BROWN
BOOK ONLY

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224361
UNIVERSAL
LIBRARY

OUP—880—5-8-74—10,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. R ٨٩١ ٥ د ٣٠٥ Accession No. ٣ جلد ١٩٠٥ ء

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.


معيار
Osmania University Librar
HYDERABAD (DECCAN)
Checked 1978
The Maiyar Monthly
FIROZ

صحت منداور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

جلد ۳ ، شمارہ ۱

جنوری ۱۹۵۳ء

معیار

ترتیب دینے والے

اصغر علی عابدی

نجم الاسلام

ہیڈ آفس :- خندق اسٹریٹ میرٹھ شہر

سب آفس :- محلہ کشن گنج دہلی ۶

تعاون

سالانہ چھ روپے

ششماہی تین روپے

(مضامین، خط و کتابت، ترسیل زر، تبادلہ جرائد کیلئے ہیڈ آفس)

ترسیل زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب، فیملی لائن، جیکب آباد

فی پرچہ آٹھ آنے

ترتیب

نقش اوّل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اصغر علی عابدی ۔ ۳

نظمیں

ہمشوں یاروؤں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابوالمجاہد زاہد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵
خلافت الٰہیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فاروق بالنپاری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۷
یہ فانوس کس نے جلائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محمود عالم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۹
مشورہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عنوان چشتی بنگلوری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۱
جشن آزادی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اعجاز اعظمی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲
فن کار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انور جمیل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۳
امن کے دیوتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شبنم سبحانی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۴

مقالے

خواب اور شاعری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابن فرید بی، اے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۵
جدلیاتی مادیت بہ حیثیت فلسفہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شمس رحمانی اعظمی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۱
غالب کا فلسفۂ نشاط و غم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محمد عثمان رمز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۵
ہند قدیم میں فن تعمیر کا ارتقاء ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یوسف کمال بخاری۔ ایم، اے ۔ ۔ ۔ ۳۰

غزلیں

غزل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سید حرمت الاکرام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۳
" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ احسن مظہری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۴
" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عالم صدیقی، شفا گوالیاری ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۶
" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شہریار پرواز، ہوش اکبرآبادی ۔ ۔ ۔ ۳۷
" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حامی نادری، شوریدہ کاشیری ۔ ۔ ۔ ۔

افسانے

چراغ کیوں جلے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انور اعظمی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۸
نکاح کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ منظر اعظمی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۲
آنسو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (محترمہ) بنت حماد، بی، اے ۔ ۔ ۔ ۴۶
مشیت کا پیار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حسن شاہدی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۱

نقشِ اوّل

ادب نوازوں یا ادیبوں میں اس وقت دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ "قدامت پسندوں" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور دوسرا گروہ "جدیدیت پسند" یا "ترقی پسند" کہلاتا ہے۔ "قدامت پسندوں" میں کچھ اصول اور نظریات ابھی تک ایسے باقی ہیں جن کا تعلق زندگی کی بنیادی باتوں اور کائنات کی اٹل قدروں سے ہے لیکن نہ تو ان لوگوں کو خود اپنے مسلک کی اصل حقیقت کا شعور ہے! ورنہ وہ اس کے لئے کسی قسم کی جرأت مندانہ جدوجہد کے لئے تیار ہیں۔ اپنی بے عملی، یکسانی افتادِ خیال، اور سنجیدہ اخلاقیات کے ساتھ ان میں اور جدیدیت پسندوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر یہ لوگ ایک طرف اُن کے مخالف ہیں تو دوسری طرف اُن سے گلے مل رہے ہیں۔ ان کے نزدیک پائدار اصولوں اور نظریات سے مراد، اُن کی اصلی رُوح اور حقیقت نہیں ہے بلکہ اُن کا اُوپری خول ہے، اسی لئے یہ حضرات ادب اور آرٹ میں جس پائداری کو دیکھنے کے خواہش مند ہیں اُس کا تعلق اُس فرسُودہ اُوپری خول سے ہے جو واقعی صدیوں پرانا ہو چکا ہے، اور اس اعتبار سے یہ لوگ یقیناً "قدامت پسند" کہلانے کے مستحق ہیں، یہ بے چارے پائداری، استقلال اور صالحیت کے الفاظ سے تو خوب آشنا ہیں مگر ان کا مفہوم اُن کے نزدیک بس اُوپری پائداری، سطحی استقلال، اور خارجی صالحیت تک محدود ہے، ان کے اعصاب اس قدر مُردہ ہو چکے ہیں کہ یہ نہ تو خود گہرائی میں اُترتے ہیں اور نہ دوسروں کو اترتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی حالت ضعفِ قلب کے اس مریض کی سی ہو گئی ہے جو کسی نچلے نوجوان کو کنوئیں میں چھلانگ لگاتا دیکھکر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ آخر ان حضرات کو کس طرح سمجھایا جائے! اور پھر لطف یہ ہے کہ یہ بزرگانِ کرام دعوائے اُستادی بھی رکھتے ہیں۔ یقیناً ان حضرات کے اس فن شریف میں مہارت بہم پہنچانے کا ہر شخص کو قائل ہونا چاہئے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے پاس کونسا سرمایۂ فکر ہے؟ آپ جس دوام، ہمیشگی اور صالح قدر کا نام لیتے ہیں وہ ہے کیا؟ کیا صرف قدیم اُستاد، ان فن کی پرستش؟ زبان کی پرستش؟ محاورے کی پرستش؟ آخر اس خول پرستی کا حاصل کیا ہے؟ کیا اس سے زندگی کا کوئی بھی مسئلہ حل ہوتا ہے؟ کیا اس سے وہ ذہنی تسکین ہی حاصل ہوتی ہے جو خود ان حضرات کے نزدیک فن کا اصلی مقصود ہے؟ کیا اس سے کسی قسم کی جمالیاتی حس بیدار ہوتی ہے؟ ——— اگر نہیں، اور یقیناً نہیں ——— تو پھر اس گناہ بے لذت کو کیوں نہ ترک کر دیا جائے! یاد رکھئے جس قدر بے وقری اس وقت تک ہو چکی ہے آئندہ اس سے زیادہ ہو گی۔ اور اگر آپ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی کے قائل ہیں تو وہاں اپنے ایک ایک بے نتیجہ فعل کا آپ کو حساب دینا ہو گا۔ اس جگہ کسی اُستاد فن کی قسم کھا کر کسی نفسانی تسکین کا حوالہ دیکر، کسی مکتبِ خیال کا درس دے کر، آپ چھوٹ نہ سکیں گے یہ چیزیں تو اُلٹا آپ کے جرم کو ثابت کریں گی۔ اس لئے اس دنیا سے زیادہ اس بعد کی دنیا کی بھی کچھ فکر کیجئے۔ اور سوچئے کہ آپ کو ایک دیانت دار اور مخلص ادیب کی حیثیت سے ادب اور فن کو کس منزل کی طرف لے جانا ہے۔

دوسری بات تو یہ ہے کہ "قدامت پسندوں" کی طرح "جدیدیت پسند" بھی انتہائی سطحیت پرست واقع ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں انسانی سماج ارتقا کر رہا ہے۔ اس لئے انسان بدل گیا ہے، اس کے مطالبات ضروریات اور خواہشات میں تغیر آچکا ہے، لہٰذا کوئی بات چاہے وہ کتنی ہی اچھی ہو اگر وہ قدیم ہے تو اس زمانے کیلئے قطعاً ناکارہ ہے۔ وہ تو صرف اُسی منزل کے لئے کارآمد تھی جب انسان ترقی کے کسی نچلے زینے پر کھڑا تھا۔ اب جبکہ وہ کئی زینے اُوپر چڑھ آیا ہے گزری ہوئی بات کو دُہرانا سراسر حماقت ہے۔ حالانکہ یہ خود ایک بہت بڑی حماقت ہے جس میں یہ لوگ مبتلا ہیں۔ انسانی سماج میں جو کچھ تغیر ہوا ہے وہ اس کے پھیلاؤ یا مختلف اشیاء کے طریقۂ استعمال میں ہوا ہے، تغیر انسانی ضروریات اور مطالبات میں نہیں ہوا صرف ان کی تکمیل کے ذرائع اور وسائل میں ہوا ہے۔ انسان کے اندر کوئی خواہش، کوئی جذبہ، اور کوئی امنگ ایسی نہیں ہے جو زمانہ کے ساتھ ساتھ یکسر بدل گئی ہو۔ انسان پہلے بھی کھاتا تھا اور آج بھی کھاتا ہے لیکن پہلے کچھ اور کھاتا تھا آج کچھ اور کھاتا ہے۔ انسان پہلے بھی سفر کرتا تھا آج بھی سفر کرتا ہے، مگر پہلے وہ چھکڑے اور بیل گاڑی پر سفر کرتا تھا اور آج موٹر، ریل، اور ہوائی جہاز پر سفر کرتا ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ تغیر کس شے میں ہوا ہے؟ "مسافر" میں یا ذرائع سفر میں۔ ظاہر ہے تغیر صرف ذرائع سفر میں ہوا ہے۔ اور ہوتا رہے گا۔ اس لئے اگر ہم تغیر کو مانیں گے تو صرف اس حد تک

کہ تمدن کا اُوپری خول بدل جاتا ہے جو لوگ تغیر کو تسلیم نہیں کرتے وہ در اصل اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھکر روشنی کا انکار کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی جو آنکھوں والے اس قدر کوتاہ بیں ہیں کہ انہیں یہ ظاہری اور سطحی تبدیلی، بنیادی اور حقیقی تبدیلی نظر آتی ہے اُن سے بڑھکر اندھا بھی شاید ہی کوئی ہو۔ اس طرح کی باتیں کرنے والوں نے در اصل تاریخ کا غلط مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے انسانی فطرت کو غلط سمجھا ہے، انہوں نے تغیر اور ارتقاد کے مسئلہ میں سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ اِن "جدیدیت" اور نام نہاد ترقی پسندوں نے ظاہر پرستی میں ساری دُنیا کے لوگوں کو مات دیدی ہے، اور اس معاملہ میں یہ زمانۂ قدیم کے مظاہر پرستوں اور بُت پرستوں سے کسی طرح کم نہیں یہ ہمیشہ نہایت نچلی سطح سے بات کرتے ہیں۔ اُن کے خیالات میں اُتھلا پن نمایاں ہے۔ وہ سماج کے مختلف طبقات کو گھٹیا اور وقتی فائدوں کے لئے اُکساتے ہیں۔ ان کا خیال نہ صرف ہونیا کے دوسرے نظامات کے بارے میں یہ ہے کہ وہ سب کے سب اپنے اپنے زمانے کے سطحی تغیرات سے پیدا ہوئے تھے بلکہ خود وہ جس نظام کو پیش کرتے ہیں انتہائی سطحیت اور خول پرستی پر مبنی ہے۔ اِس لئے دنیا کے اور نظامات چاہے وقت کے ساتھ بدلے ہوں یا نہ بدلے ہوں لیکن ان کا نظام ضرور حالات کے معمولی تغیر سے تہس نہس ہو جائے گا اور ہو رہا ہے ـــــ ضرورت ہے کہ یہ لوگ بھی اپنے رویّہ پر نظر ثانی کریں۔ بطلیموس کی طرح خاص اصطلاحات کو ہٹ لینے اور دنیا کو اُن کھوکھلی باتوں کی روشنی میں دیکھنے سے کام نہیں چلتا۔ نہ تو خواص اور نہ عوام اب زیادہ دنوں تک ان دلفریب نعروں اور رنگین تراوں سے فریب کھا سکتے ہیں۔ "جدیدیت" اور "ترقی پسندی" کے الفاظ لوگوں کو بہکا نہیں سکتے۔ اِن الفاظ کا کوس نکل چکا ہے۔ اور ان کی قدر تیزی سے گرتی جا رہی ہے۔ دُنیا اِس طلسمات کی حقیقت سمجھ چکی ہے۔ اِس لئے اگر آپ محض اپنے آپ کو دھوکے میں مبتلا رکھنے کے لئے اِن کے بھیر میں پڑے رہنا چاہتے ہیں۔ تو خیر کوئی بات نہیں، آپ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے۔ لیکن ہم آپ سے کہتے ہیں کہ سب جانتے بُوجھتے ٹھوکر کیوں کھاتے ہیں کیوں نہیں انسانیت کے دُکھوں کا حقیقی مداوا تلاش کرنے میں لگ جائے۔ ابھی موقع ہے اور وقت کی رفتار فی الحال زیادہ تیز نہیں ہوئی ہے!

جن لوگوں نے اِس وقت پرستی اور سطح بینی کو اپنا شعار بنایا ہے اُس کا تعلق اصول سے زیادہ اُن مخالفانہ اور معاندانہ جذبات سے ہے جو مذہب۔ خدا پرستی، اور اخلاق سے بغاوت پر مبنی ہیں۔ اِن اصولوں سے سب سے پہلی بغاوت سرمایہ داری نے کی، اُس کے بعد اب سرمایہ داری نے ترقی کر کے سوشلزم یا کمیونزم کی شکل اختیار کر لی ہے اور ہو سکتا ہے کہ آیندہ سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں متحد ہو کر مذہب، خدا پرستی، اور اخلاق کے خلاف نبرد آزما ہو جائیں۔ یہ لوگ تغیر اور ارتقاد کا جو غلط گھڑت نظریہ پیش کرتے ہیں اس کا منشا صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ اُن تمام طریقوں کو رد کر دیں جن کا تعلق زمانۂ گزشتہ کے "مذہب" سے ہے۔ ورنہ یہی لوگ خود اپنے نظریات کی تائید میں تاریخ کے مختلف ادوار کی مثالیں پیش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ہر زمانے میں اس طرح کی ایک جدوجہد ہوتی رہی ہے۔ آخر اس تضاد کا کیا مطلب ہے؟ جس اصول کو وہ دوسروں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں، اپنے معاملے میں اُسے کیوں بھول جاتے ہیں؟

بات یہ کہ اہلِ مذاہب، خدا اور اخلاق کی طرف سے اُن کے دل میں گہرا عناد بیٹھ گیا ہے۔ اور اس کی بہت کچھ ذمہ داری یقیناً خود اہلِ مذاہب۔ خدا کے نام لیواؤں اور اخلاق کی مالا جپنے والوں پر عائد ہوتی ہے، اِن لوگوں نے مذہب کو صرف چند باتوں تک محدود کر دیا اور اُس کو اپنی ذاتی اغراض کا آلۂ کار بنا کر رکھ دیا۔ انہوں نے خدا کے نام پر اپنی ذات اور نفس کی پیروی کی اور کروائی۔ انہوں نے اخلاق کا واسطہ دیا مگر اپنی قومی گروہی، اور طبقاتی خواہشات کی تکمیل کیلئے دنیا کے دوسرے انسانوں کے سامنے میں انہیں اخلاق یاد نہ آیا۔ اِس طرح مذہب، خدا پرستی، اور اخلاق بدنام ہو گئے۔ اور ان کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات بھڑک اٹھے۔ آج کے سرمایہ دار سوشلسٹ اور کمیونسٹ انہیں مخالف جذبات کے نمایندے ہیں لیکن جس وقت مذہب اپنی صحیح حیثیت میں پیش کیا جائے گا۔ خدا پرستی اپنے اصلی روپ۔ مانے آئینگی اور معروف اخلاقی قدروں پر ایک منظم اور مکمل گروہ میدان میں آئے گا۔ اِن تمام مخالفتوں کے پہاڑ خود بخود ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ ضرورت ہے کہ آج بیچ کے لوگوں، پجاری، ملانے اور وقت کی قید سے آزاد ہو کر سمجھنے والوں، اور انسانی فطرت کے رازدانوں کا ایک گروہ اُٹھے ـــــ اور وہ قدامت کے "خول پرستوں" اور جدیدیت کے سطح بینوں کو جائز قدامت پسندی اور جائز قسم کی تغیر پسندی سے آگاہ کرے، یہ گروہ ایک طرف فن کی باریکیوں اور نزاکتوں کو تسلیم کرے اور دوسری طرف اظہار خیال کے طریقوں، زبان، محاوروں اور انداز بیان میں روز بروز نت نئی ترقی کا قائل ہو۔ ایک طرف فرد، سماج، اور نظام کے لئے ایک جامع مستقل، اور اُصل ضابطہ کو اپنی ہر کاوش اور ہر خیال کا جزو بنا دے، اور دوسری طرف اُسے بدلتے ہوئے تمدنی ذرائع اور وسائل کے اعتبار سے نئے نئے لباس اور لبادے پہناتا رہے۔

توقع ہے کہ اگر اس طرح کام کیا گیا تو نہ صرف قدامت پسندانہ اور جدیدیت پرستانہ سطح بینی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ بلکہ فکر و عمل کی وہ ساری کوتاہیاں بھی دُور ہو جائیں گی جو انسانی سماج کے لئے ایک عذاب بنی ہوئی ہیں ـــ!

ابو المجاہد زاہد

ہنسوں یا روؤں

خواہش امن و مسرت پہ ہنسوں یا روؤں
عقل بے مایہ کی وحشت پہ ہنسوں یا روؤں
فکر و احساس کی بدعت پہ ہنسوں یا روؤں
قومیت اور وطنیت پہ ہنسوں یا روؤں
اس چمکدار جہالت پہ ہنسوں یا روؤں

نغمہ زن صبح نہیں، رقص کناں شام نہیں
اور یہ کیا ہے اگر گردشِ ایام نہیں؟
کون ہے جو ہدفِ ناوکِ آلام نہیں
روح تو روح ہے جسموں کو بھی آرام نہیں
آپ کے نظمِ حکومت پہ ہنسوں یا روؤں

ظلم کی دھوپ میں آئین پگھل جاتے ہیں
جھوٹ کی آنچ میں دستور بدل جاتے ہیں
آنکھ جھپکے، تو غلط داؤں بھی چل جاتے ہیں
جعل سازی سے بڑے کام نکل جاتے ہیں
اس سیہ کار حکومت پہ ہنسوں یا روؤں

مسکراتا ہے نئی جنگ کا خونیں طوفاں
جس کے انفاس میں ہے نارِ جہنم پنہاں
ٹھاٹ سے اینڈتے ہیں اہرمنانِ دوراں
خوف سے کانپتے ہیں بے بس و مظلوم انساں
ایٹمی دور کی لعنت پہ ہنسوں یا روؤں

محنتوں پر ہے حکومت کی اجارہ داری
ہے وہی مالک و مزدور میں ناہمواری
جرأت فکر پہ "سنسر" کا فسوں ہے طاری
نعرۂ عدل و مساوات فقط عیاری
مسخ جنت کی حقیقت پہ ہنسوں یا روؤں

گرم ہر رنگ میں ہے خود غرضی کا بازار
عالم نزع میں ہیں زیست کی اعلیٰ اقدار
دام ہوں پاس تو بکتا ہے جوانی کا سنگار
مول مل جاتے ہیں گلرنگ مہکتے رخسار
عصر حاضر کی "عنایت" پہ ہنسوں یا روؤں

عورت احساس ترقی کا سہارا لے کر
بے حجابانہ نکل آئی گھروں سے باہر
جگمگانے لگی جلوؤں سے ہر اک راہگذر
مسکرانے لگی مردوں کی ہوسناک نظر
لاشۂ عفت و عصمت پہ ہنسوں یا روؤں

حسن اخلاص نہ اخلاق کی پاکیزہ بہار
وہی الحاد پسندانہ ترقی کے شرار
"آج" کے شاعر و افسانہ گر و نقد نگار
ہے غریبوں کے تخیل "پہ زن و نان" سوار
ادب و شعر کی حالت پہ ہنسوں یا روؤں

مجھ کو ماحول کے دھارے میں نہ بہنا آیا
شام کو صبح ضیا بار نہ کہنا آیا
مصلحت خیز فضاؤں میں نہ رہنا آیا
حسن باطل کی جفاؤں کو نہ سہنا آیا
"وقت" کی زجر و ملامت پہ ہنسوں یا روؤں

---

* علامہ اقبال مرحوم کا مشہور شعر تھوڑے سے تصرف کے ساتھ (ناشر)

فاروق۔ بانسپاری

خلافت الٰہیہ

زمین و آسماں کو مل چکا جب خلعت ہستی
جمالِ خود نما کے دل میں اٹھی موجِ سرِ مستی

زمیں پر اِک خلیفہ کے تقرر کا سوال آیا
یہ نازک مسئلہ پیشِ خدائے ذوالجلال آیا

مشیّت نے طلب کی رائے بالآخر فرشتوں سے
نظر تھی جن کی ناواقف مقدر کے نوشتوں سے

سزاوارِ خلافت بن کے فخرِ بے گناہی میں
ملایک ہو گئے خود پیش درگاہِ الٰہی میں

مقابل نوریوں کے آدمِ خاکی بھی جا پہونچا
حریمِ قدس میں شہ کارِ بے باکی بھی جا پہونچا

لئے فرقِ خمیدہ میں جنونِ سرفرازی بھی
نگاہوں سے تجسّس بھی عیاں اور بے نیازی بھی

بصد بے مائگی یہ خواہشِ اعزاز کیا کہنا
جزاک اللہ مشتِ خاک کی پرواز کیا کہنا

سرشتِ بوالبشر میں تھا نہاں ذوقِ خطاکاری
ملایک ناشناسِ لطفِ صہبائے گنہگاری

اِدھر تھی دل میں روحِ معصیت کی کارفرمائی
تقدس لے رہا تھا اُس طرف ماتھے پہ انگڑائی

تقابل تھا نہ کوئی درمیانِ ذرّہ و اختر
کجا یہ خاک کا پُتلا کجا وہ نور کے پیکر

مگر نیرانِ کُن تھا فیصلہ ربِّ دو عالم کا
فرشتے جھک گئے چمکا ستارہ بختِ آدم کا

عطا کی حق نے تو قیرِ خلافت پیکرِ گِل کو
تفوّق زہد و تقویٰ پر بلا آگاہیٔ دل کو

علومِ اِسم و اشیاء کی یہ اِک معجز نمائی تھی
کہ پائے معصیت پر خم جبینِ پارسائی تھی

ملایک سے اسی میداں میں آدم لے گیا بازی
ازل کے ممتحن نے دی کفِ گل کو سرافرازی

نظر آتا نہیں جو مدرسوں میں خانقاہوں میں
وہ رنگِ آگہی بھر دو مسلماں کی نگاہوں میں

تمہارے سامنے ہے جہل کا اپنے یقیں مجھ کو
بتاؤ تو مگر دیوانگانِ علم دیں مجھ کو

کبھی مہر و مہ و انجم کے الٹے ہیں ورق تم نے
عناصر کی کتابوں سے لیا ہے کچھ سبق تم نے

کبھی قدرت کے پوشیدہ خزانوں پر نظر ڈالی
زمینوں کو ٹٹولا آسمانوں پر نظر ڈالی
کبھی قطروں کے دل میں آتشیں طوفان دیکھا ہے
فضا میں برق پاروں کا کبھی ہیجان دیکھا ہے
کبھی تجزیۂ آب و ہوا کا بھی خیال آیا
خرد کے سامنے تحقیق اشیاء کا سوال آیا
کبھی قلبِ مناظر پر نظر کے تیر مارے ہیں
کبھی افکار کے بکھرے ہوئے گیسو سنوارے ہیں
کمالاتِ مظاہر کا نگاہوں پر اثر کچھ ہے
تمھارے دین کو حالاتِ دنیا کی خبر کچھ ہے
سمجھتے ہو کہ تبدیلی یہ کیوں بر روئے کار آئی
عرب کیوں ہوگیا ویراں عجم میں کیوں بہار آئی
تمھارا علمِ برحق آج خود تم پر گراں کیوں ہے
درِ باطل کے سجدوں کا جبینوں پر نشاں کیوں ہے

حقیقت پر اگر مبنی تمھاری دینداری ہے
زمیں کے وارثو! تم پر زمیں کیوں آج بھاری ہے

شبیہِ علم کے صرف ایک پہلو پر فدا تم ہو
رخِ ثانی کے جلووں سے مگر آشنا تم ہو
کلیمِ بے عصا حق کی اشاعت کر نہیں سکتا
تمھارا علم خود تم کو ہدایت کر نہیں سکتا
دعاؤں سے ہی گر ممکن فروغِ علم و دیں ہوتا
تو شمعِ بزمِ مصطفوی ابوجہل لعیں ہوتا
پئے شق القمر کافی فقط جس کا اشارہ تھا
وہ میدانِ حنین و بدر میں پھر کیوں صف آرا تھا
بہر پہلو نہیں علم و عمل میں گر ہم آہنگی
تو قائم رہ نہیں سکتا نظامِ محفلِ ہستی
جہاں کے بھید تاویلوں سے ہرگز کھل نہیں سکتے
کبھی میزانِ منطق میں حقائق تل نہیں سکتے

ضرورت قصر کی نقشے سے پوری ہو نہیں سکتی
تخیل کی مدد سے طے یہ دوری ہو نہیں سکتی

بتاؤں آؤ میں تم کو کہ قانونِ خدا کیا ہے
حقایق کو نظر انداز کرنے کی سزا کیا ہے
بشر جب ہوش کا دشمن بقیدِ ہوش ہوتا ہے
دلِ قدرت میں پیدا انتقامی جوش ہوتا ہے
جو بیرونِ تصور ہیں وہ طوفاں سر اٹھاتے ہیں
سفینے زندگی کے خشکیوں میں ڈوب جاتے ہیں
مشیت غیظ میں جب قہر کا پہلو بدلتی ہے
سمندر آگ ہوتا ہے زمیں شعلے اگلتی ہے
جہنم مسکراتا ہے صبا کی سرد آہوں میں
گل خوش رنگ کانٹا بن کے چبھتے ہیں نگاہوں میں

الٹ جاتی ہیں تدبیریں بدل جاتی ہیں تاثیریں
معاذ اللہ قانونِ خداوندی کی تعزیریں

محمود عالم

یہ فانوس کس نے جلائے

مرے ساتھیو
آج پھر زندگی کے شبستاں میں دھیرے سے اک روشنی مسکرائی
دل آویز و دل کش حسیں روشنی
دل ربا روشنی
زندگی آفریں روشنی مسکرائی
فضا مسکرائی
فضائے زمان و مکاں مسکرائی
مرے ہم صفیرو مرے ساتھیو
آج پھر زندگی کی پُراسرار و تاریک راہوں پہ روشن دیئے جھلملائے
فضا جگمگائی
فضائے زمان و مکاں جگمگائی
اُفق پر تخیل کے اُبھرے وہ دیکھو نئے چاند تارے
نئے ماہ پارے
سہانے دل آویز و دل کش نظارے
تخیل کی پُرپیچ و تاریک راہوں پہ آخر یہ فانوس کس نے جلائے
یہ کس نے تخیل کی ویران وادی میں شاداب و دل کش مناظر سجائے
مرے ہم صفیرو مرے ساتھیو
آج پھر زندگی کے لبوں پر ہیں شادابیاں رقصاں رقصاں

فضا شاداں شاداں
فضائے زمان و مکاں شاداں شاداں
خیالوں پہ طاری بہاروں کے عنواں
بہاروں کے ساماں
مرے ساتھیو
آج پھر زندگی کی مچلتی رگوں میں عزائم کی چنگاریاں ہیں درخشاں
پُراسرار ظلمت کی پرچھائیاں آج پھر ہیں ہراساں
ہراساں ہراساں، پشیماں پشیماں
گریزاں گریزاں
جدھر دیکھئے موج تنویر رقصاں
ادھر بھی چراغاں اُدھر بھی چراغاں
فضا نغمہ ساماں
فضائے زمان و مکاں نغمہ ساماں
یہ کس قلب مضطر کی بیتاب لَے ہے جو اِک نغمۂ بیکراں بن رہی ہے
خزاں چپکے چپکے بہاروں کا اِک کارواں بن رہی ہے
مرے ساتھیو
آج پھر یہ زمیں آسماں بن رہی ہے
مرے ہم صفیرو
یہ کس کا لہو ہے جو دھرتی کی رنگیں بہاروں کی اِک داستاں بن رہا ہے
یہ کس کے مچلتے اشاروں پہ آخر حجاب زمان و مکاں اُٹھ رہا ہے . . . .

عنوان چشتی بنگلوری

مشورہ

(۱)

بڑھتا جاتا ہے زمانہ میں یہ کیوں "خوف و ہراس"
اور کیوں "گرمیٔ دل" سرد ہوئی جاتی ہے؟
جیسے دنیا میں کوئی کیف نہیں ہے باقی
زیست یوں موت کے پہلو میں اماں پاتی ہے

(۲)

"شیر خواروں" کی تڑپ میں ہے قیامت رقصاں
اور بیواؤں کی چیخوں میں نہاں ہے محشر
نوجواں زیست سے بیزار ہیں بیکاری میں
ماتم امن میں مشغول ہے ہر ایک بشر

(۳)

مفلسی سے تو پریشان تھے مفلس لیکن
"اہلِ زر" کو بھی نہیں دہر میں آرام نصیب
بیکسی اپنی حدوں سے بھی بڑھی جاتی ہے
یعنی اپنے ہی وطن میں ہیں مگر جیسے غریب

(۴)

ظلمت جنگ ہے چھائی ہوئی بحر و بر پر
روشنی امن کی گھٹتی ہی چلی جاتی ہے
اور انساں ہے کہ حیواں بنا جاتا ہے
آدمیت ہے کہ بیجان ہوئی جاتی ہے

(۵)

ٹھوکریں مار دو "امریکی خداوندوں" کو
اور اسٹالن و لینن سے بغاوت کر دو!
صرف اسلام ہے دنیا میں "نظامِ محکم"
بے نقاب اٹھکے زمانے کی سیاست کر دو

دور ہو جائے گا یہ "دورِ نحوست ساماں"
نور برسائے گا ہر سمت سے "امن و اماں"

اعجاز اعظمی

جشن آزادی

تم بھی آزاد ہو ہم بھی آزاد ہیں ——
آؤ جشنِ مسرت منانے چلیں
یوں روپہلی سڑک پر جلیں بجلیاں
جیسے مانگوں میں افشاں چمکنے لگے
جیسے آکاش پر چاند تارے اُگیں
دونوں جانب دکانیں سجائی گئیں
فرش پر مخملی چادریں بچھ گئیں
اور محلوں میں بھی لمپ روشن ہوئے
جام ڈھلنے لگے ——
رقص ہونے لگا ——
روٹیوں کے عوض جسم بکنے لگے
ہڈیوں کے یہ ڈھانچے تراشے ہوئے
ہاتھ پھیلائے ننگے بلکتے ہیں کیوں ؟
ان کی بینیں حیا سے سمٹتی ہیں جب
دور چاندی کے سکّے کھنکتے ہیں کیوں ؟
ان کے ہونٹوں پہ پھولوں کی سرخی نہیں
ان کی آنکھوں میں تارے لرزتے ہیں کیوں ؟
تم بھی آزاد ہو ہم بھی آزاد ہیں ——
آؤ جشنِ مسرت منانے چلیں

انور جمیل

فن کار

لوگ کہتے ہیں کہ فن کار ہوں میں !
قلب کو نین دھڑکتا ہے مرے گیتوں میں !
میرے فن کو ہے حیاتِ ابدی !
اور میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں ——— !!
میری تخلیق کے شہپارے ——— یہ گیتوں کے محل !
یہ مرے فن کے ستارے، یہ مرے لعل و گہر !
کس نے بخشے ہیں مجھے ؟
کون ہے خالق اِن کا ؟
میرے بربط میں یہ نغموں کا تلاطم کیا ہے ؟
میرے افکار کی اِس وسعتِ بے پایاں میں
نکہت و نور کا سیلاب کہاں سے آیا ؟
رنگ بھر دیتا ہے یہ کون مرے خوابوں میں ؟
میرے اشعار کی تابندہ گذرگاہوں میں
شمعِ احساس کی لَو کون بڑھا دیتا ہے ؟
کون فن کار ہے اِس پردے میں ؟

اور فن کار وہ کیسا ہوگا ؟
آگ سینے میں بھڑک اُٹھی ہے !
اُٹھ چکا ہے مری آنکھوں سے حجاب !
لہلہاتے ہوئے یہ کھیت، یہ باغات، یہ گلرنگ شفق !
یہ پرندوں کا اُمڈتا ہوا اک سیلِ رواں !
مرتعش سی یہ فضائیں، ——— یہ سلگتی ہوئی شام
کسی کی صنّاعی کے ہیں عکسِ جمیل ؟
اور یہ رات ! یہ رخشندہ ستاروں کی جبیں !
یہ مہ و نو ! یہ خنک چھاؤں کا خوابیدہ فسوں !
یہ چٹکتی ہوئی کلیوں کا دلآویز گداز !
[illegible]
یہ درختوں کا پُر اسرار سکوت !
کس کے شہکار ہیں یہ ——— کس کی تخلیق کے شہپارے ہیں ؟
اور تخلیق کا مقصد کیا ہے ؟

شبنم سبحانی

امن کے دیوتا

امن کے دیوتا ــــــ
امن کے نام پر قہر ڈھاتے رہے
ناخدا بن کے کشتی ڈباتے رہے
انگلیوں پر جہاں کو نچاتے رہے
دہر کو یونہی صدیوں مٹاتے رہے
امن کے دیوتا ــــــ
امن کے نام پر قہر ڈھاتے رہے

ایک سے اک نیا گل کھلاتے رہے
ظلم کرتے رہے مسکراتے رہے
اک طرف امن کے راگ گاتے رہے
دوسری سمت طغیان ڈھاتے رہے

ایک جانب جہاں کو دلاسے دیئے
امن لانے کے پیمان و وعدے کئے
ایک جانب لڑائی کے ساماں کئے
بن کے طوفانِ غم دہر پر چھا گئے

ایٹمی طاقتیں جنگ کے اسلحے
ڈالروں روبلوں کے یہ اندھے دیئے
اِن سے کتنے غریبوں کے گھر جل گئے
کتنے معصوم و مظلوم لٹ پٹ گئے

"امن کے دیوتاؤ" سنو!
آج ہم پر تمہارا بھرم کھل گیا
سب فریب نگاہ کرم کھل گیا
نورِ عرفاں زمانے کو پھر مل گیا
لو وہ حق آگیا لو وہ باطل گیا

ابنِ فرید بی۔اے

خواب اور شاعری

زیرِ نظر مقالہ کا محرک معیار کی گذشتہ اشاعت میں چھپنے والا ایک مضمون "خواب اور شاعری" ہے۔ اس مضمون کو غالباً عدیم الفرصتی کے باعث سید محمد یحییٰ صاحب نے بہت ہی اختصار سے تحریر کیا تھا۔ امید ہے کہ ابنِ فرید صاحب کا یہ تبصرہ سامنے آنے کے بعد محمد یحییٰ صاحب اس موضوع پر تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار فرمائینگے۔ (ادارہ)

ایک عرصہ ہوا جب میں نے سوچا تھا کہ تحلیل نفسی اور فرائڈ کی نقطۂ نظر کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ شعور و لاشعور کا ہوّا ہم پر جس طرح سوار کر دیا گیا ہے۔ درحقیقت وہ اس قدر بااختیار نہیں ہے۔ چنانچہ شعور و لاشعور پر میں نے ایک مقالہ معیار ہی کے صفحات میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد ارادہ تھا کہ اس موضوع کے دوسرے اساسی نظریات پر بھی کچھ نہ کچھ سپردِ قلم کروں گا مگر شوقِ مطالعہ اور جہدِ تحقیق نے موقع نہ دیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جس عنوان سے میں یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں اسی عنوان سے گذشتہ ماہ کے شمارہ میں ایک نیم نفسیاتی مقالہ نظر سے گذرا اور میں مجبور ہو گیا کہ اس پر کچھ اور روشنی ڈالوں۔

یہ درست ہے کہ خواب اور شاعری پر ایک صفحہ کے مختصر مقالے میں اہم اشارات ہی پیش کئے جا سکتے ہیں اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ لیکن بذاتِ خود موضوع اس کا متقاضی ہے کہ اس پر لکھنے سے پہلے سوچا جائے اور سوچنے سے پہلے نفسیاتی نکات کی تحقیق ضروری ہے خواب اور شاعری میں مماثلت تلاش کرنے سے پہلے ہمیں یہ بھی معلوم کر لینا پڑے گا کہ ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں۔ یا خواب کی ماہیت کیا ہے۔ اگر ہم یہ نہیں جان سکتے کہ خواب کیونکر انسانی نفس میں نمو پا گیا تو ہم اس کا انطباق بھی صحیح معنوں میں نہ کر سکیں گے کہ وہ کس سے مماثل ہے اور کس سے مفترق۔

یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ انسانی دماغ تمام حیوانات کے مقابلہ میں اعلیٰ ہے۔ اور جس قدر وہ اعلیٰ ہے اسی قدر وہ پیچیدہ ہے۔ ایک ماہر نفسیات نے ایک خرگوش کو ایک مخصوص راستہ پر سے گذرتے ہوئے بجلی کا جھٹکا دیا لیکن وہ کوئی شناختی تدبیر نہ سوچ سکا یعنی اس میں کوئی تجرباتی ردِ عمل نہ ہوا حتیٰ کہ وہ سوم تبہ اسی راستہ سے گذرا اور ہر مرتبہ بجلی کے جھٹکے سے دوچار ہوا لیکن کیا آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ آپ بجلی کا ایک جھٹکا کھا کر یا اس بجلی کے جھٹکے کے ناگزیر طور پر واقع ہونے سے واقف ہونے کے بعد ہی اس راستہ سے گذرنے کا ارادہ کریں گے؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا! اور اس جواب کی تشریح اور تجزیہ ہی آپ پر یہ واضح کر دے گا کہ انسانی ذہن عام حیوانات کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ[1] ہے۔

ہمارا دماغ (یا ذہن) احساس، حافظہ اور تخیل کی اعلیٰ ترین قوتیں رکھتا ہے۔ ہمیں کسی چیز کا احساس ہوا یعنی ہم نے اُسے دیکھا، سنا، چکھا، مس کیا یا سونگھا اور وہ ہمارے تجربہ میں آ گئی۔ یہ عمل ہمارے دماغ میں محفوظ ہو گیا۔ ایسی ہی متعدد چیزیں ہمارے علم میں آتی چلی جاتی ہیں اور ہم ان کو اپنے حافظے میں جمع کرتے چلے جاتے ہیں لیکن ہمارا ذہنی عمل صرف اس حد پر اکتفا نہیں جاتا وہ اُن تجربہ شدہ چیزوں کو دوبارہ ہمارے حافظہ میں تازہ کر دیتا ہے اور ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ مخصوص چیز یا واقعہ وغیرہ

---

[1] "ترقی یافتہ" سے قطعاً یہ خیال ذہن میں نہ لایا جائے کہ یہ نقطۂ نظر یہ ارتقاء سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے بلکہ اس ترقی کو اس مثال سے سمجھئے کہ انسان کی ترقی یافتہ سواری ریل نہیں ہے۔ سائیکل ایک بالکل مختلف ضرورت اور راستہ کے لئے ہے اور اسی طرح ریل ایک مختلف راستہ اور ضرورت کے لئے ہے۔ یونہی اس کائنات میں تمام حیوانات اپنی ایک خاص ضرورت اور مقصد کے لئے ہیں۔ یہ مسئلہ میرے موضوع سے خارج ہے اس لئے اس کی تشریح کی میں چنداں ضرورت نہیں سمجھتا۔

ہمیں یاد ہے۔ یہ عمل کبھی اُس چیز کے احساس میں آجانے پر وقوع پذیر ہوتا ہے اور کبھی اس چیز کی غیر موجودگی میں بھی۔ مثلاً آپ نے ایک گلدان دیکھا۔ اب اگر کسی اور وقت اُس کو دیکھیں تو وہ دوبارہ آپ کو یاد آجائے گا کہ آپ اس کا تجربہ کر چکے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ نے ایک پھول دیکھا اور اس گلدان کی تصویر آپ کی نگاہوں کے سامنے آگئی۔ یہ عمل ہر حس کے معاملے میں ہوتا ہے۔ آپ کو کوئی سُونگھی ہوئی خوشبو یاد آسکتی ہے، آپ کو کوئی مس کیا ہوا دلائم و نفیس کپڑا یاد آسکتا ہے، اور اسی طرح کوئی شگفتہ فقرہ یاد آسکتا ہے۔ غرض یاد ہر جگہ کارفرما رہتی ہے۔

پھر اس یاد کی بھی بے انتہا اقسام ہیں۔ منظر و مثال سے یوں سمجھئے کہ اگر آپ ایک گلدان کو دیکھنے کے بعد بھول جائیں کہ وہ گلدان ہے تو آپ کو ہر روز اور ہر لمحہ نیا تجربہ کرنا پڑے۔ آپ ہر اُس چیز سے نادانستہ ہی ہیں جس سے آپ واقف ہو چکے ہوں۔ یہ کتنی بڑی دردسری کا باعث ہوگا بڑی آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس حافظہ پر قدرت نے تخیئل کا اضافہ کیا ہے۔ تخیئل کیا ہے؟ مختلف حفظ شدہ تجربات کی پیوندکاری۔ آپ نے ایک عورت دیکھی اور ایک مچھلی دیکھی، آپ کے تخیئل نے آپ کو جل پری کا تجربہ کرا دیا۔ اس تشریح کو سامنے رکھتے ہوئے ہر تخیئل کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کس تجربہ کا کس قدر حصہ ہے۔

حافظہ اور تخیئل کے درمیان ایک اور کڑی ہے جو ان دونوں کو جوڑتی ہے۔ یہ ہے تصور۔ عام طور پر ہم تخیئل اور تصور کو ہم معنی سمجھتے ہیں لیکن نفسیات ان دونوں میں واضح فرق کر دیتی ہے۔ تصور وہ ذہنی عکاسی ہے۔ جس میں عکس اپنے اصل سے مختلف نہیں ہوتا۔ جیسے ایک مخصوص قلم کا تصور اُسی قلم کی شکل میں اُبھرتا ہے لیکن تخیئل وہ ذہنی عکاسی ہے جس میں کافی حد تک فرد کے مزاج، طبیعت۔ مذاق اور اختراع کو دخل ہوتا ہے۔ اس کی مثال سطور بالا میں پیش کی جا چکی ہے، اور اسی مثال کو سامنے رکھکر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ جل پری اپنا وجود نہیں رکھتی بلکہ ذہن خود اُسے بنا کر کھڑا کر دیتا ہے۔

ان ساری تشریحات پر مستزاد یہ کہ انسانی دماغ اپنی اختراع کو تصور میں بھی دخیل رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ کبھی حافظہ کے محفوظ کردہ خطوط کو اُسی طرح پیش نہیں کرتا جس طرح اس نے اُن کا تجربہ کیا ہے، اور پھر حافظہ کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ ایک مخصوص شے کی تمام جزئیات کو محفوظ رکھے وہ اپنے رجحان اور توجہ کے لحاظ سے ان کو جمع کر لیتا ہے۔ مثلاً جب ہم اپنے کسی دوست سے ملتے ہیں تو اُس کے جوتے کی ڈیزائن سے کر قمیص کے بٹن تک ساری چیزوں کا جائزہ نہیں لیتے اور نہ ان کے بارے میں ہمیشہ ہی بتلا سکتے ہیں بلکہ جب جو چیز اپنا منہج (Stimulus) پاتی ہے تو حافظہ میں اُبھرتی ہے۔ تخیئل کے ضمن میں بھی یہی ہوتا ہے کہ اُس میں بھی وہی چیزیں ایک ترتیب پاتی ہیں جو اس مذاق، رجحان اور طبع کے مطابق ہوتی ہیں جو اس وقت برسرکار ہوتی ہیں۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ ان سے فائدہ کیا ہے؟ افادیت کی یہ تلاش ہمیں اس انجام تک پہونچاتی ہے کہ اس خاص عطیۂ فطرت سے ہم مستقبل کے قیاس اور آنے والے واقعات کے تجربات میں مدد لیتے ہیں۔ ہماری ساری تخلیقی اور تعمیری صلاحیتیں اسی کی مرہونِ منت ہوتی ہیں۔ ایک مصور اسی کی مدد سے اپنے ذہن میں وہ نقوش تیار کر لیتا ہے جنہیں اس نے ابھی تک صفحۂ قرطاس پر ثبت نہیں کیا ہے اور ایک انجنیر اسی پر تکیہ کر کے زیر تعمیر عمارت کا نقشہ تیار کر لیتا ہے۔ غرض جہاں حافظہ ہمیں تجربات کی تکرار سے بچاتا ہے وہاں تخیئل اور تصور مستقبل کے نئے تجربات کے سلسلہ میں ترتیب و تدوین میں سامان فراہم کرتے ہیں۔

تخیئل کی دو واضح قسمیں ہوتی ہیں۔

(ا) تعمیری تخیئل جو صنعتی صلاحیتوں میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ مثلاً انجنیر نگ و ڈاکٹری وغیرہ۔

(ب) تخلیقی تخیئل۔ جو فکری و جمالیاتی ہوتا ہے۔ مثلاً مصوری، موسیقی اور ادب وغیرہ۔

یہ دوسری قسم کا تخیئل جمالیاتی ہونے کی وجہ سے Fantastic یعنی ہوائی قلعے تعمیر کرنے والا عنصر بھی اپنے اندر رکھتا ہے اور یہی بڑھکر خواب بن جاتا ہے۔ حالانکہ خواب میں اور دوسرے اقسام تخیئلات بھی شامل رہتے ہیں مگر یہ نمایاں رہتا ہے۔ اس طرح شاعری اور خواب میں یہ مماثلت ضرور پائی جاتی ہے کہ وہ ایک ہی مخرج سے ہیں وہ دونوں تخیئل ہی میں پروان چڑھتے ہیں لیکن اس سے قبل کہ اس مماثلت کو کلیتہً بنا لیا جائے، یہ ضروری ہے کہ خواب کا بھی نفسیاتی جائزہ لے لیا جائے۔ جب ہم جس وقت آرام کر رہے ہوتے ہیں ہمارا خود اختیاری اعضا

نظام اور مرکزی اعصابی نظام مصروفِ کار ہوتے ہیں۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ ہمارا دل ہمارے پھیپھڑے اور ہمارے گردے وغیرہ وغیرہ کام کرتے رہتے ہیں اور اسی طرح ہمارا دماغ بھی مشغول رہتا ہے۔ بس فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ دماغ پر سے شعور کا پردہ اُٹھ جاتا ہے اور وہ اپنی خواہشات اور اپنے تقاضوں کے مطابق کام کرنے لگتا ہے۔ دماغ کا عالمِ خواب میں یہ کام فعلِ خواب ہوتا ہے اور یہ کارکردگی تخیل ہی ہے۔ اس طرح خواب اپنے مخرج سے منسلک رہتا ہے۔

خواب بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔

(ا) سوتے وقت کے خواب Night Dreams

(ب) عالمِ بیداری کے خواب Day Dreams

سوتے وقت کے خواب کبھی بڑے سادہ ہوتے ہیں۔ کبھی بڑے پیچیدہ کبھی استعاراتی۔ کبھی رمزیاتی اور کبھی اتنے تمثیلی کہ اصل اساس معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کی مثالیں دینے کے لئے بڑی توضیح کی ضرورت ہے اور بڑی احتیاط کی۔ کوئی شخص بھی جب تک نئے سرے سے ان پر تجربہ نہ کرے یہ ناممکن ہے کہ وہ مغربی تعبیرات سے متاثر نہ ہو جائے۔ بہرحال اس ناگزیر موقع کے لئے ہم ایک مثال لیتے ہیں۔

ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ اس کے سینے سے ایک پیڑ پھوٹا اور اس کی شاخیں چاروں طرف پھیلنا شروع ہوگئیں اور بڑی دُور تک سایہ ہو گیا اس کے حالات کی روشنی میں تجزیہ کیا گیا کہ وہ ہمیشہ یہ خواہش کرتا رہا تھا کہ وہ ایک کامیاب ڈاکٹر بن جائے اور عوام کی پُرخلوص خدمت کر سکے۔ یہاں جو تعلیم اور استعارہ پوشیدہ ہے وہ قابلِ غور ہے۔ اور یہی وصف ملک العوینہ کے خواب میں بھی ہے۔

عالمِ بیداری کے خواب وہ ہوائی قلعے ہوتے ہیں جو ہم اکثر بنایا کرتے ہیں اور الند میں کھو کر ہم اکثر یہ محسوس کرنے لگتے ہیں جیسے وہ سب کچھ واقعی ہو رہا ہے جیسے ہم حقیقتاً خواب دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ یہ خواب بڑے سادہ ہوتے ہیں۔ بے ربط اور لاشعوری بھی۔

ان دو خوابوں کے علاوہ الہامی خواب بھی ہوتے ہیں جنہیں Orac کہتے ہیں۔ اس کی مثال میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خواب پیش کیا جا سکتا ہے مگر بہت ممکن ہے کہ اسے Mythological یا دیومالائی کہہ کر ٹال دیا جائے۔ اس لئے زمانہ حال کے ایک اور ماہر خواب کا حوالہ دینا ضروری معلوم ہو رہا ہے۔ یہ ہے Durant جس نے اپنے ہر خواب کو قلمبند کرنا شروع کر دیا اور پھر اس نے یہ دیکھا کہ اس کے ماضی کے بہت سے خواب حرف بہ حرف حقیقت بن کر پیش آ رہے ہیں۔ اس کے ان تجربات سے اگر چشم پوشی نہ کی جائے تو ہم ماننے کے لئے مجبور ہو جائیں گے کہ خواب تخیل سے ماورا بھی ہوتے ہیں اور بعض اوقات مستقبل کی دید بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح ہر خواب پر لاشعوری ہونے کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ الہامی خواب پہلی قسم کے بھی ہو سکتے ہیں اور دوسری قسم کے بھی یعنی سوتے وقت بھی واقع ہو سکتے ہیں اور عالمِ بیداری میں بھی۔

تخیل اور خواب کا نفسیاتی جائزہ لینے کے بعد اب مذکورہ مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں جو دراصل اس خامہ فرسائی کا محرک ہوا ہے۔ شاعری کیا ہے ادبی تعریفوں سے ہٹ کر انسانی دماغ اور اس کے عمل کی روشنی میں متعین کیجئے۔ کیا یہ تخلیقی تخیل کے جمالیاتی عنصر کی پیداوار نہیں؟ کیا یہ حافظہ، تخیل، تصور اور جذبات وغیرہ سے ہٹ کر وجود میں آ سکتی ہے؟ شاید کبھی بھی نہیں اسی وجہ سے اسے تخیل سے ماوراء نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ہر حال میں تخیل کی پابند رہے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح خواب تخیل، حافظہ اور تصور کے پابند رہتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ خواب حروف و الفاظ کا جامہ نہیں اوڑھتے لیکن شاعری اب آج کل، اسی پیرہن میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس مباحثہ سے قطع نظر کر کے کہ دورِ تحریر سے قبل شاعری زبانی ہوتی تھی۔ ہمیں یہ ضرور پیشِ نظر رکھنا ہے کہ ہمارے حروف تہجی اور اسی طرح تمام دوسری زبانوں کے حروف محض علامات (Symbols) ہیں۔ یہ انسان میں فطری طور پر نہیں پائے جاتے ہیں بلکہ وہ انہیں سیکھتا ہے۔ چنانچہ یہ ایک مسلمہ انگریزی بات کہی جاتی ہے کہ ایک چینی شیر خوار کو اس لئے پالا پوسا جائے کہ جب وہ بڑا ہوگا تو اس سے چینی زبان سنی جائے گی۔ یہ اکتسابی عادت ہے اور ایک فرد اپنے تمدن اور ماحول کے مطابق ان حروف کے ساتھ وہی تلازمات کرتا چلا جاتا ہے۔ جو اس کے ماحول کے دوسرے افراد کے ذہنوں میں ہے۔ اب جبکہ حروف و الفاظ اکتسابی عادت کا ثمرہ ہیں اور حافظہ، تصور اور تخیل فطرت انسانی، تو یہ باور کرنے میں دقت نہ ہوگی کہ اوّل الذکر ضمنی شئے ہے اور آخر الذکر مبنا دی۔

جہاں تک عام مشاہدہ کو دخل ہے یہ تصور بڑا محال سا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شاعر محض الفاظ اور حروف کی وجہ سے شعر کہتا ہوگا اور اس کے ذہن میں کسی قسم کا تخیلاتی یا تصوراتی نقش نہ ابھرتا ہوگا۔

خواب کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ حافظہ کی وہ تصویریں ہیں جو کسی خارجی

حقیقت سے ماخوذ معقول قوانین کے مطابق ترتیب نہیں پاتیں۔ خواب نہ تو سوچا سمجھا فکر ہے اور نہ معقول احساس، بلکہ اپنی ترکیب میں جملہ معقول لوازمات سے آزاد ہوتا ہے۔ اور ایک غیر سماجی چیز ہے۔ لہٰذا خواب کی دنیا ایک ذاتی دنیا ہے۔" احتیاط کے منافی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اظہار خیال فرائڈ کے نظریۂ خواب سے متاثر ہو۔ لیکن ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اسے غیر سماجی مانتے ہوئے اسے بالکل ذاتی اور معقولیت سے آزاد نہیں ٹھہراتا۔ اُس نے خواب کو لاشعور کے لامحدود قوت والے گرز سے مسلح کیا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ پر مسلط کر دیا ہے۔ اور اسی بنا پر وہ سمجھتا ہے کہ ہمارے سارے سماجی افعال لاشعور کے خوشہ چیں ہیں۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اُس کے نظریات سے ہٹ کر سوچیں تو بھی الہامی اور مستقبل سے منسلک خوابوں کے بارے میں یہ مسالہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ رہ گئے وہ خواب جو الہامی نہیں ہیں تو اُن کے بارے میں بھی یہ جان لینا ضروری ہے کہ خواب ہماری بہت سی شعوری بندشوں سے آزاد ہونے کے باوجود ہمارے تجربات کا ہی سہارا لیتے ہیں اور انہیں تجربات کو سیمنٹ کر شاعری فکر نو پیش کرتی ہے۔ شاعری جس شعوری ذہنی عمل سے متعلق ہوتی ہے وہ بھی نرا تخئیل ہوتا ہے وہ بھی من و عن واقع نہیں ہوا ہوتا ہے بلکہ ہمارا ذہن ویسا کچھ تصوراتی مشاہدہ کر لیتا ہے اب فرق دونوں میں صرف افادیت کا ہوتا ہے۔ خواب ہمارے مرکزی اعصابی نظام کے لاشعوری طور پر کام کرتے وقت وقوع پذیر ہوتے ہیں اس لئے جب تک شعور میں آنے کے بعد وہ حفظ نہ رہیں اور اُن سے استفادہ قطعی شعوری طور پر نہ کیا جائے ان کی افادیت نہیں ہوتی لیکن شعر کی افادیت ایک خاص تقاضے کی وجہ سے پہلے ہی سے پیش نظر رہتی ہے خواہ وہ کسی لفظ کو بہتر طور پر استعمال کرنے کے لئے ہو یا کسی قوم کو انسانیت کی بلندیوں تک لے جانے کے لئے ہو۔

مرکزی اعصابی نظام کے لاشعوری طور پر کام کرنے کے قطعاً یہ معنی نہیں ہیں کہ خواب کی سطح کے نیچے وہ جبلی خواہشات ملیں گی جو بالکل لاشعوری ہوتی ہیں۔ جبلت اندھا دھند چیز ہے اور جب تک وہ لاشعوری رہتی ہے اپنے اندر کوئی تغیر قبول نہیں کرتی۔ جبلت کی وضاحت میں اس وقت صرف اس پر ہی اکتفا کرنا ہے کہ یہ وہ حیوانی یا حیاتی افعال ہیں جو قدرت نے انسان میں ودیعت کئے ہیں۔ مثلاً دل کی حرکت، آنکھ کا فعل وغیرہ۔ اس پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ میں "شعور و لاشعور" (معیار دسمبر ۵۲ء) میں لکھ چکا ہوں اس لئے تکرار سے گریز کرتا ہوں بہتر ہوگا کہ اس مضمون کو دیکھ لیا جائے — اگر یہ جبلی یا حیاتی افعال اندھا دھند ہیں تو پھر ہمیں فرائڈی مریضانہ نظام حیات پر ایمان لانا ہوگا۔ لیکن ہم جو تعمیر[1] اور صحتمندی پر ایمان رکھتے ہیں خالق کائنات کو اس طرح مطعون نہیں کر سکتے۔ اور مغربی ماہرین نفسیات میں شاید ہی آج کوئی سرے سے وجود انسانی کو نسلی مریض (Heriditical Patient) ماننے کے لئے تیار ہو۔

ہمارا لاشعور اُن تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے جو ہماری زندگی میں پیش آتے ہیں۔ اگر ہم کسی ناقص ماحول میں پروان چڑھ رہے ہیں تو یہ ازبس ضروری ہے کہ ہمارا سوچنے کا طریقہ اور ہمارے تخئیل کا دائرہ بھی ویسا ہی ہو لیکن اگر ہمارا[2] دو پیش اس کے برخلاف ہے تو یہ ناممکن ہے کہ ہم تب بھی اس میں سے وہ حاصل کر لیں جو اس میں نہیں ہے۔

اب جب ہم اپنے لئے ایک سماجی حلقہ منتخب کر لیتے ہیں تو وہ ہمارے خوابوں میں بھی دخیل ہو جاتا ہے اور اُس کی نسبت سے ہم خواب بھی دیکھتے ہیں چنانچہ فرائڈ کے مریضوں کے حالات پر نظر ڈالئے مغرب کی جنسی انارکی سے ان میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں اور اسی وجہ سے فرائڈ نے بھی جنس کو ہی اساسی جبلت بنا لیا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنی زندگیوں کو ایک منضبط نظام زندگی کے حوالے کر دیں اور اپنے لئے وہ عظیم فکری مقام چن لیں جس کی طرف ہمیشہ ہمیشہ سے انسانیت کو بلایا گیا ہے تو یہ ناممکن ہے کہ ہمارا لاشعور اپنا کینڈا نہ بدلے اور اس کا اندھا دھند جبلی "طریقہ تذرطاق نسیاں نہ ہو جائے۔

لاشعور کی اس عملی تبدیلی سے یہ بڑی آسانی کے ساتھ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خواب درحقیقت کوئی لعنت نہیں ہے جس سے گریز کیا جائے بلکہ بنیادی طور پر ایک دماغی فعل ہے اور صرف دماغی فعل ہی میں علاج جس چیز کا کرنا ہے وہ اپنا ماحول، اپنا طرز فکر اور نظام زندگی ہے۔ اگر یہ سب کچھ

---

[1] سید محمد کبیر صاحب تعمیر پسند نہیں۔ بلکہ ترقی پسند ہیں۔ (ادارہ) [2] ماحول ہم پر فطری طور پر مسلط نہیں ہوتا بلکہ قدرت نے ہمیں انتخاب ماحول کا اختیار دیا ہے۔ قرآن پاک میں اس حقیقت کا تین ثبوت ہے ۱ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا یعنی نفس انسانی کو خدا نے برائی اور بھلائی کی واقفیت الہامی طور پر عطا کر رکھی ہے۔ اس طرح ایک بار جب ایک فرد خود کو ایک مخصوص ماحول کے سپرد کر دیتا ہے تو وہ اس کی شعوری و لاشعوری تمام کیفیتوں پر حاوی ہو جاتا ہے اور جب تک اس کو توڑتا نہیں اس کے پھندے سے نہیں نکلتا۔

اعلیٰ اقدار کی طرف بڑھ جاتے ہیں تو خواب کے لئے بھی ناگزیر ہے کہ وہ اپنا دائرۂ عمل بدل دے۔

یہ حقیقت ہے کہ "شعور شعوری بلندی سے نازل ہوتا ہے اور اس لئے جانی بوجھی اور تخلیقی چیز ہے۔" لیکن "جذبات کی فلمروے خواب سہم کر گریز کرتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ خواب دیکھنے والا بیدار ہو کر عمل کی دنیا میں قدم رکھ لے۔" تحلیل نفس کے استدلال سے تو صحیح ٹھہر سکتا ہے مگر طبعی نفسیات اس پر ایمان لانے کے لئے تیار نہ ہوگی۔ خواب جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے مرکزی اعصابی نظام کا لاشعوری فعل ہے اپنا کوئی انفرادی وجود نہیں رکھتا۔ نیند کے دوران میں وہ ہر وقت واقع ہوتا رہتا ہے۔ خواہ خواب خرگوش ہو یا نیم بیداری! البتہ نیم بیداری کے خوابوں کو ہم یاد رکھ پاتے ہیں، اور غفلت کی نیند کے خواب بے انتہا سعی و کاوش کے بغیر محفوظ نہیں رہ پاتے۔ اب اگر نیم بیداری کے خوابوں کو حرف ملامت بنایا جائے تو بھی یہ فراری اور گریزی" نہیں ہیں۔ قدرت نے ہر چیز میں تدریج رکھی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ایک دم سے سورج نکل آئے اور غڑاپ سے چاند ڈوب جائے بلکہ بڑی ہی آہستگی کے ساتھ روشنی ابھرتی ہے اور پھر کم ہونا شروع ہوتی ہے اور تاریکی پھیلنا شروع ہو جاتی ہے حتیٰ کہ پھر تاریکی میں سفیدی آنگیز ہونے لگتی ہے اور سویرا ہو جاتا ہے۔ یہ تمام نظام یونہی چلتا ہے اور یونہی مفید ہے۔ اگر سردیوں کی انتہائی سردی یکایک شروع ہو جایا کرے اور گرمیوں کی انتہائی گرمی بھی اسی شدت کے ساتھ ایک دم آ جایا کرے تو شاید کوئی ذی روح اس صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہے۔ یہی معاملہ نیند اور بیداری کا ہے۔ انسان کو نیند سے بیدار ہونے کے لئے ایک تدریج درکار ہے خواہ وہ مختصر ہو یا طویل۔ یہ تدریج ہی نیم بیداری کا عرصہ ہوتا ہے جس میں وجود کے خارج کے محرکات بھی خواب میں شامل ہو جایا کرتے ہیں۔ ریوند نے اس سلسلہ میں کافی تجربات کئے ہیں اور اس نے ثابت کیا ہے کہ کیونکر نیم بیداری کی حالت میں خارج بھی خواب میں شامل ہو جاتا ہے۔ مثلاً۔

> ایک فرد نیم بیداری کی حالت میں ہے الارم کی گھنٹی سنتا ہے اور وہ خواب دیکھتا ہے کہ وہ اسٹیشن پر کھڑا ہے کہیں جا رہا ہے سامان بندھا ہوا رکھا ہے اور لوگ بڑی عجلت کے ساتھ اِدھر اُدھر آ جا رہے ہیں۔ گاڑی کے آنے کا آخری سگنل ہو رہا ہے۔ یہ گھنٹی اسی کی ہے۔

خارج کے محرک کا خواب میں یوں ضم ہو جانا کیوں ہوتا ہے؟ صرف اس لئے کہ تدریج قایم رہے لیکن اس تدریج کو فرائڈ فراریت کہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی تاویل ایسی بھی کی جا سکتی ہو۔ مگر یہ تدریج۔ تدریج ہی رہے گی۔ اب اگر کسی طرح یہ تدریج قائم نہ ہو تو یہ لازمی ہے کہ فرد کے دماغی نظام اور صحت پر اس کا اثر پڑے۔ اس لئے یہ ایک قسم کی تحفظی تدبیر ہے جو اس حکیم و بصیر نے ہم میں رکھی ہے۔

یہاں بیداری کے خوابوں کے بارے میں سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ اگر نیند کے خواب تحفظی تدبیر ہیں تو دن کے خواب کو کیا کہا جائے گا۔ اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے یہ تبدیلی تو جب **Fluctuation of Idea** کی انتہائی حد ہے اور تخیل کا مریضانہ حد تک بڑھ جانا ہے۔ مضمون کی طوالت کے خوف سے تبدیلی توجہ پر تفصیلی گفتگو موزوں نہ ہوگی مگر اس قدر جان لینا ضروری ہے کہ ہماری توجہ مسلسل ایک طرف مرکوز نہیں رہتی ہے بلکہ چند ایک لمحوں کے بعد وہ دوسری طرف ہٹ جاتی ہے اور یہی **Fluctuation of Ideas** ہے۔ اب اس تبدیلی میں جب انسان دوبارہ اصل شے کی طرف جلد متوجہ نہیں ہو پاتا تو تخیل اس کو اپنے گرد و پیش سے پرے دلکیل لے جاتا ہے۔ یہی خواب بیداری ہے اور یہی نقص ہے یا مرض ہے۔

ان تشریحات کے بعد شاعری محض تخیلی ہونے کی وجہ سے مورد عتاب نہیں ٹھہرتی۔ بلکہ اگر وہ تخیل کی امداد سے وجود میں نہیں آ سکتی تو وہ کسی اور طرح بھی تخلیق نہیں پا سکتی۔ وہ خواہ خارجی حقیقتوں سے متاثر ہو یا داخلی لیکن تخیل اس میں دخیل ضرور رہے گا۔ پھر خاص کر واقعاتی نظمیں تو تخیلی کیا صرف تصوراتی ہی ہوتی ہیں جو کشش کی نظم "ریل کا سفر"۔ مجاز کی نظم "ایک نرس کی چارہ گری" وغیرہ محض تصوراتی ہی تو ہیں۔

جہاں تک خارجی حقیقتوں سے شاعری کے متاثر ہونے کا تعلق ہے یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شاعری کے لئے صرف خارجی حقیقتوں ہی سے متاثر ہو جانا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی اور تقاضے ہیں۔ ہمارا خارج بالکل معصوم نہیں ہے اور اس حقیقت کو تو ہمارے اشتراکی دوست بھی بڑی شدت کے ساتھ جدلی عمل کے تحت مانتے ہیں کہ خارج ہر وقت مزاحم رہتا ہے۔ اب اگر کسی طرح یہ بات ذہن میں جڑ پکڑ گئی ہے کہ خارجی حقیقتوں پر تکیہ کرنا متحسن ہے تو ہیگل اور مارکس سے بغاوت کرنی ہوگی۔ پھر فرائڈ بھی تو خارج کو قوی اور حقیقی نہیں مانتا وہ تو اسے صرف لاشعور کی امتناعی اور ارتقائی شکل مانتا ہے۔ اس طرح ہر مفکر کچھ نہ کچھ اختلاف کے ساتھ یہ مانتا ہے کہ ہمارا خارج جسے مذکورہ مقالہ میں سماجی کہا گیا ہے معصوم عن الخطا نہیں ہے۔ اور جب وہ بے داغ نہیں ہے تو مطمح نظر بننے کے لائق بھی نہیں ہے۔

تخئیل و تصوّر کے سلسلہ میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ یہ فرد کے مزاج، طبع، مذاق اور اختراع سے محفوظ نہیں رہتے یا دوسرے الفاظ میں ہر تخئیل و تصوّر فرد کے احساس، جذبہ اور تفہیم سے متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک ہی شے کبھی پسندیدہ ہوتی ہے اور کبھی ناپسندیدہ اور ایک ہی چیز کو ایک فرد حسنِ قبولیت دیتا ہے اور دوسرا ناقابلِ توجہ یا ناقص قرار دیتا ہے۔ یہ تنوع فطری ہے اور اس کو کسی "مشین" سے فنا نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ سماجی ہو یا خارجی۔ جوشؔ نے سیف و سبو کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

. . . . انسان اتنا حیرت ناک اور پیچیدہ حیوان (؟) ہے کہ کوئی شخص، خواہ وہ کتنا ہی طبّاع و ذہین کیوں نہ ہو۔ ثبات عقل و فکر کی موجودگی میں یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ اُسے اپنی ذات کی معرفتِ تام حاصل ہو چکی ہے ؎

ہمارے حال کو دُنیا بھلا کیا جان سکتی ہے!
بسا اوقات جب ہم خود غلط اندازہ کرتے ہیں!

بہرحال یہ حقیقت اب بے نقاب ہو چکی ہے کہ ہمارے خارج میں جو کچھ وقوع پذیر ہے اس میں سے صالح و اصلح منتخب کرنے کے لئے ہمیں اپنے احساس، جذبہ اور تفہیم سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ اور یہ انسان کے بس کا نہیں[1] ہے۔ اسلئے ہمیں کسی ایسی ہستی کے فیصلوں پر بھروسہ کرنا پڑے گا جو ان فطری لغزشوں سے بری ہو۔ اس کے لئے خارج اور داخل کا سوال نہ ہو۔ خواب و شعور کی بندش نہ ہو۔ جس کی ذات ازلی دابدی ہو اور جس کے ناقد نکردہ اصول ازلی دابدی ہوں۔ اور جس کے اختیار میں کائنات کا ذرّہ ذرّہ ہو۔ اب اس کے متعین کردہ ضوابط سے ہٹ کر جو تخلیق بھی پیش کی جائے گی خواہ وہ کتنی ہی شعوری اور خارجی و سماجی کیوں نہ ہو تخریبی ہو گی۔ چنانچہ "شاعرِ انقلاب" کا "شعوری" اور "سماجی" پروگرام دیکھئے۔

اے شخص! اگر جوشؔ کو تو ڈھونڈھنا چاہے
وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا
اور صبح کو وہ ناظرِ نظّارۂ قدرت
طرفِ چمن و صحنِ بیابان میں ملے گا
اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی
شہر ہنر و کوئے ادیباں میں ملے گا
اور شام کو وہ مردِ خدا، رندِ خرابات
رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملے گا
اور رات کو وہ خلوتیٔ کاکلِ درخسار
بزمِ طرب و کوچۂ خوباں میں ملے گا
اور ہو گا کوئی جبر، تو وہ بندۂ مجبور
مُردے کی طرح خانۂ ویراں میں ملے گا

صاحب پروگرام ایک وقت جس سے گریز کرتا ہے دوسرے لمحہ اُسی میں ملوث ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس میں اتنا شعور بھی نہیں ہے کہ وہ مردِ خدا اور رندِ خرابات میں امتیاز کر سکے۔ یہی جذباتیت ایسے افراد کو احساس کمتری سے بھر دیتی ہے کہ وہ جبر کے سامنے بے دست و پا ہو کر بندۂ مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی لاتعداد شعوری شاعری کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جو سماجی ہونے کے باوجود خواب کی تخریب سے زیادہ مزر اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اور اس کے برخلاف ایک واضح راہ پر چلنے والے مردِ میدان کا ہر لفظ ایسی تاویلات سے پاک ہوتا ہے کہ جن کا سہارا لے کر بے نیازِ بصارت اپنے لئے ایک حیلہ و بہانہ تراش لیتے ہیں۔ جو کبھی خواب کو فراری قرار دے کر فراریت سے خائف ہونے لگتے ہیں۔ کبھی لاشعوری تنومندی بخش کر مجبور و مجموس ہو جاتے ہیں۔ مگر ایک صحیح نصب العین رکھنے والا ان "بدروحوں" سے نہیں جھجکتا وہ ہر لمحہ اور ہر وقت، تضاد اور انتشار سے پاک ہو کر ایک ہی راہ کی طرف نظر رکھتا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو روسو Russeau کا نظریۂ رائے عامہ General will

ترجمہ: شمسی رحمانی اعظمی
جان میک مرے

جدلیاتی مادیّت بہ حیثیت فلسفہ

جدلیاتی مادیت کے فلسفہ سے جو اختلاف ظاہر کیا جاتا ہے یہ وہ اختلاف نہیں ہے۔ جو میں رکھتا ہوں، یہ بات نہیں ہے کہ میں اشتراکیت کے فلسفہ پر ایمان رکھتا ہوں۔ بلکہ میں اس سے ان معنوں میں مخالفت نہیں کرتا جن معانی میں میں اور فلسفوں سے کرتا ہوں لیکن جدلیاتی مادیت کے فلسفہ میں کچھ بنیادی باتیں ایسی ہیں جو ان تمام نظام ہائے فلسفہ سے الگ ہیں، جن کو میں جانتا ہوں۔ اس فلسفہ نے خود دنیائے فلسفہ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اس انقلاب کو میں جانتا ہوں۔ اور اس وجہ سے میں اشتراکیوں کے ساتھ ان تمام نظام ہائے فلسفہ کا مخالف ہوں۔ جو آج کی دنیا میں معبود بنے ہیں یہ ماننا ہوں کہ فلسفہ کو ایک نئی بنیاد پر پھر سے بنانا چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جدلیاتی مادیت کے فلسفہ میں بہت سی ایسی باتیں موجود ہیں۔ جن کی وہ خود تردید کرتا رہتا ہے۔ اس نے بہت سی باتیں ایسی لے لی ہیں جن کو اسے نہیں لینا چاہئے تھا۔ باوجودیکہ وہ ہمیشہ انقلابی نعرے لگایا کرتا ہے۔ میں جدلیاتی مادیت کا مخالف ہوں اس لئے کہ اس نے بہت سی باتیں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے فلسفے سے لے لی ہیں۔ جس کی وہ مخالفت کرتا ہے۔

اب میں اس بات کی طرف آنا چاہتا ہوں جس کا میں متفق ہوں۔ میں اس کو اس طرح کہہ سکتا ہوں کہ جدلیاتی اور تاریخی مادیت کا فلسفہ وہ فلسفہ ہے جو ہر اس رشتہ میں یقین رکھتا ہے۔ جو کسی فلسفہ اور اس کی معاشری کیفیت میں، (جس میں کہ وہ ابھرا ہے) ہوتا ہے۔ کوئی بھی نظام فلسفہ، محض اس وجہ سے کہ وہ کسی خاص ماحول کے درمیان ابھرتا ہو۔ اپنے عمومی تصوّر کے لئے اس ماحول کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان دو نظام ہائے فلسفہ میں جو ایک ہی ماحول میں ابھرے ہیں۔ کافی فرق ہو سکتا ہے۔ مگر اس قسم کے تمام نظام ہائے فلسفہ میں ایک ظاہری تعلق، یا مشترک خیالات اور اصولوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ جو ایک ماحول یا ایک ہیئت اجتماعیہ ہی سے ابھرتے ہیں۔ جدلیاتی مادیت اور دوسرے حالیہ نظام ہائے فلسفہ میں جو فرق ہے۔ وہ بس اتنا ہی کہ جدلیاتی مادیت اس حقیقت کو سمجھتی ہے۔ دوسرے نظام ہائے فلسفہ اور جدلیاتی مادیت کے فرق کی کنہ ان معاشرتی حالات کی بناوٹ میں نہیں ہے جن میں متفرق فلسفہ جات کی نشوونما ہوتی ہے۔ بلکہ اس بات میں ہے کہ جدلیاتی مادیت اس حقیقت سے باخبر ہے۔ اور دوسرے فلسفہ جات نہیں ہیں۔ اس امتیاز کی اہمیت سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ جو فلسفی اپنے تصورات کے باہر معاشرتی حالات کی بناوٹ سے باخبر نہیں ہے، یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی طرح حقیقت کو پالے گا۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ جن معاشرتی کیفیات کے تحت وہ زندگی گذار رہا ہے۔ اور خاص طور پر وہ نفسیاتی کیفیات جو اس کے معاشری حالات کی بنا پر اس کے اندر پیدا ہو گئی ہیں۔ اس کے سوچنے کے انداز پر کوئی اثر نہیں رکھتیں، اور کسی طرح بھی اس کے تصورات کی بناوٹ اور اس کی یقینیات کو نہیں طے کرتیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی خاص اصول سے شروع کر سکتا ہے (ایسے اصول سے جو مانا ہوا ہے) چاہے وہ ان حالات کو سمجھے یا نہ سمجھے۔ جن میں وہ خود ہے۔ اور اس کو صرف اپنے خیالات کو صحیح منطقی طریقہ و استدلال کے ساتھ بڑھاتے رہنا چاہئے۔ اس طرح وہ ایک مکمل فلسفہ کو ترتیب دے سکتا ہے جو ہر معاشرہ کے لئے کسی بھی زمانے میں کام آ سکتا ہے لیکن اگر وہ اس بات کو جان لے کہ اس کے خیالات کی بناوٹ اسی انداز پر متعین کی جانی چاہئے۔ جس انداز پر ہیئت اجتماعیہ، معاشرتی اور نفسیاتی حیثیت سے چل رہی ہے۔ تو دنیا ایسے فلسفہ کے خیال ہی کو لغو سمجھے گی۔ مگر خالص فلسفہ کا تصوّر۔ جس کا اپنا الگ ماحول اور اپنی الگ کیفیت ہونا ممکن ہے۔

ایک ایسا فلسفہ جو اپنے معاشرتی حالات سے واقف ہو جیسے کہ جدلیاتی مادیت۔ فوراً اپنی توجہ اپنے وقت کے ضروری مسائل کی طرف پھیر

دیتا ہے۔ ایک فلسفی جو ہیئتِ اجتماعیہ کی اہمیت جانتا ہے۔ اپنا فلسفہ کسی ایک نقطہ سے شروع نہیں کرسکتا۔ وہ ان بنیادی مسائل کو دریافت کرتا ہے جو کسی قوم میں اس وقت موجود ہوتے ہیں۔ اور وہاں سے وہ شروع کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایسے فلسفی کا پہلا کام حال کی ہیئت اجتماعیہ کے مسائل کو سمجھنا۔ اور پھر اپنے مقصد کی طرف بڑھنا ہوتا ہے۔ کوئی دوسری راہ مناسب اور نہ صرف مناسب بلکہ عقلی نہیں ہے۔

چونکہ جدلیاتی مادیت کی رو سے موجودہ یورپ کا مسئلہ ایک مادی مسئلہ ہے۔ کم سے کم نشاۃ ثانیہ کے وقت سے لے کر اب تک یورپ کی ہیئتِ اجتماعیہ کا خاص اور ضروری مسئلہ اقتصادی مسئلہ ہے۔ اسی محور پر یورپ کی دنیا گھوم رہی ہے۔ چاہے اس کو آپ مانیں یا نہ مانیں۔ تواریخ نے موجودہ دنیا کو اس کے اہم ترین کام کی حیثیت سے مادی دنیا کو تابو میں لانے کا مسئلہ سپرد کیا ہے۔ معاشری حالات سے باخبر ہونے کے بعد فلسفہ موجودہ فلسفی کو یہی نتیجہ نکالنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ نقطہ ظاہر ہے۔ اس چیز پر عقلی حیثیت سے سوچنے پر ہمیں معلوم ہوگا کہ انسانیت جدید دنیا کا عطیہ سائنس کی تخلیق ہے۔ کیونکہ سائنس اور اس کا نشوونما اس معاشرتی مسئلہ کا صرف عقلی رخ ہے۔ اس مسئلہ کا صحیح حل سائنس کا استعمال یعنی مشینوں کی ایجاد ہے۔ اسی وجہ سے جدلیاتی مادیت خود کو مادیت کہتی ہے۔ مادیت عام مفہوم میں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ عام مفہوم میں مادیت کے معنی یہ مشینی دور ہے۔ اور جدلیاتی مادیت اس کے خلاف ہے مگر اس کو اس حیثیت سے تسلیم کرتی ہے کہ یہ موجودہ دنیا کو سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ یہ ہے کہ سائنس کو ترقی دے کر سائنس کے ذریعہ اقتصادیات کو قابو میں لاکر انسانیت کو آرام پہنچایا جائے۔ مادیت کے معنوں میں جو امتیاز ہے اسے سمجھ لینا چاہئے۔ جدلیاتی مادیت کسی معنی میں مشینی مادیت یا مشینی فلسفہ نہیں ہے یہ حقیقت میں جدلیاتی حقیقت پسند (Dialectical Realism) ہے۔ اس کی مادیت کا سب سے ضروری نقطہ یہ ہے کہ جدید دنیا کا سب سے اہم مسئلہ مادیت ہے۔ اس لئے ہر فلسفہ کو یہیں سے شروع ہونا چاہئے۔

یہیں پر جدلیاتی مادیت نے ایک بنیادی غلطی کی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ مادی مسئلہ ساری دنیا کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ یا کم سے کم اس مفہوم میں کہ موجودہ یورپ کا سب سے اہم مسئلہ یہی ہے اسی نقطۂ آغاز کو عمومی قرار دینا حقیقت میں اس انقلابی نقطۂ نظر کا انکار ہے جس سے کہ جدلیاتی مادیت شروع ہوتی ہے۔ اور جو اس کی خصوصیت ہے۔ یہ اس حقیقت کو جھٹلانا ہے کہ فلسفہ کا ہی اپنے وقت کے ماحول سے متعلق رہنا ضروری ہے۔ یہ بالکل وہی حرکت ہے۔ جس کے کرنے کی شکایت وہ تمام حالیہ فلسفہ جات کے بارے میں کرتی ہے۔ اس غلطی کا اثر کمیونزم کے عملی کام پر فوراً پڑتا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ چونکہ روسی جمہوریہ کی معاشرتی حالت اس سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ یورپی حکومتوں سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس لئے وہ نظام فلسفہ جو روسی جمہوریہ کے باشندوں کے لئے درست ہے۔ یقیناً یورپ میں ناکام ہوگا۔

دوسرا نقطہ جس پر ہمیں سوچنا ہے وہ ہے کہ جدلیاتی مادیت کا تعلق دوسرے نظام ہائے فلسفۂ جدید سے کیا ہے؟ یورپی فلسفہ کی نشوونما کا واضح تعلق اس عمومی کوشش سے ہے۔ جو زندگی کی مادی کیفیات کو قابو میں کرنے کے بارے میں تھی۔ وہ خاص ذریعہ جس کی یورپ میں نشوونما ہوئی ہے۔ سائنس ہے۔ اگر ہم سائنس کی نشوونما کا تجزیہ کریں۔ تو اس کے تین ادوار متعین کئے جاسکتے ہیں۔ پہلے دور میں سائنس براہ راست ان قوانین کی دریافت کرتی ہے جو مادیت پر حاوی ہیں۔ دوسرے دور میں سائنس کی توجہات کا مرکز مادی دنیا سے ہٹ کر نباتی (Organic) دنیا ہو جاتا ہے اور جو کہ ایک طویل عرصے میں میں سائنسی حیاتیات (Scientific Biology) کو نشوونما دیتا ہے، ابھی جلد ہی ہم نے تیسرے دور کا آغاز دیکھا ہے۔ جس کا ایک اہم جزو سائنسی نفسیات (Scientific Psychology) کی پیدائش ہے۔ انیسویں صدی خاص طور سے حیاتیاتی صدی (Biological century) ہے۔ اس کے فلسفہ جات پر ارتقاء اور نشوونما کے تصورات غالب ہیں۔ اس کی ذہنیت مسائل کو ایک تاریخی انداز میں سمجھنے کی ہے۔ یعنی فلاں چیز کہاں سے آئی اور کیسے بنی۔ اس کے برخلاف سترہویں اور اٹھارہویں صدیاں ریاضیاتی یا عقلی اندازِ تفکر پیش کرتی ہیں۔

موجودہ یورپ کے فلسفے چونکہ سائنس کے نشوونما کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ دو واضح حصوں میں تقسیم ہوسکتے ہیں۔ پہلا گروہ کارتیسی (Cartesian) فلسفوں کا ہے۔ جن کی وسعت نظر مادی دنیا تک محدود ہے۔ اور دوسرے گروہ میں وہ فلسفے ہیں جو نباتی دنیا سے زیادہ متاثر ہیں۔ اس میں کوئی شبہ

نہیں کہ اب تیسرا گروہ بھی پیدا ہو جائے گا۔ جو اپنے میدانِ فکر کو انسانی شخصیت تک محدود رکھے گا۔ بہرحال اب تک کوئی نظامِ فلسفہ سائنسی نفسیات سے متعلق پیدا نہیں ہوا ہے۔ اگرچہ کوششیں جاری ہیں۔ جدلیاتی مادیت خاص طور پر حیاتیاتی فلسفہ ہے۔ جو انیسویں صدی کے مسئلہ ارتقاء سے متاثر ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے یہ اسی گروہ میں آجاتی ہے۔ جس میں ہیگل (Hegel) کی حقیقت پسندی (Realism) اور پروفیسر الگزنڈر کی آئیڈیلزم (Idealism) ہے۔ ان تمام نظام ہائے فلسفہ میں ایک بات مشترک ہے ——— ان کا میدانِ تفکر تجرباتی (Experimental) اور حیاتیاتی یا ارتقائی سائنس ہے۔ یہ کارتیسی نظام ہائے فلسفہ سے بہت مختلف ہیں۔ جو ریاضیاتی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے کچھ نتائج ہیں جو ہمارے مقصد کے لئے ضروری ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ایک نامیاتی فلسفہ ضروری طور پر نشوونما کے تصور کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ کارتیسی فلسفہ پر اس طرح اعتراض کرے گا کہ اس کے پاس ۔ تاریخی مواد نہیں ہے۔ اور یہ انسان کے تجرباتی نشوونما کو سمجھنے میں ناکام رہتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس کا اکائی (unity) کا تصور ہمیشہ بہت سی نامیاتی چیزوں کا مجموعہ ہوگا۔ نامیاتی چیزیں (Organism) اس (unit) یونٹ کو کہتے ہیں۔ جو اپنا ہر کام صرف ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے اور ہیئتِ اجتماعیہ میں کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی بھی حیاتیاتی فلسفہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کو ایک ترقی کرتی ہوئی اکائی سمجھے گا۔ اس کا رجحان ادھر ہوگا کہ ہر فرد صرف سوسائٹی ہی کے لئے زندہ رہتا ہے اور سوسائٹی کے باہر اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ کیونکہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حیاتیات میں نسل (Species) ہی ایک اکائی (unity) ہوتی ہے نہ کہ وہ افراد جو اس کو بناتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک جانور یا پودا ہرگز کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ اپنی نسل کی زندگی کا مظاہرہ ہے جو کہ ارتقائی منزل میں نشوونما کرتی رہتی ہے۔ اس طرف آپ کی توجہ مبذول کرانے کی وجہ یہ ہے کہ جب اس قسم کا کوئی فلسفہ اپنے تصورات کو حیاتِ انسانی پر لاگو کرنا شروع کر دیتا ہے تو وہ ہمیشہ انسانیت کو گروہوں کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یعنی اس کی نگاہوں میں ان عورتوں اور مردوں کی کوئی اہمیت نہیں جو ہیئتِ اجتماعیہ کو بناتے ہیں۔ بلکہ اہمیت خاص ہیئتِ اجتماعیہ کی ہے جن انسانی اکائیوں کا وہ تصور کرتے ہیں وہ ایک انسان نہیں ہوتا۔ بلکہ قوم، گروہ، یا نسل ہوتی ہے۔ اور وہ اس خاص تعلق کا خیال نہیں کرتے جو ہیئتِ اجتماعیہ اور افراد میں ہے۔ اس طرح ہو نامیاتی فلسفے، اپنے حیاتیاتی نظریات کی بنا پر انسانی زندگی کا وہ پہلو بھول جائیں گے جو اس کو تحت الانسان (Sub Human) زندگی سے الگ کرتا ہے اور انسانی افراد کی امتیازی شان باقی نہ رہے گی۔

اس نقطہ پر ہر چیز مڑ جاتی ہے۔ جدلیاتی مادیت کی رُو سے کسی نامیاتی فلسفہ کا انسانی مسائل کے حل کرنے کا دعویٰ ایک دم مشکوک ہو جاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ وہ فلسفہ جو انسان کی امتیازی خصوصیات کو بلند بتاتا ہے۔ انسان کے مسائل حل کر سکتا ہے؟ یہی نقطہ ہے جو جدلیاتی مادیت پر اس تنقید کا موجب بنتا ہے کہ جدلیاتی مادیت انسان کے حقائق کے ساتھ انصاف کرنے میں ناکام رہتی ہے۔

حیاتیات سائنس کی ترقی کا نقطۂ آخر نہیں ہے۔ اس کا نقطۂ آغاز طبیعیات ہے۔ طبیعیات صحیح طرزِ عمل کے ساتھ ترقی کرتی ہے اور اس کے بعد حیاتیات شروع ہوتی ہے۔ حیاتیات کے بہت بعد نفسیات۔ یہ ترتیب کوئی امر اتفاقیہ نہیں ہے۔ اس کی بنیاد دینا کی توجہ کے مبذول ہو جانے پر ہے۔ جس جس طرف دینا کی توجہ مبذول ہوتی گئی۔ سائنس کے نئے ادوار تخلیق ہوتے گئے۔

اس بات کو مان لینے سے موجودہ جدلیاتی مادیت پر بنیادی تنقید ہوتی ہے۔ بہرحال اس تنقید کو کرتے وقت ہمیں یہ بات بھولنی نہیں چاہئے کہ جدلیاتی مادیت اور دوسرے فلسفہ جات کن کن معنوں میں ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز ہیں۔ امتیاز کی بنیادی وجہ یہی تو ہے کہ جدلیاتی مادیت اس حقیقت سے باخبر ہے کہ تمام تصورات (Thought) معاشرتی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اس حقیقت سے بھی باخبر ہے کہ وہ خود اپنے معاشرتی ماحول سے متاثر ہے۔ اس لئے آپ کو یہ دیکھ کر متعجب نہ ہونا چاہئے کہ ہو سکتا ہے کہ خود اس کی جدلیت معاشرتی ماحول کے بدلنے سے متاثر ہو کر خود اس میں تبدیلی پیدا کر دے۔ اس کو خود اپنی ضد کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

اب اس پر تنقید یہ ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ہر نامیساتی فلسفہ انسانی حیات کے چند بنیادی اصولوں سے صحیح طریقہ پر برتاؤ کرنے میں ناکام رہے جو باتیں کہ نامیساتی فلسفہ نظر انداز کر دیتا ہے یہ وہ ہیں جو انسان کو جانوروں کے اعلیٰ طبقے سے الگ کرتے ہیں۔ اور مختصراً یہیں پر حقیقت میں جدلیاتی مادیت ناکام رہ جاتی ہے۔ یہ ناکامی صرف اس کے فلسفہ میں نہیں ہے۔ بلکہ یہ اپنی عملی اہمیت ان معاشرتی حالات میں رکھتی ہے جو مغربی یورپ میں نشوونما پا رہے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس کی ناکامی ہی فاشیلیت کو ابھرنے میں مدد دے۔ فاشیلی یقین رکھتا ہے کہ کمیونزم آئے گا۔ بالکل اسی مفہوم میں جس میں مارکس (Marx) نے کہا تھا۔ کمیونزم ناگزیر ہے۔ اس صورت میں کہ ایک انقلابی فضا میں مزدور طاقت اپنے ہاتھ میں لے لے" درست ہے۔ ایک فاشیلیت کا مومن جواب دیتا ہے "ہم مزدور طبقہ کو طاقت ہاتھ میں لینے ہی نہیں دیں گے۔ اس کے علاوہ ہم ایسا ماحول پیدا کریں گے جس میں جدلیاتی مادیت کا فلسفہ ابھرے ہی نہیں۔ مارکس ہی نے تو کہا تھا کہ فلسفہ اپنے ماحول کا مرہون منت ہوتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ فاشیلی کا یہ دعویٰ ناکام رہے گا؟ جدلیاتی نشوونما کے نامیساتی طریقہ اور نشوونما کے عقلی طریقہ میں جو کہ نامیساتی طریقوں کو سمجھتا ہے بہت زیادہ فرق ہے۔ نامیساتی طریقے غیر شعوری ہوتے ہیں۔

یہاں پر ہم دوسرے نکتہ پر آتے ہیں۔ جدلیاتی مادیت چونکہ ایک نامیساتی فلسفہ ہے اس لئے وہ مجبور ہے کہ تمام سائنس کی ترقیات اور انسانی حرکات کو غیر شعوری حرکات کہے۔ میں نے غیر شعوری یہاں نفسیاتی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اس کو لاشعوری حرکت بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک لاشعوری حرکت وہ حرکت ہوتی ہے جو انسان کے جذبات یا فطری تصورات (Instincts) سے ابھرتی ہے یہ شعوری حرکات نہ جو دماغ سے پیدا ہوتی ہیں۔ بالکل الٹی ہے۔ جدلیاتی مادیت اس نقطہ پر خود اپنی ہی مخالفت کرتی ہے۔ ایک ہی ساتھ یہ ایک نامیساتی فلسفہ ہے۔ جو شعوری حرکات کو جذبات (Impulses) سے تعبیر کرتا ہے اور اسی وقت یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ اس کا نصب العین انسانی حرکات یا بنی نوع انسان کو غیر شعوری (Impulsive) ماحول سے نکال کر عقلیت اور سائنس کے ماحول میں لے آنا ہے۔ یہی چیز فاشیلیت کو موقع دیتی ہے۔

آیئے اس نکتہ کے دوسرے رخ کو بھی دیکھیں۔ نامیساتی زندگی کا ارتقاء اصل میں نسلوں کا ارتقاء ہے۔ اور ارتقاء تنازع للبقا کے ذریعہ متعین ہوتا ہے۔ جدلیاتی مادیت نے بھی یہ خیال اپنایا ہے۔ اور یہ فلسفہ تاریخ میں طبقاتی جنگ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اقتصادیات کی اصطلاحات میں یہ طبقات ذرائع پیداوار کے اختلافات کی بنا پر بنتے ہیں۔ یہ بات کتنی ہی درست ہو مگر خالص حیاتیاتی نقطۂ نظر سے یہ بالکل غلط ہے۔ فاشلی فوراً زیادہ قدرتی اور حیاتیاتی طبقات پیش کر کے اپنی بات بنا سکتا ہے۔ وہ بھی اپنے فلسفۂ و تاریخ میں طبقاتی جنگیں پیش کرتا ہے مگر یہ طبقات قومیں اور نسلیں ہیں۔ بورژوا اور پرولتاریہ نہیں۔ اس طرح فاشیلیت جدلیاتی مادیت کے فارمولے کو لے کر عوام کے مذاق اور جذبات کو متاثر کرنے والی چیز بنا سکتی ہے۔ اور طبقاتی جنگ کو چھپا سکتی ہے۔ انسانی ذہن قدرتاً قوموں یا نسلوں میں تقسیم ہونا پسند کرتا ہے۔

دوسرے نقاط بھی ہیں۔ مثلاً۔ جدلیاتی مادیت کے تصورات جو مذہب اور فرد کے حقوق کے بارے میں ہیں۔ اپنی حیاتیاتی طریقہ استدلال کی بنا پر فاشیلیت کو راہ دے دیتے ہیں۔ لیکن جدلیاتی مادیت پر میں نے جو تنقید کی ہے وہ میرے خیال میں کافی ہے۔ جدلیاتی مادیت، ایک حیاتیاتی فلسفہ ہونے کی بنا پر قوموں اور نسلوں کے مسائل حل نہیں کر سکتی۔ اور اس کی محدودیت (Limitations) اس کی ضد یعنی فاشیلیت کو راہ دیتی ہے۔

محمد عثمان رمز

غالب کا فلسفۂ نشاط و غم

غالب محض شاعر ہی نہیں بلکہ اعلیٰ مفکر بھی تھا۔ ادب میں فلسفی اور صوفی کی حیثیت سے بھی اس کا ایک مقام ہے۔ اس کے فلسفیانہ تفکرات میں فلسفۂ نشاط و غم ایک خاص مرتبہ کا حامل ہے۔ میں اس مضمون میں اس پر چند صفحات سپرد قلم کروں گا۔

یوں تو تصورِ نشاط بہت ہی قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے لیکن اس کو باقاعدہ نظریہ کی صورت میں پیش کرنے والا مشہور فلسفی ایپیکیورس (Epicurus) ہے۔ اس سلسلے میں دوسرے یونانی مفکرین کے نام بھی آتے ہیں لیکن وہ اتنے ضروری نہیں ہیں۔ ان مفکرین کا نظریہ بس یہ تھا کہ "کھاؤ پیو مست رہو"۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ انسان فطرتاً اپنے لئے زیادہ سے زیادہ خوشی تلاش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک یونانی مفکر سے ایک دوسرے یونانی نے سوال کیا کہ اس شخص کی ذاتی خوشی کیا ہوگی جو کسی دوسرے کے لئے اپنی زندگی قربان کر دیتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ وہ اپنی زندگی کو اگر قربان نہ کرے تو وہی اس کے لئے بار ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ اسے اپنی ذاتی خوشی کے لئے قربان کر دیتا ہے یہ تو ذاتی خوشی (Egoistic Pleasure) کے تصور کا نقطۂ انتہا ہے۔

لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔ اور وہ دوسرا رخ مل (Mill) کے ساتھ ساتھ سامنے آتا ہے۔ اس یوروپی مفکر کا کہنا ہے کہ زندگی کا عین مقصد تلاش خوشی ہے۔ لیکن ذاتی خوشی نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ خوشی زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے یہ تصور روسو (Rousseau) اور رابرٹ اوون (Robert Owen) کے بعد دنیا کے سامنے آیا۔ اس وقت جبکہ ہر مفکر نے نہ صرف فرد یا قوم بلکہ دنیا کے لئے سوچنا شروع کر دیا تھا۔

جب انیسویں صدی میں یوروپ کے اندر یہ نظریہ عام ہو رہا تھا تو غالب دوسرے خطوط پر سوچ و بچار کر رہا تھا۔ مل (Mill) اور اس کے دوسرے ہم عصر مثلاً بنتھم (Bentham) جب مادی نہج پر سوچ رہے تھے تو غالب ایشیائی روحانیت کی شمع جلائے بیٹھا تھا۔ اس میں غالب کی شخصیت کے علاوہ اس کے ماحول کا بھی دخل ہے۔ جہاں تک اس کی شخصیت کا تعلق ہے ہم یہ دیکھتے ہیں۔ کہ وہ ایک عجیب و غریب ہستی ہے۔ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ گو افلاس اور تنگ دستی میں گذرا پھر بھی اس نے ہمیشہ خوش رہنے اور خوش رکھنے کی کوشش کی۔ بلکہ اس کی زندگی کے رکھ رکھاؤ اور تلاش خوشی ہی نے اسے افلاس میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ خود بھی اس سے بے خبر نہیں اس لئے کہ اپنے ایک شعر میں وہ کہتا ہے ؎

قرض کی پیتا تھا مے لیکن سمجھتا تھا کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مگر وہ اسے بھی بھلا دیتا ہے۔ وہ ہنستا ہے اور دوسروں کو بھی ہنساتا ہے وہ خود رونے سے گریز کرتا ہے اور دوسروں کو بھی یہی مشورہ دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو اپنے ایک خط میں وہ کہتا ہے۔

"مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں، بیٹھ بس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتداء شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ۔ مزے اڑاؤ۔ مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا۔" (یا)

فارسی کے ایک شعر میں وہ اپنے خیال کا یوں اظہار کرتے ہیں ؎

عیدِ صبوحی و نشاطِ طرب و زمزمہ عام است
مے نوشی گنہ بر من اگر بادہ حرام است

یہ تلاش مسرت و خوشی تو ہر فلسفۂ نشاط کی بنیاد ہے ہی غالب اس سے آگے بڑھ کر اپنا ایک نظریہ پیش کرتا ہے۔ جس کو اس نے اپنے اس شعر میں سمو دیا ہے ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کی انتہائی خوشی اس میں ہے کہ وہ اپنی روح محدود Finite Soul کو لامحدود Infinite میں ضم کر دے۔ جب تک وہ زمان و مکان کی قید میں جکڑا رہے گا اور جب مادی زنجیروں کی جھنکار اس کے چاروں طرف گونجتی رہے گی وہ "خوشی" سے دور رہے گا۔ اور جب وہ ان حدود سے آگے گذر جائے گا تو اسے انتہائی خوشی مل سکے گی۔ جو نتائج ہم اس نظریئے سے اخذ کر سکتے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) یہ نظریہ ذاتی (Egoistic) ہے جماعت کے لئے یہ کوئی تصور نہیں رکھتا (جماعت سے اس کا بس اتنا مطالبہ ہے کہ افراد انفرادی طور پر اپنی ہستی کو ہستیٔ لامحدود میں ضم کر دیں)

(۲) یہ نظریہ خالص روحانی نظریہ ہے۔

قدیم یونانی فلسفۂ نشاط سے غالب کا فلسفہ صرف اس قدر مماثل ہے کہ دونوں ذاتی خوشی تک محدود ہیں لیکن ان دونوں فلسفوں میں ایک بہت بڑا فرق بھی ہے۔ وہ یہ کہ یونانی فلسفہ کے مطابق انسان کی خوشی براہ راست کائنات سے وابستہ ہے۔ وہ اپنی خوشی کے لئے دوسروں کی خوشی کو بھینٹ چڑھا سکتا ہے لیکن غالب کے تصور میں اس کی ذرا بھی گنجائش نہیں اس لئے کہ اس کا تصور تصوف پر مبنی ہے جس کی روح یہ ہے کہ محدود کو لامحدود میں ضم ہو جائے۔ اس لئے ترک علائق ضروری ہے اس میں اپنی ہی ہستی اور خودی کو فنا کر دینا ہے۔ دوسروں سے سروکار نہیں۔ اس میں دامن کھینچنا ہے الجھانا نہیں۔ یہاں "ساقی گردوں" سے عشرت نہیں دے سکتا۔ اس کی امید ایک خیال خام ہے دیکھئے غالب خود ہی کہتا ہے ؎

مئے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ وارگوں وہ بھی

یا دوسری جگہ وہ کہتا ہے ؎

بزمِ قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صید زدامِ جستہ ہے اس دام گاہ کا

یہاں ہم یہ سوال کر سکتے کہ غالب نے تبلیغ فلسفۂ نشاط اس زمانہ میں کیونکر کیا جبکہ نئی اور پرانی معاشرت اور نئی اور پرانی تہذیب میں رسہ کشی ہو رہی تھی۔ جبکہ قتل و غارت کی وارداتیں عام ہو رہی تھیں جبکہ افلاس و غربت کے بادل ہندوستان پر چھا رہے تھے اور جبکہ غلامی کی زنجیریں ہندوستانیوں کو پہنائی جا چکی تھیں۔

اس کا جواب میرے خیال سے بس یہی ہو سکتا ہے کہ جس طرح چراغ سحری بجھنے سے پہلے ایک بار تیزی سے بھڑکتا ہے اسی طرح بگڑتے ہوئے نواب مٹنے سے پہلے (بجائے حالت سنبھالنے کے) خوب عیش و عشرت سے جام اڑاتے ہیں۔

غالب بھی ایک بگڑا ہوا رئیس تھا اس لئے اس نے کھاؤ پیو کا فلسفہ اختیار کیا اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ دنیا تو اک چھاؤں ہے دھن دولت مایا ہے اور ہر شے آنی جانی ہے۔ اس نے اپنی حالت کو پرست سے پست تر کر دیا۔ اس نے اپنے اس فلسفہ کا اظہار کر کے اپنے معاشرہ پر بھی گہرا اثر ڈالا البتہ یہاں جو نقطۂ قابل غور ہے وہ یہ کہ اس نے اپنے اس فلسفہ کو روحانیت سے منسلک کیا جس کی واحد وجہ یہ ہے کہ مایوسی نے لوگوں کے اندر قنوطیت (Pessimism) اور گریز کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ یہ جذبہ اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کا بگاڑ سے بڑا مفکر بھی ذہنی پستی میں مبتلا تھا جس کی وجہ یہ بھی کہ وہ اپنے معاشیاتی مسائل اور سیاسی ماحول پر فکر کرنا اپنی ذمہ داری سے بالکل غیر متعلق سمجھتا تھا۔

ان معیارِ اخلاق Standard of Ethic کے مذکورہ نظریوں میں کون انسان کے لئے ضروری ہے اور کون زیادہ قرینِ قیاس ہے ایک تشریح طلب بات ہے۔

قدیم یونانی فلسفۂ نشاط اور جدید فلسفۂ نشاط جس کو مل اور بنتھم نے پیش کیا، پر کافی تنقیدیں ہو چکی ہیں ڈیوی (Dewy) راجرس (Rogers) اور میکنزی (Makenzie) وغیرہم نے ان نظریوں پر کافی اعتراضات کئے ہیں جن میں سے چند کی طرف میں یہاں اشارہ کروں گا۔

اوّلاً عہد قدیم کے مفکرین نے انسان کو حد سے زیادہ "خود غرض" (Egoistic) سمجھ لیا تھا۔ اس لئے کہ عمرانیات کے ماہرین یہ کہتے ہیں کہ انسان حیوان مدنی" بھی ہے۔ مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے کہ انسان دوسرے کی خوشیوں اور ان کے حقوق کا بھی خیال کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی وہ سوسائٹی کے قوانین اور مذہبی اصولوں کی وجہ سے دوسروں کو گزند پہنچانے سے بھی اپنے کو روک لیتا ہے، اور کبھی خود اس کا شعور (Conscience) اس پر ملامت کرتا ہے۔

عہد جدید کے مشہور مفکر مل (Mill) کی غلطی ــــ بڑی غلطی ــــ یہ ہے کہ اس نے انفرادی خوشیوں کو "آفاقی خوشی" (Universal pleasure) کے تصور کی تحت جوڑنا چاہا، دراں حالیکہ خوشی ایسی کوئی چیز نہیں جو جوڑی یا گھٹائی جا سکے۔ ان دو اعتراضوں کے علاوہ ایک پر حقیقت اعتراض یہ ہے کہ قدیم و جدید دونوں نظریئے حسیات (Sensation) پر مبنی ہیں۔ اور عقلیت (Reason) سے عاری ہیں۔

یہاں تک پہنچ آنے کے بعد ہمیں کانٹ (Kant) کا بھی نظریہ ملتا ہے۔ اس جرمن فلسفی نے یہ کہا کہ ہمارے "معیار اخلاق" کا راز "فرض برائے فرض" (Duty for the sake of duty) میں مضمر ہے جس کو انگریز شاعر ورڈسوارتھ (Wordsworth) نے اپنی نظم "اوڈے ٹو ڈیوٹی" (Ode to Duty) میں عمدگی سے ظاہر کیا ہے۔ مگر اس پر مندرجہ ذیل اعتراضات ہیں۔

(۱) یہ نظریہ حسیات (Sensation) کو بالکل ختم کرتا ہے اور اپنی بنیاد اعتقاد (faith) اور عقل (Reason) پر رکھتا ہے۔

(۲) یہ بہت ہی تشدد (Rigorus) ہے۔

(۳) یہ ترک دنیا (Asceticism) کی تبلیغ کرتا ہے۔

اب رہا غالب کا نظریہ تو اس پر بنیادی اعتراض یہ ہے کہ وہ انسان کو دنیا کی جد و جہد اور تگ و پو سے دور لے جا کر بزم شہود میں کھڑا کر دیتا ہے۔ جہاں زندگی کا دوسرا نام شاید موت ہے۔ وہ پورا کا پورا فلسفہ جامد ہے۔ اس میں فراریت اور گریز کا رنگ نظر آتے ہیں۔

اگر یہ تمام نظریئے ناقص ہیں تو دل پکار اٹھتا ہے کہ فلسفہ نشاط کا مکمل نظریہ کیا ہو سکتا ہے؟ جو اب اس کا یہی ہے کہ فلسفۂ نشاط کا جامع اور مکمل نظریہ وہی ہے جو قانون فطرت سے مطابقت کرے اس لئے کہ خود "تلاش مسرت" ایک فطری جذبہ ہے۔ فطرتاً ایک انسان خوشی یا مسرت تلاش کرے گا لیکن اس حصول مسرت میں اس کا ٹکراؤ جماعت سے نہ ہوگا۔ ہر انسان اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے مقصد کو حاصل کرے گا اس کے حاصل کرنے کے لئے اسے ایک صالح معاشرہ کی ضرورت ہوگی جس میں ہر فرد معاشرہ کو صالح تر بنانے کی کوشش کرے گا اور یہ سعی و کوشش بھی اس کے لئے باعث مسرت ہوگی۔ اس صالح معاشرہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوگی کہ اس میں ہر فرد "خود غرضی" سے مبرا ہوگا۔ وہ اپنی فطری خوشی کو ایک مافوق الفطرت ہستی کا عطیہ تصور کرے گا۔ اور اس پر اظہار تشکر کرے گا۔ یہ وہ معاشرہ ہوگا جس میں ایک فرد دوسرے کی فضول خوشی کیلئے جائز مدد کرے گا۔

یہاں تک تو ہم نے غالب کے فلسفہ نشاط پر ایک تعمیری تنقید کی اب ہمیں فلسفہ غم بھی دیکھنا ہے اس لئے کہ کتاب حیات پر اگر ایک طرف "نشاط" لکھا ہوا ہے تو دوسری طرف لفظ "غم" بھی پایا جاتا ہے انسان اگر خوش رہتا ہے تو وہ کبھی مغموم بھی ہوتا ہے۔ زندگی اور غم کا چولی دامن کا ساتھ ہے مگر مسرت کی طرح غم بھی وقتی اور لمحاتی ہے۔ غم کو جزو زندگی قرار دے لینا کوئی فلسفہ نہیں۔ اس طرح کی حزنیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ انسان قنوطیت پسند (Pessimist) ہو جاتا ہے، اسے تو چاہئے کہ وہ غم کے سامنے بجائے اس کے کہ ہتھیار ڈال دے اسے پیچھے چھوڑتا ہوا گزر جائے۔

غالب کا دیوان حزن و ملال، رنج و غم اور درد زندگی سے بھرا ہوا ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ غم کے سامنے بے بس اور بیکس نظر نہیں آتا بلکہ ایک وار کرتا ہوا گزر جاتا ہے۔

ذوق جس بیکسی کے عالم میں یہ شعر کہہ گیا ہے ملاحظہ کیجئے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

لیکن غالب اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے کہتا ہے ؎

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

غالب کے فلسفۂ غم کا ذکر کرتے وقت ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ ہندوستانی شاعر تھا اس نے اس ملک میں جنم لیا تھا جو حزن و غم کا گہوارہ ہے۔ جہاں کے یوگی (Yogi) اور صوفی (Sufi) اب بھی

دنیا میں سوائے غم کے اور کچھ نہیں پاتے۔

پھر ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ولی دکنی سے لے کر غالب تک اور غالب سے لے کر آج تک اکثر اردو شعراء نے حزنیت کا دامن ہاتھوں سے نہیں چھوڑا۔ یعنی یہ بھی تصوف کی طرح اکثریت شعراء کے ساتھ روایتی شئے بن کر رہ گئی۔ اس کی سب سے عمدہ مثال فانی کے یہاں ملتی ہے۔ فانی ایک متمول گھرانے کا فرد، وکیل، اور صاحب وسائل ہونے کے باوجود بھی عمر بھر روتا دھوتا رہا۔ لیکن جیسا کہ ڈوتی (ایم۔ اے) نے اپنے ایک مضمون۔ "فانی کی المیہ شاعری" میں کہا کہ میر کے غم کے چاروں طرف ایک ایسا دائرہ بنتا ہے جس میں آباد بستیاں نظر آتی ہیں اور فانی کے یہاں اسی نوع کے دائرہ میں ویرانی نظر آتی ہے صحیح تجزیہ معلوم ہوتا ہے۔ دونوں کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک کو (یعنی میر کو) قدرت نے غم بطور عطیہ دیا۔ اور دوسرے نے (یعنی فانی نے) غم کو مول خریدا۔ اور یہاں اگر میں اتنا اور عرض کردوں کہ غالب کا غم بھی میر کے مقابلہ میں دھندلا جاتا ہے تو بیجا اور غلط نہ ہوگا۔

فلسفیانہ لحاظ سے ہمیں غالب کے تصور غم میں کوئی نئی بات نہیں ملتی وہ بھی قدماء کی طرح اسی خیال کا حامل تھا کہ انسان زندگی کے ساتھ غم لے کر آتا ہے سنئے ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یا دوسری جگہ غالب یوں کہتا ہے ؎

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مومن نے بھی بہت ہی عمدگی و صفائی کے ساتھ اس سے ملتے جلتے خیال کو نظم کیا ہے ؎

عدم میں رہتے تو شاد رہتے انہیں بھی فکر ستم نہ ہوتا
جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

کالدران Calderon ایک مشہور قنوطیت پسند مفکر اسی کو یوں کہتا ہے۔

"The greatest sin of man was this that he is born."

یعنی "انسان کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ معرض وجود میں آیا"

یوروپ بالخصوص جرمنی میں فلسفہ حزن Sadism ہندوستان سے پہنچا۔ شاپن ہاور (Schopenhaur) اس کی عمدہ مثال ہے۔ وہ بدھ فلسفہ اور ویدخیالات سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ اس کا بھی خیال تھا کہ انسان موت سے پہلے غم سے نجات حاصل نہیں کرسکتا۔ اور دنیا رنج و غم سے بھری پڑی ہے۔

یہاں قابل ذکر بات ایک یہ بھی ہے کہ اردو شاعری میں مقصد ادب کی آمد کے ساتھ ساتھ غم کا تصور بالکل ہی بدل گیا۔ پرانے شعراء پیر فلک، گردش دوراں اور ستم روزگار کا رونا اس لئے روتے رہے کہ ان کا محبوب بیوفا ہوا کرتا تھا۔ ان کا غم از قسم "غم جاناں" تھا جس کو آصغر گونڈوی نے اپنے شعر میں یوں نظم کیا ہے ؎

آلام روزگار کو آسان بنا دیا
جو غم دیا اسے غم جاناں بنا دیا

یہ خیال اردو شعراء کے اندر اس لئے رہا کہ وہ اپنے معاشرہ کی کمزوریوں سے بیگانگی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ وہ یہ سمجھتے رہے کہ معاشرہ کی اصلاح حکمراں طبقہ ہی کے لئے ہے۔ یہ الفاظ دیگر ان تمام شعراء نے اپنے کو مسائل سیاسیات اور معاشیات سے بیگانہ رکھا۔

لیکن آج کل تصور غم "غم جاناں" سے بلند ہوکر "غم دوراں" اور "غم انسان" ہوگیا ہے اب اگر سماج کا حق پسند شاعر کسی کو مغموم دیکھتا ہے تو اپنے کو بھی اس کے غم میں شریک کرتا ہے۔ سماج کے ہر مظلوم انسان کا غم اس کا غم ہوگیا ہے یعنی شاعر کا غم اب عالمگیر اور آفاقی ہوگیا ہے۔

غالب کے یہاں یہ چیز بالکل ہی نہیں بلکہ اس کی امید کرنا امید موہوم کی مترادف ہے اس لئے کہ تصورات اور نظریوں میں ایک خاص زمانہ اور خاص ماحول میں تبدیلی ہوتی ہے۔

اب میں غالب کے دیوان سے چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

تا رخ کاوش غم پنہاں ہوا اسد
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

شوریدگی سے ان دنوں سر ہے وبال دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

قبل اس کے کہ میں اس مضمون کو ختم کروں میں اس مسئلہ کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو ممکن ہے ناظرین کے ذہن میں پیدا ہوا ہو۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر غالب کے یہاں فلسفۂ غم بھی ہے اور فلسفۂ نشاط بھی تو فی الحقیقت ان میں سے کس سے اس کی زندگی کا تعلق ہے اور کون اس کی زندگی و فکر کا صحیح پرتو ہے۔

جواباً میں یہ تحریر کروں گا کہ "نشاط" اور "غم" کو کسی خاص خطے حد ا نہیں کیا جا سکتا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہاں تک مسرت اور یہاں تک غم۔ آج سے بہت پہلے سقراط نے اپنے ایک شاگرد کرائیٹو Crito کو مخاطب کرتے ہوئے قید خانے میں کہا تھا کہ "ہر خوشی کے بعد غم ہے اور ہر غم کے بعد خوشی" انسان کبھی خوش رہتا ہے تو کبھی غمگین۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ خوشی سے ناآشنا ہی رہ جائے یا غم سے دوچار نہ ہو۔

غالب کی زندگی کے اوراق الٹنے پلٹنے کے بعد ہمیں یہ آسانی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ دلّی کی عذر سے پہلے اس کی زندگی بہ عیش و آرام گذرتی رہی دلّی کے بعد ہنگامی طور پر اس کے نظام عیش و عشرت میں بھی تبدیلی ہوئی۔ وہ "تنگدست" بھی ہو گیا اور قرض خوار بھی۔ مگر پھر آہستہ آہستہ حالات اس کے بدل گئے۔ اس لئے اس نے جو تصورِ غم پیش کیا ہے وہ فلسفیانہ اہمیت تو رکھ سکتا ہے لیکن اسے اس کی زندگی کا پرتو سمجھ لینا غلط فہمی سے خالی نہیں۔ پھر یہ کہ اپنے بیشتر خطوط میں (جہاں انسان بالکل بے تکلف نظر آتا ہے) جا بجا اس نے کھاؤ پیو کے فلسفہ پر زور دیا اور معلوم بھی یہی ہوتا ہے کہ اس نے زندگی کے رکھ رکھاؤ میں کوئی کمی نہیں کی۔ اسی طرف مولانا آزاد نے اشارہ کیا ہے کہ غالب "علو حوصلہ اور بلند نظری کی وجہ سے تنگ رہتے پھر بھی طبیعت ایسی شگفتہ پائی کہ ان دقتوں کو خاطر میں نہیں لاتے ہمیشہ کھیل کر غم غلط کر دیتے۔"

یوسف کمال بخاری۔ ایم۔ اے

ہند قدیم میں فنِ تعمیر کا ارتقاء

مختلف علوم و فنون کسی ملک اور قوم کی تہذیب کو مل کر مرتب کرتے ہیں۔ یہ علوم و فنون دراصل ملکی و قومی خیالات، احساسات، جذبات و رجحانات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جن کے ذریعے سے ہمیں کسی قوم کی طرزِ معاشرت، ادب، موسیقی مصوری و فن تعمیر وغیرہ کے مصائب و محاسن کا پتہ چلتا ہے۔ عروج و زوال کے اسباب معلوم ہوتے ہیں۔ قومی و ملکی زندگی کے تاریخی مطالعہ میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ہندوستان بھی علم و فن کا ایک بڑا مرکز رہا ہے۔ یہ ملک ابتدائے تاریخ سے مختلف اقوام کی آماج گاہ رہا ہے۔ ان قوموں میں گونڈ۔ بھیل۔ دراوڑ۔ آریہ۔ کشان۔ یوچی۔ ہن۔ مسلمان اور انگریز خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر بیرونی خطوں سے ہند میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے یہاں کی سرزمین کو میدانِ کارزار بنایا۔ مقامی باشندوں سے نبرد آزما ہوئیں اور فاتحانہ انداز سے اپنی حکومتوں کی داغ بیل ڈالی۔

ہندوستان کی مقامی اور باہر سے آنے والی اقوام اپنی فنی و علمی خصوصیات میں منفرد تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ مقامی و غیر مقامی اقوام کے آزادانہ اختلاط سے مختلف علوم و فنون میں نئی نئی موشگافیاں پیدا ہوئیں۔ برسرِ اقتدار و حکمراں اقوام نے علوم مروجہ و فنون لطیفہ کی مربیانہ سرپرستی کی جس کے نتیجے میں مختلف ادوار میں مختلف اسکول قایم ہوئے جن میں ہندی و غیر ہندی طرزوں کی آمیزش نظر آتی ہے۔ آگے چل کر یہ جداگانہ رنگ ہندوستانی کلچر کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہو گئے۔

اس موضوع میں ہمارا تعلق صرف ہند قدیم کے فن تعمیر سے ہے۔ فن تعمیر بذاتِ خود فنون لطیفہ کا ایک جزو اعظم ہے ہندوستان میں اس فن نے تدریجی ترقی میں جو خدمت انجام دی ہے وہ تاریخ داں حضرات سے پوشیدہ نہیں۔ ہندوستان کا فنِ تعمیر غاروں اور جھونپڑیوں سے شروع ہو کر مختلف ادوار میں بدھ جین۔ کشاں۔ برہمن۔ اسلامی و نئی دہلی کی سربفلک برطانوی عہد کی عمارتوں پر تدریجی ترقی کرتا ہوا ختم ہو جاتا ہے۔

تاریخی لحاظ سے عہد عتیق کے فن تعمیر کو ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) بدھ عہد کا فن تعمیر سنہ ۲۵۰ ق م سے سنہ ۵۰۰ء تک
(۲) جین عہد کا طرز تعمیر سنہ ۲۰۰ ق م سے نویں صدی کے آخر تک نظر آتا ہے
(۳) گاندھار آرٹ پہلی صدی عیسوی سے پانچویں صدی عیسوی تک ملتا ہے
(۴) ہندو یا برہمن فن تعمیر کا زمانہ سنہ ۶۰۰ء سے شروع ہو کر اٹھارہویں صدی تک شمار کیا جاتا ہے لیکن ان دوروں کے درمیان کوئی قطعی حد امتیاز نہیں کھینچی جا سکتا ہے۔ کیونکہ اکثر طرز تعمیر عہد وسطیٰ میں کافی عرصہ تک چلتے رہے اس برہمن فن تعمیر میں بھی ہم کو تین جداگانہ طرز ملتے ہیں۔ اوّل طرز تعمیر شمالی ہند کا ہے۔ جو سنہ ۶۰۰ء سے اٹھارہویں صدی تک جاری رہا۔ دوسرا وسطِ ہند یا چالوکیہ فن تعمیر جو سنہ ۶۰۰ء سے سنہ ۱۳۰۰ء تک اور تیسرا جنوبی ہند کا فن جو سنہ ۶۰۰ء سے سنہ ۱۷۵۰ء تک قایم رہا۔ مؤخر الذکر میں پانچ علیحدہ طرز تعمیر شامل ہیں۔

(۱) پالو۔ (سنہ ۶۰۰ء سے سنہ ۹۰۰ء)
(۲) چولا (سنہ ۹۰۰ء تا سنہ ۱۱۵۰ء)
(۳) پانڈی۔ (سنہ ۱۱۵۰ء تا سنہ ۱۳۵۰ء)
(۴) وجیانگر۔ (سنہ ۱۳۵۰ء تا سنہ ۱۵۶۵ء) اور
(۵) ناٹک۔ (سنہ ۱۶۰۰ء تا سنہ ۱۷۵۰ء)

یوں تو فن تعمیر کا تعلق ہر اس عمارت سے ہے جسے انسانی ہاتھوں نے بنایا لیکن اس وقت زیر بحث وہ عمارتیں ہیں جو فنی اعتبار سے تعمیر کی گئی ہیں۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ فن تعمیر بھی ترقی کرتا گیا۔ عمارات میں حسن و نزاکت پیدا ہوتی چلی گئی۔ بلاشبہ اوّلین انسانی رہائش گاہیں قدرتی غاروں اور پہاڑوں کے دامنوں تک محدود تھیں لیکن زمانہ ماقبل تاریخ کا تھا۔ جدید تحقیقات کی رو سے ہندوستان میں فن تعمیر کی داستان وادیٔ سندھ کی تہذیب سے شروع ہوتی ہے موہنجوداڑو اور ہڑپہ میں اینٹوں کی تعمیر شدہ چند عمارات حضریات میں برآمد ہوئی ہیں۔ ان عمارتوں میں کچھ رہائشی مکانات۔ احاطے

اور ایک حمام شامل ہیں جو بالکل سادہ اور نقش و نگار سے معرّا ہیں۔ باقاعدہ فن تعمیر کا زمانہ بدھ عہد سے شروع ہوتا ہے۔

بدھ عہد کا فن تعمیر ۲۵۰ ق م سے ۷۵۰ ق م تک نظر آتا ہے، اس کی دو قسمیں ہیں۔

اوّل چٹانوں کو تراش کر بنائے ہوئے مندر۔ دوسرے معمولی طریقے پر بنی ہوئی عمارتیں۔

مندروں میں صرف ایک بیرونی دروازہ چٹان کے سامنے ملتا ہے اور بقیہ تعمیر اور نقش و نگار اندرونی حصہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان مندروں میں سنگ تراشی کے ساتھ ساتھ چوب کاری بھی ملتی ہے۔ پتھر پر جا بجا لکڑی کا کام نہایت موزوں اور دلکش معلوم ہوتا ہے۔ اندرونی چوکھٹوں اور چھتوں پر نقش و نگار ملتے ہیں۔ دروازے پست اور چھتیں نصف مدوّر اور خمدار ملتی ہیں۔ بدھ عہد کے چیتیہ یا مندر چٹانوں کو تراش کر بنائے گئے ہیں ان مندروں میں ایک جگہ عبادت کے لئے مخصوص کر دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اس عہد کی تعمیرات میں "وہار" (خانقاہیں) خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ خانقاہیں بدھ عہد کے زاہدوں اور عابدوں (بھکشو اور بھکشنی) کے لئے تعمیر ہوئی تھیں۔ ان خانقاہوں میں تین طرف چھوٹے چھوٹے اطاق اور مرکز میں ایک تالار (ہال) ہوتا تھا۔ یہ خانقاہیں بھی سنگ تراشی کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر نعل نما محرابیں ہوتی تھیں جن پر چوبی طرز کی چوکھٹ لگائی جاتی تھی اور ان سرد یوں کو رنگا رنگ کے نقش و نگار سے زینت بخشتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ اس عہد کی فنی خصوصیات میں ہشت پہل یا ستون، نقش و نگار، حیوانات کے مجسمے، در و دیوار کی زینت، بھورے رنگ کے پتھروں کا استعمال وغیرہ شامل ہیں، بدھ عہد کی عمارات کو ہم پانچ قسموں پر تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) لاٹیں۔ اس کا اعلیٰ نمونہ الہ آباد میں ملتا ہے۔

(۲) اسٹوپ۔ سانچی کا اسٹوپ اپنی نوعیت کیلئے مشہور ہے۔

(۳) آحاطے۔ سانچی کا احاطہ فنی اعتبار سے ممتاز ہے۔

(۴) چیتیہ۔ جس کے عمدہ نمونے بھاجہ، ناسک، کرلی، ایلورا، اجنٹا اور ایلیفنٹا میں ملتے ہیں۔

(۵) وہار۔ (خانقاہ) انوراد پور اور پلونروا میں ملتے ہیں۔

اس کے بعد جینی طرز تعمیر آتا ہے جو دوسری صدی قبل مسیح سے نویں صدی عیسوی کے آخر تک شمار کیا جاتا ہے یہ اپنی فنی خصوصیات علیحدہ رکھتا ہے۔

جین عہد کے مندروں میں ایک چھوٹا سا مربع کمرہ عبادت گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کمرے میں صرف ایک دروازہ داخل ہونے اور آفتابی شعاعوں کے لئے بنایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی کھڑکی یا روشندان وغیرہ نہیں ہوتے تھے۔ اس کمرے کی اُوپر مخروطی سیڑھیاں منحنی خطوط نما بنی ہوئی تھیں۔ ان مندروں میں ایک ہال ہوتا تھا جس کے سامنے ایک سائبان کا ہونا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ ہال کو قائم رکھنے کے لئے ستون تعمیر کئے جاتے تھے۔ ان ستونوں کے بالائی حصّے کو پائدار بناتے تھے تاکہ اُوپری حصّے کو سہارا دینے میں مضبوط ثابت ہوں۔ یہ ستون ایک قطار میں تعمیر کئے جاتے تھے تاکہ چھت کی جا بجا بلندی و پستی کو بغیر کسی بیرونی سہارے کے قائم رکھ سکیں۔ ان مندروں کی اندرونی تعمیر نہایت دلکش، دیدہ زیب اور خوشنما طرز عمارت پیش کرتی ہے۔ در و دیوار پر مصوری کے کمالات دکھائے جاتے تھے حتیٰ کہ بہت ہی کم جگہ غیر منقش و سادہ نظر آتی تھی۔ جین عہد کے مندر پہاڑوں کی چوٹیوں یا وادیوں کے دامنوں میں بنائے جاتے تھے۔ ان مندروں میں جینی ماحول اور ان کے معاشرہ کا پورا عکس نظر آتا ہے۔ ان کے خاص خاص مندر آبو، پلیتانا، گرنار، گوالیار، سارنگی، کھجوراہو وغیرہ میں نظر آتے ہیں۔

یونانیوں کی آمد اور ان کی قیام حکومت سے ہندی یونانی طرز کی بنیاد پڑی۔ جیسے گاندھار فن تعمیر اور گاندھار آرٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کشن خاندان کے عہد حکومت میں اس فن نے نمایاں ترقی کی عمدہ قسم کے چونے اور پلاسٹر کا استعمال، یونانی پھول پتیوں کی نقش و نگاری، گوتم بدھ کے مجسموں کی ابتدا اور ان میں اعضاء و لباس کی تفصیلی نمائش۔ ہندی یونانی طرز کے ستون، مندروں میں مربع و مدوّر شکل کی جائے عبادت۔ ہال میں جانے کے لئے متعدد سیڑھیاں اس طرز کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس کی خاص عمارتیں ٹکشاکا، مانک پالا، تخت باہی، جمال گڑھی وغیرہ میں ہیں جن میں تخت باہی اور جمال گڑھی کے استوپ اور خانقاہیں اپنی فنی خصوصیات کے لئے مشہور ہیں۔

ہندو یا برہمن فن تعمیر کا زمانہ سنہ ۶۰ء سے اٹھارہویں صدی تک سمجھا جاتا ہے۔ یہ طرز تعمیر عہد وسطیٰ میں اسلامی فن تعمیر کے دوش بدوش امتیازی حیثیت سے قائم رہا۔ اس اسکول میں تین جداگانہ طرز ملتے ہیں۔ اوّل شمالی ہند کا برہمن طرز تعمیر جو چھٹی صدی سے اٹھارہویں صدی تک قائم رہا۔ دوسرا وسط ہند یا چالوکیہ فن تعمیر اور تیسرا جنوبی ہند کا طرز تعمیر ہے۔ اور جنوبی ہند میں پانچ جداگانہ طرز پائے جاتے ہیں۔ جن کا بیشتر حوالہ دیا جا چکا

تینوں طرزوں میں بہت کچھ مشترک و مشابہ پہلو نظر آتے ہیں۔ مندروں میں پوجا کے لئے ایک مخصوص کوٹھری ہوتی تھی جس کے سامنے کی جانب ایک دروازہ آمد و رفت کے لئے بنا ہوتا تھا، وہی کمالات مصوری۔ نقش و نگار۔ جانوروں اور دیوتاؤں کے مجسمے، تصویر کشی۔ سنگ تراشی۔ منقش ستون وغیرہ اس فن کی اہم ترین خصوصیات ہیں۔ اس دور کے مندروں میں خصوصیت کے ساتھ کچھ جدتیں پیدا کی گئیں اور مندروں میں بہ نسبت پہلے کے زیادہ صفائی اور خوبی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ پورے مندر کے چاروں طرف ایک احاطہ مندر کو محصور کرنے کے لئے بنایا جاتا تھا؛ دراصل اس دور کے مندروں کی فنی خوبی صحن کے نقش و نگار اور اس کی بیرونی ساخت و خاکہ پر مبنی ہے۔ اس شمالی ہند کے طرز میں جہاں مشابہ پہلو ملتے ہیں۔ وہاں امتیازی شان بھی پائی جاتی ہے مثلاً جنوبی ہند کے مندروں کی چھتیں بستونوں کے سہارے پر قائم ہیں۔ لیکن اس کے برعکس یہاں کے مندروں کی چھتیں بغیر ستونوں کی مدد کے ٹھیری ہوئی ہیں۔ اور ان چھتوں کی تعمیر مخروطی طرز کی ہے۔

چالوکیہ یا وسط ہند کے طرز تعمیر میں شمالی و جنوبی طرزوں کی آمیزش نظر آتی ہے اس میں مندروں کا ستارہ نما نقشہ وہ ہے جو جنوبی طرز میں نہیں ملتا اور جنوبی طرز میں کوٹھری رجسے وِمان کہتے ہیں کے اوپر گاؤدم سری ہوتی ہے وہ دوسرے طرزوں میں نہیں پائی جاتی۔ دراصل اس دور کے فن تعمیر کو طرز قدیم کی ایک ترقی یافتہ صورت کہنا چاہئے۔ اس کے علاوہ شہری فن تعمیر میں محلات، مقبرے اور اشنان گھاٹ ہیں جو اس دور کے فن تعمیر کا ایک بڑا حصہ ہیں یہ اشنان گھاٹ وسیع اور بڑے بڑے دریاؤں کے کناروں پر بنے ہوئے تھے۔ مربع شکل کی کھلی ہوئی کوٹھریاں پوجا کے لئے بنی ہوئی ملتی ہیں۔ یہ پوجا گھر دریاؤں کے کنارے پر بنے ہوئے ملتے ہیں۔ جن میں متعدد سیڑھیاں دریا سے لے کر کوٹھری تک بنی ہوئی تھیں۔ جن میں غسل سے فراغت پاکر برہمن اور پجاری لوگ پوجا میں مشغول ہوتے تھے۔

ہند و یا برہمنی طرز کے شمالی ہند کے مندر اور عمارتیں ہمیں اڑیسہ، بھونیشور، کنارک، جگن ناتھ۔ دھرور، چندرا وتی۔ بارولی، اُودھے پور، چالوکیہ فن تعمیر میں امبر، ہیلور، سومناتھ پور، اور بلابید، جنوبی ہند میں مہاولی پور، ایلورا، تنجور، مندرا، تنولی، کنجیورام، ویلور اور نارپتری ملتے ہیں۔

اس کے بعد عہد اسلامی کا فن تعمیر آتا ہے جسے ہم آئندہ کسی فرصت میں آپ کے سامنے پیش کریں گے۔

سید حرمت الاکرام

غزل

نالہ کش ہوتی ہے یا نغمہ بلب ہوتی ہے
زندگی ہر طرح اِک طرفہ غضب ہوتی ہے

جلوۂ کیف سے معمور جو شب ہوتی ہے
اور بیگانۂ انوارِ طرب ہوتی ہے

فطرتِ عشق بھی کس درجہ عجب ہوتی ہے
پھول ملتے ہیں تو کانٹوں کی طلب ہوتی ہے

ہستیٔ دل کے لئے اور غضب ہوتی ہے
وہ جو آزردگیٔ غیر سبب ہوتی ہے

غمِ دوراں! تجھے اللہ سلامت رکھے
زندگی موت سے اِمداد طلب ہوتی ہے

یا تو ہوتی ہی نہیں صبح مری دنیا میں
اور ہوتی ہے تو کیا جانیئے کب ہوتی ہے

ہوا انھیں پا کے بھی محسوس کمی جب ان کی
حاصلِ عمرِ تمنّا وہی شب ہوتی ہے

نہ مسرّت کی تمنّا ہے نہ غم کی پروا
لذّتِ بیخودیٔ شوق عجب ہوتی ہے

گردشِ وقت وہاں لائی ہے اب دنیا کو
جس جگہ صبح بھی پروردۂ شب ہوتی ہے

آپ کو پانے کی تدبیر بھی کر لیتا ہوں
آپ کی یاد سے فرصت مجھے جب ہوتی ہے

ہر تمنّا پہ ہوا موت کا دھوکہ حرمتؔ
ایسی یہ کشمکشِ ترک و طلب ہوتی ہے

احسن مظہری

غزل

حسیں نغموں کی بارش لائے گی پیغامِ جاں کب تک
مری تخئیل کے گلزار میں فصلِ خزاں کب تک

جمالستانِ ماضی میں خیال اپنا سنورتا ہے
مگر جذبات کے طوفاں رہینِ داستاں کب تک

سحر خیزیٔ مستقبل کی اُمیدوں پہ سو جاؤں
مگر تاریکیٔ دورانِ حاضر پاسباں کب تک

ستاروں سے بہت آگے نشانِ راہ ہے اپنا
عزیمت کا مری عنواں فرازِ آسماں کب تک

یہاں قلب و نظر کا ذرّہ ذرّہ جانِ محشر ہے
قیامت کو پکارے گی یہ مرگِ ناگہاں کب تک

محبت کی حسیں رفتار کو تیر و سناں روکیں
کلی جب عطر افشاں ہو تو کانٹے درمیاں کب تک

زمانہ جن کی ہر جنبش پہ رقصاں ہونے والا ہے
اُن آنکھوں کیلئے محویتِ خوابِ گراں کب تک

حریمِ ناز کا ہر ذرّہ اِک عنوان ہے احسن
ترا حُسنِ تکلّم اور حدیثِ دیگراں کب تک

عالم صدیقی

○

کہوں بات دل کی تو کس سے کہوں
ہے گم صم یہ ماحول، ہاں ہے نہ ہوں
گزرتے ہوئے وقت، ایسا بھی کیا
ٹھہر تو سہی، میں ذرا سوچ لوں!
مری زخم خوردہ نظر ہے نڈھال
وہ دیکھے ہیں منظر کہ بس کیا کہوں!
جو ہو سرپرستی میں باطل کا ہاتھ
تو کیا اے خدا اس کے آگے جھکوں؟
مفکر کی تو بس بات ہی چھوڑ دے
کہیں اس طرح بھی ملا ہے سکوں؟
جنوں کی وہ بیباکیاں کیا ہوئیں؟
ابھی تک ہے طاری خرد کا فسوں
بظاہر تو گویا سبکدوش ہیں
ندامت سے بیچین ہے اندروں
کہیں زندگی اتنی مہلت بھی دے
کہ تجھ کو کبھی یاد ہی کر سکوں!
فریبوں کی آغوش میں سادگی
بتاؤ، زمانے میں پلتی ہے کیوں؟

شفا گوالیاری

○

مبارکباد اُن کے عزم کو اُن پر سلام اپنا
کہ جو سُولی پہ چڑھکر بھی سُناتے ہیں پیام اپنا
بھروسہ مشعلوں پر تا کجا اے کارواں والو
خود اپنی روشنی میں کیوں نہ پہچانو مقام اپنا؟
جو منزل پر بھی یہ کہہ دے کہ "منزل دُور ہے تیری"
بس ایسے رہنما کو دُور ہی سے ہے سلام اپنا!
یہ باقی زندگی بھی رہو کے سجدوں میں کھو دو گے
کوئی حاضر دماغ اب بھی بنا لو تم امام اپنا
تو کیوں سُنتا ہے دیوانوں کی، دیوانوں کو بکنے دے
کہ جو ہیں کام والے وہ کئے جاتے ہیں کام اپنا
بس اِک نازک سا پردہ جنبش و لغزش کا ہے ورنہ
نظام زندگی کیا، زندگی خود ہے نظام اپنا
جہاں سے تو ذرا پہچان لے اپنی حقیقت کو
وہیں سے فرض ہو جاتا ہے تجھ پر احترام اپنا
نہ اب آئیں گے اے ساقی ترے رنگیں فریبوں میں
جب اپنے ہاتھ میں آجائے تب سمجھیں گے جام اپنا
اُجالوں کو نکھاریں گی شفا تاریکیاں کب تک
دکھائے گی کہاں تک صبح کو آئینہ شام اپنا

شہر یار۔ پروانہ

○

رات افلاک میں اِک سمت کو ڈھلتی ہی رہی
صبحِ اُمید نئے رُوپ بدلتی ہی رہی
آندھیاں بادِ مخالف کی بُجھاتی ہی رہیں
شمع مقصودِ مری رُوح میں جلتی ہی رہی
اِک نئی بزمِ چراغاں کی تمنّائیں شفق
سینۂ جو میں کنول بن کے مچلتی ہی رہی
کی زمانے نے بہت پُشت پناہی لیکن
ظلم کی آہنی دیوار پگھلتی ہی رہی
تا کہ گلشن کی ہر اک رگ میں چراغاں ہو جائے
ہر کلی آتشِ صد رنگ اُگلتی ہی رہی
نہ کرم پر کبھی ٹھہری، نہ ستم پر ٹھہری
مضطرب فطرتِ صیّاد بدلتی ہی رہی

ہوشؔ اکبرآبادی

○

بہارِ تشنۂ شانِ بہار اب بھی ہے
چمن سے رنگِ خزاں آشکار اب بھی ہے
اُفق پہ دیر سے ہے آفتاب نور افشاں
مگر فضا پہ مسلّط غبار اب بھی ہے
بدل سکا نہ نظامِ زمانہ دل کا مزاج
یہ بیقرارِ ازل بیقرار اب بھی ہے
کہاں گھٹا ہے ابھی اِلتہابِ سوزِ جگر
جو اشکبار تھی چشمِ اشکبار اب بھی ہے
مٹا سکی نہ جہاں سے اسے نگاہِ ستم
بجھا بجھا سا دلِ داغدار اب بھی ہے
بدل گئی ہے زمانہ کی ہر ادا تو کیا
نگاہِ مست تغافل شعار اب بھی ہے
اسیرِ گردشِ لیل و نہار تھی دُنیا
اسیرِ گردشِ لیل و نہار اب بھی ہے
نگاہِ قہر نما اندازِ لطف ہے لیکن
مزاجِ ہوشؔ حزیں بیقرار اب بھی ہے

حامی ناردی

○

جلوہ سے تیرے دُنیا روشن
ذرّہ ذرّہ وادیٔ ایمن
دیکھ کے کیا کیا غم ہوتا ہے
اجڑا اجڑا اپنا نشیمن
رازِ محبّت کیسے چھپے گا
خاک بنائے کوئی نشیمن
تاک میں بجلی گھات میں صرصر
کیسے بنائے کوئی نشیمن
دستِ طلب تیرا کیا کہنا
تھام لیا ہے اُن کا دامن
تھوڑا تھوڑا جمع کئے جا
دانہ دانہ ہوتا ہے خرمن
ڈھونڈھ رہا ہے تجھ کو حامی
"صحرا صحرا، گلشن گلشن"

شوریدہ کاشمیری

○

اصنام سے بے نیاز کر دے
یارب مجھے پاکباز کر دے
جو عشق ہے جانگداز اب تک
اس عشق کو دلنواز کر دے
دیدہ وری مجھے عطا کر
یا چاک نقاب راز کر دے
ہشیار اگر رہوں ابد تک
سرمستِ مئے مجاز کر دے
میں طائرِ پرشکستہ سا ہوں
پرواز دے شاہباز کر دے

انور اعظمی

چراغ کیوں جلے؟

اس شام کو رام جتن کی جھونپڑی سے لے کر صاحب رام لالہ کے سرخ اینٹوں والے محل تک میں چراغاں کیا گیا۔ چراغاں کی جگمگاہٹ کو سب دیکھ رہے تھے لیکن گاؤں کے دو ایک آدمیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ آج کیوں گاؤں میں روشنی کی جا رہی ہے۔ رام جتن نے تو محض صاحب رام لالہ کی ضد میں چراغوں کو جلایا تھا۔ پچھلے پرتال میں جب لالہ رام جتن کے کھیتوں کی نوعیت کو بگاڑ دیا تھا۔ اس وقت سے اس کے دل میں لالہ سے آگے بڑھ جانے کا جذبہ ایک آگ کا طوفان بھڑکائے رہتا تھا۔ چند مہینوں کی مشقوں محنت نے اسے روکے رکھا۔ نہیں تو وہ یقیناً اپنے چھپر کے جھونپڑے کو سرخ اینٹوں والے محل میں تبدیل کر دیتا۔ وہ کھیت جن کو لالہ کے ہاتھوں میں کھیتوں کے کاغذات دیئے ہی اس لئے گئے ہیں کہ ان کے یا ان پر سرخ اینٹوں اور چونے کے گارے کا لمبا چوڑا مکان ہے اور وہ حاکموں کی اچھی خاصی خاطر مدارات کر لیتا ہے۔

لیکن مہردست وہ مجبور تھا۔ نہ تو پکی اینٹوں کا محل بنا کر زمیندار کے لئے اس کے پاس روپیہ تھا اور نہ کسی حاکم کی خاطر مدارات کا بوجھ اٹھانے کی ہمت ہی تھی۔ اس نے غلط سمجھا تھا کہ کاغذات لالہ کو سرخ اینٹوں والے محل اور حاکموں کی خاطر و مدارات کی وجہ سے ملے ہیں کیونکہ پکا محل تو محض کاغذات کے مل جانے کی وجہ سے تھا اور حاکموں کی خاطر مدارات تو صرف کاغذات کے اوپر مستقل حقوق حاصل کرنے کی ایک اچھی خاصی کوشش تھی ـــــ مگر رام جتن کو اس کے سمجھنے سمجھانے کی جھنجھٹ کی مطلق فرصت نہیں تھی اگر اس کے کھیتوں کی نوعیت دنگرانی ہوتی تو وہ لالہ کے سرخ محل پر بھی سوچنے کی زحمت نہ گوارا کرتا۔

تو اس نے جب دیکھا کہ صاحب رام لالہ کے مکان کی دیواروں پر چراغ جھلملا رہے ہیں تو وہ دوڑا دوڑا بدری ساہو کی دوکان پر گیا اور منت سماجت کر کے دو ایک چراغ کا تیل اُدھار لے آیا اور اس کے دل میں لالہ کے چراغوں کو دیکھ کر جو آگ بھڑکی تھی چراغوں کے روشن کرنے کے بعد کچھ ٹھنڈی پڑ گئی۔ پھر بھی وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے ٹمٹماتے ہوئے دیئے لالہ کے رنگا رنگ چراغوں کے سامنے منہ اٹھائے ہوئے کھڑے ہیں۔

بوڑھا گاؤں جب تک چراغوں کے جلانے میں مصروف رہا اس وقت تک کسی کو اس مسئلہ پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی کہ آخر چراغ جلائے کیوں جا رہے ہیں؟ اور صبح تک کے مصروف پروگرام میں شاید ہی کسی کی اس طرف توجہ جاتی لیکن رام جتن کے چراغوں نے جب صاحب رام لالہ کے ـــــ چراغوں کی تند و تیز اور ایک حد تک تیغ مسکراہٹوں والی روشنی کو دیکھ کر اپنی لو کو ابھارا تو یکایک پھوس کی جھونپڑی بھڑک اٹھی شاید جھونپڑی کو لالہ کے چراغوں کا مستحسنانہ دیئے کچھ گرانا گوارا نہ ہوا اس لئے جلتے ہوئے چراغوں کی ہلکی اور نرم روشنی کو اچھی خاصی مدد پہونچانے کی کوشش جس مدد کے مل جانے کی وجہ سے نہ صرف لالہ کے چراغ مدھم پڑ گئے بلکہ گاؤں میں انھیں کوئی دیکھنے والا بھی نہ رہا۔

جھونپڑی بھڑک رہی تھی۔ رام جتن کی کھوسٹ ماں چیخ چیخ کر گھر کے ایک ایک سامان کو پکار رہی تھی۔ مگر جیسے انھیں آگ کا شدید انتظار تھا۔ جس کی گود میں پہونچنے کے بعد دنیا کے اور رشتے ٹوٹ گئے تھے۔ ماں ـــــ تو یہ صرف ماں کی لاج کا معاملہ تھا جو رام جتن لپک لپک کر سامانوں کے نکالنے میں مصروف تھا۔ اور عورتیں چراغوں کو گالی دے دے کر دیویوں اور دیوتاؤں کے استھان پر قربان کر رہی تھیں۔ بچے بوکھلا کر اِدھر اُدھر بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ انھیں سب سے زیادہ اپنے کھلونوں اور بچپن کی معصومانہ یادگاروں کا فکر تھا۔

"بھیّا۔ میری گڑیا نکالو۔" ایک لڑکی چلّا رہی تھی۔

"چاچا، ہمارا گھوڑا پہلے لاؤ۔" ایک لڑکا شور مچا رہا تھا۔

اور گاؤں کے لوگ بڑی سرگرمی کے ساتھ شعلوں پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ آدم کی اولاد جیسے شعلوں کو دبوچ لینے کی جد

کر رہی ہو۔ آخر کار رام جتن کے آدھے گھر کے جل جانے کے بعد یہ جنگ گاؤں والوں کی فتح پر ختم ہو گئی۔ بجھی ہوئی لکڑیوں اور سلگتے ہوئے پھوس کا کثیف دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایک دھند ــــ ہولناک پھیلتا ہوا، شعلے بجھ گئے تھے لیکن دہوئیں ابھی تک فضا کو مکدر کر رہے تھے۔

پہلے گاؤں کو چراغ جلانے کی دھن میں اس کی فرصت نہیں تھی کہ چراغ جلانے کی وجہ پر غور کریں۔ پھر بھڑکتے ہوئے شعلوں، چٹختی ہوئی لکڑیوں اور دھکتی ہوئی دیواروں کی وجہ سے یہ سوچنے کا موقع نہیں تھا کہ چراغ جلنے سے فائدہ پہونچا یا نقصان ہو گا۔ گاؤں والے ہمیشہ سے ایسے ہی کام کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ تو صرف یہ دیکھتے تھے کہ کون سا کام کیا جا رہا ہے گاؤں کے بڑے لوگ جب بھی کوئی نیا کام شروع کرتے تو گاؤں کے اور لوگ بغیر کچھ سوچے سمجھے ہوئے اس کام میں لگ جاتے، نفع نقصان کا سوال تو بعد کو ہوتا۔

یہ ان کی عام عادت تھی یہاں تک کہ اپنی زندگی کو جیتے وقت بھی اسی اصول پر عمل کرتے تھے انھوں نے جب گاؤں کے سرخ مکانوں پر چراغوں کو جلتے ہوئے دیکھا تو بغیر کچھ سمجھے ہوئے وہ بھی چراغ جلانے لگے کیونکہ انہیں اس کے نفع نقصان پر سوچنے کے لئے دوسرے دن کا انتظار تھا ــــ بات جو کچھ بھی ہو لیکن آج لالہ کا مکان جیسے ہنس رہا تھا کہ لال اینٹوں سے پھونس اور مٹی کے جھونپڑے کا مقابلہ کیسے بھی جھونپڑے کے حق میں سود مند نہیں ہو سکتا۔

اور چراغوں کا تیل ختم ہو گیا تھا۔ رام جتن کے گھر کے شعلے بجھ گئے تھے۔ گاؤں والے آگ بجھانے کی کوشش و سرگرمی کو بڑے فخریہ انداز میں بیان کر رہے تھے۔ کولھو چل رہا تھا اور اس کی چیخ چیخ، چوں کی آواز گفتگوؤں میں شامل ہو کر ہنگامہ مچا رہی تھی کہ یکایک بوڑھے سنتو کے ذہن میں ایک سوال ابھرا اور اس نے اپنے جہاں دیدہ ساتھیوں سے پوچھا۔

"بھیّا! تم نے دیا کیوں جلایا؟"

یہ ایک سوال تھا! آسان اور غیر مبہم؛ لیکن الاؤ کے اردگرد کی آبادی کے سامنے جیسے کوئی پہاڑ لا کر رکھ دیا گیا ہو۔ کسی کے اندر ہمت نہ تھی کہ اس پہاڑ کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کرے حالانکہ ان میں سے بہتوں نے چٹیل میدانوں کو محض اپنی قوتِ بازو کے بل پر شاداب کھیتوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان کے جوان ارادوں نے سنگ آلود زمینوں سے بھی اپنی محنت کا خراج حاصل کر لیا تھا ــــ مگر اس آسان اور غیر مبہم سوال نے ان کے سامنے ایک لوہے کی چادر لا کر کھڑی کر دی ــــ پراسرار اور بڑی حد تک بھیانک بھی ــــ جس کو توڑنے کی طاقت نہ تو رجئی کے نئے اور تیز رپھاڑ ڑے میں تھی اور نہ بدلو لوہار کے ہتوڑے میں، پھر کون تھا جو اس پردے کے پیچھے کچھ ٹٹول کر پا لینے کی کوشش کرے۔

ایک لمبی حیرت اور گہرا سناٹا جس کے دامن میں سب کچھ ہو مگر بوڑھے سنتو کے سادہ اور غیر مبہم سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

بات آسان سی تھی۔ رجئی نے لالہ سے سنا تھا۔ بدلو لوہار کو مستری نے بتایا تھا اور اگر وہ چاہتے تو بتا دیتے کہ چراغ کیوں جلائے گئے تھے۔ مگر وہ سمجھتے تھے کہ بوڑھا سنتو صرف جواب سنکر خاموش نہیں ہو گا۔ بلکہ وہ اسی سوال کے پیچھے اور بہت سے سوالات کی موجیں ابھار دے گا۔ اس کی ایک بات سے ہزاروں باتیں کلبلا کر نکل پڑتی ہیں۔ جس طرح کسی تالاب میں ایک لہر کے بعد کئی کئی لہریں تعاقب میں لپکتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔

بوڑھے سنتو کو یہ طویل خاموشی گراں گذری اور اس نے الاؤ پر چھائی ہوئی راکھ کو کُرید کر اپنے ماحول کو گرم کر دیا اور یکایک بڑے مفکرانہ انداز میں اپنے قریب کے ایک بڈھے سے پوچھا۔

"اور بھیّا تم نے دیا کیوں جلایا؟"

اس جملہ کے ادا ہونے سے پہلے ہر شخص کو یہ گمان تو تھا کہ بوڑھا سنتو کسی نہ کسی کو مخصوص کر کے یہ سوال ضرور کرے گا مگر اس بڈھے کو یہ خیال نہ تھا یہی وجہ ہے کہ اس کی زد میں آ گیا۔ وہ بھوں چکا ہو کر بولا۔

"تم بھی بھیّا کیسی بات کرتے ہو۔ ارے یہ نہیں سنا کہ پوری آجادی (آزادی) ملی ہے۔"

بوڑھا سنتو ایک لکڑی سے الاؤ کو کُریدتے ہوئے مسکرایا۔ اور دیر تک مسکراتا رہا۔ رجئی بول اٹھا۔

"اب کاہیں (کیوں) چُپ ہو جا چا"

بوڑھا سنتو سر سے پگڑی اتار کر سر کھجلانے میں مصروف ہو گیا اور دیر تک سر کھجلاتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رجئی کو کس طرح اصل حقیقت سے آگاہ کرے۔ وہ جانتا تھا کہ ابھی ان کی زندگی تجربوں کے کھُردرے میدانوں سے نہیں گذری ہے اس لئے یہ ہر سانپ کو لکیر سمجھکر پیر رکھ دینے کے عادی ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ انھیں کیا جواب دے لیکن وہ بالکل خاموش بھی نہ رہنا چاہتا تھا آخر کار اس نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"بولوں کیا رجئی۔ تم لوگوں کا نیا کھون۔ نئی آجادی ملی ہے۔ اب مجا اڑاؤ۔ ہماری کیا؟ اب تو دنیا کا بھور ہو گا۔"

بوڑھے سنتو کا یہ جواب لوگوں پر بہت گراں گذرا سب یہ چاہتے

تھے کہ کوئی پر لطف جملہ چھیڑا جاتا تو چند لمحے کے لئے بے کیف اور بے لچک زندگی مسرتوں کے مرغزاریں تبدیل ہو جاتی مگر سنتو نے اس بحث میں رحمو کا جواب یا کہ ماحول پر اور زیادہ افسردگی چھا گئی اور سب کے سب خاموش ہو گئے۔

بدلو لوہار سر جھکا کر سوچنے لگا کہ سنتو کی بات کتنی اکھڑی اکھڑی ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں جب انگریز جا رہے تھے تو اس نے گاؤں بھر کی مخالفت کی اور ان کی مسرتوں اور امنگوں میں صرف حصہ ہی نہیں لیا بلکہ ان کا اپنے پوپلے منہ سے کتنا مذاق اڑایا تھا اور تو اور بابو ہنسراج سنگھ وہ اس بات پر کتنا الجھا تھا کہ اپنے بھائی انگریزوں سے زیادہ ظلم ڈھائیں گے معلوم نہیں اس کے دل میں کہاں سے یہ بات سما گئی ہے کہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ بڈھا ہو گیا ہے اس لئے بے چارے کا دماغ چل گیا ہے۔ نہیں پہلے تو بڑا گیانی تھا۔

ٹھیک یہی بات سمبر بھی سوچ رہا تھا مگر اس کے دل میں رہ رہ کر یہ سوال ابھر رہا تھا کہ اگر بوڑھے سنتو کی باتیں پاگل پن کی ہوتی ہیں۔ تو کیوں اس کی باتیں آگے چل کر حرف بحرف درست ہوتی ہیں۔ اس نے جب کہا تھا کہ آدمی آدمی پر حکومت کرے گا تو جیون کا کوئی کام ٹھیک نہیں ہو سکتا اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی فساد اٹھا کرے گا اُس نے جب یہ بات کہی تھی لوگ اس کا بڑا مذاق اڑا رہے تھے مگر وہ اپنے بے دانت کے منہ کے ذریعہ سب کا جواب دیتا رہا۔ اس وقت تو واقعی یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی مگر جب سے انگریز گئے ہیں تب سے جیون کتنی کٹھن ہو گئی ہے۔ کھدر کی ٹوپی اور خاکی ہیٹ میں فرق ہو مگر سردیوں میں تو کوئی فرق نہیں ہوا۔ سنتو چاچا ٹھیک کہتا تھا کہ جب تک آدمی کی حکومت رہے گی اس وقت تک جیون کشٹ سے نہیں چھوٹے گا۔

سمبر محض واقعات کی رفتار اور حالات کی تشریح کے بعد اس نتیجے پر پہونچا تھا مگر رام جتن جس کا مکان رات ہی جل کر دیوار دل کو سیاہ کر چکا تھا سر جھکا کر عجیب و غریب مسئلے حل کر رہا تھا اس کے دماغ میں یہ سوال بڑی تیزی سے گردش کر رہا تھا کہ آدمی جسے اپنی حالت کو سدھارنے کے لئے ایسی ایسی بیسیوں یوجنائیں کار ہیں، وہ کیسے دنیا کے معاملوں کو سدھارے گا جب اسے آگم و مستقبل کی کوئی بات معلوم نہیں تو کیسے کوئی کام بالکل ٹھیک ٹھیک کرے گا پھر کیسے اتنے بڑے بڑے گیانی اتنی بڑی غلطی کرتے ہیں اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ جو دن رات نئے نئے قانون بنتے رہتے ہیں۔ نئی نئی حکومتیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ نئے نئے فسادات، نئے نئے جھگڑے اٹھتے رہتے ہیں اس کی بھی وجہ یہی ہے کہ انسان کو حکومت کرنے کا حق مل گیا ہے اور وہ اندھا دھند قانون بنا کر چلاتا رہتا ہے۔ محض اٹکل پچو کی باتیں کرتا ہے اور اندھیرے میں زندگی کے کارواں کی رہنمائی کرتا ہے۔

وہ اتنا سوچ کر بوکھلا گیا۔ اس کے آگے اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ جب انسانوں کو حکومت کرنے کا حق نہیں تو پھر کون حکومت چلائے گا کون سڑکیں بنوائے گا۔ کون لگان وصول کرے گا۔ کون گرام سدھار قایم کرے گا۔ اور کون پولیس۔ تھانہ۔ چوکی۔ ڈاک خانہ کا انتظام کرے گا؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی اور بڑی دیر تک وہ اس ادھیڑ بن میں رہا مگر کوئی اسے سلا نہیں جسے وہ انسانوں کے حاکم کی جگہ دے سکے۔ جانور۔ چاند، سورج۔ ان کے متعلق تو وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ یہ انسان سے بھی گئے گذرے ہیں۔ پھر کون حکومت کرے؟ یہ سوال بڑا کٹھن مگر بہت بنیادی تھا۔ اس کو افسوس تھا کہ وہ گیانی کیوں نہیں ہے؟

رام جتن کی سمجھ میں جب یہ بات کسی صورت نہیں آئی تو وہ الاؤ کو کرید کر چلم بھرنے لگا لیکن رحمو ابھی تک گم صم اور خاموش کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نے تو محض لطف لینے کے لئے سنتو سے وہ بات کہی تھی مگر سنتو نے جس سرد لہجے میں اس کا جواب دیا وہ بالکل ماگھ کے ہوا کے جھونکے کی طرح سے اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ اس کو افسوس تھا کہ آج تک اس نے سنتو کی ہر بات کا مذاق اڑا دیا لیکن یہ بھی واقعہ تھا کہ بوڑھے سنتو کی ہر بات بالکل درست ثابت ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں جب ووٹ پڑ رہے تھے تو بوڑھا سنتو عجیب قسم کی پراسرار سنہی سنہا کرتا تھا اور کہتا پھرتا تھا کہ۔

"راجا ڈھونڈھو، مداجیون کشٹ میں پڑ جائے گا۔"

اور جب سے نئی حکومت آئی ہے دن رات نئے نئے ٹیکس لگتے رہتے ہیں۔ مویشی خانہ کا پہلے کتنا کم جرمانہ تھا مگر اب تو ایک کے پانچ لگتے ہیں۔ غلہ پہلے سے دگنا مہنگا ملتا ہے۔ لگان بڑھ گیا۔ پھر اپنے پاس جو چیز ہے۔ اس کی قیمت کتنی گر جایا کرتی ہے۔ اپنی حکومت ہونے سے کون سے سونے کے لقمے ملنے لگے۔ پچھلے دنوں بڑے جلسے میں کتنا کتنا لمبا لکچر ہوا۔ کہ چند دنوں کی مصیبت ہے مگر ہر دن ایک نہ ایک مصیبت بڑھتی ہی جاتی ہے۔ پہلے گاؤں کی دکانوں پر ٹیکس نہیں تھا اور اس طرح دو چار پیسے کی آمدنی ہو تی تھی مگر جب سے اپنی حکومت ہوئی ہے تب سے گاؤں کی دو کانیں بھی ٹیکس سے نہیں بچیں۔ کاتک میں جب میری دوکان پر ٹیکس

لگا تھا تو میں نے تو بڑی جلی کٹی سنائی۔ کہاں تک کوئی برداشت کرے۔ اور یہ کمبخت جو گردن جھکائے ہوئے یوں بیٹھا ہے جیسے کسی گہرے سوچ میں ڈوبا ہوا ہو اس دن اس نے بھی ہنس کر کتنی پتے کی بات کہی تھی کہ

"رجبی بھیا! تمھارے پاس چار بھینسیں ہیں ان کو نکال دو نہیں تو آجادی اس پر بھی ٹکس لگا دے گی۔"

میں جیسے کھسیا گیا اور پھر بھی ہنستے ہوئے کہا تھا کہ

"بھیا دشا (حالت) تو ایسی ہی ہے آگم (مستقبل) بڑا اندھیارا ہے۔"

یکایک اس کے ذہن پر ایک علتی ہوئی لوہے کی سلاخ گذرنے لگی اور وہ تلملا کر سوچنے لگا کہ سنتو چاچا کا مذاق اڑانا اور بات ہے مگر اس کی بات بالکل سچی ہوتی ہے یہ کہنا ہے کہ آدمی آدمی پر حکومت نہیں کر سکتا ٹھیک تو کہتا ہے آخر کوئی کسی کا دیس تھوڑے ہی ہے اور اگر آدمی ہی حکومت کر سکتا ہے تو پھر مجھے کیوں نہیں حکومت ملتی؟ یہ بڑے لوگ جتنا ہی پڑھ لکھ لیتے ہیں اتنے ہی بے ایمانی کے نئے نئے ڈھنگ نکال لیتے ہیں۔ اپنی حکومت پر جا حکومت کل غلط، بالکل جھوٹ، نرا اپنی حکومت ہوتی ہے نہ پرجا راج کرتی ہے نہ راجہ البتہ ہی بدل جاتے ہیں مگر پرجن ہر شکل میں پرجا ہی رہ جاتی ہے یہ ٹھیک وہی کا ہے یہ بڑوں کی چالیں ہیں اپنوں کی اور پرائی خوشامد کر کے اپنی حکومت جماتے ہیں۔ پھر ہمارا خون چوس لیتے ہیں اور ہم نہ ہے بدھو ہیں کہ پہلے کچھ سوچتے ہیں، جب سر پر تھوڑا پڑتا ہے تب ہاتھ اٹھا کر روکنے کی بیکار کوشش کرتے ہیں۔ بات تو جب ٹھیک ہوتی کہ یا سب راجہ ہوتے یا سب پرجا۔

رجبی کا جوان خون کھول رہا تھا۔ الاؤ کے ارد گرد بیٹھے ہوئے بوڑھے سوچ رہے تھے۔ ایک گہری خاموشی ماحول پر مسلط ہو رہی تھی جسے کوٹھو کی چٹ چٹ چوں نے درہم برہم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

بوڑھا سنتو چپ رہا۔ دیر تک چپ رہا وہ رجبی کے جملے سے تلملا تو اٹھا تھا مگر یہ چاہتا تھا کہ آج کل کے نوجوان سوچنے سے پہلے کام کرنے کے عادی ہیں یہ ہر انگارے کو پھول سمجھ کر اٹھا لیتے ہیں اور جب ہتھیلی جلنے لگتی ہے تو انگار کو گالی دینے لگتے ہیں، آج ترنگ میں ہیں کل کی کچھ سُدھ بُدھ نہیں اور اگر کل کوئی بات ہو گئی تو پھر گردن کی رگیں پھلا کر سرخ سرخ آنکھیں نکال کر اِدھر اُدھر لوگوں کو دیکھیں گے گویا ماحول کو نگل جائیں گے۔

الاؤ کے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ اب سوچتے سوچتے تھک گئے تھے ان کو جب اپنے دل کے شبہوں کا کوئی صحیح جواب نہیں ملا تو تھوڑی دیر بعد تمام کے تمام ایک تھکاوٹ سی محسوس کرنے لگے، رام جتن تو اب مطلق سوچنے پر تیار نہیں تھا اسے رہ رہ کر اپنا جلا ہوا گھر یاد آتا اور تصور کی ساری دنیا درہم برہم ہو جاتی۔ اس نے گردن اٹھا کر بوڑھے سنتو کو دیکھا جو ابھی تک سر جھکائے ہوئے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے یکایک یاد آیا کہ بوڑھے سنتو کو رجبی کی تلخ بات بہت بری معلوم ہوتی ہے۔ اسے بوڑھے سنتو سے ہمدردی سی پیدا ہو گئی اور اس نے کہا کہ

"سنتو چاچا تمھاری بات بالکل سچی ہوتی ہے مرا لوگ دیر میں کان دھرتے ہیں۔"

بوڑھے سنتو نے گردن اٹھائی۔ وہ خود ماحول کے سُوکھے پن سے گھبرا رہا تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی دلچسپ تذکرہ چھیڑے۔ رام جتن کی بات کا تو اس نے زیادہ خیال نہیں کیا البتہ رجبی سے پوچھنے لگا۔

"رجبی! تمھیں صاحب رام جب بیگار میں بلا رہے تھے تو تم کیوں انیٹھے تھے؟"

رجبی چپ تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ سنتو نے اس کے گرد ایک ایسا جال بنا دیا ہے کہ وہ ذرا بھی تڑپھڑائے گا تو اس کا ایک ایک بندھن ہڈیوں تک میں چبھ جائے گا۔

بڑی دیر تک سنتو کو کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا، جھری پڑا ہوا چہرہ، بے دانت کا منہ۔ اس کے چہرے پر عجیب عجیب دائرے بن بگڑ رہے تھے۔ طرح طرح کی لکیریں اُبھر اور مٹ رہی تھیں۔ مربع مستطیل مثلث، کریدا ہوا الاؤ بھڑک اٹھا اور سنتو نے رجبی سے کہا۔

"رجبی۔ اس کا جواب تمھیں دینا ہوگا۔"

رجبی چپ رہا مگر منگشہ راہیر نے اس کی فلسفیانہ توجیہ کی۔

"اتنا نہیں مالوم چاچا۔ کوئی کسی کا دیس تھوڑے ہی ہے۔"

بے تحاشہ ہنستے ہوئے بوڑھے سنتو نے کہا تب تمھیں کیسے پوری آجادی مل گئی۔ اور اس کی ہنسی جو ہولناک معمہ تھی اب حیرت خیز سوال بن چکی تھی۔

الاؤ کے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ اب خود معمہ بن گئے تھے۔ وہ گہری سوچ میں پڑے ہوئے تھے، ان کے دلوں میں یہ ہلچل مچی ہوئی تھی کہ بوڑھے سنتو کی باتوں میں حقیقت کتنی ہے؟

بوڑھا سنتو اب چپ رہنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا

"رجبی یہ کہو کہ انگریزوں سے آجادی ملی ہے۔ پوری آجادی کیسی۔ پہلے گوروں کی گلامی تھی اب اپنوں کی گلامی ہے پھر پھرک (فرق) کیسا؟"

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

منظر حسین

نکاح کے بعد

(اس فسانہ کا پلاٹ اور اس کے کردار بالکل فرضی ہیں۔ ان کا تعلق کسی گذشتہ یا موجودہ مس یا مسٹر ـــــ سے نہیں)

مسٹر ایشیا کا نکاح مس یورپ سے کب اور کیسے ہوا؟

یہ ایک طویل داستان ہے جس میں جناب کیوپڈ نے اہم پارٹ ادا کیا تھا۔ حضرت کیوپڈ نے پہلے دو چار معصوم شرارتیں کی تھیں۔ جیسا کہ ان کا طریقہ ہے یعنی مسٹر ایشیا کو مس بھارت اور مس پاکستان سے بیک وقت اُلجھا دیا تھا جس کے نتیجے میں مسٹر ایشیا ایک اُلجھن میں مبتلا ہو گئے تھے اور ان کی قوتِ انتخاب ساڑھی اور غرارے کے درمیان پھنس کر رہ گئی تھی۔ وہ تو کہئے بڑی خیریت ہوئی کہ کیوپڈ نے ان کے حال پر رحم کھا کر ایک ایسا تیر مارا جو اتفاق سے مس یورپ کے دل میں پیوست ہو گیا اور مس یورپ انھیں مس بھارت اور مس پاکستان دونوں کے چکر سے نکال کر اپنی عریانیت کے دامن میں بہالے گئیں اور ایک خاصی مدت کی "کورٹ شپ" کے بعد ان دونوں کا نکاح پیرس میں ہو گیا۔

یورپ میں ایک سال تک "ہنی مون" منانے کے بعد مسٹر ایشیا مسز ایشیا کے ساتھ اپنے گھر لوٹے جہاں ان کے اعزاز میں ایک پُر تکلف ڈنر پارٹی ہوئی۔ یہ پارٹی مسٹر اور مس بھارت، مسٹر اور مس پاکستان، مسٹر اور مس برما اور مس چین وغیرہ کی طرف سے دی گئی تھی۔

مسز ایشیا کو مسٹر چین کے مقابل جگہ ملی اور ان کے ایک طرف مسٹر پاکستان تھے اور دوسری طرف مسٹر بھارت۔ مسٹر ایشیا کو مس برما کے مقابل جگہ ملی اور ان کے ایک طرف مس پاکستان تھیں اور دوسری طرف مس بھارت

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ـــــ مسز ایشیا نے مسٹر پاکستان سے آہستہ سے پوچھا "آپ کے سینے کی چوڑائی کتنی ہے؟ افسوس مجھے یاد نہ رہا ـــــ اخبار میں پڑھا ضرور تھا" ـــــ اور اسی وقت مسز ایشیا نے مس بھارت سے سوال کیا "آپ کی کمر کا گھیر کتنا ہے؟ افسوس میں یوروپ جا کر بھول ہی گیا" ـــــ مسٹر پاکستان نے تو جواب دیدیا مگر مس بھارت نے شرما کر منہ پھیر لیا۔

یہ پارٹی مس بھارت کے ناچ، مسٹر چین کی مختصر تقریر اور مسٹر ایشیا کے شکریہ پر ختم ہوئی ـــــ مسٹر ایشیا نے چلتے چلاتے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ بھی میری طرح کیوپڈ کے شکار ہو کر ازدواجی زندگی کی سیر کریں اور دیکھیں کہ یہ کتنی لذیذ اور کتنی پُر سکون ہوتی ہے"۔

مگر مسٹر ایشیا کا دل اسی روز سے مسز ایشیا کی طرف سے ہٹنے لگا اور بالکل یہی کیفیت مسز ایشیا کے دل کی بھی ہونے لگی۔

کیوں؟ ـــــ مسٹر ایشیا نے اپنے دل کو ٹٹولا تو انھیں پتہ چلا کہ وہ مس بھارت کی تیلی کمر سے چپکنے کے لئے آمادہ ہو رہا ہے ـــــ مگر یہ تو وہی مس بھارت تھی جسے وہ پہلے ٹھکرا چکے تھے؟ مسز ایشیا اس نتیجہ پر پہنچیں کہ وہ مسٹر پاکستان کے چوڑے چکلے سینے سے لگنے کے لئے تڑپ رہی ہیں ـــــ مگر اس سے قبل تو ایسا خیال ان کے دل میں نہیں آیا تھا؟ ـــــ مسٹر ایشیا اور مسز ایشیا دونوں ایک ہی قسم کی آگ میں سلگنے لگے جس کے کشف دھوئیں نے ان کا سکون اور چین چھین لیا۔

ایک رات جب مسٹر ایشیا مس بھارت کے ساتھ ناچ رہے تھے۔ انہوں نے مسز ایشیا کو مسٹر پاکستان کے ساتھ "پرائیویٹ روم" میں جاتے دیکھ لیا۔ انھیں سخت غصہ آیا مگر وہ اسے پی گئے اور ناچتے رہے ـــــ لیکن جب انہوں نے دیکھا، کئی منٹ ہو گئے اور پھر بھی وہ لوگ "ہال" میں واپس نہیں آئے تو ان سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ مس بھارت سے معذرت کر کے اِدھر ـــــ پرائیویٹ روم کی طرف چلے۔

اور وہاں ان کی آنکھوں نے جو سماں دیکھا۔ اس نے انہیں جھنجوڑ دیا۔ ہلا دیا۔

مسٹر الیشیا ایک لفظ کہے بغیر ہال میں واپس آئے اور مس بھارت کی کمر میں ہاتھ دیکر اور اسے ساتھ لے کر پرائیویٹ روم میں دوبارہ پہنچے اور ——

مسز الیشیا نے جوش میں آکر کہا "تمہاری یہ جرأت —— میری آنکھوں کے سامنے ——" مسز الیشیا نے بڑھکر مس بھارت کے ایک تھپڑ رسید کیا۔

مسٹر الیشیا نے مسز الیشیا کو پکڑ کر مس بھارت سے کہا "ایک کے بدلے دو تھپڑ مارو۔ اسے" —— لیکن مس بھارت نے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ مسٹر پاکستان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور فرمایا "مسٹر الیشیا —— آپ اپنی بیوی کو لے جا سکتے ہیں"

"بیوی؟ کس کی؟ —— میری یا تمہاری؟"

"آپ کی —— لے جائیے انہیں —— مسز الیشیا —— Please go —— میں پھر ملوں گا آپ سے"

"کیوں ملو گے؟ کون ہے یہ تمہاری؟"

"شٹ اپ" مسز الیشیا نے چلا کر کہا "میں انہیں Love کرتی ہوں"

"تو میں تمہیں طلاق دیدوں گا" مسٹر الیشیا نے حلق پھاڑ کر کہا اور غصہ میں پیر پٹک کر روم سے باہر نکل گئے۔

لیکن مسٹر الیشیا نے طلاق نہیں دی —— ان میں اور مسز الیشیا میں سمجھوتہ ہو گیا جس کی رُو سے مسز الیشیا کو ایک عاشق رکھنے کی اجازت مل گئی اور مسٹر الیشیا کو ایک "معشوقہ" کی

دونوں کی زندگی بظاہر اب پُرسکون گذر رہی تھی۔

ایک دن مسز الیشیا نے ٹیلی فون پر مسٹر الیشیا کو مطلع کیا "آج رات میں گھر نہیں آرہی ہوں —— اپنے ایک دوست کے ہاں ہونگی"

مسٹر الیشیا سمجھے —— مسٹر پاکستان کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ انہوں نے کہا "اچھا —— تمہاری مرضی۔

اور معاً ان کے دل میں خیال آیا "مسز الیشیا تو موجود نہیں —— کیوں نہ مس چین کو آج رات اپنا مہمان بنالوں —— مس چین آہ! کتنی مرتبہ اس نے مجھ سے تنہائی میں ملنے کی درخواست کی تھی مگر میں صرف مس بھارت کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ آج نادر موقعہ ہے —— آج رات مس چین اور میں ——"

مسٹر الیشیا نے فوراً مس چین کو فون پر بلایا۔

اور معاملہ طے ہو گیا۔

رات کو —— جب مسٹر الیشیا مس چین کے ساتھ آرام کر رہے تھے —— مسز الیشیا اس وقت مسٹر بھارت کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھی۔

یکایک مسٹر الیشیا کا ٹیلی فون کھڑکھڑایا۔

"ہلو —— کون؟ —— مسٹر پاکستان؟ —— مسز الیشیا؟ —— انہیں آپ کے ہاں ہونا چاہئے —— نہیں ہیں —— مگر وہ تو —— ان کا ٹیلیفون آیا تھا کہ وہ آج رات آپ کے ہاں —— پھر —— مجھے کچھ نہیں معلوم ——"

مسٹر الیشیا نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ریسیور رکھ دیا —— تو مسز آج رات اپنے کسی اور دوست کے ہاں گئی ہوئی ہیں؟ "——" کہاں؟ —— "کیوں؟" —— مسٹر الیشیا کے غصہ کا پارہ چڑھنے لگا۔

مس چین نے کہا "مسز الیشیا مسٹر بھارت سے میگیفن پڑھا رہی تھی۔ میرا خیال ہے وہ ——"

"خاموش" مسٹر الیشیا نے مس چین کو ایسی نظروں سے گھورا کہ اس سے وہ سہم گئی۔

مسٹر الیشیا تھوڑی دیر تک سوچتے رہے —— سوچتے رہے —— پھر بولے "مس چین آج میرا موڈ خراب ہو گیا ہے —— چلو تمہیں گھر پہنچا دوں"

اور مس چین کو اس کے گھر چھوڑ کر مسٹر الیشیا سیدھے مسٹر بھارت کے ہاں پہنچے۔

لیکن مسٹر بھارت اپنی خواب گاہ میں داد عیش دے رہے تھے انہوں نے مسٹر الیشیا سے ملنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

مسٹر الیشیا بار بار کال بل (Call Bell) کو دبا دبا کر اکتا گئے اور آخر سمجھ گئے کہ مسٹر بھارت ان سے ملنے کو تیار نہیں —— لیکن انہوں نے اسی وقت ایک خوفناک فیصلہ کر ڈالا "میں صبح تک یہیں رہوں گا —— اور —— اور اگر وہ خاطر خواہ ہوئی تو یہیں طلاق —— فوراً طلاق دیدوں گا" —— پر جب صبح ہوئی اور مسٹر

ایشیا کو مسٹر بھارت نے گھر کے اندر داخل ہونے دیا تو مسز ایشیا انہیں کہیں نظر نہ آئیں ——— دراصل وہ پائیں باغ سے نکل کر اس وقت اپنے گھر پہنچ چکی تھیں۔

مسز ایشیا نے خجل ہو کر مسٹر بھارت سے اس تکلیف دہی کی معافی چاہی اور اپنے گھر لوٹ آئے ——— جہاں مسز ایشیا اپنے تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر ان کے استقبال کے لئے تیار تھیں۔

"کہاں گئی تھیں کل ——— سرکار؟" مسٹر ایشیا نے طنزیہ پوچھا۔

"ایک دوست کے ہاں۔ ڈارلنگ" مسز ایشیا نے اپنی لاکھوں ملین پونڈ والی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔

"کون ہے وہ؟ ——— کیا میں اس کا نام جان سکتا ہوں؟"

"مس چین ——— ڈارلنگ تم اتنے Suspicious کیوں ہو؟"

"مس ——— چین؟" مسٹر ایشیا نے کوک کر کہا "مس چین تو کل رات میرے پاس ———" مسٹر ایشیا نے اپنی زبان دانتوں میں دبالی۔ غصہ میں ان کی زبان سے وہ بات نکل گئی جو انہیں مسز ایشیا سے چھپانی تھی۔

اب مسز ایشیا کے بگڑنے کی باری تھی۔ انہیں کچھ کہنے کے لئے ہاتھ لگ گیا۔ وہ چیخ کر بولیں "تو کل رات تم میری عدم موجودگی میں مس چین کے ساتھ مزے اڑا رہے تھے ——— تم بدمعاش ہو ——— میں تمہیں ابھی اور اسی وقت طلاق ———"

مسٹر ایشیا نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں بدمعاش ——— اور تم بڑی پارسا ہو۔ کل رات جو تم مسٹر بھارت کے ساتھ ———"

"ہاں ہاں ——— میں مسٹر بھارت کے ہاں تھی ——— میں جانتی تھی کہ تم مس چین کو بلاؤ گے ——— میں جانتی تھی۔ مس چین تم سے Love کرتی ہے ——— تم موقعہ کے منتظر تھے ——— تمہیں موقعہ مل گیا ——— تم ایک بدمعاش مرد ہو ——— میرا تمہارے ساتھ نباہ نہیں ہو سکتا ——— ہرگز نہیں ——— بس اب Divorce

اور مسز ایشیا نے رونا شروع کر دیا ——— مسٹر ایشیا سب بھول بھال کر مسز ایشیا کے آنسو پونچھنے لگے ——— اور جب آنسوؤں کی بارش تھمی تو مسٹر ایشیا کے ایک سے زیادہ "دانشوں" سے مستفید ہونے کے حق کو تسلیم کر چکے تھے اور خود اپنے لئے بھی "رعایتیں" حاصل کر چکے تھے۔

مسٹر اور مسز ایشیا کی زندگی اب پھر پُرسکون معلوم ہوتی تھی۔

وہ دونوں اپنے "حقوق اور رعائتوں" سے خوب فائدہ اٹھا رہے تھے اور ان کی زندگیاں اب دوسروں کے لئے قابلِ تقلید بن چکی تھیں۔

مسٹر ایشیا نے سیاست کے میدان میں قدم رکھ کر اپنے لئے ایک اونچا مقام پیدا کر لیا تھا۔ اور وہ اب ایک نہیں کئی ایشیائی قوموں کے چہیتے لیڈر بنتے جا رہے تھے۔

مسز ایشیا نے عورتوں کو منظم کر کے ان میں روح آزادی پھونک کر اپنی قیادت کا سکہ جما لیا تھا۔ اور ان کا نام اب ایشیا کی چوٹی کی عورتوں میں شمار ہونے لگا تھا۔

لیکن ایک دن جب مسز ایشیا نے مسٹر ایشیا کے کان میں یہ خبر سنائی کہ وہ عنقریب ہی ایک بچے کی ماں بننے والی ہیں تو مسٹر ایشیا کچھ گھبرا سے گئے اور ان کے اطمینان اور سکون میں فرق آ گیا۔

ان کے گھر میں کسی بچے کی ضرورت نہ تھی ——— اور نہ گنجائش۔

مسٹر ایشیا نے پوچھا "کب تک؟"

جواب ملا "آج اور کل میں"

"ارے ——— تم نے مجھے اب تک کیوں نہیں مطلع کیا؟"

"اوہ ——— ڈیئر" مسز ایشیا نے کسی قدر جھینپتے ہوئے کہا "میں اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح میں اس بچے کو گرا دوں مگر تمام تدبیریں بیکار ثابت ہوئیں اور اب ———"

"کوئی بات نہیں ——— اسپتال میں داخل ہو جاؤ"

مسٹر ایشیا یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے ——— ان سے مسز ایشیا کی اب بہت کم ملاقات ہوا کرتی تھی اور ان کا مسز ایشیا سے اب کچھ یوں ہی سا تعلق رہ گیا تھا ورنہ وہ ایک دوسرے کے لئے تقریباً اجنبی ہو چکے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے دن اور رات کا بیشتر حصہ گھر سے باہر ہی گذار دیا کرتے تھے۔

مسٹر ایشیا کمرے کی تنہائی میں بیٹھ کر سوچنے لگے ——— "یہ بچہ کس کا ہے؟ میرا یا ———؟" اس خیال سے انکا دماغ پراگندہ ہونے لگا۔

اب وہ جب کبھی کچھ کرتے نہ ہوتے تو اس آنے والے بچے کے متعلق سوچا کرتے اور انھیں یہ خیال کہ "یہ بچہ ان کا نہیں" بار بار ستاتا اور ان کے دل پر کچوکے لگاتا۔

وہ سوچتے "ممکن ہے ——— بچہ میرا ہی ہو ——— لیکن اس کا ثبوت؟ شاید یہ بچہ کی شکل دیکھ کر کوئی فیصلہ ہو سکے۔"

مسٹر ایشیا انتظار کرنے لگے۔

آخر وہ دن آیا جب مسز ایشیا نے ایک خوبصورت لڑکی کو جنم دیا۔ یہ لڑکی کس کی ہے؟ اس کی شکل کس سے ملتی جلتی ہے؟ مسٹر ایشیا کوئی اندازہ نہ لگا سکے ان کا دل

شکوک وشبہات کا ویسے ہی آماج گاہ بنا رہا جیسا کہ لڑکی کی پیدائش سے قبل۔

انہوں نے مس بھارت، مس برما، مس پاکستان، مس چین سے دریافت کیا لیکن وہ بھی کسی صحیح فیصلہ پر نہ پہنچ سکیں ـــــ مسٹر ایشیا نے ناامید ہو کر لڑکی کے اصلی باپ کا کھوج لگانا بند کر دیا اور چار و ناچار اس کا باپ بننا گوارا کر لیا ـــــ مگر جب بھی وہ اسے دیکھتے تو یہ سوال فوراً ان کے ذہن میں ابھرتا "کہ کیا یہ میری اپنی بچی ہے؟"

مسٹر ایشیا ابھی اس مسئلہ کو سلجھا نہ پائے تھے کہ ایک دوسرا مسئلہ سامنے آگیا۔

مس بھارت نے اپنے ناجائز بچے کا باپ مسٹر ایشیا کو بنا کر ہرجانہ کا دعویٰ دائر کر دیا ـــــ یہ سنسنی خیز خبر پورے ایشیا میں اخباروں کے ذریعہ پھیل گئی اور مسٹر ایشیا کو اس میں اپنی سیاسی موت نظر آنے لگی ـــــ انہوں نے ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے مس بھارت سے خفیہ مفاہمت کر لی جس کے نتیجہ کے طور پر مس بھارت کے بچے کی کفالت کا بار انہوں نے اپنے سر لیا اور مس بھارت اپنے دعوی سے دست بردار ہو گئیں۔

یہ مصیبت سر سے ٹلی ہی تھی کہ ایک تازہ مصیبت نازل ہوئی۔

مس چین کے سکم سے بھی ایک ناجائز بچہ پیدا ہو گیا جس کا باپ مسٹر ایشیا ہی کو بننا پڑا۔ اور ابھی مسٹر ایشیا دو ہی ناجائز بچوں کے باپ بنے تھے کہ مس پاکستان اور مس برما کے بھی اپنے ہونے والے ناجائز بچوں کے باپ بننے کا المیہ ڈیمانڈ ہو گیا۔

مسٹر ایشیا بوکھلا گئے ـــــ بلکہ آدھے پاگل ہو گئے۔ کیا یہ بات انھیں پاگل بنانے کے لئے کافی نہ تھی کہ وہ ایک مشکوک لڑکی کے باپ تھے اور دوسرے یہ کہ ناجائز بچوں کے باپ بنا دیئے گئے تھے اور اب دو مزید پیدا ہونے والے ناجائز بچوں کی ذمہ داری ان کے سر تھوپی جا رہی تھی؟ کیا وہ واقعی ان بچوں کے باپ تھے؟ آخر اس کا کیا ثبوت تھا کہ مس بھارت، مس چین، مس پاکستان اور مس برما کے بچے مسٹر ایشیا ہی کے تھے؟ اس لئے مسٹر ایشیا نے ان تمام موجودہ اور آئندہ بچوں کی ذمہ داری کو بچنے کا ایک طریقہ سوچ لیا ـــــ صاف انکار ـــــ ہاں انہوں نے مسز ایشیا کی لڑکی کے باپ بننے سے بھی انکار کی ضرورت محسوس کی ـــــ انکار ـــــ انکار ـــــ ہاں میں انکار کرتا ہوں" مسٹر ایشیا نے بلند آواز سے کہا ـــــ "میں کسی کا باپ نہیں، میں کسی کا شوہر نہیں"۔ اور اس انکار کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے اپنی میز کی دراز سے اپنا ریوالور نکالا ـــــ اور اسے بھر کر جیب میں ڈال لیا۔

"پہلے مسز ایشیا اور ان کی لڑکی" ـــــ ذہن نے رہنمائی کی اور مسٹر ایشیا نے اسی حالت میں مسز ایشیا کے کمرے میں جا کر ان سے پوچھا "یہ لڑکی کس کی ہے؟ ـــــ میری یا کسی اور کی؟ بولو ـــــ جلد بتاؤ"

مسٹر ایشیا کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا۔

مسز ایشیا ڈر گئیں ـــــ اور ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

مسٹر ایشیا نے بڑھکر مسز ایشیا کے شانے میں اپنی انگلیاں گڑو دیں ـــــ مسز ایشیا کی چیخ نکل گئی۔ اور وہ بول اٹھیں "تمہاری" ـــــ لیکن مسٹر ایشیا اب مزید کچھ سننے اور سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے ـــــ ان کا ہاتھ جیب میں پڑے ہوئے ریوالور تک پہنچ گیا۔

اور چند ہی سیکنڈ میں مسز ایشیا اور ان کی لڑکی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں ـــــ اور مسٹر ایشیا اپنے ہوش و حواس سے ـــــ اب وہ پورے پاگل ہو گئے تھے۔ اور انہیں پورا اطمینان اور سکون حاصل ہو گیا تھا ـــــ

(محترمہ) بنتِ حماد۔ بی۔ اے

آنسو

"منو" میں نے اپنی کھڑکی کھول کر پکارا۔

تھوڑی ہی دیر بعد میلے کپڑے پہنے گورا سا چھوٹا سا منو دوڑتا ہوا آیا۔

"کیا ہے باجی" وہ کھڑکی کے نیچے آکر بولا۔

"کیا کر رہے ہو" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں کھیل رہا تھا" وہ جلدی سے بولا۔

"کیا کھیل رہے تھے" میں نے پھر پوچھا۔

"کوڑیاں" اس نے کہا اور ساتھ ہی اس نے اپنی چھوٹی سی مٹھی کھول دی جس میں تین چار سفید سفید کوڑیاں تھیں اور پھر جلدی سے اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ پیسے نکالے "اور یہ دیکھئے میں نے رامو سے پیسے جیتے ہیں" وہ پیسے دکھاتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو تم نے پھر سے کوڑیاں کھیلیں۔ جاؤ میں نہیں بولتی" یہ کہہ کر میں نے کھڑکی بند کر لی۔ تھوڑی دیر تک تو باجی باجی کی آواز آتی رہی۔ مگر پھر آواز بند ہو گئی۔ شاید وہ پھر سے رامو سے پیسے جیتنے چلا گیا۔

تو یہ تھا میرا ننھا پڑوسی منو۔ جس سے میری حال ہی میں دوستی ہوئی تھی۔ بھولی بھولی صورت اور گھنگھریلے بالوں والا یہ منو مجھے اپنے دوستوں میں سب سے زیادہ پسند تھا۔ یوں تو اس کی ماں کو میں بہت پہلے سے جانتی تھی۔ وہ اپنے دو اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ میرے پڑوس میں رہتی تھی۔ اور اس کا باپ کہیں باہر نوکری کرتا تھا۔ اور یہ پورا خاندان صرف ان تھوڑے سے روپیوں پر گزر کرتا تھا جو ہر ماہ اس کے باپ کے پاس سے آیا کرتے تھے۔ کیسے گزر ہوتی تھی یہ تو میں معلوم نہ کر سکی مگر اس کی ماں کی زبانی اس کی تنگی کے قصے میں برابر سن چکی تھی۔ اور اکثر تو گرمیوں کی لمبی دوپہر وہ اماں سے باتیں کر کے گذار دیتی تھی۔ اور روپوں ڈھلنے کے بعد جب وہ جانے لگتی تو بھینچتے ہوئے کبھی دال کبھی چاول اور کبھی آٹا مانگتی جاتی۔

میں اکثر سوچتی تھی کہ یہ یوں مانگ مانگ کر کیوں گزر کرتی ہے کیوں نہیں۔ کہیں نوکری کر لیتی۔ مگر اس سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی کیونکہ اگر اماں سن لیتیں تو اُلٹا مجھ پر خفا ہونے لگتیں کہ غریبوں کو ذلیل نہیں چاہتی۔ مگر بٹے کے ٹوٹوں کو اس طرح بھیک دیتے مجھ کو بہت برا لگتا ہے۔ اور ایک دن حسب عادت وہ کمرے کے فرش پر لیٹی ہوئی اماں سے اپنا رونا رو رہی تھی۔

"یوں روز روز مانگتے شرم آتی ہے مگر کیا کروں" وہ افسردہ سی ہو کر بولی

"تو پھر تم کہیں نوکری کیوں نہیں کر لیتیں" میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"کیا کروں بی بی میرا مالک بڑا ظالم ہے" وہ بولی۔ "اگر وہ سن لے گا کہ میں نے نوکری کر لی ہے تو گھر ہی سے نکال دے گا"

"یہ آخر کیوں" میں نے پوچھا

"کہتا ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں تجھے نوکری نہ کرنے دوں گا" اس نے کہا۔ "تو پھر تم اپنے بچوں میں سے کسی کو کہیں نوکر رکھا دو" میں نے رائے دی۔

"منو کو فوج صاحب کے یہاں رکھا تھا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد انہوں نے اسے مار کر نکال دیا۔ تب سے وہ ڈر کے مارے کہیں نہیں جاتا" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"مار کر نکال دیا تھا" میں نے تعجب سے کہا اچھا اس کو میرے یہاں بھیج دینا میں رکھ لوں گی۔

"اس سے بہتر بات اور کیا ہو سکتی ہے" وہ تشکر آمیز لہجے میں بولی۔ میں اس سے جا کر کہوں گی اگر وہ آیا تو رکھ لیجئے گا۔

اور پھر ہمیشہ کی طرح دوپہر ڈھلنے کے بعد وہ چلی گئی۔ مجھ کو تو یقین تھا کہ وہ منو کو کہیں نہیں بھیجے گی۔ اور ہوا بھی یہی۔ میں بھی رفتہ رفتہ اس تذکرے کو بھول گئی۔

تھوڑے دنوں کے بعد ایک بار وہ پھر آئی مگر ہمیشہ کی طرح مسکرائی نہیں بلکہ اس دن ایک عجیب سی گھبراہٹ اس کے چہرے پر تھی آتے ہی اس نے کہا۔

"بی بی مجھ کو تھوڑی سی ہلدی دیدو"

"کیا کرو گی" میں نے سوال کیا۔

"منو کو چوٹ لگ گئی ہے۔ پیس کر لگاؤں گی" اس نے گھبراتے ہوئے کہا

"کیسے لگ گئی"

"کیسے بتاؤں" وہ روندے ہوئے گلے سے بولی۔ "جب اپنا ہی سونا

کھوٹا ہے تو سنار کا کیا دوش" یہ کہتے ہوئے وہ ایسے ایسے ڈگ بھرتی ہوئی چلی گئی۔

تین چار دن گذر گئے۔ ایک دن میں اپنے صحن میں کھڑی ہوئی گلاب کے پودوں کو دیکھ رہی تھی کہ ایک چھوٹا سا لڑکا میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"کون ہو تم اور کیا کام ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

میرے اس سوال پر وہ ایک دم گھبرا گیا۔ اور خاموش کھڑا رہا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" میں نے تھوڑی دیر ٹھہر کر پوچھا۔

"منو" اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"اچھا تو تم ہی منو ہو۔ میرے باغ کے پیچھے رہتے ہو نہ؟" میں نے کہا

"جی ہاں" اس نے جلدی سے جواب دیا۔

"کیا کام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ماں نے یہ بھیجا ہے" یہ کہہ کر اس نے ایک میلی سی پوٹلی میری طرف بڑھا دی۔ "کیا ہے اس میں" میں نے برا سا منہ بنایا۔ گندے کپڑے کو دیکھ کر مجھ کو گھن آئی۔

مجھ کو اس قدر برا منہ بناتے دیکھ کر اس نے جلدی سے پوٹلی پیچھے کر لی۔ اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھ کو گھور کر دیکھنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو میں نے تو ماں سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ نہ بھیج۔ وہ لوگ بڑے آدمی ہیں۔ بھلا یہ کیا پسند کریں گے۔ ایسی چیزیں تو ان کے یہاں کے نوکر بھی نہیں کھاتے۔ مگر ماں نے ضد کر کے بھیجا۔

"اچھا لاؤ" میں نے مسکرا کر کہا اور اس نے ڈرتے ڈرتے پوٹلی میرے ہاتھوں میں دے دی۔ میلی سی اور کالے کالے دھبوں والی پوٹلی لیکر میں برآمدے میں آگئی۔ سائے میرے پیچھے پیچھے وہ بھی آہستہ آہستہ آگیا۔

اور پوٹلی کے کھلتے ہی ننھے ننھے گول گول جامن میری گود میں بکھر گئے۔

"ارے اس میں تو جامن ہیں" میں خوش ہوتے ہوئے بولی۔ جلدی سے ایک جامن میں نے منہ میں رکھ لیا۔ "اور میٹھے بھی ہیں" میں نے کھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمارے آنگن کے ہیں" اس نے جلدی سے کہا۔ "ہم اس میں روز پانی ڈالتے تھے۔ مگر ماں ہم لوگوں کو کھانے نہیں دیتی۔ کہتی ہے کہ نقصان کریں گے" اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"تو کیا تم جامن نہیں کھاتے" میں نے اس کا مزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں آج کل تو برابر کھاتا ہوں۔ ماں دوپہر کو کھانا نہیں پکاتی۔ تھوڑے سے جامن توڑ کر دے دیتی ہے اور ہم دہی کھا لیتے ہیں"

"کیا پیٹ بھر جاتا ہے" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں" اس نے ہاں کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔ "تھوڑے سے جامن کھا لیتا ہوں اور ڈھیر سا پانی بس پیٹ بھر جاتا ہے"

"اچھا تو چلو آج میں اپنے کھانے سے تمھارا کھانا بدل لوں" اور میں اس کو ساتھ لے کر دو تین کمرے پار کرتی ہوئی ایک کمرے میں گئی۔

"یہ لو" یہ کہہ کر میں نے آٹا اس کے کپڑے میں ڈال دیا۔ اپنی ماں سے کہنا وہ تم کو روٹی پکا دے گی۔

"اچھا" کہہ کر وہ جلدی جلدی آٹا باندھنے لگا۔

"کچا ہی نہ کھا جانا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ بہت زور سے ہنسا اور پوٹلی باندھ کر صحن میں دوڑ گیا۔

"سنو منو" میں نے پھر پکارا۔ قریب آنے پر میں نے ایک چونی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ "یہ پیسے تو تم کو دینا بھول ہی گئی" منو نے اپنی لمبی لمبی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے جلدی سے مٹھی بند کر لی۔ اور پھر کھول دی اور پھر غور سے چاندی کی چمکتی ہوئی چونی کو دیکھنے لگا۔

"کیا میں اسے لے جاؤں" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں لے جاؤ" اپنی ماں کو دیدینا" میں نے کہا اور وہ خوشی میں دوڑتا ہوا چلا گیا۔

یہ تھی میرے ننھے دوست کی پہلی ملاقات۔ اور مجھ کو پہلی بار منو بہت پیارا لگا۔ پھٹے ہوئے گندے کپڑوں میں وہ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کا بھولا پن اس کے بے بسی کے افسانے پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں تنگدستی کے قصے دہرا رہی تھیں۔ اگر یہ کسی بڑے آدمی کے گھر پیدا ہوا ہوتا تو اس کی کتنی قدر کی جاتی۔ جب یہ اپنے اس پیارے انداز سے باتیں کرتا۔ اور لوگ اس کے بھولے پن کی تعریفیں کرتے تو اس کے باپ کا سر فخر سے اور اونچا ہو جاتا۔ میں بڑی دیر تک منو کے بارے میں سوچتی رہی۔

"بی بی چلئے کھانا کھا لیجئے" اپنی بوڑھی خادمہ کی آواز نے مجھ کو چونکا دیا۔ اور میں بغیر ایک لفظ بولے ہوئے کھانے کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

اماں کھانا لئے ہوئے میری منتظر تھیں۔ بلکہ انہوں نے اپنی پلیٹ میں نکالنا شروع بھی کر دیا تھا۔ "جلدی سے ہاتھ دھو کر آجاؤ" انہوں نے کہا اور کھانا شروع کر دیا۔ میں بھی فوراً ہی حکم کی تعمیل کی۔

آج اماں نے میری پسندیدہ چیزیں پکوائیں تھیں۔ اور میں جلدی جلدی اپنی پلیٹ میں کھانا نکالنے لگی۔ مگر جیسے ہی میں نے ایک نوالہ کھایا تھا کہ مجھے منو یاد آگیا۔ "تھوڑے سے جامن کھا لیتا ہوں اور ڈھیر سا پانی بس پیٹ بھر جاتا ہے"

ہے۔" اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ بیچارہ منو صرف جامن اور پانی سے پیٹ بھر لیتا ہے اور میرے دسترخوان پر قسم قسم کے کھانے چُنے ہوئے ہیں نہ جانے کیوں میں افسردہ ہو گئی اور باوجود کوشش کے بھی میں دو چار لقموں سے زیادہ نہ کھا سکی۔

"بس کھا چکیں۔" اماں نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اماں آج بھوک نہیں ہے۔ میں نے جامن کھائے تھے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہزار دفع منع کر دیا کہ بے وقت کچھ نہ کھایا کرو۔ مگر تم سنتی نہیں ہو"

اماں خفا ہوتے ہوئے بولیں۔ "یہ لو تھوڑا سا حلوہ تو کھا لو" انہوں نے پلیٹ میری طرف بڑھا دی۔ میں نے ایک چمچہ حلوہ لے لیا مگر وہ تو جیسے میری حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ وہ سوکھے سوکھے جامن جو روزانہ منو کھاتا ہے مجھے یاد آ گئے۔ کیسے کھاتا ہوگا بیچارہ میں سوچنے لگی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ خس کی ٹٹیوں کی وجہ سے یہاں خاصی ٹھنڈک تھی اور ایک قسم کی بھینی بھینی خوشبو میرے کمرے کی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں پلنگ پر دراز ہو گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر آج تو جیسے نیند نے نہ آنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ رہ رہ کر مجھے منو یاد آ رہا تھا اس کے پریشان بال، بڑی بڑی آنکھیں۔ بھوا پھرے اور پھٹے کپڑے میرے ذہن میں اُبھرتے اور ڈوبتے رہے۔ بیچارہ لو کے تھپیڑوں کے درمیان کھیل رہا ہوگا۔ ماں کے پاس کھانا مانگنے گیا ہوگا۔ تھوڑے سے جامن اور ڈھیر سا پانی پی کر وہ پھر کھیلنے چلا گیا ہوگا اور شاید جامن ختم ہو جانے کے بعد اس کو صرف پانی ہی پی کر گھومنا پڑے۔ میں نے بے چین ہو کر کروٹ لے لی۔ نہیں منو میں تم کو یوں نہیں گھومنے دوں گی۔ میں تم کو اس طرح فاقے نہیں کرنے دوں گی۔ تم اتنی آسانی سے بربادی کی طرف نہیں جا سکتے اور میں بڑی دیر تک اپنے خیالی منو سے باتیں کرتی رہی، نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

سو کر اٹھی تو دن ڈھل چکا تھا۔ آفتاب کی تمازت میں کمی آ گئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی تو اماں لسی بنانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نہ؟"

"سر میں ہلکا سا درد ہے۔" میں نے بہانہ بنا لیا۔

"کچھ کھا لو تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔" انہوں نے پھلوں کی پلیٹ میری طرف سرکا دی،

میں نے ایک سیب کا ٹکڑا اٹھا لیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ ذرا باغ میں ٹہل آؤں شاید دل بہل جائے۔ باغ کا خیال آتے ہی مجھے منو یاد آ گیا میں نے ایک بڑا سا سیب اٹھا لیا اور صحن پار کر کے باغ میں آ گئی۔ یہ باغ میرا ذاتی تھا۔ اس میں میری ہی پسند کے پھول لگے تھے۔ گلابوں کے تختوں کے درمیان ہوتی ہوئی۔ میں باغ کے آخری کنارے پر پہنچ گئی۔ اور دروازہ کھول کر میں نے منو کو پکارا وہ کسی سے لڑ رہا تھا مگر میری آواز سنتے ہی دوڑا ہوا آ گیا۔

"کس سے جھگڑ رہے تھے" سنو میں نے پوچھا۔

"راموے" اس نے کہا۔ اس سے میں نے دو پیسے جیت لئے مگر وہ نہیں دیتا۔ اور پھر وہ کوڑیاں دکھا کر بولا "یہ دیکھئے روزانہ کوڑیاں کھیل کر چار پیسے جیت لیتا ہوں"

"میرے ساتھ آؤ" میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئی ہم دونوں گلابوں کے تختوں کے درمیان والے چبوترے تک آ گئے "یہیں کوڑیاں کھیلنے کو ماں منع نہیں کرتی۔" میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ماں کیوں منع کرے گی" اس نے تعجب سے پوچھا۔ اے میرے سوال پر تعجب ہوا پیسے لے جا کر روز انہ ماں ہی کو تو دیتا ہوں جس سے وہ نمک۔ مرچا۔ پان اور ضرورت کی دوسری چیزیں منگاتی ہے۔ بھلا وہ کیسے کیوں منع کرے گی۔

"تم آج سے کوڑیاں کھیلنا بند کر دو" میں نے اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو منو اگر تم کوڑیاں کھیلنا چھوڑ دو گے تو سب تم کو پیار کریں گے اور اگر تم کہنا نہیں مانو گے۔ روزانہ کھیلو گے تو پھر کوئی تم کو اپنے پاس نہیں بٹھائے گا۔ کوئی تم کو چیزیں نہیں دے گا۔ بولو اب سے تو نہیں کھیلو گے" میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں کھیلوں گا" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا لو یہ سیب کھا لو" میں نے سیب اس کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔

ہم دونوں بڑی دیر تک باغ میں ٹہلتے رہے۔ پھولوں کے درمیان وہ آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ اور پھر ہماری دوستی ہو گئی۔ دن چھپنے کے بعد وہ جانے لگا تو اس نے پھر وعدہ کیا کہ وہ اب سے کوڑیاں نہیں کھیلے گا۔ میں نے اس کی گود میں ڈھیر سے پھول ڈال دیئے اور وہ خوش خوش اپنے گھر کو دوڑ گیا۔

اور دوسرے دن جب میں نے کھڑکی کھول کر پکارا تو وہ پھر کوڑیاں کھیل رہا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ جب وہ آئے گا تو میں باتیں نہیں کروں گی۔ اور پھر میں بیلے کے تختے کی طرف مڑ گئی۔ ابھی حال ہی میں یہ پودے آئے تھے۔ پھولوں سے مجھے عشق ہے اس لئے میں دُور دُور سے پھول منگاتی ہوں۔ میں وہیں بیٹھ گئی اور

غور سے ہر ایک پیٹر کو دیکھ ہی رہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے میری آنکھیں بند کر لیں۔ کون ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا رشید تو ابھی اسکول سے آیا نہیں ضرور یہ منو ہو گا۔

"مذاق نہ کرو منو" میں نے اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ مگر اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی باہیں میری گردن میں ڈال دیں "تم نے کل ہی مجھ سے کہا تھا کہ تم کوڑیاں نہیں کھیلو گے اور آج ہی پھر تم نے کھیلنا شروع کر دیا" میں خفا ہوتے ہوئے بولی۔

"اچھا اب سے نہیں کھیلوں گا" اس نے پھر کہا۔ مگر میں نے سنی کی ان سنی کر دی اور جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی دو چار ہی قدم بڑھائے تھے کہ وہ ہنستا ہوا میرے سامنے آگیا۔

"ہٹ جاؤ منو" میں نے ڈانٹا۔ اور آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر تک تو وہ کھڑا رہا۔ پھر دوڑ کر میرے سامنے آگیا اور ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ "باجی اب سے نہیں کھیلوں گا" وہ ایک دم رونے لگا۔

میرے قدم رک گئے۔ اور وہ میری ٹانگوں سے لپٹا روتا رہا۔ اس کی ہری ہری سیاہ آنکھیں آنسو برسا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنی بھیگی ہوئی پلکیں اوپر اٹھائیں اور بولا "آج کھانے کو نہیں تھا ماں نے کہا کہ جا پیسے لے آیا تو کھانا دوں گی"۔

میں نے اسے جلدی سے گود میں اٹھا لیا۔ وہ اور چمٹ گیا اور رونے لگا۔ مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ میں اس کے آنسو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اور میرا مقصد اس کو رلانے کا تھا بھی نہیں۔

"اچھا منو بس سارے آنسو آج ہی نہ گرا دو" میں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے اسے گدگدایا۔ اور وہ ہنس پڑا۔ اور دوسرے ہی لمحے ہم پھر پہلے کی طرح دوست تھے۔ "سنو منو اب اگر تم کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو تم سیدھے میرے پاس آجایا کرو۔ میں تم کو پیسے بھی دیدوں گی اور کھانا بھی دیدوں گی"۔ میں نے اس سے کہا۔ اور اس دن بھی وہ بڑی دیر تک آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔

"آؤ یہاں تھوڑی دیر آرام کر لیں" میں ایک گلاب کی جھاڑی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"میرے پاس رہو گے منو" میں نے اس سے پوچھا کیونکہ میں اس کو اس راستہ پر سے ہٹا دینا چاہتی تھی جس پر وہ فی الحال چل رہا تھا۔

تھوڑی دیر تک تو وہ چپ چاپ گردن جھکائے کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "رہوں گا۔ مگر نوکری نہیں کروں گا۔

"کیوں"۔ میں اس کے بھولے پن پر مسکراتے ہوئے بولی۔

"جب میں جج صاحب کے یہاں نوکر تھا تو انہوں نے بہت مارا تھا"۔ وہ افسردہ سا ہو گیا۔

"تم ان کے یہاں کیا کرتے تھے" میں نے پوچھا

بے بی کو کھلاتا تھا۔ جج صاحب کا حکم تھا کہ بے بی روئے نہ پائے۔ اور میں اس کو گود میں لئے دن بھر گھوما کرتا۔ بیگم صاحبہ نے اس کے لئے بسکٹ کے ڈبے منگا دیئے تھے۔ اور مجھے حکم دیا تھا کہ دو بسکٹ صبح اور دو بسکٹ شام دیا کرنا۔ مگر بے بی روئے میں اتنی تیز تھی کہ چپ نہ ہوتی۔ جب تک گود میں لئے پھرتا رہتا۔ اس وقت تک تو ہنستی اور خاموش رہتی لیکن جب اسے بٹھا دیتا تو وہ پھر رونا شروع کرتی۔ تمام دن کھڑے کھڑے میں تھک جاتا۔ آخر میں نے ایک ترکیب سوچ نکالی۔ جب بے بی رونا شروع کرتی میں جھٹ سے اسے ایک بسکٹ نکال کر دے دیتا۔ پھر ایک گھنٹہ کی چھٹی ہو جاتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس ڈبے کو ایک مہینے میں ختم ہونا چاہئے وہ پندرہ ہی دن میں ختم ہو گیا۔ بے بی نے پھر رونا شروع کیا اور مجبوراً مجھ کو بتانا پڑا کہ بسکٹ کا ڈبہ ختم ہو گیا مگر یہ سنتے ہی کہ اب ان کو دوسرا ڈبہ منگانا پڑے گا وہ پھر پرس پڑیں۔ تھپڑ اور گالیوں کے درمیان وہ مجھ سے پوچھتی رہیں کہ ڈبہ کیسے ختم ہو گیا۔ بھلا باجی میرے پاس اس کا کیا جواب تھا" وہ میرے ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

اور پھر مجھ پر چوری کا الزام لگایا گیا۔ اس نے کچھ دیر رک کر پھر کہنا شروع کیا۔ یہ خود ہی سارے بسکٹ کھا گیا ہو گا۔ بیگم صاحبہ نے کہا۔ خیر اس مرتبہ تو تھوڑی سی مار کھا کر بچ گیا۔ اور بے بی کے لئے دوسرا ڈبہ آگیا۔ اب میں نے بسکٹ دینے بند کر دیئے۔ لاکھ رونے پر بھی بے بی کو دن بھر میں چار بسکٹ سے زیادہ نہ ملتے۔ اس کے بسکٹوں میں کمی آگئی اور ساتھ ہی میرے کھانے میں بھی بیگم صاحبہ نے کمی کر دی۔ مجھے اتنا کم کھانے کو ملتا کہ میرا پیٹ نہیں بھرتا۔ مجھ سے روز روز بھوک برداشت نہ ہوتی اور ایک دن تو بھوک کے مارے میں رونے لگا۔

"تو تم نے بیگم صاحبہ سے کیوں نہیں کہا؟" میں نے اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

کہا تھا۔ جواب یہ ملا کہ اس سے زیادہ نہیں مل سکتا۔ چوری بھی کرے گا اور زیادہ کھائے گا بھی۔ پھر ایک دن بے بی کو بسکٹ دیتے وقت میرا دل بے اختیار چاہا کہ ایک بسکٹ میں بھی کھا لوں۔ دو بسکٹوں کے درمیان شکر کی ہلکی سی گلابی رنگ کی تہہ کتنی اچھی لگتی تھی۔ میں نے سوچا کہ جب میں نے بسکٹ نہیں کھائے تھے تب بھی میرا نام لگا تھا۔ مار بھی کھائی تھی اور کھانا اوپر سے کم ہو گیا تو کیوں نہ اب کھا لوں۔ اور یہ سوچ کر میں نے

جلدی سے ایک بسکٹ منہ میں رکھ لیا۔ ابھی میں اس کو کھا ہی رہا تھا کہ بیگم صاحبہ نے دیکھ لیا۔ پھر کیا تھا خوب مارا اور اس پر بھی جب ان کو تسلی نہ ہوئی تو جج صاحب سے کہہ دیا۔ اور انہوں نے اپنا بید جو شاید اس موقع کے لئے رکھا تھا منگوا کر مجھ کو مارنا شروع کیا۔ اور یہ دیکھئے یہ اسی بید کا نشان ہے جو بڑی دیر لگانے کے باوجود اب بھی باقی ہے۔ اور اس نے اپنی آستین اٹھا کر کہنی کے پاس ایک نیلے سے نشان کو دکھایا۔

"تو یہ تمہاری چوری کا نشان ہے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ اور اس کا چہرہ اُتر گیا۔

"مگر اب سے چوری نہیں کروں گا" وہ روتے ہوئے بولا۔

بے چارہ منو۔ میں سوچنے لگی۔ کتنے ظالم ہیں جج صاحب۔ ایک معصوم پر ہاتھ اٹھاتے انھیں برا نہ لگا۔ وہ تو اسے اپنی بی کی طرح چمکار کر اور پیار کر کے منع کر سکتے تھے۔ یا زیادہ سے زیادہ ڈرا اور دھمکا کر راہِ راست پر لا سکتے تھے۔ اسے اس لئے مارا کہ اس نے بی کے بسکٹ کھائے تھے۔ کیا انھوں نے منو کے حق میں صحیح فیصلہ کیا۔ کیا انہوں نے اس بے گناہ کو ٹھیک سمجھا۔ وہ ابھی انصاف نہیں کر سکتے کیونکہ وہ خود غلط راستے پر ہیں۔ جو خود گناہ گار ہو وہ بے گناہوں اور گناہ گاروں کو کیسے چھانٹ سکتا ہے۔ میرے ذہن میں منو، جج صاحب ان کا بید اور منو کی ماں۔ دیر تک پھرتے رہے۔ میں اس وقت چونکی جب منو نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا۔

"باجی تم چپ کیوں ہو، تمہارے پاس رہ کر چوری نہ کروں گا۔ کوڑیاں نہ کھیلوں گا۔ اور وہ روز دکر نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔

"بولو نہ باجی کیا تم پھر روٹھ گئیں"۔ وہ مجھ سے چمٹ کر روتے ہوئے بولا۔

اور میں چونک پڑی "نہیں منو میں تم سے خفا نہیں ہوں میں تم کو اپنے ہی پاس رکھوں گی"۔ اور میں نے اس کے آنسو چوم لئے۔ کیونکہ یہ میرے معصوم دوست کے پاکیزہ آنسو تھے جو اس نے میری گود میں بہائے تھے۔

چراغ کیوں جلے؟

(بقیہ صفحہ ۴۰)

بوڑھے سنتو کا یہ احساس جوان تھا۔ جس کی گرمی سے رجنی کی ساری متحرانہ صلاحیتیں جل گئیں، اور وہ بھی بھوں چکا ہو کر سوچنے لگا۔ اس جملہ کا ایک ایک لفظ اس کے ذہن پر مستقل نقش بن گیا تھا۔ سنتو نے اپنا جملہ پھر دہرایا۔ بات ذہنوں میں چبھ گئی۔ گاؤں کا یہ سادہ ماحول اب فلسفہ کا خشک ریگستان بن گیا تھا۔ جس کا کھردرا پن خود سنتو کو کچھ اچھا نہیں لگا اور اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب بتاؤ بھیّا! تم نے دیا کیوں جلایا؟"

قریب بیٹھا ہوا جگشر اہیر کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ رام جتن بول اٹھا۔

"چاچا، اپنا گھر جلاوے کھاتر (خاطر)"

حسن شاہدی

مشیّت کا پیار

مشیت ایزدی نے کہا
"جاؤ ——"
اور کالی کالی بدلیوں کی ٹولیاں پیاسی زمین کے اوپر تیرنے لگیں —— زمین نے حسرت بھری نظر دوڑائی سسکتی ہوئی ہواؤں کا ایک جھونکا گرد و غبار کو اپنے دامن میں لئے آگے بڑھا اور کہا
"—— تمہاری آنکھیں بہت اداس ہیں ——"
"ہاں —— لیکن تم جاؤ ——"
"کہاں ؟"
"ان امراتے ہوئے بادلوں کے قریب، انہیں میرا پیام پہونچا دو۔ میں مدت کی پیاسی ہوں۔ اگر وہ نہیں آئیں گے تو میں پیاس کی تاب نہ لاکر ریگ کا ایک ڈھیر بن جاؤں گی۔ اور میرے سینے پر قدرت کے یہ رنگ برنگ بچے تڑپ تڑپ کر جان دیدیں گے ——!"
"میں جاؤں گا، میں جاؤں گا" سسکتی ہوئی ہواؤں کا جھونکا اس بربادی کے تصور سے کانپ گیا۔ اور اس کی خشک آنکھوں کے چند قطرے ڈھلک آئے۔
پیاسی زمین نے کہا۔
"کچھ دیر اور رو لو ——"
"——"
"تمہارا رونا بھی فائدہ سے خالی نہیں۔ میری چھاتی پر ایک درخت اُگا ہے۔ نیکی کا درخت، ڈالیاں اور تنے سب ننگے ہیں اس کے —— اس درخت کی ان ننگی ڈالیوں میں دو چار کلیاں کھلنے کو تھیں۔ وہ کلیاں جن کو پنکھڑیوں میں اس وقت آرام کر رہی ہیں۔ وہ اب مرجھانے لگی ہیں۔ اگر وقت پر انہیں پانی نہ ملا تو پھر وہ کبھی تر و تازہ نہ ہو سکیں گی، تمہاری آنکھوں کے پانی سے میں انہیں کچھ دیر تر و تازہ رکھنے میں کامیاب ہو سکوں گی۔"

یہ سسکتی گرم ہوا کے جھونکے کا دل بھر آیا۔ اس کی پیشانی پر ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے۔ اس نے حسرت کے ساتھ سر ہلایا ——
اور قطرے ڈھلک کر زمین کی چھاتی پر آرہے ——!
زمین کی پیاسی آنکھوں میں جذبۂ تشکر کی روشنی نظر آئی ——!
"مگر اب تم جاؤ ——"
"کہاں ——؟"
"ان ٹیالے بادلوں کے قریب —— کہنا، تمہیں زمین حسرت سے تکتی ہے۔ تم فطرت کی بہترین نعمت ہو —— تمہاری ضرورت سب سے پہلے اس پیاسی زمین کو ہے جس کا میں سفیر ہوں ——"
"تو چلوں ——؟"
"ہاں جاؤ! لیکن ان بدلیوں سے کہنا، تم بہت دیر سے فضائے آسمانی میں چکر لگا رہی ہو۔ آخر کیوں؟ . . . . دنیا کی ہر چیز تمہیں حسرت سے تکتی ہے۔ تمہاری آمد نے ان کے مردہ جسموں میں نئی رُوح ڈال دی ہے۔ لیکن فضائے آسمانی میں محبوب کے گیسوئے پریشان کی مانند لہراتا تو اب چھوڑ دو —— مانا کہ تمہاری ادا مستانی ہے، تمہاری چال متوالی ہے۔ تم فضائے آسمانی کے چوڑے سینے پر یوں لوٹ پوٹ رہی ہو۔ جیسے کالے رنگ کی بط۔ نیلے تالاب میں تیرتی رہتی ہیں۔ مگر چھوڑ دو، ان باتوں کو —— صرف اتنا کہہ دینا کہ اب بھی نہ پہونچو گی تو پھر بعد میں تمہارا برس پڑنا بھی بیکار ہوگا۔ ابھی اسی وقت چلو۔ یہ پیاسی مخلوق کی زمین کا پیغام ہے۔ تمہارے تمام آنسوؤں میں بھیگا ہوا پیغام ——!"
"تو اب مجھے چلنا ہی چاہئے"
"ہاں اب جاؤ، لیکن سنو، یہ بتانا نہ بھولنا کہ اگر تمہیں کسی کی خدمت مقصود ہے تو اپنی اصلی سطح سے کچھ نیچے اتر آؤ —— ورنہ تم کسی کی خدمت کر نہ پاؤ گی۔ بے شک خدا نے تمہیں نیلے آسمان کا پیڑ وسی

بنایا ہے۔ تمہیں زمین کی پستی منظور نہیں۔ لیکن یہ نہ بھولو کہ اگر فطرت کو اس پیاسی زمین کے سیراب کرنے کا خیال نہ آتا تو تمہارا وجود بھی ممکن نہ تھا ــــ تمہیں تو زمین کا شکر گزار ہونا چاہئے۔۔۔۔۔ یہ شمس و قمر، یہ مصابیح و نجوم ہزار ہا سال سے مسکرا مسکرا کر اس حقیر سی زمین کے احسان کا شکریہ ادا کرتے ہیں صرف تم ہی نہیں ــــ تم؟ ۔۔۔۔۔ تم ناشکرے ہو، زمین کی خلقت پیاسی ہے اور تمہیں اپنی ادا کی سوجھی ہے۔ چلو، جلدی کرو ــــ"

"اچھا تو اب چلتا ہوں میں ــــ"

"ہاں جاؤ۔ اب میں تمہیں روکنا بھی نہیں چاہتی ــــ" زمین نے بالآخر کہا۔ "لیکن یہ بھی کہہ دینا کہ میں اس دھرتی کا سفیر ہوں، جس پر ایک ایسی مخلوق رہتی ہے جو کائنات کے سربستہ رازوں کی امین ہے۔

۔۔۔ یاد رکھو۔ اس شربتِ فنا کو تم نے وقت پر سیراب نہ کیا تو وہ اپنی حکمت کے ذریعے پتھروں کو آگ اور آگ کو پانی بنا دے گی۔ تمہارے سینے کو چیر کر چاند ستاروں کی زرین دنیا میں پہونچ جائے گی۔

۔۔۔ یاد رکھو، یہ اپنی کفالت کی محتاج ہے، لیکن ناکامی کی ذرا سی تلخی اس کے اندر سرگرمی کا ایک شعور پیدا کر دیتی ہے۔ کیا تمہارے دل میں خدا کی اس پسندیدہ مخلوق کی کچھ بھی قدر نہیں ــــ؟"

"ہاں میں یہ سب کچھ کہہ دوں گا" ہوا کا جھونکا بیتاب ہو اٹھا۔

"اور سنو ــــ"

"نہیں، میں اب کچھ نہیں سنوں گا۔ میں چلتا ہوں ــــ" دور سے آواز آئی۔

"آ گئے تم ــــ؟"

"ــــ"

"بولتے کیوں نہیں پیارے"

اور پروین آمیز ہوا کے جھونکے کے جسم پر پسینہ آ گیا۔ زمین کی تھرائی ہوئی آنکھیں اس پر اٹھیں۔ اور وہ سہم گیا۔ بدن میں جھرجھری جو آئی تو کتنے ہی قطرے زمین کی تپتی ہوئی چھاتی پر ڈھلک آئے۔ زمین کے کھلائے ہوئے پھولوں نے اپنے معصوم لب کھول دیئے۔ اور زمین اس دل دوز منظر کی تاب نہ لا کر بلبلا اٹھی۔

"کچھ تو بولو میرے سفیر، کہیں اوس سے پیاس بھی بجھتی ہے۔؟"

ہوا کے جھونکے نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ خشک اور مرجھائی ہوئی آنکھوں میں ناکامیوں کا ڈیرا نظر آیا ــــ زمین کی چھاتی ہل گئی۔ ایک بھونچال آیا۔ اور جا بجا آگ اگلنے والے دہانے پھوٹ پڑے۔ مامتا کی ماری ماں کا کلیجہ شق ہو گیا۔ آتشیں لاوے کا ایک امڈا ہوا سیلاب ابھرا اور آناً فاناً اس نے ساری چیزوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اگلے ہوئے درخت کی وہ ننگی ڈالیاں بھی تھرا اٹھیں، اور ان کی مرجھائی ہوئی کونپلوں کے نازک سینے ہمیشہ کیلئے بیٹھ گئے ــــ؟

روئے زمین پر موت نے جھاڑو پھیر دی ــــ!
ایک بھیانک اور آتشیں منظر ــــ!
پھر ــــ؟
پھر ایک مکمل سکوت ــــ ابدی سکون؟
صرف خدا کی ذات ــــ اور عالمِ بالا کی وہ ساری مخلوقات جنہوں نے انسان کی تخلیق پر روزِ ازل ہی میں اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔

"انسان ــــ ایک ایسی مخلوق جو زمین پر فساد پھیلاتی پھرے گی۔

خداوندا! کیا ہماری عبادت تیری شانِ کبریائی کی تصدیق کے لئے کافی نہیں ــــ؟"

"تم اس مصلحت کو سمجھ نہ پاؤ گے میرے ننھے فرشتے ــــ میری شانِ کبریائی کی تصدیق کے لئے ایک ایسی مخلوق کی ضرورت ہے۔ جو باغیانہ فطرت کی حامل ہو ــــ اور تم میں یہ بات نہیں ــــ!

ــــ انسان، بغاوت کے عناصر کا ایک خوبتر ترتیب۔ اور بس ــــ! تو پھر آج، زمین پر بسنے والی اس باغی مخلوق پر یہ قہر کیوں، یہ ستم کیوں ــــ؟

مشیت کے لبوں پر ایک پاکیزہ تبسم ــــ!
زمین کی چھاتی پر پھیلی ہوئی لاشوں کا انبار ــــ!
ستارے دور خلاؤں میں روپوش ــــ!
آفتاب کا چہرہ زرد، چاند کی مسکراہٹ معدوم

دوزخ کی سرگرمیوں میں عروج ۔
بہشت کے نظارے مغموم ۔۔۔!
کائنات کی ہر چیز تھرائی ہوئی سی ۔۔۔
یہ قیامت کا منظر ۔۔۔!
قہر ہے، ستم ہے ۔۔۔!!
" آہ، یہ انقلاب کیسا ۔" تند ہوا کے جھونکے نے سسک کر کہا۔
لیکن مشیت کے لبوں پر وہی پاکیزہ تبسم ۔!
کیسا انوکھا جواب ہے ۔۔۔!
کالی گھٹاؤں کی ٹولیاں خود اپنے وجود کے مقصد سے ناآشنا ۔!
" خداوندا، میں برس پڑنے کو چاہتی ہوں، لیکن برس نہیں سکتی۔ یہ مجبوری کیوں ؟"
" میں جانتی ہوں تیری مجبوری " مشیت کے مسکراتے ہوئے ہونٹ بالا خر کھلے ۔۔۔" تم میرے حکم کے بغیر کیوں کر برس پاؤ گی ۔۔۔! لیکن اب جاؤ، زمین کی جھلسی ہوئی چھاتی پر اپنی حیات افزا بوچھاڑ سے کوثر و تسنیم کی نہریں بہا دو ۔"
" ابھی ۔۔۔ !؟"
" ہاں ۔۔۔"
" خداوندا، ابھی اسی وقت ۔۔۔ !!؟"
" ہاں، ابھی، اسی وقت، یہ میرا حکم ہے ۔"
" اب تو زمیں پر حیات کے کچھ آثار بھی نہیں میرے مالک ۔!"
" تم جاؤ ۔ یہ میری شانِ کبریائی ہے، میں عدم و وجود کا مالک ہوں ۔۔۔ !"
اور بدلیاں لہراتی ہوئی اٹھیں ۔۔۔
" لیکن سنو " مشیت ایزدی نے کہا " کہنا زمین کی ان بے جان چیزوں سے ۔۔۔ میری فطرت میں لچک ہے ۔ میں ان کی گستاخی کو معاف کرتی ہوں ۔۔۔
اور تم ۔۔۔ ؟ . . . محبوب کے گیسوئے پریشاں کی طرح لہرانا تو تمھاری فطرت ہے، تمھاری ادا مستانی ہے، تمھاری چال متوالی ہے ۔ تم فضائے آسمانی میں اسی طرح منڈلاتی رہو ۔ جس طرح کالے رنگ کی بطخ، نیلے تالاب میں اپنے پروں کو پھیلائے تیرتی رہتی ہیں ۔

" اچھا تو میں جاتی ہوں ۔"
" ہاں جاؤ، لیکن کہنا ان انسانوں سے، تم نے مشیت ایزدی سے امداد طلب نہ کی، یہ تمہاری نادانی ہے ۔۔۔"
" اچھا تو اب میں جاتی ہوں ۔"
" ہاں جاؤ، لیکن یہ کہنا نہ بھولنا کہ تمہاری چھاتی پر پلنے والی مخلوق کو اپنی قوتِ خام پر بہت ناز ہے ۔ اتنا غرور اچھا نہیں ۔۔۔"
" اچھا، تو اب مجھے چلنا ہی چاہیے ۔۔۔"
ہاں جاؤ ۔ لیکن یہ بھی کہہ دینا ۔ ان انسانوں سے، یہ شمس و قمر، یہ مصباح و نجوم تو میرے ممنونِ احسان ہیں ۔ لیکن تم میرے احسان کے شکر گزار نہیں ۔ تم دوسروں کو نصیحت کرنے کے عادی ہو، لیکن خود اس نصیحت پر عمل پیرا نہیں ۔۔۔"
" تو اب چلتی ہوں میں ۔"
" ہاں جاؤ، میں تمہیں زیادہ دیر روکنا نہیں چاہتی یہ بھی سنا دینا کہ تم زمین کی وہ مخلوق ہو، جسے خدا نے " دقیقِ اسرار " بنایا ہے ۔ علم و ادراک عقل و دانش کی تقدیر شکن قوت سے نوازا ہے، تم خدا کی بخشی ہوئی قوت کے سہارے ستاروں کی بستی ۔ مہتابوں کے جزیرے میں پہنچ سکتے ہو لیکن وہاں تک پہونچنے سے پہلے مجھ تک پہونچنے کی کوشش کرو ۔ ارتقاء کا صحیح راستہ یہی ہے پیارے ۔ ! اسی میں تمہاری خیر ہے ۔ !"
" اچھا تو اب میں چلی ۔۔۔"
" ہاں جاؤ، لیکن یہ بھی سنا دینا کہ مجھے اس کی جسارت، اس کی شوخیاں اب بھی پسند ہیں ۔ لیکن ان شوخیوں میں خودستائی کا جو رنگ ہے وہ مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں ۔۔۔ !"
" اچھا تو میں چلتی ہوں اب ۔۔۔"
" ہاں جاؤ، لیکن خود اپنے فرائض سے غافل نہ ہو جانا ۔"
" خداوندا، مجھے اتنی ہی قوت دے کہ ۔۔۔ میں صرف تیرے حکم کی تعمیل کر سکوں ۔ !"
کالی بدلی کچھ سوچ کر سرنگوں ہو گئی ۔
" جاؤ، زمین پر میری رحمت کی بارش کر دو ۔۔۔ اب ایک نئی دنیا کی تخلیق ہو گی ۔ سرسبز و شاداب دنیا ۔۔۔ اس دنیا کی چھاتی پر وہ نیکی کا درخت پھر سے اگے گا ۔ اس کی ڈالیاں مشرق

سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ہر چیز کو اپنے سائے میں لے لیں گی۔ اور پھر بارجوانی سے جھک کر میرا شکر بھی ادا کریں گی۔ ان میں کونپلیں پھوٹیں گی۔ ان کونپلوں میں کچھ کلیاں پھر سے جنم لیں گی۔ ان کے کھلنے پر ساری دنیا رشکِ ارم بن جائے گی۔ حتیٰ کہ فردوس بریں کے گلچیں بھی

ان کے بغیر اپنے دامن کو خالی خالی پائیں گے ــــ!

کالی بدلیوں کی ٹولیاں پیاسی زمین کے اوپر تیرنے لگیں۔ اور لہرا لہرا کر برس پڑیں ــــ اس طرح ساری دنیا پر زندگی کی چھوٹی بڑی لہریں دوڑ گئیں ــــ!

اسانگنی اینڈ کمپنی

کمیشن ایجنٹوں اور تاجروں کے لئے نفع بخش، اور عمدہ تجارت کا سامان، ہول سیل نرخوں پر مندرجہ ذیل چیزیں سپلائی کرنے کے لئے ہم اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔

- ــــ مونگ پھلی
- ــــ پٹڈور کا ناریل اور اس کا تیل
- ــــ ریٹھا
- ــــ املی
- ــــ سکئی (سوپ ناٹ)
- ــــ بہترین صاف اور ڈریس کیا ہوا تیار چمڑا۔

ــــ خط و کتابت کیلئے پتہ ــــ

اسانگنی اینڈ کمپنی ۱۴۴، اولڈ مارکیٹ بنگلور

اسٹینڈرڈ

سیزرس

اور

اسٹیر

عمدگی اور پائداری کی اعلیٰ مثال پیش کرتے ہیں، جس پر میرٹھ کی اس صنعت کو ناز ہے، قینچیوں اور استروں کی تجارت کر کے بھاری منافع حاصل کیجئے

ایجنسی کا شرائط نامہ خط لکھ کر منگائیے

پتہ

دی اسٹینڈرڈ سیزرس کمپنی میرٹھ انڈیا

۵۵

ابوالمجاہد زاہد کا شعری کارنامہ تگ و تاز کی حسین و جمیل شکل میں

تگ و تاز

زاہد کا فن بڑی تیزی سے ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا ہے، تگ و تاز اس نوجوان فن کار کا پہلا مجموعۂ کلام ہے زاہد کی شاعری برائے شاعری نہیں وہ ذہنی اور مجروح انسانیت کیلئے ایک پیام ہے ——— ایک آفاقی پیام، زاہد کی شاعری ایک آئینہ ہے جس میں آج کا آوارہ اور بھٹکا ہوا انسان اپنا صحیح عکس دیکھ سکتا ہے، زاہد سماج کے رستے ہوئے زخموں کی نمائش پر ہی اکتفا نہیں کرتا ان کا مداوا بھی پیش کرتا ہے۔

تگ و تاز میں اس حساس اور بیدار دل شاعر کی حیات افروز نظمیں اور پاکیزہ غزلیں شامل ہیں

بہت جلد شائع ہو رہا ہے

معیار میں پیش کئے ہوئے دو سال کے افسانوں کا بہترین انتخاب

اُبھرتی کرنیں

(زیر طبع)

مرتبہ ——— نجم الاسلام

——— قیمت دو روپے آٹھ آنے ———

نئے تعمیری رجحانات کا افسانوی ادب میں گراں قدر اضافہ اس کے مطالعہ کے بغیر آپ کا ادبی ذوق موجودہ دور کے ایک نئے بڑھتے ہوئے افسانوی رجحان سے بیگانہ رہے گا۔ "اُبھرتی کرنیں" محمود فاروقی، اسعد گیلانی پروفیسر عامی ضیائی، ابن فرید منظر حسین انصاری کی بہترین نگارشات لئے ہوئے ہے۔ اور مرتب کے قلم سے ایک تعارف بھی شامل ہے جس میں تعمیری ادب، تعمیری ادب کی تحریک اور نئے تعمیر پسند افسانوی رجحانات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ناشر

مکتبہ معیار میرٹھ

(محمد احمد ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے کمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ معیار خندق اسٹریٹ شہر میرٹھ سے شائع کیا)

صحت منداور تعمیری ادب کا علمبردار

جلد ۳، شمارہ ۲ ماہنامہ فروری ۱۹۵۳ء

معیار

ترتیب دینے والے

اصغر علی عابدی

نجم الاسلام

ہیڈ آفس:۔ خندق اسٹریٹ میرٹھ شہر

سب آفس:۔ محلہ کشن گنج دہلی ۶

تعاون

سالانہ پانچ روپے

شش ماہی تین روپے

مضامین، خط و کتابت، ترسیل زر، تبادلۂ جرائد کے لئے ہیڈ آفس

ترسیل زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب۔ فیملی لائن۔ جیکب آباد

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

ترتیب

نقشِ اوّل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اصغر علی عابدی ۳

نظمیں

میری شاعری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابو المجاہد زاہد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵
ظلمتوں کی برات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عبد الباسط مقصد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶
بیانگِ دہل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سید حرمت الاکرام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۷
اشتباہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عنوان چشتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸
زباں بندی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ منظر اعظمی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۹
دعائے نیم شبی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نور نقی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۰
عرفانِ حقیقت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۱
بشارت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ برق علوی کاکوروی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲

مقالے

اقبال اور اشتراکیت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابو خالد ایم، اے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۳
ادب اور معصیت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محمد عثمان بی، کام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۰
تاریخ کا انتباہ (ترجمہ) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محمد عمر برنی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۳
میر اور دلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نثار احمد فاروقی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۷

غزلیں

غزل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جگر مرادآبادی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۱
" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بدرت میرٹھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۲
" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تسکین قریشی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۳
" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ثاقب کانپوری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۴
" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اختر انصاری اکبرآبادی ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۵

افسانے

ڈھلتے سائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابن فرید۔ بی۔ اے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۶
جب عورت باغی ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اقبال نسیم عثمانی ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۲
دو سانپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ احمد پرویز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۷

ڈرامہ

بھائی پیسہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عالم صدیقی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۲

نقشِ اوّل

پچھلے دنوں الہ آباد میں ترقی پسند مصنفین کی صوبائی کانفرنس ہوئی تھی۔ اس میں جو بولیاں بولی گئیں وہ اس سے پہلے کی بولیوں سے بہت کچھ مختلف تھیں مثلاً علی سردار جعفری نے کہا۔

"ترقی پسندی کیا ہے اور کیا نہیں۔ اِس کے بارے میں میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ سوال ایسا ہے جو کسی زمانے میں بھی مکمل طریقے پر حل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ترقی پسندی کی قدریں ہر زمانے میں بدلتی چلی جاتی ہیں۔ پہلے صرف اتنا ہی کہہ دینا بڑی ترقی پسندی تھی کہ فن کا انحصار مادہ پر ہے۔ کیونکہ مادہ ہی تخیل کو خوراک بہم پہنچاتا ہے۔ لیکن آج ہمارا شعور اس سے آگے بڑھ گیا ہے۔ دراصل ادیب کا انفرادی نقطۂ نظر اس کے فن کو کوئی بھی موڑ اور کوئی بھی رنگ دے سکتا ہے۔"

اِس موقع پر علی سردار جعفری نے ایک ہڑتال کی مثال دی اور بتایا کہ چار ادیب اپنے ذاتی خیالات کی بنا پر اس ہڑتال سے چار الگ الگ نتیجوں پر پہنچتے ہیں۔ اس فقرے میں علی سردار جعفری کی پہلی بات دوسری بات کے بالکل خلاف پڑتی ہے یا دوسری پہلی کے عین برعکس ہے۔ اگر ترقی پسندی کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر آن بدل جائے اور اس کی کوئی مستقل اخلاقی قدر نہ ہو تو اُس کے لئے یہی اصول صحیح ہے کہ "مادہ ہی تخیل کو خوراک بہم پہنچاتا ہے" کیونکہ مادہ کے اندر ہر آن تغیر ہو رہا ہے۔ اُس کے استعمال کے طریقے آج کچھ ہیں تو کل کچھ۔ اِس لئے اگر ترقی پسند اس اصول کے قائل ہیں کہ ترقی پسندی کے معنی ہر آن بدل جانے کے ہیں تو انہیں مادہ پرست ہی رہنا پڑے گا۔ اور مادہ کو رہنما مان کر اُس کے پیچھے چلنا ہوگا۔ لیکن اگر وہ اِس نظریہ کو ترک کر کے کسی موضوعی (Subjective) اصول کی طرف آنا چاہتے ہیں۔ اور یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چار ادیبوں کا انفرادی نقطۂ نظر ایک ہی واقعہ سے مختلف نتائج نکالتا ہے تو یہ بات جس طرح مادہ پرستی کے ساتھ نہیں نبھ سکتی۔ اسی طرح تغیر پسندی کے ساتھ بھی نہیں نبھ سکتی۔ اِس کا تعلق انسان کے داخلی احساسات سے ہے۔ جو خارجی حالات کے پابند نہیں۔ اِس لئے خارجی حالات کے بدلنے سے ان کے اندر تغیر بھی ضروری نہیں۔!

علی سردار جعفری نے اِس موقع پر دراصل ایک ایسی بات کہہ دی ہے کہ اگر اُسے مارکس اور لینن کے خیالات پر پھیلایا جائے تو وہ بھی کالعدم ہو کر رہ جائیں۔ ہم کہتے ہیں بے شک یہ صحیح ہے کہ انسان کا داخلی احساس ہی خارجی واقعات کو خاص قسم کا رنگ دیتا ہے۔ مگر کیا مارکس اور لینن بھی یہی کہتے ہیں؟ جن پر علی سردار جعفری اور تمام دیانتدار ترقی پسندوں کا ایمان ہے۔ کیا وہ مارکس۔ لینن اور اسٹالن کے تمام نظریات پر اپنی اس منطق کو پھیلا کر اس کے لازمی نتائج بھگتنے کے لئے تیار ہیں؟

مارکس کہتا ہے:۔

"میرے نزدیک تصورِ مادی دنیا کا صرف ایک ایسا عکس ہے جسے انسانی ذہن نے اخذ کیا ہے اور اس کو خیالات کا رُوپ دیدیا ہے۔"

J. Stalin; Dialectical + Historical Materialism

اسی طرح لینن کہتا ہے:۔

"شعور مادہ کا محض عکس ہے۔ ایک اعلیٰ ترین۔ صحیح ترین۔ مکمل۔ مفصل۔ اور قطعی عکس۔"

Lenin: Materialism & Empirio Criticism

کیا اِن تصورات کو جان لینے کے بعد "مادہ کے تخیل کو خوراک بہم پہنچانے" کے خیال کو غلط ٹھیرانا یا اُس سے آگے بڑھ جانا اِن سے کھلی ہوئی بغاوت نہیں ہے۔؟ اگر ترقی پسندوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو کیمونسٹ نظریات سے ہٹ رہا ہے تو یہ ایک اچھا شگون ہے۔ توقع ہے کہ اِس طرح اِن میں کے بہت سے لوگ غلط راستے کو چھوڑ کر صحیح راستے کی طرف آ جائیں گے۔!

لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ "بغاوت" بھی محض ایک چال ہے۔ آج جو ترقی پسند ہندو ازم کی طرح ایک غیر ملک کی چیز کو اپنے اندر جگہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس طرح وہ ایک بہت بڑے طبقے کو جو "خیال پرست" اور "خود پرست" ہے اپنے نئے نظام میں جذب کر لیں گے۔ ترقی پسندوں کو یہ بات ہندوستانیوں کی بڑھتی ہوئی روایت پرستی کو دیکھکر سوجھی ہے۔ آزاد ہندوستان میں اب وہ اس نقطہ پر پہنچے ہیں کہ جب تک ہندو کلچر اور ہندو اکثریت کی روایات سے کمیونسٹ اور ترقی پسند اپنے آپ کو نہیں بچائیں گے اس وقت تک ہندوستان میں ان کی کامیابی محال ہے۔ چنانچہ اسی کانفرنس میں ایک اور مقرر نریندر تیواری نے کہا۔

"پرانی روایات" کو "نئے مقاصد" کے لئے استعمال کرنا تمام تر خود ادیب پر منحصر ہوتا ہے اور اگر وہ خود ادب کو صحیح طریقہ سے سمجھتا ہے۔ ادب کے "بلند مقاصد" سے واقف ہے تو وہ "پرانی روایتوں کی خوبصورتی" اور "نئے" مسئلوں کی گہرائی اور شعور کو ملا جلا کر ایک ایسا خوبصورت اور سچا ادب پیدا کر سکتا ہے جس کی مقبولیت کبھی مشکوک نہ ہوگی"

اس جگہ "پرانی روایات" سے مراد قدیم ہندو روایات اور "نئے مقاصد" اور "بلند مقاصد" سے مراد مارکس اور لینن کے خیالات ہیں۔ اور پرانی روایات کی خوبصورتی سے مراد ان کے اوپری نقش و نگار یعنی اصطلاحات، زبان، ضرب الامثال، تشبیہیں اور استعارے ہیں۔ اور "نئے" مسئلوں کی گہرائی اور شعور سے مراد مارکسی۔ لینینی خیالات یا کمیونسٹ مقاصد کی روح ہے مقرر کا خیال یہ ہے کہ اگر ترقی پسند ایک ایسا ادب تیار کریں جو اوپر سے تو "ہندو" ہو مگر اندر سے وہی سب کچھ ہو جو ترقی پسند ادب اس وقت ہے تو ایسا ادب ہی روایت پرست ہندوستانی اکثریت میں مقبول ہو سکتا ہے۔ اور ترقی پسندوں کو اُن کے مقاصد کے حصول میں مدد دے سکتا ہے۔ اسی بات کو دوسرے مقرر رام بلاس شرما نے کچھ اور کھول کر کہہ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"پدم پراد (روایت) تاریخ یعنی اتہاس سے پیدا ہوتی ہے اور تاریخ چونکہ عوام بناتے ہیں اس لئے جنتا اتہاس اور پرم پراوں سے محبت کرتی ہے۔ لہذا تاریخ پر بھی ترقی پسندوں کو غور کرنا چاہئے۔ ہمارا ادب کافی طور پر اپنی تاریخ (یعنی قدیم ہندو عہد کی تاریخ) کا رنگ لئے ہونا چاہئے۔ اور ہماری روایات (یعنی ہندو روایات) کی بھی جو جگہ ہمارے ادب میں ہے اس کا ہمیں بہت زیادہ خیال اس لئے کرنا ہے کہ ہماری جنتا اس سے محبت کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جن چیزوں سے جنتا محبت کرتی ہے ان کو ساتھ لئے بغیر ہم جنتا میں کس طرح مقبول ہو سکتے ہیں"!

ان الفاظ سے یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے کہ ترقی پسند ادیب صرف اپنی اغراض کی تکمیل کے لئے یہ چال چل رہے ہیں۔ انفرادی نقطۂ نظر کی جس اہمیت کا تذکرہ علی سردار جعفری نے کیا ہے وہ ایک فریب ہے۔ اس کا مطلب صرف اُوپری نقش و نگار کی تبدیلی ہے ورنہ اُن کا اصلی مقصد یعنی کمیونزم کا پرچار اور کمیونسٹ نظریات پر یقین اپنی جگہ پر قائم ہے۔ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ہم ترقی پسندوں پر "کمیونسٹ" کا لیبل زبردستی لگا رہے ہیں۔ نہیں یہ بات نہیں؟ اسی کانفرنس میں فراق گورکھپوری نے کہا ہے۔

"جنتا کی بات کرتے وقت جنتا کی لڑائی اس کے رُخ اور اُس کی صحیح رہنمائی کرنے والوں (یعنی کمیونسٹوں) کو آپ نہیں چھوڑ سکتے صرف مزدوروں اور کسانوں کی مالا جپ کر ادیب اپنے ادب میں زندگی نہیں پیدا کر سکتے۔ اسے کہیں جا کر جانبداری اختیار کرنی ہی پڑے گی۔ آپ اگر نئے چین پر لکھیں۔ امن پر لکھیں۔ افریقہ میں نسلی امتیاز پر لکھیں۔ امریکہ میں رنگ کے امتیاز پر لکھیں۔ گورکھوں کی بھرتی پر لکھیں تو کس کی طرف سے بولے گا؟ ظاہر ہے آپ کمیونسٹوں کی طرف سے بولیں گے"!

یہ الفاظ کسی تشریح کے محتاج نہیں ہیں ــــ!

ابوالجاہد زاہد

میری شاعری

ذکرِ بادہ و سبو میری شاعری نہیں
خال و خط کی گفتگو میری شاعری نہیں
بے سرور ہاؤ ہو، میری شاعری نہیں
ہاں! "نمازِ بے وضو" میری شاعری نہیں

میری شاعری میں ہیں عزم کی بلندیاں
میری شاعری میں ہیں ولولوں کی بجلیاں
میری شاعری میں ہیں عطر بیز مستیاں
میری شاعری میں ہیں زیست کی نشانیاں

بارگاہِ جنسیت" میری شاعری نہیں
اک بہشتِ معصیت میری شاعری نہیں
بے شعورِ عقلیت میری شاعری نہیں
ہاں غلط جدیدیت" میری شاعری نہیں

میری شاعری میں ہے جلوۂ حق آگہی
میری شاعری میں ہے معرفت کی روشنی
میری شاعری میں ہے شعلہ تابیٔ خودی
میری شاعری میں ہے صوفۂ نگاہ و فکر کی

"سرخ زار" کا فسوں میری شاعری نہیں
ایک شامِ صبح گوں" میری شاعری نہیں
"ملک و قوم کا جنوں میری شاعری نہیں
"آمریت زبوں" میری شاعری نہیں

میرے دل میں درد ہے مفلس و اجیر کا
میں ہوں آدمیت غمزدہ کا ہمنوا
میں خدا پرست ہوں میں خودی پہ ہوں فدا
امن کا نقیب ہوں زندگی کا رہنما

اک پیام کی جھلک میری شاعری میں ہے
اک نظام کی جھلک میری شاعری میں ہے

عبدالباسط مقصد

ظلمتوں کی برات

(۱)

اُداس زلیست کی راہیں خموش سازِ حیات
نفس کی آنچ میں لہرائے جل گئے نغمات
اُجالے روندتی نکلی ہے ظلمتوں کی برات
یہ دَور دَورِ جہالت ہے دورِ عدل نہیں

(۲)

ہنوز وقت کی آنکھوں سے اشکِ خوں ہیں رواں
دلِ حیات سے رہ رہ کے اُٹھ رہا ہے دھواں
خوشی میں غم کی جھلک مسکراہٹوں میں فغاں
یہ دَور دورِ جہالت ہے دورِ عدل نہیں

(۳)

جفا کا نام وفا اور وفا کا نام جفا
قدم قدم پہ تباہی کا نام عین بقا
عمل سے اس کی نفی اور زباں پہ نامِ خدا
یہ دَور دَورِ جہالت ہے دورِ عدل نہیں

(۴)

غمِ حیات کی اُلجھن غمِ حیات کے دام
تصوّرات کے محور پہ گھومتے ہیں عوام
شکستہ ساز پہ دیتے ہیں عہدِ نو کا پیام
یہ دَور دَورِ جہالت ہے دَورِ عدل نہیں

(۵)

کرم کی شکل میں رقصاں ہے آج بھی بیداد
ہزار رُوپ بدلتے ہیں آج بھی صیّاد
قیامِ امن کے نعروں میں پل رہا ہے فساد
یہ دَور دَورِ جہالت ہے دَورِ عدل نہیں

(۶)

اُفق پہ نُور نہیں ظلمتوں کا ڈیرا ہے
زمیں کو وقت کی تاریکیوں نے گھیرا ہے
فضائے زلیست پہ چھایا ہوا اندھیرا ہے
یہ دَورِ دَورِ جہالت ہے دورِ عدل نہیں

سید حرمت الاکرام

بیانگ دہل

ختم شب کا یقین کیا آئے
کوئی تدبیر اس کی کی بھی گئی؟
مہر نو بھی ہوا نہ جلوہ فگن
ماہ و انجم کی روشنی بھی گئی!

چاک کرنا تھا جن کو پردۂ شب
دم وہ تاریکیوں کا بھرتے رہے
ہم جمائے ہوئے افق پہ نظر
صبح کا انتظار کرتے رہے

کون دلدادۂ بہار نہ تھا؟
کون آزردۂ بہار نہیں؟
رنگ پھولوں نے ایسا بد لا ہے
فصلِ گل کا بھی اعتبار نہیں!

خواب ہائے طرب کے شیرازے
غیر مربوط ہوتے جاتے ہیں
سامراجی نظام کے پھندے
اور مضبوط ہوتے جاتے ہیں

بار ہے زندگی کا ہر لمحہ
کسی بڑھتی ہوئی سزا کی طرح
ہوئی جاتی ہے رُوح میں پیوست
بھوک اِک دردِ لا دوا کی طرح

خشک ہیں ہونٹ آج بھی اپنے
خالی مینا و جام آج بھی ہیں
اپنی روٹی ہے اپنا راج مگر
ننگے بھوکے عوام آج بھی ہیں

عنوان چشتی منگلوری

اِنتباہ

(۱)

کس لئے پلتے ہیں جذباتِ مظالم دل میں؟
اور انسان کو انسان سے نفرت کیوں ہے
محوِ حیرت ہوں کہ آزاد فضا میں اب بھی!
آدمیت کی حسیں شکل پہ وحشت کیوں ہے

(۲)

جنگ کے کام میں مشغول ہے ہر ایک بشر
امن کا نعرہ ہی نعرہ ہے عمل کچھ بھی نہیں!
کوریا محشرِ خاموش ہوا کتنی ... بار ...!
ہیں یہ بیباز سلامت تو اجل کچھ بھی نہیں

(۳)

ایک مجبور مگر دوسرا "قاروں" زماں
امتیاز آج بھی تو مفلس و نادار میں ہے
ابھی اٹھنے نہیں پایا ہے دوئی کا پردہ
"خار و گل" کی ابھی تمیز چمن زار میں ہے

(۴)

قافلے اور لٹیں راہبروں کے ہاتھوں؟
آہ یہ مشقِ عمل اپنے وطن والوں سے
پھول کھلتے بھی نہیں ہیں کہ کچل دیتے ہیں
پوچھئے حالتِ گلزار چمن والوں سے

(۵)

عصمتیں روز بکا کرتی ہیں روٹی کے لئے
"حسن" لٹتا ہے سرِ راہ ہوس کی خاطر!
روندے جاتے ہیں شباب اور جوانی ہر روز
اس تباہی کی حدیں ہیں۔ تو کہاں ہیں آخر؟

(۶)

تم کو معلوم نہیں ہے یہ اصولِ فطرت؟
ظلم کا عالمِ اسباب میں ہے ظلم جواب!
وقت کے ساز سے آواز یہی آتی ہے!
ہے یہی رنگ تو ہے خوں، نہ مٹی ہو خراب

اپنے ناپاک ارادوں کو بدلنا ہوگا
آدمیت کی حسیں راہ پہ چلنا ہوگا

منظر اعظمی

زباں بندی

یہ زباں آج سے پہلے کبھی خاموش نہ تھی
اور پھر آج یہ خاموش رہے! ناممکن
لاکھ آئین ستم خیز کے خونی جبڑے
میرے افکار و خیالات کے دشمن ہو جائیں
تیرے جذبات کو زنجیر کے حلقوں میں کسیں
گولیوں کا مرے نغمات پہ سایا کر دیں

علم و حکمت کے خزانوں کے یہ جاہل دربان
مجھ کو نغموں کو مرے دیس نکالا دے دیں
ان کو معلوم نہیں سینۂ طوفانِ الم
چیر ڈالا ہے مرے دل کی صدا نے اکثر
برق تک کانپ گئی نغمۂ شعری سے مرے
کتنے برباد جیالوں کو سہارا دے کر
کتنے ویرانوں کو گلزار کیا ہے میں نے
کتنے مایوس دماغوں کے سیہ خانوں میں
مسکرائے ہیں مرے نغمے بہاروں کی طرح
تم یہ کہتے ہو رہوں گوشۂ تنہائی میں
لاکھ مظلوم ستم رانی کی چکی میں پسیں
دورِ صہبا بھی چلے جام کھنکتے بھی رہیں
کفر و الحاد کے جرثومے اُبلتے بھی رہیں
مائیں بہنیں سرِ بازار پھریں ——
اور پھر بزم کی رونق بنجائیں ——
فکر کچھ بھی نہ کروں اور میں خاموش رہوں
یہ زباں آج سے پہلے کبھی خاموش نہ تھی
اور پھر آج یہ خاموش رہے ناممکن

نور تقی

دعائے نیم شبی

اُف یہ پُر ہول دور اندھیری رات
ٹھوکریں کھا رہی ہے رُوحِ حیات
دل، نظر، حُسن، عشق سب مجروح
ایک سکتہ میں آ گئی ہے رُوح
لب ترسنے لگے تبسّم کو
اِک تبسّم ہی کیا تکلّم کو
پیچ در پیچ زندگی کے مقام
موت کرتی ہے ہر قدم پہ سلام
سہمی سہمی سی ہے فضا کی سانس
جیسے دل میں کھٹک رہی ہو پھانس
عقلِ ناکام، فکرِ ناکارہ
کہہ گیا ہے دماغ بے چارہ
اہرمن قہقہے لگاتا ہے
اور انساں شکست کھاتا ہے
اے خدا آہ میں اثر دیدے
رحمتوں سے بھری سحر دیدے

پروفیسر ظفر احمد صدیقی

عرفانِ حقیقت

اتفاقی حادثہ تھا یہ جہاں میرے لئے
زندگی تھی ایک راہ بے نشاں میرے لئے

معنی و مفہوم سے بیگانہ تھی یہ کائنات
اِک معمّہ تھا زمین و آسماں میرے لئے

تھی نہ بنیادِ یقیں کوئی نظر کے واسطے
تھی خود اپنی ذات بھی وہم و گماں میرے لئے

امتیازِ خیر و شر کے کوئی معنی ہی نہ تھے
تھی بھلائی ایک سعیٔ رائگاں میرے لئے

مادّی اسباب کی بیدردیوں کے سامنے
تھی نہ کوئی عافیت گاہِ اماں میرے لئے

حاملِ مقصد ہے اب ہر ذرّہ بزمِ وجود
زندگی ہے عشق کا ایک امتحاں میرے لئے

اب مجھے اپنی نظر پر اعتبار آنے لگا
اب ہوا ثابت وجودِ این و آں میرے لئے

امتیازِ خیر و شر کا اب ہوا ثابت جواز
سازِ فطرت ہے کسی کا ترجماں میرے لئے

ہاتھ میں میرے سرا اب آگیا اس ڈور کا
ہوگئیں آساں خرد کی گتھیاں میرے لئے

اب رضائے دوست کی خاطر ہے میری زندگی
اب نہیں اندیشۂ سود و زیاں میرے لئے

جس کا سجدہ ہے ہر اِک بندِ غلامی سے نجات
سجدہ گاہِ شوق ہے وہ آستاں میرے لئے

میری ہمّت کے لئے اب کوئی دشواری نہیں
اب نہیں مایوسیاں محرومیاں میرے لئے

پالیا ہے عشق نے جب سے نشاطِ غم کا راز
مِٹ گئی ہیں درد و غم کی تلخیاں میرے لئے

برق علوی کاکوروی

بشارت

مژدہ اے چشمِ جہاں وہ مہرِ تاباں آنے کو ہے
پھر حقیقت کی کرن اب بے نقاب آنے کو ہے

چاک ہو جائیں گے پردے ظلم و استبداد کے
ہوشیار اے طفلِ ظلمت انقلاب آنے کو ہے

ڈوب جائیں گے ستارے، ماند پڑ جائے گا چاند
بحرِ ظلمت سے اُبھر کر آفتاب آنے کو ہے

ہوشیار اے چیرہ دستو! اے درندو، ہوشیار!
وقت کے ہاتھوں سے خود تم پر عتاب آنے کو ہے

ظلم و بے رحمی کا پرچم سرنگوں ہو جائے گا
اِک نئے انداز سے پھر انقلاب آنے کو ہے

بے خدا ظالم سیاست پر نہ پھولو اس قدر
سرخیٔ خونِ شہیداں کا جواب آنے کو ہے

دخترِ رز یہ تابہ کے اور تا بکے جام و سبو
برق اٹھ بیٹھو کہ اب حق کی شراب آنے کو ہے

ابوخالد ایم۔ اے

اقبال اور اشتراکیت

سردار جعفری صاحب لکھتے ہیں:۔

"اقبال کی شاعری کو رجعت پرست نقادوں اور سیرت نگاروں کی دست برد سے بچانا جو اقبال کے رجعت پرستانہ رجحانات کو بڑھا کر چڑھا کر دکھاتے ہیں اور اقبال کو اُنکے سیاسی اور سماجی ماحول اور پس منظر کے ساتھ پیش کرنا ترقی پسند ادیبوں کا فرض ہے جو اقبال کی روایات کے جائز وارث ہیں"

غالباً اسی فرض سے عہدہ برآ ہونے کی خاطر موصوف نے وہ مقالہ سپرد قلم کرنیکی زحمت گوارا فرمائی ہے جو اسوقت میرے پیش نظر ہے۔ اس مقالے کا عنوان ہے "اقبال کے سیرت نگار اور نقاد" اور اس عنوان کا حق موصوف نے اسطرح ادا کیا ہے کہ تمام ان لوگوں کی جو اشتراکی نظریات کی صحت پر یقین نہیں رکھتے قرار واقعی "تواضع" ہو جائے۔ اُنکے مقالے کا سیاق و سباق اور ارتقاء و عمود اس "زیریں معنی طریق کار" کی غمازی کرتا ہے جس کے لئے اشتراکی حضرات میدان سیاست میں کافی نام پا چکے ہیں۔

عبداللہ انور بیگ کی انگریزی تالیف "شاعر مشرق" سے ایک اقتباس کا اُردو ترجمہ درج کرنے کے دوران سردار صاحب قوسین میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہانتک ہمارے کام کی چیز ہے لیکن جہاں سے اقبال زمان و مکان کے حدود کو توڑ کر روحانی آسمانی اور مابعد الطبیعاتی دنیا میں داخل ہو کر خودی کی اعلیٰ ترین منزلوں میں داخل ہو جاتے ہیں وہاں سے رجعت پرستوں کے کام کی چیز شروع ہو جاتی ہے"!

کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ بجائے اس کے کہ جیسا وہ ہے کوئی اس ذہنیت کے ساتھ کرنے بیٹھے گا کہ اسمیں کیا اسکے "کام" کا ہے اور کیا اس کے کام کا نہیں تو ظاہر ہے کہ کچھ وہ اپنے مطلب کے مطابق پائیگا اور کچھ کو کھینچ تان کر اپنے مقصد سے ہم آہنگ کرے گا۔ مذکورہ بالا اقتباس ظاہر کرتا ہے کہ جعفری صاحب نے بھی اقبال کی شاعری اور پیغام کا اسی انداز سے مطالعہ کیا ہے اور یہ انکی دریا دلی ہے کہ جائز وارث وہ اور ان کے ہم خیال ادیب تھے مگر انھوں نے رجعت پرستوں کو بھی اپنی وراثت میں حصہ دار بنا لیا۔

یہ کمال غالباً اشتراکی مفکرین ہی کو حاصل ہے کہ وہ مادی اجسام کیطرح افکار و خیالات کی بھی "تکا بوٹی" کر سکتے ہیں۔ سلسلۂ افکار کی حد بندی اور یہ سوچنا کہ انسان کے ادراکات ذہنی میں باہم کوئی ربط نہیں ہوتا اور انمیں سے بعض کو بعض سے اسطرح جُدا کیا جا سکتا ہے۔ جیسے بساطی کی دوکان پر رکھے ہوئے سامان میں اپنے کام کی اور دوسروں کے مطلب کی چیزیں الگ کی جاتی ہیں، انتہائی طفلانہ اور مضحکہ انگیز تخیل ہے۔

اقبال کے مابعد الطبیعاتی روحانی اور آسمانی تصورات اور انکے تصورِ حیات و کائنات میں گہرا اور ناقابل انفکاک ربط ہے۔ اس تعلق کو سمجھے بغیر انکے کلام کو فی الحقیقت سمجھا ہی نہیں جا سکتا معہ واذا ذہنی Reservation of mind کے ساتھ یا کسی تحریک کی مذمت کے لئے انکے افکار و اشعار کا "مثلہ" کرنے پر کسی کو اصرار ہو تو وہ ایسا کرنے کے لئے آزاد ہے لیکن یہ علمی طریقہ نہیں ہے۔ کچھ بے اٹکل لوگ تو اس سے غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں مگر کوئی سلیم المذاق انسان اس سے متاثر نہیں ہوتا۔

رجعت پرستی اشتراکی حضرات کی اصطلاح میں ان کے اصولوں سے اختلاف کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ جعفری صاحب نے تمام ان لوگوں کو رجعت پرست قرار دیا ہے جو اُن سے اصولی اختلاف رکھتے ہیں یہانتک علامہ اقبال مرحوم بھی جنکے وارث جائز ہونے کے جعفری صاحب بشمول تمام ادبائے ترقی پسند مدعی ہیں۔ اپنے ان تصورات کے باعث جو ترقی پسند ادیبوں کے "کام" کے نہیں یا جو اشتراکی نظریات سے میل نہیں کھاتے رجعت پرستانہ رجحانات کے حامل قرار پائے۔ یہ اور بات ہے کہ اس

تفریح کے سبب کم از کم ان رجحانات کی حد تک جعفری صاحب ہی کے انداز فکر کے مطابق اشتراکی تصورات سے اقبال کا اختلاف مسلّم ہو گیا۔

سردار صاحب کو بالخصوص ڈاکٹر یوسف حسین سے شکایت ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب "روح اقبال" میں یہ کیوں لکھ دیا کہ "اسوقت دُنیا میں تین نظام معیشت رائج ہیں، ایک خالص انفرادیت یا سرمایہ داری کا نظام، دوسرے اشتراکیت یا اشتمالیت کا نظام اور تیسرا اسلامی نظام" جعفری صاحب سوال کرتے ہیں کہ "آخر اسلامی نظام کس ملک قصبے یا گاؤں میں رائج ہے" انکی یہ گرفت حق بجانب ہے اور کم از کم مجھ کو اس اعتراف میں کوئی تامل و تردد نہیں کہ اسلامی نظام کسی ملک، قصبے یا گاؤں میں رائج نہیں لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلامی نظام خواہ کتنی ہی مختصر مدت کیلئے کیوں نہ سہی سرزمین عرب میں عملی طور پر رائج اور نافذ رہ چکا ہے جبکہ اشتراکیت نظری طور پر وہ جو کچھ ہے، اتنے دنوں کی جدوجہد، ایک بڑے خونی انقلاب اور سائبیریا کے سرد جہنم کی بڑے پیمانے پر آبادی کے باوجود، مارکس کے تصورات کے مطابق اپنی اصلی و مکمل صورت میں ابتک قائم نہیں ہو سکی۔ معاشی مساوات اور غیر طبقہ داری سماج کا خواب تا ہنوز محتاج تعبیر ہے۔ اور اگر جعفری صاحب میری طرح صاف گوئی سے کام لیں تو انھیں تسلیم کر لینا چاہیئے کہ اشتراکی تحریک پر اب وہ فرسودگی طاری ہوتی جارہی ہے۔ جو عنقریب اسکی موت کی تمہید ثابت ہو گی۔ اسکے برخلاف وہ اندرونی تحریک روز بروز واضح تر بنتی جارہی ہے جو سرمایہ داری اور اشتراکیت کے بنیادی نقائص اور عملی تباہ کاری کا منطقی نتیجہ اور اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہے۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

ان کا یہ مطالبہ کافی وزن رکھتا ہے کہ ڈاکٹر یوسف حسین صاحب کو "تینوں نظام معیشت کا مقابلہ کر کے ان کا فرق بتانا اور یہ ثابت کرنا چاہیئے تھا کہ اسلامی نظام معیشت، سرمایہ داری اور اشتراکی نظام معیشت سے بہتر ہے"۔ ڈاکٹر صاحب کی کتاب کا یہ موضوع نہ تھا پھر بھی اقبال کی شاعری اور افکار سے بحث کی ضرورت جس حد تک متقاضی تھی۔ انھوں نے ہر سہ نظامات کے خد و خال اور بنیادی اصولوں کی طرف مناسب اشارات کر دیئے ہیں۔ طویل اقتباسات کی گنجائش نہیں۔ اس لئے صرف چند مختصر جملے درج ذیل کئے جاتے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ "روح اقبال" میں بھی جعفری صاحب نے محض اپنے کام کی چیزیں تلاش کی ہیں۔ موصوف جس سادہ پرکاری کا مجرم رجعت پرست ادیبوں کو قرار دیتے ہیں۔ اس سے کام لینے میں انھوں نے بھی دریغ نہیں فرمایا مثلاً یہ کہ ڈاکٹر صاحب کی کتاب سے وہ سہ سطری اقتباس انھوں نے درج کر دیا۔ جسکا تذکرہ اوپر ہوا لیکن بعد کے صفحات جن میں ہر سہ نظامات کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں بسہولت تمام نظر انداز کر گئے اور اپنی جانب سے ایک مطالبہ پیش کر کے ان صفحات کے مضمون کی نفی بھی کر دی۔

"اسوقت دنیا میں تین نظام معیشت رائج ہیں، ایک خالص انفرادیت یا سرمایہ داری کا نظام، دوسرے اشتراکیت یا اشتمالیت کا نظام اور تیسرا اسلامی نظام۔ اقبال کے تمدنی تصورات چونکہ بنیادی طور پر اسلامی تعلیم سے ماخوذ ہیں اسلئے محل تعجب نہیں کہ وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت پر تنقید کرتے ہوئے اسلامی نظام معیشت کو ان دونوں پر فضیلت دیتا ہے۔ اسلام نے تمدنی زندگی کے متعلق جو حل پیش کئے ہیں وہ بیشتر امتزاجی نوعیت رکھتے ہیں..... سرمایہ داری اور اشتراکیت میں زندگی کی پیچیدہ حقیقت کو سادہ بنانے اور یکطرفہ حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ....."

"اسلام کا ایک بڑا کارنامہ تو یہ ہے کہ اس نے دین اور دُنیا کی تفریق کو مٹا دیا۔ مسلمان جب دعا مانگتا ہے۔ ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ تو دراصل انسان کے معاشی عمل کو بھی اسکے اخلاقی عمل کا ایک جزو قرار دیتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے جعلت لی الارض مسجداً میرے لئے تمام زمین مسجد ہے یعنی تمام دنیاوی اعمال بھی اخلاقی نوعیت رکھتے ہیں..... معاشی مسائل کو حل کرنیکا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انھیں اخلاقی اعمال سے علیحدہ نہ تصور کیا جائے"

"اسلام نے ہمیشہ انفرادی آزادی کے اصول کو تسلیم کیا..... پھر اسلامی نظام معیشت میں مستقل طور پر ایسے اسباب نہیں موجود ہونے چاہئیں جو دائمی طور پر معاشرہ کو دولتمندوں اور مفلسوں میں تقسیم کر دیں۔ حق معیشت کی مساوات اس نوعیت سے ہونی چاہیئے کہ بغیر محنت کے کوئی شخص معاشی خوشحالی کی منزل تک نہ پہنچ سکے..... اصول وراثت زکوٰۃ اور سود کی ممانعت سے ایسا انتظام کیا گیا کہ سرمایہ معاشرے کے مختلف طبقوں میں چلتا پھرتا رہے ..... اس نظام میں دولت کا

فرق فضیلت و برتری کی ضمانت نہیں ہو سکتا۔"

"سرمایہ داری کا سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ اسمیں ملکیت کے جذبے کی تشفی صرف چند اشخاص کے لئے ممکن ہوتی ہے دوسروں کو غیر حقیقی نفع کی اُمید میں کام پر لگایا جاتا ہے لیکن انکی شخصیت کی تکمیل کا کوئی سامان نہیں بہم پہنچایا جاتا۔ اس نظام میں اکثریت کی مساعی منتشر، غیر مربوط اور میکانکی حیثیت رکھتی ہیں اور ایک قسم کے عام احساس نامرادی کی شکل اختیار کرلیتی ہیں معاشی بندگی اور آقائی اس نظام کی خصوصیت ہے۔"

"اشتراکی معیشت ذاتی ملکیت اور مبادلہ دونوں کو ختم کرنا چاہتی ہے اور یہی دونوں معاشی دنیا میں قدر کو معین کرنے والے عناصر ہیں۔ یہ بغیر زر کی معیشت ہے۔ اشتراکیت کے نزدیک اشیاء کی قدر آفرینی انفرادی فرق مراتب کو حق بجانب ثابت کرنے کا ذریعہ ہے۔"

اسلام میں سرمایہ اور ملکیت خدا کی امانت ہے۔ وسائل دولت آفرینی پر نہ فرد کو تصرف کا حق حاصل ہے اور نہ جماعت کو بلکہ خدا کو۔ انسان جوں جوں ترقی کرتا جائے گا ذات واجب کو اپنا مقصود و مشتہا بنا کر اپنے معاشی اداروں میں بھی تبدیلی کرتا رہے گا..... چنانچہ اسلام میں سیاست و معیشت کے باب میں کوئی قطعیت نہیں۔ بنیادی اصول کو حتمی طور پر بیان کر دیا گیا ہے..... جسطرح سیاست میں حقیقی حاکمیت ذات واجب کی ہے اسی طرح وسائل معیشت خدا کے ہیں جن سے انسان استفادہ کر سکتا ہے..... زمین اور سرمایہ پر انفرادی تصرف امانت کے طور پر حق بجانب ہے بشرطیکہ ان کا استعمال ایسے نظام معیشت کے تحت ہو جو کسی شخص کو بھی رزق سے محروم نہ ہونے دے۔"

مذکورہ بالا اقتباس کے خط کشیدہ حصّے کو نقل کر کے جعفری صاحب رقمطراز ہیں:-

"ڈاکٹر صاحب اصل سوال سے گریز کر رہے ہیں۔ اصل سوال یہ نہیں ہے کہ سرمایہ اور ملکیت خدا کی امانت ہیں (یعنی گویا کہ یہ بات شاید جعفری صاحب کے نزدیک بھی مسلّم ہے) بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ خدا کی اس امانت کا امین کون ہوگا۔ فرد یا جماعت، پوری سوسائٹی کی بہبود کیلئے خدا کی اس ملکیت پر تصرف کیونکر اور کس کے ذریعہ سے کیا جائے گا؟"

اور یہاں تک پہنچنے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ فی الحقیقت ان کا سوال ختم ہو گیا اور اگر اسکا کوئی معقول جواب ملجائے (جو شاید خود انکی نگاہ میں بھی تھا) تو بات یہیں ختم ہو جاتی ہے اور ان کا کام رہ جاتا ہے اس لئے انھوں نے کلام میں کسی قدر تندی و گرمی داخل کر کے اصل سوال سے آگے یہ اضافہ فرمایا "سرمایہ داروں اور زمینداروں کے ذریعہ سے یا ذاتی نفع خوری کی بنیاد پر یا عوام کے ذریعہ جمہوری بہبود کی بناء پر؟ اصل سوال وسائل دولت آفرینی کے طریق استعمال کا ہے۔ سرمایہ داروں میں انکا استعمال ذاتی منافع اور جنگ زرگری کے لئے ہوتا ہے اور اشتراکیت میں جمہوری بہبود کے لئے اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب بتائیں کہ اسلام اور انصاف کس کے ساتھ ہیں، سرمایہ داری یا اشتراکیت کے؟"

اسلام اور انصاف نہ سرمایہ داری کے ساتھ ہیں اور نہ اشتراکیت کے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت شجر جنیث کے دو کڑوے کسیلے پھل ہیں جنھوں نے ساری انسانیت کو تلخی کام و اہن اور یاس و انتشار میں مبتلا کر رکھا ہے۔ نہ سوال یہ ہے کہ سرمایہ اور ملکیت خدا کی امانت ہیں یا نہیں اور نہ یہ کہ وسائل دولت آفرینی کا طریق استعمال کیا ہو اور نہ یہ بات محتاج دریافت ہے کہ خدا کی اس امانت کا امین کون ہوگا؟ اس کائنات کا خدا کی ملکیت و امانت ہونا یہ وہ بنیادی اصول ہے کہ اس سے خود بخود منطقی نتیجے کے طور پر جعفری صاحب کے تمام سوالوں کے جواب متفرع ہوتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اشتراکی فلسفے پر یقین رکھنے کے باعث ان کے نزدیک یہ بنیاد ہی غلط ہے۔ وہ بظاہر اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ وہی پہلو بچانے کی ذہنیت ہے جو اُن کے سارے مقالے میں نمایاں ہے اگر کہا کائنات خالق کائنات کی امانت ہے تو لازمی طور پر اسکو یہ بھی بتانا چاہیئے کہ اسکی اس امانت کا امین کون ہے، اس امانت کا طریق استعمال کیا ہونا چاہیئے۔ اور اسمیں تصرف کے کیا حدود ہیں۔ ان میں سے ہر سوال کا جواب اسلامی دستور (قرآن پاک) اور اسکی عملی تشریحات (حیات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم) میں موجود ہے۔ کسی واقعی عذر کے سبب اگر قرآن پاک کا

مطالعہ ان کے لئے ممکن نہ تھا تو خود اقبال کے کلام میں، اسرار خودی سے لیکر ارمغان حجاز تک، اس نوع کے اشارات پائے جاتے ہیں جن سے یہ گرہیں کھل جاتیں، اس سے قطع نظر کہ اسلامی نظام سے متعلق کافی مواد خود اُردو زبان میں موجود ہے۔ اسلام کو ایک روایتی مذہب اور اشتراکی اصطلاح میں "افیون" سمجھنے پر اصرار نہ ہو اور تحقیق کی واقعی لگن ہو تو کوئی معذوری سنگ گراں نہیں بن سکتی۔

اسلامی نظام میں فرد و جماعت کے تعلق کی وہ نوعیت نہیں جو اشتراکی نظام میں ہے۔ کلکم راع وکل راع مسئول عن رعیتہ کے انفرادی ذمہ داری اور مسئولیت اور اجتماعی ذمہ داری اور مسئولیت میں اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی تضاد نہیں۔ فرد و جماعت ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔ فرد کی شخصیت کے پروان چڑھنے اور اجاگر ہونے کے لئے جماعت کا وجود ضروری ہے اور جماعت کی بقاء و استحکام کے لئے فرد کا وجود لابدی ہے۔ اسی حقیقت کی جانب اقبال نے ان اشعار میں اشارہ کیا ہے :-

در جماعت فرد را سیمے ما — از چمن اورا چو گل چیدیم ما
فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند — سلک و گوہر کہکشاں و اختر اند
فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام

ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ جعفری صاحب اور ان کی برادری کے لوگ پہلے انسانی زندگی کو مختلف خانوں میں تقسیم کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد معاشی مسئلے کو انسان کی پوری زندگی سے، جو بجائے خود ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے، جدا کر کے دیکھتے ہیں۔ یہی حرکت وہ اسلامی نظام کے ساتھ کرتے ہیں، اسلام کا ایک بنیادی فلسفہ، ایک شعور حیات و کائنات، ایک مخصوص طریق فکر اور زاویۂ نگاہ ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت وہ ارکان ہیں جنکی بنیاد پر زندگی کی وہ اسکیم اُبھرتی ہے جسکا نام اسلامی نظام ہے۔ انسانی زندگی کے اس نقشے میں تمام مسائل کا حل یکجائی اور مربوط طور پر پایا جاتا ہے۔ جو شخص ان باتوں سے قطع نظر کر کے اور فرد و جماعت کے اس تصور کے ساتھ جس میں یا تو فرد کو خدائی کا مقام حاصل ہے یا جماعت و جمہور کے نام پر سوسائٹی کے نسبتاً ذہین اور باعزم چند لوگوں کو، اسلامی تعلیمات یا اقبال کی شاعری کا مطالعہ کرنے بیٹھے گا۔ اسکو اپنے "کام" کی چیزیں ملجائینگی، اسلام نظام کے بارے میں کوئی سوجھ بوجھ نہ مل سکے گی۔

جعفری صاحب کا یہ دعویٰ محض دعویٰ ہی ہے کہ وسائل دولت آفرینی کا استعمال اشتراکیت میں جمہوری بہبود کے لئے ہوتا ہے اگر ایسا ہوتا تو روس میں وہ "آہنی دیوار" نہ کھڑی کی جاتی جو باہر ازاں عیوب سرمایہ دارانہ ممالک میں بھی نہیں کھڑی ہے۔ مطلق العنان بادشاہ عوام کی دولت ذاتی عیش پرستی اور بے جا نمود و نمائش میں ضائع کیا کرتے تھے۔ اشتراکی روس کے خدائے لاشریک اسٹالن نے ان کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ابھی گذشتہ جنگ عظیم کے بعد انھوں نے ایک بہت بڑی رقم کے انعام کا اعلان اس شخص کے لئے کیا تھا جو ان کے صاحبزادے کے مرقد مبارک کا نشان دریافت کر لائے۔ یہ شخص واحد کی مطلق العنان آمریت ہے یا جمہور کی با اختیار حکومت ؟

ایک عام شہری کی زندگی اور اوسط آمدنی اور اسٹالن اور دوسرے عہدہ داروں کی آمدنی میں جو تفاوت اشتراکی روس میں پایا جاتا ہے وہ اس تفاوت سے کسی طرح کم نہیں جو سرمایہ دارانہ نظام مملکت رکھنے والے ممالک کی آبادی کے مختلف طبقات میں پایا جاتا ہے دیکھنے والوں کو وہاں بھی ایسی گلیاں مل جاتی ہیں جن میں خدا کی مخلوق اسطرح بستی ہے جیسے پھٹکی میں کبوتر بند ہوتے ہیں اور کمرے کی تنگی کے باعث پلنگ یوں بنائے جاتے ہیں جیسے دیوار میں لگی ہوئی خانہ دار الماری۔

سرمایہ دارانہ ممالک کی فوقیت ثابت کرنا مقصود نہیں، اصل حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت دونوں کی بنیاد ہی ناقص ہے اور وہ ہے خدا کی ہستی کو الگ کر کے اس کائنات کا تصور اور انسان کے اقتدار اعلیٰ کا اصول۔ انسان خواہ سرمایہ دار ہو یا مزدور خدا کی ہستی سے بے نیاز ہو کر وہ اس مرکز ثقل سے محروم ہو جاتا ہے جو اسکے تمام اعمال میں توازن قائم رکھنے کی واحد ضمانت ہے۔

نہ تمام کار اگر مزدور کے ہاتھ میں ہو بھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اگر تاجے کنی جمہور پوشد — ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست
عروس اقتدار سحر فن را — ہماں پیچاک زلف پرشکن ہست
ہوس اندر دل آدم نمیرد — ہماں آتش میاں مرد و زن ہست
خاند ناز شیریں بے خریدار — اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

جعفری صاحب فرماتے ہیں :-

"اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال نے اشتراکیت پر کافی نکتہ چینی کی ہے لیکن انھوں نے غالب و مغلوب اور بلند و پست کے امتیاز کی حمایت کہیں نہیں کی ہے بلکہ اسکے خلاف جہاد کا اعلان کیا ہے۔"

بلاشبہ اقبال نے یہی کیا ہے لیکن ان کے اشعار سے معاشی مساوات کا استنباط تاویل و تعبیر کی وہ شعبدہ بازی ہے جسکی مثال نہیں مل سکتی۔ اقبال اس مساوات کے قائل نہ تھے جسکی بنیاد "شکم" پر ہو یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مارکس کے نظریات پر اس پہلو سے بڑی کڑی تنقید کی ہے۔

دین آں پیغمبر حق ناشناس بر مساوات شکم دارد اساس

اقبال کے وہ اشعار جن سے معاشرتی مساوات مستنبط ہوتی ہے ان میں سے چند یہ ہیں

آگ ہیں لڑائی میں اگر وقت نماز قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

بمنبر بندہ و فساد آدمیت ہے

خدائے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

آخری شعر اور اس سے قبل کے دوسرے تمام اشعار سے زیادہ سے زیادہ جو نتیجہ نکالا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ سرمایہ و محنت کی کشمکش میں اقبال کی ہمدردی غیر مبہم طور پر محنت کش انسانوں کے ساتھ تھی اس لئے بڑھ کر یہ دعویٰ کہ سرمایہ داری کی پیدا کردہ معاشی بدحالی اور ناہمواری کا علاج اقبال کے نزدیک بھی اشتراکیت ہی تھی ان کی منشا اور ان کے کلام کی اندرونی شہادت کے یکسر خلاف ہے۔

بایں ہمہ جعفری صاحب لکھتے ہیں کہ اقبال کے سیرت نگار اور نقاد "ایک ایسے جمہوری نظام کی مخالفت کرتے ہیں جسے اقبال نے "آفتاب تازہ" کا نام دیا اور جسکے انقلاب کو اسلام کی بہترین روایات سے تعبیر کیا۔ مذہب کے بعض روشن خیال پرستار اسی زبان میں باتیں کرتے ہیں مثلاً گیٹر بری کے بڑے پادری نے ابھی اشتراکیت کو عیسائیت کی بہترین روایات سے تعبیر کیا ہے۔"

پھر فرماتے ہیں "اقبال نے اشتراکیت پر جو کچھ نکتہ چینی کی ہے وہ اس مذہبی نقطۂ نگاہ اور تصور پرستی کی بنیاد پر ہے ..... اس کا سارا اعتراض اس پر ہے کہ اشتراکیت کی بنیاد مادیت پر ہے اسلئے روحانیت کے فقدان کی وجہ سے اس کے بھٹک جانے کا اندیشہ ہے ..... یہ اعتراض اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ اشتراکیت روحانی قدروں کی قائل نہیں ہے۔"

'خضر راہ' اقبال کی ایک طویل نظم ہے جو انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ ۱۹۲۲ء میں پڑھی گئی تھی۔ اس نظم میں اس بلاغت اسلوب اور زور کلام کے ساتھ جو اقبال ہی کا حصہ ہے انھوں نے خضر کی زبانی چند مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور مختلف عنوانات کے تحت کچھ سوالوں کے جواب دیئے ہیں۔ پہلا عنوان ہے "صحرا نوردی" اور آخری عنوان ہے "دنیائے اسلام"۔ آخر سے پہلے عنوان "سرمایہ و محنت" کے تحت یہ اشعار ہیں۔

اٹھ کے اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
فنچہ ساں غافل ترے دامن میں گوہر کب تلک
آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

جعفری صاحب نے اپنے مذکورہ بالا اقتباس میں آخری شعر کا حوالہ دیا ہے۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے استدلال کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے نظم کے آخری عنوان کے تحت کے چند اشعار اور خصوصاً آخری شعر بھی درج کر دوں مختلف عنوانات پر منقسم ہونے کے باوجود نظم مسلسل ہے اور اسکے مختلف حصص میں فکری و معنوی ربط بھی پایا جاتا ہے۔

کھولکر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں آنیوالے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ
مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار ہر زماں پیش نظر لا یخلف المیعاد دار

خضر راہ کے پہلے کی نظمیں ہیں ان میں یہ اشعار دیکھئے۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو خوف باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو
شب گریزیں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ خورشید سے

اس کے بعد

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے — یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

"طلوع اسلام" زمانی اعتبار سے خضر راہ کے بعد کی نظم ہے یعنی ۱۹۲۳ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں پڑھی گئی۔ اگر جعفری صاحب کے طریق استدلالی کو وسعت دی جائے تو "طلوع اسلام" خضر راہ کے آفتاب تازہ کے ظہور اور مزدور کے دور کے آغاز کا ایک نیا عنوان ہوگا۔ لیکن ایسا کچھ سوچنے سے پہلے اس نظم کے درج ذیل اشعار کو ایک بار ضرور پڑھ لینا چاہیئے۔

سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا — خلیل اللہ کے دریا میں ہونگے پھر گہر پیدا
کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے — یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا — تری فطرت برا ہیمی ہے معمار جہاں تو ہے
مٹایا قیصر کسریٰ کے استبداد کو جس نے — وہ کیا تھا زور حیدرؓ فقر بوذرؓ صدق سلمانیؓ
ولایت پادشاہی علم اشیا کی جہاں گیری — یہ سب کیا ہیں فقط ایک نکتۂ ایمانی کی تفسیریں
حدیث خواجۂ بدرو — تصرف ہائے پنہانش بچشم آشکار آمد

ممکن ہے انقلاب روس سے علامہ کو یہ توقع رہی ہو کہ محنت کش انسانوں کی حالت اسکے نتیجہ میں سنبھل جائے گی اور اس کے اثر سے ہر ملک کے پسماندہ اور خراب حال لوگ اعتماد و عزم حاصل کر سکیں گے جیسا کہ امریکہ کی جنگہائے آزادی کا ردعمل یورپ کے مختلف ممالک پر ہوا تھا لیکن جیسا کہ جعفری صاحب کو خود تسلیم ہے اقبال نے جن مسائل کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے وہ سارے ہندوستان اور پورے عالم انسانیت کے مسائل تھے جنھیں انھوں نے ایک مسلمان کی نظر سے دیکھا" ایسا ہے تو انھوں نے اشتراکی انقلاب کو بھی مسلمان ہی کی نظر سے دیکھا ہوگا اور یہ جاننے کے لئے بڑے چھان بین کی ضرورت نہیں کہ مسلمان کی نگاہ میں انسانیت کے سارے مسائل کا واحد حل اسلام ہے نہ کہ اشتراکیت۔

یہ بات بھی کھولنے کی نہیں ہے کہ اقبال ایک مفکر ہی نہ تھے شاعر بھی تھے۔ شاعر کا وجدان اور اسکا احساس عام انسانوں کی بہ نسبت زیادہ سریع التاثر ہوتا ہے۔ حرکت اور جوش و سرگرمی کے بڑھتے اور ابھرتے ہوئے آثار کے لئے طلوع آفتاب سے عہد استعمار تک دریافت نہیں ہوا۔ اقبال کی شاعرانہ بالغ نظری نے اس حقیقت کو پالیا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہر موقع پر ان کیفیات کو بیان کرنے کے لئے اس استعارے کا انتخاب کیا ہے۔ مزدور اور محنت کش طبقہ کی بیداری ہو یا محض ملت میں عزم و ہمت کا ظہور خاص کر ان آثار کے بیان کے لئے طلوع آفتاب کا منظر اقبال کا پسندیدہ اور عام الورود ہے۔ میرا خیال ہے اس ایک عنوان کے تحت انکے اشعار کی ایک معتدبہ تعداد ہوگی۔ اور ان بے شمار اشعار میں معتدبہ تعداد ایسے ہونگے جن میں اس استعارے کا تعلق اسلامی نظام کے ابھرتے اور بڑھتے ہوئے رجحانات سے ہے۔

بہرحال تنزل اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آفتاب تازہ سے مراد اشتراکی انقلاب ہے تو بھی اقبال کے کلام کی بے شمار اندرونی شہادتوں کے پیش نظر اس استنباط کی ذرہ بھر بھی گنجائش نہیں کہ وہ مارکس کے نظریات کی بنیادی کمزوریوں سے ناواقف تھے یا اشتراکیت کو ایک نظام نو کی حیثیت سے دنیا میں برسرکار و با اقتدار دیکھنے کے متمنی تھے۔

میں نے جاوید نامے کے اس حصے کو بار بار پڑھا جسکے حوالہ سے جعفری صاحب نے لکھا ہے کہ یہ "بڑا اہم نکتہ ہے کہ اقبال نے اشتراکیت کے نصب العین اور اصولوں سے کہیں اختلاف نہیں کیا بلکہ اشتراکی اصولوں کو اپنا کر ملت روس کو اسلامی روحانیت کا پیغام دیا ہے"۔ لیکن میں یہ سمجھنے سے قطعاً قاصر ہوں کہ ملوکیت، نسل و رنگ کے امتیاز کی مخالفت اور خدا کی حاکمیت کے تصور کے ساتھ اسلامی تعلیمات کی جو جو اشارات پائے جاتے ہیں ان کا اشتراکیت سے کیا رشتہ ہے اور یہ اسلامی روحانیت کونسی اصطلاح ہے۔ اس پیغام کی حقیقت یہ ہے

منزل و مقصود قرآں دیگر است — رسم و آئین مسلماں دیگر است
بندۂ مومن ز قرآں برنہ خورد — در ایاغ او نہ مے بینم نہ درد
خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست — خود سر تخت ملوکیت نشست
تو کہ طرح دیگر انداختی — دل ز دستور کہن پرداختی
کردۂ کار خدا و ندان تمام — بگذر از لات و منات ام الخرام
اے کہ می خواہی نظام عالمے — چشمۂ او را ز اساس محکمے؟
داستان کہنہ مشتی باب باب — فکر را روشن کن از "ام الکتاب"

اسی "ام الکتاب" سے فکر کو روشن کرنے کی دعوت کا نام جعفری صاحب نے اسلامی روحانیت کا پیغام رکھا ہے۔ اشتراکی حضرات کی یہ عادت بن گئی ہے کہ وہ بے اٹکل لوگوں کو تسلی دیا کرتے ہیں کہ

اشتراکیت میں کوئی کمی نہیں سوا اخلاقی تصورات کی کمی کے اگر یہ کمی بآسانی پوری ہو سکتی ہے جس کو اس سلسلے میں اضطراب لاحق ہو وہ اپنے شعر فکر میں اس قلم کی بھی پیوند کاری کر لے۔ ابھی کچھ دن ہوئے لنکا میں Moral Re-Armament کے ایک جلسہ میں ایک اشتراکی نمائندے نے اسی قسم کی بات کہی تھی۔ جعفری صاحب نے سرے سے تفصیل ہی چکا دیا ہے جیسا کہ اوپر کسی اقتباس میں تحریر کیا جا چکا ہے انھوں نے اس نئی دریافت کا حتمی اعلان کر دیا کہ اشتراکیت روحانی قدروں کو مانتی ہے اور اس سلسلہ میں علامہ اقبال غلط فہمی میں مبتلا تھے۔

ملت روس کے نام اسلامی روحانیت کے اس پیغام کے سلسلے میں یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ یہ پیغام افغانی کی زبانی ہے جو اتحاد اسلامی کے داعی تھے اور یہ کہ روسی انقلاب کی دست برد میں جو خطے آئے انکی اکثریت کا دین اسلام تھا اور اسلامی شعور کے فقدان کے سبب وہ اس انجام کو پہنچے تھے۔

اس ساری گفتگو میں ایک تہدید بھی شامل ہے اور اسکو پڑھکر مجھے وہ "قلعہ سازی" یاد آگئی جسکا تذکرہ اکثر شطرنج کھیلنے والے کرتے ہیں۔ جعفری صاحب فرماتے ہیں:-

"ظاہر ہے کہ اقبال کے جو سیرت نگار اور نقاد اقبال کو ہندوستان کی تحریک آزادی، دنیا کی جمہوریت اور اشتراکیت کا دشمن بتائینگے وہ اقبال کا رشتہ لامحالہ اس دور کے بدترین رجعت پرستوں سے جوڑ دینگے۔ اگر سرمایہ داری شہنشاہیت کی مخالفت کے ساتھ جمہوریت اور اشتراکیت کی بھی مخالفت کی جائے تو پھر فاشزم ہی سے رشتہ جوڑا جا سکتا ہے"

تا منفعل ز بخشش پیمانہ بنمیش — می آرم اعتراف گناہ نہ بودہ را

بڑی بدذوقی ہوگی اگر جعفری صاحب کی اس کوشش کی داد نہ دیجائے مگر حقیقت پھر حقیقت ہے اقبال نہ سرمایہ داری کے قائل تھے نہ اشتراکیت کے اور نہ فاشزم کے ان کے نزدیک ان تینوں میں کچھ اچھے پہلو ہونے کے باوجود ہر سہ تخریبات اسی "ام الخبائث" کی دختران نافرجام ہیں جسکا نام بے خدا تصور حیات و کائنات ہے وہ جس نظام کو برسر کار دیکھنا چاہتے تھے اسکے خدوخال "حکومت الٰہی" کے عنوان سے انھوں نے جاوید نامے میں بیان کئے ہیں اور پھر اپنی آخری تصنیف ارمغان حجاز میں ابلیس کی زبانی تمام شیطانی عزائم کے لئے اسکو ایک مستقل اندیشہ قرار دیا ہے۔

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام — من غلام او رانہ او کس را غلام
رسم و راہ دین آتیشش زحق — زشت و خوب تلخ و نوشیش زحق

دست فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک ❊ مزد کی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھکو اشتراکی کوچہ گرد ❊ یہ پریشاں روزگار آشفتہ مغز آشفتہ ہو
ہے اگر مجھکو خطر کوئی تو اس امت سے ہے ❊ جسکی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو
جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے ❊ مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے

محمد عثمان بی۔ کام

ادب اور معصیت

کوئی نگارش زمان و مکان کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتی کیونکہ ادب برائے زندگی ہو یا ادب برائے ادب، بہر حال ادیب کو فکری غذا گرد و پیش رونما ہونے والے واقعات و حوادث سے ہی ملتی ہے۔ وہ زندگی کے ٹھوس معاملات سے ہی اپنی نگارش کا ڈھانچہ تیار کرتا ہے۔ اسکے بعد ضرور اتنا فرق ہو جاتا ہے کہ پھر ادب برائے زندگی کا حامی اس ڈھانچہ پر رنگ و روغن بھی وہی چڑھاتا ہے جو حقیقت و واقعیت کے اجزا سے بنتا ہے لیکن ادب برائے ادب کا قائل وہ رنگ و روغن استعمال کرتا ہے جو سراسر تصنع، تخیل اور خیال آرائی کا آمیزہ ہوتا ہے۔ اور اسکی نگارش جن حقیقتوں کے بل پر وجود میں آئی ہے ان تک نظر کی رسائی کے لئے اس مصنوعی روغن کو بہت کچھ کھرچنے اور دھونے کی ضرورت ہوتی ہے اسلئے اکثر اوقات یہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ ادب برائے ادب کا قائل زندگی کی حقیقتوں کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ تجربہ و مشاہدے سے ماورا معاملات ہی اسکی نگارش میں بنیاد کا کام کر دیتے ہیں۔ لیکن دراصل یہ بڑی غلط فہمی ہے جو اب بڑی حد تک تمام ادبی حلقوں میں محسوس بھی کر لی گئی ہے اور یہ بات متفقہ طور پر طے پا چکی ہے کہ ادب خواہ کسی دبستان فکر کی پیداوار کیوں نہ ہو کبھی زندگی کی حقیقتوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

پھر یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ ادب زندگی کے کسی ایک رُخ کی ہی عکاسی نہیں کرتا بلکہ وہ اس کے تمام پہلوؤں کا ترجمان ہوتا ہے چنانچہ اس میں صرف نیکیاں اور اچھائیاں ہی زیر بحث آتی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ بُرائیاں اور لغزشیں بھی ادب کا موضوع بنتی ہیں اس لئے اسلام پسند ادیبوں کی تحریریں بھی بدی اور معصیت کے ذکر سے خالی نہیں رہ سکتیں کیونکہ ان کا مقصد ہی موجودہ معاشرت کی خرابیوں کو سامنے لاکر ان پر مناسب تنقید کرنا اور عوام کے دلوں میں ایک سعید اور صالح معاشرہ کی پیاس پیدا کرنا ہے۔

چنانچہ اسلام پسند ادیبوں کے لئے بالخصوص یہ مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر برائیوں کے تذکرہ سے اجتناب کریں یا اگر ان کا ذکر کریں تو یہ کن حدود کے اندر رہنا چاہیئے۔

ابھی کچھ عرصہ پیشتر حقیقت نگاری کی جو تحریک چلی تھی اس کے علمبرداروں نے برائیوں کو پورے کیف و کم کے ساتھ انکے اصلی رنگ میں بیان کر دینے کو حقیقت نگاری سمجھا تھا اور دلیل یہ دی کہ جب تک برائیوں کو واشگاف کر کے نہ رکھ دیا جائے لوگ اس سے باخبر کیسے ہونگے اور پھر ان کے تدارک کی تدبیر کیسے ہو سکے گی۔ بظاہر تو یہ دلیل بڑی دزنی معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل یہ بُرائی کی نوعیت سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ بُرائی کوئی ایسی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے کہ اسکی جانب توجہ مبذول کرانے کے لئے اسکی ساری تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت ہو یا پھر بجنسہٖ اسکی عکاسی کی جائے۔ یہ تو ایسی معروف چیزیں ہیں جنھیں عامی سے عامی بھی جانتا ہے۔ انکی جانب صرف ایک سرسری سے اشارے کی ضرورت ہوتی ہے اور سُننے والا خود ہی کہنے والے کی مُراد کو پالیتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ کسی برائی کی مکمل منظر کشی کے بغیر حقیقت نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا، یا تو قائل کی کم فہمی کی دلیل ہے یا پھر اسکے گندے جذبات کا آئینہ دار ہے جنکی تسکین کے لئے وہ ادب کو انسانی لغزشوں اور غلطیوں کا آئینہ خانہ بنا دینا چاہتا ہے۔

اس کے علاوہ ایسی نام نہاد حقیقت پسندانہ طرز نگارش سے لازمی طور پر ایک اور بُرائی کو فروغ ہوتا ہے جسکے مہلک نتائج کو برداشت کرنے کی جرأت کوئی صاحب فہم نہیں کر سکتا۔ کامیاب منظر نگاری کے لئے خواہ وہ سماج کی کسی خوبی کی ہو یا بدی کی، اسکے

عمیق مشاہدہ اور گہرے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کوئی ادیب ایسے طرز نگارش کو اختیار کریگا جس میں برائی کی تمام جزئیات کو بیان کرنیکا اہتمام کیا جاتا ہے تو لازماً اسے بدی اور بدکاروں پر گہری نگاہ رکھنا ہوگی۔ ان کے اعمال و افعال کا بہت قریب سے مشاہدہ کرنا ہوگا اسے ان راہوں سے گذرنا ہوگا جہاں عموماً ایسے افعال کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔

پھر یہ برائی یہیں ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اس کے بہت ہی دور رس اثرات ہوتے ہیں جنکی چوٹ براہ راست نفس و اخلاق پر پڑتی ہے۔ ہر انسان کی سرشت میں برائی سے نفرت اور اچھائی سے رغبت کا میلان فطری طور پر موجود ہے۔ یہ وہ زبردست انتظام ہے جو قدرت نے انسان کو بدراہوں سے روکنے اور نیک روی کی جانب سبقت کرنے کے لئے کر دیا ہے۔ جس حد تک یہ انتظام درست رہتا ہے انسان اخلاقی حیثیت سے ارفع و اعلیٰ رہتا ہے اور اسی انتظام میں جتنی خرابی پیدا ہوجاتی ہے اتنی ہی خرابی اسکی سیرت و کردار میں آجاتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسکے لئے زیادہ بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں۔ اب جسطرح گندے ماحول میں رہنے یا بار بار اس طرف سے گذرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر آدمی کے دل میں طہارت اور نظافت کا جذبہ کمزور پڑتا جاتا ہے اور غلاظت سے وہ کراہیت محسوس نہیں ہوتی جو پہلی بار اس نے محسوس کی تھی اسی طرح برائیوں کے کھلے بیان اور جزئیاتی منظر کشی سے بھی انسان کی وہ اخلاقی حس کمزور پڑتی جاتی ہے جو برائیوں سے نفرت دلاتی اور اچھائیوں کا شوق پیدا کرتی ہے۔ اس خرابی کی آخری حد وہ ہوتی ہے جب اسے برائی کے برائی ہونیکا احساس بھی نہیں رہتا۔ زیر بحث طرز نگارش اگر زوال کی اس آخری پستی تک نہیں پہنچاتا تو اسکے قریب تک ضرور پہنچا دیتا ہے۔ لیکن یہ نقصان بھی صرف نظر کر لینے کے قابل نہیں۔

اس طرز تحریر کے اختیار کرنے میں جو چیز سب سے بڑھ کر مانع ہے وہ خود ہمارا مقصد ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ لوگ برائی کو برا محسوس کرکے اس کے استیصال کی فکر کریں اور اس کے مقابلہ میں اچھائی کو پروان چڑھائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہم صرف وہی ذرائع اختیار کریں گے جو حصول مدعا میں معاون ہوں نہ کہ وہ جن سے ہمارا اصل مقصد ہی فوت ہوجائے۔ اس کلیہ کو ذہن میں رکھ کر اب اس حقیقت پر غور فرمائیے کہ ہر برائی میں کچھ نہ کچھ لذت ضرور ہوتی ہے اور جب اس برائی کی منظر کشی کی جاتی ہے تو زبان یا کاغذ پر اسکا ذکر ہی منتقل نہیں ہوتا بلکہ اس خط کا ایک حصہ بھی لگا چلا آتا ہے جو خود اس برائی میں تھا۔ اب اگر کسی ادبی مجلس میں آپ حقیقت نگاری کی خاطر کسی برائی کی منظر کشی پر اتر آئیں تو سننے والوں تک آپ صرف اس برائی کا تصور ہی نہیں بلکہ اسکی لذت بھی پہنچا دیں گے۔ خصوصاً نوجوان اس سے بری طرح متاثر ہونگے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آپکا اصل مقصد پس منظر میں جا پڑے گا اور اس تک کسی کی نظر نہ پہنچ سکے گی۔ اس طرح آپنے حصول مدعا کے لئے جو ذریعہ اختیار کیا خود اسی نے آپکے مقصد پر تیشہ چلا دیا۔ پھر بھی اسی انداز نگارش پر اصرار کئے جانا کہاں کی دانائی ہے۔

اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جب ادیب کو بہرحال انسانی زندگی کے مسائل سے ہی واسطہ پڑتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں اسے برائیوں کا تذکرہ بھی کرنا پڑتا ہے تو کونسا اسلوب بیان اختیار کیا جائے لیکن یہ کوئی ایسا سوال نہیں ہے جس کے جواب کے لئے ہمیں بہت زیادہ غور و تجسس کی ضرورت ہو۔ زندگی کے دوسرے مسائل کی طرح اس معاملہ میں بھی ہمیں قرآن سے پوری ہدایت ملتی ہے۔ ایسے مواقع پر کتاب الٰہی میں ہمیشہ رمز و کنایہ کا انداز اختیار کیا گیا ہے اور کسی جگہ بھی اس کی پوری تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ جو اسلام پسند ادیب بھی قرآنی ادب کو اپنانے کی کوشش کرے گا۔ اسپر خود بخود صحیح راہ واضح ہوتی جائے گی اور پھر وہ اپنے لئے ایک مناسب انداز بیان متعین کرنے میں کامیاب ہو سکے گا اس بات کو سمجھنے کیلئے ذیل کی چند مثالیں کافی ہونگی۔ عربی زبان میں ہم بستری کے لئے کتنے ہی الفاظ ہیں مگر ان سب سے صرف نظر کرکے قرآن میں لمس کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی چھونا ہیں (سورہ مائدہ رکوع ۳ - سورہ نساء رکوع ۷)

ایک جگہ اس فعل کو "ڈھانک لینا" سے تعبیر کیا گیا:
(سورہ اعراف رکوع ۲۴) ایک اور جگہ اسی فعل کا اظہار ایک دوسرے تک پہنچ جانے کے الفاظ سے کیا گیا ہے (سورہ نساء رکوع ۳) سورہ بقرہ رکوع ۲۸ میں صحبت سے اجتناب کرنے کے لئے صرف علیحدہ ہوجانے کا لفظ آیا ہے۔

سورہ یوسف کا وہ حصہ جس میں زلیخا کے ارادۂ زنا کا تذکرہ

آیا ہے اس انداز بیان کی بہترین مثال ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"یوسف جس عورت کے گھر میں مقیم تھا اس نے اسے اپنی طرف مائل کرنا شروع کر دیا اور ایک دن دروازے بند کرکے بولی آجا یہ تیرے لئے اچھا موقع ہے۔ یوسف نے فوراً کہا خدا کی پناہ۔ میرے رب نے مجھے ایک خاص مرتبہ عطا فرمایا ہے۔ ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے۔ عورت نے برائی کا مکمل ارادہ کر لیا تھا اور اگر یوسف اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے تو وہ بھی ارادہ کر چکے ہوتے۔ یہ واقعہ اس لئے پیش آیا کہ ہم اُس سے بدی اور برائی کو دور کر دیں۔ درحقیقت وہ ہمارے لئے برگزیدہ بندوں میں سے تھا۔ آخر کار دونوں آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور عورت نے یوسف کا قمیص پیچھے سے پھاڑ دیا"

غور فرمایئے یہاں کتنے لطیف اشارات کئے گئے ہیں۔ ایسے واقعات کا تذکرہ عموماً جذبات کے لئے آگ کا کام کرتا ہے۔ لیکن قرآن نے اتنا محتاط طرز بیان اختیار کر کے اس جذبات انگیز واقعہ کو کتنا غیر مضرت رساں بنا دیا لیکن اس ابہام اور رمزیت کے باوجود اصل مدعا کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

اسلام پسند ادیبوں کا فرض ہے وہ اپنے قلم کو جاہلانہ اسالیب بیان سے پاک کر کے قرآنی انداز بیان اختیار کریں تاکہ یہ انکے مقصد حیات کی تکمیل میں انکا صحیح طور پر معاون بن سکے اور پھر خدا کے حضور میں یہ باز پرس نہ ہو کہ ہمنے جو تمہیں زور قلم کی نعمت عطا کی تھی تنے اسے ہماری مقرر کردہ حدود کے باہر کیوں صرف کیا۔

(ادارۂ ادب اسلامی بدایوں کی ماہانہ نشست میں پڑھا گیا)

مترجمہ محمد عمر برنی
پروفیسر آرنلڈ

تاریخ کا انتباہ

موجودہ دور کا انسان ایک ایسے کھلاڑی کی طرح ہے جس نے اپنی زندگی کا تمام سرمایہ کھیل کی نذر کر دیا ہو اور جو اب اس فکر میں ہو کہ آیا وہ کامیاب ہوگا بھی یا نہیں؟ وہ دور گذر چکا جب لوگ اپنی ہار اور جیت کے متعلق زائچہ بنواتے تھے۔ اس دور کا انسان وہی نہیں رہا۔ پھر بھی اُسے کامیابی اور ناکامی کا خیال سوہان روح بنا ہوا ہے۔ وہ کبھی تو ماہرین معاشرت سے سوال کرتا ہے کہ کیا مثالی سوسائٹی کا وجود ممکن ہے۔ اور کیا وہ سوسائٹی ہم کو تباہی سے بچا لیگی۔" مگر وہاں سے کوئی تسلی بخش جواب نہ پاکر مورخوں کی طرف رجوع ہوتا ہے اور پوچھتا ہے کہ "کیا انسان کی گذشتہ تاریخ کسی ایسے جمود کا پتہ دیتی ہے جیسا کہ یہ ہے؟ اور اگر سوسائٹی پر کوئی ایسا جمود طاری ہوا تو اُسکا نتیجہ کیا نکلا؟" ہاں ہم کہتے ہیں کہ ایسا ہوا۔ لیکن موجودہ دور کی تکنیک (Technology) نے ہمارے مسئلہ کو زیادہ اُلجھا دیا ہے۔ پچھلے ادوار میں بھی جمود طاری ہو چکے ہیں اور سوسائٹی نے اُن کے ہولناک نتائج کو بھگتا ہے مگر موجودہ جمود نہایت خطرناک ہے۔ فرق کیا ہے صرف اتنا کہ دراصل ہمارے مسائل نہیں بدلے بلکہ اُنکی شکل بدل گئی ہے۔ ماضی میں ان ہی سڑکوں پر لوگ یا تو پیدل سفر کرتے تھے یا پرانی بیل گاڑیوں میں۔ سڑک کے قوانین کی پیروی بھی کرتے تھے۔ مگر آج اگر ہم اپنی بہترین کار میں ۸۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بیٹھ کر سڑک کے قوانین کو توڑ دیں تو ہماری کار عوام کو اُس بیل گاڑی سے کہیں زیادہ نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ اب تک سڑک بدلی ہے اور نہ اُس پر چلنے کے قاعدے اور ضابطے۔ اگر آج ہم اپنی ایجادات کو دیکھ کر شیخی ماریں اور یہ سمجھیں کہ ہم اپنے آباؤ اجداد سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں تو یہ ہماری مہلک ترین غلطی ہوگی۔ مشینوں پر مہارت اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ہم پہلے سے زیادہ عقلمند اور ترقی یافتہ ہو گئے ہیں جس زمانہ میں بھی جس قوم نے بھی اپنی مشینوں پر بھروسہ کیا اُس نے اپنی تہذیب کا گلا گھونٹ ڈالا۔

جب تہذیب پتھر کے دور سے گذر رہی تھی Lower Neolithic نے اپنی تمام تر توجہ پتھر کے ہتھیار بنانے پر صرف کر دی۔ مگر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اُنکی تہذیب فنا ہو گئی۔ Upper Polithic وہ قوم تھی جس نے اِن ہتھیاروں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ لیکن اُنھوں نے اپنی گپھاؤں کی ڈرائینگ میں آپنے رہن سہن کے ڈھنگ میں وہ نمایاں ترقی کی جس کو دیکھ کر ہم ایک بڑا سبق لے سکتے ہیں۔ اسی طرح Mayans جنھوں نے ماضی میں ایک عظیم الشان تہذیب کی بنا ڈالی۔ دھات کے کام Metalurgy سے واقف تک نہ تھے۔ برخلاف اِس کے اُنکے پڑوسی Mexicos اور Yucatas جو دھاتوں سے اچھی طرح کام لینا جانتے تھے اُنکی تہذیبوں کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔

کیا ہم اپنی طاقت کو کام میں لا سکتے ہیں

ہاں اگر تاریخ میں کوئی چیز اہم رہی ہے تو وہ یہ ہے کہ کسی چیز کا کیا استعمال ہو۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کوئی تہذیب اُسوقت تک زندہ رہ سکتی ہے جبکہ وہ صحت مند ہو۔ اُس میں تعمیر ہو اور ہر آنے والے سوال کا جواب ایک نئے ڈھنگ سے دے سکے یہ بات اسطرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ امریکہ نے Paddle Steamer بنا کر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا مگر یورپ نے چند سالوں کے بعد Screw Propeller ایجاد کر لئے جس نے امریکہ کے تجارتی بیڑہ کا سارا زور توڑ دیا۔ اگر امریکہ اپنی سابق ایجاد پر ڈٹا رہتا تو آج وہ ایک زندہ قوم نہ بن سکتا۔

آج ہم اپنی مشینی ترقی کے نشہ میں ہم اتنے سرشار ہیں بھول گئے ہیں کہ اس کے علاوہ کچھ اور تعمیری قدریں بھی ضروری ہیں جن کے بغیر کوئی

تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے ماضی کی پرستش کرتا ہے اور یہ پرستش یقیناً اُسکی ترقی کو روک دیتی ہے۔ لیکن ماضی کی پرستش کے علاوہ آپنے ملک کی پرستش کرنا بھی ایک زبردست لعنت ہے۔

سب سے بڑا سبب جس نے ہمارے مسائل کو اُلجھا دیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو سکھلایا گیا ہے کہ ہم اپنے ملک، اپنے جھنڈے اور اور اپنی ماضی کی تاریخ کی والہانہ پرستش کریں۔ ایک انسان خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصہ کا رہنے والا کیوں نہ ہو نہایت آسانی کے ساتھ ایک خدا کی عبادت کر سکتا ہے اور صرف خدا کی بندگی کرنا ہی کسی صحتمند تہذیب کے لئے جائز ہے۔ اِس نظریہ پر جتنی بھی تہذیبیں دُنیا میں وجود میں آئیں گی کبھی اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن جب ہماری نظروں کے سامنے سے یہ روشن حقیقت ہٹ جاتی ہے ہماری تباہی شروع ہو جاتی ہے۔ انیسویں صدی میں Venetians (1884) نے Austrian شہنشاہیت کے خلاف صرف اس لئے بغاوت کی کہ اُنکی تاریخ رہ رہ کر اُن کا ماضی اُن کو بتا رہی تھی۔ انجام اِسکا شکست ہوا لیکن Piedmentese کے سامنے اس قسم کا کوئی نظریہ موجود نہ تھا۔ اُن کے سامنے اُنکی ماضی کی تاریخ نہ تھی۔ نتیجہ میں یہ لوگ فاتح ہوئے اور انھوں نے اپنا انتقام لے کر Venetians کو آزاد کر دیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر Piedmentese کیوں کامیاب ہوئے۔ اسکا صرف ایک جواب ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کے سامنے متحدہ اِٹلی کا تعمیری نظریہ تھا۔ جو بالکل ایک نئی چیز تھی۔ اس کام کے لئے اُنہیں ایک نئی ہمت اور نیا ولولہ موجود تھا جو برخلاف اسکے Venetians میں وہی اپنی ماضی کی تکرار تھی۔ اور وہ بات جو پُرانی ہو جاتی ہے اپنا اثر صرف اس لئے کھو دیتی ہے کہ اُس کو نئے ڈھنگ سے نہیں پیش کیا جاتا۔ Patriotism (وطن پرستی) انقلاب فرانس کے بعد کی پیداوار ہے۔ اس سے پہلے جب لوگ خدا کو اپنا حاکم اعلےٰ تسلیم کرتے تھے تو وہ اپنی حکومت کے صرف اتنے ہی وفادار تھے جتنے کہ ہم آجکل اپنے شہر کی میونسپلٹی کے وفادار ہیں۔ یعنی بس ٹیکس وغیرہ ادا کر دیئے اور دوٹ ڈالدیا۔ ان لوگوں نے اپنے ضمیر پر کبھی ریاست (State) کو قابو یافتہ ہونے نہیں دیا لیکن اب تو Patriotism کو مذہب کا ایک جزو لاینفک بنا دیا گیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ جزو سب سے زیادہ خطرناک اور گھناونا ہے۔ اس تصور کو سب سے زیادہ بلندی پر ہٹلر اور میسولینی نے پہنچایا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے عوام سے اُنکی عام وفاداریاں ملک اور وطن کے لئے مانگیں۔ میسولینی نے اگر اطالیہ کے عوام کو Roman Empire کے خواب دکھائے تو ہٹلر نے جرمنوں کو Pagan gods of Valhallas کے کارنامے سنا کر مبہوت بنا دیا۔ جسکا نتیجہ زبردست تباہی اور شکست کی شکل میں رونما ہوا، یہ چھوت کی بیماری اب تو تمام دُنیا میں عام ہو چکی ہے۔

اپنے ملک کے ساتھ جنون آمیز محبت (Fanatical State worship) دُنیا کی سب سے بڑی بت پرستی ہے۔ اور یہ ہے ہمارا وہ خیال کہ سائنس تمام دُنیا کو امن سے ہم کنار کر سکتی ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ سائنس نے Industrialism کا بڑا کامیاب جواب دیا ہے لیکن ہماری موجودہ مشکلات ایسی نہیں ہیں جو تجربہ گاہوں میں بیٹھ کر حل کی جا سکیں۔ دراصل ہمارے سامنے اخلاقی مسائل درپیش ہیں اور سائنس بیچاری تو خود اخلاق سے کوسوں دور رہے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد حالات میں بڑی تیزی سے انقلاب پیدا ہوا۔ آج پھر ہم اس کوشش میں مصروف ہیں کہ سائنس کے زور پر اپنے تمام مسائل کو حل کر ڈالیں لیکن اگر ہم ایسے مادّی طریقے کام میں لاتے رہے جیسے کہ اب لا رہے ہیں تو ہمارا انجام بھی ویسا ہوگا جیسا کہ پچھلی تہذیبوں کا ہو چکا ہے۔ ہمارے سامنے مثالیں موجود ہیں Polynesians بہترین جہازراں تھے Eccenios بہترین ماہی گیر اور Spartans بہترین سپاہی تھے۔ یہ لوگ صرف ایک فن میں دستگاہ رکھتے تھے۔ زمانہ کے حالات کو دیکھ کر انھوں نے اپنی تہذیب میں تعمیری اقدام نہیں کئے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو انکی تہذیبیں فنا ہو گئیں یا پھر اگر باقی بھی ہیں تو انتہائی کسمپرسی کی حالت میں۔

قوم پرستی ایک لعنت ہے

تاریخ بتاتی ہے کہ جو تہذیبیں تلوار کے زور پر قائم کی گئی تھیں زیادہ دنوں زندہ نہ رہ سکیں۔ ایک جرنیل کا دماغ فتح کے بعد کے مسائل کو حل کرنے سے قطعاً عاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چنگیز خاں، تیمور اور برطانوی سپہ سالار صرف اس لئے ناکامیاب رہے کہ وہ ہر جگہ صرف ایک حربہ یعنی Unitarianism کے قائل رہے۔ اور ظاہر ہے کہ زندگی میں اتنی گونا گونی ہے کہ ہر سوال کا جواب ایک لگا بندھا Formula

نہیں ہو سکتا۔ زندگی تو ہر نئے موڑ پر ہر سوال کا ایک نیا جواب چاہتی ہے۔
لیکن انسان ہمیشہ سے کاہل رہا ہے۔ اُس نے کبھی اِس بات کی ضرورت محسوس ہی نہ کی کہ ایک نئے جواب کی ضرورت بھی ہو سکتی ہے۔ آج بھی وہ اپنے مسائل کا جواب پرانے مادی حربہ سے دینا چاہتا ہے اور اس لئے سائنس کو بیحد ترقی دیدی ہے۔ آج ایک بچہ بھی پوری دلجمعی کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ انسان نے فطرت پر اپنا اقتدار حاصل کر لیا ہے کیا ہمہ گیر ریاست Inter National State قائم ہو سکتی ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ حالانکہ انسان نے قدرت پر فتح حاصل کر لی ہے لیکن وہ اپنے پر آجتک فتحیاب نہ ہو سکا۔ اِس مشینی دور نے اُسے اور جو کچھ بنا دیا ہو مگر انسان نہیں چھوڑا ؎

جہل خرد نے دن یہ دکھائے گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

اگر لوگ چاہتے ہیں کہ ایک ہمہ گیر ریاست قائم ہو تو ہمیں یہ کہنے میں نہیں رہ سکتے کہ کوئی تہذیب اپنے عروج کو اسی وقت پہنچتی ہے جب اُس میں اخلاقی قدریں پائیدار ہوتی ہیں۔ اور اگر یہ انسان اپنی فلاح کا خواہشمند ہے تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ دوبارہ اعلیٰ اخلاق کو جنم دے۔ اور ہاں یہ اخلاقی تبدیلی جب ہی ممکن ہے جب کہ ہم اپنے ملک۔ اپنے جھنڈے۔ اپنی تاریخ۔ اپنی معاشیات کی پرستش کرنا چھوڑ دیں گے۔ پھر بھی چند لوگوں کو یہ بات ناگوار ضرور گذرے گی۔ اور اگر وہ واقعی دنیا کے بہی خواہ ہیں تو اُنکو قابل قدر قربانیاں بھی دینی پڑیں گی۔ اس لئے تو حضرت نے کہا ہے۔

"The rich man has peculiar difficulties in entering into the Kingdom of heaven in all ages."

اور دراصل اس دور کے رئیس وہ ہی ہیں جو وطن پرستی اور قوم پرستی جیسی چیزوں کو سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں۔

دو یا تین صدی قبل مسیح یونان میں شہری ریاستیں قائم تھیں۔ اور ان شہری ریاستوں (City States) کو اِس بات کی ضرورت تھی کہ وہ متحد (Federal) ہو کر رہیں کیونکہ ایک دوسرے کے تجارتی مفاد وابستہ تھے بغیر اسکے یہی شکل ہماری بھی ہو جاتی۔ اقتصادی اور تجارتی تعلقات اتنے وسیع ہو چکے ہیں کہ ایک دوسرے کی مدد کے بغیر زندگی دشوار ہے۔ پہلے اگر صرف یونان کیلئے Federation کا سوال مشکل تھا تو یہی سوال اب ہمارے سامنے بھی موجود ہے اسکی وجہ ظاہر ہے Sparta اور Corinth Athenians جیسی شہری ریاستیں (City States) اپنی آزادی سے دست برداری کے لئے تیار نہ تھیں۔ ہر ایک کو اپنی تاریخ پیاری تھی ہر ایک میں Nationalism موجود تھا لیکن Carthage Egypt اور Syria میں چونکہ Nationalism موجود نہ تھا اس لئے اُنکا تمدن زیادہ شاندار اور اُنکی تہذیب زیادہ عالمگیر رہی۔

ہمکو چاہیئے کہ نظریاتی پرستش بند کریں:۔

"We must stop idol worship"

ایک عالمی حکومت کا تصور بڑا خوش آیند تصور ہے۔ ایک عالمی حکومت کو ضرور بننا چاہیئے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسا انقلاب پُرامن طریقہ سے، اور اخلاقی بنیادوں پر آنا چاہیئے۔ اگر کسی ایسی حکومت کو تلوار یا تشدد کے زور سے قایم کرنے کی کوشش کی گئی تو نتائج ہولناک ہوں گے۔ Nationalism Patriotism اور اپنی تاریخ پرستش فرسودہ تصورات ہیں جن کو جتنی جلد خیرباد کہہ دیا جائے اُتنا ہی دُنیا کی فلاح کے لئے بہتر ہے۔

جو لوگ اس دُنیا کے انتظام میں خدا کا کوئی دخل نہیں سمجھتے وہ جب Brotherhood of man کا نام لیتے ہیں تو اُن پر بے اختیار ترس آتا ہے۔ اخوت اور انسانی محبت اسوقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان کسی ایک خدا کو حاکم اعلیٰ اور اقتدار کل تسلیم نہ کر لے۔

مغربی تہذیب کی بنیاد ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پڑی جو دنیا میں اقتصادی اور سیاسی برتری کے خواہشمند تھے بلکہ یہ تمام چیزیں Middle Ages میں دفعتاً خود بخود پیدا ہو گئیں۔ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ انسان کی تمام کوششیں کہ وہ صرف مادی ذرائع کو کام میں لاکر زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے ناکام ہو چکی ہیں۔ آج جب کہ مشینوں نے ہم کو سخت محنت سے بچا دیا انگلینڈ اور امریکہ میں عورتوں کو دو کام کرنے پڑتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دفتروں اور کارخانوں میں نوکری کریں اور دوسرے گھر کا کام۔ اگر سنجیدگی سے تاریخ شاہد ہے کہ

کسی قوم پر اسی وقت تباہی نازل ہوئی جبکہ اُسکی عورتیں گھروں سے باہر جا چکی تھیں۔ سکندر اعظم تک یونان کا ماضی اپنے دامن میں ایک شاندار تہذیب رکھتا ہے اور یہ اُسوقت تک کی بات ہے جبکہ عورتیں گھروں میں رہتی تھیں۔ مگر تباہی کے چند اسباب میں سے یہ بھی ایک بڑی وجہ تھی کہ عورتوں نے اپنے مکانوں پر انجمن کو ترجیح دی۔

مادی تدابیر نے ہماری مشکلات کو بجائے کم کرنے کے اور بڑھا دیا ہے۔ بیکاری Shortage of man power اور اسطرح کی متعدد مشکلات سائنس نے ہی ہمارے سامنے لا کھڑی کی ہیں۔ اگر ہم مادی تدابیر سے اپنی مشکلات کو حل کریں گے تو اس سے زیادہ مشکلات کی دلدل میں پھنستے چلے جائیں گے۔

دُنیا کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنی اخلاقی قدروں کو دوبارہ جنم دے۔ اس کو چاہیئے کہ وہ خدا کے قوانین کی پیروی کرے ورنہ ہماری تجربہ گاہیں ہر روز ایک نئی مشکل کو جنم دیتی رہیں گی۔

نفسِ انسانی کا مطالعہ اور اُس کے مختلف پہلوؤں کا اظہار بجائے خود مفید ہے مگر اُسمیں ہر ایک اپنا تصورِ انسان کام کرتا ہے۔ جن لوگوں کے نزدیک انسان شریر اور خبیث ہے وہ نفس انسانی کے بُرے پہلوؤں ہی کو نمایاں کرتے ہیں۔ ہمارا تصورِ انسان یہ نہیں ہے اس لئے ہمیں نفس کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے نہیں کرنا ہے جس سے مغربی افسانے ڈرامے میں کیا جا رہا ہے۔

نثار احمد فاروقی

میر اور دلّی

میر کو کمسنی میں ہی والد کی وفات کا غم سہنا پڑا۔ اُنکے والد بڑے درویش کامل عالم فاضل، متقی اور اللہ والے بزرگ تھے۔ اکبر آباد، شاہجہاں آباد اور اُس کے نواح میں اُن کے سیکڑوں مرید تھے۔

لیکن باپ کے مرتے ہی میر بالکل بے یار و مددگار ہو گئے چنانچہ لکھتے ہیں "کسا نیکہ پیش درویش خاک پائے مرا کحل البصری ساختند ..... بیکبار گی از نظم انداختند"

پایانِ کار وہ اکبر آباد کے در و دیوار پر حسرت بھری نگاہیں ڈالتے ہوئے دہلی آئے اپنے وطن سے ہجرت کرنے اور "زندانی و زنجیری" ہونے کا حال انھوں نے مثنوی خواب و خیال میں لکھا ہے کہ کسطرح ہوش سنبھال کر پریشانیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ اپنے بھی بیگانے ہو گئے، کسی نے گھاس نہ ڈالی۔ یاروں نے بے وفائی کی اور عزیز و اقربا نے بے مروتی اور پہلی مرتبہ گھر سے باہر قدم نکالا۔

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی ۔۔۔ در و بام پر چشم حسرت پڑی
کہ ترکِ وطن پہلے کیونکر کروں ۔۔۔ مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

اور جب گرتے پڑتے دہلی آ گئے۔

پس از قطع رہ لائے دلّی میں بخت ۔۔۔ بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر و جگردوں سے خوں ہو گیا ۔۔۔ مجھے رفتہ رفتہ جنوں ہو گیا

میر کے والد کا سن وفات ۱۱۴۸ھ بتایا جاتا ہے اور اُسوقت میر صاحب کی عمر دس سال۔ سند کے طور پر وہ عبارت دی گئی ہے جہاں میر صاحب نے اپنے منہ بولے چچا سید امان اللہ کے انتقال کا ذکر کیا ہے۔

"گاہ می گفت کہ ماہِ من نہ طفل بالہ، الحمد للہ کہ دہ سالہ
چہ لکاہش افتادۂ آخر درویش زادۂ دل راقوی دار
خود را بخدا سپار۔ شاد نبری و خوش بمان" (ذکر میر، ص ۵۴)

سید امان اللہ کے انتقال سے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد میر کے والد محمد علی عرف علی متقی نے رحلت کی۔ اگر "الحمد للہ دہ سالہ" پر نظر کی جائے تو میر صاحب کا دہلی آنا ۱۱۴۸ھ میں ہی ہوا۔ کیونکہ والد کے انتقال کے بعد وہ زیادہ دنوں دہلی میں نہ ٹھہر سکے۔ میر صاحب کے دہلی آنے، اُنکے والد کے انتقال اور پھر اکبر آباد واپس جانیکی سنین میں اختلاف ہے اسلئے ہم بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

میر صاحب نے اپنے انتقال سے پہلے سید محمد محسن[1] کو جو اُنکے برادر زادہ تھے، اپنے دیوان چہارم کا ایک قلمی نسخہ مرحمت فرمایا تھا جو میر صاحب کے داماد میر حسن علی تجلّی کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ اور راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اسمیں محمد محسن کے قلم سے یہ عبارت تحریر ہے۔

"میر محمد تقی صاحب بعد طئ نہ عشرۂ عمر بجوار رحمت ایزدی پیوستند" اسطرح میر کی تاریخ ولادت بڑی آسانی سے دریافت ہو سکتی ہے۔ مصرعۂ تاریخ وفات ع "واویلا مُردِ شاعر شاعران" سے ۱۲۲۵ھ برآمد ہوتے ہیں اور میر کا سن ولادت ۱۱۳۵ھ۔

اسکی تصدیق نوادر الکلام کی ایک عبارت سے بھی ہو جاتی ہے کہ انکی پیدائش ۱۱۳۵ھ کی ہی تھی اور وہ سترہ سال کی عمر میں دہلی آئے۔ لیکن اس حساب سے میر صاحب کے والد کا سن وفات ۱۱۵۱ھ یا ۱۱۵۲ھ ہونا چاہیئے۔ اور مولوی عبدالباری آسی نے کلیات میر کے مقدمات میں لکھا ہے کہ میر صاحب ۱۱۵۲ھ میں دوسری مرتبہ دہلی پہنچے ہیں۔

قطع حجت کے لئے تو میر صاحب کا سن ولادت اور اُن کے والد کی وفات کا زمانہ کوئی بھی متعین کر لیا جائے لیکن یہ ضرور ہے کہ دہلی ورود کے وقت اُنکی عمر کسی طرح سترہ سال سے کم نہ تھی۔ عقلاً بھی یہ بات

---

[1] سید محمد محسن: محسن تخلص می کند۔ برادر زادۂ فقیر مولف است۔ ذہنش بسیار مناسب و سلیقہ اش خیلے درست معلوم می شود
(نکات الشعراء ص ۱۴۸)

ذہن میں نہیں آتی کہ میر صاحب دس سال کی عمر میں دہلی چلے آئے ہوں جبکہ ذکرِ میر میں وہ اپنے والد کی وفات سے چار پانچ سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت قبل کے واقعات نہایت شرح وبسط کے ساتھ لکھ رہے ہیں جو پانچ یا چھ سال کی عمر کے بچے کو اسطرح یاد رہنے مشکل ہیں۔

علاوہ ازیں انھوں نے ذکرِ میر میں یہ بھی لکھا ہے کہ والد کی وفات کے بعد میرے اوپر عرصۂ حیات تنگ ہوگیا۔ قرض خواہوں نے میرا دامن پکڑنا شروع کیا اور اعزا واقارب نے لگا ہیں پھیر لیں اور یک لخت تمام بار میرے ناتواں کندھوں پر آپڑا ..... کمسنی میں ہی فکرِ معاش کی جستجو میں سراسیمہ و سرگرداں خرابہ جہاں آباد تک آیا"

یہ کسطرح ہوسکتا ہے کہ ایک دس سال کے بچے کا قرض خواہ دامن پکڑلیں اور "عقارب" یوں تنگ کریں جبکہ وہ سن بلوغ کو بھی نہ پہنچا ہو۔ شرعاً و قانوناً بھی اسپر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی لیکن اسکے ساتھ ایک پیچیدہ اور غور طلب پہلو بھی ہے۔ میر صاحب جب دہلی میں وارد ہوئے ہیں تو نواب امیر الامرا صمصام الدولہ نے میر صاحب کے والد سے اپنے قدیمی تعلقات کے پیش نظر اُنکا روزینہ مقرر کردیا۔ اور اسطرح اُنکو امیر الامرا کی زندگی تک ایک روپیہ یومیہ ملتا رہا۔ ۱۱۵۱ھ کے نادر شاہی ہنگامہ و آشوب میں نواب صمصام الدولہ قتل کردیئے گئے اور میر صاحب کو یومیہ ملنا بند ہوگیا۔ مجبور ہوکر انھیں پھر آگرہ کی طرف کوچ کرنا پڑا۔

سوال یہ ہے کہ اگر میر کا سن ولادت ۱۱۳۵ھ تسلیم کرلیا جائے اور پھر نوادر الکلما کی اس عبارت کو دیکھا جائے کہ

"میر تقی میر ..... بعمر سفدہ سالگی در دہلی رفت"

تو اُنکے والد کا سن وفات ۱۱۵۲ھ یا ۱۱۵۱ھ ہی نکلتا ہے۔ لیکن مولوی عبدالباری آسی کے قول کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ نادر شاہ حملہ ۱۱۵۱ھ میں ہوا ہے اور اُسوقت میر صاحب دہلی میں موجود تھے اور اسطرح وہ ۱۱۵۲ھ میں دوبارہ آگرہ گئے تھے۔

اگر دوسرا قول یعنی ۱۱۳۷ھ صحیح مان لیا جائے جسے جسٹس سر شاہ سلیمان مرحوم نے صحیح بتایا ہے تب بھی ۱۱۵۱ھ میں انھوں نے پہلی بار آگرہ آباد چھوڑا ہوگا۔ اسطرح اُن کے برادر زادہ محمد حسن کا قول غلط ثابت ہوتا ہے۔

ابتداءً میر صاحب آگرہ آباد کے گلی کوچوں کو یاد کرتے تھے۔ وہ دہلی سے ہر داشتہ خاطر تھے لیکن پھر اُنکو دہلی اسقدر عزیز ہوگئی کہ لکھنؤ جاکر وہ دلی کے مرثیے ہی لکھتے رہے۔ آگرہ آباد اُن کے صفحۂ خیال سے محو ہوچکا تھا۔

میر کے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو آگرہ آبادی کا سلوک میر صاحب کے ساتھ اچھا نہیں تھا اور اُنکی حیات تک میر صاحب پریشان و سرگرداں ہی رہے۔

میر کو زندگی میں کبھی سکون نہیں ملا۔ انکی زندگی کو Keats کی حیات سے کتنی مناسبت ہے؟ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ کیٹس Keats فینی Fenny کی محبت میں گرفتار ہوکر پریشان رہا اور میر فکرِ معاش کے اسیر ہوکر۔

۱۱۹۷ھ میں نواب آصف الدولہ کی دعوت پر وہ لکھنؤ گئے۔ نواب سالار جنگ پسر اسحاق خاں مومن الدولہ کے چھوٹے بھائی نے جو وزیر اعظم کے خالو ہوتے تھے اُن قدیم تعلقات کی بنا پر جو میر کے خالو خان آرزو سے تھے آصف الدولہ سے کہا کہ اگر حضور زادہ مرحمت فرمائیں تو میر صاحب یہاں آسکتے ہیں۔ دربار آصفی سے سفر خرچ ملی گیا۔ نواب سالار جنگ نے ہنڈی بھیج کر لکھا کہ فوراً چلے آؤ۔ میر صاحب تنگدستی کے باعث پریشان تو بیٹھے ہی تھے ایما پاکر فوراً چل دیئے اور فرخ آباد ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ جاتے ہی نواب سالار جنگ کے یہاں اُترے۔ دوسرے دن قصیدہ لکھ کر آصف الدولہ کے دربار میں گذرانا۔ اُسی دن دربار سے وظیفہ مقرر ہوگیا۔ نواب نے خلعت اور انعام سے بھی سرفراز کیا۔

لہ سیر شاہ سلیمان نے اپنے قول کی دلیل اسطرح پیش کی ہے کہ ذکرِ میر کی تالیف کے وقت میر صاحب کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی اور کتاب کی تاریخ اختتام اس قطعہ سے برآمد ہوتی ہے۔

مسمّٰی باسمی شد لے باہنر — کہ ایں نسخہ گردد بعالم سمر
ز تاریخ اگر شوی بے گماں — ذ ذائی عدد بست وہفت اوراں

"ذکرِ میر" کے اعداد ۱۱۷۰ ہجری ہوتے ہیں اسمیں ۲۷ اور اضافہ کئے جائیں تو ۱۱۹۷ ہجری ہوتے ہیں میر صاحب کا سن ولادت برآمد کرنے کے لئے اسمیں سے ساٹھ منہا کردیئے جائیں اسطرح ۱۱۳۷ ہجری برآمد ہوتے ہیں۔ نادر شاہ کے وقت انکی عمر ۱۵ سال سمجھنی چاہیئے اور والد کا سن وفات ۱۱۵۰ھ۔

میر صاحب کو "خرابۂ جہاں آباد" سے عشق تھا "دل اور دلی" دونوں کی خرابی کے باوجود وہ اس اجڑے نگر میں بھی ایک لطف پاتے تھے۔ انہیں لکھنؤ کی عیش و تنعم کی زندگی کے مقابلہ میں دلی میں فقر و فاقہ کی حالت میں بیٹھ رہنا گوارا تھا۔ وہ جب تک لکھنؤ میں رہے غریب الوطنی کے مرثیے پڑھتے رہے۔

برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجھکو لیک
یاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزم سفر ہنوز

اُن کے خیال میں لکھنؤ "چندوں کی بستی" تھی

آباد اجڑا لکھنؤ چندوں سے اب ہوا
مشکل ہے اس خرابہ میں آدم کی بود و باش

وہ جانتے تھے کہ لکھنؤ میں اُنکی شاعری اور کمال فن کا کوئی قدرداں نہیں اُنکی دلآویز طرزادا اور حسن و سلامت کی اس دیار میں داد ملنی مشکل ہے۔

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

لکھنؤ میں مقرب دربار شاہی ہونیکے باوجود وہ فقر و فاقہ سے نجات حاصل نہ کرسکے۔ اُنکی دل برشتگی سوز اور درد بڑھتا ہی گیا اسلئے اُنکی آخر عمر کی شاعری میں یاسیات کا رنگ اور گہرا نظر آتا ہے۔ پھر انہیں اپنے فن کی بے قدری کا گلہ بھی بُری طرح لگا ہوا تھا۔ ؎

کس کس ادا سے میں نے کہے ریختے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زبان اس دیار میں

میر برابر لکھنؤ چھوڑنے کی فکر میں رہے۔ وہاں کا ماحول، وہاں کی بود و باش انھیں راس نہ آئی۔

گو لکھنؤ ویراں ہوا ہم اور آبادی میں جا
مقسوم اپنا لائیں گے خلق خدا ملک خدا
کیا قدر ہے ریختہ کی گو میں
اس فن میں نظیری کا بدل تھا

اُنکی زندگی یاس و حرماں سے کچھ اسطرح عبارت ہوگئی تھی کہ وہ زیر فلک کہیں بھی آسودگی نہ پا سکتے تھے۔ بدقسمتی و آشفتہ حالی نے مدت العمر انھیں در در پھرایا۔ کوئی رئیس اور مقرب دربار شاہی ایسا نہ تھا جو میر کو سلسلۂ مدد معاش کچھ دیدیتا ہو۔

قلعۂ معلّٰی اور دربار اودھ کے وظائف سے لیکر دلی کے امرائے ہنود تک نے اُنکی پرورش کی مگر بدنصیبی نے کہیں ساتھ نہ چھوڑا

زیر فلک جہاں تک آسودہ میر ہوتے
ایسا نظر نہ آیا اک قطعۂ زمیں بھی

اُن کے جواہرات کے قدرداں درحقیقت وہ خواص ہی تھے جنھوں نے کمال شعر گوئی کی قدردانی کرتے ہوئے میر کے افلاس اور فقر و فاقہ میں انکی مدد کی۔

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
گو مجھے گفتگو عوام سے ہے

لکھنؤ جاکر دہلی کی مجلسیں، رنگینیاں، اور شاعرانہ ماحول خواب و خیال ہوگیا۔ پھر میر کے زمانہ کی دلی، کیسی ہی گئی گذری سہی۔ لٹی پٹی، بھگڑا اور کنگال دلی بھی آج کی ترقی یافتہ دلی سے بہتر تھی۔ کیسے کیسے بامروت، خلیق اور وضعدار لوگ تھے۔ ۔ ۔ یہ "فردوس روئے زمین" انھیں کہاں مل سکتی تھی۔

پھرا میں صورت احوال ہر اک کو دکھا یا یاں
مروت تحط ہے آنکھیں نہیں کوئی ملاتا یاں
خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں اے کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں
محبت دشمن جاں ہے جو میں معلوم یہ کرتا
تو کاہے کو کسو سے میر اپنا دل لگاتا یاں

لکھنؤ سے مخاطب ہیں:۔

اب کے جو ترے کوچہ سے جاؤں گا تو سینو
پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا

میر کی زندگی کے اداس لمحوں میں بہار کسطرح آتی ہے یہ بھی دیکھئے:۔

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ایک دلدوز قطعہ سُنئے:۔

یہ میر ستم کشتہ کسی وقت جواں تھا
انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا
جا دُور کی پڑھی ہر پچہ ابیات تھا اسکا
منہ تکتے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا

جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی سے نکلتا
ساتھ اُسکے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایک کہ جوں آب زدہ خاک
آندھی تھا، بلا تھا کوئی آشوب جہاں تھا

ساتھ ہی دلّی کی شوکتِ رفتہ کے مرثیے بھی اسی طرح لکھے ہیں۔

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

اب خرابہ ہوا جہاں آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

دل و دلّی گرچہ ہیں دونوں خراب
لطف اس اجڑے نگر میں بھی کچھ ہیں

لکھنؤ دلّی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اداس
میر کو سرگشتگی نے بیدل و حیراں کیا

دلّی میں آج کر اُن یاروں کو نہ دیکھا
کچھ دے گئے شتابی کچھ ہم بدیر آئے

مارا گیا خرام تباں سے سفر میں میر
اے کبک کتا جائیو اس کے وطن تلک

دلّی کے مشاعروں کا نقشہ کس حسرت سے کھینچا ہے۔

کیا رہا ہے مشاعرے میں اب — لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں
میر و مرزا رفیع و خواجہ میر — کتنے یہ اک جوان ہوتے ہیں

میر کی نازک دماغی "نے کریلا اور نیم چڑھا" والی مثل کا کام کیا۔ خلاف مزاج کوئی معمولی واقعہ بھی ہوا تو دربار سے روٹھ کر گھر بیٹھ رہے اور ساری عمر یہ ہی کہتے رہے۔

جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا — خریدار لیکن نہ پایا گیا
متاع ہنر پھیر کر لے چلو — بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

حضرت علی کی شان میں قصیدہ لکھتے ہوئے آخر میں دعا کرتے ہیں۔

گری کرے تنک بھی اعانت تری تو پھر
آجائے بخشگی پہ مرا یہ خیالِ خام

یعنی کہ دیکھوں حضرت دہلی کی پھر نواح
معلوم ہے سوائے ترے حاصل کلام

صفحت اقلیم ہر گلی ہے کہیں
دلّی سے بھی دیار ہوتے ہیں

کیا زمانہ تھا وہ جو گزرا میر
ہمدگر لوگ چاہ کرتے تھے

دلّی کے جوانوں، مہ وشوں اور حسینوں کی یاد ستاتی ہے۔

ہر روز نیا اک تماشہ دیکھا
ہر کوچہ میں تو جوان رعنا دیکھا
دلّی تھی طلسمات کہ ہر جاگہ میر
ان آنکھوں سے آہ ہم نے کیا کیا دیکھا

صبا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ ارضِ دہلی تک میرا اتنا پیغام پہنچا دے۔

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گذار
کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حال زار
خاکِ دلّی سے کیا ہم کو جدا یکبارگی
آسماں کو بھی کدورت سو نکالا یوں غبار
منصب بلبل غزلخوانی تھا سو وہ ہے اسیر
شاعری زاغ و زغن کا کیوں نہ ہو اب شعار

ان ہی مصائب و آلام، ٹھوکروں اور ٹکروں کی بدولت میر تقوٰلیت کی اس منزل سے آگے نکل گئے ہیں جسے KEATS کیٹس کے سوز و درد کی معراج خیال کیا جاتا ہے۔

نقادوں کا کہنا ہے کہ کیٹس KEATS کے تخیل کی طرازندگی "سے ورامش و رنگ و بو" سے نہیں نکھری بلکہ اس یاس کا پس منظر FENNY فینی کی محبت سے عبارت ہے۔ لیکن KEATS کیٹس کا غم عشق بوالہوسی کی منزلوں سے گذر کر دلخستگی کی حدوں تک نہیں آیا ہے۔ میر کی شاعری کا تعلق دماغ سے نہیں دل سے ہے انکی شاعری "فکر معاش، عشق بتاں، یاد رفتگاں" کا ایک ایسا لطیف مرکب ہے کہ اسکو پڑھ کر آپ دل میں میٹھی میٹھی کسک پائیں گے اور دماغ میں ہلکی ہلکی خلش۔

میر صاحب اردو شاعری کا ایک دور، ایک عہد اور ایک مکمل باب تھے۔ جس کی ابتدا بھی ان ہی سے ہوئی اور انتہا بھی وہ ہی تھے۔

جگر مرادآبادی

غزل

ہمّت ہے گر بلند تو کچھ اس سے کام لے
ساقی کا انتظار نہ کر بڑھ کے جام لے

قیمت غمِ حیات کی تو دام دام لے
یعنی بہار ہو کہ خزاں سب سے کام لے

تو عینِ زندگی سے گریزاں تو ہے مگر
تیری ہی زندگی نہ کہیں انتقام لے

جینے کو یوں تو ہم بھی جیے جاتے ہیں مگر
یہ زندگی اُسی کی ہے جو اِس سے کام لے

جو تلخیٔ عمل کو گوارا بنا سکے
یوں لے سکے تو لذّتِ حُسنِ کلام لے

مجھ کو نہیں قبول یہ تفریقِ خاص و عام
ساقی یہ اپنا شیشہ اُٹھا اپنا جام لے

(ناتمام)

قدرت میرٹھی

غزل

دل میں تمہیں ہو اور کوئی مدعا نہیں
یہ کعبہ ہے، صنمکدۂ ما سوا نہیں

اب وہم ہست و بود میں دل مبتلا نہیں
یہ عشق ہے مقام فنا و بقا نہیں

گریہ سے آنکھ شکوے سے لب آشنا نہیں
صرف اس لئے کہ شیوۂ اہلِ وفا نہیں

اس بحث سے تو رازِ حقیقت کھلا نہیں
وہ بُت نہیں خدا ہے وہ بُت ہے خدا نہیں

دل میں نہیں کہ آنکھ میں وہ خود نما نہیں
دعویٰ حجاب کا ہے حجاب آشنا نہیں

آغوش میں جو اب دلِ درد آشنا نہیں
جینے کو جی رہا ہوں مگر کچھ مزا نہیں

ناکام رہتے رہتے ہمیں صبر آگیا
اب یہ سمجھ لیا کہ کوئی مدعا نہیں

سچ پوچھئے تو بھاری ہے اپنے مقام پر
وہ اشکِ غم جو آنکھ سے ابتک گرا نہیں

ہے ان کی برہمی میں ادا التفات کی
شوقِ جفا ہے ان کو شعورِ جفا نہیں

جب جی رہا تھا میں تو فنا تھی بقا نہ تھی
اب مٹ گیا ہوں میں تو بقا ہے فنا نہیں

عالم فریب پردۂ ظلمت میں بھی رہا
حالانکہ حسنِ دوست نظر آشنا نہیں

میں کیا کہوں تری نگہِ التفات کو
یوں مٹ کے رہ گیا ہے کہ دل جیسے تھا نہیں

وہ ملتفت کہ جیسے سنیں مدعائے دل
میں دم بخود کہ جیسے کوئی مدعا نہیں

اچھا ہے ان کے پاس یہ اہلِ خرد نہ جائیں
دیوانگانِ عشق خرد آشنا نہیں

ساکت خرد نظر متحیر حواس گم
اب کوئی کیا بتائے کہ وہ کیا ہے کیا نہیں

قدرت! عجب نہیں کہ وہ ترکِ جفا کریں
اب اور کوئی پہلوئے مشقِ جفا نہیں

(آل انڈیا مشاعرہ علیگڈھ)

تسکین قریشی

غزل

۴

مرجا بیخود دئی روز افزوں — حُسن ہی حُسن ہے جہاں میں ہوں
نغمۂ زندگی و سازِ جنوں — اب سکوں ہے نہ آمدِ زُوئے سکوں
موت افسانہ، زندگی افسوں — اللہ اللہ مقامِ جذب وجنوں
اِس سے واقف ہیں صرف اہلِ جنوں — زندگی موت ہے اگر ہو سکوں
کیا بدلنے کو ہے فضائے چمن — بڑھ رہی ہے رگوں میں گرمیٔ خوں
یہ رہائی بھی کچھ رہائی ہے — کہ جہاں چاہوں میں وہیں نہ رہوں
عشق میں تازگی نہیں آتی — ہو نہ جب تک ہر آرزو کا خوں
فرصتِ عرضِ غم سہی لیکن — کیوں نہ ذکرِ جمالِ یار کروں
تم نے کس دل سے دل دہی کی تھی — اِک خلش ہو گئی بجائے سکوں
زندگی مرگِ ناتمام ہے آج — نہ تمنّا، نہ جستجو، نہ جنوں

وہ غمِ عشق ہی نہیں تسکیںؔ
جس سے حاصل نہ ہو دلوں کو سکوں

ثاقب کانپوری

غزل

مجبور آج گردشِ دوراں پہ رو دیئے
اپنی حیاتِ بے سر و ساماں پہ رو دیئے

یہ وسعتِ حیات تھی کس درجہ مختصر
ہم آج اپنے شوقِ فراواں پہ رو دیئے

نیرنگیٔ فریبِ بہاراں نہ پوچھیے
غنچے مآلِ کارِ گلستاں پہ رو دیئے

جن کو نصیب ہو نہ سکا لمحۂ سکوں
بے اختیار گردشِ دوراں پہ رو دیئے

جلوے کی تاب جب نہ رہی تیری بزم میں
مجبورِ شوق دیدۂ حیراں پہ رو دیئے

اے ہم نشیں ہم سے مآلِ طرب نہ پوچھ
آخر ہم اپنے عیشِ فراواں پہ رو دیئے

مایوسیوں کے بعد ترا التفاتِ شوق
جوشِ طرب سے ہم ترے احساں پہ رو دیئے

اب کیا ہو اُن سے شکوۂ محرومیٔ نشاط
جب خود وہ میرے حالِ پریشاں پہ رو دیئے

کیا یاد آگیا ہمیں ثاقب بتائیں کیا
کیوں دشت میں خرامِ غزالاں پہ رو دیئے

اختر انصاری۔ اکبرآبادی

غزل

سیاہ بخت زمانے میں نور پھیلائے
افق سے پھر کوئی خورشیدِ نو ابھر آئے

وہ اپنی شانِ عزائم پہ ناز فرمائے
جو اپنی سمت زمانے کو کھینچ کر لائے

یہ سنگلاخ چٹانیں تو گرد ہیں، کوئی
رہِ حیات میں اپنے قدم نہ ٹھہرائے

گذر رہا ہوں ابھی تک میں خارزاروں سے
ابھی سے کس نے محبّت کے پھول برسائے

زمانہ کھائے نہ موہوم عشرتوں کا فریب
وہ کون ہے جو کھلونوں سے دل کو بہلائے

ستم ظریف ہیں، گم کردہ راہ دیوانے
جہاں کا عزم کیا تھا وہیں نکل آئے

یہ بستیاں ہیں کہ تاریک وادیاں اختر
یہ آدمی ہیں نظر میں کہ مضمحل سائے

ابنِ فرید، بی اے

ڈھلتے سائے

سورج کی نوخیز کرنیں اونچی فصیل کو پھلانگ کر اُس کے صحن میں سے ہوتی ہوئی برآمدہ میں داخل ہو رہی تھیں اور وقت گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ لپٹتا چلا جا رہا تھا۔ اُس نے ایک گہری سانس لی اور دفتر کی تیاری کرنے لگا۔ سامنے جگو اپنے چینی کے کھلونے سے کھیل رہا تھا۔ اس کے بالوں کی ایک بھوری سی طلائم لٹ پیشانی پر لٹک آئی تھی اور اس کی آنکھوں میں انہماک اس طرح رچا ہوا تھا کہ جیسے وہ نہ معلوم کہاں ہو۔ وہ اپنے چینی کے چھوٹے سے کھلونے کو تسلہ میں بھرے ہوئے پانی سے نہلا کر کپڑے سے پونچھنا چاہتا تھا لیکن وہ ہر بار پھسل کر پھر پانی میں گر پڑتا تھا۔ اب اس کی سنجیدگی میں جھنجھلاہٹ کی آمیزش ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے پھر ایک بار غصہ میں کھلونے کو پانی سے نکالا اور زور سے کپڑے پر رگڑ کر جیسے ہی دوسرا ہمراہ اس پر ڈھکنا چاہا۔ وہ غڑاپ سے پانی میں اُتر گیا۔ اس بار اس کو اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو نہ رہا اور اس نے اپنے ہونٹوں کو بسورتے ہوئے انداز میں لٹکاتے ہوئے کھلونے کو فرش پر پٹخ دیا۔ چینی کے سفید سفید ریزے چاروں طرف پھیل گئے۔

اس شکست و ریخت کی آواز نے اس کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور وہ تادیبی لہجہ میں بے اختیار جگو پر چیخ پڑا "ہائیں یہ کیا کیا تو نے؟" اور جگو نے فوراً اس مداخلت بیجا کے خلاف احتجاج شروع کر دیا۔ وہ جگو کے اس احتجاج کے خلاف کبھی بھی نہیں ٹک سکا تھا۔ اس لئے اس وقت بھی وہ اپنی ناگواری خاطر سے فوراً دست بردار ہو گیا۔ اس نے ملتے ہوئے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور بہلانے پھسلانے لگا لیکن وہ بچہ بھی جیسے بڑا ہوش مند تھا، اس آسانی سے ہتھیار ڈالنے پر تیار نہ تھا۔ اُس نے جھنجلا کر اُسے پھر ڈانٹا "چپ ہو جاؤ ورنہ پیٹ دوں گا۔" اور جگو نے اپنے احتجاج کی تجدید کر دی۔ تب اُس کو احساس ہوا کہ بات یوں آسانی سے بننے کی نہیں اور دفتر کا وقت بھی سر پر آتا چلا جا رہا ہے، اُس نے جلدی جلدی اپنے ذہن میں اُسے خاموش کرنے کی تدبیر سوچی۔

"جگو چپ ہو جاؤ۔ دیکھو ہم کشتی بنا کر اس تسلہ میں ابھی چلاتے ہیں۔"

اور جگو اپنے اس محبوب مشغلہ کا نام سن کر خاموش ہو گیا۔

اس نے ایک پرانے اخبار کے ٹکڑے کی چھوٹی سی کشتی بنائی اور جگو کو پانی کے تسلہ کے پاس بٹھا کر کشتی کو پانی میں تیرانے لگا۔ اور جگو کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن اس میں برہمی کا بے انتہا امتزاج تھا اس نے مخصوص توجہ کے ساتھ جگو کی طرف دیکھا جیسے اُسے یہ خطرہ لاحق ہو رہا تھا کہ کہیں وہ ایک بار پھر اپنے رونے کو یاد کر کے چیخنے نہ لگے۔ مگر جگو کنکھیوں سے اپنے چینی کے کھلونے کے ٹکڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے مناسب سمجھا کہ وہ اس ٹوٹے ہوئے کھلونے کے بارے میں نصیحت کرنا شروع کر دے۔

"جگو دیکھو تم نے اپنے بے چارے کھلونے کو توڑ ڈالا ہائے۔"

جگو نے تاسف کے ساتھ کھلونے کے بڑے بڑے ٹکڑے چننے شروع کر دیئے۔ جیسے وہ دریت میں سے آنسو کے قطرے اٹھا رہا ہو۔

"بولو، اب کہاں سے گا تم کو کھلونا۔؟"

"آپ لا دیں گے! ——" جگو نے بڑی پُر امید لبشاشت کے ساتھ کہا۔

"میں کہاں سے لا دوں گا؟"

"بازار سے! ——"

وہ جگو کے سامنے ایک اور سوال رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس آخری جواب نے اُسے ایک طرح کی بصیرت دیدی اور وہ صرف مسکرا کر رہ گیا —— معصوم بچے تم سوچنا ہی نہیں چاہتے کہ آنے والے لمحوں میں کیا ہو گا —— اُس نے بڑے پیار سے اُس کی پیشانی کا بوسہ لیا، اور جگو نے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں بڑی وسعت سی نظر آ رہی تھی اور وہ بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ اُسے معاً دفتر کا خیال آ گیا اور وہ اُسے کاغذ کی ناؤ کے ساتھ کھیلتا ہوا چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی بیوی ان دونوں کے کھیل کو بڑی سرپرستی کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر اپنی عجلت کا احساس دلایا مگر پھر اُسے خیال

آیا کہ وہ اپنی کاہلی کی وجہ سے گھر کی مختلف ضروریات کی چیزیں آج تک نہیں لایا تھا اور اس کی بیوی چند ایک تقاضے کرنے کے بعد خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی اس لاپروائی کا ازالہ کرنے کے لئے اُس سے خود ہی پوچھ لیا۔

"ہاں ذرا لانا تو، وہ تمہاری فہرست کہاں ہے"۔

"کیسی فہرست؟ ——"

"ارے وہی؟ —— کیا کیا منگا رہی تھیں تم۔ لاؤ وہ کاغذ پر لکھ کر دیدو میں واپسی پر لے آؤں گا"۔

"ہو گا کہنے بھی دیجئے، آپ کو فرصت کہاں ہو گی۔ شام تو ہو جاتی ہے گھر آتے آتے"۔

"لاؤ بھی تم میں لیتا آؤں گا"۔

اس نے جلدی سے کاغذوں کا پلندہ بغل میں دبایا اور ضروری اشیاء کی فہرست لے کر بس اسٹاپ کی طرف چل دیا۔ دفتر کا وقت ہونے کی وجہ سے عام طور پر اُس وقت بس کے انتظار میں ایک بھیڑ کھڑی رہتی ہے چنانچہ اس وقت بھی اُمیدواروں کی ایک لائن لگی ہوئی تھی۔ وہ بھی آخر میں جا کر شامل ہو گیا۔ مگر جیسے اُلجھن سی سوار ہو گئی تھی اُس پر اُس قطار کو دیکھ کر اُسے خطرہ تھا کہ کہیں اُس کی باری آتے تک دفتر کے لئے زیادہ دیر نہ ہو جائے۔ مگر اس وقت ایک اُمید لگائے رکھنے کے سوا چارہ نہ تھا۔

اُس کے سامنے ایک ادھیڑ عمر کی عورت قطار میں کھڑے ہو کر بھی مُوٹر بننے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ اس اُمور خانہ داری کی نمائش سے بڑی چڑچڑی محسوس کر رہا تھا۔ آخر کیا اس دکھاوے کے بغیر زندگی کی مصروفیت اور وقت کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ حالانکہ اگر ان نفوس کے باطنوں میں اُتر کر دیکھا جائے تو وہاں کتنے ہی لمحے محض اس لئے رائیگاں جاتے ہوں گے اُن کی طرف توجہ نہ دی گئی ہو گی۔

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے دھکا دیا۔ اس نے مُڑ کر دیکھا ایک صاحب عجب بے ہنگم سے سگرٹ منہ میں لگائے اخبار کے مطالعہ میں بے انتہا منہمک سے تھے اور لوگ اُنھیں دھکیل کر منتشر الخیال کر رہے تھے۔ اُس نے اُن کی اس مضحکہ انگیزی پر کچھ تمسخرانہ لہجہ میں دریافت کیا۔

"کیا تیسری جنگ چھڑ گئی ——؟"

اور وہ اخبار میں عجب بدحواسی میں اخبار بند کر کے پہلے صفحہ کو غور سے دیکھنے لگا جیسے اتنی اہم چیز اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ مگر پھر خفیف ہو کر اخبار تہہ کر کے خاموش کھڑا ہو گیا۔ ایک بس آئی اور قطار آگے سے چھوٹی اور پیچھے سے طویل ہو گئی۔ اب اس کی جان میں جان آئی کہ وہ آئندہ بس میں جگہ پا سکے گا۔ مگر آئندہ بس کا انتظار بھی طولِ شبِ ہجراں سے کم نہ تھا۔ اور یہاں بس والوں کا انتظار اور ان کی بیقراری عجب پست ذہنیت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ جیسے ان کی زندگیاں بھیڑ کے گلہ کی طرح تاریک کھڈ کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھیں، اور وہ اس بے نگاہی پر کامل اطمینان حاصل کر چکے تھے۔ اُسے اُس وقت اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی انسانیت غلاظت میں رینگتے ہوئے ہزاروں حشرات الارض نظر آ رہے تھے جن کو ضمیر کے وجود اور عدمِ وجود کی کوئی خاص پرواہ نہیں ہوتی۔ اور اس کا مظاہرہ وہاں بس اسٹاپ پر پوری طرح ہو رہا تھا کہ یہ نظم و ترتیب اور یہ اشتراک باہمی ان کے مزاجوں پر گراں گذر رہا تھا۔ کیا یہ انسانیت جو اپنی برتری اور دانشمندی کے راگ الاپا کرتی ہے اور جس کو اُن کے مخصوص نظریہ کے اہل ارتقائی کرمی بیان فرمایا ہے صرف اسی قدر دانشمند ہے کہ وہ کردار اور گفتار میں اتنا بڑا تضاد رکھے کہ ابدی حقیقتیں محض خیال و خواب ہی بن کر رہ جائیں۔

دوسری بس بوجھل جھکولے کر اُس کے سامنے رک گئی اور رکی تھمی ہوئی قطار میں پھر حرکت پیدا ہو گئی۔ اور وہ اپنے خیالات سے چونک کر فائلوں کا گٹھا سنبھالتا ہوا بس میں داخل ہو گیا۔ بس بھر گئی اور چلدی۔ اس نے ایک خالی نشست دیکھکر خود کو اس طرح اس پر جما دیا جیسے اُسے اپنی کوتاہ دستی کا خطرہ لاحق ہو رہا تھا۔

بس آہستہ آہستہ رینگی اور عمارتوں اور دوکانوں کی قطاریں پیچھے رینگنے لگیں اُس نے چھ پیسے نکال کر کنڈکٹر کے ہاتھ پر رکھدیئے اور ایک سکریٹ کسر کر بے توجہی کے ساتھ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے سامنے بیٹھا ہوا نوجوان بار بار اپنے کالروں کو کھینچ کر درست کر رہا تھا جیسے اس کو یہ شک تھا کہ وہ ملگجے ہو گئے ہیں۔ کیا یہ احساس کمتری نہیں جس کو شانِ تفاخر سمجھا جاتا ہے؟ اس نے سوچا لیکن فوراً اس کو ٹکٹ کا خیال آ گیا۔ اس نے مُڑ کر دیکھا کنڈکٹر اُس کو چھوڑ کر آگے بڑھ چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ بس کنڈکٹر کا مقصد کیا ہے۔

"اے جناب! —— میرا ٹکٹ؟ ——" اس نے تکلفانہ لہجہ میں کہا۔

"اوہ، یہ لیجئے" بس کنڈکٹر نے بڑے خجل سے لہجے میں کہا، مگر وہ ایسی بودی رعایت کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس لئے اس نے بے پروائی سے اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کر لی۔

اس کے سامنے بیٹھا ہوا نوجوان اب بھی اسی کوشش میں مصروف تھا، وہ بار بار کالروں کو کھینچکر درست کر رہا تھا، اُسے اس کی اس حرکت پر بڑی کراہت سی آئی۔ اُس نے اپنے بازو کی مقابل سیٹ کی طرف بلا ارادہ دیکھا، ایک بھونڈی سی نوجوان لڑکی اپنے بالوں کے ترشے ہوئے گچھوں کو اس طرح ٹھیک کر رہی تھی جیسے وہ اُن کو محسوس بھی کرنا چاہ رہی ہو۔ اُسے ایک بار پھر بڑا تاسف سا ہوا۔ یہاں بھی نمائش، وہاں بھی نمائش، ساری دنیا جیسے نمود و نمائش ہی کے گرد چکر لگا رہی ہو۔

اس نے ڈرائیور کے سامنے لگے ہوئے شیشے میں سے گردن اٹھا کر سامنے سمٹتی ہوئی سڑک کو دیکھنا چاہا مگر بے خواہش و ارادہ اس کی نظر اس آئینہ پر پڑ گئی جو ڈرائیور کے پشت کی طرف دیکھنے کے واسطے لگا رہتا ہے اور اُسے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ وہاں کچھ حریص نظریں ایک دوسرے سے اُلجھ رہی ہیں۔ اس نے بڑی نفرت اور کراہیت کے ساتھ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھا جس کی پشت اس کی طرف تھی اور اس لڑکی کی طرف دیکھا جس کی سیٹ اس کے مقابل بازو میں تھی۔ پھر وہ اپنے تصور میں اُس سماجی بندھن کو تلاش کرنے لگا جس نے ان دو اَنجانے نفوس کو مجبور کیا تھا کہ وہ اس آنکھ مچولی کے لئے بس کے آئینہ کو منتخب کریں۔ مگر باوجود تجسس و تلاش کے وہ یہاں سماج کی کسی قید و بند کو نہ پا سکا۔ علاوہ اس کے کہ خود اُس کے اندر اس گہری ہوئی آوارگی کی طرف سے نفرت پیدا ہونے لگی۔ لیکن اس عرصہ میں بس ایک اسٹاپ پر رک چکی تھی، لڑکی اپنی سیٹ چھوڑ چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ نوجوان بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا جیسے دو طاعون زدہ صحتمندوں کے گروہ میں سے نکالے جا رہے ہوں۔

ان اترجانے والوں کی جگہ پر کچھ نئے داخل ہونے والوں نے قبضہ کر لیا اور بس دوبارہ چل دی۔ اگلا اسٹاپ سکریٹریٹ کا تھا۔ اس کی منزل آچکی تھی۔ اس نے فائلوں کے پلندہ کو بغل میں دبایا اور فٹ بورڈ پر کھڑا ہو گیا۔ دفتر کے وقت میں صرف تین منٹ باقی تھے اُسے فوراً ہی چار دیواری عبور کر کے پہونچنا تھا اور اس کے لئے اتنا وقت بے انتہا قلیل تھا۔ لیکن جب بس رُکی تو منتظروں کا جم غفیر بدحواسی کے ساتھ بس پر ٹوٹ پڑا اور وہ بڑی کش مکش کے بعد ان سے چھٹکارا پا کر دفتر کی حدود میں داخل ہو سکا۔

دفتر میں وہ دو منٹ تاخیر سے داخل ہوا تھا اور یہ تاخیر اُس وقت ہیڈ کلرک کی آنکھوں میں شعلہ بن کر چمک رہی تھی جیسے اب تک وہ معمول سے زیادہ محنت سے کام کرتا رہا تھا وہ قابلِ تحسین نہ تھا۔ البتہ یہ دو منٹ بے پناہ عتاب کا موجب تھے۔ وہ اس وقت ایسی دنیا میں سانس لے رہا تھا جہاں پر جالفٹ نی لائق بے اعتنائی اور ہر نا قابل توجہ کوتاہی لائق سرزنش تھی۔ جیسے جذبات، احساسات اور بصیرت ایک سخت فرمے میں کستے چلے جا رہے تھے، جیسے روح گھٹ رہی تھی اور سانس اکھڑ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی میز کی طرف بڑھ گیا جہاں فائلوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اور اس کی بغل کا پلندہ اس آرام کے مقابلے میں محض مشتے از خروارے تھا۔ اس نے اپنے پلندے کو ایک طرف رکھ دیا اور ان فائلوں کے ڈھیر میں محو ہو گیا۔

وہ نہ معلوم کیوں ہمیشہ ان فائلوں کو بولتا ہوا محسوس کیا کرتا تھا، وہ اس کے تصور میں عکاسی کیا کرتی تھیں۔ اور یہ نقوش اس کے لئے بڑے کریہہ المنظر ہوا کرتے تھے، ان میں وہ معلوم کتنی گھناؤنی بدکاریوں کے راز پوشیدہ ہوتے تھے۔ اور وہ ان اوراق کے الٹتے ہی اس کے سامنے عریاں ہو جایا کرتے تھے، وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کتنے صفحوں کے محض الفاظ تبدیل کرنے کے لئے تجوریوں کے منہ کھول دیئے گئے پھر بھی نہیں ہوا کہ کچھ کاغذات نئے آگئے، کچھ پرانے ہٹ گئے، کچھ کی ہیئت بدل گئی اور کچھ محض ظاہری تراش خراش سے مناسب حال ہو گئے بلکہ کتنے ہی صفحات ایسے تھے جن کو محض اس لئے ہٹا یا گیا اور ان میں سے کچھ کو محض اس لئے داخل کیا گیا کہ بند تجوریوں کے منہ صرف سمسم کھل جا کے بول پر واشگاف ہو جائیں۔ اور پھر ایسا ہی ہوا اور شاید ان بنیادوں پر ہمیشہ ہی ایسا ہوتا رہے، اس لمحہ وہ ان حریص چہروں اور نمائشی لباسوں کے باطن میں نہ معلوم کیا تلاش کرتا اور پھر آپ ہی آپ سوال کرتا، کہاں ہے وہ ترقی، کہاں ہے وہ ابدی بہتری جس کے لئے یہ نظام چلایا جا رہا ہے اور مرجھائی ہوئی پیشانیوں اور جھکی ہوئی کمروں کو مجبوراً مطمئن رہنے پر آمادہ کیا جاتا ہے کاش وہ اس طاغوتی جال کے ہر پھندے کو کاٹ سکتا اور اس انبار کو آگ لگا سکتا جس کے نیچے ہر اعلیٰ انسانی قدر پڑی کراہ رہی ہے۔ پھر وہ اس راکھ کو سمیٹ کر سمندر کے پُرشور پانی کی نذر کر دیتا اور اس غلاظت سے اس سرزمین کو پاک کر کے ایک ایسا سادہ اور پُرخلوص رشتہ قائم کرتا جہاں خود غرضی و خود پرستی کے بجائے ہمدردی اور باہمی اشتراک لحہ بہ لحہ پروان چڑھتے رہتے۔

مگر کیا یہ اکیلے اس کے بس کا تھا؟ کیا یہ ممکن تھا کہ جب تک کوئی خود ایک چیز کی احتیاج نہ رکھتا ہو زبردستی وہ چیز اس کے سر منڈھ دی جائے، اور وہ اپنے گرد و پیش دیکھ رہا تھا کہ پیشانیاں محض اس لئے ٹیکی جاتی ہیں کہ اپنا بھلا ہو۔ نظریں اس لئے پھیر لی جاتی ہیں کہ نقصان خود کو نہیں پہونچ رہا ہے۔ جیسے ہر وجود ڈرا ہراسا سا ہے۔ اور وہ ہر حرکت محض خوف کے تحت کر رہا ہے کہ کاش ایسا نہ ہو جائے۔ کتنی بے چارگی اور پسماندگی اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اور پھر جب ان کو جھنجھوڑا جاتا ہے تو وہ اپنی بوجھل چپچپاتی ہوئی آنکھوں کو ہلکا سا کھول کر کہتے ہیں کہ اگر ہمارے ذمہ جاگنا ہو گا تو ہم جاگ ہی پڑیں گے، اُن یہ کتنی بڑی کور نگاہی ہے جسے وہ کور نگاہی ماننے کے لئے تیار نہیں۔

خیالات کے اس سیلِ بے پناہ میں بہتے بہتے اس کو ایک دم یہ شک گزرا کہ اس کے چاروں طرف کلرکوں پر ایک غیر معمولی خاموشی مسلط ہے اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ سے ہر ایک چہرہ کا جائزہ لیا وہاں نہ معلوم کیوں ایک نامانوسیت سی چھائی ہوئی تھی اور اس اجنبیت میں جیسے ہر نظر اُسی کو اجنبی ٹھہرا رہی تھی، اس نے اس کیفیت کی تہوں میں اُترنے کی کوشش کی مگر وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ اس نے لاکھ غور کیا مگر بات اس کو لایعنی سی معلوم ہوئی۔

"قیصر صاحب کیسے کیسے مزاج ہیں؟"

اس نے سلسلۂ کلام شروع کرنا چاہا تاکہ وہ رازِ یونہی فاش ہو۔

"اچھے ہی ہیں!"

قیصر کی آواز میں کچھ ایسی پژمردگی سی تھی کہ جیسے کسی خالی ٹین کو بجا دیا گیا ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی اسے کچھ ایسا بھی محسوس ہوا کہ قیصر کچھ کشیدہ خاطر بھی ہے، ——— گرہ اور بھی الجھ کر رہ گئی ——— اور وہ اور بھی سنجیدگی کے ساتھ سوچنے لگا کہ آخر آج اُن سوفیانہ تبسموں کے بجائے ویرانگی کیوں محیط ہے؟

"بابو جی، آپ کو بڑے بابو نے بلایا ہے۔"

"اچھا ———"

وہ ایک کرسی کھینچ کر بڑے بابو کے سامنے بیٹھ گیا۔

"یہ آپ کے لئے آرڈر ہے!" ——— بڑے بابو کی نگاہ میں ٹراشک شبہ سا محلول محسوس ہو رہا تھا۔

اس نے آرڈر کو اٹھا کر پڑھا۔ اُسے چوبیس گھنٹے کے اندر دفتر خالی کر دینا ہے کیونکہ اس کا تعلق دشمن پرست تخریبی عناصر سے ہے ——— ایک زہر خند اس کے ہونٹوں پر پھیل گیا۔ دشمن پرست؟ ——— تخریبی عناصر؟ ———

اور وہ؟ ———

"دیکھئے آخر اس میں آپ کا ہرج ہی کیا تھا اگر آپ یہ لکھ دیتے کہ میں اس تحریک کا کارکن نہیں ہوں اور واقعی آپ نہیں ہیں!"

بڑے بابو نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔ اور واقعتاً جیسے وہ بیچارے اپنے پورے خلوص کے ساتھ اس وار سے اس کو بچانا چاہتے تھے جس کی وجہ سے جیسے اس پر رزق کے سارے دروازے بند کئے جا رہے تھے۔

"آپ کچھ نہیں تو پھر بھی، کم از کم اپنے تھے، اب نہ معلوم کون آپ کی جگہ پر آئے اور کیسا ہو؟ ———" ایک وقفہ دے کر انھوں نے کہا۔ "اور پھر یہاں سے لوگوں کو فائدہ بھی پہونچا سکتے تھے باہر سے آپ کیا کر سکیں گے؟"

"بابو جی آپ تو اوب دوست ہیں۔ آپ کو اگر ادبی جوابِ یا جائے تو کیسا رہے؟"

اُس نے بڑے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"لیکن یہ موقع و محل اس کا نہیں؟" بڑے بابو نے انتہائی اضطراب اور کبیدگی کے ساتھ کہا جیسے اس کے مشورے کا وہ مذاق اڑا رہا ہو۔

"پھر بھی میرے پاس اس کے سوا کچھ اور کہنے کو نہیں۔"

"کہئے" بڑے بابو نے سارے تاثرات کو یکسر ختم کرتے ہوئے کہا۔

"آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی"

بڑے بابو نے بڑی بدمزگی کے ساتھ کہا۔ "اچھا تو آپ قیصر صاحب کو جواب دیدیجئے۔ میرا خیال ہے آپ ایک گھنٹے کے اندر فارغ ہو جائیں گے۔"

اس نے برخاستگی کے اس آرڈر کو اس طرح تو مروڑ کر جیب میں رکھ لیا۔ جیسے وہ بس کا رد شدہ ٹکٹ ہو اور اس کو اس نے صرف اس لئے جیب میں ڈال لیا ہو کہ جگو اس سے چند منٹ کھیل کر بہل جائے گا ورنہ شاید وہ اسے فٹ پاتھ کے کنارے کنارے بہتی ہوئی نالی میں پھینک دیتا۔ پھر وہ بڑے بابو کے پاس سے جواب دینے کے لئے اٹھ آیا۔

"قیصر صاحب۔ آیئے میں آپ کو جواب دیدوں۔"

"کیا؟ ——— قیصر کا انتہائے استعجاب میں رنگ فق ہو گیا تھا۔

اور قیصر بڑی مُردہ دلی کے ساتھ اس کے پاس آگیا تاکہ کاغذات اپنی تحویل میں لے لے۔ دفتر میں اس کے سلسلۂ ملازمت کے ختم ہونے کی خبر بکھرے ہوئے کاغذ کے ٹکڑوں کی طرح پھیل گئی۔ کلرکوں کے چہروں پر جیسے ایک سراسیمگی سی چھائی ہوئی تھی جیسے ان کے لئے یہ ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ وہ توقع کر رہے تھے کہ وہ اپنی میز پر اپنا سر جھکا دے گا۔ اور بڑی بیچارگی کے ساتھ سسکیاں بھرنے لگے گا اور بڑے موٹے موٹے آنسو ڈھلک کر اس کے رخساروں پر سے بہتے ہوئے کاغذوں پر گریں گے، اور بڑے بدنما دھبے بنائیں گے۔ پھر وہ اُسے تسلی دیں گے اور اپنے مخصوص انداز میں زمانہ کو کوسیں گے۔ تقدیر کو صلواتیں سنائیں گے اور بڑی اچھی جذباتیت کے ساتھ رقت آمیز ہو کر ہمدردی کا اظہار کریں گے۔ اور پھر یہ سب سُسکیاں چھوٹ پڑیں گی، اور وہ زار زار رونے لگے گا۔ اور یہاں تک کہ اُن کی آنکھوں میں بھی میلے میلے سے آنسو جھلکنے لگیں گے۔ مگر اُسے غم بھی نہ تھا۔ خوشی بھی نہ تھی، عجب شخص تھا وہ ——— ! اس میں کوئی تاثر ہی نہ تھا، کوئی تحریک ہی نہ تھی، کوئی ردِ عمل ہی نہ تھا، جیسے یہ ایک بڑی عام سی بات تھی جو روز ہی ہوتی ہے۔ اس کی اس بے حسی نے دفتر کے تمام بابو لوگوں کو بے طرح تجسس میں ڈال دیا تھا۔ اُن کی ساری توقعات باطل ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ ان کے سکوت کو اس طرح انگیز کر رہا تھا جیسے وہ کوئی اہم چیز نہ تھی اور بابو لوگ کچھ ایسے ہراساں زدہ سے تھے کہ جیسے یہی ستم کل ان پر بھی ٹوٹ پڑے گا۔ وہ اُسے بڑی عبرت کے ساتھ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور وہ کمال بے اعتنائی کے ساتھ چارج دینے کی تیاری کر رہا تھا۔

"آیئے قیصر صاحب، یہ رہیں فائلیں" اس نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا۔

اور قیصر کو گرفتہ پرندکی طرح عجیب سہما سہما خوف زدہ سا اس کی طرف

متوجہ ہو گیا، جیسے اس عتاب نے اُسے انتہائی خطرناک بنا دیا تھا اور کسی شخص کا اس سے مَس ہو جانا اس شخص کے لئے بھی اُسی پاداش کا باعث ہوگا۔

اس نے قیصر کی طرف ترس بھری نظر سے دیکھا اور اپنی ذمہ داریوں سے دست بردار ہونے لگا۔ قیصر نے بدحواسی کے ساتھ سب کچھ اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اور اس نے انتہائی اطمینان کے ساتھ اپنی کرسی خالی کر دی اور اب اس کے تبسم کے ساتھ تمام بابو لوگوں سے ہاتھ ملا کر دفتر سے باہر نکل آیا۔ جب وہ گیٹ کے باہر نکل آیا تو سب لوگوں نے تاسف بھری اطمینان کی سانس لی اور اپنے کاغذات کی غلاظت میں دفن ہو گئے۔

وہ ٹٹ پاتھ پر سے ہوتا ہوا بس اسٹاپ کے پاس ٹھہر گیا۔ پیڑوں کے چھدرے چھدرے سائے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے اور دھوپ کی چھنچھریاں اُن کے درمیان برص کے داغوں کی طرح نظر آ رہی تھیں چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور بس اسٹاپ پر اس کے اور ایک ادھیڑ عمر کے شخص کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس وقت اس پر عجلت اور جھنجھلاہٹ طاری نہیں تھی، بے پایاں اطمینان سا تھا۔ جیسے اس کے پاس بہت سا فاضل وقت تھا اور وہ کافی دیر تک بس کا انتظار کر سکتا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی جیسے وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہا ہو۔ سڑک کی دوسری طرف فٹ پاتھ پر ایک سور غلاظتوں کو سونگھتا پھر رہا تھا اس کا جی بُری طرح گھن کھانے لگا اور اس نے بڑی تیزی کے ساتھ نظر سڑک کی انتہائی دست کی طرف پھیر دی جو خم کھاتی ہوئی عمارتوں کے ڈھیر میں گم ہو گئی تھی۔ اسی طرف سے بس آنے والی تھی۔

شاید وہ بس اس کی نگاہ اُٹھ جانے کی منتظر تھی کیونکہ اس کے دیکھتے ہی بس ایک موڑ سے نمودار ہوئی اور چند سیکنڈوں میں اس کے سامنے آ کر ٹھہر گئی۔ دفتروں کے وقت کے گذر جانے کی وجہ سے بس بالکل خالی تھی شاید تین سیٹوں پر صرف تین افراد بیٹھے تھے۔ اور دونوں نے مل کر تین کی تعداد میں دو تنہائی کا اضافہ کر دیا۔ خالی بس میں جیسے دماغ فکر و خیال کے تار و پود بننے لگتا ہے۔ مگر وہ خود کو عجب بے فکرا سا پا رہا تھا جیسے وہ اپنے پیچھے تمام پستیاں چھوڑ آیا تھا اور خود غرضانہ خود پرستانہ ماحول کو در یا بُرد کر آیا تھا۔ اُسے رہ رہ کر معلوم کیوں یہ خیال آ رہا تھا کہ وہ اس نظام کے لئے مناسب بھی نہ تھا وہ یقیناً دشمن دوست تھا کیونکہ وہ لوگوں کی حبیبیں کتر کر اپنی تنگدستی کو دُور کرنے کے لئے بہانہ نہیں بنا سکتا تھا، وہ کینہ و مکر کے جال پھیلا کر نت نئے شکار نہیں لگا سکتا تھا۔ وہ مکار روباہ کی طرح تذلیلی انداز میں گڑگڑا نہیں سکتا تھا خوشامد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کا ضمیر اتنا مسخ نہیں ہوا تھا اور پھر رشوت کے مقابل دیانت، کذب و افترا پردازی کے مقابلہ میں لسانیت دوستی کتنے بڑے تخریبی عناصر ہیں، گندے سڑے ہوئے تالاب میں پرورش پانے والے متعدی جراثیم کو برداشت کر سکتے ہیں، وہ تو اپنی بساط بھر ایسے تخریبی عناصر کو فنا کر دینے کی کوشش کریں گے، یہ ایک فطری عمل ہے اور یہی فطری عمل اس کے معاملہ میں بھی برسرکار تھا۔ پھر بھلا یہ خلاف توقع بات کیونکر ہو سکتی تھی۔

بس ریڈیو اسٹیشن کے سامنے ٹھہر گئی۔ دو خواتین داخل ہوئیں۔ انہوں نے شاید اس لئے پُرکشش پوشاک پہن رکھی تھی کہ خود ان میں کوئی کشش نہیں تھی۔ مگر پھر بھی دو آنکھیں جیسے مردان کے تعاقب میں بس میں سوار ہو گئے اور بس چل دی۔ وہ دونوں عورتیں قدرے ڈگمگاتی سی ایک سیٹ پر بیٹھ گئیں اور وہ دونوں مرد بھی ان کے پیچھے والی سیٹ پر قابض ہو گئے اور اسے معاً اُس سور کا خیال آ گیا جو تلاش کر کر کے اور کُرید کُرید کر غلاظت کھا رہا تھا اُس نے پھر ایک بار گھن محسوس کی اور بس کی کھڑکی میں سے گذرتی ہوئی عمارتوں گلیوں، سڑکوں اور راہوں کو دیکھنے لگا۔ اُسے نہ معلوم کیوں ہر طرف ایک پسماندگی سی نظر آ رہی تھی۔ جیسے یہ ساری آبادی ایک بس ہو اور یہ بس ایک بوسیدہ نظام کے متعفن دفتر کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہو، وہ ان ساری چیزوں سے اس وقت تک نجات نہیں پا سکتا تھا جب تک وہ بدل نہ جائیں۔ اور ان کے بدلنے کے لئے بیش قدمی کی ضرورت تھی توقف کی نہیں۔

وہ منزل مقصود تک آ چکا تھا، اس لئے اتر پڑا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مگر اب وہ کچھ کچھ اس انداز سے سوچنے لگا تھا کہ کیا اس کی راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ اس کے ضعیف والدین فقر و فاقہ کی نذر ہو چکے ہیں۔ اس کا بچہ اور بیوی کس پرسی کی خندق میں گر چکے ہیں؟ پھر ایک انجانا عزم اس کے اندر سے بول اُٹھتا کہ وہ بودے وسوسے کیوں اپنے اندر پیدا ہونے دے رہا ہے اور اس نے بڑے تحمل کے ساتھ اس کیفیت کو ماند کر دینے کی کوشش کی۔

اس نے گھر کے دروازے پر دستک دی، بیوی نے اس غیر متوقع وقت پر آنے پر ایک سراسیمہ استعجاب کا اظہار کیا۔ اس نے اس کی نگاہوں میں بڑی جُستجو سے دیکھا، ایک پُرخلوص استفہام جھلک رہا تھا۔

"آؤ تم کو بتلا دوں میں کیوں آ گیا۔" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کی بیوی خاموشی کے ساتھ برآمدہ میں آ گئی۔

جگو اسٹول پر اپنے ٹوٹے ہوئے کھلونے کے ٹکڑوں کو اس طرح ترتیب دے رہا تھا جیسے وہ کچھ تعمیر کر رہا ہو، اُس نے اُسے دیکھا تو ایک

طفلانہ مسرت ابھرتے ہوئے سورج کی طرح اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ اور وہ دوڑ کر اس کے پاس آ گیا۔

"ابو، آ گئے ——" اس کے اس فقرے میں بڑا معصوم ترنم تھا۔

اس نے بس کا ٹکٹ اور آرڈر جیب سے بڑی طمانیت کے ساتھ نکالے اور پھر اُسے کھول کر اس طرح دیکھا جیسے وہ پرکھنا چاہتا ہو کہ کیا یہ کاٹھ کی تلوار واقعی اصلی تلوار ہو سکتی ہے۔ مگر نہ معلوم کیوں اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس ہتھیار سے اس پر وار کیا گیا تھا۔

اُس نے بس کا ٹکٹ جگو کو دیدیا اور وہ اُسے توڑ مروڑ کر نہ معلوم کیا بنانے کی کوشش کرنے لگا اور وہ اس آرڈر کا مفہوم اپنی بیوی کو بتلانے لگا۔

پھر اُس نے اُس کو تہہ کیا، اور سرے موڑے اور یونہی غیر ارادی طور پر اُسے کئی بار موڑا اور پھر دو کونے کھینچ دیئے۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ کاغذ کی ناؤ تیار ہو چکی ہے۔

"ارے —— ! ——" وہ بے اختیار کہہ اُٹھا۔

جگو اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"آہا! کشتی، کشتی! ——" وہ خوشی سے چہکنے لگا اور اُسے لے کر بھاگ گیا۔

اُس نے نیم خفی مسکراہٹ کے ساتھ بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی، اور اُس نے محسوس کیا کہ ابھی کتنے ہی دروازے اس کے انتظار میں کھلے ہوئے ہیں۔

موجِ نیل

مصر کے شہرۂ آفاق ادیب، سید مصطفےٰ لطفی منفلوطی دورِ حاضر کے مصری ادباء کے سرتاج تسلیم کئے جاتے ہیں۔ آپ مشرقی رجحانات کے حامل و داعی ہیں مغرب کی تہذیب کے ہاتھوں مشرق کے اخلاق و تمدن کو لٹتے دیکھ کر آپ بیحد متاثر ہوئے ہیں اور آپ نے ان تاثرات کو العبرات و النظرات میں افسانوں اور افسانوی مضامین کی صورت میں پیش کیا ہے یہ افسانے اور افسانوی مضامین اس قدر پُر اثر اور درد انگیز ہیں کہ پڑھنے والے کو آنسو ضبط کرنے دشوار ہو جاتے ہیں اور اس قدر دلچسپ کہ راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔

موجِ نیل اس سحر آفریں ادب کا اعجاز نما ترجمہ ہے جو قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کی مترجمانہ صلاحیتوں کا بہترین نمونہ ہے۔ ترجمہ کے متعلق ملک کے مشہور ادباء کی رائے ہے کہ "ان میں مصری لطافت اور روح بدستور باقی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا خود منفلوطی نے ہی اُردو کا جامہ پہنایا ہے" بلکہ زبان و بیان کی سادگی، بے تکلفی، شیرینی، دلکشی، سحر آفرینی اور وجد انگیزی یہ باور ہی نہیں ہونے دیتی کہ یہ ترجمہ ہے۔

کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ —— مجلد قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ

مکتبۂ معیار۔ خندق اسٹریٹ۔ میرٹھ

اقبال نسیم عثمانی

جب عورت باغی ہوتی ہے

شمسہ نے سوچا۔ یہی کوئی پانچ سال کی بات ہوگی کہ امّی کہا کرتی تھیں۔ میری شمو! میری لاڈلی! کتنی اچھی کتنی پیاری ہے میری بیٹی! ۔ میں اسے ایک لمحہ کے لئے جدا نہیں کر سکتی۔ لیکن آج وہی امّی اپنی لاڈلی شمو کو اپنے سے جدا کرنے پر تلی تھیں اُس کے لئے کسی اچھے بَر کی تلاش تھی۔ اور کہیں دُور پردیس بیاہ دینے کی ٹھہری تھی۔ وہ سوچتی امّی کے لئے میں چاند کا ٹکڑا تھی اور ابّو کی نظر میں گھر کا روشن چراغ۔ مگر اب جیسے چاند کی چاندنی پھیکی پڑتی جا رہی ہو اور چراغ کی روشنی مدھم۔ کیوں؟ ۔۔۔ آخر کیوں؟

ابھی شمسہ سوچ کی اِن الجھی ہوئی گتھیوں کو اچھی طرح سلجھانے بھی نہ پائی تھی کہ یکایک ایک روز ساون کی پھواروں میں دروازہ پر شہنائیاں بجیں اور یاسمین کے تازہ پھولوں سے سجائی ہوئی ایک دوشیزہ دُور پردیس بیاہ دی گئی۔ یہ شمسہ تھی۔ جو دلمن بنی سمٹی۔ سمٹائی۔ لجائی۔ شرمائی۔ ایک نئی سی دنیا میں داخل ہوگئی۔ کچھ روز فطری طور پر اس نئے ماحول میں ایک اجنبیت سی محسوس ہوئی لیکن رفتہ رفتہ انور کی محبت نے پھر سب کچھ بھلا دیا۔ اور وہ محسوس کرنے لگی۔ جیسے وہ صرف انور کے لئے ہی پیدا کی گئی ہو۔ اُسے انور سے محبت تھی۔ انور بھی اُس سے بے پناہ پیار کرتا تھا۔ چنانچہ وہ اکثر شوہر کی محبت کو اپنے مقدر کی کامیابی سمجھ کر مسکرا دیتی۔ لیکن کبھی کبھی ماضی کے رنگین تصورات اُسے جھنجوڑ ڈالتے اور خیالات پر برسنے ہوئے ہوائی قلعے ایک دم ڈھیر ہو کر رہ جاتے۔

وہ سوچتی۔ سوچا تھا کہ شادی کے بعد زرینہ کی طرح میرے پاس طلائی کنگن ہوں گے۔ صوفیہ کی طرح صوفہ سیٹ۔ ریڈیو۔ اور برقی پنکھے میرا خیر مقدم کریں گے۔ سلمیٰ سے بڑھ کر ساریاں۔ جمپر۔ اور غرارے میرے جسم کی زینت بنیں گے ۔۔۔ مگر ۔۔۔ مگر ۔۔۔ آہ ۔۔۔ مجھے یہ کچھ بھی نہ مل سکا ۔۔۔ مانا وہ اچھے ہیں۔ بہت ہی اچھے ۔۔۔ میں ان کی عزت کرتی ہوں۔ اُن کے پاس بھی میرے لئے محبت ہے۔ پریم ہے۔ خلوص ہے ۔۔۔ مگر کھنکتے ہوئے سکّے ۔۔۔ چمکتی ہوئی بلاؤز ۔۔۔ اور دمکتی ہوئی ساریاں وہ مجھے نہیں دے سکتے کیونکہ وہ ایک بابو ہی تو ہیں صرف پچھتر روپے پانے والے ایک معمولی سے بابو ۔۔۔ جن کی آمنگیں فائلوں کی گرد میں اٹی ہوئی پیچانی سینکڑوں تھیں کہ وہ بھی کوئی جوان آمنگیں تھیں۔ کاش وہ اِن فائلوں اور فائلوں والوں سے بغاوت کر سکتے۔ جنہوں نے ذہنی صلاحیتوں اور دماغی کاوشوں کی قیمت کل پچھتر لگائی ہے ۔۔۔ پچھتر ۔۔۔ جو بھوک سے سکڑے ہوئے پیٹ کو اگر چند ٹکڑے دے سکتے ہیں تو ٹھٹھرے ہوئے جسم کے لئے چار گز کپڑا مہیا نہیں کر سکتے ۔۔۔ اُف یہ بے رحم نظام ۔ اور وہ بیچارے بابو ۔۔۔

شمسہ غربت کی آغوش میں پروان چڑھ کر باغی ہو رہی تھی۔ اُس نے لاکھ چاہا کہ جھکی ہوئی کمر ۔۔۔ ٹوٹی ہوئی چپل اور پھٹی ہوئی بلاؤز کے باوجود وہ چلّا اٹھے ۔۔۔ ہم کمزور نہیں ہیں۔ ہم غریب نہیں ہیں ۔۔۔ مگر غربت پھر غربت تھی۔ وہ حقیقت کا منہ چڑا دیتی۔ اور شمسہ جیسے کھسیانی ہو کر رہ جاتی۔ پھر یکایک اُس کے پہلو میں چھپی ہوئی عورت جھنجلا اٹھتی۔ شمسہ! تو جوان ہے خوبصورت ہے۔ تیرے جسم کے لئے بھی طلائی زیورات اور قیمتی کپڑے درکار ہیں لیکن افسوس زمانہ تجھ سے یہ تیرا حق بھی چھین چکا۔ اور تو اُف تک بھی نہ کر سکی۔ تجھ سے بہتر تو وہ تیری سہیلی نا بیدہ ہے جو صورت اور جوانی دونوں میں دیوالیہ ہو کر بھی کس قدر غنی رہتی ہے۔ اُس کا شوہر بھی ایک بابو ہے۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ اُس کی پیشانی پر پارسائی کا لیبل نہیں ہے۔ وہ بیوقوف لوگوں کی بھاری بھاری جیبوں سے اپنے متعدد کے سکّے چھیننا جانتا ہے۔ لیکن تیرا انور شاید کچھ نیک ہے۔ مگر آج نیکی کا زمانہ نہیں۔ نیک رہ کر اس دنیا میں کچھ بھی نہیں ملتا ہے پگلی! ۔۔۔ اور شمسہ تلملا اٹھتی ۔ نیک رہ کر کچھ بھی نہیں ملتا ۔۔۔ تو کیا میں ہمیشہ غریب رہوں گی۔؟ کیا یہ ٹوٹی ہوئی چپل ۔۔۔ کامدانی سینڈل۔ اور پھٹی ہوئی بلاؤز ریشمی جمپر میں نہیں بدل سکتی۔ اوہ خدایا! ۔۔۔ میں غریب رہنا نہیں چاہتی مجھے غربت سے نفرت ہے کیونکہ یہ تیری دنیا والے غریب کو نالی کا رینگتا ہوا کیڑا سمجھتے ہیں۔ اب تو ہی بتا کیسے بتاؤں۔ میں کوئی متعفن کیڑا نہیں، انسانیت کا جوہر ہوں۔ مجھ میں بھی شرافت۔ خلوص۔ محبت۔ وفا اور ایمانداری موجود ہے ۔۔۔ مگر وہ نہیں مانتے۔ وہ نہیں مانیں گے ۔۔۔ پھر؟ ؟ ؟

مجھے بھی دولت دیدے۔ تاکہ ایک ایک شریف لیٹرے کو دکھلا سکوں یہ میرا کارٹ ہے۔ پانچ تولے والا ـــــ یہ نیکلس پورے نو تولے کا۔ اور وہاں دیکھو یہ جھومر ـــــ جھمکے۔ کرن پھول۔ گلوبند۔ کنگن ـــــ جھانجریں۔ پازیب۔ چھڑے۔ اور پھر یہ ایر کنڈیشن نیکلس جس میں یہ باتھ روم ہے۔ یہ ڈریسنگ ہاؤس۔ یہ کیچن۔ یہ ڈرائنگ روم اور یہ سونے کا کمرہ ـــــ اب میں غریب نہیں ہوں۔ میرے پاس دولت ہے۔ عزت ہے۔ غریبوں سے چھینی ہوئی۔ کمزوروں کی ہتھیائی ہوئی۔ دولت و عزت ـــــ اب میری شرافت پر کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ میں شریف خاتون ہوں۔ نالی کا رینگتا ہوا کیڑا نہیں ـــــ

شمسہ اسی طرح نہ جانے کیا کیا کچھ سوچتی لیکن اس مسلسل سوچ کے بعد بھی اُسے چند سرد آہوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہ ملتا۔ اسے انور سے نہیں۔ بلکہ خود اپنی کم نصیبی سے شکایت تھی اور غربت سے نفرت۔ وہ غریبوں سے پرہیز کرتی۔ بڑے لوگوں میں اٹھتی بیٹھتی۔ اور ہمیشہ بڑے ہی لوگوں جیسی باتیں کیا کرتی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہ جہاں فریبی بھی اس کے لئے خود فریبی نہ بن سکی۔ اُسے احساس تھا کہ میں غریب ہوں۔ اور اس احساس کے ساتھ ہی جیسے اُس کی جوان اُمنگوں پر اداسی سی پڑ جاتی شاداب خوابوں کی رنگینیوں پر مایوسیاں بکھر جاتیں۔ وہ گھبرا کر ان بکھری ہوئی مایوسیوں کو سمیٹتی۔ اور ہمیشہ لبوں کی حنیف مسکراہٹوں سے انور کا استقبال کرتی۔ جیسے وہ اپنے شوہر سے اپنے ہی پہلو میں سوئی ہوئی باغی عورت کو چھپانا چاہتی ہو ـــــ مگر انور شمسہ کو بھی جانتا تھا اور اُس عورت کو بھی، وہ اُس کی اٹھی ہوئی مضمحل نگاہوں میں مچلتی ہوئی آرزوؤں کو تاڑ جاتا۔ اُسے تکلیف ضرور ہوتی۔ مگر اس تکلیف کا مداوا بھی کیا تھا۔

پھر عرصہ تک وہ چپ چاپ سب کچھ سنتا رہا۔ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اور آخر ایک روز کہہ ہی بیٹھا۔

شمسہ!!!

"جی"

"مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں وہ سب کچھ نہ دے سکا جو تم چاہتی ہو"

کیا مطلب؟ شمسہ گھبراتے ہوئے بولی ـــــ

"مطلب یہی کہ تم دولت چاہتی ہو۔ اور میرے پاس غربت کے علاوہ اور رکھا ہی کیا ہے" انور نے ہونٹوں کو چباتے ہوئے ایک حقیقت دہرائی۔ نہیں سرتاج! شمسہ نے پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے بات بنائی۔ میں صرف تمہیں چاہتی ہوں۔ اور جب تم میرے ہو تو مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں۔

ٹھیک ہے ـــــ انور مسکرایا ـــــ میری شمسہ کو صرف میری ضرورت ہے۔

لیکن بدقسمتی سے تمہاری آغوش میں مچلتی ہوئی ایک حریص عورت محبت کے ساتھ دولت کی بھی بھوکی ہے۔ اُسے غربت سے نفرت ہے۔ اور وہ تمہیں بھی باغی بنا رہی ہے۔ مانا۔ وہ عورت تمہاری ساتھی ہے۔ جنم بھر کی ساتھی۔ مگر بعض دفعہ نادان ساتھی تباہیوں کے غاروں میں بھی دھکیل دیتا ہے۔

شمسہ! ـــــ تم غریب ہو یہ کوئی زیادہ افسوسناک بات نہیں۔ اس دنیا میں تم سے بھی زیادہ غریب موجود ہیں۔ افسوس تو اس کا ہے کہ غریب ہوتے ہوئے بھی تم غربت کو چھپانا چاہتی ہو اور یہ نہیں سمجھتی کہ غربت کا چھپانا غربت سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ یقین جانو یہ بہت بڑی سزا ہے جو نادانستہ تم خود کو دے رہی ہو۔ مجھے دے رہی ہو۔ خدا نہ کرے کہ یہ سزا ہماری زندگی کے لئے اجیرن بن جائے تب کیا ہوگا۔ ٹھنڈے دل سے سوچو۔ غور کرو ـــــ

انور کہتا رہا۔ اور شمسہ کی ندامت سے گردن جھک گئی ـــــ جیسے وہ باغی عورت سے بغاوت کر کے اپنی موجودہ زندگی پر ہی مطمئن ہونا چاہتی ہو ـــــ لیکن پھر ایک دن یکایک ایک طوفان آیا ـــــ اور شمسہ ڈگمگا گئی ـــــ اس نے سنبھلنا چاہا مگر وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ جا گری۔ سامنے پڑوس کی ایک عورت اپنے نئے زیورات دکھاتے ہوئے کہہ رہی تھی ـــــ

"وہ مجھے بے انتہا چاہتے ہیں" ـــــ اور شمسہ تڑپ اٹھی جیسے غربت کے ساتھ ساتھ اس کے انور کی محبت کا بھی منہ چڑایا جا رہا ہو ـــــ اُس نے بمشکل جواب دیا ـــــ

ہر شوہر اپنی بیوی سے محبت کرتا ہے ـــــ مگر ـــــ پھر وہ کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی ـــــ

نہ بابا ـــــ پڑوسن نے تقریر جھاڑی ـــــ مرد کی یہ عالم خولی محبت ایک آنکھ نہیں بھاتی ـــــ اور سچ تو یہ ہے کہ اس روکھی سوکھی محبت کو محبت کہنا ہی پرلے درجہ کا سفید جھوٹ ہے۔ بعض چالاک مرد بھولی بھالی عورتوں کو بہکا دیتے ہیں۔ میں تجھ پہ مرتا ہوں۔ تو ایسی ہے۔ تو ویسی ہے۔ گویا لینے دینے کے نام خاک۔ محبت رکھیں پاک۔ واہ ـــــ واہ ـــــ کیا ترت دان مہا کلپ ان محبت ہے۔ چولھے میں جائے ایسی محبت اور ایک یہ نگوڑی عورتیں ہیں کہ پھر بھی ایسے نکھٹو مردوں کا کلمہ پڑھتی ہیں۔ سچ ہے جب اپنا ہی پیسہ کھوٹا تو پرکھنے والے کا کیا دوش۔ شمسہ! برا نہ ماننا ایک تمہارے شوہر ہیں معقول تنخواہ اور ماشاء اللہ اوپر کی آمدنی سو علیحدہ۔ یہ کہہ رہے تھے کہ اگر میں انور کی جگہ ہوتا تو جھ مہینہ میں ہی تمہیں زیور میں پیلی کر دیتا میری گڈو ـــــ مگر ہم نے تمہاری پاس ایک رائنگ کا چھلا بھی نہ دیکھا۔ توبہ! توبہ! ایسی بھی کیا خساست۔ بس

کہنے ہی کی محبت ہے۔ ورنہ محبت کے لئے انسان کیا کیا کچھ بے ایمانیاں نہیں کر گزرتا جوانی۔ دیوانی ہوتی ہے بس اگر اس میں بھی چاؤ چونچلے نہ ہوئے تو خاک پڑے بڑھاپے میں تو دو کوڑی کے بھی نہ رہیں گے۔

شمسہ سنتی رہی اور جیسے مدت سے اس کے دماغ میں سوئی ہوئی عورت ایک دم ہڑبڑا کر جاگ اٹھی۔ اس نے سوچا ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے بس کہنے ہی کی محبت ہے ورنہ محبت کے لئے انسان کیا کیا کچھ بے ایمانیاں نہیں کر گزرتا۔ کہاوت ہے جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ مگر شاید وہ کچھ نیک ہیں۔ کاش وہ اتنے نیک نہ ہوتے اور دوسروں کی طرح وہ بھی جینے کا سلیقہ جانتے۔

اور پھر یہ سوچتے سوچتے عورت باغی ہوگئی ـــــ اور دفعتاً چل اٹھی میرے بھی زیور نہیں گے ـــ انور نے سمجھا یا۔ شمسہ! مجھے کل پچھتر ملتے ہیں جس میں روٹیوں کا خرچ بھی مشکل ہی سے چلتا ہے۔ تمہاری فرمائش یا ـــــ مگر بتاؤ کہاں سے لاؤں۔ میں نہیں جانتی ـــــ شمسہ ٹھنکی ـــــ دنیا کو اپنی محبت کا اعتبار دلانے کے لئے کہیں سے لائیے ـــــ پارسائی کا گلا گھونٹیے چوری کیجئے ـــــ

شمسہ ؟ ؟ ؟ انور غصہ میں کانپ اٹھا ـــــ

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں" شمسہ نے مچلتے ہوئے جواب دیا۔ اور دوسرے ہی لمحہ چٹاخ سے گال پر ایک طمانچہ پڑا ـــــ اور شمسہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

انور بھی رات بھر روتا رہا ـــ سوچتا رہا ـــ سوچتا رہا ـــــ روتا رہا ـــ جیسے شمسہ بار بار اس کے کان میں کہہ رہی ہو۔ تم نے مجھے مارا ہے عورت کو مارا ہے۔ اپنی محبوبہ کو مارا ہے، کہاں ہے۔ تمہاری محبت ـــ ظالم! ـــــ سنگدل ـــــ اور انور گھبرا کر جواب دیتا ـــــ ہاں میں نے مارا ہے۔ میں ظالم ہوں سنگدل ہوں۔ مگر محبت کے لئے چوری نہیں کر سکتا ایمان نہیں بیچ سکتا ـــــ چوری نہیں کر سکتے ـــ ایمان نہیں بیچ سکتے۔ تو پھر مجھ کو۔ خود کو اور دنیا کو کیوں دھوکہ دے رہے ہو۔ تم منافق ہو ـــــ تم منافق ہو ـــــ

اور انور سوچ میں پڑ گیا۔ کیا میں منافق ہوں۔ کیا مجھے شمسہ سے محبت نہیں ـــ انور نے اپنے اس سوال کا جواب شمسہ کی ڈبڈبائی آنکھوں میں ڈھونڈنا چاہا۔ مگر وہاں ہزار ہا شکوے تڑپ رہے تھے ـــــ وہ تڑپ اٹھا ـــــ لیکن اس پر بھی شیطانی قوتوں سے لڑتا رہا ـــــ یہ اس کی آخری لڑائی تھی اور جب وہ تھک کر چور ہو گیا تو دل کے کسی کمزور مورچہ سے غنیم نے پھر ایک دم چھاپہ مارا ـــــ انور! اس بیچ سے شمسہ مر جائے گی پھر تیرا کیا ہوگا تیری محبت کا کیا ہوگا۔ وہ یہ سنتے ہی جیسے پاگل ہو گیا۔ اور نیز سوچے سمجھے پانچ ہزار کا ایک جعلی چیک کاٹ ڈالا۔ دفتر بھر میں اس کی پارسائی کی دھاک تھی۔ اس لئے صاحب سے جعلی چیک پر دستخط کرانے میں ذرا بھی دشواری نہ ہوئی۔ مگر اس کے دل کا چور کانپ رہا تھا۔ اور اس نے محسوس کیا جیسے کوئی ہنس ہنس کر کہہ رہا ہو۔ محبت کے لئے چوری نہیں کر سکتا۔ ایمان نہیں بیچ سکتا۔ ہا ـ ہا ـ ہا ـ ہا ـــــ

انور گھبرایا۔ اور سوچنے لگا۔ ابھی وقت ہے۔ بگڑی ہوئی بات بن سکتی ہے۔ مگر پھر کوئی شعور کی گہرائیوں سے چلایا۔ شمسہ مر جائے گی۔ تیری شمسہ مر جائے گی۔ نادان! پانچ ہزار میں اس کی محبت کچھ مہنگی نہیں۔ اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا۔ بنک کی کھڑکی پر جا پہونچا۔ اور پھر دس منٹ میں ہی وہ پورے پانچ ہزار کا مالک تھا باغی عورت کی محبت اور اس کے اعتبار کا مالک ـــــ لیکن دل کا چور اب بھی کانپ رہا تھا۔ اس نے سنا جیسے پھر کوئی کہہ رہا ہے۔ بے ایمان ـــ چور ـــ غاصب ـــ خائن ـــ پکڑو ـــــ اور وہ گھبرا کر نوٹوں کو دبائے اس طرح بھاگا جیسے ہر راہ گیر اسے پکڑنے بڑھ رہا ہو۔ بھیڑ بھاگتی ہوئی پرچھائی پر بھی اسے لال پگڑی والے کا شبہ تھا ـــ وہ پے تماشا بھاگتا رہا۔ سوچتا رہا ـــ میں چور نہیں ـــ میں غاصب نہیں ـــ مجھے پہچانو ـــ میں بابو ہوں۔ بابو ـــــ اور پھر لوگوں کی نظروں سے بچتا۔ بچاتا۔ الجھتا ـــ گرتا۔ تنگ اور چور گلیوں سے گذرتا ہوا وہ صراف میں جا نکلا۔ یہ اس کا منتہائے مقصود تھا۔ جہاں اونچی اونچی دوکانوں پر عورت کی محبت کا اعتبار شیشہ کی الماریوں میں مسکرا رہا تھا۔ اس نے ان چمکتے ہوئے گہنوں کو غور سے دیکھا۔ وہ کہہ رہے تھے ہمیں خریدو بابو جی! ـــ ہم شمسہ کی محبت ہیں ـــــ اور انور نے گھبرا کر بازار میں بکتی ہوئی جھوٹی محبت پورے پانچ ہزار میں خریدی اور پھر شمسہ کے قدموں میں لا ڈالی۔

"یہ کیا ہے" شمسہ نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری محبت۔ تمہارے زیورات" انور نے فاتحانہ انداز میں جواب دیا۔

"کہاں سے لائے" شمسہ نے دوبارہ پوچھا۔

تم نے کہا تھا نا ـــ انور نے جواب دیا ـــ پارسائی کا گلا گھونٹیے۔ چوری کیجئے ـــــ چوری کر کے لایا ہوں۔ اگرچہ کل اس جرم میں جیل بھیج دیا جاؤں گا۔

چوری!!! ـــــ اوہ! یہ تم نے کیا کیا ـــــ شمسہ روتے ہوئے بولی۔ کچھ نہیں۔ شرافت کے کھرے سکے دیکر عورت کی محبت خریدی ہے۔ کیونکہ اسے خلوص میں ڈوبے ہوئے دل کی نہیں بلکہ چمکتے ہوئے زیورات کی ضرورت ہے۔

اب رونے کے کیا حاصل ہنسو۔ جی بھر کر ہنسو۔ دنیا ہنسے گی۔ اور ہنسے گا۔ اُسے تم سے محبت ہے۔ اب اگر وہ نہیں ہوگا نہ سہی لیکن اس کی محبت کا اعتبار تمہارے پاس ہوگا۔ اُسے دیکھنا اور پہننا کہ محبت کے لئے چوری بھی کی جا سکتی ہے۔ افسوس میں جو تم سے چاہتا تھا وہ نہ مل سکا۔ تم جو چاہتی تھیں وہ مل گیا۔ پھر اب کیوں رو رہی ہو۔ لو! یہ اپنے زیورات پہنو اور دنیا کی ایک ایک عورت کو بتا آؤ کہ انور تم سے محبت کرتا ہے۔" شمسہ ایک چیخ کے ساتھ انور کے قدموں پر گری۔ میرے سرتاج !!! ــــ اور اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اور کہتی بھی کیا۔ اُس کے پاس کہنے کے لئے اب رکھا ہی کیا تھا۔ پھر وہی ہوا کہ ہفتہ بھر بعد انور حوالات بھیج دیا گیا۔ شمسہ کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس کا سر چکرایا۔ اُف! یہ میں نے کیا کیا ــــ کیا مجھے ان سے محبت نہیں؟ ــ وہ بڑبڑائی ــــ اور پھر تمام دن روتی رہی۔ آدھی رات تک روتی رہی ــــ روتے روتے جیسے اُسے کچھ یاد آگیا۔ وہ اُٹھی اور اپنے تمام زیورات لئے صاحب کے بنگلہ پر پہونچی۔ میں آپ کے انور کی وائف ہوں۔ شمسہ نے اپنا تعارف کرایا۔ خدا کے لئے اُنہیں بچا لیجئے۔ نہیں تو میں تباہ ہو جاؤں گی۔ برباد ہو جاؤں گی۔

محترمہ! صاحب نے سگریٹ پیتے ہوئے لاپرواہی سے جواب دیا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ مگر اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ فیصلہ کیس ہے جو عدالت میں پہونچ چکا ہے۔

نہیں۔ ایسا نہ کہئے۔ شمسہ زار و قطار رو رہی تھی۔ مجھ پر رحم کیجئے۔ اُن پر رحم کیجئے۔ میں یہ پانچ ہزار کے زیورات لائی ہوں۔ یہ اُن کے جرم کی قیمت ہے۔ اُنہیں بچا لیجئے۔ یہ کہہ کر شمسہ صاحب کے قدموں پر گر گئی۔ اور صاحب کی آنکھوں کے سامنے جیسے بجلی کوند گئی۔ پھر جذبات میں طوفان کیسے نہ آتا۔ وہ آیا اور پوری گرج اور کڑک کے ساتھ آیا۔ اِدھر شیطان نے کہ تھپکی دیکھا دولت اور حسن تیرے قدموں میں پڑا ہے۔ ایک کو تجوری میں رکھ اور دوسرے کو سینہ سے لگا۔ تجھے کوئی نہیں دیکھتا تو اس اندھیری اور طوفانی رات میں قانون کی نظر سے دُور ہے۔ بہت دور ــــ اور صاحب نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ اُسے کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اور جو دیکھ رہا تھا۔ صاحب اُسے نہ دیکھ سکا۔ اِس لئے اپنی شیطانیت پر مسکرایا ــــ اور نرم گداز انداز میں بولا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں انور کو بچانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دوں گا۔ خوش قسمتی سے آج بڑے صاحب بھی آرہے ہیں۔ وہ رات کو کسی وقت یہیں میرے بنگلہ پر آئیں گے۔ تمہارے تمام زیورات سرکاری خزانہ میں داخل کر کے اُن سے تمہارے انور کو چھڑانے کی سفارش کروں گا۔ اگر مناسب سمجھو تو آج کی رات تم بھی میرے بنگلہ پر قیام کرو۔ تم خود انھیں اپنی درد بھری داستان سنانا۔ وہ بڑے رحمدل ہیں۔ انور کو چھڑا دیں گے" ــــ اور شمسہ سوچنے لگی ــــ

"کیا مجھے آج رات رُکنا چاہئے۔ ایک غیر مرد کے پاس؟ لیکن معاً کسی نے کہا۔ ہاں تیرا رکنا ضروری ہے۔ اگر تو نہ رُکی تو پھر بڑے صاحب سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ انور جیل ہی میں پڑا رہے گا ــــ اس کے علاوہ اپنا دل صاف ہونا چاہئے۔ بڑے صاحب رحمدل ہیں اور یہ چھوٹے صاحب بہت نیک بیچارے سادھے۔"

ــــ چنانچہ شمسہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آج رات بنگلہ پر رُکے گی۔ اور پھر نیک بیچارے سادھے صاحب نے زیورات اپنی تجوری میں رکھ دیئے۔ اور بنگلہ کی تمام بتیاں گل کر دی گئیں۔ رحم و انصاف کے بنگلہ میں اب چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا ــــ صبح کو سورج کی پہلی معصوم کرن نے دیکھا کہ گناہگار شمسہ رو رہی تھی۔ لیکن چھوٹے صاحب مسکرا رہے تھے۔ اور پھر شمسہ بڑے صاحب سے ملے بغیر خالی ہاتھ اپنے گھر سدھاری روتی ہوئی سسکتی ہوئی۔ جیسے اپنے انور کو چھڑانے کے لئے آج وہ اپنا سب کچھ دے بیٹھی ہو۔ دولت۔ عزت اور ناموس اب اس کے پاس رہا ہی کیا تھا صرف انور کی ایک یاد لیکن وہ بھی اُسے گھور رہی تھی۔ جھڑک رہی تھی۔ ہیو تو عورت! جا دُور ہو۔ مجھے تجھ سے نفرت ہے۔ تو انسانیت کا جوہر نہیں بلکہ نالی کا رینگتا ہوا ایک کیڑا ہے۔ بے حیا! کہیں ڈوب مر ــــ !!!۔

اور وہ گھبرا کر بولی۔ ہاں میں گناہگار ہوں۔ مجرم ہوں۔ مجھے ڈوبنا ہی چاہئے لیکن اُن کی رہائی کی خبر پا کر ــــ شمسہ مہینوں رو رو کر انور کی رہائی کی دعائیں مانگتی رہی۔ اپنے گناہ پر توبہ کرتی رہی۔ مگر انور اب بھی نہ چھوٹ سکا۔ اور پھر ایک روز قانون کے ٹھیکہ داروں نے انور کا گھر نیلام چڑھا دیا اور خود شمسہ کے انور کو جیل کا حکم سنا دیا گیا۔

شمسہ تڑپ اٹھی۔ اور آج پھر جیل میں کوئی چیز دبائے اسی بنگلہ پر پہونچی جہاں اُس رات اُس کی دولت و عزت لٹی تھی۔ پھر وہی اُداس آئی۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے مگر کیا کروں تم نے اس وقت خبر لی جب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

آپ کیا کر سکتے تھے۔ شمسہ بولی۔ اور کوئی کیا کر سکتا ہے۔ مجرم پھر مجرم ہے۔ اُسے سزا ملنی ہی چاہئے۔ پھر باتوں ہی باتوں میں شمسہ کے مجرم کو بھی سزا مل گئی۔ اُس رات مرد کے جذبات میں طوفان آیا تھا اور آج عورت کے جذبۂ انتقام میں بھونچال آگیا۔ دُنیا نے سُنا کوئی مرد چیخ رہا تھا۔ لوگ چاروں طرف سے مدد کے لئے دوڑے لیکن اُن کے پہونچنے سے پہلے ہی ایک خون آلود جسم ہمیشہ کے لئے سرد ہو چکا تھا۔ مگر شمسہ اب بھی اپنے بے جان مجرم پر جھکی ہوئی پاگلوں کی طرح ہنس رہی تھی۔ چلا رہی تھی۔

انتقام ــــ انتقام ــــ !!!

قانون کی نظر میں اب شمسہ بھی مجرم تھی ــــ چنانچہ وہ بھی اپنی سلاخوں کے اُس پار بھیجدی گئی۔ جہاں وہ ہر وقت روتی بڑبڑاتی اور سوچتی ــــ کاش میں

اپنے آقا کو اتنا ہی لکھ سکوں۔

میرے سرتاج! اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔ میں مجرم ہوں۔ تم بھی مجرم ہو — اور تمہارے صاحب بھی مجرم تھے۔ انہوں نے ایک مجبور عورت سے جھوٹی ہمدردیاں جتا کر تمہاری دولت چھینی۔ عزت لوٹی۔ مگر قانون اُن کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔ ہم دونوں کمزور تھے۔ غریب تھے۔ قانون نے ہمیں سزا دے ڈالی۔ اور تمہارے صاحب بڑے آدمی تھے۔ اُن کی بھاری بھاری کلائیاں قانون کی گرفت میں نہ آ سکیں۔ لیکن میں نے وہ کلائیاں مروڑ ڈالیں۔ وہ ہاتھ توڑ ڈالے جو تمہاری دولت پر بڑھے تھے۔ تمہارے ناموس پر ٹوٹے تھے۔ مگر میں اب بھی مجرم ہوں۔ یہ میرے جرم کی تلافی نہیں بلکہ ایک دوسرے مجرم کی سزا تھی جسے دُنیا مجرم نہ سمجھ سکی۔ قانون مجرم نہ جان سکا۔ لیکن وہ مجرم تھا خدا کا مجرم۔ میرا اور تمہارا مجرم۔ سارے سماج کا مجرم۔ پھر وہ کیسے بخش دیا جاتا — اُسے سزا ملنی ہی تھی اور وہ مل گئی — میں بھی مجرم ہوں — مجھے بھی سزا مل رہی ہے — اور یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ عورت معاف ہی کیسے کی جا سکتی ہے جو دولت کے لئے شوہر اور شوہر کے لئے اپنی عزت تک کھو بیٹھی —

بیوقوف باغی عورت جو اندھی ہوتی ہے اور شاید بہری بھی — کیا ایسی عورت کو تم معاف کر سکو گے — اے کاش! معاف کر سکو — صرف ایکبار —

احمد پرویز

دو سانپ

دُور، پہاڑی کے دامن میں بل کھاتی ہوئی ایک کچی پگڈنڈی پر دوڑتی ہوئی بیل گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ، اور بیلوں کی گردنوں میں لٹکی ہوئی گھنٹیوں کی مخصوص آواز جونہی اُس کے کانوں میں داخل ہوئی، اُس کے پاؤں تلے کی زمین، جیسے کھسک ہی گئی۔ اس کے جسم و جاں پر کپکپی سی طاری ہوگئی اور اُس کے بھرے ہوئے سانولے سے چہرہ پر پسینے کی گھنی پھوار اُبھر آئی۔

بیلوں کی گھنٹیوں کے بجنے کی آواز جُوں جُوں قریب آرہی تھی، اُس کی طبیعت میں ایک ہیجانی کیفیت برپا ہوتی جارہی تھی۔ اُس کے تنفس میں انتہائی تیزی پیدا ہوگئی تھی اور اُس کے سینے کے زیر و بم سے، اُس کے دل کی دھڑکنوں میں چھپی ہوئی غیر معمولی سراسیمگی و گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ ایک مختصر سے کمرہ میں اپنے بیمار شوہر کے سرہانے بیٹھی اُس کا سر دبا رہی تھی۔ عام دیہاتی لڑکیوں سے کہیں زیادہ اُس کے دل میں اپنے شوہر کی محبت تھی۔

کل شام اُسے اپنے باپو کا خط ملا تھا اور آج صبح اُس کا باپو اُسے لینے کے لئے آرہا تھا۔

اُس کے بیمار، نحیف و ناتواں شوہر کی مرضی کے خلاف،

اُس کے بوڑھے سسر، ننھو دادا کی منت و سماجت کی پروا کئے بغیر۔

اُس کی نو آباد دُنیا کو اپنی گاڑی کے بیلوں اور میلوں کے کھروں سے روندتا ہوا، آج اُس کا باپو اُسے لینے کے لئے آرہا تھا۔

خط میں لکھے ہوئے، باپو کے الفاظ اُس کے دل و دماغ میں ہیجانی قہقہے بنکر گونج رہے تھے۔

"مجھے اپنی بچھیوں کے اُترکی ضرورت" نہیں تھی۔"

"تمہارا شامو نہیں جاتا مگر تم میری گوپی کو بھیجا جاتے۔"

"میرے گیان میں نہ تھا کہ تم اِتنے نیچ ہو ننھو دادا۔"

"گاؤں کا کھیا، اجیت اور دوسرے یاتری میرے گاؤں سر" چلنے کے لئے رُکے رہے۔"

"تم نے مجھے نیچوں کے سامنے بے اِزت" کرایا۔ میں گوپی کو لینے آپ ہی آرہا ہوں۔"

یہ جملے گاڑی کے پہیوں کی طرح اُس کے حافظے میں گردش کر رہے تھے۔ وہ محسوس کر رہی تھی جیسے اُس کے دل و دماغ پر وزنی ہتھوڑے پڑ رہے ہوں۔ شدت غم سے اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے اور وہ سرتاپا تھرا رہی تھی۔

اُس کی اِس بیمارانہ کیفیت نے، بیمار شامو کو، جو دیر سے سو رہا تھا بیدار کر دیا۔ اُس نے حرکت کئے بغیر آہستگی سے آنکھیں کھولیں۔

"کیا بات ہے سانولی؟" وہ گوپی کو پیار سے سانولی کہا کرتا تھا۔ گوپی چونک پڑی۔ "باپو آگئے" اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"تمہارے باپو کا آنا ضروری" تھا سانولی! تمہارے بغیر اُن کی تیرتھ یاترا ادھوری جو رہ جاتی۔" وہ بدستور لیٹا ہوا تھا۔

"تمہارے باپو سومیرے باپو، مگر یہ تجی کہوں جو بُرا نہ مانو"

وہ خاموش بیٹھی، اُس کے بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"تمہارے باپو آدمی بننے سے پہلے رام بھگت بننا چاہتے ہیں سانولی! تم چُپ چاپ اُن کے سنگ ہولینا۔ میں جانوں! وہ بہت ظالم ہیں، مارتے مارتے دُرگت بنادیں گے تمہاری۔" شامو نے کھڑکی سے صحن کے دروازے کی طرف کروٹ بدلی، گوپی چارپائی کی پٹی سے اپنے بازو کی ٹیک لگائے خاموش بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے بہہ رہے تھے۔ اب اُسے گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ اور گھنٹیوں کے بجنے کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ یکایک لپک کر کھڑکی کے پاس پہنچی۔ اُس نے دیکھا، باہر اُس کے باپو کی گاڑی کو دو سفید بیل راجو اور تیجو لئے کھڑے ہیں

"باپو سچ مچ آگئے" اُس نے بغیر دیکھے ہی شامو سے کہا، اور ایک دم سہم گئی۔ دروازے کے سامنے شامو کی چارپائی کے قریب اُس کے باپو سرخ آنکھیں

کئے کھڑے تھے۔

"ہاں! میں بیچ بیچ آگیا! کون مرگیا ری تیرا، جو رو رو کر آنکھیں لال لال کرلی ہیں چھوری؟" چودھری نے ایک ہی سانس میں کرخت آواز سے کہا۔

گوپی اوڑھنی کے پلّو سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔

"آؤ باپو! گئے" ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" شامو نے بدستور لیٹے ہی لیٹے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا! "سانولی تو تمہارے سنگ جانے کو راضی ہے بھلا! وہ کب سے باٹ تک رہی تھی تمہاری، کہہ رہی تھی آج باپو آرہے ہیں میں ان کے سنگ یاترا کرنے ضرور جاؤں گی" گوپی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی، کہ باپو سے صاف صاف کہہ دے۔۔۔۔۔

"دیکھ رہے ہو باپو! میں ایسے میں تمہارے سنگ کیسے جاسکتی ہوں بھلا! لوٹ جاؤ باپو! جن ہاتھوں سے تم نے میری دینا بسائی ہے انہیں ہاتھوں سے تو نہ اجاڑو! مان جاؤ باپو!

تم اپنے جھوٹے ادھیکار کے بھرم میں میرا جیون تو دکھی نہ کرو! ایسی یاترا سے مجھے کیا لینا ہے، لوٹ جاؤ باپو! میں تمہارے سنگ نہیں جاسکتی ——— میں تمہارے سنگ نہیں جاؤں گی! جاتے کیوں نہیں؟ چلے جاؤ باپو،

گوپی کے سینے میں ایک بھونچال سا اُٹھ رہا تھا۔ وہ انتہائی بے بسی کے عالم میں دم سادھے ساکت و صامت کھڑی سُن رہی تھی۔ شامو کہہ رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ باپو! گھام بہت تیز ہو رہی ہے، دادا بھی کھیت سے آتے ہی ہوں گے۔"

"مجھے کیا لینا ہے دادا سے؟ یاترا سے لوٹ آؤں تو یہ بھی نا مانگے بھیج دیجو! چل ری چھوری! اُس نے گوپی کی کلائی پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ شامو دیکھتا ہی رہ گیا اور اُس کی سانولی اس سے چھین لی گئی۔

باہر گاڑی کے دوڑنے کی کھڑ کھڑاہٹ اور بیلوں کی گھنٹیوں کے بجنے کی زور دار آواز شامو نے سنی، آواز بتدریج مدھم پڑتی گئی سادر بالآخر دور اپہاڑی کی گھاٹیوں میں کہیں گم ہوگئی۔

تیرتھ سے لوٹنے کے بعد آٹھ روز اُسے آٹھ ماہ سے بھی زیادہ طویل محسوس ہو رہے تھے، وہ گھر کے چبوترے پر نیم کی چھاؤں میں، پیڑ کے سہارے بیٹھی شامو کی راہ تکتی رہتی۔ اُس کے باپو کے نام نتھو دادا کا خط آیا تھا۔۔۔۔

"تم نے ایسے میں گوپی کو لیجا کر بہت بُرا کیا چودھری! اب میں جیتے جی تمہاری چوکھٹ پر پاؤں نہیں دھروں گا۔ شامو اب تک بکھار" میں پڑا تاپ رہا ہے، کہہ رہا تھا! دادا میرا جی اچھا ہو جائے تو میں باپو سے نا بھی مانگ کر سانولی کو لے آؤں گا۔

وہ نیم کے سہارے روزانہ بیٹھی، انتظار آمیز نگاہوں سے، اِن پہاڑی پیڑھی ترچھی راہوں کو دیر تک گھورتی رہتی۔ اور پھر یاس ہو کر اپنی ماں کے پاس آبیٹھتی۔ یہاں سے بارہ میل دُور رسانے والی پہاڑی کے پیچھے اس کی سسرال تھی۔ جب وہ اپنی ماں سے کہتی "ماں! چٹھی ڈالی کر اپنے نتھو دادا کا حال چال تو تو لوم" کر لو!" اُس کی ماں آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتی "ایسا مت کہو بیٹا! تمہارے باپو کو ایسی ہاری ہوئی باتیں پسند نہیں، وہ اپنے پیسے کے گھمنڈ میں نتھو دادا ہی کیا۔ کسی کو بھی کچھ نہیں سمجھتے،

"لچھمی پُوجن" نے انہیں بدّھ بھاج" بنا دیا ہے"

گوپی سوچ میں پڑ جاتی، سفر کے دوران میں لکھیا کے ملازم اجیت نے جو جو باتیں اُسے بتائی تھیں، اُن میں اُسے صداقت معلوم ہونے لگتی،

"اجیت باپو" کتنے بدّھی مان ہیں" وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔

"سہر کے بڑے اسکول سے سیکھ کر آئے ہیں۔

جبھی تو لکھیہ جی نے انہیں "لکھتا" بنا دیا ہے، میں کیوں نہ انہیں سے چٹھی لکھوا کر نتھو دادا کے پاس بھیج دوں؟" گوپی نے فیصلہ کر لیا ———

یاترہ کے موقع پر اجیت نے، گوپی اور اُس کی ماں کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھا تھا۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دی تھی، ہر ممکن طریقہ سے گوپی کا غم غلط کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اِس لئے گوپی، اجیت سے اس حد تک تو بے تکلف ہو گئی تھی، کہ اپنے باپو کی چھیوواں چوری، اجیت کو خط لکھنے پر رضامند کر لے۔

ہلکی ہلکی سردی بڑھ رہی تھی۔ جوار، باجرہ وغیرہ کی فصلیں کٹ کٹ کر کھیتوں سے کھلیان میں پہنچ رہی تھیں، گاؤں کی ہماہمی اور رونق بڑھتی جا رہی تھی۔

ایسی ایک شام، گوپی لکھیا کے مکان پر، اجیت کی نشست گاہ میں خط لکھوانے کے لئے پہنچی۔ اجیت کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے حسابات چکا رہا تھا، کوئی ٹیڑھے ترچھے دستخط کرتا، کوئی انگوٹھا لگا دیتا اور روپے پیسے سنبھال کر چلتا بنتا۔ اجیت کے ہونٹوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی اُبھری ہوئی گندمی پیشانی پر بال بکھرے ہوئے تھے۔ زیادہ باتیں بنانا اُس کی عادت تھی، وہ اپنے کام میں دلچسپی لے رہا تھا۔

"آؤ سانولی! بیٹھو!" اُس نے گوپی کو دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ گوپی بھی اخلاقاً مسکراتے ہوئے ایک طرف بیٹھ رہی۔ وہ پہلے کی طرح اپنے

کام میں منہمک ہوگیا۔

"جانکی!"

"اچھا بابو جی!"

"سات روپیہ آٹھ آنے! ——— سنبھال لو ——— لو انگوٹھہ ——— چلو! ٹھیک ہے نا؟"۔

"ہاں بابو جی!"

"دیکھو جانکی! ——— تم بھی لکھنا پڑھنا سیکھ لو!"

"لکھنا پڑھنا! بابو جی؟"

"ہاں پگلے! ہم نے چوپال کے نکڑ پر پکے کمرہ میں رات کا اسکول کھول لیا ہے ———"

"اچھا بابو جی؟"

"ہاں! وہاں یہ دینا بھی تو آتا ہے، اور گاؤں کے آٹھ دس جوان چھوکرے اور پہنچتے ہیں؛ تم بھی آجایا کرو؟"

"بہت اچھا بابو جی! ——— اچھا سلام!"

"سلام"

"سوما"

"لاؤ بابو جی"

"نو روپیہ چار آنے ——— لگا دو انگوٹھہ ——— ہاں! گن لئے نا؟"

"گن لئے بابو جی!"

"اور تم کیا کرتے ہو سوما؟ ——— تم بھی رات کو اسکول پہنچ جایا کرو! اچھا ہے، لکھ پڑھ لوگے تو میری طرح انسان بن جاؤ گے پاگل!"

"اچھا بابو جی! ——— اچھا جے رامجی کی"

"سلام!"

"دینا!"

"لاؤ بابو جی! آج تو بھوت سارے روپئے دیدو!"

"ارے! تمہارے تو سچ مچ بہت سارے روپئے نکلتے ہیں ——— سنبھالو۔ دس روپئے دو آنے ——— بناؤ دستخط، دیکھیں بکیے لکھتے ہو اپنا نام؟ ——— بالکل ٹھیک! جلدی سیکھ جاؤ گے لکھنا پڑھنا"

"بابو جی! مجھے جلدی سے دستخط سکھا دو! کہ وہ لال کتاب پڑھنا آجائے!"

"کونسی دے؟"

"ودیائی بابو جی! جو تم پڑھتے ہو؟ اس پر لال رنگ میں ہتھوڑہ اور درانتی بنی ہوئی ہے"

"اسی لئے تو اتنے پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں پگلے! من لگا کر سیکھو گے تو لال کتاب بھی پڑھنی آجائیگی ——— اچھا۔ اب جاؤ!"

"سلام بابو جی!"

"سلام!"

"لاؤ سانولی! کیا کام لیکر آئی ہو؟" اجیت نے گوپی کو ہاتھ کے اشارہ سے پاس بلاتے ہوئے کہا۔

"چٹھی لکھوانے آئی ہوں اجیت بابو!" گوپی نے جواب دیا اور وہ اجیت کی بائیں طرف سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئی۔

"اچھا تو اپنے شاموکے پاس چٹھی ڈالوگی؟" اجیت نے اس کے چہرہ پر معنی خیز نگاہیں ڈالتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں اجیت بابو! حال چال "نالوم" کرنے ہیں ان کے" گوپی نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا اچھا!" اجیت نے اس کے ہاتھ سے خط لیتے ہوئے کہا۔ اور جلدی سے خط کھکھرا کے پڑھکر سنایا۔ وہ گردن جھکائے خاموش بیٹھی سنتی رہی۔

"پتہ کیا لکھوں؟ ——— شاموولد؟"

"نتھو دادا لکھو!" گوپی نے بتایا۔

"اچھا ——— گاؤں؟"

"میری سسرال یہاں ناگدیں ہے"

"مجھے معلوم ہے، ویسے ہی پوچھا تھا ——— اچھا لو!"

اجیت نے گوپی کو خط دیتے ہوئے کہا

"اور دیکھو! ہمیں چوپال کے پاس والے پٹے میں چھوڑتی چلی جانا"

اجیت نے بھک دار آواز میں کہا۔

"پر بابو کو اس کا بھید "نالوم" مت کرنا اجیت بابو" گوپی نے خط لیتے ہوئے خوف زدہ لہجہ میں کہا۔

"ایسا ہے؟" اجیت نے انتہائی تعجب سے پوچھا۔

"ہاں اجیت بابو، تم تو جانو، بابو کتنے "جالم" ہیں"

"اچھا سانولی! تم فکر مت کرو!"

"تم کتنے اچھے ہو اجیت بابو!" گوپی نے تشکر آمیز لہجہ میں کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جواب ہمیں سے پڑھوانا ہے؟" اجیت نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"بھگوان کرے جلدی آجائے۔" گوپی نے جواب دیا اور چلدی۔

گوپی لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی جا رہی تھی اور اجیت دروازے میں کھڑا اُسے گھور رہا تھا۔

"اُونہہ! بھگوان؟ آج کے انسان کو بھی بھگوان کی ضرورت ہے؟" اجیت نے تمسخرانہ ہنسی ہنستے ہوئے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہا اور اپنی جگہ بیٹھکر کاغذات ٹھیک کرنے میں مصروف ہوگیا۔

گوپی کو خط ڈالے ہوئے آج تین روز ہوگئے تھے۔ اُسے شامو کے جواب کا شدید انتظار تھا۔ وہ اپنے گھر کے چبوترے پر نیم کے نیچے کھڑی ناگد سے آنیوالے ڈاکیے کا انتظار کرتی، اور جب وہ گھنٹی بجاتے ہوئے سائیکل سے گذر جاتا تو وہ مایوس ہو جاتی۔

آج بھی ڈاکیے کے آنے کا وقت ہو چکا تھا، مگر اُسے دُور تک کہیں سائیکل نظر نہیں آرہی تھی۔ اُس کی نظریں لوٹ آئیں۔

معاً اُس نے گھاٹی میں دوڑتی ہوئی گاڑی کی آواز سنی۔

"شامو! ——" اُس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی اور اس کے گول سے چہرہ پر اُمید افزا مسکراہٹ پھیل گئی۔ بیلوں کے گھنگروؤں کی مترنم چھم چھم اُسے فضاؤں میں بکھرتی محسوس ہوئی۔ مگر یہ جلد اُس کے خوبصورت کنول سے چہرہ پر مایوسی چھا گئی۔ گاڑی دندناتی ہوئی اُس کے سامنے سے گذر رہی تھی —— مگر شامو کہاں؟

ساتھ ہی غبار آلود راہ پر ڈاکیہ سائیکل کی گھنٹی کھنکھناتا ہوا اُسے نظر آیا۔ اُس کے چہرہ سے اُمید و یاس کے تاثرات ہویدا تھے۔

"آج تو شامو کی چٹھی ضرور" ہوگی" اُس نے دل ہی دل میں کہا۔

ڈاکیہ اُترا اور اُس نے گوپی کے ہاتھ میں خط دیتے ہوئے کہا: "چودھری کا خط" اور وہ سائیکل پر چڑھکر جلدی جلدی پیڈل گھماتا ہوا چلدیا۔ گوپی نے انتہائی خوشی میں خط کو بھینچ لیا، اور پھر دائیں بائیں دیکھکر اطمینان کی سانس لی۔

"سانولی! مجھے بڑا دُکھ ہوتا ہے جب میں تمہاری حالت پر غور کرتا ہوں۔" اجیت کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں شام کے جھٹپٹے میں چوپال کے نکڑ پر کھڑے تھے۔ گوپی اجیت سے خط پڑھوانے کے لئے گھر سے نکل آئی تھی۔ اجیت کے ہاتھ میں خط تھا اور گوپی خط سننے کے لئے حد درجہ بیقرار نظر آرہی تھی۔

"تم خود سوچو سانولی! تمہارے باپو نے تم پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے، دولت کا سانپ ڈسے بغیر کسی کو نہیں چھوڑتا۔" اجیت نے غم انگیز لہجہ میں کہا۔

"کیا لکھا ہے اجیت بابو اس میں؟" گوپی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"ہاں سانولی! اس میں لکھا ہے، تمہارے شامو کی حالت زیادہ خراب ہے، ہر وقت یاد کرتا ہے تمہاری؟ —— کیا! شامو مر جائے گا تب پہنچو گی سانولی تم؟"

"اجیت بابو ——؟"

"ہاں سانولی! تمہارے شامو نے لکھا ہے جیسے بھی ہو چٹھی دیکھتے ہی چلی آؤ!"

"اب کیا ہونا ہے اجیت بابو؟" گوپی کے الفاظ یاس میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"ہونا کیا ہے! ہمت سے کام لو سانولی!" وہ دانت پیستے ہوئے کہہ رہا تھا! "تم چاہو، تو میں سویرے ہی ہلکی ہلکی دھوپ میں تمہیں شامو کے پاس پہنچا سکتا ہوں" اجیت نے قدرے شانے اُبھارتے ہوئے کہا۔

"تم کتنے بھلے مانس ہو اجیت!" گوپی نے فرطِ عقیدت سے اجیت کا ہاتھ اپنے ہاتھوں سے بھینچتے ہوئے کہا۔

"سوچ لو؟" اجیت نے لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"روچ سوچتی ہوں اجیت بابو! —— میں "راجی" ہوں" گوپی نے فیصلہ کن جواب دیا اُس کے لہجہ میں حرارت تھی۔

"لو!" اجیت نے اُسے خط دیتے ہوئے کہا۔

"اب تم جاؤ —— اور دیکھو؟ آدھی رات کے بعد، جب سارا گاؤں سو رہا ہوگا۔ ہم چھوٹی گاڑی جوت کر چل دیں گے —— مگر تم کچھ دیر پہلے ہی ——" اُس نے سرگوشیوں میں اُسے کچھ سمجھا دیا، اور وہ جلدی جلدی قدم اُٹھاتی ہوئی گھر کی طرف چلدی

تاریک رات سائیں سائیں کرتی بڑھی چلی آرہی تھی۔ ہر سمت گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا رہا تھا۔ سارے گاؤں پر جیسے سیاہ چادر تان دی گئی ہو۔ پیپل کی ٹمٹماتی لیمپ کہیں کہیں ٹمٹما رہے تھے۔ چار دانگ طرف مکمل سکوت طاری تھا۔ کہیں کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سے شب کے سکوت میں خفیف سی حرکت ہو جاتی۔ اور کبھی کبھی کسی بھینس یا بیل کی گردن میں لٹکی ہوئی گھنٹی کی آواز سے، خاموش فضا میں چند لمحوں کے لئے ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ اور پھر مکمل سکوت ——

ایسے میں ایک مختصر سے پکے مکان کے برآمدہ میں ایک انسانی سایہ حرکت کرتا ہوا معلوم ہوا۔ مکان کے ایک کمرہ کا دروازہ آدھ کھلا تھا۔ اور ہلکی سی روشنی باہر نکل رہی تھی۔

"آجاؤ! ——— اندر چلی آؤ! ——— ابھی چلتے ہیں" کمرہ کے اندر سے ایک انتہائی بھیگی ہوئی آواز آئی۔ سایہ کمرہ میں داخل ہوا اور پھر دروازہ بند کرنے کی آواز ہوئی۔

——— سیاہ رات کے دبیز سائے ہلکے ہوتے جا رہے تھے۔ شب کا سکوت ٹوٹتا جا رہا تھا۔ گاؤں کے کچے مکانوں سے کبھی کسی کے کھانسنے اور کبھی برتنوں کے ٹکرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کہیں سے چکی کی گھر گھر کے ساتھ گاؤں کی کسی بہو کی سُریلی آواز فضائے بسیط میں ہلکے ہلکے سنگیت بکھیر رہی تھی۔ بھینسوں کی گردنوں میں بندھی ہوئی موٹی موٹی گھنٹیاں پیہم بج رہی تھیں۔ اور کہیں کہیں دودھ دوہنے کی ترنم ریز صداؤں سے سنسان ماحول میں ایک عجیب کیف برپا ہو رہا تھا۔ اور گوپی کا باپو، اپنے وسیع چبوترے پر پڑے ہوئے مختصر سے ٹین کے سائبان میں، ایک چارپائی پر خراٹے لے رہا تھا۔

"ماں! ——— ماں!" گوپی نے دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹاتے ہوئے آواز دی۔

"کون؟ ——— گوپی؟" اُس کی ماں نے اندر سے پوچھا۔

"ہاں ماں! ——— باہر ٹھنڈ پڑ رہی ہے ——— بھیتر ہی سوؤں گی۔"

گوپی نے مرجھائی ہوئی آواز میں رکتے رکتے کہا۔ اُس کی ماں نے دروازہ کھول دیا اور گوپی اپنا بستر لینے کے لئے مڑی، اُس کے رُوح و تن پر ایک لرزہ طاری تھا۔ اُس نے حواس باختگی کے عالم میں اپنی چارپائی سے بستر اُٹھایا اور ڈھیلے ڈھیلے جسم کے ساتھ دروازہ میں داخل ہو گئی۔ اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جیسے اُسے کسی مُرغ ناگ نے ڈس لیا ہو، اور زہر اُس کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگا ہو۔

سویرے ہلکی ہلکی دھوپ میں، گوپی اپنے چبوترے پر نیم کے پیڑ کے سہارے سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ آج وہ پہلے سے کہیں زیادہ اُداس اور غمگین نظر آ رہی تھی۔ غم کی آگ نے جیسے اُس کے چہرہ کو جھلس کے رکھ دیا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے شامو کے انتظار کی چمک یکسر زائل ہو گئی تھی، اور وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی کسی گہری سوچ میں محو تھی۔

"گوپی آج تجھے کیا ہو گیا ہے ری بٹیا؟" اُس کی ماں نے کہا۔ وہ باورچی خانہ سے اُٹھکر گوپی کے پیچھے، ٹین کے سائبان میں ایک چارپائی پر آ بیٹھی تھی۔

"کچھ نہیں ماں! ——— آج میرا جی گھبرا رہا ہے۔" گوپی نے بغیر دیکھے ہی جواب دیا۔

"کیوں اِتنا گم کر رہی ہے پگلی! ——— شامو آئے گا؟ وہ ضرور آئے گا۔" گوپی کی ماں نے چارپائی سے قدرے جھکتے ہوئے کہا۔

"وہ نہیں آئیں گے ماں! ——— وہ نہیں آئیں گے!" گوپی نے دونوں گھٹنوں پر اپنے سر کو ٹیکتے ہوئے کہا۔

"آئے گا کیسے نہیں!" چودھری نے باہر سے آتے ہوئے بھاری آواز میں کہا گوپی سہم گئی، اور چودھری اُسے چبوترہ کی سیڑھیوں سے گھورتا ہوا۔ اپنی بیوی کے سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"چٹھی آئی ہے باپو!" گوپی نے بدستور بیٹھے ہی بیٹھے کچھ سوچ کر کہا۔

"کہاں ہے چٹھی؟" اُس نے کرخت آواز سے پوچھا۔

"اُسی کھاٹ کے "سریا نے" ——— کل رکھی تھی۔" گوپی نے رکتے رکتے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔ چودھری نے وہیں سے ٹٹول کر خط اٹھایا۔

"آئے گا کیسے نہیں؟" اُس نے خط کو دیکھتے ہوئے غصہ میں کہا۔

"کس سے پڑھوائی تھی یہ چٹھی؟" اُس نے کرخت آواز سے پوچھا۔ گوپی نے کوئی جواب نہیں دیا، اس کی آنکھوں میں جیسے آنسوؤں کا سیلاب اُمنڈ آیا تھا۔ وہ نیم کے سہارے پہلے کی طرح گم سم بیٹھی تھی۔

"کیا لکھا ہے چٹھی میں؟" گوپی کی ماں نے جو وہیں بیٹھی تھی۔ پوچھا۔

"لکھا کیا ہو گا! آج شامو آ رہا ہے بھیج دینا اپنی لاڈلی کو اُس کے سنگ، دونی صورت تو کالی ہو گی یہاں سے؟" چودھری نے اپنی بیوی کے ہاتھ پر خط رکھتے ہوئے۔ ایک ہی سانس میں کہا، اور وہیں چارپائی پر دراز ہو گیا۔

"سچ باپو؟" گوپی کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی، اور اُس کی ماں جلدی سے باورچی خانہ کی طرف لپکی۔ غم کے آنسوؤں کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں مسرت آمیز چمک تیر گئی۔ مگر بہت جلد اُس کے چہرہ پر بدستور اندوہناک تاثرات پھیل گئے۔ وہ بُت بنی دُور پہاڑی راستہ کو دیکھ رہی تھی۔

"اب آ رہے ہو شامو!" اُس کے لبوں کو پھر حرکت ہوئی۔

"اب؟ ——— جبکہ میں اپنی ہی نظروں میں "جلیل" ہو گئی! تمہیں اس سے بہت پہلے آنا تھا شامو!" وہ بدستور پہاڑی کے پیچھے خلاؤں میں گھور رہی تھی۔

عالم صدیقی

بھائی ..... پیسہ!

(ڈرامہ)

افراد :-

ایک فقیر
ایک ترقی پسند
راستہ چلنے والے

منظر

ایک پہاڑی نالا بہہ رہا ہے۔ دونوں طرف بلندی پر آبادی ہے۔ نالے پر ایک چھوٹا سا پل بنا ہوا ہے تاکہ آدمی گزر سکیں۔ ایک طرف ڈھلاؤ پر ایک بوڑھا فقیر بیٹھا ہے۔ منہ سے رال بہہ رہی ہے۔ جب بھی وہ کسی کو آتے دیکھتا ہے پیسے مانگنے لگتا ہے۔

شام کا وقت ہے۔ بارش ہو کر رکی ہے۔ ایراب بھی ہو رہا ہے۔ تیز ہوا چل رہی ہے۔ ڈھلاؤ پر پھسلن ہو رہی ہے ——— ایک ترقی پسند پل پر سے گزر رہا ہے۔

فقیر۔ (اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر) بھائی پیسہ! بھائی پیسہ!!

(فقیر کے قریب آکر ترقی پسند کے قدم رک جاتے ہیں)

فقیر۔ (گھٹنوں کے بل اٹھ کر دونوں ہاتھ پھیلا دیتا ہے) بھائی پیسہ! بھائی پیسہ! . . . . .

ترقی پسند۔ بات سنو!... میں ترقی پسند ہوں..... جانتے ہو ترقی پسند کسے کہتے ہیں؟

فقیر۔ (اسی انداز میں) بھائی پیسہ! بھائی پیسہ!!

ترقی پسند۔ ارے سنو تو سہی، میں تمہیں لاکھوں روپوں کی بات بتاتا ہوں ..... تم نہیں جانتے ترقی پسند کسے کہتے ہیں؟ خیر یہ میں پھر بتاؤں گا۔ مطلب میرے کہنے کا یہ ہے کہ ہم نے تم لوگوں کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ اور کر رہے ہیں۔

فقیر۔ (چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ترقی پسند کی کارگذاری سے مطمئن نہیں) بھائی پیسے.....

ترقی پسند۔ (بات کاٹ کر ذرا سختی سے) بات سنو! (فقیر سہم جاتا ہے اپنی جگہ بیٹھکر اس کا منہ تکنے لگتا ہے) ترقی پسندی کی تحریک زیادہ تر تم ہی لوگوں کی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔ فرصت نہ ملنے پر بھی ہمیں تم لوگوں کی خاطر کچھ نہ کچھ وقت نکالنا ہی پڑتا ہے۔ تمام دن پیٹ کے دھندے میں لگے رہتے ہیں شام کو تھکے ہارے آتے ہیں اور رات گئے تک جاگ کر نظمیں اور افسانے لکھتے ہیں۔ راتوں کی تاریکی میں ہم لوگ سماج کے گلے سڑے، رستے ہوئے ناسوروں کو بے نقاب کرتے ہیں۔

فقیر۔ بھائی پیسہ! بھائی پیسہ!!....

ترقی پسند۔ (ان سنی کر کے بیان جاری رکھتا ہے) ——— چھٹی کے دن بھی ہم لوگ آرام نہیں کرتے۔ "انجمن ترقی پسند مصنفین" کے جلسے میں شرکت کرتے ہیں۔ اپنی اپنی تحریریں (ہفتے بھر کی محنت) سناتے ہیں۔ پھر ان پر تنقید ہوتی ہے۔ (فقیر اس کا منہ تک رہا ہے) ——— تنقید! ——— تم نہیں جانتے ..... یہ ایک بہت کڑوی دوا ہوتی ہے۔

(اتنے میں کچھ لوگ پل پر سے گزرتے ہوئے آتے ہیں)

فقیر۔ (ان کی طرف رجوع ہو کر) بھائی پیسہ! بھائی پیسہ!!

ترقی پسند۔ ..... لیکن تم لوگوں کی خاطر یہ تلخ گولیاں بھی نگلنی پڑتی ہیں۔ ..... پھر بھی تم ہم لوگوں سے پیسے مانگتے ہو۔ بڑے شرم کی بات ہے۔ اب تمہیں بھی ترقی کرنی چاہئے۔

(لوگ انہیں دیکھکر مسکراتے ہوئے گذر جاتے ہیں)

فقیر۔ (لوگوں سے نا اُمید ہو کر پھر ترقی پسند کی طرف رُخ کرتا ہے) بھائی پیسہ! بھائی پے . . . .

ترقی پسند۔ صرف یہی نہیں۔ تم لوگوں کے اُوپر ہزار ہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

(فقیر اُوپر کی طرف دیکھتا ہے۔ جہاں اُسے ایک بھی کتاب نظر نہیں آتی)

ان صفحات میں تمہیں سماج کے سڑے ہوئے زخموں کا مواد ملے گا۔ اِن آئینوں میں تمہیں اپنی زندگی کا عکس، اپنی پھٹی پُرانی گدڑیاں نظر آئیں گی۔

(فقیر جھک کر اپنی گدڑی کو دیکھتا ہے) ہاں یہی رال میں سنی ہوئی گدڑیاں۔

(فقیر اپنی گدڑی میں کوئی خاص بات نہ پا کر نیچے کا ہونٹ لٹکا دیتا ہے۔ جس سے رال ٹپکنے لگتی ہے) یہ کچھ لکھ کر لوگوں نے تمہیں بھی مشہور کیا ہے۔ اور خود بھی مشہور ہوئے ہیں ——— اپنی قدر کو پہچانو تم تو ادب پر چھائے ہوئے ہو۔ ادب میں زندگی ہے اور زندگی میں تم ہو۔ گو تمہارے اندر زندگی کے آثار تک نہیں پائے جاتے . . . . . ہاں تو لوگوں نے کتابیں لکھ کر تمہیں بھی مشہور کیا ہے اور خود بھی مشہور ہوئے ہیں . . . . . افسوس میں ابھی مشہور نہیں ہو سکا۔ حالانکہ میں بھی ترقی پسند ہوں . . . . تم تو فقیر ہو دعا کرو کہ میں بھی جلدی سے مشہور ہو جاؤں پھر میری کتابیں بھی ہاتھوں ہاتھ بک جایا کریں گی۔ آہ وہ کتنا سُہانا وقت ہوگا، وہ لمحات کتنے حسین ہوں گے . . . کیسا سُندر سپنا ہے یہ . . . . . مگر کہاں . . . . . لیکن . . . . . خدا! . . . . نہیں نہیں . . . . اگر تمہارا خدا: حائیں قبول کر لیا کرتا تو آج تم فقیر کیوں ہوتے اور میں ترقی پسند کیوں ہوتا۔

فقیر۔ (اُکتا کر) بھائی پیسہ!

ترقی پسند۔ ہاں اچھے وقت پر یاد آیا۔ میرے ایک افسانے کا خاتمہ سنو ——

"اور پھر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ابوالفضل علامی جوانی زندگی میں دن رات میں چودہ سیر کھانا کھا جاتا تھا ——— دیکھا تم نے؟ جو ——— وہ ——— سیر ——— ہاں ——— وہی ابوالفضل جو اکبر کے دربار میں تھا ——— وہی اکبر جو ایک سرمایہ پرست بادشاہ تھا ——— ہاں تو ——— جیسے ابوالفضل کی رُوح چیخ چیخ کر، پکار پکار کر، چلا چلا کر، دہاڑ دہاڑ کر، گڑگڑا گڑگڑا کر (جوش میں آواز بلند ہو جاتی ہے اور فقیر سہم جاتا ہے) کہہ رہی ہو . . . . ایک نوالہ . . . . اللہ کی راہ میں . . . . بس ایک نوالہ" ——— دیکھا تم نے کتنا شاندار اختتام ہے، یہ تمہارے جذبات کی بالکل صحیح ترجمانی کر رہا ہے۔ کیوں؟ ٹھیک ہے نا!

فقیر۔ (بدحواس ہو کر اسے دیکھتا ہے کہ یہ کیا بکواس کر رہا ہے) بھائی پیسہ!

ترقی پسند۔ (افسانہ ختم لیکن بیان جاری ہے) آزاد نظم بھی اسی آسانی کی وجہ سے ایجاد کی گئی ہے تاکہ انسانی محبت جیسے نازک احساسات آزادی کے ساتھ الفاظ میں لائے جا سکیں ——— ہم نے ہر جگہ محبت کو عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ آج کل تقریباً ہر فلم کا موضوع الٹ پلٹ کر یہی ہوتا ہے۔ اس سے ہماری نوابی زندگی کی وسعتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان فلموں کو جا کر دیکھو تو پتہ چلے یہاں بیٹھے بیٹھے تم کیا اندازہ لگا سکتے ہو۔

(اتنے میں کچھ اور لوگ پُل پر آتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فقیر ترقی پسند سے اُکتا کر ان کی طرف متوقع نظروں سے دیکھنے لگتا ہے)

ترقی پسند۔ (ناصحانہ پیرایہ اختیار کر لیتا ہے) کسی کی طرف مت دیکھو۔ کہیں تمہاری نظر کی تاثیر نہ مر جائے۔ اسے حقیر نہ ہونے دو . . . . کوئی کسی کا نہیں . . . . یہ دنیا ہے۔

فقیر۔ (لوگوں کو دیکھ کر ان کی طرف فریاد بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ جیسے ترقی پسند کے ہاتھوں اس پر ظلم ہو رہا ہو) بھائی پیسہ! بھائی پیسہ!!

ترقی پسند۔ (تقریر جاری ہے) تم لوگ کیا اندازہ لگا سکتے ہو جو جو قربانیاں ہم نے تمہارے لئے دی ہیں ——— حتیٰ کہ محبت کی قربانی بھی ——— آہ ——— محبت ——— تم کیا جانو! ——— محبت ——— جو تخلیق کا باعث ہے ——— ان گدڑیوں میں لپٹی ہوئی سسکتی ہوئی لاشوں کی خاطر شاعر کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

(لوگ مسکراتے ہوئے گزرتے ہیں)

فقیر۔ (گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر دونوں ہاتھ پھیلا دیتا ہے) بھائی پیسہ! بھائی پیسہ!!

ایک۔ مشاعرہ ہو رہا ہے۔

دوسرا۔ ہاں، فقنا بھی شاعرانہ ہے۔

تیسرا۔ اور سامع بھی ادب نواز ہے۔

(طنز کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں)

فقیر۔ (بیٹھتے ہوئے، پکارتا رہ جاتا ہے) بھائی پیسہ! بھائی پیسہ!!

(لوگ سنبھل سنبھل کر اُوپر چڑھنے لگتے ہیں)

فقیر۔ (ناچار ہو کر ترقی پسند سے) بھائی پیسہ! بھائی . . . . .

ترقی پسند۔ (یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ تم مجھے بھائی کہہ کر پکار رہے ہو۔ ہم ایسا ہی نظام چاہتے ہیں جس میں سب برابر کے بھائی ہوں کوئی چھوٹا بڑا نہ ہو۔

اس گندے سماج میں کوئی کسی کا بھائی نہیں۔ مگر ہاں ۔ ۔ ۔ ہنہ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پیسے کے سب بھائی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ پیسے والے کے سب بھائی ہیں۔ پیسہ کسی کا بھائی نہیں، پیسے والا کسی کا بھائی نہیں ۔ ۔ ۔ لیکن ہم اور تم بھائی بھائی ہیں۔ تم بھکاری ہو۔ ہم بھی بھکاری ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم مانگتے نہیں جانتے۔

فقیر۔ مانگنے کا سلیقہ نہ جاننے پر کچھ شرمندہ سا ہو جاتا ہے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر گڑگڑاتا ہے) بھائی پیسہ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ترقی پسند۔ (فلسفیانہ انداز میں) ہاتھ مت پھیلاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنا حق لو مگر عزت کے ساتھ ـــــ کتوں کی طرح نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ آہ مجھے کتنی شرم آتی ہے۔ جب تم کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم نے دیکھا یہ لوگ کتنی بے پروائی سے تمہارے قریب سے گذر گئے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر ہمدردی کرنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ مگر نہیں، ہم ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ ہم دنیا کی اصلاح کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

فقیر۔ (ایسے انداز میں گویا کہہ رہا ہو کیوں بہکا کر ٹالتے ہو) ۔ بھائی پیسہ!

ترقی پسند۔ آہ، ارے یہ تو میں تمہیں ایک زرّین خزانہ بخش رہا ہوں۔ ان موتیوں کو سنبھال کر رکھو۔ کھو مت دینا۔ یہ وہ جواہر ہیں جو تمہیں قارون کے خزانے میں بھی نہیں ملیں گے۔

فقیر۔ (گویا کچھ کچھ بات سمجھ گیا ہے، اپنی گدڑی سمیٹتا ہے اور اپنے جسم سے لپیٹ لیتا ہے) بھائی پیسہ!

ترقی پسند۔ (اس کے کپڑوں کو غور سے دیکھکر ذرا درشتی کے ساتھ) دیکھو تمہارے کپڑے کس قدر میلے ہو گئے ہیں۔ بہتے پانی کے پاس بیٹھے ہو۔ اور پھر بھی اتنے غلیظ کپڑے؟ یہاں سینکڑوں دھوبی کپڑے دھوتے ہیں۔ خود نہیں تو کم از کم ان میں سے کسی سے دھلوا لئے ہوتے۔ یہاں بیٹھکر پیسے مانگنے کے بجائے اگر ان میں سے کسی کو کچھ پیسے دے کر کہتے کہ بھائی کوئی مجھ غریب کے کپڑے دھو دو تو کیا وہ نہ دھوتے؟ ـــــ تم تو روز خاصے پیسے جمع کر لیتے ہو گے! (مسکراتا ہے)

فقیر۔ (خوشامدی) بھائی پیسہ!

ترقی پسند۔ (وعظ ابھی ختم نہیں ہوا) افسوس۔ تمہیں دنیا کا کوئی فن نہیں آتا۔ جو شخص وقت کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔ وہ زندگی کے طوفان میں بہہ جائے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے یہ تنکے پانی میں بہہ رہے ہیں ـــــ ـــــ صاف ستھرے رہا کرو، آزاد تو میں نفاست پسند ہوا کرتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ ٹھیک ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے موضوع تمہاری یہ میلی کچیلی گدڑیاں ہی تو ہیں۔ اگر ان میں میل نہ ہوتا تو ہماری تحریروں میں یہ اثر اور یہ درد کہاں سے آتا ۔ ۔ ۔ ۔ اگر یہ پھٹی ہوئی نہ ہوتیں تو ان میں سے سماج کے رستے ہوئے ناسور کس طرح نظر آتے۔ ان گندی گدڑیوں کی بدولت ہی تو ادب پر بہار آئی ہے۔

(ننھی ننھی بوندیں پڑنے لگتی ہیں)

فقیر۔ (اس کی شکایت اسی سے کرتے ہوئے) بھائی پیسہ!

ترقی پسند۔ (آسمان کی طرف دیکھکر) اوہ، بارش آ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیر کچھ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ لو اب جلدی سے ایک آدھ بات اور سن لو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم نے دنیا کے سامنے ایک نیا دستور پیش کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ایک بدلتی ہوئی ایک دھڑکتی ہوئی، ایک انقلابی زندگی کا دستور ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن تم لوگوں کو دیکھکر افسوس ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تم وہی لکیر کے فقیر ہے۔

(بارش ذرا تیز ہو جاتی ہے)

فقیر۔ (یہ دیکھکر کہ وہ بغیر کچھ دیئے کھسکنے کو ہے، آخری کوشش کرتا ہے) بھائی پیسہ!

ترقی پسند۔ (چلتے ہوئے) برا مت ماننا ۔ ۔ ۔ میں احسان نہیں جتا رہا ہوں یہ سب کچھ مجھے مجبوراً کہنا پڑا۔ اس لئے کہ تم مجھ سے بار بار پیسہ مانگتے ہو اور میں شرماتا ہوں۔

(آگے بڑھ جاتا ہے اور بلندی پر چڑھنے لگتا ہے)

فقیر۔ (جیسے کسی کی قبر پیٹ رہا ہو) بھائی پیسہ! بھائی پیسہ!! بھائی پیسہ!!!

ترقی پسند۔ (مڑکر) بارش تیز ہوتی جا رہی ہے۔ اٹھو تم بھی جاؤ ـــــ نہیں تو ـــــ (ترقی پسند کا کریپ کا جوتا پھسلتا ہے اور وہ دھڑام سے گرتا ہے)

فقیر۔ (باآواز بلند) بھائی پیسہ! بھائی پیسہ!!

ترقی پسند۔ (کیچڑ میں لت پت کوٹ کو سہلاتا ہوا مڑکر فقیر کی طرف دیکھتا ہے) تم تو کہیں کریپ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا ٹھیک ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اور بھی عمدہ بات ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ننگے پاؤں رہنے میں بہت فائدہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ آدمی بارش میں بھی آسانی سے نہیں پھسلتا۔

(آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگتا ہے)

فقیر۔ (اپنے آنے والوں کی راہ دیکھ رہا ہے) بھائی پیسہ!

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھائی پیسہ!! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(پردہ)

اسلامی نظامِ حیات کا داعی

ماہنامہ **زندگی** رام پور

- صحیح اسلامی زندگی کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔
- موجودہ انسانی اُلجھنوں کے کامیاب حل کی نشان دہی کرتا ہے۔
- تفسیر القرآن کے مستقل عنوان کے تحت عام فہم قرآن کی تفسیر پیش کرتا ہے۔

سالانہ چندہ ——— پانچ روپئے ——— فی پرچہ ——— آٹھ آنہ ———

ایجنٹ حضرات شرائط ایجنسی طلب کریں

پاکستان میں ترسیلِ زر کا پتہ :۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ۔ لاہور

مینیجر ماہنامہ "زندگی" رامپور (یو۔پی)

اگر ——— آپ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں امن و سلامتی کا دور دورہ ہو۔
اگر ——— آپ یہ چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالیں۔
اگر ——— آپ یہ چاہتے ہیں کہ پاکیزہ افسانوں سے روح میں سرور پیدا کریں۔
اگر ——— آپ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے کردار کی اصلاح کریں۔
تو ——— دین کے داعی حق کے پیامی اور صحت مند ادب کے حامی

ماہنامہ **الکلام** بمبئی ۲۰
(باندرہ)

کا پابندی سے مطالعہ فرمایئے

جو ہند اور بیرون ہند وقت کی پابندی کے ساتھ ملک کے بہترین اہلِ قلم اور دینی بصیرت رکھنے والے صاحب علم و فضل کے تعاون سے دینی۔ علمی۔ تاریخی مضامین۔ ادبی مقالات۔ پاکیزہ نظمیں۔ روح پرور نعتیں۔ اصلاحی افسانے اور سیاسیات حاضرہ پر تنقیدی مضامین پیش کرتا ہے

ابو المجاہد زاہد کا شعری کارنامہ
"تگ و تاز" کی حسین و جمیل شکل میں

تگ و تاز

زاہد کا فن بڑی تیزی سے ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ "تگ و تاز" اس نوجوان فن کار کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ زاہد کی شاعری برائے شاعری نہیں، وہ دکھی اور مجروح انسانیت کے لئے ایک پیام ہے۔

——— ایک آفاقی پیام۔ زاہد کی شاعری ایک آئینہ ہے۔ جس میں آج کا آوارہ اور بھٹکا ہوا انسان اپنا صحیح عکس دیکھ سکتا ہے۔ زاہد سماج کے رستے ہوئے زخموں کی نمائش پر ہی اکتفا نہیں کرتا ان کا مداوا بھی پیش کرتا ہے۔

تگ و تاز میں اس احساس اور بیدار دل شاعر کی حیات افروز نظمیں اور پاکیزہ غزلیں شامل ہیں۔

بہت جلد شائع ہو رہا ہے

معیار میں پیش کئے ہوئے دو سال کے افسانوں کا
بہترین انتخاب

اُبھرتی کرنیں

(زیر طبع)

مرتبہ ——— نجم الاسلام
قیمت ——— دو روپے آٹھ آنے

نئے تعمیری رجحانات کا افسانوی ادب میں گراں قدر اضافہ، اس کے مطالعہ کے بغیر آپ کا ادبی ذوق موجودہ دور کے ایک نئے بڑھتے ہوئے افسانوی رجحان سے بیگانہ رہے گا۔ "اُبھرتی کرنیں" محمود فاروقی، اسعد گیلانی، پروفیسر عاصی ضیائی، ابن فرید، منظر حسین انصاری وغیرہ کی بہترین نگارشات لئے ہوئے ہے۔ اور مرتب کے قلم سے ایک تعارف بھی شامل ہے۔ جس میں تعمیری ادب، تعمیری ادب کی تحریک اور نئے تعمیر پسند افسانوی رجحانات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ناشر
مکتبہ "معیار" میرٹھ

(محمد احمد ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے کمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "معیار" خندق اسٹریٹ شہر میرٹھ سے شائع کیا)

صحت منداور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

جلد ۳ ، شمارہ ۳

مارچ ۱۹۵۳ء

معیار

ترتیب دینے والے

اصغر علی عابدی

نجم الاسلام

ہیڈ آفس:- خندق اسٹریٹ میرٹھ شہر

سب آفس:- محلہ کشن گنج دہلی ۶

تعاون

سالانہ پانچ روپے

ششماہی تین روپے

مضامین - خط و کتابت - ترسیل زر - تبادلہ جرائد کیلئے ہیڈ آفس

ترسیل زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب - فیملی لائن - جیکب آباد

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے (۸)

ترتیب

نقشِ اوّل ..... نجم الاسلام ۳

نظمیں

سعیِ ناکام — فاروق بالنپاری ۵
امروز — شمیم جاوید ۶
اجنتا سے آگے — تنویر احمد علوی ۷
دھرتی کے انسان — سعید عقاب ۹
اِسی دھرتی پر — انور جمیل ۱۰
طلوعِ سحر — متین طارق ۱۱
رباعیات — شفا گوالیاری ۱۲

مقالے

شفیق جونپوری کی شاعری "فانوس" کی روشنی میں — ابو المجاہد زاہد ۱۳
فانی ــــ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں — وحید الدین خاں ۱۹
صالح ادب کی نفسیاتی بنیادیں — معز علی بیگ ۲۴

غزلیں

غزل — سید امین اشرف ۲۷
" — الم مظفر نگری ۲۸
" — انجم رہبر پوری ۲۹
" — عروج زیدی ۳۰
" — عبد المجید حیرت ۔ عروج قادری ۳۱
" — عمیق ۔ ایم ۔ اے ۔ بشیر اثر مالیگانوی ۳۲

افسانے اور خاکے

نظرِ ثانی — ابن احمد ۳۳
سرکار کی خدمت میں — منظر حسین ۳۴
دھوبی کے بعد — ابن فرید ۔ بی ۔ اے ۳۹
انگارے — شکر نقوی ۴۴
لہنیں اور بیویاں — عابد الانصاری ۴۶
روبان کی تلاش — آغا ناصر ۴۸
میں بھی اُن سے ملا ہوں — مقبت الحسن رضوی ۵۱

خیال اپنا اپنا

لوح و قلم ــــ سائیکولوجی ــــ کالے قوانین ــــ ع ۔ م ۵۲

نقشِ اوّل

آج کی صحبت میں ہم ادبیات کے اساسی ارکانِ ثلاثہ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

وہ اساسی ارکانِ ثلاثہ کیا ہیں؟ فکر ــــ فن ــــ اور تنقید۔ انہی کے امتزاج و توافق سے ادبیات کی حسین عمارت بنتی ہے۔ انہی کی صحت و پائداری ادب کی تعمیر کی کامیابی پر منحصر ہوتی ہے اور انہی کی ادنیٰ سی کجی اور ناپختگی عمارت کو کمزور اور کج بھی بنا دیتی ہے۔

سلسلۂ کلام کے ہر مرحلہ آگے سے پہلے مناسب ہوگا۔ اگر اصطلاحات کے پردوں کو اٹھا کر فکر، فن اور تنقید کے لازمی بنیادی مفہومات کا اجمالی تعارف کرا دیا جائے۔ تاکہ آگے چل کر جب بحث و نظر کسی فیصلہ کن مقام پر پہنچے اور کوئی نتیجہ خیز بات سامنے آنے والی ہو تو اصطلاحات کے اندرون و بیرون کی دورنگی آڑے نہ آئے۔

اس لئے پہلے ہی قدم پر یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ فکر نام ہے زندگی کی مختلف قدروں کو جاننے پہچاننے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی کرنے اور ان دونوں کے نکات و معلومات کو زندگی کے رواں دواں عناصر سے ہم آہنگ کرنے کا ــــ تاکہ علم و آگہی کی روشنی سے عمل کی راہیں جگمگا اٹھیں۔

فن نام ہوتا ہے حسنِ تناسب کے اُس انداز صورت گری کا جس میں ڈھل کر فکر کو ایک ایسا پیکر جمیل مل جاتا ہے جس سے انسان کا وہ فطری جذبہ متاثر ہوتا ہے جو جمالیاتی ذوق یا جمالیاتی حس کی صورت میں اس کی زندگی کے جذباتی پہلوؤں سے مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے ــــ تاکہ علم و آگہی۔ اور فکر کی روشنی سے جہاں عمل کی راہیں جگمگاتی ہیں وہاں جذبات کی دنیا میں بھی انقلاب آ سکے۔

اور تنقید کہتے ہیں قدروں کے مختلف پہلوؤں کو حقیقت کی کسوٹی پر کسنے اور زندگی کے مختلف مسائل اور مراحل کو فکر و فن کی روشنی میں جانچنے پرکھنے کو ــــ تاکہ فکر و فن کے جمیل پیکروں میں بدنمائی اور حسن، افادیت اور مضرت کا اندازہ لگایا جا سکے جو زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور فکر و فن میں کوئی ایسی کمی نہ رہ جائے جو دونوں میں سے کسی کی قدر کو گھٹاتی ہو۔ یا کوئی ایسا عنصر داخل نہ ہونے پائے جو زندگی کے تعمیری اور ارتقا پذیر عناصر سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ تاکہ رچرڈس کے الفاظ میں ذہنی صحت کا معیار قائم ہو سکے۔

چند لفظوں کے لئے اُن لوگوں کو نظر انداز کر دیجئے جو آج بھی جبکہ ادب کا زندگی سے تعلق مسلّم ہو چکا ہے یہ کہتے ہیں کہ ادب کی تعمیر کے لئے فکری عنصر ضروری نہیں یا اس کو اساسی اہمیت حاصل نہیں یا ادب کا مقصد قدروں کی اشاعت نہیں اور نہ اسے زندگی کے کام کی اچھائی برائی سے کام ہے۔

آیئے آگے بڑھکر ادب کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیں کہ ہر جہاں وہ کسی نہ کسی نہج پر زندگی ہی کی تعمیر کرتا ہے اور اس کی تہ میں کچھ تدریت ضرور ہوتی ہیں۔ اس کے بعد آسانی سے ہم سمجھ سکیں گے کہ

۱ــــ اپنے موضوع یعنی ادبیات کے حدود کو سامنے رکھتے ہوئے فکر، فن اور تنقید کسے کہتے ہیں؟ ان میں آپس میں کیا ربط ضبط ہوتا ہے؟ ادبیات میں ان کی کیا اہمیت ہے اور ادب کی تعمیر میں ان کا الگ الگ کیا حصہ ہوتا ہے؟

۲ــــ مفکر۔ فن کار اور نقاد کون ہوتے ہیں؟ ان کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہوتا ہے اور ان میں کیا فرق ہوتا ہے؟ وہ ایک دوسرے سے کیا حاصل کرتے ہیں اور ان کے اثرات ادب میں کس صورت میں ظاہر ہوتے ہیں؟

ان سوالات کے جوابات سے یہ بات صاف ہو کر سامنے آ جائے گی کہ فکر، فن اور تنقید اور مفکر۔ فن کار اور نقاد کا ادبیات میں کیا مقام ہوتا ہے۔ یہی ادبیات کی بنیادیں ہیں اور یہی اس کے معمار۔

ان سوالات کو بحث و نظر کے نکات قرار دیتے ہوئے اس بات کی شدید ضرورت ہے کون انکار کرسکتا ہے کہ صرف "دیکھنے کی چیز" کو دیکھا بجائے بلکہ "دیکھنے والوں کی نظر" کو بھی دیکھا جائے۔ اس جملہ کی تشریح یوں سمجھئے کہ ایک ہی چیز کو مختلف نگاہیں مختلف زاویوں سے دیکھتی ہیں۔ ایک ہی بات پر مختلف ذہن مختلف جذبات کے تحت سوچتے ہیں۔ ایک ہی شے مختلف اثرات مختلف آدمیوں پر چھوڑ جاتی ہے۔ اس اختلاف کا سبب کھلے طور سے اُن زاویوں اور جذبات پر رہی آتا ہے۔ تو اس صورت میں کیا اُن مختلف زاویوں اور مختلف جذبات کی توضیح، تحلیل اور ان کا تجزیہ کئے بغیر ہم اجتماعیات میں انفرادیت کی غیر ضروری رنگ آمیزی سے بچ سکتے ہیں؟ غالباً کبھی نہیں۔ اس لئے پیشتر ہی کچھ باتوں کو طے کر لینا چاہئے اور کچھ باتوں کی وضاحت ہو جانی چاہئے۔ یہاں ہم صرف دو باتوں کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

ایک ——— مسائل کا تاریخی تجزیہ اور تعمیری تنقید کلاسیکل ادب کو سامنے رکھتے ہوئے۔

اور دوسرے ——— بحث کے نتائج کی تحقیق و ترتیب اُن بنیادی مفہوماتِ مسلّمات کی روشنی میں جو فکر، فن اور تنقید کی تشریح و استقرار کے ضمن میں تسلیم کئے جائیں۔

کلاسیکل ادب کو سامنے رکھتے ہوئے مسائل کا تاریخی تجزیہ کرنے سے ہماری مراد یہ ہے کہ ادبیات میں چاہے وہ تکوینی ادبیات ہو یا غیر تکوینی۔ اب تک جو اتار چڑھاؤ آتے رہے ہیں اور جس جس طرح ایک زبان کا ادب دوسری زبانوں کے ادب کے فکری عناصر یا فنی و تنقیدی شعور سے اثر قبول کرتا رہا ہے۔ ان کے تاریخی تجربات کو اس طرح نکھار کر سامنے رکھا جائے کہ اس سے استفادہ ممکن ہو اور تعمیری تنقید سے مراد تاریخی تجربات کی وہ چھان بین ہے جس سے کسی تجربے کے غلط اور صحیح ہونے کا اندازہ لگایا جاسکے کہ آیا وہ زندگی کی صحت مند اور اعلیٰ قدروں سے ہم آہنگی رکھتا بھی نہیں اس میں توافق ہے یا تضاد، اور وہ ادب کو ایسے راستہ پر لے جاتا ہے جس سے زندگی کی تعمیر ہوتی ہے یا ایسے راستہ پر لے جاتا ہے جس سے زندگی کی تخریب ہوتی ہے۔

تعمیری تنقید کے مرحلہ پر ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ نہ تو ہم قدیم سرمایۂ تنقید کی طرف سے آنکھیں بند کر کے کسی صحیح نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں اور نہ اس کو من و عن تسلیم کر کے صحیح نتیجہ پر پہونچنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جبکہ زندگی کے جملہ پہلو اور اس کی تمام بنیادی قدریں ہر لمحہ اور ہر موڑ پر آفتاب کی طرح روشنی دکھاتی ہوں اور فکری عناصر الجھاؤ سے پاک ہوں۔ اور یہ ممکن ہو کہ قدیم و جدید ہر چیز کو زندگی کی اعلیٰ اور اٹل قدروں کے معیار پر جانچ کر اچھی اور بُری چیزیں الگ الگ کی جاسکیں۔

رومانی تنقید کے علمبردار اور مارکسی تنقید کے پیرو اب سے بہت پہلے اسی مقام پر ٹھوکر کھا کر بھٹک چکے ہیں۔ دونوں انتہا پسند ہیں اور ڈور کا سرا ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کے الجھاؤ میں جا پھنسے ہیں۔ جزئیات پسندی کی شدت پر ان کے یہاں اکثر زندگی کو کل کی حیثیت سے دیکھنے والی وسعتِ نظری قربان ہو جاتی ہے۔ وہ ذرّوں کی چمک سے تو متاثر ہو جاتے ہیں لیکن آفتاب کی روشنی کو جھٹلاتے ہیں۔ اور کچھ ضمنی قدروں کو بنیادی قدریں سمجھ کر یا اہم اور غیر اہم کی تمیز اٹھا کر خود ادب کے مقصد ہی سے اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ زندگی کی دوسری قدروں کا خیال تک ذہنوں سے محو ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہم نے اوپر تنقید کو تعمیری تنقید کہہ کر یہ واضح کرنا چاہا ہے کہ تاریخی تجربات کی چھان بین میں نظر کے سامنے ایک بلند اور صحت مند تصورِ حیات اور زندگی بخش قدروں کی کسوٹی ضرور رہے۔

اب رہی دوسری بات یعنی بحث کے نتائج کی تحقیق و ترتیب ان بنیادی باتوں کی روشنی میں کرنا جن کو فکر، فن اور تنقید کی تشریح کے ضمن میں تسلیم کیا گیا ہو۔ اس سلسلے میں اُن تمام باتوں کو اچھی طرح جان لینا ہوگا جو ادب کی تخلیق اور اس کی ماہیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ زندگی کو دیکھنے میں ہمارا نقطۂ نظر کیا رہتا ہے۔ کیا ہم اسے ایک مقدس فریضہ سمجھتے ہیں، یا کھیل سمجھ کر یونہی گذر جانا چاہتے ہیں۔ اگر ہم اسے ایک مقدس فریضہ نہیں سمجھتے تو ظاہر ہے کہ ہمارے طرزِ فکر میں وہی خامیاں اُبھر آئیں گی جو پہلے اُبھرتی رہی ہیں۔ ہم اندھی روایت پسندی کو روکنا چاہیں گے لیکن خود اندھی عقلیت پسندی کے گڑھوں میں جا گریں گے۔ جمود کا پردہ چاک کرنا چاہیں گے۔ مگر سستی جذباتیت اور سطحی جوش کا اندھا طوفان ہمارے سروں پر سوار ہو جائے گا۔ غلط اور نام نہاد مذہبیت سے دل اُچاٹ ہو جائیں گے لیکن ایک طرح کی غلط اور نام نہاد ترقی پسندی کا جہل تصور دل و دماغ پر قبضہ جمائے گا۔ پھر ادب کے سارے منصوبے سارے مقاصد ساری تدبیریں خاک میں مل جائیں گی۔ نہ تہذیبی عنصر کو کوئی فائدہ پہونچے گا نہ جذباتی عنصر میں سنوار اور بناؤ آسکے گا۔ اجتماعی پہلو

ملاحظہ فرمایئے ص ۱۸

فاروق بالنپاری

سعیٔ ناکام

اللہ رے شعورِ تمدن کا جزر و مد
گرداب اضطراب میں انسان آگیا
اِک مستقل عذاب بنامِ ربوبیت
بہرِ مدد بصورتِ سلطان آگیا
ناکامیوں کے فیض سے لیکن مآلِ کار
چشمِ فریب خوردہ پہ ایمان آگیا
اصنامِ قیصری کی پرستش کے ساتھ ساتھ
دل میں بغاوتوں کا بھی طوفان آگیا

تخلیق کی طلب نے اِک ایسے نظام کی
جس میں بہ حدِّ خاص جگہ تھی عوام کی

مشروطیت کے سائے کا یہ دَور بھی مگر
امن و اماں کے خواب دکھا کر چلا گیا
طوفانِ تیرگی میں سرِ راہِ زندگی
بجھتا سا اِک چراغ جلا کر چلا گیا
آسانیوں کے نام پہ راہِ حیات میں
دشواریاں کچھ اور بڑھا کر چلا گیا
اِک تازہ انقلاب کی خاطر مگر ضرور
ٹھوکر دماغ و دل پہ لگا کر چلا گیا

فکرِ سکوں تھی "عالمِ خانہ بدوش" کو
جمہوریت کا نشّہ چڑھا اہلِ ہوش کو

تاریخ کہہ رہی ہے یہ اقدام بھی مگر
انسانیت کے درد کا درماں نہ ہو سکا
محلوں کے واسطے تو ستارے تک آ گئے
مفلس کی جھونپڑی میں چراغاں نہ ہو سکا
دنیا میں آدمی بہزاراں عروجِ فہم
سب کچھ تو ہو سکا مگر انساں نہ ہو سکا
مغرب کے خار رشکِ گل و لالہ بن گئے
مشرق کا پھول کھِل کے بھی خنداں نہ ہو سکا

بنیاد تھی غلط جو نظامِ حیات کی
بڑھتی چلی گئیں خلشیں مشکلات کی

آخر میں اشتراکیتِ عصرِ حاضرہ
نقش و نگارِ دامنِ افکار ہو گئی
پیہم شکستِ فکر کا انجام الاماں
انسانیت خدا سے بھی بیزار ہو گئی
جمہوریت کا ردِّ عمل ہمنشیں نہ پوچھ
پہلے جو تھی خلیج وہ دیوار ہو گئی
زخمِ جگر کا حیف مداوا نہ ہو سکا
کوشش تمام عقل کی بیکار ہو گئی

دُنیا کا اضطراب بدستور ہے ابھی
انساں حقیقتوں سے بہت دُور ہے ابھی

شمیم جاوید۔ بی۔ اے۔

اِمروز

مرے رفیقو مرے عزیزو!

وہ ساعتیں جو گذر چکی ہیں
کبھی نہ تم ان کو پا سکو گے
وہ اپنے اجداد جن کے خوں سے
ہوئی ہے تعمیرِ بزمِ عالم
انہیں نہ واپس بلا سکو گے
تمھارا ماضی حسیں ہے لیکن
تم اس کی یادوں میں کھو نہ جاؤ
جواب ہے رنگِ حیات دیکھو!

مرے رفیقو مرے عزیزو!

وہ آنے والے حسین لمحے
جو سینۂ وقت میں نہاں ہیں
جو دوشِ فردا پہ پرفشاں ہیں
انھیں نہ اتنا قریب سمجھو
کہ راہ میں تھک کے بیٹھ جاؤ
سحر کی آمد اٹل ہے لیکن
سحر کے خوابوں میں کھو نہ جاؤ
مہیب ہے کتنی رات دیکھو!

تنویر علوی۔ ایم۔ اے

اجنتا سے آگے

(کرشن چندر سے معذرت کے ساتھ)

ہم نشیں یہ منقش افسانے
خواب ہائے حسیں کے ویرانے

حُسن ہیں یہ خیالِ حسن عمل
زندگی کی حسین تعبیریں
خلوتِ دل کے راز ہائے نہاں
لوحِ محفوظ کی یہ تفسیریں

یہ کتاب حیات کے اوراق
پر تو ستانِ زندگی کی جھلک
شرح نازک صحیفۂ دل کی
چشم ہستی میں اشکِ غم کی چھلک

زندگی کیا ہے ایک رقص خریر
اس پہ یہ بندِ غم یہ قیدِ حیات
یہ مسلسل نزاعِ جان و جہاں
ترک اور تیاگ کی یہ راہِ نجات

رُوح کی یہ تپسیا یہ ریاض
رازِ ہستی کی جستجو کے لئے
یہ اندھیروں میں روشنی کی تلاش
نوعِ انسان کی آبرو کے لئے

یہ سوادِ عظیم وہم و گماں
یہ یقین و ثبات کی منزل
یہ گذرگاہِ صدیات و ممات
یہ نشانِ نجات کی منزل

یہ ہدایت یہ امن کا پیغام
زندگی کے لئے نجات کی راہ
اب بھی ہے نقشِ کالحجر لیکن
نوعِ انسان پھر بھی ہے گمراہ

اور وہ مایا کے فتنہ زا عفریت
ترکِ دُنیا سے زیر ہو نہ سکے
اہلِ دولت یہ رُوح کے صیّاد
خونِ آدم سے، سیر ہو نہ سکے

یہ اہنسا یہ بیکسی یہ سکوت
زندگی سے گریز ہے اے دوست
غمِ ہستی کا غیرِ مرگ علاج
اِک مسلسل ستیز ہے اے دوست

سعید عقاب

دھرتی کے انسان

تیرہ و تاریک کیوں انسانیت کی بزم ہے
کیوں بشر کے ذہن میں بیدار جوشِ عزم ہے
تار کیوں سازِ اخوت کے ابھی خاموش ہیں
کیوں ابھی آدم کے دل میں آرزوئے رزم ہے

پھر ابھر آئی زمانے کی جبیں پر اک شکن
بجلیوں کی زد میں آیا آدمیت کا چمن
مادی طاقت نے سرکش کر دیا انسان کو
دیکھتے ہی دیکھتے بدلا شرافت کا چلن

کانپ اٹھی لو چراغِ زندگی کی ہم نشیں
لو! فضا میں گونج اٹھے نعرہ ہائے آتشیں
جس کو تیرہ رب نے بخشا اشرف المخلوق کا
بھول کر خود کو بنا شیطان کا وہ جانشیں

ہاتھ طاقت کے بڑھے لو کانپ اٹھیں کمزوریاں
پٹ گئیں سفاکیوں سے رحم کی پگڈنڈیاں
امن کی معصوم دیوی خوف سے سہمی ہوئی
بڑھتی ہی جاتی ہیں دیو جنگ کی بدمستیاں

کیا یہی اطوار ہیں جینے کے آدم کے سپوت؟
گمرہی کا مل لیا ہے اپنے چہرے پر بھبھوت
اپنے خالق سے بغاوت حیف ہے صد حیف ہے
ہو رہا ہے دیکھ تیرا مہرِ عظمت اب غروب

انور سہیل

اِسی دھرتی پر

میں نے مانا کہ فضاؤں پہ سیاہی ہے محیط !
زندگی آج — بہ سمت — اِسی دھرتی پر!
کفر و الحاد کی چکّی میں پِسی جاتی ہے !
یہ بھی سچ ہے کہ اِسی شب کے سیہ دامن میں !
"سرخ" پرچم کے تلے "سرخ" سویرے کے لئے !
اپنی مجروح جوانی کا سہارا لیکر !
سرد لاشوں کو میں چمٹائے پھرا کرتا تھا !
امن و تہذیب کے ہر روز جلاتا تھا دیئے !
اور دُنیا انہیں دم بھر میں بُجھا دیتی تھی !
فکرِ بے قید نے گو لاکھ دلاسے بھی دیئے !
پھر بھی ہونٹوں سے مرے چیخ نکل جاتی تھی !
روز ڈھلتے تھے مرے گیت نئے سانچوں میں
ٹوٹ جاتے تھے مگر وقت کی جھنکار کے ساتھ
میں مگر آج بہ اندازِ دگر آیا ہوں
پیکرِ عزم و یقیں ! حاملِ قرآنِ مبیں
گوہرِ فکر و نظر ! اشکِ سحر تاب لئے
ذرّۂ خاک لئے ! انجم و مہتاب لئے
بربریت کے لئے جرعۂ زہر اب لئے

متین طارق

طلوعِ سحر

رعنائی و تنویر کے جلوؤں سے نکھر کر
آئی ہے سحر رات کی منزل سے گذر کر
بڑھتے ہیں کچھ اس نرم خرامی سے اُجالے
محسوس یہ ہوتا ہے ابھی خواب ہو جیسے
پھیلی ہے کہیں چادرِ مہتاب زمیں پر
یا عکسِ رخِ حور ہے دُنیا کی جبیں پر
بکھرا ہے یہاں نور کی موجوں کا خزانہ
یا ٹوٹ پڑا ہے کسی دریا کا دہانہ
ہنس کر کسی غنچے نے دہن کھول دیا ہے
یا کشورِ ظلمات میں یہ حق کی ضیا ہے
نکلا ہے پئے سیر کوئی یوسفِ حکمت
یا دیدۂ یعقوب میں آئی ہے بصارت
پھل پھول کے آئی ہے ذرا کشتِ بہاراں
یا شاہدِ قدرت نے کیا سیر کا ساماں
غازہ رُخِ ایام پہ فطرت نے ملا ہے
آغوشِ فلک دیر سے جس کے لئے وا ہے
کیا کیا میں بتاؤں کہ ہے یہ نورِ سحر کیا
سوتوں کو مگر ایسے نظاروں کی خبر کیا

شفا گوالیاری

رباعیات

تنقیصِ محبت کو روا رکھتے ہیں
تردیدِ حقیقت کو روا رکھتے ہیں
تحقیق وہ ہیں آپ ہی اپنے باغی
جو حق سے بغاوت کو روا رکھتے ہیں

میں ذوق کو مجبوس نہ ہونے دوں گا
نظارے کو مایوس نہ ہونے دوں گا
یوں دیکھوں گا حسن اُن کا بحسنِ احساس
نظروں کو بھی محسوس نہ ہونے دوں گا

کیا سنتے ہو آوازۂ دنیا دیکھو
کیا پاتے ہو خمیازۂ دنیا دیکھو
اے دیکھنے والو بہ نگاہِ عجلت
دنیا کو باندازۂ دنیا دیکھو

بگڑا ہوا ہر کام سنبھل جائے گا
کانٹا دل انساں سے نکل جائے گا
تم اپنے تو اطوار بدل لو پہلے
دنیا کا نظام آپ بدل جائے گا

ہر شام سے ہر صبح نکھر سکتی ہے
تصویر سے تصویر اُتر سکتی ہے
تقدیر کی اُلجھن میں اُلجھنے والے
تدبیر سے تقدیر سنور سکتی ہے

ابوالمجاہد زاہد

شفیق جونپوری کی شاعری

"فانوس" کی روشنی میں

شفیق صدیقی جونپوری ملک کے جانے پہچانے کہنہ مشق۔ اور صاحبِ طرز اسلام پسند شاعر ہیں ان کی شاعری نے منفرد اسلوب کی بدولت ایک خاص مقام پیدا کرلیا ہے انہوں نے نئی قدروں سے بغاوت نہیں کی نہ پرانی قدروں کو قابلِ گردن زدنی قرار دیا بلکہ ان کے کلام میں قدیم و جدید کا ایک لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔ علامہ سیماب مرحوم نے اچھے شاعر کی پہچان بتائی ہے کہ

"جو کانوں سے اتر کر روح کو چھولے وہ شاعر ہے"

اور شفیق کا کلام واقعی کانوں سے اتر کر روح کو چھو لیتا ہے۔ اپنی مزاجی مناسبت، خلقی استعداد اور ذوقِ شعری کی مدد سے وہ اپنا راستہ خود بناتے ہیں نفسِ تقلید کو وہ بہت برا سمجھتے ہیں، یوں تو وہ علامہ اقبالؒ کے پیرو ہیں اور پیروئ اقبال پر ناز بھی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے کلام میں "سرقہ" اور "توارد" کی مثالیں نہیں ملتیں ـــــ انہوں نے کسی حد تک "صرف اقبالیات" کی روش کو لیا ہے لیکن اس روش پر جو ڈھانچہ اور ڈھانچہ پر جو گوشت پوست ہے وہ شفیق کا اپنا بنایا ہوا ہے۔ اسی لئے وہ اقبال کے مقلد ہوتے ہوئے بھی مجتہد نظر آتے ہیں، اور یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

شفیق کے کئی مجموعے شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں"۔ فانوس" ان کا تازہ مجموعۂ کلام ہے جس میں "سفینہ" کی طرح غزلیں نظمیں، قطعات و رباعیات سبھی کچھ شامل ہیں۔ لیکن ان کی شاعری کے صحیح خدوخال ـــــ اور بنیادی احساسات کی نمائندہ غزلیں ہی کہی جاسکتی ہیں وہ غزل زیادہ کہتے ہیں۔ غزل کی "آفاقیت" پر ان کا ایمان ہے۔ اور فانوس کی غزلوں میں بلند آہنگی اور توازن الفاظ کے ساتھ ساتھ سوز و ساز کی دلکش آمیزش پائی جاتی ہے۔

ھ

مسکراتا ہے کوئی پھول تو جی ڈوبتا ہے
ڈھونڈتی ہو نہ اسے گردشِ ایام کہیں

میں نے بھی سارے زمانے کو فراموش کیا
جب سے تو بھول گئی اے نگہِ یار مجھے

خوشی گلے سے لگانے کو بار بار آئی
گیا نہ دل سے ترے غم کا احترام کبھی

وہ روشنی دل سے تو گئے تابانیٔ غم ناکام نہیں
ہر چند کہ سورج ڈوب گیا بستی میں ابھی تک شام نہیں

جب سامنے آجاؤ گے کبھی خود داد بصیرت لے لیں گے
آوارہ پھریں ڈھونڈھیں بھی تمہیں یہ اہلِ نظر کا کام نہیں

تقدیر کے مالک ہو نہ خفا ناعاقبت اندیشی پہ مری
جس دن سے بھروسہ ہے تجھے اس دن سے غمِ انجام نہیں

ان کی غزلیں دیکھ کر ان کی بانع نظری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور ان کے اشعار ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ھ

تجھے ہم دوپہر کی دھوپ میں دیکھیں گے اے غنچے
ابھی شبنم کے رونے پر ہنسی معلوم ہوتی ہے

مرے دامن پہ کیا ہنستا ہے اے گل
ذرا اپنے گریباں پر نظر ہو

سحر کے جھونکے ہیں لرزاں کہ دھوپ تیز نہ ہو
کلی کو ناز ابھی میری عمر ہی کیا ہے

ترے غرور کو اے آفتاب کیا معلوم
کہ میری خاک کے ذرّوں میں روشنی کیا ہے

ذرا ہو تعاون شبنم تو اے نسیم سحر
تجھے بہار کی خلوت میں دخل ہی کیا ہے
اب اٹھتے جاتے ہیں رخسار و زلف کے پردے
بدلتی جاتی ہے شام و سحر زمانے کی
گلہائے چمن نے چاہا تھا بلبل کے ترنم پر ہنسنا
اپنی بھی تمنائیں غارت کیں نکہت کا بھی پردہ چاک کیا
ارے او موت کی دشواریوں کو سوچنے والے
خبر بھی ہے تجھے خود زندگی ہے کتنی پیچیدہ

چند تشبیہیں ملاحظہ ہوں ؎

تصور میں ترقی ہے مگر تا بو نہیں اپنا
کہ جیسے فلم کے پردے پہ کوئی خوش جمال آئے
زہے تابانیاں اس بزم پر اشکوں کی لکیروں سے
کہ جیسے چمن میں کوئی خورشید کو آئینہ دکھلائے
وہ گرمیٔ ہجراں وہ تری یاد کی خنکی
جیسے کہ کہیں دھوپ میں سایہ نظر آئے
گل بہشت کی دو پتیوں کو جنبش تھی
کہ ہر تھی لب ناز پہ مسکرانے کی
قدم کیوں سست رکھتے ہو جو نیت ہے عیادت کی
تمہاری چال کیا ہے نبض بیمار محبت کی

شفیق کی شاعری میں جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے۔ صفائی اور بیباکی ان کی فطرت ثانیہ ہے۔ سچائی ان کی طبیعت کا خاصہ ہے ان کے حوصلے جانداز اور توانا ہیں۔ ان کے یہاں سیاسی اور عصری رجحانات بھی ملتے ہیں تنقید کے تیز و تند نشتر بھی پائے جاتے ہیں اور لطف یہ کہ تغزل کا بانکپن کہیں بھی مجروح نہیں ہونے پاتا۔ ہندوستان کی آزادی اور اس سے پیدا شدہ ہلاکت سامانیوں اور گمراہیوں پر شفیق نے بہت کچھ لکھا ہے۔ فانوس کے یہ اشعار پڑھیے ؎

تصرف غیر پر گلہ تھا کہ راستہ بے خطر نہیں ہے
اور آج منزل ہوئی ہے اپنی تو قافلوں کا گذر نہیں ہے
کلی کلی کو ستا رہا ہے تمازت آفتاب کا ڈر
مٹی گلستاں سے شب کی ظلمت تو اعتبار سحر نہیں ہے
خود اپنی شاخوں کو قطع کرنا خود اپنے پھولوں کا خون کرنا
چمن پہ حاصل ہوا ہے قابو تو فاتحانہ نظر نہیں ہے
کچھ پھول کھل گئے ہیں تو خوش ہو نہ باغباں
تقدیر اس بہار پہ ہے خندہ زن ابھی
تہذیب خر مسار ہے اخلاق سرنگوں
باقی ہے حسرتیت کی جبیں پر شکن ابھی
ہر چند آفتاب نمودار ہو چکا
تھرا رہی ہے صبح کی پہلی کرن ابھی
یہ دھن کسی کو نہیں گل کھلیں بہار آئے
یہ فکر ہے کہ چمن زیر اختیار آئے
چمن میں پھر وہی گلچیں ہے پھر وہی صیاد
خیال تھا کہ اسیری کے دن گذار آئے
پہن لیتا ہے جو کھدر کی ٹوپی
سمجھتا ہے جواہر لال ہوں میں
ہمیں اے موسم گل تجھ پہ کیا کیا ناز تھا لیکن
وہ کانٹوں سے نہیں ممکن جو پھولوں نے قیامت کی
چل دینے کا الزام نہ نکہت ہی کے سر ہو
کچھ بے رخی اہل چمن پر بھی نظر ہو
نکہت پہ ہے اتنا ہی بہتان آوارگی و رسوائی کا
جتنا کہ چمن سے دور گئی فیضان چمن پہونچانے کو
قسم ہے ایسی بیداری کو بیداری نہیں کہتے
کہ آنکھیں جاگتی ہوں آدمی کی روح سو جائے

"انقلاب زندہ باد" کا نعرہ وہ بھی لگاتے ہیں لیکن اس نعرہ کی پوری اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ وہ سطحی اور جھوٹے انقلاب کو پسند نہیں کرتے۔ وہ سچا انقلاب چاہتے ہیں۔ ایسا انقلاب جس میں "بدن بھی ہو توانا روح بھی سیراب ہو جائے" انہیں یقین ہے کہ بگاڑ اور برائی کی جڑ خدا، مذہب اور اخلاق سے بغاوت و سرکشی ہے۔ وہ انقلاب کا نام "فیشن" کے طور پر نہیں لیتے کہ ؎

صورت بھی مسخ ہو تو کہیں لوگ زندہ باد
ایسی ہوا چلی ہے شفیق انقلاب کی

وہ ایسے نظام جمہوریت کو بھی ضمیر شیطاں کی آگہی بتاتے ہیں جس میں "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے"

نظام جمہوریت کی بنیاد صرف کثرت پہ رائے کی ہے
تو انتخابات کا تصور ضمیر شیطاں کی آگہی ہے

وہ انسان کو انسان بننے پر آمادہ کرتے ہیں۔ انہیں افسوس ہوتا ہے کہ اس دور ترقیات میں آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا"

تہذیب کا آئینہ ابتک شرمندۂ احساں ہو نہ سکا
کیوں شور ترقی ہے یارب انساں ہی جب انساں ہو نہ سکا

فضاؤں میں پرواز کا فن سکھایا
تو دریا کی موجوں کو ساحل بنایا
سمندر کی تہ میں بھی راہیں نکالیں
مگر آدمی بن کے چلنا نہ آیا

وہ انسان کے عناصر ترکیبی کی وضاحت بھی کرتے ہیں ؎

خود آگاہی و خود داری خود آرائی و خود فہمی
شفیق اتنے عناصر ہوں تو پھر انسان کہلائے

ان کی انقلابی شاعری اخلاق کی داعی ہے ؎

عظمت کا طلبگار ہے انساں تو شفیق آج
اخلاق رسول عربی پیش نظر ہو

خبردار اس آنے والے کی کہ جس کی خوش خرامی نے
خس و خاشاک میں بھی زندگی کی رُوح دوڑا دی

شفیق طاقت اخلاق سے وہ ممکن ہے
ہزار سال جو فوج و سپاہ کر نہ سکے
تلوار کی قوت سے بھی شفیق آئین بدل سکتے ہیں کہیں
اخلاق کی طاقت کیا کم تھی تہذیب پہ ایماں لانے کو

عدل و انصاف سے انہیں عشق ہے۔

تاجپوشی اُسے زیبا ہے جسے آتا ہو
عدل و انصاف سے دامانِ زمیں بھر دینا
ترقی دے تو فطرت بھی جہانداری کے قابل دے
خدا بندے کو پہلے امتیاز حق و باطل دے

اے جنگ کے فاتح کاش تجھے اس بات کا بھی احساس ہے
مقتول سپاہی کی بیوہ محتاج ہے دانے دانے کو

شاہ ہو یا گدا کوئی بھی شہ زوری کرے
کیوں لحاظ رتبۂ تیموری و غوری کرے
عدل تو یہ ہے کہ قطعاً ہاتھ کاٹا جائے گا
فاطمہ بنت محمد بھی اگر چوری کرے

شفیق زندگی کے ہر گوشہ پر نظر رکھتے ہیں ان کی شاعری میں ساری دنیا کا دل دھڑکتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور ان کے جگر میں سارے جہاں کا درد پایا جاتا ہے۔

فقط ہندوستان ہی تک نظر محدود کیونکر ہو
خدا نے درد بخشا ہے ہمیں سارے زمانے کا

شفیق اسلام پسند شاعر ہیں اس لئے ان کا عمومی انداز بیان بنام انسانیت یا بنام اسلام ہے۔ اسلام سے زیادہ انسانیت کا دوست کون ہو سکتا ہے، وہ اسلام کو کوئی پراپیوریٹ چیز" یا "چینا بیگم" کا انکشن نہیں سمجھتے وہ خوب جانتے ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا عالمگیر اور حیات آفریں نظام فکر و عمل ہے جس میں بہترین اخلاقی اور روحانی قدریں بھی ہیں۔ سیاست معاشرت اور جمہوریت کے اعلیٰ اصول بھی ہیں اور جو تمام انسانوں کو بلا امتیاز طبقہ و نسل یکساں انصاف و محبت کی نظر سے دیکھتا ہے اور جو انسانی زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرتا ہے۔ وہ انسان پر انسان کی خدائی کو تسلیم نہیں کرتے وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ؎

انسان پہ انساں کی حکومت اگر اے دوست
فردوس بھی بریں بھی ہو تو آرام نہیں ہے

وہ خوب جانتے ہیں کہ ؎

صرف ربانی حکومت سے ہے مومن کی بقا
عشق یزداں ہو تو خوف اہرمن کیا چیز ہے

ان کا احساس خودی بیدار ہے وہ بیچارگی و مظلومی کی ذلت کو برداشت نہیں کر سکتے ؎

بیچارگی و مظلومی کی ذلت کو دوامی کون کرے
احساس خودی بیمار ہے اب درد کی سلامی کون کرے
فرعون کا استکبار کجا اب روس میں دود زار کجا
خلاق ہی کا سجدہ مشکل ہے بندوں کی غلامی کون کرے

خودی سے انہیں بہت محبت ہے ؎

خودی سے ہو کے بیگانہ بشر پستی میں رہتا ہے
فرشتوں سے نہیں ہوتا جو آدم زاد کرتا ہے
خودی کا اپنی جو لے سہارا تو ہے وہ تنکا بھی ہم کو پیارا
ہے جس پہ یہ راز آشکارا کہ ہر تلاطم میں زندگی ہے

وہ بہت ہی خوددار ہیں اور محبت میں بھی خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ہیں ؎

میں عاشق ہوں مگر تجھ سے پرستش کی توقع کیوں
محبت ہے محبت بندگی ہے بندگی ساقی
محبت کا صلہ یہ ہے محبت تو بھی کر مجھ سے
جبیں رکھتا نہیں قدموں پہ جو خود دار ہوتا ہے

اور بڑے پیارے کہتے ہیں ؎

خفا تو ہو نہ اپنے میکشوں کی خود پسندی پر
یہ تیرے واسطے خود بھی مقام ناز ہے ساقی

وہ زمانے کی ترقی کو تکمیل تک پہونچانے کے لئے مردِ مومن کے منتظر ہیں ؎

زمانہ کی ترقی تشنۂ تکمیل ہے یارب
ابھی اِک مردِ مومن کی کمی معلوم ہوتی ہے

وہ بندۂ مومن کی پہچان بھی بتاتے ہیں ؎

آیندۂ مومن کی پہچان بتا دوں میں
اخلاق فقیہانہ تیور اسد اللّٰہی

وہ بربادیٔ ملت اور مسلمانوں کی بے عملی پر تڑپتے بھی ہیں۔ ارباب زوال امت پر ان کی گہری نظر بھی ہے۔ اور مذہب کو دستار و دامن میں الجھانے والوں سے بیزار بھی ہیں ؎

زمانے کے تغیر کی کہانی پوچھتے کیا ہو
کہ ہم سے اپنی بھی تصویر پہچانی نہیں جاتی
کہاں چلے گئے طوفاں سے کھیلنے والے
یہ آج کشتی و ساحل کی بے بسی کیا ہے
تاج شاہی کو بھی ٹھکراتے تھے ایماں والے
آج ملّا کے لئے کیسۂ زر سب کچھ ہے
خانقاہوں میں ہے اب مرغ مسلم کی ہوس
فقراء بھول گئے نانِ جویں حیدر
روایت ہے نانِ جویں کی لبوں پر
مگر زور بازوئے حیدر نہیں ہے
اللہ رے یک رنگی محسوس نہ ہوتا تھا
درویش کی محفل ہے یا انجمن شاہی
وہ میری باہمی وحدت کا رشتہ کیا ہوا یارب
پھیکا کا نشا عجم میں تو عرب سے چارہ ساز آیا
دلوں سے ٹوٹتا جاتا ہے رشتہ تیری وحدت کا
چلیں نسل و وطن کی آندھیاں فریاد ہے ساقی
یہ عالمگیر وحدت کا تصور یہ جمود اپنا
مسافر خواہ میرا ہو اور منزل کا خیال آئے

لیکن انھیں یقین ہے کہ حالات ضرور کروٹ بدلیں گے اور نظام باطل کی چھائی ہوئی کالی رات کا جادو ٹوٹ کر رہے گا ؎

جن کی مرجھائی ہوئی شکل پہ ہنستے ہو وہی
چاک کرتے ہوئے دامانِ بستم آئیں گے
قافلہ دور نہیں میرے سحر زادوں کا
لے کے وہ روشنیٔ لوح و قلم آئیں گے
اِک ذرا نیند سی آنکھوں پہ ہے طاری ورنہ
آج بھی بندۂ مومن کی نظر سب کچھ ہے

شیفتہ کو الحاد و بیدینی سے نفرت ہے ان کا ایک بڑا پیارا شعر ہے ؎

یہ طورین ندامت کا لطف کیسا جانیں
گناہ کرکے جو قدر گناہ کر نہ سکے

"شراب اشتراکیت" کو بھی وہ اسی لئے پسند نہیں کرتے کہ اس میں تلخیٔ الحاد پائی جاتی ہے۔ اور اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا کی وجہ سے وہ اسے مردود قرار دیتے ہیں۔

ضرورت اشتراکیت کو بھی ہے ایک رہبر کی
شراب اچھی ہے لیکن تلخیٔ الحاد ہے ساقی

وہ سرخ سویرے کے بھی اسی لئے قائل نہیں ہیں کہ اس میں "بغاوت" کی ہوا کے جھونکے محسوس ہوتے ہیں ؎

میں سرخ سویرے کا بھی قائل نہیں اے دوست
اس صبح میں جھونکا ہے بغاوت کی ہوا کا
کیا وہ تحریک ہے جس میں نہیں اخلاق کی روح
اشرف الخلق ہے انساں تو بغاوت کیسی
آہ انسان کا دل اور بغاوت کی خلش
یہ تو افلاس کی "خارش" کے سوا کچھ بھی نہیں
کہتا ہے بے خبر کہ ترقی پسند ہوں
اور اشتراکیت میں وہی مادّہ من ابھی

رامپور کے ایک آل انڈیا قسم کے مشاعرے میں رامپور کے ایک شاعر

نے ایک مختلف نظم کہہ دوں تو کفر ہے" پڑھی۔ شفیق سے نہ رہا گیا۔ اور انہوں نے فی البدیہہ چند شعر موزوں کر لئے اب جو دیکھتا ہوں تو وہ اشعار گندم نما جو فروش کے عنوان سے فانوس میں موجود ہیں ؎

ہمیشہ دور عروج و زوال کا ہو گا
یہ آدمی کبھی سلطاں کبھی گدا ہو گا
یتیم و بیوہ و مزدور کا ہے نام ہی نام
یہ "اقتدار کا فتنہ" ہے جو بپا ہو گا
جو تجھ سے خوش نہیں تیرا نہ ہو سکا یا رب
بھلا اُسے ترے بندوں کا درد کیا ہو گا

مزدوروں اور غریبوں کا غم شفیق کو بھی ہے وہ خدا سے بھی فریاد کرتے ہیں ؎

جو تو ہی فریاد رس نہ ہو گا کسے پکاریں گے غم کے مارے
کہ تیری دنیا میں یا الٰہی غریب کی آہ بے اثر ہے
ستایا جا رہا ہے ہر جگہ تیرے غریبوں کو
وہیں نا مطمئن ہے جو جہاں آباد ہے ساقی

اور انہیں یقین ہے کہ کبھی نہ کبھی نداق عام بلند ہو کر رہے گا ؎

زمانہ لے گا غریبوں کا انتقام کبھی
بلند ہو کے رہے گا مذاق عام کبھی

اور زمانہ انتقام لے بھی رہا ہے ؎

یہ وقت کا انتقام بھی ہے یہ زندگی کا پیام بھی ہے
کہ آج خسرو کے سر کی ٹوپی کلاہ مزدور بن گئی ہے

وہ جانتے ہیں کہ پہلا سا دور عالم ہے
اور اب غریب کی دنیا بہت منظم ہے

لیکن وہ غریبوں اور مزدوروں کو روس کا ذہنی غلام بنانا نہیں چاہتے نہ مزدور و سرمایہ دار میں بغاوت آمیز تفریق کو پسند کرتے ہیں ——— وہ کہتے ہیں اور ——— خدا ناآشنا عوامی تحریکوں کا جائزہ لیکر بالکل ٹھیک کہتے ہیں ؎

درد مزدوروں کسانوں کی پریشانی کا
اِک نمائش ہے نمائش کے سوا کچھ بھی نہیں
میں خوب سمجھتا ہوں پیارے سرمایہ پرستوں کی چالیں
تنظیم غریباں کرنے لگے جب خون غریباں ہو نہ سکا
تھی کسی دور میں اِک رحمت کونین کی ذات
پھر تو آیا نہ غریبوں کا نگہباں کوئی

وہ خود فانوس کے مقدمہ میں اسلام اور اشتراکیت کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ؎

"اسلام مزدور و سرمایہ دار دونوں کا مصلح و دردمند ہے اور اشتراکیت میں غریب و سرمایہ دار کی بغاوت انگیز تفریق ہے۔ اسلام کی بین الانسانی محبت کیمونزم کو کہاں نصیب، اسلام کی دردمندی عالمی ہے اور کیمونزم کی نظر تفریق پسند"

ان کی مشہور نظم سچی اشتراکیت" ان کے خلوص کی آئینہ دار ہے جس میں ایک خلیفۂ اسلام کی زندگی کی جھلک پائی جاتی ہے نظم طویل ہے چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

ضرورت اشتراکی دور کو ہے ایسے رہبر کی
جو سر پر تاج رکھے مشک بھی کاندھے سے لٹکائے
امیری میں بھی ہو جس کے بدن پر ٹاٹ کا کرتہ
جو خود مزدور بنکر قسمت مزدور چمکائے
امیر فوج و لشکر ہو مگر ہو سادگی ایسی
کہ سر پر ٹوکرا رکھ کر بھی چلنے سے نہ شرمائے
غریبوں کو چھڑائے پنجۂ سرمایہ داری سے
مگر شعلے بغاوت کے قبائل میں نہ بھڑکائے
امیروں اور ناداروں میں نفرت کا نہ بانی ہو
مگر ایسا سبق دے قیصریت ختم ہو جائے

ع ایک زمانہ تھا جب میں رامپور میں حلقۂ ارباب ادب کا سکریٹری تھا جو مشہور ترقی پسند شاعر شاد عارفی کی زیر نگرانی قائم تھا۔ اس زمانے میں جناب محشر عنایتی روزنامہ آغاز رامپور کے ایڈیٹر تھے۔ محشر صاحب نے اسی نظم کہ "دوں تو کفر ہے" پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ یہ نظر حدود عقائد سے کچھ متجاوز ہے۔ نظم چونکہ حلقہ کے ایک شاعر کی تھی۔ اس لئے پورے حلقہ میں کھلبلی مچ گئی اور سکریٹری ہونے کی حیثیت سے میں نے مدیر آغاز کو اجازات میں خوب بدنام کیا۔ مقدمہ بازی تک کی نوبت آگئی۔ اب جب کبھی مدیر آغاز کی سچی تنقید اور اپنی ہٹ دھرمی پر غور کرتا ہوں تو دل کانپ جاتا ہے۔ اللہ معاف فرمائے۔ (زاہد)

نہ ہو محدود روٹی اور بوٹی تک نظام اس کا
بدن بھی ہو توانا رُوح بھی سیراب ہو جائے
جو مسکینوں میں بیٹھے تو ادا ہو خاکساری کی
چلے تلوار لیکر تو خدا کا شیر کہلائے
ریاکاری کا دھبہ دُور ہو جس کے عنانوں سے
جو مذہب کو فقط دستار و دامن میں نہ الجھائے
شکم پر پتھروں سے تین بندھے ہوں مستقل فاقے
پکارے در پہ گر سائل تو چادر نذر ہو جائے
چلی آتی ہوں چیخی کی صدائیں باب عالی سے
مگر خاتون خانہ قوم کی سلطانہ کہلائے
شفیق اخلاق میں انسانیت کے اتنے جوہر ہوں
تو امت رحمۃ اللعالمیں کی قوم کہلائے

جن لوگوں کو علامہ اقبالؒ کی "مجازیت" میں معنی و عمل کی پستی نظر آتی ہے۔ وہ شفیق کی "حجازیت" پر بھی اعتراض کریں گے۔ مگر اس قسم کے اعتراضات کو اسلامی بصیرت کا فقدان ہی کہا جا سکتا ہے۔ شفیق کہتے ہیں ؎

مجاز ملت کا خاص مرکز یہ منزل و رہگذر نہیں ہے
تصور اپنا ہے کائناتی وطن بحد سفر نہیں ہے

شفیق اپنی نگاہوں میں ہے دنیا بھر کی پیمائش
مگر جغرافیہ کا راز کعبہ کی نگہبانی
ہمارا مستقل اک مستقر ہو پر مگر پرواز تا حدِ نظر ہو
چمن کی قید نہ تخصیص آشیانے کی
مرے حدود میں ہیں وسعتیں زمانے کی
زمین اپنی زمانہ اپنا یہ دو جہاں اپنا مستقر ہے
وطن وطن کی پکار کیوں ہے وطن بھی اک منزل سفر ہے
با فیض ہو تو بحث مقام و وطن نہیں
خوشبوئے گل کے واسطے قید چمن نہیں
حد و دگستاں ہی تک نظر محدود ہو جس کی
بھلا اس پھول کو پرواز شبنم کی خبر کیا ہو

غرض یہ کہ فانوس کا ہر شعر ایک ایسی شمع ہے جس کی روشنی زندگی کے پر گو شہ پر پڑتی ہے اسلامی ادب کے مستقبل کو شفیق سے بہت کچھ امیدیں ہیں۔ فانوس کے شروع میں شفیق کا لکھا ہوا ۴۶ صفحات کا طویل "مقدمہ شعر و ادب" شامل ہے۔ جو شفیق کو سمجھنے میں کافی مدد دیتا ہے، فانوس میں کہیں کہیں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جنہیں "شعر جائز" کی حد سے خارج قرار دیا جا سکتا ہے کہیں کہیں قومی ادب کا رنگ بھی نظر آجاتا ہے لیکن ایسے اشعار کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

نقشِ اوّل ——— صفحہ ۴ سے آگے

کو کوئی فائدہ پہونچے گا۔ نہ بین الاقوامی تصور پیدا ہو سکے گا نہ آفاقیت پیدا ہو سکے گی اور نہ معاشی اور معاشرتی الجھنوں کو سلجھایا جا سکے گا۔

مگر ہم پوچھتے ہیں کہ ذہنی صحت کا وہ معیار رکھنے والے کہاں سے آئیں گے جو ایک ڈاکٹر کی طرح زندگی کے پورے نظام کا جائزہ۔ سطحی جوش۔ سستی جذباتیت اور اندھی عقلیت پرستی یا غیر معقول تلخی اور بیزاری سے بالکل الگ تھلگ رہ کر سکیں۔ ان آنکھیں کہاں سے آئیں گی جو حقائق سے چار ہونے کی جرأت رکھتی ہوں۔ ایسا ذہنی ماحول کب بن سکے گا۔ جسمیں تعمیری عناصر کی فراوانی تخریبی عناصر پر غالب ہو؟

یہ صرف ایک بات تھی جو مثالاً کہی گئی، اسی طرح کتنی ہی ایسی دوسری باتیں ہیں جو غور طلب ہیں۔ ان سب باتوں کی روشنی میں ہم اپنے ان سوالات کا جواب تلاش کر سکتے ہیں۔ جو ابتداء میں قائم کئے گئے تھے۔

نقش کے صفحات کی مختصر سی گنجائش مجبور کرتی ہے کہ اس وقت گفتگو کو یہیں روک دیا جائے۔ یوں بھی اس کا ایک افادی پہلو یہ ہے کہ آپ کو ان سطروں میں جو بات ملتی ہے اسے از خود آگے بڑھائیں اور تشریح و استقرار کے بعد حکم یا تشریح کے انتظار میں اپنے فکر کو بالکل ہی مفلوج نہ بنا لیں۔ آگے جو کچھ ہمیں کہنا ہے وہ آئندہ کہیں گے۔

وحید الدین خاں

فانی — حقیقت کی تلاش میں سرگرداں

فانی بدایونی مرحوم کے متعلق عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک ناکام انسان تھے اور ان کی المیہ شاعری دراصل ان کے ناکام جذبات کی مصوری ہے۔ مگر فانی کے ذاتی حالات نہایت سختی کے ساتھ اس نظریہ کی تردید کرتے ہیں۔ فانی کے ایک ہم وطن پروفیسر دوتی۔ ا م۔ اے، نے رسالہ نگار ماہ مارچ ۱۹۴۸ء میں "فانی کی المیہ شاعری کے عناصر" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

"فانی ایک خوش حال گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ یہ گھرانا بدایوں میں اپنی امارت اور شرافت نسبی دونوں کے لئے مشہور تھا۔ فانی نے نوجوانی ہی میں ڈپلتھ ہوئی جوانی تک کی تمام زندگی دولت اور راحت کی چھاؤں میں بسر کی پینتیس برس کی عمر تک صاحب جائداد اور برسر روزگار باپ کا سایہ سر پر رہا جس نے اس زمانہ کے بلند ترین معیار کے مطابق مسلمانوں کی سب سے مشہور درس گاہ علی گڑھ کالج میں رکھ کر انہیں اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ کہا جاتا ہے کہ فانی اپنے شہر کے تیسرے مسلم نوجوان تھے جس نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر والد کے انتقال پر ایک عالی شان محل نما مکان کے علاوہ ۵، ۶ سو روپیہ ماہوار آمدنی کی جائداد پائی۔ یہ اس ٹھوس سرمایہ کے علاوہ تھی جو وکالت کی سند کی شکل میں پہلے سے ان کے پاس موجود تھا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ جیسے فانی کو یہ فراغت کا ٹکڑا کھاتی ہو۔ تھوڑے ہی دنوں میں ناقابل برداشت اسراف کی بدولت اپنی آبائی جائداد کے دارے نیارے کر دیئے۔ وطن سے طبیعت بیزار ہو گئی تو وکالت کے سلسلہ میں اٹاوہ۔ آگرہ۔ لکھنؤ اور خدا جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی۔ لیکن عالم یہ تھا کہ ان کی بیقرار طبیعت انہیں کہیں زیادہ دنوں جم کر بیٹھنے نہ دیتی۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ وکالت کی سردبازاری انہیں ایک شہر چھوڑ کر دوسرے شہر کے لئے رخت سفر باندھنے پر مجبور کرتی تھی۔ جی نہیں۔ واقعات شاہد ہیں کہ وہ جہاں جاتے ان کے کمال کا شہرہ ان سے پہلے وہاں پہونچ جاتا اور بہت جلد ان کی شاعرانہ ایسے ہمدردوں کا ایک گروہ پیدا کر لیتی جو ان کے پیشہ کو ہر طرح چمکانے کی سعی بلیغ کرتے، فانی کے ایک ہم وطن نے جو ان کے گہرے دوست رہ چکے ہیں اور جنہیں مدتوں سفر و حضر میں فانی کی ہم نشینی کا فخر حاصل رہ چکا ہے۔ مجھ سے خود بیان کیا کہ وہ جس شہر میں بھی جا کر وکالت شروع کرتے وہاں تھوڑے ہی دنوں میں اپنے کمال شاعری کی بدولت افسروں کے منظور نظر بن جاتے اور ان میں سے بعض وارفتگان ادب کی ہمدردی کا تو یہ عالم تھا کہ اپنی عدالت کے ملزموں کو بہ اصرار فانی کو اپنا وکیل قرار دینے پر آمادہ کرتے۔ پھر یہ بھی نہ تھا کہ فانی کی ذہانت صرف ان کی شاعری تک محدود ہو۔ جن بزرگوں نے فانی کو مقدمات کی پیروی کرتے دیکھا ہے وہ ان کی حیرت انگیز قانونی ذکاوت اور غیر معمولی سوجھ بوجھ کے آج تک قصیدہ خواں ہیں۔

بدایوں کے ایک دوسرے فاضل دوست کا فانی کے متعلق بیان ہے کہ ان کے نزدیک گھر سے کچہری تک جانا اتنی بڑی مصیبت تھی کہ مقدمے کی کوئی رقم اس کا بدل نہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ کچہری کے قصد سے دروازے تک آئے۔ دھوپ کی تمازت دیکھکر العظمۃ للہ کہا اور پھر گھر میں واپس چلے گئے۔ اٹاوہ میں ایک ڈپٹی کلکٹر ان کے بڑے قدرشناس تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ فانی کو احتیاج کی صورت نہ دیکھنی پڑے۔ چنانچہ ایک ادلی کی مستقل خدمت یہ تھی کہ فانی کو گھر سے کچہری تک پہونچا دے۔ آگرہ میں ایک سب جج فانی کے بڑے مداح تھے۔ یہاں تک کہ وہ ہر مشاعرے میں جہاں فانی کو بلایا جاتا۔ شرکت کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ ہر کمیشن فانی کے سپرد کر دیتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک ایک ماہ میں چودہ چودہ سو کے کمیشن فانی کو دیئے گئے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم پیشہ وکلاء نے افسران بالا کو شکایتیں لکھنا شروع کر دیں۔ لیکن نہ حکام کی نوازشیں فانی کے افلاس کا علاج کر سکیں نہ احباب کی فہمائشیں۔

فانی کے والد کا انتقال ۱۹۱۷ء میں ہوا اس وقت فانی کی عمر لگ بھگ ۳۰ سال کی تھی۔ ۳۷ سال کی اس طویل مدت میں فانی کو جو

کچھ بننا یا بگڑنا تھا وہ بن یا بگڑ چکے تھے اور ان کی طبیعت اور ان کا شعور زندگی کے تمام منازل طے کر چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں جو اُوپر بیان کئے گئے غمِ روزگار کا سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا۔ رہا غمِ جاناں۔ سو داخلی اور خارجی مشاہدہ سے صرف ایک اُدھا دُھچی سی چوٹ کا پتہ چلتا ہے محض ایک خراش جو شاعر کی زندگی پر رعنائی اور رنگینی کا ہلکا سا پرتو تو ضرور ڈال سکتی ہے۔ لیکن دل کا خون نہیں کر سکتی۔"

اُوپر کی سطروں میں جو بات کہی گئی ہے۔ اس کی شہادت خود فانی کے کلام سے بھی ملتی ہے۔ فانی کے دیوان میں اس قسم کے بہت سے اشعار ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو شعوری طور پر اپنی آزردگی کا کوئی سبب معلوم نہ تھا۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

راہِ دل سے نہیں واقف دلِ ناداں میرا
تیرے عرفاں سے بھی دشوار ہے عرفاں میرا
کوئی وجہ تسکیں نہیں غم نہ راحت
خدا جانے فانی میں کیا چاہتا ہوں
یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانی
وجود درد مسلّم، علاج نامعلوم

اس کے علاوہ ایجابی طور پر خود فانی کے یہاں ہم کو اس بات کی بھی وضاحت ملتی ہے کہ ان کا غم نہ تو غمِ جاناں ہے نہ غمِ روزگار۔ فرماتے ہیں ؎

یہ درد محبت غمِ دنیا تو نہیں ہے
اب موت بھی جینے کا سہارا نہ رہے گی
یہ درد لاعلاج محبت دوا بھی ہے
تھا ورنہ کچھ علاج غمِ روزگار کا
ممکن نہیں ہے راحتِ دنیا کی آرزو
غم پر گمان راحتِ دنیا کیے بغیر

آخری شعر کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو چیزیں عام طور پر سامانِ راحت سمجھی جاتی ہیں۔ وہ مجھ کو راحت نہیں پہونچا سکتیں۔ اگر میں ان کے اندر راحت تلاش کروں تو یہ درحقیقت اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ راحت و غم کے بارے میں اپنے نظریہ کو بدل کر ایک غیر مقصود چیز کو مقصود قرار دوں۔

یہ تو ہوا غمِ روزگار کا معاملہ، اب غمِ جاناں کی بابت ان کا بیان سنئے:۔

کسی کے جلوۂ طاقت ربا کو کیا دیکھوں
شکست رنگِ رخِ کائنات نے مارا
ہوگی کسی کو فرصتِ نظارۂ جمال
فانی خرابِ حسنِ تماشائے یار ہے

ان دونوں اشعار کا مطلب یہی ہے کہ مادی دنیا کے مناظر مجھ کو لبھا نہیں سکتے کیونکہ میں اس سے اُوپر کسی اور ہی منظر کی تلاش میں ہوں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی چیز تھی جس کے لئے فانی اس درجہ بیقرار تھے۔ اس باب میں غور کرنے کے لئے جب ہم فانی کے کلام سے مدد لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ فانی کا غم دراصل زندگی کا غم تھا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ اس لمبی چوڑی کائنات کے اندر ان کی حیثیت کیا ہے۔ اور کس مقصد کے لئے ان کو یہاں پیدا کیا گیا ہے وہ اپنے گرد و پیش لوگوں کو دیکھتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سب کے سب محض زمانہ کی رو میں بہے چلے جا رہے ہیں جس کے پیچھے کوئی شعور اور کوئی نصب العین نہیں ہے۔ وہ اس سے بلند ہو کر زندگی کی اصل حقیقت جاننا چاہتے تھے۔ وہ اپنے دل میں ایک چیز کی تڑپ محسوس کرتے تھے مگر نہ تو اس کا کوئی واضح اور متعین نقشہ ان کے ذہن میں تھا اور نہ دنیا کے اندر وہ چیز عملاً کہیں ان کو نظر آتی تھی۔ وہ بس ایک اَن دیکھی حقیقت کو معلوم کرنے اور اس کو اپنی زندگی کا نصب العین بنانے کے لئے بے چین تھے۔

اس ضمن میں ان کے حسب ذیل اشعار ہماری رہنمائی کرتے ہیں ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم
کیا کیجئے سیرِ باغِ عالم
گل پردہ نشین رنگ و بو ہے
دنیا میں حال آبدرفت بشر نہ پوچھ
بے اختیار آکے رہا بے خبر گیا
یہ تو معلوم نہیں کیا ہے یہ دنیا لیکن
صرف صدرقص ہے صورت کدۂ جاں کوئی
اک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
مری حیات ہے محروم مدعائے حیات
وہ نقشِ پا ہوں جسے کوئی رہ گزر نہ ملا

اس کے بعد دوسری حقیقت جو ان کے کلام ہی کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ فانی کو جس چیز کی طلب ہے وہ کوئی تازہ واردات نہیں بلکہ وہ ایک ایسی چیز ہے جو اوّل روز سے ان

کی رُوح کی گہرائیوں میں پیوست ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ہو بھی چکے تھے دام محبت میں ہم اسیر
عالم ابھی بقید زمان و مکاں نہ تھا

وہ کسی سُنی سنائی چیز کے پیچھے نہیں دوڑ رہے ہیں۔ بلکہ خود اپنا ایک اندرونی جذبہ ہے جس کو محسوس شکل میں دیکھنے کے لئے انکی فطرت بے چین ہے ؎

ہم ہیں اس کے خیال کی تصویر
جس کی تصویر ہے خیال اپنا
وہ دل کی آڑ میں رہتے ہیں فانی
تمنا میرے ان کے درمیاں ہے
مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا
میری فطرت ہے گوش بر آواز
سُن رہا ہوں نوائے محرم کیا
اے جذب بیخودی ترے قربان جایئے
پھرتا ہے دل میں کوئی مجھے ڈھونڈتا ہوا
یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں
آواز آرہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی

اُوپر کے اقتباسات سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ فانی کا غم نہ آلام روزگار کی پیداوار ہے نہ کسی رومانی حادثہ کی یادگار۔ بلکہ درحقیقت وہ زندگی کی ازلی و ابدی حقیقت جاننے کی بے چینی ہے۔ شاعر نے تخیل کے دھندلکے میں محض جذباتی طور پر کوئی نقطہ پیدا نہیں کیا ہے بلکہ اس کی سرشت میں ایک چیز کی طلب اوّل روز سے موجود ہے۔ اور اسی جانی بُوجھی حقیقت کو وہ پالینا چاہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح ریل کا انجن اپنی رفتار کو بروئے کار لانے کے لئے ایک خاص طرح کی لائن چاہتا ہے اور اگر اس کو یہ لائن میسّر نہ کی جائے تو عملی میدان میں وہ صحیح طور پر اپنا حصہ ادا نہیں کرسکتا۔ اسی طرح انسان بھی کوئی ہستا ہوا، یا نیوٹن ہے جس کا راستہ زمین کے نشیب و فراز سے خود بخود معین ہو جاتا ہو بلکہ وہ قدرت کے کارخانہ میں ڈھلی ہوئی ایک عظیم الشان مشین ہے جو ایک خاص مقصد کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس کی فطرت کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کو مقررہ شاہراہ پر اس کے اصل مقصد وجود کے لئے استعمال کیا جائے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو اس کا وجود اسی طرح بے معنی ہو کر رہ جائے گا جس طرح ریلوے انجن کو لوہے کی پٹڑی کے بجائے زمین پر دوڑانے کی مشق کی جائے۔

دراصل فطرت انسانی کا یہی وہ خاموش مطالبہ ہے جو اس کے پورے وجود میں سمایا ہوا ہے، اور اس سے اپنے اصل مقام پر پہونچنے کے لئے تقاضا کرتا رہتا ہے۔ جو لوگ کسی بنے بنائے ماحول کے اندر پیدا ہوئے ہیں اور جن کو چلتے ہی قدم پر ایک متعین اور موجود نقشہ زندگی گزارنے کے لئے مل جاتا ہے وہ اس کی خلش بہت کم محسوس کرتے ہیں۔ مگر جو خوش قسمت کسی "طوفان" سے دوچار ہوتے ہیں جن کو خشکلات اور رکاوٹوں کی وجہ سے زندگی کے بارے میں سوچنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کی زندگی میں یہ جذبہ بہت اُبھر آتا ہے۔ فانی اسی آخری گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ فانی کی یہ تلاش محض ان کی ایک انفرادیت نہیں بلکہ اس عالمگیر شورش کا ایک جزو ہے جو دنیا کا نظام ابتر ہو جانے کی وجہ سے ہر معقول شخص کو حقیقت کی تلاش میں پیش آرہی ہے۔

ہر دل ہے ترے غم کی امانت لئے ہوئے
ذرّے ہیں اک جہان حقیقت لئے ہوئے

فانی کو جس چیز کی تلاش ہے اس کی نوعیت تلاش روزگار کی نہیں ہے کہ یہاں کام نہیں ملا تو وہاں مل گیا۔ بلکہ وہ اپنے اصل مقصد وجود کو ڈھونڈ رہے ہیں ؎

پڑتا نہیں اس آئینہ میں عکس کوئی اور
دل میں تری تصویر سجا رکھ دی ہے کسی نے

وہ اپنی فطرت کے اندرونی تقاضے سے بے چین ہیں اور ہر چیز جو بظاہر دلفریب شکل میں سامنے آتی ہے اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ مگر قریب سے دیکھنے کے بعد وہ محض سراب ثابت ہوتی ہے ؎

شوق بیتاب کا انجام تحیّر پایا
دل سمجھتے تھے جسے دیدۂ حیراں نکلا

اس طرح کا قصہ بار بار پیش آتا ہے۔ اس لئے اب کسی نئی امید کا پیدا ہونا ان کے لئے ایک مزید غم کی تمہید ہو کر رہ گیا ہے ؎

پھر ملی غیب سے نوید نشاط
غم کے ساماں ہوئے فراہم کیا

مگر بار بار کے ناکام تجربوں کے بعد بھی دل کی لگن ختم نہیں ہوتی۔ اور کہیں نہ کہیں سے امید کا کوئی نیا گوشہ نکال لیتی ہے۔ اس طرح ہر روز نئی نئی امیدوں کی جھلک اس کا بھی موقع نہیں دیتی کہ مایوس ہو کر موت کے دامن میں

پناہ لینے کی کوشش کریں ؎

ہر لمحۂ حیات رہا وقف کار شوق
مرنے کی عمر بھر مجھے فرصت نہیں رہی

یہاں تک کہ جب حقیقت کا سُراغ کہیں نہیں ملتا تو سمجھتے ہیں کہ شاید یہ میری تڑپ محض فریب خیال ہے جس کی کوئی اصل نہیں ؎

تجلیات وہم ہیں مشاہدات آب و گِل
کہ شمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

اِس شعر میں "تجلیات" سے مراد وہ امیدیں ہیں جو شاعر کو مایوس نہیں ہونے دیتیں اور ہر آن جدوجہد پر اُبھارتی رہتی ہیں۔ "مشاہدات" سے مراد دنیا کی وہ تمام موجود چیزیں جن کے اندر وہ اپنا گوہرِ مقصود ڈھونڈ رہا ہے۔ اور "کہ شمۂ حیات" وہ آئیڈیل ـــــ ایک خاص طرزِ زندگی گزارنے کی تڑپ ـــــ جو دل کے اندر چھپی ہوتی ہے۔

ذیل میں فانی کے کلام سے کچھ متفرق اشعار مع مختصر تشریح نقل کئے جاتے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوگا کہ فانی اپنی تلاش میں کن کن کیفیتوں سے دوچار ہوئے تھے ؎

عشرتِ تجلّی کی لذتیں ذرا ٹھہریں
اکتسابِ غم کر لوں حُسن بے تماشا سے

"عشرتِ تجلّی" سے مراد دنیا کی موجود لذتیں ہیں جو مل سکتی ہیں۔ اور "حسن بے تماشا" سے مراد وہ خیالی لذت جس کو حاصل کرنے کے لئے شاعر بے چین ہے ؎

تنکوں سے کھیلتے ہی رہے آشیاں میں ہم
آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

فانی کی زندگی میں دنیوی ترقی اور کامیابی حاصل کرنے کے بہت سے قیمتی مواقع آئے مگر وہ اپنی اسی اُدھیڑ بُن میں پڑے رہے اور ان مواقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے ؎

دل کی قسمت ہی بری تھی ورنہ کوئے دوست میں
تھا کوئی ذرّہ جو دل کے درد کا مرہم نہ تھا

اِس شعر میں فانی نے اِس صورتِ واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کی حرماں نصیبی کو دور کرنے کے لئے بہت سے ہاتھ اٹھے مگر ان کا درد کسی طرح دُور نہ ہو سکا۔ اس کو غلطی سے فانی نے اپنی بدقسمتی سے تعبیر کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ فانی کو جو مدد کار ملے وہ صرف مادی اعتبار سے ان کی مدد کر سکتے تھے۔ اصل چیز جس کی فانی کو تلاش تھی اس کا کوئی سامان ان کے پاس موجود نہ تھا ؎

باقی نہیں کسی کو نشاطِ جنوں کا ہوش
کس جوش پر شباب غمِ روزگار ہے

یعنی دنیا کے لوگ کھانے کمانے کے دھندوں میں اس بُری طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ کسی کو یاد نہیں رہا کہ اس سے بلند تر بھی کوئی چیز ہے جس کو حاصل کرنے کی ضرورت ہو اور کوئی دوسری چیز بھی ایسی ہو سکتی ہے جس میں آدمی کو دنیوی عیش و آرام سے زیادہ لذت مل سکے ؎

جا بجا تغیرِ حال دل کے چرچے ہیں تو ہوں
ہم ہوئے رسوا مگر اب ہم کسے رسوا کریں

فانی کی شاعری میں حسن و عشق کے الفاظ دیکھکر لوگ ان کے بارے میں مختلف قسم کی قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔ فانی کہتے ہیں کہ لوگ مجھے بدنام کر رہے ہیں لیکن میرے پاس تو اس قسم کی کوئی بات نہیں جس کا میں ذکر کروں ؎

زیست تھی فانی بقدرِ فرصتِ تمہید شوق
عمر بھر ہم پر تو نورِ بشر دیکھا کئے

"نورِ بشر" سے مراد وہ انسانِ مطلوب جو شاعر کے ذہن میں بسا ہوا ہے، کہتے ہیں کہ ہم کو زندگی کی خوشی صرف ان چند لمحوں کے لئے حاصل ہوئی ہے، جب کہیں سے اپنے محبوب کے پانے کی توقع پیدا ہو جائے ؎

کسی نے تجھ کو نہ جانا مگر یہ کم جانا
یہ راز ہے کہ کوئی راز داں نہیں ملتا

یعنی لوگ دوسری چیزوں کو حقیقت سمجھکر اس کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہیں مگر اصل چیز جس کی تلاش ہونی چاہئے اس کی کوئی فکر نہیں کرتا ؎

جلوۂ رنگ ہے نیرنگ تقاضائے نگاہ
کوئی مجبورِ تماشائے سراب آتا ہے

جن ظاہری چیزوں کو دیکھکر اس کی طرف دل کھنچتا ہے ان کی خود کوئی حقیقت نہیں۔ یہ محض جستجو کی بیتابی ہے جو اس طرف مائل کر دیتی ہے ؎ حسرت ان حرماں نصیبوں پر جو ہوش آنے کے بعد
خواب آغوشِ قفس میں آشیاں دیکھا کئے

اس شعر میں اس موقع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جب آدمی تلاشِ حق میں ناکام ہو کر سوچنے لگتا ہے کہ اس زندگی سے بہتر تو یہ ہے

کہ دنیا میں دوسری چیزیں جو ملنے والی ہیں انہیں کی طرف توجہ کی جائے اور انہیں میں رہ کر زندگی گذار دی جائے ۔

قفس پرورده ونا آشنائے آشیانستم
یه مرغان چمن ارزد صلائے دانه و دامے

دنیا کے اندر اپنے مقصدِ حیات سے بے بہرہ ہو کر فانی اپنے کو قفس کی تنگی میں محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے عام رواج کے مطابق گھر بنانے اور کھانے کمانے کی زندگی اختیار کرنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی ۔

اسرار زندگی کو سمجھوں تو کیا سمجھ لوں
جس زندگی کو دیکھا تردید زندگی ہے

یعنی جس چیز کو بظاہر اچھا سمجھکر اس کی طرف لپکتے ہیں قریب سے دیکھنے کے بعد فطرت کا رجحان اسے رد کر دیتا ہے۔

فانی در اصل زندگی کی حقیقت جاننا چاہتے تھے اور اس کی تلاش میں سرگرداں تھے، مگر فانی اپنی تلاش کی جس منزل میں تھے وہ حقیقت میں آشفتگی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان کے اندر ابھی وہ فکر پیدا نہ ہو سکی تھی جو واضح اور متعین اصولوں کی روشنی میں چیزوں کو اصل حقیقت کے اعتبار سے دیکھے اور محض ان کی ظاہر فریبی میں پھنس کر نہ رہ جائے۔

فانی کی زندگی تمام تر اسی فریب خوردگی کی داستان ہے مگر ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بار بار کے تجربوں کے بعد شاید وہ اس حقیقت کے قریب تک پہونچ گئے تھے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں ان کا یہ شعر قابلِ قدر ہے ۔

فریبِ جلوہ اور کتنا مکمل ہے معاذ اللہ
بڑی مشکل سے دل کو بزمِ عالم سے اٹھا پایا

معزز علی بیگ۔ (ایم۔اے، علیگ)

صالح ادب کی نفسیاتی بنیادیں

ہر صنفِ ادب کو اگر ایک مخصوص نفسیاتی کیفیت کا عکس کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ ادب درحقیقت نفسیاتی کیفیات کے اظہار کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ لیکن چونکہ تہذیب و تمدن نے اس کو باقاعدہ فن کی شکل دیدی ہے لہذا اس کی اوّلین حیثیت اب اس وجہ اہم نہیں رہی ہے تاہم اس کا اصل الاصول وہی ہے۔ اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہر شخص اس ذریعہ اظہار پر قابو رکھتا ہے یا یہ کہ وہ جو اس پر قابو رکھتے ہیں دیگر ذرائع کو استعمال نہیں کرتے بلکہ یہ صرف مختلف ذرائع میں سے ایک ہے اور اس کو وہی لوگ کام میں لاسکتے ہیں جن کو خدا نے ایک خاص تخلیقی ملکہ عطا کیا ہے۔

یہ لوگ اپنی اس ذہنی قوت سے اپنے تجربات، مشاہدات، اور واقعات زندگی ایک انوکھی حیثیت سے منظم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور یہ انوکھی تنظیم ان کے احساسات، جذبات اور تخیل کی آمیزش سے پیدا ہوتی ہے جو مختلف نفسیاتی حالات کے تحت اُبھرتے رہتے ہیں۔ وہ ذہن جس میں قوت تخلیق ہوتی ہے اس کے لئے اکثر و بیشتر خود تخلیق ہی ایک ضرورت کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ یہ ضرورت تخلیق جن احساسات اور جذبات کا مجموعہ ہوتی ہے ان کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ کرنا ناممکن ہے کیونکہ اس مجموعہ (WHOLE) کا فعل انسانی شعور میں غیر معمولی سرعت سے ہوتا ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی زندگی کے ہزارہا مختلف النوع واقعات سے پیدا ہوتے ہیں وُنڈ (WUNDT) نے اس کو شعور کا جزو لایتجزا قرار دیتے ہوئے اس کو (ULTIMATE ELEMENT) تسلیم کیا ہے۔

اس تخلیقی قوت سے جو نفسیاتی کیفیات اپنا اظہار ادب میں کرتی ہیں ان کی تقسیم اس طرح کی جاسکتی ہے۔

(۱) تخیلی و فراری ادب

(۲) واقعاتی و تعمیری ادب

تخیلی و فراری ادب

یوں ہر شعبۂ ادب میں تخیل کی کارفرمائی ہوتی ہے اور تخیل ہی عریاں فکر کو خوبصورت جامہ سے مزین کرتا ہے لیکن تخیلی ادب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے وہ واقعات سے دُور ہوتا ہے اور اس میں حقائق بہت کم ہوتے ہیں۔ یعنی اس کے معنی و مفہوم کو ہم حقیقی زندگی میں پوری طرح نہیں پاسکتے۔ تخیلی ادب حقیقت سے بیشک دُور ہوتا ہے لیکن اگر اس کے عناصر ترکیبی کو ٹٹولا جائے تو ان کا سراغ حقیقت کے اندر ہی ملتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کی تنظیم میں حقیقت کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ اور احساسات اور جذبات کو حقیقت شناسی کی تربیت نہیں ہوتی۔

تخیلی ادب کی ایک شاخ جس میں اس کی ایک انتہا نظر آتی ہے فراریت ہے ایک ذہن جو خارجی حقیقت سے تطابق نہیں پیدا کرسکتا اور نیز اس کش مکش کو بھی برداشت نہیں کرتا جو اس میں اور حقیقت میں رونما ہوتی ہے تو وہ یہی راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہ صرف اس کش مکش کے مہلک اثرات سے بچنے کے لئے کیا جاتا ہے لیکن فرار کی نوعیت انسان کی نفسیاتی ساخت پر مبنی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر الیفریڈ ایڈلر کے نزدیک فراریت نفسیات فاسدہ کا ایک مظہر ہے لیکن یہاں یہ واضح رہے کہ انہوں نے ادب کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے بلکہ فراریت سے پیدا شدہ ان غیر معمولی حالات سے بحث کی ہے جو ایک انسان کو زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں۔

غرضیکہ تخیلی اور فراری ادب اس غیر فطری مطابقت کا نتیجہ ہے جو ایک انسان ماحول سے پیدا کرنا چاہتا ہے یعنی وہ اپنے عجیب و غریب خیالات کے مطابق حقیقت کو ڈھالنا چاہتا ہے تو یہی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس قسم کا ادب خالص انفرادیت کا رنگ لئے ہوئے ہوتا ہے۔

واقعاتی اور تعمیری ادب

واقعاتی ادب بھی ضرورت تخلیق کے تحت وجود میں آتا ہے۔ ایک حساس طبیعت انسان واقعات سے گہرا تاثر لیتا ہے۔ اور یہ تاثر اس کی تخلیقی قوت کے لئے مہمیز ہوتا ہے۔ واقعات کو بعینہٖ بیان کر دینا دراصل اس ضرورت کو پورا کر دیتا ہے۔ کبھی واقعات کو بیان کرنے میں شعوری طور پر ذہنوں کو متاثر کرنا مقصود ہوتا ہے اور کبھی محض ان سے حظ اٹھانا مقصود ہوتا ہے۔ اس قسم کے ادب کی بہترین مثال ہم کو افسانہ نگاری میں مل سکتی ہے۔ جس میں واقعات کے خام مادّے کو خوبصورت بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ تخیل اس میں ہوتا ہے لیکن غالب عنصر حقیقت ہی کا ہوتا ہے۔

واقعاتی ادب میں ماحول سے تطابق کی وہ صورتیں نہیں ہوتیں جو فراری یا تخیلی ادب میں ہوتی ہیں کیونکہ اس میں وہ تضاد بھی نہیں ہوتا جو ہم کو اوّل الذکر صورتوں میں ملتا ہے۔ خارج میں اور ذہن میں ایک ہم آہنگی موجود ہوتی ہے۔

واقعاتی ادب کی اعلیٰ ترین قسم تعمیری ادب ہے۔ یا وہ ادب جو واقعات میں تغیر و تبدل کا پتہ دیتا ہے۔ اس تخلیق کا حامل ذہن کبھی منتشر افکار اور غیر تربیت یافتہ احساسات اور جذبات کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس اس میں ربط ہوتا ہے اور ایسی قوت برداشت ہوتی ہے۔ جو ماحول کی کشمکش سے بآسانی اس کو نکال لے جاتی ہے۔ اور اس میں ایسے لاشعوری محرکات نہیں پنپنے پاتے جو کوئی اندرونی کشمکش رونما کر دیں۔

تعمیری ادب سے اور ماحول سے کوئی بلا واسطہ تطابق نہیں ہوتا اور نہ ہم آہنگی ہوتی ہے لیکن وہ اس کو واقعاتی طور پر بدل کر ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا ادب پیدا کرنے والا ذہن اپنی خواہشات / رجحانات پسند و ناپسند کے اعتبار سے ایک واقعاتی تغیر پیدا کرتا ہے یا اس کی صورت پیش کرتا ہے، یا پھر واقعات کو پرکھتا ہے اور ان کے حسن و قبح کو نمایاں کرتا ہے لیکن اس میں کوئی بات محض تخیلی یا حقیقت سے دور نہیں ہوتی۔ اس میں اور محض واقعاتی ادب میں نمایاں فرق یہ ہے کہ اس کی صورت تنقیدی ہوتی ہے اور اس کی بیانی۔ اس میں احساسات کا ردّ عمل فعالی (ACTIVE) ہوتا ہے اور اس میں مفعولی (PASSIVE)

ادب کی یہ تمام نفسیاتی صورتیں بہر حال واقعات ہی کے اثر سے رونما ہوتی ہیں لیکن ان کا اختلاف در اصل ذہنوں کی نفسیاتی ساخت اور ان کے نشو و نما کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی عظیم الشان (SUBLIME) چیز کو دیکھ کر ایک شخص میں نفور و ہراس کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ دوسرے میں عجز اور عبودیت کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ تیسرے میں تسخیر کے جذبات ابھر سکتے ہیں۔ یہ اپنی اپنی ذہنی ساخت پر مبنی ہوتا ہے۔ اب نفسیاتی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے صالح ادب کے نفسیاتی لوازم پر غور کرنا ہے۔

صالح ادب کے نفسیاتی لوازم

اوپر کی بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہوگی کہ مختلف قسم کا ادب مختلف نفسیاتی کیفیات کا مظہر ہوتا ہے اور ہر ایک ایک خاص ذہنی ساخت کی پیداوار ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ ادب جس میں صالح اور تعمیری عناصر ہوں اپنے لئے خاص ذہنی ساخت کا طالب ہے۔

یہ ذہنی ساخت در اصل اسی طرح کے ایک نشو و نما کی طالب ہے جس کے پیہم عمل سے یہ وجود میں آ سکتی ہے۔

اب میں اس ذہنی ساخت کی چند نفسیاتی خصوصیات کی طرف اشارہ کروں گا۔

احساسات و جذبات

ہر حیثیت سے احساسات اور جذبات کے ردّ عمل میں توازن درکار ہے۔ یہ ردّ عمل اخلاقی لوازم کا حامل ہو اور اس کی تندی اس درجہ نہ ہو کہ وہ حقیقت کے حدود کو توڑ دے یا وہ کسی خبر کے جواب میں شر کو پیش کرے۔ احساسات و جذبات کے توازن سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ منتشر اور بے زاویہ نہیں ہیں۔ بلکہ کسی خاص رخ کی طرف ہیں جو اس زندگی کی جانب ہے جس کے خدوخال اس میں جھلک رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ایک اسلامی ادیب کے لئے انکی تربیت نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ تجربہ اس کے ردّ عمل کی وہ ہیئت REACTION PATTERN رونما نہیں ہو سکتی جو صالح اقدار کو ادب میں پیدا کر سکے۔

شعور و لاشعور

لاشعور و شعور اگر ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں لیکن یہ ہم آہنگ بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا نظری نہیں ہے جتنا عملی ہے۔ اور یہ تمام تر اس پر منحصر ہے کہ انسان اپنی خواہشات کی کس طرح تربیت و تنظیم کرتا ہے۔ صالح ادب کے لئے اس کی ہم آہنگی ایک حد تک بہت ضروری ہے۔ کیونکہ لاشعوری محرکات اور شعوری سطح پر حرکت کرنے والے خیالات میں ایک ایسی مطابقت درکار ہے جو اندرونی کشمکش INTERNAL CONFLICTS سے ذہن کو مامون رکھے صالح اور تعمیری ادب اپنے اندر تخریب کے جائز پہلو ضرور رکھتا ہے لیکن ایک ادیب کے تاثرات اس درجہ غیر معتدل نہ ہوں کہ بالآخر جذبۂ تخریب ایک لاشعوری

محرک کی حیثیت سے اپنا عمل شروع کرتے تخریبی عنصر ادب اور صالح ادب میں بھی نمایاں امتیاز ہونا چاہئے۔

خیالات و رجحانات

ادب میں غالباً یہ چیز آسانی سے واضح ہو جاتی ہے۔ ایک شخص نے کس حد تک تصنع سے کام لیا ہے اور کس حد تک اس کے رجحانات و خیالات میں اسی قسم کے جذبات کی بھی آمیزش ہے یہ ہم آہنگی در اصل ایک متجانس نشوونما کی از سر نو تنظیم PSYCHIC REORIENTATION کے لئے ایک عرصہ درکار ہے۔ اس درمیانی وقفے میں معیار مطلوب کا حصول فوری طور سے ممکن بھی نہیں ہے۔ اس لئے صالح ادب کی ترویج اور ترقی بہرحال قابلِ قدر اور حوصلہ افزا ہے ؎

"آوازۂ خلیل ز تعمیر کعبہ نیست
مشہور شد ازاں کہ بآتش نکو نشست"
(نظیری)

ہونے لگیں۔ گویا واقعات کو واقعات ہی کی حیثیت سے لایا جائے لیکن اس کا وہ عریاں طریقہ نہ ہو جو آج کل رائج ہے۔ کیونکہ صالح ادب کی یہی ایک عظیم خوبی ہے۔

غرضیکہ یہ ہیں مختصراً وہ چند نفسیاتی لوازم جو صالح ادب کی پیدائش اور اس کی ترقی کے لئے ضروری ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ عمل بہت دیر طلب اور دقت طلب ہے۔ ذہنی نشوونما HARMONIOUS DEVELOPMENT سے پیدا ہو سکتی ہے۔ ادب میں صالح فکر کے لئے صالح جذبات کی وہ محرک قوت درکار ہے۔ جو اس کو پاکیزہ مگر مصنوعی خیال بن جانے سے بچائے اور اس میں روحِ ادب کو برقرار رکھے۔ صالح ادب میں تخیل کو بہرحال واقعات سے ہر طرح مربوط ہونا چاہئے تاکہ اس کا افادی پہلو ختم نہ ہو جائے۔ ادیب کے اپنے رجحانات کا عکس واقعات پر اس طرح پڑنا چاہئے کہ وہ مسخ نہ ہو جائیں بلکہ جس طرح وہ اس کو محسوس ہوتے ہوں اسی طرح وہ اس کی تخلیقات کے پڑھنے والے کو بھی محسوس

انگارے ——— صفحہ ۴۶ سے آگے

نکال کر پھینک دینا چاہتا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے ضمیر پر منوں وزن رکھ دیا ہو۔ اور وہ اس ناقابلِ برداشت وزن کے نیچے کچلا جا رہا ہو۔

اور آخر اس نے یہ انگارہ اس کے منہ پر دے مارے جس نے اس کو جھلسانے کا سامان کیا تھا۔ اور جب وہ واپس آ رہا تھا تو اسے اپنے شانے ہلکے ہلکے محسوس ہو رہے تھے اور اس کے دماغ میں ایک کیف انگیز مسرت مچل رہی تھی۔

سید احمد سید

غزل

لوائے یک نفس لے کر یہاں آیا تو کیا آیا
برائے نام قبضہ میں نشاں آیا تو کیا آیا

جب اپنی وضع چھوڑی تھی پہنچتا ان کے کانوں تک
شکستہ دل سے نالہ تا زباں آیا تو کیا آیا

چمن کی لوٹ پر بادِ حوادث سے کوئی پوچھے
ترے حصہ میں میرا آشیاں آیا تو کیا آیا

مری بربادیوں کی دشمنوں کو میرے شہ دیکر
پئے نصرت پیامِ دوستاں آیا تو کیا آیا

زمانے! تو حمایت پر خس و خاشاکِ گلشن کی
جلو میں اپنے لے کر آندھیاں آیا تو کیا آیا

جب آیا تھا تو لاتا ساتھ سرگرمِ عمل شعلے
قفس تک آشیانہ سے ہوا آیا تو کیا آیا

کہیں چھینا گیا کچھ اور کہیں کچھ ہائے منزل تک
اگر یوں لٹ لٹا کر کارواں آیا تو کیا آیا

زباں کیا لب ہلانا بھی تو ہے دشوار اے سیدؔ
اب ایسے وقت میں جوشِ بیاں آیا تو کیا آیا

الم مظفر نگری

غزل

کبھی غربت کو بھی اپنا وطن کہنا ہی پڑتا ہے
قفس کی شام کو صبحِ چمن کہنا ہی پڑتا ہے

جو معنیٰ سکوتِ لب سمجھ لیتے ہیں ان کو تو
خموشی کو بھی اِک طرزِ سخن کہنا ہی پڑتا ہے

بتوں کے حُسن کو چمکا دیا ذوقِ پرستش نے
مجھے اکثر یہ پیشِ برہمن کہنا ہی پڑتا ہے

جنونِ عشق کی جب حد سے بڑھتی ہے گلو گیری
گریباں کو گریبانِ کفن کہنا ہی پڑتا ہے

بغیر اس کے نہیں ہوتی ہے زینت آدمیت کی
محبّت کو وفا کا پیرہن کہنا ہی پڑتا ہے

بہاروں میں شباب لالہ و گُل کی اداؤں کو
کسی پردہ نشیں کا بانکپن کہنا ہی پڑتا ہے

نوازش ان کے جلوؤں کی ہوا کرتی ہے جس دل پر
اسے آئینۂ ہر انجمن کہنا ہی پڑتا ہے

جھلکتا ہے حجابِ رنگ و بُو سے رنگِ بیدردی
بہارِ باغ کو خونِ چمن کہنا ہی پڑتا ہے

جو موجِ بُوئے گُل غمّازیاں کرتی ہے گلشن میں
اُسے اِک روزنِ برقِ شعلہ زن کہنا ہی پڑتا ہے

عیاں ہیں پہلوئے تخریب سے تعمیر کے جلوے
شکستِ انجمن کو انجمن کہنا ہی پڑتا ہے

الم حُسنِ قدامت رنگ تازہ سے ٹپکتا ہے
ہر اِک جدّت کو تصویرِ کہن کہنا ہی پڑتا ہے

اظہار رامپوری

غزل

سو تڑپ دل میں لئے عزمِ جواں آیا ہے
زندگی بن کے ترا دردِ نہاں آیا ہے

جاں بلب خاک بسر اشک فشاں آیا ہے
یوں تری بزم سے اِک سوختہ جاں آیا ہے

ہر نفس ٹھوکریں کھائی ہیں تجسّس میں ترے
ہر قدم راہ میں اِک سنگِ گراں آیا ہے

بن گئی دم پہ جگر خون ہوا، دل ٹوٹا
جب کہیں جا کے کچھ اندازِ بیاں آیا ہے

جانے کیا معرکۂ عشق میں دل پر گذری
خون میں ڈوبا ہوا اشکِ رواں آیا ہے

اُن کو حاصل ہے دو عالم کی مسرّت اظہار
میرے حصّہ میں غمِ کون و مکاں آیا ہے

عروج۔ زیدی۔ بدایونی

غزل

آنکھ خوں بار نہیں سانس شرر بار نہیں
میں ابھی تیری نوازش کا سزاوار نہیں

اور جذبے ہیں مگر جذبۂ ایثار نہیں
ہم میں کردار تو ہے عظمتِ کردار نہیں

مجھ کو عرفان نہ ہو یہ ہے جُدا بات مگر
وسعتِ دہر میں اِک فرد بھی بیکار نہیں

ٹوٹ جاتا ہے تو بڑھ جاتی ہے دل کی قیمت
حیف وہ دل کہ جو شائستۂ آزار نہیں

ان میں عکاسیٔ ماحول کی انگڑائی ہے
میرے شعروں میں بیانِ لب و رُخسار نہیں

فطرتِ حُسن پہ بھی میری نظر رہتی ہے
میں فقط رنگ و جوانی کا پرستار نہیں

اپنے خالق کی ہوا کرتی ہے مخلوق دلیل
ہستیٔ دوست سے گنجائشِ انکار نہیں

رات بھی ڈھل گئی تارے بھی ہیں رُوپوش مگر
بزمِ گیتی میں ابھی صبح کے آثار نہیں

اُس پہ کیا خاک سجے جامۂ الفاظ عروج!
جس تخیّل میں کوئی ندرتِ فن کار نہیں

عبدالمجید حیرت سہلوی

عالم جو نظر سے دیکھتا ہوں
معمور اثر سے دیکھتا ہوں
کہتا ہوں وہی زبانِ غم سے
جو دیدۂ تر سے دیکھتا ہوں
اتنا تو ہوا کہ غم کسی کا
وابستہ جگر سے دیکھتا ہوں
ہر فتنۂ صبح، شب سے پہلے
گزرا ہوا سر سے دیکھتا ہوں
لپٹی ہوئی شب کی رُوسیاہی
دامانِ سحر سے دیکھتا ہوں
آتی ہوئی اِک نئی قیامت
ہر راہ گذر سے دیکھتا ہوں
تھوڑی سی وہ گھر کی عافیت بھی
جاتی ہوئی گھر سے دیکھتا ہوں
آثار، ہزار خستگی کے
دیوار سے در سے دیکھتا ہوں
آباد دلِ حزیں حیرت
پھر برق و شرر سے دیکھتا ہوں

عروج قادری

آج کی شب جانے کس کا جلوہ میرے گھر میں ہے
تابشِ خورشید پیدا ایک اِک اختر میں ہے
چند قطرے ہی اگر تم کو نظر آئے تو کیا
اِک جہانِ آرزو پوشیدہ چشمِ تر میں ہے
بس کھنچی آتی ہیں ہر ہر سمت سے پیشانیاں
جانے کیا کیسا تیرے آستانِ در میں ہے
تو جنہیں مجبور ہے ان سے غرض کا کیا سوال
تیری خوشنودی ہے مقصد تیرا سودا سر میں ہے
مٹ گیا دنیا سے شاید مشرق و مغرب کا بُعد
آگ مغرب میں لگی لیکن تپش خاور میں ہے
ایک چنگاری سمجھ کر ہنس نہ دو تحقیر سے
شعلۂ بیباک مخفی، مختصر اخگر میں ہے
ربط تیرے شعر میں باقی نہیں لیکن عروج
ایک معنی خیز رشتہ تیرے شعر تر میں ہے

عمیق، ایم، اے

ولولے اب لبِ اظہار تک آ پہنچے ہیں
قافلے منزلِ دشوار تک آ پہنچے ہیں
دی زمانے نے جو فرصت تو چلا آؤں گا
تیرے پیغام دلِ زار تک آ پہنچے ہیں
تیز رفتار زمانے نے جنہیں جنم دیا
وہ مسائل مرے افکار تک آ پہنچے ہیں
کتنے ہی مرحلے تاریخ کے طے کرتے ہوئے
زلزلے ظلم کی دیوار تک آ پہنچے ہیں
جن کے دامن سے نئی صبح ہویدا ہوگی
وہ اندھیرے مری دیوار تک آ پہنچے ہیں
رسمِ چنگیز مٹانے کے لئے آج عمیق
ہم بھی گفتار سے کردار تک آ پہنچے ہیں

بشیر اختر مالیگانوی

قدم قدم پہ نظر آتے ہیں نظام نئے
خطیب وقت بھی دیتے ہیں اب پیام نئے
ندیم عالمِ نو میں ہیں صبح و شام نئے
نئی صراحی ہے، ساقی نیا ہے جام نئے
امیرِ کارواں بدلے ہیں منزلیں بدلیں
نئے ہیں راہی، نئے رہنما، مقام نئے
ہیں چند پھولوں پہ مسرور اِدھر طیورِ چمن
اُدھر بچھائے ہیں صیاد نے بھی دام نئے
شراب و شیشہ و ساغر سبھی بدل ڈالو
ہیں پیرِ میکدۂ نو کے اہتمام نئے
ہوئی ہے لرزہ بر اندام کائناتِ جہاں
دیئے پیامبروں نے بھی ہیں پیام نئے
نقوشِ رسمِ کہن کے نشاں بدل ڈالو
نئے زمانے میں ہیں ہر طرف نظام نئے
وہ دن گئے کہ مصیبت تھا سانس لینا بھی
بنائے زندگیٔ عشق نے مقام نئے
دماغ و دل پہ فسونِ فرنگ چل نہ سکا
اثر دیئے ترے افکار نے پیام نئے

ابنِ احمد

نظرِ ثانی

اُس نے افسانے کی آخری سطور لکھ کر قلم رکھتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا اور سوچا، کتنا حسین ہے یہ افسانہ! یہ . . . میں چھپے گا اور اسے ہزاروں آدمی پڑھیں گے . . . . اور میں ایک کامیاب اسلامی ادیب کہلاؤں گا . . . . اور فرشتے نے اس گھنٹہ کی رپورٹ ختم کرتے ہوئے سوچا . . . . . سارے خرمن کو ایک بجلی کس طرح تباہ کر جاتی ہے!

نجات اللہ صدیقی کا مندرجۂ بالا افسانچہ "افسانہ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جو اسلام پسند حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔ نمود و نمائش کا جذبہ اسلامی ادیبوں کو واقعی زیب نہیں دیتا ضرورت تھی کہ نفس کی اس لطیف ترین شرارت پر ایک کاری ضرب لگائی جائے اور یہ کام "افسانہ" کے مصنف نے پوری چابکدستی سے انجام دیا اس لحاظ سے یہ افسانہ اپنے اندر بہت بڑی افادیت رکھتا ہے مگر کچھ دنوں سے اس کے ردِ عمل کے طور پر ہمارے ادیبوں میں ایک اور خطرناک مرض کی علامتیں نمودار ہو رہی ہیں یعنی "وہم" کی حد تک بڑھی ہوئی احتیاط۔ شہرت پسندی کا جذبہ بلاشبہ کچلے جانے ہی کے قابل ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بعض اچھے فن کاروں نے اس مذموم جذبہ کے ساتھ ہی اپنا دل بھی کیل ڈالا ہے۔ عزم سے ان پر ایک قسم کی مُردہ دلی چھائی ہوئی ہے۔ جیسے وہ حرکت کی راہ پر قدم بڑھاتے بڑھاتے یکایک خطرہ کا بورڈ دیکھ کر جمود کے دامن میں روپوش ہو گئے ہوں۔

ابنِ احمد کا افسانچہ "نظرِ ثانی" اس جمود کو توڑنے کی ایک کوشش ہے خدا کرے کہ کامیاب ثابت ہو۔ حق یہ ہے کہ دونوں ہی بیماریاں مہلک ہیں نمود و نمائش بھی اور جمود و تعطل بھی۔ اُمید ہے کہ "افسانہ" اور "نظرِ ثانی" ان بیماریوں کی تیر بہدف دوائیں ثابت ہوں گی۔

(ادارہ)

وہ ایک فن کار تھا، لیکن محتاط ——
اس کی تخلیقات معرکۂ خیر و شر میں خیر کا ساتھ دینے والی تھیں
اس کے افسانے بے شمار جذبات کو ابھارنے والے تھے
اس کی نظمیں لاکھوں دلوں کو گرمانے والی تھیں۔
اس کے ناولے ہزاروں کرداروں کو سنوارنے والے تھے
اس کی غزلیں سینکڑوں روحوں کو تڑپانے والی تھیں۔
اس کے مقالے بہت سے ذہنوں کو صاف کرنے والے تھے۔
الغرض اس کی فن کارانہ صلاحیتیں حق کے کام آ رہی تھیں
اور اس کے ادبی کارنامے اس کی نیکیوں میں اضافہ کر رہے تھے
لیکن —— ایک دن اُسے خیال آیا
میں لکھوں گا اور وہ چھپیں گے
وہ چھپیں گے اور بکیں گے
یہ نمود اور نمائش ہے!
یہ پیشہ اور تجارت ہے!!
میں فن کار نہیں ریاکار ہوں!!!
اُس نے اپنے ذہنی دریچہ پر نظرِ ثانی کی
وہ محتاط تھا مگر اب نہایت محتاط ہو گیا ——
اسی لمحہ اس کے نفسانی وجود نے اپنی تن آسانیوں کے لئے ایک مقدس
پناہ گاہ ڈھونڈھ لی
شیطان نے اس ٹھنڈی چال کی کامیابی پر اطمینان کا سانس لیا
فرشتے نے باطل شکن فن کاروں کی فہرست پر نظرِ ثانی کی۔
اور کہیں لکھے ہوئے ناموں میں سے ایک نام کم ہو گیا۔

منظر حسین

سرکار کی خدمت میں

پہلی درخواست ۔ جناب عالی

مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ دفتر میں ایک ہیڈ کلرک کی جگہ خالی ہونے والی ہے لہٰذا میں بصد ادب اپنے کو ایک امیدوار کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں۔

جہاں تک تعلیم و تجربہ کا تعلق ہے گذارش ہے کہ میں نے ۱۹۳۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کیا تھا اور مختلف اہم جگہوں پر کام کرنے کے بعد اب تقریباً چھ سال سے حضور کے زیر سایہ ایک سینیئر کلرک کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں اور بفضل خدا آج تک حضور کو اور نہ ہی حضور کے ماتحت افسروں کو میرے کام کے بارے میں کسی قسم کی کوئی شکایت ہوئی۔

میری موجودہ تنخواہ چالیس روپیہ ہے۔ سارٹیفکیٹ کے مطابق (جس کی ایک نقل منسلک ہے) اور میرے متعلقین کی تعداد بارہ ہے جن کے بنیادی حقوق موجودہ تنخواہ میں کفایت کرنے کے قابل نہیں۔

امید ہے سرکار میری درخواست پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے جس کے لئے میں ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ اور سرکار کے اقبال کی بلندی کیلئے ہمیشہ دعاگو۔

آپ کا فرمانبردار خادم
احمد اللہ نجاشی
سینیئر کلرک سیکشن ــــ

مورخہ ۳ر فروری ۱۹۴۸ء

(۲)

مسٹر احمد اللہ نجاشی کی درخواست پیش کی جاتی ہے اور ان کے کیس کی پُرزور سفارش۔

آئی ۔ آئی ۔ برنی
ہیڈ کلرک۔

مورخہ ۱۰ر اپریل ۱۹۴۸ء

(۳)

لیکن تم نے اس کے کام کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ تمہاری سفارش کی بنیاد کیا ہے؟

ایچ ۔ جی ۔ رونر
آفس سپرنٹنڈنٹ

مورخہ ۱۲ر اپریل ۱۹۴۸ء

(۴)

مسٹر نجاشی ایک بہت اہم کام پر لگے ہوئے ہیں۔ پورے برانچ میں ان کی ٹکر کا کوئی آدمی موجود نہیں۔ انہیں جو کام دیا جاتا ہے اسے سلیقہ سے کرتے ہیں اور اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ مجھے ان سے بہت امداد ملتی ہے اور میں ان کے کام سے بہت خوش ہوں اور مطمئن۔

آئی ۔ آئی ۔ برنی
مورخہ یکم مئی ۱۹۴۸ء

ایچ ۔ سی

(۵)

ہیڈ کلرک ــــ مجھ سے ملو۔

ایچ ۔ جی ۔ رولر
مورخہ ۱۰ر مئی ۱۹۴۸ء

او ۔ ایس

(۶)

دوخواست ضروری ایکشن کے لئے پیش کی جاتی ہے۔

ایچ ۔ جی ۔ رولر
مورخہ ۸ر جولائی ۱۹۴۸ء

او ۔ ایس

(۷)

او ۔ ایس ــــ یہ درخواست کس غرض کے لئے پیش کی گئی ہے

ڈبلیو ۔ ڈبلیو ۔ جوزف
(ڈپٹی اسسٹنٹ ڈائرکٹر)
مورخہ ۲ر اگست ۱۹۴۸ء

(۸)

یہ مسٹر نجاشی (سینیئر کلرک) کی درخواست ہے۔ ہیڈ کلرک کی خالی جگہ کے لئے۔ اگر اجازت ہو تو اے ۔ او ۔ (O ۔ A) کو ضروری ایکشن کے لئے بھیج دی جائے۔

ایچ ۔ جی ۔ رولر
او ۔ ایس ۔
مورخہ یکم ستمبر ۱۹۴۸ء

(۹)

بھیج دی جائے۔

ڈبلیو ۔ ڈبلیو ۔ جوزف
مورخہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۴۸ء

(۱۰)

مسودہ

نمبر ۴۵ بی (۲۱) ۵۴ ——— بنام :- ایڈمنسٹریٹیو آفیسر ———

موضوع ——— ہیڈ کلرک کیلئے درخواست

مسٹر احمد اللہ نجاشی۔ سینیئر کلرک کی درخواست برائے ہیڈ کلرک کی ضروری ایکشن کے لئے بھیجی جاتی ہے۔ ڈی ۔ اے ۔ ڈی ۔

حسب حکم مورخہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۴۸ء مسودہ برائے دستخط پیش کیا جاتا ہے۔

آئی ۔ آئی ۔ برنی
مورخہ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۴۸ء
ایچ ۔ سی

ایچ ۔ جی ۔ رولر
مورخہ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۴۸ء
او ۔ ایس

(۱۱)

ٹائپسٹ ——— صرف ایک کاپی

آئی ۔ آئی ۔ برنی
مورخہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۴۸ء
ایچ ۔ سی

(۱۲)

برائے دستخط پیش:

آئی ۔ آئی ۔ برنی
مورخہ ۱۵ر نومبر ۱۹۴۸ء
ایچ ۔ سی

ایچ ۔ جی ۔ رولر
مورخہ ۱۸ر نومبر ۱۹۴۸ء
او ۔ ایس

(۱۳)

مسٹر نجاشی کو بھیجو ——— میں ان سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

مورخہ ۲۰ر نومبر ۱۹۴۸ء ڈبلیو ۔ ڈبلیو ۔ جوزف

(۱۴)

دفتر ——— صاحب بہادر

نمبر ۴۵ بی (۲۱) ۵۴/ ۲۵۱۵ بنام :- ایڈمنسٹریٹیو آفیسر صاحب بہادر

یکم دسمبر ۱۹۴۸ء

موضوع :- ہیڈ کلرکی کے لئے درخواست

مسٹر احمد اللہ نجاشی کی درخواست ضروری ایکشن کیلئے بھیجی جاتی ہے۔

(دستخط) ڈبلیو ۔ ڈبلیو ۔ جوزف
ڈپٹی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ———

دوسری درخواست ——— جناب عالی۔

میں نے مورخہ ۴ر فروری ۱۹۴۸ء کو آپ کی خدمت میں ایک درخواست اس مضمون کی پیش کی تھی کہ دفتر میں ایک ہیڈ کلرک کی جگہ خالی ہونے والی ہے۔ مجھے اب پتہ چلا ہے کہ وہ جگہ خالی ہو کر بھر بھی گئی ہے (اگرچہ وہ شخص جسے ہیڈ کلرک بنایا گیا ہے۔ میٹرک بھی پاس نہیں اور نہ ہی وہ کچھ زیادہ تجربہ کار ہے) اب کچھ اور جگہیں عنقریب ہی خالی ہونے والی ہیں۔ لہٰذا میں ان میں سے ایک کے لئے پھر درخواست پیش کرتا ہوں، اس گذارش کے ساتھ کہ گرانی کی وجہ سے موجودہ تنخواہ میں میری اور میرے بال بچوں اور دیگر متعلقین کی گذر بسر نہیں ہو رہی ہے۔ میرے متعلقین کی مجموعی تعداد اب تیرہ ہے۔ جس میں سے چھ مستقل طور پر بیمار رہتے ہیں مگر ان کا علاج نہیں ہو سکتا۔ میری بیوی سخت بیمار ہے اور اس کے علاج کے لئے مجھے روپیوں کی سخت ضرورت ہے۔ امید ہے سرکار میرے حال پر رحم کریں گے۔

آپ کا دنا دار خادم
احمد اللہ نجاشی
سینیئر کلرک سیکشن ———

مورخہ ۲۰ر جنوری ۱۹۴۹ء

(۲)

مسٹر نجاشی کی درخواست پیش کی جاتی ہے ——— کچھ دنوں سے ان کا کام خراب ہو رہا ہے۔ انہوں نے مختلف درخواستوں میں بیوی کی علالت کا بہانہ بنا کر بہت سی چھٹیاں لے ڈالی ہیں۔

آئی ۔ آئی ۔ برنی
مورخہ ۳ر مارچ ۱۹۴۹ء
ایچ ۔ سی

(۳)

کیا مسٹر نجاشی نے اپنی بیوی کی علالت کا سارٹیفکٹ دیا ہے؟

ایچ ۔ جی ۔ رولر
مورخہ ۱۲ر اپریل ۱۹۴۹ء
او ۔ ایس

(۴)

جی نہیں ——— مسٹر نجاشی سے ان کی بیوی کی علالت کا سارٹیفکٹ مانگا جائے۔

آئی ۔ آئی ۔ برنی
مورخہ ۲۰ر اپریل ۱۹۴۹ء
ایچ ۔ سی

(۵)

مسٹر نجاشی ——— سارٹیفکٹ دو۔

ایچ ۔ جی ۔ رولر
مورخہ یکم مئی ۱۹۴۹ء
او ۔ ایس

(۶)

مسٹر نجاشی ـــــ بیوی کی بیماری کے ثبوت میں ایک ہفتہ کے اندر سارٹیفکٹ دیجئے۔

آئی ـ آئی ـ برنی
ایچ ـ سی

مورخہ ۱۲ر مئی ۱۹۴۹ء

(۷)

ہیڈ کلرک ـــــ جناب میری بیوی سخت بیمار ہے لیکن میرے پاس دو پیسہ نہیں کہ اس کا علاج کراؤں۔ جب علاج نہیں ہوتا تو سارٹیفکٹ کہاں سے ملے گا؟ مجھے افسوس ہے۔ آپ نے میری درخواست پر اچھے کلمات نہیں لکھے ـــ حالانکہ آپ میرے حالات کا پورا پورا علم رکھتے ہیں ـــــ میں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ ان حالات کے تحت ایک عام انسان کا دماغ کام نہیں کر سکتا ـــــ میرا کام صرف اسی لئے خراب ہو رہا ہے کہ مجھے دماغی سکون اور جسمانی راحت میسر نہیں۔

آپ کا خادم
احمد اللہ نجاشی ـ سینیئر کلرک

مورخہ ۱۳ر مئی ۱۹۴۹ء

(۸)

مسٹر نجاشی کا جواب پیش کیا جاتا ہے۔ انہیں اپنی بیوی کو سرکاری اسپتال میں فوراً داخل کر دینا چاہئے۔ جہاں اس کا باقاعدہ معائنہ کیا جا سکے۔

آئی ـ آئی ـ برنی
ایچ ـ سی

مورخہ ۲۴ر جون ۱۹۴۹ء

(۹)

مسٹر نجاشی اپنی بیوی کو فوراً اسپتال میں داخل کر دیں۔

ایچ ـ جی ـ رولر
او ـ ایس

مورخہ ۲۸ر جون ۱۹۴۹ء

(۱۰)

مسٹر نجاشی ـــــ نوٹ کیجئے۔

آئی ـ آئی ـ برنی
ایچ ـ سی

مورخہ ۳۰ر جون ۱۹۴۹ء

(۱۱)

ہیڈ کلرک ـــــ جناب، گذارش ہے کہ میں اپنی بیوی کو اسپتال میں داخل کر دوں تو میرے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ ـــــ میرے بوڑھے والدین یہ کام نہیں کر سکتے کہ بچوں کو روٹی پکا پکا کر دیں ـــــ وہ پلنگ سے اٹھنے کے قابل ہی نہیں،

آپ کا خادم
احمد اللہ نجاشی ـ سینیئر کلرک

مورخہ ۳۰ر جون ۱۹۴۹ء

(۱۲)

مسٹر نجاشی کا جواب پیش خدمت ہے۔ مسٹر نجاشی اپنی بیوی کے میڈیکل ایکسکشن سے گریز اختیار کر رہے ہیں۔

آئی ـ آئی ـ برنی
ایچ ـ سی

مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۹۴۹ء

(۱۳)

مسٹر نجاشی ـــــ مجھ سے ملو۔

ایچ ـ جی ـ رولر
او ـ ایس

مورخہ ۲۶ر جولائی ۱۹۴۹ء

(۱۴)

مسٹر نجاشی اپنی بیوی کو سرکاری اسپتال بھیجنے سے انکار کرتے ہیں ان کی تمام پچھلی چھٹیاں جن میں بیوی کی علالت کا ذکر ہے نامنظور کی جائیں ـــــ اور ان دنوں میں "غیر حاضر" قرار دیکر ان کی تنخواہ کاٹ لی جائے۔

ایسی صورت میں ان کی درخواست مورخہ ۳۰ر جنوری ۱۹۴۹ء فارورڈ نہیں کی جا سکتی۔

ایچ ـ جی ـ رولر
او ـ ایس

مورخہ ۳۰ر جولائی ۱۹۴۹ء

(۱۵)

مسٹر نجاشی ـــــ مجھ سے ۱۴ر اگست کے بعد ملو۔

ڈبلیو ـ ڈبلیو ـ جوزف

مورخہ ۴ر اگست ۱۹۴۹ء

(۱۶)

مسٹر نجاشی اپنی بیوی کے میڈیکل ایکسکشن کیلئے راضی ہو گئے ہیں۔ چیف میڈیکل آفیسر کے نام ایک خط بھیج دو۔

ڈبلیو ـ ڈبلیو ـ جوزف

مورخہ ۲۶ر اگست ۱۹۴۹ء

(۱۷)

دفتر ـــــ صاحب بہادر

نمبر ۴۵ بی (۲۱) ۵۳/۱۰۲

بنام:- چیف میڈیکل آفیسر ـــــ

۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۹ء

موضوع :۔ مسٹر احمد اللہ نجاشی کی بیوی کا ڈاکٹری معائنہ

برادِ کرم مسٹر احمد اللہ نجاشی (سینئیر کلرک) کی بیوی کا ڈاکٹری معائنہ کر کے جلد از جلد اپنی رپورٹ پیش کیجئے۔

معاملہ اہم ہے۔ (دستخط) ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ جوزف
ڈپٹی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ــــ

(۱۸)

دفتر چیف میڈیکل آفیسر

نمبر ۳۰۴ الف/۱۱ ان/۹۵۱ (۱۴) بنام

ــــ ۶ر دسمبر ۱۹۴۹ء ڈپٹی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ــــ

موضوع :ــ میڈیکل انسپکشن رپورٹ

میں نے مسٹر احمد اللہ نجاشی (عمر ۳۰ سال) کا بغور معائنہ کیا۔ میری رائے میں وہ "ٹی بی" میں مبتلا ہیں ــــ دونوں پھیپھڑے متاثر ہو چکے ہیں

(دستخط) جی ۔ او ۔ برنیڈلے
برائے چیف میڈیکل آفیسر

(۱۹)

چیف میڈیکل آفیسر کی رپورٹ مسٹر نجاشی کے متعلق ــــ پیش ہے۔ میری تجویز ہے کہ مسٹر نجاشی کا بھی ڈاکٹری معائنہ کرایا جائے تاکہ یہ اطمینان ہو سکے کہ وہ خود اس مرض میں مبتلا نہیں ــــ چند دنوں سے وہ آفس میں بُری طرح کھانس رہے ہیں۔

آئی ۔ آئی ۔ برنی
مورخہ ۸ر دسمبر ۱۹۴۹ء اپیچ ۔ سی

(۲۰)

فوراً ــــ انہیں اب ایک ماہ کی "اونڈیو" اور پندرہ دن کی آدھی تنخواہ پر "میڈیکل لیو" دی جا سکتی ہے۔

اپیچ ۔ جی ۔ رولر
مورخہ ۹ر دسمبر ۱۹۴۹ء او ۔ ایس

(۲۱)

ہاں ــــ چھٹی کی درخواست کہاں ہے؟

ڈبلیو ۔ ڈبلیو ۔ جوزف

مورخہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۹ء

(۲۲)

مسٹر نجاشی ــــ چھٹی کی درخواست دیجئے اور اپنا ڈاکٹری معائنہ کرائیے ــــ خط ایشو کیا جا رہا ہے۔

آئی ۔ آئی ۔ برنی
مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۹ء اپیچ ۔ سی

(۲۳)

درخواست حاضر ہے جناب۔ مگر میری درخواست مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۴۹ء پر بھی غور فرمایئے ــــ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس کا حشر بھی ویسا ہی نہ ہو جیسا کہ میری پچھلی درخواست کا ہو چکا ہے۔

اگر میں ہیڈ کلرک بننے میں کامیاب ہو گیا تو آپ کا بیحد مشکور رہوں گا ــــ اور اس قابل ہو جاؤں گا کہ اپنے قرضے وغیرہ چکا دوں ــــ پندرہ دن کی آدھی تنخواہ پر "میڈیکل لیو" میرے لئے مزید قرضے کا باعث ہوگی میرے حال پر رحم کھا کر مجھے پوری تنخواہ دیجئے گا ــــ ایک خاص کیس کی حیثیت سے بڑی مہربانی ہوگی۔

آپ کا خادم
مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۹ء احمد اللہ نجاشی ۔ سینئیر کلرک

(۲۴)

چھٹی منظور کی جائے ــــ سردست ایک ماہ کی رخصت کافی ہوگی۔ "میڈیکل لیو" کے لئے چیف میڈیکل آفیسر کی رپورٹ چاہیئے۔ ــــ ابھی مسٹر نجاشی کی بیماری کا کوئی ثبوت نہیں اس لئے چھٹی انہیں صرف اس غرض کے لئے دی جا سکتی ہے کہ وہ اس دوران میں اپنی بیوی کا خاطر خواہ علاج کرا سکیں۔ جیسا کہ انہوں نے خود اپنی درخواست میں لکھا ہے۔

آئی ۔ آئی ۔ برنی
مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء اپیچ ۔ سی

(۲۵)

مجھے مندرجہ بالا سے کامل اتفاق ہے۔

اپیچ ۔ جی ۔ رولر
مورخہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء او ۔ ایس

(۲۶)

چھٹی منظور کی جاتی ہے۔

ڈبلیو ۔ ڈبلیو ۔ جوزف
مورخہ ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۹ء

(۲۷)

مسٹر نجاشی ـــــ آپ کی چھٹی (صرف ایک ماہ کیلئے) منظور ہوگئی ـــــ اگر ضرورت ہو تو میڈیکل فٹنیو کے لئے دوسری درخواست چیف میڈیکل آفیسر کی رپورٹ کے ساتھ دیجئے گا ـــــ چیف میڈیکل آفیسر کے نام خط لکھ دیجئے۔

آئی - آئی - برنی
ایچ - سی

مورخہ ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۹ء

آخری درخواست ـــ جناب عالی

گذارش ہے کہ آپ کا خط نمبر ۴۵ بی (۲۱) ۵۳/ ۸۱۱۵ مورخہ ۵ر مئی ۱۹۵۰ء ملا۔ آپ کی مہربانیوں کا کہاں تک شکریہ ادا کروں۔ پہلے آپ نے مجھے ایک ماہ کی رخصت متنخواہ کے دی۔ پھر آپ نے پندرہ دن کی چھٹی آدھی تنخواہ پر دی۔ پھر آپ نے تین ماہ کی رخصت بغیر کسی تنخواہ کے دی اور اب آپ نے میرا پتہ ہی کاٹ دیا کیونکہ اس سے زیادہ آپ کے بس میں نہ تھا۔ لیکن سرکار گستاخی معاف کریں، آپ کے بس میں ابھی بہت کچھ ہے۔ میں دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ جہاں آپ نے اتنے کرم کئے ہیں وہاں ایک کرم اور کیجئے۔

"مجھے اور میرے متعلقین کو گولی سے اڑا دیجئے"

آپ کا فرمانبردار خادم
احمد اللہ نجاشی
(ایکس سینیئر کلرک)

مورخہ ۱۵ر مئی ۱۹۵۰ء

شاعری کے عمومی اثرات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جذباتِ انسانی میں ہلچل پیدا کرنے اور دنیائے خیالات کو تہ و بالا کرنے کے بجائے ہماری رہنمائی کریں، نہ صرف بداخلاقیوں اور بدطواریوں سے روکیں۔ بلکہ ہماری زندگی، ہمارے تمدن، ہمارے معاشرے کی ترجمانی کرتے ہوئے رہبری کے فرائض انجام دیں۔ اس لئے کہ شعر عریاں اور انشائے عریاں کے جلوے جلد عام ضرور ہو جاتے ہیں مگر ان کی حیثیت خرمنِ انسانیت کیلئے بجلی سے کم نہیں ہوتی"۔

اختر انصاری۔ اکبر آبادی

ابنِ فرید، بی، اے،

دھوئیں کے بعد

چند دنوں سے ہمارے کمرے پر بڑی پُراسراری فضا طاری ہوتی چلی جارہی تھی۔ کامیابی سے ہمکنار ہونے کے یقین کے ساتھ جو لرزتا ہوا سا خوف جاگزیں ہوجاتا ہے وہ سینوں میں کروٹ لیکر عجب لذت بخش رہا تھا۔ اور ہم اس نئے اجالے کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہوگئے تھے جو سگرٹ کے دم گھٹا دینے والے دھوئیں کے چھٹنے کے بعد ہی نمودار ہونے والی تھی۔ ہم اس کے تصور میں بے پایاں مسرت محسوس کررہے تھے۔ اور نوخیز عزائم نے ہمارے اندر آنے والی گھڑیوں کا مضطربانہ انتظار بھر دیا تھا۔

ہمارا یہ کمرہ مجھ جیسے چند آشفتہ حال نوجوانوں کی پناہ گاہ تھا۔ جہاں اپنی تھکی ہاری زندگی کی کرب انگیز داستانیں ایک دوسرے کو سنایا کرتے تھے۔ پھر سننے والوں کے تاثرات میں جذباتی ہیجان پیدا کرکے اپنے لئے ہمدردی پیدا کرلیا کرتے تھے۔ ان لمحوں میں ہر ایک پر جھنجھلاہٹ اور اذیتی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ اور ہمارے ہاتھ بیرساری طاقت توانائی کھوکر شل سے ہوجاتے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے ظالم حیوانی ماحول کو پارہ پارہ کرکے رکھ دیں لیکن ہماری بےبسی ہمارا مذاق اڑا رہی ہوتی۔ اور ہماری آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے لڑھک کر ہمارے چہروں پر شورائی دھاریاں بناتے چلے جاتے۔ پھر دیا سلائیوں کے جلانے کی آواز سنائی دیتی ننھے ننھے شعلے چمکتے۔ دھواں اٹھتا۔ کمرے کی فضا دھواں دھواں کثیف ہوجاتی اور سینوں پر ایک بوجھ سا بڑھنے لگتا۔ بڑا قنوطی ماحول تھا اس کمرہ کا۔ اور بڑے بےمحل سے افراد تھے یہاں کے۔ جو ایک ہی وقت میں نفرت کے لائق بھی تھے اور دلاسے اور دل دہی کے متعلق بھی!

اس کمرہ کے اثاثہ میں کثرت ان چیزوں کی تھی جن پر خود وہ کمرہ مشتمل تھا۔ یعنی ایک پست شکستہ دروازہ، چار تاریک سیلی دیواریں اور ان چاروں دیواروں سے مل کر بننے والے چار کونے جن پر سگرٹ کے جلے ہوئے ٹکڑوں۔ دیا سلائی کی تیلیوں، کاغذ کے پرزوں، مکڑی کے جالوں۔ اور جھینگروں کا تصرف تھا۔ اور ان سب میں تعلق پیدا کرنے والے سگرٹ کے دھوئیں کے ساتھ دھندلی سی لالٹین اور بوسیدہ فرش کو بھی نمایاں اہمیت حاصل تھی لیکن جب اس میں پناہ لینے والے وہ پانچ چھ حزن و یاس کے مرقعے مل بیٹھتے تو یہ ساری چیزیں ایک عجیب خلاسا بنکر رہ جاتی تھیں یہ سب چیزیں کچھ اس طرح دور ہٹتی ہوئی سی نظر آتی تھیں کہ ان ہر اس زدہ ذہنوں پر اور بھی خوف سا طاری ہونے لگتا تھا۔ اور اس خوف کو شعوری طور پر محسوس کرنے کے بجائے وہ اپنی گفتگوؤں میں اور بھی زیادہ یاس، غمگینی اور ناکامی بھرنے لگتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے بےشک و شبہ یقین کرلیا ہے کہ غم واندوہ کے اس شکنجے سے چھڑانے والی صرف موت ہے۔ اور موت کی طرف بےپناہ سرعت کے ساتھ بڑھنا چاہئے۔ خواہ اس سے حرماں نصیبی اور بھی بڑھتی چلی جائے۔

ہم سب کا یہی معمول تھا اور اسی لئے ہم سب اس کمرے میں جمع ہوا کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے کے غموں کے بوجھ کو اپنے سینے پر لادتے چلے جارہے تھے۔

ایک مدقوق چہرے والے نے کہنا شروع کیا ——— اس کی آنکھیں اس قدر اندر دھنسی ہوئی تھیں کہ بڑی مشکل سے سیاہی میں دوگہرے سے قطروں کے چمکنے کے سوا کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ اس کی آواز میں شکستہ قبروں کا کھوکھلاپن تھا۔ آنکھیں اس کے چہرے کی طرف اٹھنے کے لئے تیار نہ ہوتی تھیں اور کان اس کی آواز سننے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ مگر اس کے باوجود ہم اس آواز اور اس مدقوق چہرے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ کیونکہ یہی تو وہ افراد تھے جن کی سنا تھی

اور اپنی سناتا تھی ـــــ وہ مدقوق چہرے والا کہہ رہا تھا۔

"رفیق۔ اب مجھے یہیں جیا جاتا۔ اب میں کسی طرف نکل جاؤں تو اچھا ہے۔ زندگی کا بوجھ اٹھائے اٹھائے میری رُوح مضمحل ہو چکی ہے۔ اب یہ دُکھ مجھ سے نہیں سہے جاتے معلوم ہوتا ہے میرے لئے دنیا ہی میں سارے عذاب مقرر کر دیئے گئے ہیں اور یہیں مجھے ان سب سے نبٹنا ہے۔ آہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہم سب اس کی آواز کو سنتے رہے اور ہمارے دل ڈوبتے رہے اور وہ خود ہی کہتے کہتے ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔ مگر ہمارے ہونٹوں کو ذرا بھی جنبش نہ ہوئی جیسے ہم ابھی منتظر تھے کہ وہ کچھ اور کہے۔ اس نے ابھی اپنے غم کے گھٹتے ہوئے دہنوں کو پوری طرح خارج نہیں کیا تھا۔ یا شاید ایسی دردانگیز گفتگو ہمیں لذت بخش ہو رہی تھی۔ بہرحال جب تک وہ کہتا رہا ہم کچھ بھی نہ بولے اور جب وہ کہہ چکا تب بھی ہماری زبان کو حرکت نہ ہوئی۔ اور ہم لوگ سوچنے لگے جیسے ہم ان فقروں میں ہی اس کی اصل تکلیف کا کھوج لگا لیں گے۔ ہمارا ذہن یونہی بھٹکتا رہا۔ اور شکست خوردگی بڑھتی رہی۔ پھر ایک اور مدقوق چہرے والا بولا جس کے رخساروں کی ہڈیاں اس طرح ابھری ہوئی تھیں کہ ڈھانچے اور کھوپریاں نظروں کے سامنے ناچنے لگتیں اور موت کھڑی قہقہے لگاتی معلوم ہونے لگتی۔ اور ہم اس ہیئت سے خوف کھانے کے باوجود اپنا جی کڑا کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"جواد، غم کسے لاحق نہیں۔ مگر اس طرح گھبرا جانا اچھا نہیں برداشت کرنے کی قوت پیدا کرو۔ کبھی تو وقت ٹل ہی جائے گا۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ کہیں بہت دور سے بول رہا ہے۔ اور خود اس کی آواز میں اتنی کرب انگیزی تھی کہ اس کے جملے اسکے مانی الضمیر سے احتجاج کرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اور ہم اسے تسلی اور تشفی کے بجائے ایک اور زہر آلود خنجر تصور کرنے لگے۔ ہمارے دلوں کو ہراس بُری طرح جھلسائے دے رہا تھا مگر ہم یہ معلوم کرنے سے قاصر تھے کہ آخر یہ ہراس کیوں کر اُبھر آیا۔ ہم صرف مایوسانہ طور پر سوچ رہے تھے۔ سوچتے جا رہے تھے بغیر کسی نقطہ پر رُکے ہوئے۔

"جواد، یہ تو بتلاؤ بات کیا ہے؟"

ایک اور پھولے پھولے جسم والا بولا جس سے غم پروری نے ساری تروتازگی سلب کر لی تھی۔ اس کی آواز میں بڑی عاجزی سی تھی جیسے وہ کسی قہر کا ستایا ہوا ہو۔ مگر اس عاجزانہ جملے میں وہ سوال پوشیدہ تھا جو ہمارے ماؤف ذہنوں میں ابھی تک واہ نہیں پا سکا تھا۔ ہم بڑی حیرت کے ساتھ اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور پھر سہمی ہوئی اطمینان کی سانس لی ہمیں آمادہ ہونے سے پہلے معلوم کرنا چاہئے کہ اس شکست خوردگی کی وجہ کیا ہے۔

اور ایک اور گرد سے اٹے ہوئے بالوں والے نے اسی سوال کی تائید کی۔ اس کی صورت سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے انتہائی بے بسی میں اس کو میلوں ریت پر گھسیٹا گیا ہو۔ اور روتے روتے اس کی ہچکیاں بند ہو گئی ہوں۔ اُس کی آواز میں ایسی ہی ہچکیوں کا ارتعاش تھا۔ اس نے کہا۔

"ہاں، ہاں جواد یہ تو بتلاؤ کہ آخر ہوا کیا ہے؟"

اور ہم سب سکوت کے عالم میں جواد کے جواب کا انتظار کرنے لگے اور جواد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کب کا مُردہ ہو چکا ہے۔ وہ ایک دم جامد ساکت بیٹھا رہا۔ اس کے گوشت پوست سے خالی چہرے پر لالٹین کی زرد روشنی ایسے آسیبی انداز میں پڑ رہی تھی کہ اگر ہم سب اس کے جواب کا انتظار نہ کر رہے ہوتے تو ایک دم چیخ اٹھتے۔ مگر پھر بھی کوئی کمزور دل خوف زدہ ہو ہی گیا۔ اور اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں جھنجھوڑا ـــــ

"جواد ـــ ؟ ـــــ"

جیسے وہ اُسے جگا رہا ہو۔

اور جواد کی نسوں میں جھرجھری تحریک ہوئی اور اس نے تھکے تھکے سے جملے ادا کرنے شروع کر دیئے ـــــ

"میری یہ قلیل سی آمدنی کسی طرح بھی میری کفیل نہیں ہو پاتی۔ میری ماں بیمار ہے۔ آج سے پانچ دن سے اس کو دوا نہیں ملی میرے بچے چیتھڑوں میں پھر رہے ہیں مگر تو اُن کو بھی دو وقت سے روٹی نہیں ملی ہے اور میری بیوی ـــــ۔ اُس کی آواز بری طرح کانپ رہی تھی اور آنکھوں کے گڑھوں میں نمی سی نظر آ رہی تھی۔ ہم سب پر رقت طاری ہو گئی مگر کوئی مداوا تلاش کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ پھر اس نے ایک بوجھل سانس لے کر کہنا شروع کیا۔ "کہاں تک سناؤں کیا کیا سناؤں، مجھ پر جو بیت رہی ہے وہ ـــــ" ہم نے محسوس کیا وہ سسکیاں لے رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے گڑھے آنسوؤں سے لبریز ہو رہے تھے۔ ہمارے دل بھی بڑے اُداس سے ہونے لگے جیسے ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ ہم سے بچھڑ جائے گا۔ پھر اس کے بچھڑنے سے ہمارا ایک غمخوار کم ہو جائے گا۔ اس تصور سے ہم بڑے خائف سے ہو رہے تھے۔ اور یہ خوف

اور یہ غم ہمیں اُس کے اپنے غموں سے اہم نظر آرہا تھا ہم اتنے بڑے غم کا مقابلہ کیسے کریں گے؟ ـــــ اس لئے ہم سب اس کے درد میں شریک ہوں گے۔ اور ہماری سانسیں بوجھل ہونے لگیں۔

دیا سلائیوں کے جلانے کی آواز سنائی دی۔ ننھے شعلے بھڑک اٹھے اور ایک اور کراہ نے کروٹ لی۔ اور پہلے تاخر کو کسی انجام تک پہونچانے کے بجائے ہم اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ انتہائی نفاست پسندانہ لباس میں ملبوس فرمانے کہنا شروع کیا ـــــ نہ معلوم کیوں وہ اپنی خوش پوشی کے باوجود ایسا نظر آرہا تھا کہ جیسے اس میں کوئی چیز کم ہے اور وہی اہم ہے جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر ویرانی برس رہی تھی۔ اور اس کا سگرٹ جسے جلانے کے بعد اُس نے ایک کش لیا تھا بار بار سلگتا چلا جارہا تھا۔ اُس نے اُس سے بے پروا ہو کر کہنا شروع کیا۔

"جواد، تمہاری تکلیفوں نے میرے دل پر بڑی گہری چوٹ لگائی ہے"۔

اور وہ چوٹ جیسے ہمارے دلوں پر لگی ہم نے غیر ارادی طور پر چاہا کہ اپنے سینوں کو دبالیں۔ ان سینوں کے اندر گوشت کا وہ انتہائی حساس ٹکڑا بڑی تیزی سے حرکت کرنے لگا تھا اور ایک بھول سا ہم سب پر طاری ہوگیا تھا۔ اور وہ سسکیاں لیتا ہوا جواد، جس کی آنکھوں کے گڑھوں میں چمکتے ہوئے دو گہرے قطرے آنسوؤں کے پانی میں ڈوب گئے تھے۔ اپنی آستین سے خشک کرکے انہیں باز یافت کرتے ہوئے، سگرٹ جلا کر اس کی طرف متوجہ ہوگیا مگر اس کا اپنا غم اس کے اندر اب تک زندہ تھا۔ اس کی کنپٹیوں کی دھڑکن اس کے اس راز کو فاش کر رہی تھی۔

گرد سے اٹے ہوئے بالوں والے نوجوان نے اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی سی کرتے ہوئے لمبا کش لگا کر غلیظ دھواں اپنے چاروں طرف پھیلا لیا۔ اور گہری حزنیہ سانس کے ساتھ اُس میں ڈوبنے لگا۔ اور وہ دوسرا مرد قوی جس کے رخساروں کی ہڈیاں ہیبتناک انداز میں اُبھری ہوئی تھیں بے چینی کے ساتھ کروٹ بدل کر نیم دراز ہوگیا۔ جیسے تنویمی عمل کے ذریعہ اس کی رُوح کو اس سے جدا کیا جارہا ہو۔

مگر اس خزاں زدہ پھولے پھولے جسم والے نے ہمیں چھراسا دیا کہ ہمیں اس چوٹ کی تفصیلات معلوم کرنی چاہئیں۔ اور ہم نے ایک بار اطمینان کا سانس لیا اور انتظار کرنے لگے کہ وہ خوش پوش اپنا سلسلۂ کلام شروع کرے۔

اور ہم اس کی ویرانی کو اس سے چھڑا کر الگ پھینک سکیں۔ مگر وہ خاموش رہا معاً اس کے سگرٹ نے اس کی انگلیوں کو جلانا شروع کر دیا اور اس نے چونک کر اُسے پھینک دیا اور بڑے تعجب کے ساتھ ہماری طرف دیکھنے لگا جیسے وہ ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا ہو کہ ہم سب اس کی طرف کیوں متوجہ ہیں۔ اور پھر یکایک چونک کر اس نے گہری سانس لی اور کہنا شروع کیا ـــــ

"میرے ساتھ کوئی نیا واقعہ نہیں ہوا ہے۔ وہی پرانی بندشیں ہیں جو سوہانِ رُوح بن گئی ہیں۔ میں بڑی مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہوں۔ گھر کا کوئی فرد آوارہ سمجھتا ہے۔ کوئی عیاش اور فضول خرچ سمجھتا ہے۔ کوئی کاہل اور بے غیرت سمجھتا ہے۔ میرے اپنے گھر میں مجھے کسی کی ہمدردی نصیب نہیں۔ میں جو کچھ کرتا ہوں شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جہاں جاتا ہوں وہ اُن کے لئے اوباشی کا اڈہ ہوتا ہے۔ میں آخر کیا کروں۔ کیا میں کوئی بچہ ہوں جو مجھے بہلا پھسلا لیا جائے گا۔ مجھے ذرا بھی ذہنی آزادی حاصل نہیں۔ اس مجبور زندگی سے تو موت بدرجہا بہتر"۔ . . . . .

اس کے جملوں میں بڑا شکست خوردہ احتجاج تھا۔ مگر اس کے چہرے پر سے کسی قسم کے عمل کے آثار اس طرح مفقود تھے جیسے اس کے کیڑوں پر سے شکنیں۔ وہ بالکل ویران سا نظر آرہا تھا۔ اور بڑا قابلِ رحم۔ اس کی صلاحیتیں ہر فراغت کے باوجود صرف ایک ہمدردی کے نصیب نہ ہونے کی وجہ سے مردہ ہوتی چلی جارہی تھیں اور وہ ایک مرمریں مجسمہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں رہا جارہا تھا۔

دھواں سگرٹوں سے اٹھ اٹھ کر کمرے بھر میں گھٹ رہا تھا۔ اور سانسوں میں بوجھل پن عود کرنے لگا تھا کہ اس سانحہ نے مزید سگرٹوں کے جلانے کے خیال کو ہی فنا کر دیا۔ اور ہم لوگ اپنی فکروں میں پھر الجھ گئے اور سگریٹ کا دھواں رفتہ رفتہ ہلکا پڑنا شروع ہوگیا۔ اور وہ خوش پوش ایک اضطراب کے ساتھ اپنی انگلیوں کو چٹخاتے ہوئے۔ نہ معلوم کس بات کی توقع کرنے لگا۔

پھر دیا سلائیوں کے جلنے نے سکوت توڑا۔ لوگوں نے ٹمٹماتی ہوئی لالٹین کی زرد آسیبی روشنی میں اضافہ کیا۔ اور دھوئیں نے اُن سب پر محیط ہو جانا چاہا کہ ایک اور گہری سانس ان سب کو چیرتی ہوئی ابھری اور ہماری توجہ کا مرکز بن گئی۔ گرد سے اٹے ہوئے بالوں والے نوجوان نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ ایک جھرجھری لی اور پھر محسوس کیا کہ سب اس کی ہی گہری سانس کی طرف متوجہ ہیں۔

پھولے پھولے جسم والے خزاں زدہ فرد نے گرد سے اٹے ہوئے بالوں والے نوجوان سے سوال کر کے سب پر ایک استفہامی کیفیت طاری کر دی۔

"کیوں منصور؟ ۔ تم نے کیوں ٹھنڈی سانس لی؟"

اس بار ہم زیادہ دیر تک غمناکی میں کھوئے رہنے کی بجائے منصور کے جواب کے منتظر ہو گئے۔ اور اس نے اپنے گرد سے اٹے ہوئے بالوں میں بھر انگلیوں سے کنگھی کرنی شروع کر دی۔ شاید وہ اس بادان کو سنوارنے کی بجائے اُن میں کوئی گم گشتہ سی بات تلاش کرنے لگا۔ مگر فوہ بات جیسے اس کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔ یا شاید وہ واضح تو ہو لیکن وہ خود اُسے آشکار نہ کرنا چاہتا ہو۔ اس نے مڑ کر اُس پھولے پھولے جسم والے خزاں زدہ فرد کی طرف دیکھا۔

"شوکت! میرا راز تم سب پر عیاں ہے ۔ کون نہیں جانتا کہ میں اُس سے محبت کرتا ہوں اور وہ مجھے محض ایک نیا کھلونا سمجھتی ہے۔ اُسے دوسروں سے کوئی باک نہیں۔ اور جب میں ٹوکتا ہوں تو کہتی ہے اپنی پچھلی زندگی پر نظر ڈالو میں کہتا ہوں میں مرد ہوں اور وہ تمسخرانہ قہقہے لگانے لگتی ہے۔ آج وہ تین دن سے کسی کے ساتھ غائب ہے اور میرا دل بُھک رہا ہے۔ وہ میرے لئے عذاب بن گئی ہے اب یہ بے جائی میری قوت برداشت سے باہر ہو گئی ہے۔ مجھے اتنی شرم محسوس ہو رہی ہے کہ بے اختیار خودکشی کر لینے کو دل چاہتا ہے۔"

ہمیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ہم سب کے ماتھوں پر کلنگ کا ٹیکا لگ گیا ہے۔ اور ہم سب منصور کی طرح خودکشی کر لینے کے لئے تیار ہیں۔ اور سگرٹ کا کثیف دھواں ہمارے گرد پھندا سا بنتا چلا جا رہا تھا۔ ہمارے دم گھٹنے لگے اور عجب کپکپی سی ہم سب پر طاری ہو گئی۔ ہمارے ذہن ہر قسم کے غور و فکر سے عاری ہو گئے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا منصور کو کیا غم تھا علاوہ اس کے کہ اس نے کچھ اداسی اور مایوسی کے ساتھ بیان کیا تھا۔ اس لئے ہم بھی اس کی اداسی اور اس کی مایوسی میں شریک ہو گئے تھے۔

یونہی سگرٹ پھُنکتے رہتے تھے دھواں کمرہ کی تنگ فضا میں گھٹتا رہتا تھا اور ہم صرف ایک دوسرے کے غم سنکر کڑھتے رہتے تھے۔ زندگی کے کتنے ہی مسائل بیان ہوتے۔ ہماری آنکھیں نم ہو جائیں اور دل ڈوبنے لگتا اور ہم سرد آہ بھر کر خاموش ہو جاتے۔ اس کمرہ کا یہی تقاضا تھا۔ وہاں افسردہ ہونا ناگزیر تھا اور افسردگی سے بڑھکر سوچنا کسی قدر اہم بھی نہیں۔

لیکن اس کمرہ سے باہر نکل کر ہم اپنی آنکھوں کی نمناکی خشک کر لیتے اور اپنی آنکھوں کو کئی ایک بار جھپکا کر باہر کی فضا سے مانوس کر لیتے اور پھر اس غم سے بے نیاز ہو چکے تھے جسے پہروں کمرہ میں اپنے آپ پر طاری کر رکھا تھا۔ البتہ جب ہم دوسری شام پھر کمرہ کے دروازہ میں قدم رکھتے تو یاسیت پوری طرح زندہ ہو جاتی اور ہم سب کے سب مجبور محض بنکر رہ جاتے۔ ایک طویل عرصہ سے یہی ہو رہا تھا اور اب اس حزن پروری سے دل بھر چکا تھا لیکن اس سے نجات پانے کے بارے میں بھی ہم کچھ نہ سوچ سکتے تھے۔

اور پھر ایک شام کمرہ میں ایک نامانوس مسکراہٹ داخل ہو گئی ہمیں انتہائی خوف کے ساتھ یہ خطرہ ہونے لگا کہ اب یہ دیواریں مسکرا کر بیٹھ جائیں گی۔ اور چھت کی بوسیدہ کڑیاں گھُن گھُن کر گرنا شروع ہو جائیں گی اور ہم سب اسی میں دفن ہو جائیں گے۔ ہمارے دل بڑی زور زور سے دھڑکنے لگے۔ اور ہم نے اس مسکراہٹ کی طرف دیکھا۔ اُف! ـــــ یہ مسکراہٹ شوکت کے ہونٹوں پر تھی۔ ہم میں سب سے زیادہ ہوش مند پھولے پھولے جسم والا خزاں زدہ شخص! ـــــ کیا وہ ہمیں چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ کیا وہ ہم سے الگ ہو جانا چاہتا ہے؟ ۔ ہمیں متعدد ایسے ہی افراد یاد آنے لگے جو اس کمرہ میں داخل ہوئے اور اس کے ماحول میں ضم ہو گئے پھر ایک دن مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور وہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئے۔ آج ہمیں یہی خطرہ شوکت کی طرف سے لاحق ہو گیا تھا۔ ہم نے تعجب کے لہجے میں سہم کر پوچھا۔

"کیا بات ہے شوکت؟"

"کچھ بھی نہیں۔ اِ۔"

"پھر بھی؟ ـــ"

"میں دیکھتا ہوں کہ ہم سب اپنی آنکھوں کو نمناک تو کر لیتے ہیں لیکن اس سے اگلا قدم نہیں اٹھاتے اِ۔"

"وہ کیا۔؟"

"ہمیں ایسے نظم جہاں کو ہی تہ و بالا کر دینا چاہئے جہاں ہم دکھی ہیں۔"

"مگر یہ ہم چند لوگوں کے بس کی بات تو نہیں۔"

"انقلاب کے لئے قدم تو اٹھاؤ سارے دکھی تمہارے چاروں طرف جمع ہو جائیں گے۔"

اُس شام پہلی بار ہم سب نے سوچنا شروع کیا کہ ہمیں کچھ کرنا چاہئے۔ جواد نے اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں کو ملا۔ خوش پوش نوجوان نے اپنے کپڑوں پر سے سگرٹ کی راکھ جھاڑی۔ منصور نے اپنے بالوں کو اپنی انگلیوں کی کنگھی سے سلجھایا اور میں نے پرانے اخبار کے ورق کو ایک طرف رکھکر اپنے عینک کے شیشوں کو

صاف کیا۔ شوکت برابر مسکرا رہا تھا اور رفیق نے یوں کروٹ لی جیسے اس پر سے تنویمی عمل ختم ہو گیا ہو۔ ہم سب جیسے جاگ پڑے تھے اور خوف کے بجائے اطمینان کی گہری سانس لے رہے تھے۔

شوکت نے بہت کچھ کہا اور ہم نے کچھ ایسی حرکت محسوس کی کہ جیسے کمرہ کے باہر نکل جائیں گے اور دور افق کی طرف بڑھتے ہوئے چلے جائیں گے۔ اور طمانیت ہمیں اپنی آغوش میں لے لے گی۔ ہم نے حقارت کے ساتھ کمرہ کی چیزوں پر نظر ڈالی زرد زرد روشنی والی لالٹین جیسے رو رہی تھی۔ اس کی دھوئیں میں الجھی ہوئی کرنوں پر اداسی طاری تھی۔ ہم نے اُسے گل کر دیا اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔

لیکن چند ہی شاموں کے بعد شوکت کے ہونٹوں پر سے مسکراہٹ غائب تھی۔ وہ پھر اُسی طرح رُوکھا پھیکا نظر آ رہا تھا اور اُس پر ویسی ہی خزاں رسیدگی چھائی ہوئی تھی ہم نے پھر اطمینان کا سانس لیا۔ ہمارے ماحول نے شکست نہیں کھائی۔ سگرٹ کے دھوئیں کی کثافت کو ہلکا نہیں کیا جا سکا۔ خلاء میں ٹمٹماتی ہوئی زرد روشنی کی آسیبیت کو فنا نہیں کیا جا سکا۔ لیکن وہ گرد آلود بالوں والا نوجوان منصور جیسے پھر اپنے مانوس ماحول کو زندہ دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔

"تم اُداس کیوں ہو شوکت؟"

"کون میں"

"ہاں تم"

"اوہ ——— میں نے جو اندازہ کیا تھا وہ غلط نکلا"

"کیا تم اُس ساتھی کے بارے میں کہہ رہے ہو جس سے تمہاری اس دن ملاقات ہوئی تھی؟"

"ہاں ——— بالکل شام وہ میرے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ اس کے منہ سے شراب کے بھپکے نکل نکل کر میرا دماغ سڑائے دے رہے تھے۔ میں نے اُس سے پوچھا کیا تم نے شراب پی ہے۔ اُس نے بڑی بیباکی سے کہا، ہاں، میں نے کہا اس سے تم کو کیا ملا۔ وہ بولا صرف دلبستگی۔ مگر تم تو انقلاب لاؤ گے۔ تو میری تفریح سے اس کو کیا تعلق۔ میں اس کے اس جواب سے پراگندہ خاطر ہو گیا۔ میں نے پھر پوچھا کیا تمہارے بہت سے ساتھی اس وقت روٹی کے لئے نہیں ترس رہے ہیں۔ کیا اُن کو فراغت نصیب ہو گئی۔ میرے اس سوال پر اس نے پُر زور قہقہہ لگایا اور کہا یہ ہم انقلاب کے بعد سوچیں گے۔ اور اس نے ہمیں گھسیٹ کر رکشا پر اپنے ساتھ بٹھا لیا ہم نہ معلوم کہاں جا رہے تھے۔ مجھے بڑی اُلجھن ہو رہی تھی۔ وہ رکشا والے سے کہہ رہا تھا۔ دیکھو تم بھی مزدور ہو اور میں بھی مزدور ہوں۔ ہم دونوں مزدور ہیں ہم دونوں ساتھی ہیں اور رکشا والا اور بھی تیز رکشا چلانے لگا۔ پھر ایک رستوراں کے سامنے اُس نے رکشا ٹھہرائی اور نصف سے بھی کم اُجرت اس کی طرف پھینک کر میرا ہاتھ گھسیٹتا ہوا رستوراں میں داخل ہونے لگا۔ رکشا والے نے آواز دی۔ ساتھی یہ پیسے کم ہیں۔ اور اس نے بڑے غضب کے ساتھ ڈانٹ دیا۔ بھاگ جاؤ لیٹرے اٹھائی گیرے۔ میں اس وقت سے سوچ رہا ہوں کیا یہی وہ طریقہ ہو گا جس سے ہم اپنے غم کا مداوا کر سکیں گے؟

ہم سب نے پھر ایک اداس سرد آہ بھری اور سوچنے لگے۔ گرد آلود بالوں والے منصور نے کہا "ہمیں ابھی سے بددل نہیں ہو جانا چاہئے۔ انقلاب کے بعد سب دُور ہو جائے گا"

"انسانیت کو زندہ کئے بغیر اس کی توقع بیکار ہے"

ہم سب کو اس جملہ پر ایک بار پھر بڑا خطرہ سا محسوس ہونے لگا۔ کہیں یہ دیواریں مسمار کو بیٹھ نہ جائیں۔ یہ کڑیاں گھن گھن کر گرنا شروع نہ ہو جائیں۔ اور ہم سب اس میں دفن نہ ہو جائیں۔ ہم سب نے چاروں طرف دیکھا۔ سگرٹ کا دھواں پوری طرح چھٹ چکا تھا۔ لالٹین کی روشنی پہلے سے زیادہ صاف اور تھمی ہوئی سی نظر آ رہی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شوکت یہ جملہ کہہ کر رومال سے اپنا پسینہ پُونچھ رہا تھا۔

ہمیں یہ ساری فضا بڑی پُر اسرار سی معلوم ہونے لگی اور ہم نئے اُجالے کے لئے مل کر سوچنے لگے۔

شاکر نقوی

انگارے

قافلوں کا ایک پلندہ سائیکل کے کیریر پر مضبوطی سے جما کر عزمی سائیکل پر بیٹھ گیا۔ اس کے پیر لاشعوری طور پر پیڈل کے ساتھ دائرے بنانے لگے۔ اس کی روح اضمحلال اور تھکن کے احساس سے کراہ اٹھی تھی اور اس کی طبیعت بڑے بابو کے معنی خیز اور کڑوے کسیلے طنز سن کر مشتعل ہو کر رہ گئی تھی۔ آفس کا وہ شعبہ جس میں وہ کام کرتا تھا گویا سونے کی ایک کان تھا۔ لیکن اس کان نے اب سونا اگلنا بند کر دیا تھا جیسے اس نے اس کے دہانہ پر ایک وزنی چٹان رکھ دی ہو۔ بڑے بابو کی جیب جو شام کو آفس چھوڑتے وقت خوشگوار وزن سے جھول اٹھتی تھی اب ایک دم خالی ہو کر رہ گئی تھی۔ اور بڑے بابو تلملا کر رہ جاتے۔ جیسے عزمی نے اُن کے ہاتھ سے سونے کے نوالے اُن کے منہ تک پہنچنے سے پہلے ہی جھپٹ لئے ہوں۔ اور خاک میں لتھیڑ کر بیروں میں مسل ڈالے ہوں۔ عزمی کو دیکھتے ہی اُن کے شانے پھڑپھڑانے لگتے۔ ان کی آنکھیں نفرت اور بیزاری سے ابل پڑتیں۔ اور وہ فائلیں زور سے ٹرے میں پٹک دیتے۔ پہلے تو انھوں نے تنخواہ کی کمی اور مہنگائی کی شدت کا رونا رویا اور پھر اشاروں اور کنایوں سے عزمی کو دست غیب کے ہتھے اور کفرانِ نعمت کے معانی سمجھائے۔ اس کے بعد طنز، طعنوں اور دبی دبی دھمکیوں پر اتر آئے۔ حتیٰ کہ اس کے Drafts اور Office Notes پر سخت تنقید شروع ہو گئی۔ اور اس کے خلاف الزامات گھڑے جاتے۔ پھر اُن الزامات کی ایک فہرست تیار ہوتی اور اس سے جواب طلب کیا جاتا اور اُس دن تو صاحب نے اُسے ایک آخری تنبیہ بھی کر دی تھی کہ اگر اس نے ایک ہفتہ کے اندر اندر اپنے کام کے اندر اصلاح نہ کی تو اسے برطرف کر دیا جائے گا۔ وہ جانتا تھا کہ ان بے سروپا الزامات اور اس تنبیہ کے پس پردہ اس کا کونسا تصور کارفرما ہے۔ پھر وہ کیا کرے۔ کیا رشوت لینی شروع کر دے۔ اس نے سوچا اور اس کا ضمیر تلملا اُٹھا۔ ابدی اصولوں سے منہ موڑ کر لمحاتی سکون کی خواہش ——— ! وہ بیچ بیچ لرز اٹھا۔ اب صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ تھی "استعفیٰ" اور پھر معاً اس کی بیوہ بہن۔ اندھی ماں اور معصوم بیوی۔

اس کے تخیل میں اُبھر آئیں۔ ماں جس نے اپنا خون پلا کر اُسے پالا۔ اس کی بیوہ بہن جو چند لقمے منہ میں ڈال کر اس لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے کہ کہیں اس کے لئے کھانا کم نہ رہ جائے۔ اس کی بیوی جو اچھے کپڑوں اور زیوروں کے لئے ترستی ہی رہی اور جس نے اپنے میکہ کا زیور بھی اس کا اور اس کی ماں اور بہن کا فاقہ توڑنے کے لئے بیچ ڈالا۔ کیا حال ہوگا ان سب کا اگر اس نے ان پچاسی روپیوں سے بھی ہاتھ دھو لئے جو تیس دن کی سخت محنت اور کاوش کے بعد احسان کے طور پر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ پچاسی روپئے پورے تیس دن کی محنت کا یہ ثمر چار آدمیوں کی ضروریات زندگی کا کفیل تو کیا ہوتا کم از کم قوت لایموت کا ذریعہ تو بن جاتا ہے۔ اور اگر یہ سہارا بھی نہ رہا تو؟ اور وہ اس سے آگے نہ سوچ سکا اور جب وہ اپنے گھر پہنچا تو رشوت اور استعفیٰ کے سخت ٹکراؤ سے اس کا دماغ پھٹا رہا تھا۔ گھر میں ایک خوفناک خاموشی کا عالم طاری تھا۔ بیوی کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور بیوہ بہن شہناز کی پسلیوں پر کسی چیز کا لیپ کر رہی تھی۔ "کیوں آج کیا تکلیف زیادہ بڑھ گئی؟" اس نے اپنی بیوی سے دریافت کیا لیکن اس کے اس استفسار کا جواب بیوی کے وہ آنسو تھے جو دفعتاً اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کی پلکوں پر تڑپنے لگے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ بیقرار ہو کر ننھی شہناز پر جھک گیا۔ "شہناز" اس نے پیار سے پکارا۔ وہ کتنا چاہتا تھا اپنی اس ننھی سی گڑیا کو اور کتنی پسند تھیں اسے اس کی توتلی اور معصوم باتیں وہ دفتر کی تمام الجھنیں اور کلفتیں یکسر بھول جاتا تھا آج اس کی نگاہوں کے سامنے یہ چہکتی ہوئی مینا خاموش ہو گئی تھی۔ اس کی اداس زندگی کی مسکراہٹ اس سے چھینی جا رہی تھی وہ چیخ اٹھا "میں ڈاکٹر کے پاس جاتا ہوں"

"لیکن بھیّا۔ مہینہ کے آخری دن ہیں اور . . . اور" عزمی کی گردن یاس اور بے بسی کے عالم میں اس طرح لٹک گئی کہ جیسے اسے پھانسی کا حکم سنا دیا گیا ہو۔ ایک سرد آہ اس کے لبوں کو چھوتی ہوئی نکلی اور اس نے نہایت کرب

اور بیکسی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ معاً دروازہ پر دستک ہوئی کسی نے اسے آواز دی اور وہ گردن جھکائے ہوئے باہر نکل آیا۔

"میں معافی چاہتا ہوں میں نے ناوقت آپ کو تکلیف دی"

"کوئی بات نہیں فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"

"وہ میں نے ایک درخواست تقاضی کے لئے دی تھی اور میں چاہتا ہوں کہ اگر ہفتہ عشرہ کے اندر روپیہ مل جائے تو۔۔۔۔۔ اور میں اس سلسلہ میں ہر ممکن خدمت کے لئے بھی تیار ہوں" اور پھر چار ہرے ہرے نوٹ عزمی کی جیب میں پہنچ گئے۔

"ارے ارے آپ نے یہ کیا کیا۔ میں اس کا عادی نہیں ہوں"۔ اور عزمی نے نوٹ نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"بس اب آپ انہیں جیب ہی میں رہنے دیں، میں آپ کو رشوت نہیں دے رہا ہوں بلکہ یہ تو بچوں کے لئے۔۔۔۔۔ اور فوراً ہی شہناز کے کراہنے کی آواز آئی اور عزمی کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے موت کا خوفناک پنجہ اس کی شہناز کی نازک سی گردن میں پیوست ہوتا جا رہا ہے۔ اُف وہ کیسا بزدل ہے کہ اپنی اکلوتی اور معصوم بچی کے لئے ڈاکٹر کا بھی انتظام نہیں کر سکتا۔ اس کے دل کے ایک گوشہ میں چھپا ہوا شیطان چیخ اٹھا "پاک ذات صرف خدا کی ہے معصومیت صرف فرشتوں کے لئے مخصوص ہے۔ تو فرشتہ نہیں ایک انسان ہے بغیر شوں کا پتلا"۔ اس نے نوٹوں کو مٹھی میں بھینچ لیا اور ہاتھ جیب سے نکال کر مٹھی کھول دی چار نوٹ مڑے مڑائے۔ اس کی ہتھیلی پر رکھے تھے اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے اس کی ہتھیلی پر انگارے رکھ دیئے ہوں۔ دہکتے ہوئے انگارے۔ اس کا ضمیر درد و کرب کے شدید احساس سے زخمی پرندہ کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔ وہ ایک تکلیف دہ الجھن لئے گھر میں آگیا۔ اس نے ایک نظر اپنی بچی کو دیکھا۔ ننھی سی کلی مرجھا کر رہ گئی تھی۔ اس کے دل میں اپنی بچی کی والہانہ محبت تڑپ اٹھی اور اس نے فیصلہ کر لیا۔ وہ ڈاکٹر کو لانے کے ارادہ سے چلا مگر دو قدم اور اس کا فیصلہ متزلزل ہو گیا۔ یہ روپیہ رشوت کا ہے۔ یہ حرام ہے قطعی حرام اور سخت گناہ اور وہ واپس آکر پھر شہناز کے سرہانے بیٹھ گیا۔ وہ سخت کرب کے عالم میں کراہ رہی تھی۔ اس کی ہر کراہ ایک ضرب تھی۔ عزمی کے دل پر۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے طوفان اور بیچارگی اور بے بسی کے خدا جانے کتنے افسانے تڑپ رہے تھے۔ وہ تڑپ اٹھا اس کے دل میں چھپے ہوئے شیطان نے جیسے اس کے کان میں کہا "یہ تو صرف تیری جیب میں روپے ہیں تو سول سرجن کو بھی لا سکتا ہے۔ اپنی عزیز بچی کے لئے کیا تو اتنا بھی نہیں کر سکتا۔ دیکھ تیری بیوی کس بیکسی سے دیکھ رہی ہے۔ اس غریب کا دل ٹوٹ جائے گا۔ یہ پھر کبھی نہ مسکرائے گی تو گناہ اور ثواب کے چکر میں پھنسکر اس کی مسکراہٹیں نہ چھین" اور وہ فوراً ہی ایک عزم کے ساتھ کھڑا ہو گیا لیکن پھر وہ سوچنے لگا۔ اگر خدا اپنی اس امانت کو واپس ہی لینا چاہتا ہے تو کیا تمام دنیا کے ڈاکٹر بھی مل کر اسے موت کے چنگل سے چھین سکتے ہیں۔ اور وہ پھر ایک کشمکش میں مبتلا ہو کر رہ گیا۔ اس کے دماغ میں چکیاں سی چلنے لگیں اور کنپٹیوں میں درد ہونے لگا۔ اس نے جھنجھلا کر اپنا سر جھٹکا جیسے وہ اس کشمکش اور الجھن کو اپنے دماغ سے جھاڑ دینا چاہتا ہو۔ معاً اسے خیال آیا کیا وہ بھی اس وحشی ناچ میں شریک ہونا پسند کر رہا ہے جس نے ظلم و استبداد کا زہر ختم ہونے والا سلسلہ قائم رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے لاتعداد غرض مند محروم رہ جاتے ہیں۔ اور چند سرمایہ دار ہر جگہ بولی بول کر پالا مار لے جاتے ہیں۔ جہاں عوام کے خادم عوام کو دکھ درد کا مداوا کرنے کے بجائے ہر حقیقت سے اجتناب کر کے صرف اپنی جیب پر اور اپنی خواہشوں پر نظر رکھتے ہیں۔ جہاں زندگی سودا بازی ہے۔ اخلاق سودا بازی۔ رزق سودا بازی اور یہاں تک کہ انسانیت بھی اسی مہیب پتھر کے نیچے کچلتی جا رہی ہے۔ اور چاروں طرف اسی نامور نرس رس کر فرد فرد کو اس قدر نیچا گرا دیا ہے کہ وہ اپنے نفس کی آواز سننے کے سوا ہر طرف سے بے گوش ہو گیا ہے اور یہ شکستہ کشتی اس خطرناک بھنور میں ناچتے ناچتے ایک بار معصیت کی تہوں میں بیٹھ جانے والی ہے۔ کیا وہ بھی اس وحشی ناچ میں شریک ہو؟ کیا وہ بھی یہی سودا بازی کرے؟ کیا وہ بھی اس کشتی کی کیل کانٹا اکھاڑ پھینکنے میں مشغول ہو جائے؟ اس بہیمی فعل کے ارتکاب کو سوچ کر جیسے وہ کانپ گیا۔ اور اپنے معبود حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا "نہیں میرے مالک میں کسی قیمت پر بھی ایسی انسانیت دشمنی نہیں کر سکتا" اور اس کا دل انتہائی کرب سے دہڑکنے لگا اور اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ اور وہ اس لامحدود عظمتوں اور نعمتوں والی ہستی کے حضور پڑا رہا۔ یہاں تک کہ طمانیت اس کے اندر کروٹ لینے لگی اور وہ محسوس کرنے لگا جیسے شہناز کی زندگی واپس آ رہی ہے جیسے اسے اس کا عزم واپس مل رہا ہے، اسے یاد آیا کہ شرما بابو کے بچہ کی بھی ایک مرتبہ یہی کیفیت ہو گئی تھی تو انڈے کی زردی کا لیپ اپنا کام کر گیا تھا اس نے اپنی بہن کو اس کی ہدایت کی اور ایک ناقابل شکست عزم کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس کے پیر سائیکل کے پیڈل کے ساتھ تیزی سے گھومنے لگے۔ اس کی جیب میں نوٹ پڑے تھے مگر وہ نوٹ اسے دہکتے ہوئے انگارے اور پھنکارتے ہوئے سانپ محسوس ہو رہے تھے وہ انہیں جلد سے جلد اپنی جیب سے

(ملاحظہ ہو ص ۲۶)

عابد الانصاری

بہنیں! اور بیویاں!!

میں نے جب کالج کی زندگی میں قدم رکھا تو عجب طرح کا کھلا کھلا ماحول پایا۔ ہر وقت ہنسی، تفریح، مذاق۔ اپنی مرضی۔ اپنی رائے۔ جہاں جی چاہیں جائیں۔ جہاں جی چاہے آئیں۔ کہاں اسکول کی وہ گھٹی گھٹی فضا۔ اسکول گئے تو وہاں ماسٹروں کے سامنے ہیں۔ گھر آئے تو والد صاحب نگراں کیوں دیر ہوگئی تو سوالات کی بوچھاڑ۔ "کہاں گئے تھے؟" "کیوں گئے تھے؟" اور آخری بات یہ کہ "بغیر اجازت کیوں گئے تھے؟" اب بھلا کون بتائے کہ اجازت کہیں ملتی بھی ہے۔ رات کو کبائنڈ اسٹڈی کے بہانہ سے تو کبھی کبھار سینما مل جاتا۔ اور ہاں! جمعرات کو دوستوں کے ساتھ گپ بھی لڑا لیتے تھے۔ بات یہ تھی کہ جمعرات کو تبلیغی جماعت کا گشت ہوتا تھا۔ ہم گشت میں شریک ہوتے یا نہ ہوتے مگر امی جان اکثر تعریف کیا کرتی تھیں۔ "ابھی میرے منے کی عمر ہی کیا ہے مگر دیکھو کوئی جمعرات بھلا چھوٹ تو جائے۔ نمازی کی نماز قضا ہو جائے گی مگر مجال ہے کہ میرے ظفر کی تبلیغی جماعت کی شرکت قضا ہو جائے۔ ویسے تو اس کے باپ ہی کہیں نہیں آنے جانے دیتے۔ مگر تبلیغ کا معاملہ ہے کہتے ہیں بڑا ہو کر بھی تو آخر اسلام کی خدمت ہی کرے گا ابھی سے نہ عادت پڑے گی تو اور کب پڑے گی۔"

میں اپنی تعریفیں سنتا تو بہت خوشی ہوتی مگر کبھی کبھی امی جان حد سے بڑھتیں تو مجھ کو خواہ مخواہ شرمندگی ہونے لگتی تھی۔ اور میں جھنجھلا اٹھتا۔ "امی جان! آپ خواہ مخواہ میرا ثواب ضائع کر رہی ہیں۔"

مگر ——— کالج کی بات ہی اور تھی۔ کلاس کا کام کر کے نہ جایئے تو استاد نہیں پوچھتے۔ ہوسٹل دیر سے پہونچیں تو جنگلہ کود کر اندر آ جائیں یا پھر دربان سے ذرا اخلاق سے پیش آ جائیں تو مجال ہے کہ وارڈن صاحب تک رپورٹ پہونچنے پائے۔ باتیں بھی ایسی کہ شروع ہو جائیں تو ختم نہ ہوں۔ کہاں کے روکھے، پھیکے نماز روزہ کے مسائل ——— "بھئی! اٹلا ایکچیریس تو ——— غضب کر دیا۔" اور ظالم . . . نے میرو ئن کا انتخاب بھی خوب کیا ہے۔" اب تو سوتے ہیں شاید رات کو بھی خواب میں درشن دیئے جائیں۔" ——— یا پھر ذرا موضوع بدلا تو کالج کی لڑکیوں کا تذکرہ۔ "دیکھ بھول تو یار کمال کے بناتی ہے بالوں میں۔" "روحی کے چہرہ کو تو چشمہ نے خراب کر دیا۔ ورنہ غضب کا فیس کٹنگ تھا۔" "اماں! تم بھی کیا باتیں کرتے ہو۔ اس کے چہرہ پر آ کر تو چشمہ بھی بچ گیا۔" "ہم کو تو صاحب موشیلا کا سرمہ پسند ہے۔" ——— شروع شروع میں تو ان خیر مانوس جلوں سے میں بہت گھبرایا۔ مگر جلد ہی ماحول کو میں اور مجھے ماحول ساز گار آ گیا۔ کچھ نام بھی یاد ہو گئے۔ کچھ لڑکیوں کو کھڑکی سے گذرتے ہوئے پہچان لیا ——— دو تین سال کے عرصہ میں ہی ہم کہیں سے کہیں پہونچ گئے ——— زندگی بدل رہی تھی۔ ——— ماحول بدل رہا تھا ——— ہم بھی بدل رہے تھے ——— کالج اب پہلا سا کالج نہ تھا۔ کافی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ بہت سے برقعے اتر گئے تھے۔ کچھ نئے داخلے بے برقعہ بھی ہوئے۔ اگر کبھی اتفاقیہ کوئی لڑکی برقعہ میں نظر بھی آ جاتی تو اس کے پیچھے پیچھے کچھ تیز قسم کے جملے چلتے۔ کچھ ہلکی ہلکی سیٹیاں بجتیں اور پیچھے پیچھے قہقہے بھی سنائی دیتے ——— !

ریحانہ۔ ہمارے کالج کی اچھی خاصی مشہور لڑکی ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کو کالج میں دو تین سال ہو گئے۔ دوسرے انگریزی اسٹائل کے کٹے ہوئے بالوں نے اس کو دوسری ہندوستانی لڑکیوں سے کچھ برتر بنا دیا۔ آج دور سے آتی ہوئی نظر آئی تو لڑکوں نے طے کیا ذرا گیلری میں پھیل کر کھڑے ہو جاؤ ——— ہم نے گیلری گھیر لی۔ ریحانہ اسی دلیرانہ انداز سے بڑھی چلی آئی۔ ایک لڑکا گھبرا کر اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور وہ نکل گئی۔ گیلری میں ایک قہقہہ گونجا۔ خالد بولے "یونہ دیگئے صاحب!" کمال مسکرائے اور جاتے ہوئے سائے کی طرف دیکھ کر بہت تمیز سے کھنکارا۔ اور پھر میری طرف منہ کر کے کہا "اپنی ہی بہنیں ہیں ظفر صاحب!" "اور اپنی ہی بیویاں بھی" میں نے فی البدیہہ جواب دیا۔ سب ساتھی دوبارہ ہنس پڑے ——— پھر گیلری میں بہت دیر تک تذکرے ہوتے رہے۔ بہت سی لڑکیاں گزریں۔ ہم ان کے استقبال کے لئے نت نئی ترکیبیں سوچتے رہے اور نئے نئے جملے تراشتے رہے۔ ہمارے جلوں کے درمیان سے دختران حوا ماپ کرتی ہوئی آگے

بڑھ جاتیں ـــــ "برا ہو پیریڈ کا اگر کبھی کوئی گھنٹہ خالی ملتا بھی ہے تو اتنی جلد گذر جاتا ہے۔ ٹن ٹن ٹن کی آواز نے سب کو چونکا دیا اور ہم سب لوگ کلاس میں جا بیٹھے۔

نیا سال شروع ہو رہا تھا۔ کالج میں عجیب چہل پہل تھی ہر طرف زندگی ہی زندگی تھی۔ خاموش دیواروں میں تین ماہ کی تعطیلات کے بعد پھر قوت گویائی آگئی تھی۔ وہی کمرے جن میں تین ماہ میں مکڑیوں نے ڈیرے ڈال لئے تھے۔ آدمیوں سے بس گئے۔

اس مرتبہ میں خود تو آیا ہی ساتھ ہی اپنی بہن کو بھی لیتا آیا۔ والد صاحب رضیہ کو میٹرک سے آگے تعلیم نہیں دلانا چاہتے تھے مگر میں مصر رہا اور ابا جان کو "تعلیم کے فوائد" اور موجودہ دور میں عورتوں میں تعلیمی ضرورت" کے موضوع پر اکثر لکھا تا رہا۔ مگر والد صاحب کا ایک ہی جواب تھا کہ تعلیم کتنی بھی اچھی چیز کیوں نہ ہو۔ اگر تربیت نہیں تو سب بیکار ہے۔ بار بار ابا جان کو لکھایا کہ ہمارے یہاں لڑکیوں کے بورڈنگ میں پردہ کا بہترین انتظام ہے۔ مجال نہیں کہ کوئی طالب علم اندر جا سکے۔ ملاقات کے بھی اوقات مقرر ہیں۔ پھر ملاقات انہیں لوگوں سے ہو سکتی ہے جو قریبی عزیز ہیں اور جن کے متعلق خود پرنسپل صاحب اجازت دے دیں۔ ابا جان اتنی تقریر سے کچھ نرم ہوئے ادھر امی جان کو تیار کر ہی لیا تھا۔ وہ بھی بول پڑیں۔ ہاں ابا جان! میری خود یہی مرضی ہے۔ اچھا ہی ہے۔ دو بول پیٹ میں پڑ جائیں گے۔ تو وقت پر کام آئیں گے۔"

رضیہ خاموشی سے سب باتیں سنتی اور خوش ہوتی حقیقت تو یہی ہے کہ میں بھی محض رضیہ کے شوق اور ذہانت ہی کے سبب اس کو کالج لے جانا چاہتا تھا۔ بڑی جدوجہد سے پرانی ذہنیت کو نئے دلائل نے بدل ہی دیا۔ میری بحث امی جان کی سفارش اور رضیہ کی ضد ابا جان کی رائے پر غالب آگئی۔ بالآخر میں اور رضیہ دونوں کالج پہونچ گئے۔

کالج کی زندگی سے متعلق جتنی باتیں ضروری تھیں وہ سب کی سب میں نے رضیہ کو سمجھا دیں۔ یہ بھی بتا دیا "اگر کوئی شخص فقرے کسے تو خاموشی سے نکل جانا۔ کبھی جلسوں اور مشاعروں میں مت جانا۔" اور ہاں پردہ کا خاص خیال رکھنا۔" کبھی یہاں کے ماحول کا اثر تم پر بھی پڑ جائے۔" کچھ تو والد صاحب کی نصیحتوں کے اثر نے کچھ ذاتی مشاہدات نے مجھ کو کچھ نہ کچھ پردہ کا قائل بنا دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں رضیہ کے لئے یہی پسند کرتا تھا کہ برقعہ پہنے۔

ہم سب پھر کالج کی رنگینیوں میں کھو گئے۔ پھر وہی باتیں۔ وہی کہانیاں وہی قصے۔ وہی ہنسیں۔ اور وہی ہلکے پھلکے جملے ـــــ

ـــــ تیسرا پیریڈ ختم ہوا۔ اب ہم کو چوتھے پیریڈ میں جانا تھا۔ ہم کلاس سے باہر نکلے ہی تھے کہ ایک کالا برقعہ لہراتا ہوا نظر آیا۔ سب لڑکوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا مسکرائے۔ اور ذرا لکھر گئے۔ لطیفہ نے دیکھتے ہی جملہ چست کیا۔

"اوے صاحب! ایسی کیا نظر لگ جاتی۔" خالد نے ہلکے سے غالب کا شعر گنگنا دیا ؎

جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ ماہِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردہ میں منہ چھپائے کیوں

برقعہ کچھ اور نزدیک آگیا۔ میں نے دبی زبان سے کہا۔ "اپنی ہی بہنیں ہیں۔"

کمال نے میرے منہ کے پاس منہ لاکر کہا۔ "اور اپنی ہی بیویاں ہیں۔" میں ہنس پڑا۔ برقعہ میرے پاس سے گذر گیا۔ ہوا نے تھوڑا سا نقاب اڑا دیا۔ ارے! رضیہ ـــــ

میرے تمام بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میرے دماغ میں ایک بار پھر یہ جملہ گونج گیا۔ "اپنی ہی بہنیں ہیں۔" "اور اپنی ہی بیویاں ہیں۔"

نقاب اڑا تو لڑکوں میں کانا پھوسی ہوئی۔ "چاند سا نظر آگیا۔" "اس ہوا کے بھی ہم گنہگاروں پر بڑے احسان ہیں۔" کمال نے مسکرا کر میری طرف دیکھا پھر ایکبار جاتے ہوئے برقعہ کی طرف دیکھا اور پھر وہی جملہ کہہ دیا۔ "اپنی ہی بیویاں ہیں۔" پھر تمام لڑکے ہنس پڑے۔ مجھ کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو۔ غصہ اور شرم سے میری بری حالت ہو گئی۔ دل چاہا کہ اسی وقت ان لڑکوں کا منہ نوچ لوں کہ دوں تاکہ آئندہ اس قسم کے جملے نہ میں سن سکوں اور نہ یہ کہہ سکیں۔ میں سر جھکائے ہوسٹل کی طرف چل دیا۔ پھر مجھے اپنے پیچھے کچھ جملے سنائی دیئے۔ "جب سے دیکھا ہے ظفر صاحب کا موڈ خراب ہو گیا۔"

کمال کی آواز آئی۔ "کیا معلوم کوئی گذرا واقعہ کسی سے وابستہ ہو۔" پھر ایک جملہ "اماں! گئی چیز ہاتھ نہیں آیا کرتی۔"

یہ جملے میرے دل و دماغ میں نشتر کی طرح لگے۔ مگران کی باتوں میں بڑی سچائی تھی۔ "جب سے دیکھا ہے ظفر صاحب کا موڈ خراب ہو گیا۔" آخر اس میں غلط بھی کیا ہے۔ "کیا معلوم کوئی گذرا واقعہ کسی سے وابستہ ہو۔" "اماں! گئی چیز ہاتھ نہیں آیا کرتی۔" سچ کہا۔ ہاں! موڈ خراب ہو گیا۔ سچ تو ہے گذرا واقعہ بھی یاد آگیا ـــــ جب ایک بار اسکول میں میں نے سنا۔ اصغر لڑکوں سے کہہ رہا تھا۔ "ظفر کی بہن میری خالہ زاد بہن کے ساتھ پڑھتی ہے۔ وہ اس کی بہت تعریف کرتی تھی۔" ایک لڑکے نے پوچھا "عمر کیا ہو گی؟"

ـــــ ایک ایک جملہ میرے ذہن میں پیوست ہو رہا تھا۔ اور اس کی چبھن مجھ کو بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ "گئی چیز ہاتھ نہیں آیا کرتی۔" اور

(ملاحظہ فرمایئے ص۵)

آغا ناصر

رومان کی تلاش

مجھے ایک کہانی لکھنی ہے۔

ایک رومانی افسانہ۔ کسی شوخ اور چنچل دوشیزہ کی محبت بھری داستان۔ جس میں حسن ہو، عشق ہو۔ ایک ایسا خوبصورت افسانہ جو ہمیشہ یاد گار رہے۔ جس کو لکھنے کے بعد میں فخر سے اپنی گردن اونچی کر سکوں جس کو لکھنے کے بعد میں عوام کا محبوب ادیب کہلا سکوں۔ کسی کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے لوگ میری طرف اشارہ کر کے کہا کریں۔ وہ دیکھو وہ۔ وہی تو ہیں اس افسانے کے خالق؟ یا کالج گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے کوئی حسین و شوخ لڑکی اپنی سہیلی کے کان میں آہستہ سے کہے "انہیں پہچانتی ہو؟ یہ وہی تو ہیں جن کا وہ افسانہ تمہیں بیحد پسند ہے۔"

کوئی ایسا ہی خوبصورت افسانہ مجھے لکھنا ہے۔ میں اپنے فلیٹ کی بالکونی میں بیٹھا افسانے کا پلاٹ سوچ رہا ہوں۔ فطرت میرا ساتھ دے رہی ہے۔ آسمان گدلے گدلے بادلوں سے اٹ گیا ہے۔ شاید کچھ دیر بعد بارش ہونے لگے۔ نیچے سڑک پر لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ سامنے نہا جرین کی جھونپڑیوں میں کچھ عجیب سی سراسیمگی پھیلی ہوئی ہے۔ شاید یہ لوگ بارش کے خطرے سے ہراساں ہیں۔ آج ہی کی بات نہیں! یہ ہمیشہ بوندی گھبرائے ہیں۔ جب بھی بارش ہوتی ہے یہ ہمیشہ یوں ہی پریشان ہوتے ہیں۔ چیختے ہیں۔ روتے ہیں۔ کبھی کبھی ٹھنڈ سے اکڑ کر کوئی بچہ یا بوڑھا مر بھی جاتا ہے تب تو یہ اور بھی واویلا کرتے ہیں اور سامنے کے فلیٹوں میں رہنے والوں کی نیند حرام کر دیتے ہیں۔ ابتداء میں مجھے ان کی حالت پر بڑا رحم آتا تھا لیکن اب تو میں عادی ہو گیا ہوں۔ ان کی چیخ پکار میرے لئے کچھ وقعت نہیں رکھتی ان کی سسکیوں اور آنسوؤں کی میرے نزدیک کوئی قیمت نہیں ہے۔ اور یوں بھی میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ حکومت بھی کیا کر سکتی ہے۔ میں جانتا ہوں اور ہر پڑھا لکھا شخص جانتا ہے کہ پانچ سال ایک قوم کی زندگی میں پانچ لمحوں کے برابر ہوتے ہیں؟

آسمان پر بادلوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ہلکی ہلکی بوندیں بھی پڑنے لگی ہیں۔ سڑک پر چلنے والے اب جلدی جلدی قدم اٹھا رہے ہیں۔ فٹ پاتھوں پر بیٹھنے والے خوانچہ فروش اپنا سامان سکیڑ رہے ہیں۔ تاکہ بارش تیز ہو جائے تو جلدی سے اٹھ کر بھاگ سکیں۔

برابر کے فلیٹ سے کھانسی کی آواز آ رہی ہے۔ صمدو کھانس رہا ہوگا۔ وہ کھانستا رہتا ہے۔ شروع شروع میں اس کی کھانسی مجھے بڑی بری معلوم ہوتی تھی لیکن اب تو عادت ہو گئی ہے۔ پھر بھی بعض اوقات اب بھی وہ مجھے تنگ کرتی ہے۔ اکثر جب میں صبح کو بیٹھا آرام سے ناشتہ کرتا ہوتا ہوں۔ تو وہ کھانسنے لگتا ہے۔ اور پھر بلغم کی بڑی سی گولی حلق سے تھوک دیتا ہے۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بلغم کی یہ گولی نالی میں گرنے کے بجائے میری چائے کی پیالی میں آن گری ہے۔ اور پیالی کا تیرتا ہوا پھیکا۔ بالکل صمدو کے منہ سے نکلی ہوئی بلغم کی گولی معلوم دینے لگتا ہے۔ تب میرا جی متلانے لگتا ہے اور میں چائے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں ——— صمدو بہت دنوں سے بیمار ہے۔ اس کو کھانسی ہے۔ ہلکا ہلکا بخار رہتا ہے۔ کمر اور جسم میں درد ہے وہ بہت دنوں سے بیمار ہے نا معلوم اس کی گذر اوقات کے لئے روپیہ کہاں سے آتا ہے۔ اس کی جوان بیوی تین سالہ بچہ اور وہ نہ جانے تینوں اپنا پیٹ کیسے پالتے ہیں۔ سنتے ہیں جب صمدو چلنے پھرنے کے قابل تھا تو کسی کی دوکان پر دوڑ دھوپ کا کام کیا کرتا تھا لیکن اب تو وہ چل پھر بھی نہیں سکتا۔ اس کو زینے تو نیچے اترے ہوئے پورے تین مہینے ہو چکے ہیں۔ ان کی گذر اوقات کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا مگر پھر بھی وہ سب زندہ ہیں۔ وہ اس کی بیوی۔ اس کا بچہ۔ اور اس کی بیوی کے پیٹ میں ایک ان دیکھا انسان۔ وہ سب زندہ ہیں۔ ان کی گزر اوقات کے لئے روپیہ کہاں سے آتا ہے یہ کوئی نہیں جانتا؟

شاید اس کی بیوی اس کا اور اپنا پیٹ پال رہی ہے۔ نا معلوم کیسے؟ لیکن صمدو کو اس سے کوئی مطلب نہیں وہ تو چارپائی پر پڑا دن رات

کھانستا رہتا ہے اور بلغم کی موٹی موٹی گولیاں تھوکتا رہتا ہے۔ ایک روز میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ شفا خانے کیوں نہیں چلا جاتا۔ مگر اس نے جواب دیا کہ وہاں اس کی کوئی نہیں سنتا۔ صدر ٹھیک ہی کہتا ہے۔ واقعی شفا خانے میں غریبوں کی کوئی نہیں سنتا۔ اور یہاں بھی اگر صدر مر جائے تو قوم اور وطن کا کونسا بڑا بھاری نقصان ہو جائے گا۔؟ ٹھیک ہی تو ہے ـــــ ...!

مگر میں یہ سب کیوں سوچ رہا ہوں۔! مجھے صدر سے کیا لینا اسے مرنے دو۔ ؟ مجھے تو ایک افسانہ لکھنا ہے۔ ایک رومانی کہانی محبت کے میٹھے میٹھے گیت گانے والی چرواہی کا افسانہ ـــ! کسی الھڑ کشمیری دوشیزہ کی پریم بھری داستان ؟ ـــ کشمیری دوشیزہ کی داستان ہاں لیکن کشمیر میں اب محبت کہاں ملتی ہے۔ وہاں تو آگ لگی ہوئی ہے۔ کشمیر جل رہا ہے۔ کشمیر کے سبزہ زاروں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ وہاں اب رومان کہاں ہے ؟ وہاں تو آگ ہے۔ خون ہے۔ الھڑ کشمیری دوشیزائیں لاہور اور راولپنڈی کی سڑکوں پر بھیک مانگ رہی ہیں۔ خوبصورت گیت گانے والے کشمیری نوجوان کراچی اور پشاور کے فٹ پاتھوں پر بوٹ پالش کر رہے ہیں۔ اُداس اور مغموم۔

" بابو جی ! " کشمیر کا فیصلہ کب تک ہو جائے گا " پالش کرتے ہوئے کوئی کشمیری کسی دفتری بابو سے پوچھتا ہے جو اپنی آئندہ مہینے کی تنخواہ کا حساب لگا رہا ہوگا۔

" فیصلہ ! فیصلہ ہو جائے گا " بابو جی اپنے حساب میں غرق آہستہ سے بڑبڑاتے ہیں ـــ " فیصلہ ہو جائے گا۔ ! آدھے دودھ والے کے رد کر تین دھوبی کو دے دیئے جائیں گے۔ فیصلہ ہو جائے گا " کشمیری مسکرا دیتا ہے کشمیر کے شہری پاکستان کے شہروں میں آوارہ پھر رہے ہیں کشمیر تو ویران ہے کشمیر میں اب محبت اور رومان کہاں ہے۔ اب وہ کشمیر کہاں ہے۔ جہاں چمکیلے آسمان تلے اُجلے اُجلے پھول کھلتے تھے اور شوخاں کرتے دریاؤں کی لہریں میٹھے میٹھے گیت سناتی تھیں۔ اب وہ کشمیر کہاں ہے کشمیر کی وادیوں میں اب سُریلی آواز والی بھیڑیں چراتی ہوئی گوالنوں کے گیت کہاں گونجتے ہیں۔

آ ـــ اے میرے محبوب آ ـــ
ان کالی کالی بدلیوں میں چھپکر میں تیرا انتظار کروں گی۔
اور جب تو آئے گا۔
تو میں بھی پانی کے قطروں کے ساتھ بادلوں سے زمین پر اتر آؤنگی۔
آ میرے ساتھی
میں تجھے وادیوں کی سیر کراؤں گی۔
تجھے میٹھے میٹھے گیت سناؤں گی۔
جنہیں سُنکر تو مدہوش ہو جائے گا۔
آ۔ میرے محبوب ـــــــ ؟

مگر نہیں اب یہ کچھ بھی نہیں ـــ کشمیر تو اب ویران ہے۔ وہاں تو آگ لگی ہوئی ہے سنتے ہیں فیصلہ ہونے والا ہے۔ پانچ سال سے سُن رہے ہیں اور نہیں معلوم کب تک سنتے رہیں گے۔

بُوندیں اب بھی اسی رفتار سے پڑ رہی ہیں۔ مہاجرین کے جھونپڑوں کے آگے پانی کے تل پر مشکوں۔ گھڑوں اور بالٹیوں کی لمبی قطار لگی ہوئی ہے دو بچے ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہیں۔ ایک کہہ رہا ہے میری بالٹی آگے تھی۔ دوسرا کہتا ہے میرا گھڑا آگے تھا۔ اکثر یونہی لڑائیاں ہوتی ہیں۔ بچوں میں عورتوں میں۔ مردوں میں۔ کبھی کبھی یہ لڑائیاں خطرناک صورت اختیار کر جاتی ہیں۔ اور لاٹھیوں۔ کلہاڑیوں کا استعمال ہونے لگتا ہے۔

اوہو۔ میں یہ کہاں پہنچ گیا ہوں۔ مجھے تو رومان کی تلاش ہے۔ پیار کی تلاش ہے۔

" ماں میرا احسان ارے نادان کر میں نے تجھ سے کیا ہے پیار "

نیچے ایک لڑکا بڑی اونچی آواز میں گاتا جا رہا ہے۔

" تو نے دیکھی یہ پکچر ـــــ ؟ " اس کا ساتھی پوچھتا ہے۔

" ہاں "

" چل بے سالے جھوٹ بولتا ہے "

" تیری قسم "

" کیسے دیکھی ـ سنتے ہیں بڑا رش لے رہی ہے "

" چھ آنے والا ایک روپے میں لیکر ـــــ ؟ "

مل جاتا ہے ؟

" ہاں "

" پھر تو یار چڑی بھی کل دیکھ ڈالیں گے "

یہ ہماری آنے والی نسل کے دو نمائندے ہیں۔ ہمارا مستقبل کس قدر تاریک ہے ؟ یہ بچے جو دن بھر کارخانوں اور موٹر ورکشاپوں میں کام کرتے

ہیں۔ اور رات کو آوارہ گردی ـــــ ؟ لیکن مجھے ان سے کیا مطلب۔ مجھے تو افسانہ لکھنا ہے۔

بارش تیز ہوگئی ہے۔ مہاجرین کے جھونپڑوں سے عورتوں کے رونے کی آوازیں آرہی ہیں۔ صمد کو کھانسی کا دھسکا لگ گیا ہے وہ بڑی گھٹی گھٹی آواز میں کھانس رہا ہے۔ فٹ پاتھوں پر بیٹھنے والے خوانچہ فروش اپنا سامان اٹھا اٹھا کر بھاگ رہے ہیں ـــــ کشمیری نوجوان اور فٹ پاتھوں پر رہنے والی کشمیری عورتیں پانی میں بھیگ رہی ہیں اور کشمیر کا فیصلہ کرنے والے آرام سے اپنی کوٹھیوں میں بیٹھے چاء اور کافی کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ مہاجرین کے بچے سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں۔ اور مہاجرین کے غمگسار اپنے بادر چیوں کو زیادہ انڈے ابالنے کی ہدایت دے رہے ہیں۔

لیکن مجھے یہ کیا ہوگیا ہے۔ مجھے تو افسانہ لکھنا ہے۔ مجھے رومان کی ضرورت ہے۔ محبت کی خواہش ہے۔ کیا میں ایک رومانی افسانہ بھی نہیں لکھ سکوں گا۔ کیا میں کبھی عوام کا مقبول ادیب نہیں بن سکوں گا۔ کیا دنیا سے محبت فنا ہوگئی ہے۔ کیا اب کہیں رومان نہیں ہے۔ کاش میں ایک رومانی افسانہ لکھ سکتا۔ صرف ایک محبت بھری میٹھی کہانی۔

کشمیر۔ مہاجرین۔ مریض ـــــ! یہ سب کیا ہے۔ بھوک۔ بیروزگاری، بیماری، مفلسی، مجھے یہ نہیں چاہئے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے حسن چاہئے۔ عشق چاہئے۔ پیار چاہئے۔ میں تو رومان کا متلاشی ہوں، ایک کہانی لکھنے کے لئے۔

"مجھے رومان کی تلاش ہے"

—— ※ —— ※ —— ※ ——

بہنیں! اور بیویاں!! ـــــ صفحہ ۴۷ سے آگے

اور میری خودداری بھی پھر ہاتھ نہیں آسکتی ـــــ نہیں تو میں تم کو نگاہ اٹھانے کی بھی مہلت نہ دیتا ـــــ بیشک! باتیں بالکل صحیح ہیں۔ مگر معنیٰ کا فرق ہے۔ ان کے لئے ان جملوں میں محض مزاح ہے۔ میرے لئے تیر ہیں۔ ان کے لئے ان میں زندگی ہے میرے لئے موت۔ دونوں کے لئے مختلف معنیٰ ہیں ان دو جملوں کے ـــ وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ میرے لئے ان جملوں میں کیا معنیٰ پوشیدہ ہیں۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ ان کے ان طنزیہ جملوں کے کیا معنیٰ ہیں ـــ وہ میرے دل کی بات سمجھنا چاہتے تھے۔ مگر سمجھ نہیں سکتے تھے۔ میں ان کے دل کی بات بخوبی جانتا تھا۔ مگر جاننا نہیں چاہتا تھا۔ ـــــ میں چل رہا تھا مگر معلوم نہ تھا۔ کہاں اور کس طرف قدم اٹھ رہے ہیں۔ میرے سامنے بار بار کالا برقعہ آرہا تھا۔ بار بار رضیہ آرہی تھی۔ بار بار کالے برقعے آرہے تھے۔ بار بار بہنیں آرہی تھیں میرے ذہن کے پردوں میں پھر وہی تلخ جملہ گونج گیا۔

"اپنی ہی بہنیں ہیں" اور "اپنی ہی بیویاں بھی"

بہنیں اور بیویاں، بیویاں اور بہنیں، نئی تہذیب کا جو سبق میں نے چار سال میں سیکھا تھا۔ آج اس کو بھلا دینا چاہتا تھا مگر مجھ کو بار بار یہی جملہ پریشان کر جاتا تھا۔

"اپنی ہی بہنیں ہیں" اور "اپنی ہی بیویاں بھی"

(ادارہ ادب اسلامی علیگڈھ میں پڑھا گیا)

مقبیت الحسن رضوی

میں بھی اُن سے ملا ہوں

لوگ کہتے ہیں وہ ایک بڑے پایہ کے شاعر ہیں ـــــ میں بھی اُن سے ملا ہوں ـــــ لیکن میرا خیال اِن سب سے جداگانہ ہے ـــــ دسمبر کی ایک سرد رات تھی۔ برف میں ڈوبی ہوئی زمستانی ہوائیں تیر کی طرح جسم میں چبھ رہی تھیں۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا اس مکان کی طرف بڑھنے لگا جہاں وہ رہتے تھے۔ اور آخر ایک کمرہ میں جہاں چند کرسیوں پر کچھ لوگ بیٹھے تھے میں داخل ہوا۔ اصولاً چاہیے تھا کہ پہلے میں ان سب کو سلام کرتا اور میں ایسا کرتا بھی ہوں لیکن نہ جانے کیوں جب میں اس مجلس میں داخل ہوا تو مجھ پر ایک نامعلوم سا رعب چھا گیا اور مجھے محسوس ہوا جیسے میرے دل کی گہرائیوں میں سے کوئی آہستہ مگر پُر عظمت آواز میں کہہ رہا ہو "با ادب" میں سلام کرنا بھول گیا اور میری متجسس نگاہیں کرسیوں کے جھرمٹ سے ہٹ کر ایک پلنگ پر پڑیں جس پر ایک پھولے پھولے گالوں والا انسان رضائی میں لپٹا لپٹایا بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

"السلام علیکم" پلنگ کی جانب سے آواز آئی۔ یہ تو مجھے یاد نہیں کہ یہ فقرہ میں نے اپنی زندگی میں کتنی بار سُنا ہے لیکن یہ ضرور یاد ہے اور شاید حشر تک یاد رہے گا کہ ایسی آواز میں نے کہیں نہیں اور کبھی نہیں سنی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے سلام بھیجنے والے کی روح دونوں جہانوں اور اپنے دامن میں ہزاروں خلوص اور شفقتیں سمیٹے تیرے لئے سلامتی اور رحمت کی دعائیں کر رہی ہے۔ میرا سر نیاز جھک گیا اور جبیں عرق انفعال کے قطروں سے بھیگ گئی۔

"وعلیکم السلام" میں نے جواب دیا اور خاموشی سے پاس کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے آنے سے تھوڑی دیر کے لئے مجلس پر ایک سکوت سا چھا گیا اور وہ پیکر ایمان جواب سے چند منٹ قبل نکتہ آفریں تھا خاموش ہو گیا اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بے انتہا خیالات کے مضطرب دھارے الفاظ بنکر اس کے لبوں تک آنے کیلئے بیچین ہوں۔ آخر لبوں کو جنبش ہوئی اور ہزار ہا نکتے موزوں الفاظ کے رُوپ میں اس کے لبھائے گہربار سے نکلنے لگے . . . . .

میں گم بیٹھا سنتا رہا اور حاضرین میں سے کسی کو یہ زہرہ نہ تھا کہ اس سیل رواں میں ایک کنکری بھی ڈال دے۔ سب دم بخود تھے۔ میں اس مرد خود آگاہ کی گرم گفتاری سے مسحور ہو رہا تھا۔ اُن یہ شخص رگ ہستی کا کتنا بڑا بتاض ہے"۔ میں نے سوچا اور میرا جی چاہا کہ ایکبار زور سے چیخ اٹھوں کہ "لوگو! نہ تو یہ ایک فلسفی ہے اور نہ ایک بلند پایہ شاعر بلکہ یہ ایک پیغمبر ہے جو کوئی پیغام سنا رہا ہے۔ نظام حکومت کے اصول سمجھا رہا ہے اور عروس زندگی کے اُلجھے اُلجھے گیسوؤں کو سنوارنے کے گُر بتا رہا ہے شاعری نہیں کر رہا" اور عنقریب تھا کہ میں کچھ بول اٹھوں کہ اس مرد خود آگاہ نے فرمایا ؎

کم نظر بیتابیٔ جانم نہ دید ؛ آشکارم دید و پنہانم نہ دید

. . . . . وہ پھر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے سے بیزاری کے آثار نمایاں تھے اور وہ سوگوار نظر آ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اُوپر اٹھیں اور میں نے دیکھا کہ ان عقابی نگاہوں میں قطرات اشک تاروں کی طرح جھلملا رہے تھے "یا رسول اللہ!" اس نے تلملائے ہوئے انداز میں کہا ؎

تو گفتی از حیات جاوداں گو ؛ بگوش مردۂ پیغام جاں گو
ولے گویم دریں ناحق شناساں ؛ کہ تاریخ وفات ایں داں گو

رخم از زرد پنہاں زعفرانی ؛ ترا و دخوں ز چشم ارغوانی
سخن اندر گلوئے من گرہ بست ؛ تو احوال مرا ناگفتہ دانی
نہ شعر است اینکہ بروے دل نہادم ؛ گرہ از رشتہ معنی کشادم
بامیدے کہ اکسیرے زند عشق ؛ مسِ ایں مفلساں را تاب دادم
من اے میر اُمم داد از تو خواہم ؛ مرا یاراں غزل خوانے شمر دند

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا تھا۔ پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں بھی اس مرد خود آگاہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اب بھی اسی طرح پلنگ پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں اب آنسو نہیں تھے

خیال اپنا اپنا

لوحِ و قلم

از ـــــ ندرت میرٹھی
ناشر ـــــ آئینہ پریس میرٹھ

ضخامت ۲۲۴ صفحات (مجلد) قیمت پانچ روپے

مولانا ندرت میرٹھی کا نام ادبی دنیا کے لئے کوئی تازہ اکتشاف نہیں موصوف ایک طویل عرصہ سے شعر و ادب کی خاموش خدمت میں مصروف ہیں۔ اور آج آپ کا شمار ملک کے ان معدودے چند یادگارِ زمانہ اساتذہ میں ہوتا ہے جن کا دم غنیمت اور کلام سند سمجھا جاتا ہے۔ لوح و قلم مولانا کا تازہ مجموعۂ کلام ہے اور جیسا کہ آپ نے خود اشارہ فرمایا ہے "یہ آپ کے ذہن کی غیر معمولی کاوشوں اور پیش از پیش عرق ریزیوں کا حاصل ہے"۔

مجموعہ کے آغاز میں عہد رفتہ کو آواز دیتی ہوئی مولانا کی ایک تصویر پارینہ (۱۹۳۶ء کی) بھی شامل ہے۔ گستاخی معاف مولانا اس تصویر سے کہیں زیادہ تو "اب" اچھے لگتے ہیں۔ اس لئے اگر تصویر کی اشاعت ضروری ہی تھی تو بہتر تھا اگر اس تازہ تصنیف کے ساتھ کوئی تازہ تصویر شاملِ اشاعت ہوتی۔

شیب و شباب کا یہ پیوند کچھ زیادہ موزوں نہیں رہا۔

مقدمہ نویسی آج کل ایک "آرٹ" کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ بالفاظ دیگر مقدمہ لکھنا کم۔ لڑھایا زیادہ جاتا ہے یہ مولانا کے الفاظ میں۔

"بسیط مقدموں اور تبصروں کے پسِ پردہ زیادہ تر صاحبِ تصنیف کو سراہنا۔ شاندار الفاظ کے ساتھ بڑھا چڑھا کر منظرِ عام پر لانا اور اس کی شخصیت سے عوام کو مرعوب و متاثر کرنا متصور ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے مقالات سے تنقید کا اصل منشا پورا نہیں ہوتا۔ کیونکہ تنقید کی بنیادی شرط ہے کہ جائز و ناجائز جانبداری اور نارواتملق سے مطلق کام نہ لیا جائے۔ نقاد کا فرض ہے کہ وہ حق و انصاف کی روشنی میں صحیح اور معقول رائے قائم کرے"۔

اس لئے مولانا نے "نہ می رویم بہ راہے کہ کارواں رفت است" کے مصداق کسی "آرٹسٹ" کو زحمتِ مقدمہ نویسی نہ دیتے ہوئے خود ہی یہ فرض ادا کرنے کی کوشش فرمائی ہے مولانا کے اپنے قلم سے "چند لفظ" کے عنوان سے ایک مقدمہ زیبِ لوح و قلم ہے جس کا مفید ترین حصہ وہ ہے جہاں مولانا نے اپنے نظریۂ ادب و تنقید پر روشنی ڈالی ہے تنقید سے متعلق مولانا کے خیالات آپ مطالعہ فرما چکے ہیں "تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں" کے پیشِ نظر آیئے۔ مولانا کا نظریۂ شاعری بھی ملاحظہ فرمایئے۔

"میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اردو کی اصل شکل مسخ نہ ہو اس کی قدرتی دلکشی اور جاذبیت میں فرق نہ آئے۔ اس کے صحیح خدوخال جن سے میری مراد محاورات ہیں۔ قایم رہیں۔ اور یہ ہی میرے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے ..... میرا کلام کوئی چیستاں یا معمہ نہیں جو دماغ پر بار ہو کر رہ جائے ..... میں ایسے الفاظ بھی استعمال نہیں کرتا جن کے لئے صراح یا قاموس کی ضرورت پڑے۔ الجھی ہوئی ترکیبوں کی بھول بھلیوں سے بھی میرا قلم دور رہتا ہے تو الی اضافات اور تعقیدات سے میں پناہ ہی مانگتا ہوں۔ اس قسم کے بازیگرانہ گورکھ دھندوں میں پھنسنا میرے بس کا روگ ہی نہیں۔ مجھے اپنے طرزِ ادا پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ صاحبِ ذوق حضرات کو غور و خوض کی معیت میں مبتلا نہ کرے گا اور میں نے جو کچھ کہا ہے اس کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی"۔

ـــــ "لوحِ و قلم" اس نظریہ کی ایک دلکش تصویر ہے۔ حسنِ ادا۔ صفائی زبان فنی رکھ رکھاؤ۔ روانی اور از دل ریزد بر دل خیزد والی سادگی مولانا کی شاعری کے نمایاں جوہر ہیں۔ استادانہ رنگ اور پختہ کارانہ اسلوب نے کلام پر ایک خاص نوع کی دلکشی پیدا کر دی ہے۔ یہ محض شاعرانہ تعلی ہی نہیں حقیقت ہے کہ ؎

رہی مشقِ سخن طفلی سے جاری عہدِ پیری تک
غزل گوئی میں جب آیا ہے ندرت کو شعور اتنا

اس نکھرے ہوئے شعور کے چند لطیف مظاہر ملاحظہ فرمایئے ؎

محبت جس کو بخشے بے نیازی
وہ دل کھائے فریبِ مدعا کیسا

رہروِ منزلِ تسلیم کو کیا فکرِ سجود
جب وہ در آئے گا جھک جائے گا سر آپ ہی

خدا محفوظ رکھے انقلابِ فتنہ سامانی سے
شعارِ آدمیت آدمی سے چھوٹ جاتا ہے
بدل جاتی ہے رسوائی سے کیفیت محبت کی
اگر دامانِ ضبطِ غم کسی سے چھوٹ جاتا ہے
تو نے ان آنکھوں کو بھی دیکھا کبھی اے محتسب
بے محابانہ لئے پھرتا ہے خم خانے کوئی
نقوشِ عظمتِ ماضی ہزار دھندلے ہوں
انھیں ابھار رہی ہیں گے ابھارنے والے
ناوک فگن تو زورِ کماں آزما چکا
اے دل اب امتحاں تری گہرائیوں کا ہے
ندرت ہجوم غم میں تصور کس کا کیا
او ناسمجھ یہ شغل تو تنہائیوں کا ہے
مری غیرت اجازت سر جھکانے کی نہیں دیتی
ترے در پر نشانِ سجدہ کس کس کی جبیں کے ہیں

کوئی نہ مونس کوئی نہ ہمدم
غم ہی راز اور غم ہی محرم
ہائے وہ دامن سمٹا سمٹا
ہائے وہ نظریں برہم برہم
تمہیں کہا دم گذرا، اپنا دامن کیوں بچاتے ہو
نہ سمجھو تم مری دیوانگی کو بے شعور اتنا
حیاتِ محبت کے لمحات توبہ
خدا جانے کس طرح ہم نے گذارے

لوح وقلم میں اگرچہ ندرتِ خیال کی کمی نہیں تاہم بعض مقامات پر پیش پا افتادہ روائتی مضامین کا محض خفیف سی تبدیلی کے ساتھ اعادہ ذوق کو مکدر کرتا ہے۔ سادگی مولنا کے کلام کا ایک خاص حسن ہے۔ لیکن جہاں یہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہوگئی ہے اشعار سپاٹ ہوکر رہ گئے ہیں اور شعر و نثر میں کوئی واضح خطِ امتیاز باقی نہیں رہا۔ نیز وسیع المشربی کی رَو میں بہت سے غیر سنجیدہ مضامین بھی شاعر کی فکر رسا کے دائرہ سے باہر نہیں رہے اور کہیں کہیں تو حسن و عشق کا پست ہی سطحی اور غیر معیاری تصور پیش کیا گیا ہے۔

——— لوح وقلم میں ایک نئی صنفِ سخن "فلمی طرزوں پر" بھی شامل نظر آتی ہے۔ یہ رجحان کسی طرح بھی مولنا کی بزرگی کے شایانِ شان نہیں معلوم ہوتا۔ لوح وقلم میں نگاہِ انتخاب کی کمی بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے بہتر ہوتا اگر اس مجموعہ میں محض منتخب اور بلند پایہ کلام ہی جگہ پاتا۔

بہرکیف ان چند "ناہمواریوں" سے قطع نظر ہمیں امید ہے کہ کلاسیکل شاعری سے ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے لوح وقلم کا مطالعہ نشاط انگیز ثابت ہوگا۔ (ع۔م)

ماہنامہ اُردو سائیکولوجی

مدیر:۔ علاؤالدین خالد
صدر دفتر:۔ اکیڈمی اسٹریٹ۔ رحمت بلڈنگ۔ بندر روڈ۔ کراچی
بھارت کا پتہ:۔ منشی عبدالقدیر صاحب ۱۳۴۱، پہاڑی املی۔ دہلی۔
ضخامت ۵۶ صفحات ——— قیمت ——— درج نہیں

آج کی پیچ در پیچ زندگی میں جبکہ ہر سمت طرح طرح کی الجھنیں پریشانیاں اور انکار۔ دائرہ حیات کو تنگ کئے ہوئے ہیں۔ سائیکولوجی یا نفسیات کی اہمیت محتاج تشریح نہیں۔ اُردو میں جہاں فلمی اور فیشن زدہ رسائل کی بہتات ہے۔ سنجیدہ علمی پرچوں کی افسوسناک حد تک کمی پائی جاتی ہے۔ اور خالص نفسیاتی ماہنامے تو تقریباً نایاب ہیں۔ "ماہنامہ اردو سائیکولوجی" اس ضد کو پورا کرنے کی ایک مستحسن اور قابلِ قدر کوشش ہے۔ ترتیب میں شگفتگی اور تنوع پایا جاتا ہے اور مضامین میں افادیت کے ساتھ ساتھ عام دلکشی کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے ——— تراجم کے انتخاب میں اگر ماحول اور فضا کی ہم آہنگی بھی پیشِ نظر رہے تو تاثر میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے۔ (ع۔م)

کالے قوانین

مرتبہ۔ اسعد گیلانی۔ ناشر۔ مکتبہ جہانِ نو۔ لیرسٹی۔ کراچی۔
ضخامت ۸۰ صفحات ——— قیمت ۸

"کالے قوانین۔ پاکستان میں سیفٹی قوانین کا پانچ سالہ جائزہ ہے۔ ایک بصیرت افروز تفصیلی اور تنقیدی جائزہ۔ سیفٹی ایکٹ وغیرہ کی آڑ میں حکمراں طبقہ نے جس استبدادی ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے وہ شرمناک بھی ہے اور عبرت خیز بھی۔ لیکن شاید حیرت انگیز نہیں۔ اسلئے کہ بقول علامہ اقبال ؎

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

"کالے قوانین" میں اسی جمہوری چنگیزیت کے منہ سے نقاب کشائی کی گئی ہے۔ اندازِ بیان متوازن۔ سنجیدہ اور سلجھا ہوا ہے۔ (ع۔م)

"عورتوں کا ڈاکٹر" یا "طبیب نسواں"

بفضلہٖ چھپ گیا ہے۔ "ماہنامہ صحت" کراچی کا یہ خاص نمبر کتابی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ خاص کتاب دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں عورتوں کے امراض اور اُن کے علاج پر ہند و پاک کے چوٹی کے اطباء اور ڈاکٹر صاحبان نے مضامین لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ان حضرات کی زندگی بھر کے تجربات کا نچوڑ بھی اس کتاب میں پیش کر دیا گیا ہے۔ مجربات کے سلسلے میں ڈاکٹری ہومیوپیتھک۔ یونانی۔ اور ویدک مجربات علیحدہ علیحدہ پیش کئے گئے ہیں۔ اس خاص نمبر کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ تمام حکماء اور ڈاکٹر صاحبان کے مضامین کے ساتھ ساتھ ان کے خود نوشتہ حالات زندگی اور فوٹو بھی شائع کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی قیمت چار روپے ہے لیکن خریدار حضرات کی خدمت میں مفت پیش کی جائے گی۔

ترسیل زر کا پتہ

بھارت میں :—— منیجر فرقانیہ دواخانہ۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ۔ یو۔ پی

پاکستان میں :—— منیجر ماہنامہ "صحت"۔ بارنس اسٹریٹ۔ کراچی ۳

آنکھوں کی روشنی

(مریضانِ چشم کے لئے ایک نادر ترین تحفہ)

موتیا بند (نزول الماء) پھولا۔ جالا۔ ناسور۔ پرتوند۔ پر بال۔ آشوب چشم۔ چیچک کی پھولی۔ نظر کی کمزوری اور چشمہ لگانے کے پرانے عادی لوگوں کے لئے

اکسیر چشم قطعی بے ضرر اور مفید ترین لاجواب تحفہ ہے۔ آنکھوں کے آپریشن کے اُمیدوار۔ آپریشن کے ناکام اور مایوس مریض چشمہ لگانے والوں کے چشمے اُتروا دینے والے کیمیاوی حل کامل۔

اکسیر چشم کے استعمال سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کر کے قدرت کاملہ کے کرشمے ملاحظہ فرمائیں۔ پوری معلومات کیلئے کتاب آنکھوں کی روشنی مفت طلب فرما دیں۔

قیمت فی شیشی خورد	4/8/-	قیمت فی شیشی کلاں	9/-
" اکسٹرا قسم اعلیٰ اوسط	11/8/-	" اکسٹرا قسم اعلیٰ کلاں	35/-

ملنے کا پتہ

عزیزی دواخانہ۔ رجسٹرڈ۔ پرنسیس بلڈنگ جے، جے ہسپتال۔ بمبئی نمبر ۳

اسٹینڈرڈ

سیزرس اور اُسترے

عمدگی اور پائیداری کی اعلیٰ مثال پیش کرتے ہیں۔ جس پر میرٹھ کی اس صنعت کو ناز ہے۔ قینچیوں اور اُستروں کی تجارت کرکے بھاری منافع حاصل کیجئے
ایجنسی کا شرائط نامہ خط لکھکر منگائیے

دی اسٹینڈرڈ سیزرس کمپنی میرٹھ انڈیا

اسانگنی اینڈ کمپنی

کمیشن ایجنٹوں اور تاجروں کیلئے نفع بخش، اور عمدہ تجارت کا سامان ہول سیل نرخوں پر مندرجہ ذیل چیزیں سپلائی کرنے کیلئے ہم اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔

- مونگ پھلی
- ایلی
- پٹوڑ کا ناریل اور اس کا تیل
- سکئی (سوپ ناٹ)
- رہیا
- بہترین صاف اور ڈریس کیا ہوا تیار چمڑا

خط وکتابت کیلئے پتہ

اسانگنی اینڈ کمپنی ۱۴۴ اولڈ مارکیٹ بنگلور

ابُو المجاھد زاہد کا شعری کارنامہ

تگ و تاز

زاہد کا فن بڑی تیزی سے ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ تگ و تاز اس نوجوان فن کار کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ زاہد کی شاعری برائے شاعری نہیں وہ دکھی اور مجروح انسانیت کے لئے ایک پیام ہے ـــــ ایک آفاقی پیام۔ زاہد کی شاعری ایک آئینہ ہے جس میں آج کا آوارہ اور بھٹکا ہوا انسان اپنا صحیح عکس دیکھ سکتا ہے۔ زاہد سماج کے رستے ہوئے زخموں کی نمائش پر ہی اکتفا نہیں کرتا ان کا مداوا بھی پیش کرتا ہے۔ تگ و تاز میں اس حساس اور بیدار دل شاعر کی حیات افروز نظمیں اور پاکیزہ غزلیں شامل ہیں۔

بہت جلد شائع ہو رہا ہے

معیار میں پیش کئے ہوئے دو سال کے افسانوں کا بہترین انتخاب

اُبھرتی کرنیں

(زیر طبع)

مرتبہ ـــــ نجم الاسلام ـــــ قیمت ـــــ دو روپیہ آٹھ آنے ۸/

نئے تعمیری رجحانات کا افسانوی ادب میں گراں قدر اضافہ اس کے مطالعہ کے بغیر آپ کا ادبی ذوق موجودہ دور کے ایک نئے بڑھتے ہوئے افسانوی رجحان سے بیگانہ رہے گا۔ "اُبھرتی کرنیں" محمود ذاروقی۔ اسعد گیلانی۔ پروفیسر عاصی ضیائی۔ ابنِ فرید، منظر حسین وغیرہ کی بہترین نگارشات لئے ہوئے ہے۔ اور مرتب کے قلم سے ایک تعارف بھی شامل ہے جس میں تعمیری ادب، تعمیری ادب کی تحریک اور نئے تعمیر پسند افسانوی رجحانات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ناشر:ـــــ مکتبہ معیار میرٹھ

(محمد احمد ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے کمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ معیار "خندق اسٹریٹ شہر میرٹھ سے شائع کیا)

صحت منداور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

معیار

جلد ۳ ، شمارہ ۴

مئی سنہ ۱۹۵۳ء

ترتیب دینے والے

اصغر علی عابدی

نجم الاسلام

ہیڈ آفس :- خندق اسٹریٹ میرٹھ شہر

سب آفس :- محلہ کشن گنج دھلی ۶

تعاون

سالانہ پانچ روپئے

ششماہی تین روپئے

مضامین خط و کتابت ترسیل زر ۔ تبادلۂ جرائد کے لئے ہیڈ آفس ۔

ترسیلِ زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب فیملی لائن ۔ جیکب آباد

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

ترتیب

نقشِ اوّل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اصغر علی عابدی ۳

نظمیں

صبحِ صادق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابو المجاہد زاہد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵
کردگارِ ازل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شفیق جونپوری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۷
تجدید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انور صدیقی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸
سخنہائے گفتنی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فاروق بانسپاری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۰
اے دوست ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ منظر عظمی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۱
ہمدم سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکبر زمزم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۱
ایک حقیقت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سرمد مظاہری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲

مقالے

صالح اور غیر صالح ادب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محمد نجات اللہ صدیقی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۳
ادب ایک بنا موڑ مڑ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابنِ فرید۔ بی۔ اے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۴
نواب جھانسوی کی غزل گوئی پر اجمالی نظر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (مولانا) دردؔ گورکھپوری ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۳
عورت کا تخیل اقبال کی فکر میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محمود الحسن شاہدی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۸

غزلیں

غزل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حقی حزیں ایم۔اے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۰
〃 ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاکر تسلیم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۱
〃 ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چندر پرکاش جوہر بجنوری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۲
〃 ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شبنم الہ آبادی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۳
〃 ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اعجاز اعظمی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۳

افسانے

جب انڈا ٹوٹے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محمود فاروقی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۴
اے کاش ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مقبت الحسن رضوی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۸
مُلّا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اقبال احمد انصاری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۰
بھوک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلدیو راج شرما ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۳

نقشِ اوّل

ایک بامقصد ادیب کی زندگی کے تین اہم اجزاء ہیں۔

۱۔ نظریہ ۲۔ عمل ۳۔ منزل

۱۔ نظریہ اُسے بتاتا ہے کہ زندگی کے بارے میں اُسے کس طرح سوچنا چاہئے۔ انسان اور کائنات کو کن کن پہلوؤں اور زاویوں سے دیکھنا چاہئے۔ تاریخ کے طویل تجرباتی سلسلہ سے کس طرح استفادہ کرنا چاہئے۔ مختلف انسانی کرداروں اور ان کی زندگی کے مختلف حادثات اور واقعات کو کس طرح سبق آموز اور نتیجہ خیز بنانا چاہئے۔ سماج اور سوسائٹی کے متعلق صحیح انداز فکر کیا ہو سکتا ہے۔ اس کی بھارٹ۔ ترقی۔ اور تعمیر کا صحیح ڈھنگ کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے مسائل۔ الجھنوں اور مشکلات کو دور کرنے کا صحیح طریقہ کونسا ہو سکتا ہے۔ یہ سب باتیں "نظریہ" ادیب کو سمجھاتا ہے۔

اِس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ادیب اپنے نظریہ سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو۔ اُس کو اپنے اندر اُتارنے اور سمونے کی پوری کوشش کرے۔

چنانچہ نظریاتی فہم کو بڑھانے کا اوّلین طریقہ یہ ہے کہ ادیب اس اساسی لٹریچر کا نہایت گہرا مطالعہ کرے جو اُسے وہ نظریہ دیتا ہے۔ ادیب اپنے نظریہ کے متعلق سُنی سنائی باتوں پر اکتفا نہ کرے۔ اور نہ کسی ضمنی اور ذیلی لٹریچر پر اکتفا کرے۔ اس معاملہ میں اُسے ٹھیک اُس لٹریچر کی طرف بڑھنا چاہئے جس میں اُس کا پسندیدہ نظریہ اپنے تمام اجزاء سمیت موجود ہے۔ البتہ اس مقصد کے لئے اُسے ایسا لٹریچر بھی ضرور اپنے سامنے رکھنا چاہئے جو اس بنیادی لٹریچر کے رموز و نکات کو سمجھانے والا اور اُن کو اُس کی زبان۔ ماحول اور فہم کے مطابق بیان کرنے والا ہو۔ اِس طرح کے مطالعہ کے بعد جب ایک نظریہ پیدا ہو جائے تو پھر ادیب مخالف نظریات یا دوسرے نظریات کے لٹریچر کا باقاعدہ مطالعہ کرے۔ اور تقابل کے ذریعہ اپنے نظریہ اور دوسرے نظریات کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لے۔ نظریاتی فہم کو بڑھانے کا دوسرا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ ادیب اپنے نقطۂ نظر کے مطابق مختلف افراد کی زندگیوں کا مطالعہ کرے۔ سب سے پہلے اُس عظیم شخصیت کو دیکھے جس نے ابتداءً انسانیت کے سامنے وہ نظریہ پیش کیا۔ اور اُس کے مطابق عمل کر کے دکھایا۔ اُس کے بعد اُس کے بہترین پیروؤں کی زندگی کو لے اور اس طرح رفتہ رفتہ اپنے عہد کے باکردار اور باعمل انسانوں حتیٰ کہ اپنے قریبی ماحول کے "متقی" انسانوں تک اِس مطالعہ کو وسیع کر دے۔ یہ تو افراد کے مطالعہ کا ایک پہلو ہوا۔ دوسرا پہلو یہ ہونا چاہئے کہ ادیب اُس نظریہ کے باعمل یا دوسرے نظریات کے علمبرداروں کی زندگی کو بھی سامنے رکھے۔ اور اس کو بھی اِسی تناسب سے اُوپر کے آدمی سے لیکر نیچے کے آدمیوں تک پھیلائے۔ شخصیتوں کے مطالعہ کا تیسرا پہلو یہ ہونا چاہئے کہ فن کار عام انسانی کرداروں کا مطالعہ کرے ان کی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ ان کی حرکات و سکنات کے محرکات اور دواعیات کا نہایت احتیاط کے ساتھ جائزہ لے۔ اور دیکھے کہ انسانوں کے عمل اور اُن کی خصوصیات میں کونسی باتیں ایسی ہیں جو اُس کے نظریہ کے مطابق ہیں۔ اور کون کونسی باتیں ایسی ہیں جو خلاف ہیں۔ اور ان دونوں باتوں کے اسباب کیا ہیں۔

"افراد کے مطالعہ کے سلسلہ میں ایک بات اور اہم ہے وہ یہ کہ ایک طرف تو ادیب انھیں ان کی منفرد حیثیت میں دیکھے اور دوسری طرف وہ اُن کی اجتماعی تصویر کو سامنے رکھے۔ وہ سب سے پہلے اس زمانے کی سوسائٹی کو اپنی آنکھوں کے سامنے لائے جس وقت اُس کے نظریہ پر ٹھیک ٹھیک عمل کر کے اُسے ایک عملی حقیقت ثابت کیا جا چکا ہو اور اُس کے بعد وہ اس نقشہ کو بھی دیکھے جب وہ مثالی سماج مائل بہ زوال ہو! اِسی طرح وہ دینا کے دوسرے سماجوں کے عروج و زوال پر نظر ڈالے اور اپنے وقت کے سماجی ماحول اور اُس کے مختلف پہلوؤں کا ایک کتاب کی طرح مطالعہ کرے۔ اور پھر ان سب کے باہمی مقابلہ سے نتائج اخذ کرے۔

نظریاتی فہم کو تیز تر کرنے کا تیسرا طریقہ اپنے نظریہ کے لئے جدوجہد کا ہے یعنی یہ کوشش کہ ادیب کا محبوب نظریہ دوسرے نظریات پر غالب آجائے۔ اُس کے مطابق فرد اور سماج دونوں کی زندگی میں انقلاب برپا ہو۔ اس طرح کی کشمکش میں پڑے بغیر یہ ممکن نہیں کہ ادیب کے ذہن میں اُس کا نظریہ راسخ ہو سکے اور اس کی جڑیں اُس کے فکر و خیال کی سرزمین میں نہایت گہری جم سکیں۔

۲۔ عمل کسی نظریہ کا وہ پہلو ہے جو خارج میں ظہور کرتا ہے۔ اگر ایک ادیب کو کسی نظریۂ زندگی پر یقین کامل ہے تو اُس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ وہ نظریہ اُس کی حرکات و سکنات اُس کے کردار اور اُس کے عمل کے ایک ایک گوشے پر چھا جائے۔ اور اگر کسی وجہ سے ایسا نہیں ہو رہا ہے تو ادیب کو اپنے اس یقین و ایمان کا پھر سے جائزہ لینا چاہئے۔ اور اُسے زیادہ سے

زیادہ استوار اور مضبوط کرنے کی فکر کرنی چاہیئے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نظریاتی شعور کے انتہائی پختہ ہونے کے باوجود اس کا عملی ظہور پوری طرح نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب ہمیشہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ ادیب کی قوت ارادی بیدار نہیں ہے۔ اس کے قویٰ عملیہ پر اس کی لاتعداد سوچوں کا بوجھ اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ وہ شل ہو کر رہ گئے ہیں جیسے کوئی کمزور آدمی بڈھے سے گٹھڑ کے نیچے دب کر رہ جائے۔ وہ جوش میں آکر اُسے اپنے سر پر اٹھا تو لیتا ہے مگر دو قدم بھی اُسے اٹھا کر چل نہیں سکتا۔ یہ کیفیت ادیبوں کی عموماً ہوتی ہے۔ مگر اس کا علاج نہایت آسان ہے۔ اور وہ یہ کہ ادیب اپنے خیالات میں بہت زیادہ اونچا اڑنے کی کوشش نہ کرے۔ یہ دراصل اس کی حد سے بڑھی ہوئی بلند پروازی ہی ہے جو واقعات کی ٹھوس سرزمین سے اُس کے قدم اُکھاڑ دیتی ہے۔ اور اُس کے کردار میں جماؤ اور سکون باقی نہیں رہتا اس لئے یہ نہایت ضروری ہے، اور خاص طور پر نئے فن کاروں کے لئے تو بیحد ضروری ہے کہ وہ اتنا ہی سوچیں کہ جتنا سوچکر وہ زندگی کی عملی جدوجہد کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ اور کشمکش حیات میں کامیابی سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔

ادیب میں عمل کی کوتاہی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ اُس کے فکر و خیال میں کچھ تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ جس نظریہ پر ایمان لاتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے نظریہ یا نظریات کے بُت بھی اُس کی آستینوں میں چھپے رہتے ہیں۔ خاص طور پر اُن نظریات اور اُس ماحول کا اثر اُس پر بہت زیادہ پڑتا ہے جس سے اُس کی کشمکش ہوتی ہے اسی لئے کسی شخص کا کسی شے کی مخالفت میں بہت زیادہ تیزی دکھانا بھی صحیح نہیں ہے۔ بلکہ کسی شے کی جذباتی مخالفت تو دراصل اس سے شکست کھا جانے کے مترادف ہے۔ اس لئے ادیبوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے نظریہ کی اندھی حمایت سے پرہیز کریں اور ہر وقت مخالف کی مخالفت ذہن میں جگہ نہ دیں۔ انھیں تو زیادہ تر ایجابی انداز میں آگے بڑھنا چاہیئے یہی طریقہ دانشمندانہ ہے۔

۳۔ منزل ایک تو ہر لمحہ بیداری کا سبق پڑھاتی ہے منزل اُسے چونکاتی ہے۔ منزل اُسے اُکساتی ہے۔ ادیب کے لئے جس قدر اہمیت نظریہ کی ہے اُسی قدر اہمیت منزل کی ہے۔ اگر ادیب پر یہ واضح نہ ہو کہ اُسے کہاں جانا ہے، تو چاہے اُسے یہ معلوم بھی ہو کہ کس طرح جانا ہے تب بھی وہ صحیح سمت کی طرف بڑھ نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ چلتے چلتے دھوکا کھا جائے اور کسی غلط راستے پر چل نکلے یا جہاں سے چلا تھا وہیں پلٹ کر آجائے۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ادیب پر اپنے ادب کی تخلیق کا اصل مقصود پوری تفصیلات کے ساتھ واضح ہو۔ وہ اپنے پچھلے مقصد کے تمام اجزاء کو اُس سے بدل لے۔ مثلاً اگر ادیب کا مقصود پہلے اپنی ذات کی خوشنودی تھا۔ قوم کی خوشنودی تھا۔ پارٹی کی خوشنودی تھا کسی حکمراں یا رہنما کی خوشنودی تھا اور وہ اس کے بدلے میں مادی انعام و اکرام شہرت یا محض زبانی داد ہی کا طالب تھا۔ اور اب ان سب چیزوں کو رد کر کے اُس نے اپنے اور اپنے آرٹ کے حقیقی خالق کی خوشنودی اور آخرت میں اُس کے ابدی انعام کو اپنا مقصود بنا لیا ہے۔ اور اس غرض کیلئے خالق حقیقی کے دیئے ہوئے نظریۂ پر اُسے انسانی سماج کو ڈھال دینا چاہتا ہے۔ تو پھر ادیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی وقت بھی اِس مقصود کو مضمحل نہ ہونے دے، وہ اس مقصود کو باقی رکھے۔ اس منزل کی طرف شعوری طور پر بڑھتے رہنے۔ اور اس کی یاد میں گھلنے کی مستقل عادت ڈالے۔

منزل کی یاد کو ہر وقت تازہ رکھنے اور اُسے اپنے شعور سے گذر کر تحت الشعور میں اتار دینے کے لئے ضروری ہے کہ ادیب کائنات کے ہر واقعہ اور ہر حادثہ سے متاثر ہو۔ اور اُس کے اُس رخ پر غور کرے جو اُس کے تصورِ منزل کی رُو سے سامنے آتا ہے۔ ایسا جب وہ بار بار کریگا تو منزل کی حقیقت اُس کے دل میں بیٹھ جائے گی۔ اور ایک میٹھے درد کی طرح وہ اُسے ہمیشہ بڑھاتی اُکساتی اور بیدار کرتی رہے گی۔

یہ ہے با مقصد ادیب کی زندگی کے اجزاء کی اہمیت اور حقیقت! اگر کسی ادیب کے یہاں یہ نہ ہوں تو وہ ایک با مقصد ادیب نہیں کہلائے گا۔ چاہے اُس کے ادب میں کسی مقصد کی تائید میں کچھ الفاظ ملتے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے ادب کو کسی وقت مقصدی ادب کہہ لیں لیکن ہم اُس کی زندگی کو اُس کے ادب سے ہم آہنگ قرار نہیں دے سکتے اور ایسے مقصدی ادیب کے لئے تو ضروری ہے کہ ادب اور ادیب میں کسی طرح کا تضاد نہ ہو۔ جو کچھ اُس کا ادب ہو ویسی ہی اُس کی زندگی ہو۔ اور جیسی اُس کی زندگی ہو ویسا ہی اُس کا ادب ہو ضرورت ہے کہ با مقصد ادیب اپنی زندگی کو اپنے ادب کے ساتھ ساتھ لے جائیں۔ یا اپنے ادب کو زندگی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھائیں جو اتفاقی غلطیاں ادیب سے سرزد ہوں یا جو وسوسے اُس کے ذہن میں آئیں اُن کے خلاف اُس کے ضمیر کی کھٹک کو انتہائی تیز ہونا چاہیئے اور اُن کی شعوری تائید یا اُن کی طرف شعوری اقدام سے ہمیشہ ادیبوں کو بچنا چاہیئے۔ انھیں اپنے آپ کو غلطیوں کے ہاتھ میں ایک مرے ہوئے مگسار کی طرح بے بس نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ ہمیشہ اس بات پر یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ جب چاہیں اپنی برائیوں کو چھوڑ سکتے ہیں۔ بہرحال ادیبوں کو چاہیئے کہ وہ جان بوجھ کر اپنے اندر کسی قسم کے تضاد کی پرورش نہ کریں۔ تضاد ادیب اور ادب دونوں کے لئے انتہائی خطرناک ہے۔

ابو المجاہد زاہد

صبح صادق

(۱)

رات تاریک تھی رات پُر ہول تھی زندگی کے کہیں بھی نظارے نہ تھے
ماہتاب آدمیت کا روپوش تھا عدل و انصاف کے بھی ستارے نہ تھے
رہگذاروں پہ تھی رات چھائی ہوئی کوئی جگنو فضا میں چمکتا نہ تھا
جھلملاتی ہوئی ٹمٹماتی ہوئی شمع اخلاق کا بھی اُجالا نہ تھا

راہرو تیرگی میں بھٹکتے رہے رہنماؤں کی بھی لاج جاتی رہی
رات اکڑاتی رہی رات بڑھتی رہی ہر طرف جال اپنا بچھاتی رہی
تھی اخوت پہ بھی رات چھائی ہوئی تھی محبت پہ بھی رات چھائی ہوئی
تھی حکومت پہ بھی رات چھائی ہوئی تھی سیاست پہ بھی رات چھائی ہوئی

کفر و الحاد کے خارزاروں میں تھا دامن فکر و احساس الجھا ہوا
"شر" تو طبعاً ہی تاریک تر تھا مگر "خیر" پر بھی اندھیرا تھا چھایا ہوا
بربریت کے گہرے سمندر میں تھا ڈوبا ڈوبا ہوا سا ضمیر بشر
وحشتوں کے دہکتے جہنم میں تھی شعلہ زن رُوح صدق و یقیں کی مگر

کوہِ فاراں پہ اِک روشنی جاگ اٹھی اور پھر بڑھ کے مہر مبیں ہو گئی
رات نے بڑھ کے پہلے تو دھاوا کیا اور پھر صبح کے نور میں کھو گئی
چادر تیرگی پارہ پارہ ہوئی امن کی روشنی مسکرانے لگی
آدمی کا مقدر چمکنے لگا ہر طرف زندگی مسکرانے لگی

کیا عرب کیا عجم ہر جگہ ہر طرف صبح صادق کے جلوے مچلنے لگے
جن مناظر پہ تھیں ظلمتوں کی تہیں وہ بھی رنگ اپنا اپنا بدلنے لگے
تانے بانے تمدن کے بدلے گئے مرنے جینے کا معیار بدلا گیا
خیر و شر کی حدیں بھی مقرر ہوئیں کھانے پینے کا معیار بدلا گیا

ساری دُنیا میں سچّی سحر ہو گئی زندگی کو حسیں آسرا مل گیا
جو خود اپنی طلب میں بھی ناکام تھے اِن جہالت زدوں کو خدا مل گیا

(۲)

رات تاریک ہے رات پُرہول ہے زندگی کے کہیں بھی نظارے نہیں
ماہتاب آدمیّت کا رُوپوش ہے عدل و انصاف کے بھی ستارے نہیں
رُوح پر کفر و الحاد کی "چھاپ" ہے ذہن مفلوج ہے فکر بیمار ہے
دودھ پیتے ہوئے زہر اگلتے ہوئے کالے ناگوں کی پُرہول پھنکار ہے
یہ بہاروں کی کچلی ہوئی تازگی، رُوح کی سسکیاں امن کی تشنگی
یہ نحوست کے جلتے ہوئے قہقہے اور یہ اہرمن کی بھیانک ہنسی
رنگ و نسل و وطن کی بلائیں بھی ہیں مزدکیّت کی خونیں بلائیں بھی ہیں
نفرتوں کی سلگتی ہوائیں بھی ہیں زر پرستی کی خونی فضائیں بھی ہیں
وحدتِ زندگی کے ترانے بھی ہیں عالمی امن کی لب پہ باتیں بھی ہیں
اور اپنی خدائی کا نشّہ بھی ہے ایٹمی جنگ کی دل میں گھاتیں بھی ہیں
دامنِ علم و حکمت میں ہے تیرگی درس گاہوں پہ ہے رات چھائی ہوئی
رہنماؤں پہ ہے رات چھائی ہوئی اور راہوں پہ ہے رات چھائی ہوئی
کس جگہ بربریت کا ڈیرا نہیں کس جگہ ظلمتوں کا بسیرا نہیں
دورِ نَو کی چمک پر نہ جائے کوئی یہ فریبِ سحر ہے سویرا نہیں
ساتھیو! امن کی ہے اگر جستجو چاہتے ہو کہ سُکھ۔ چین۔ آرام ہو
"امنِ عالم[1] پیامِ خدائی میں ہے" ہمنوا! پیامِ خدا عام ہو
جرأتِ مومنانہ ہے کچھ کام لو رات کا یہ فسوں توڑنا ہے تمھیں
ساتھیو! عصرِ حاضر کے دھارے کا رُخ موڑنا ہے تمھیں موڑنا ہے تمھیں
آج بھی وہ زمانے میں موجود ہے کوہِ فاراں سے ابھری تھی جو روشنی
لیکن افسوس اس کا ہے وہ روشنی چادرِ تیرگی میں ہے لپٹی ہوئی
ساتھیو! روشنی جس میں مستور ہے اٹھ کے وہ چادرِ تیرگی پھاڑ دو
رات کے سینۂ شیطنت خیز میں "صبحِ صادق" کا بڑھ کر عَلَم گاڑ دو

---

[1] سہیل احمد زیدی کا مصرعہ ہے۔ زاہد

شفیق جونپوری

کردگارِ ازل

ہمیشگی ہی اگر مادّے کی ہے تسلیم
تو کردگارِ ازل سے کشیدگی کیا ہے
زمین آگ کا گولا تھی فرض کرتا ہوں
مگر زمین کی ہستی پہ آگہی کیا ہے
زمین آئی کہاں سے سوال کرتا ہوں
مکوّمات کے آغاز کی خودی کیا ہے
ہوئی نہ عقل کی تسکیں خدا کو چھوڑ کے بھی
خدا نہیں ہے تو یہ نظمِ زندگی کیا ہے
چلا کہاں سے زمانے کا کاروان وجود
اور ابتدا ہے تو عنوان آخری کیا ہے
جب ابتدا کی خبر ہے نہ اِنتہا کا پتہ
تو فلسفی بھی حقیقت شناس ہی کیا ہے
زمیں پہ لالہ و گل کی بہار کیا معنیٰ
یہ آسماں پہ ستاروں کی روشنی کیا ہے

انور صدیقی

تجدید

وقت کی بوڑھی رگوں میں ہیں باقی وہ خروش
منجمد ہو گئی موجوں کی وہ یلغارِ عظیم
زندگی بھول گئی راہگذارِ غمِ شوق
اور دھندلائی سی ہے شمع سرِ راہ کی لَو
جادۂ عصمت و تقدیس کی ہر شمع جمیل
ڈھلتی جاتی ہے گناہوں کے سیہ خانوں میں
زیست آشفتہ ہے وحشت کے لہو زاروں میں
"امنِ عالم" کے فسوں ساز درندے ہر سمت
جبڑے پھاڑے ہوئے پھرتے ہیں کہ پی جائیں لہو
امن کی عنبریں چھاؤں کو ترستی ہے حیات
اُف یہ ہر گام پہ عفریت کا رقص!
امن و انصاف کا سوانگ؟
صندلیں باہوں سے لپٹے ہوئے ناگ؟
اور اخلاق کی گلتی ہوئی لاش!!!
مجھ سے ہمدم! یہ تباہی نہیں دیکھی جاتی ــــ!!

ابنِ آدم نے بھلا دی ہیں وہ راہیں جن کو
آج سے تیرہ صدی پہلے اِک "اِنسانِ عظیم"
کہکشاں زار بنانے آیا ——
کہکشاں زار بنا بھی تو گیا ——
ایسی راہوں کو جہاں ظلمتیں صدیوں ہی سے آستادہ تھیں!
آج بھی جہل کی تاریکی ہے ہر سمت محیط
آج بھی عصمت و اخلاق کے گھٹتے ہیں گلے
آج بھی محفلِ ابلیس ہے گرمائی ہوئی
آج بھی نسل کے اور رنگ کے بُت پُجتے ہیں
آج ہر راہگذر سوتی ہے۔
کفر کے سائے کو لپٹائے ہوئے سینہ سے
تیرگی کا یہ فسوں جاگ رہا ہے ہمدم!
اور اِس ظلمتِ بے پایاں میں ——
بنتِ حوّا کے بدن بکتے ہیں ——
ساتھیو آؤ! کہ ہم شمع جلانے نکلیں!
ابنِ آدم کے مقدّر کو بنانے نکلیں!

فاروق بانسپاری

سخنہائے گفتنی

نئی دنیا کرے گی گردشِ چرخِ کہن پیدا
بیاباں کے شکم سے ہونے والے ہیں چمن پیدا

خدا حافظ چلا شیخ حرم میں سوئے میخانہ
تری بے فیض صحبت میں نہ تھا برہمن پیدا

دعائیں دو مری وحشت کو اے تہذیب کے بندو!
کہ جس نے کر دیئے تم میں ہزاروں بانکپن پیدا

خدا اس دور کی انسانیت سے دے اماں تجھ کو
جو انسانوں میں کرتی ہے مزاجِ اہرمن پیدا

ہنسو خانہ بدوشوں پر نہ قصرِ بے ستوں والو
انہیں کے گھر میں ہوتا ہے تمہارا کوہکن پیدا

مرا جہلِ وفا پرور امین دولتِ راحت
تری تہذیب سے غارت گری کا علم و فن پیدا

مرے ذوقِ جنوں کی خوشہ چیں ہے تیری آگاہی
تو کسبِ لعل کرتا ہے میں کرتا ہوں یمن پیدا

لکیریں کھینچ کر ناداں زمیں پر نوکِ خنجر سے
وطن تھا ایک تو نے کر دیئے لاکھوں وطن پیدا

غلامی کیش آزادی کے سحر آگیں ترانوں سے
دلِ شاہیں میں کی تو نے نشیمن کی لگن پیدا

کبھی فاروق جن سے رہبرِ کامل نکلتے تھے
انھیں خلوت کدوں سے ہو رہے ہیں راہزن پیدا

منظر اعظمی

اے دوست

(۱)

یہ صلوت کے پرستار، معصیت کے غلام
یہ حرص و عزت کے ساماں پہ امن کے پیغام
یہ رنگ و نسل کے نعرے، یہ شیطنت کا نظام
تلاش امن و سکوں میں حیات ہو ناکام
بھٹک رہے ہیں اندھیرے میں رہبرانِ کرام
یہی ہے عہد حسیں، دور ضوفشاں اے دوست

(۲)

سجے ہوئے ہیں کہیں جنسیت کے بتخانے
کہیں ہیں "سرخ سویرے" کے سرخ افسانے
یہ اپنی اپنی سیاست کے دام اور دانے
یہ اپنی اپنی غرض، اپنے اپنے پیمانے
خلوص و عدل کہاں سو گئے خدا جانے
یہی ہے آج کا ماحولِ نغمہ خواں اے دوست

(۳)

یہ سحر کار خطابت، حسین تقریریں
یہ دیدہ زیب رسائل، برہنہ تصویریں
ہوس کی ماری ہوئی شوخ و شنگ تحریریں
"یہ صبح سرخ" کی تفریق ساز تعمیریں
یہ زندگی کی غلط اور کریہہ تعبیریں
یہی ہے شعر و ادب کا حسیں جہاں اے دوست

اکبر زمزم

ہمدم سے

(۱)

تم پیامِ شباب دیتے ہو
اور ساقی شراب دیتا ہے
میرے ہمدم مگر مرا احساس
دعوتِ انقلاب دیتا ہے

(۲)

زندگی کے نگار خانے میں
عیش دنیا سنوارتا ہے مجھے
اور بامِ حیات سے ہمدم
ذوقِ منزل پکارتا ہے مجھے

(۳)

دین اب زندگی کا رہبر ہے
میرا احساس سو نہیں سکتا
چند پیسوں میں بیچ دوں ایماں
مجھ سے ہمدم یہ ہو نہیں سکتا

سرمد مظاہری

ایک حقیقت

عقل ہے گرچہ بہت شوخ بھی فرزانہ بھی
اس کی پرواز حقیقت بھی ہے افسانہ بھی
فکرِ انسان کو رستہ بھی بتایا اس نے
فرش کو عرش کا ہمدوش بنایا اس نے
ہاں مگر عقل سے مشکل ہے حصولِ مقصود
اس کی پرواز بھی محدود فضا بھی محدود
بزمِ امکاں سے ورا، اور بھی عالم ہیں کئی
جن کی صورت بھی کبھی عقل نے دیکھی نہ سنی
آدمی وحی کے دامن میں اگر آجائے
رازِ بستۂ قرآں کو اگر پا جائے
راحتِ جاں بھی حاصل ہو سکونِ دل بھی
رازِ فطرت کی، ہو محرم یہی آب و گل بھی
یہی انسان ـــــ یہی کشتۂ تقدیرِ انساں
ہو پھر اِک بار فرشتوں کیلئے قبلۂ جاں

محمد نجات اللہ صدیقی

صالح اور غیر صالح ادب

ایک تقابلی مطالعہ

ادب کیا ہے؟ اس کے جواب میں یہاں کسی علمی اور فنی تحقیق کی ضرورت نہیں۔ ایک بڑے ادیب اور مفکر کی زبان میں "ادب حسن کلام اور تاثیر کلام کا نام ہے"۔ گویا اگر ہم اپنے خیالات کے اظہار میں حسن اور سلیقے کا اہتمام کریں اور اسے موثر پیرائے میں پیش کریں تو ہمارا یہ فعل تخلیقِ ادب کہلائے گا اور اس کلام پر لفظ ادب کا اطلاق ہو سکے گا۔

حسن و سلیقہ فطرتِ انسانی کی جانی بوجھی خوبیاں ہیں لہٰذا ان کی تشریح تحصیل حاصل ہے بات جب حسن و سلیقے سے کہی جاتی ہے تو کان اسے سنتے اور دل و دماغ اسے قبول کرنے پر زیادہ آمادہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح تاثیر حسنِ ادا کا ایک فطری نتیجہ ہے۔ خوبصورت کلام عموماً موثر ہوتا ہے اور موثر کلام کا حسن اس کی تاثیر کی باعث دوبالا ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ تاثیر کا تمام تر انحصار کلام کی فنی خوبیوں اور ظاہری محاسن ہی پر ہے تاثیر اور اثر پذیری خود ایک فن ہے۔

حسن اور اثر پذیری کی صفات کے ساتھ آنے والا ادب ذہنوں پر قابو پا لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ اگر باطل اور منکر بھی ان صفات سے آراستہ کر کے لایا جائے تو وہ بھی ذہنوں اور پھر اعمال میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے لیکن حسن اور اثر پذیری کے ساتھ حق کو ایک خطرناک مناسبت ہے جب خود فکر بھی حسین ہو تو حسنِ ادا اور حسنِ تاثیر ان کے ساتھ مل کر جو نتائج سامنے لاتا ہے، وہ باطل سے مرکب ادب کے شہ کاروں کو بھی شرما دیتا ہے۔

"ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کی بحث اب بہت پرانی ہو گئی اور اب اس پر مزید وقت صرف کرنا بے سود ہے۔ ادب زندگی کیلئے ہے

ادب بھی نہیں زندگی سے ابھرنے والی کوئی چیز بھی زندگی سے الگ نہیں رہ سکتی ادب زندگی سے متاثر بھی ہوتا ہے اور اس پر اثر بھی ڈالتا ہے۔ آج کل "ادب زندگی کی پیداوار ہے" اور "ادب زندگی کا عکاس ہے" کے نعرے کچھ اس انداز میں لگائے جاتے ہیں جس انداز میں کہ کسی انسان کو بالکلیہ ماحول کی مجبور و مقہور پیداوار قرار دیا جاتا ہے۔ گویا ادیب محض ماحول کا ایجنٹ ہوتا ہے جو اس کی عکاسی اور ترجمانی کیا کرتا ہے۔ یہ نظریے حقیقت کے خلاف ہیں اور مخصوص مقاصد کی تکمیل کی خاطر گھڑے گئے ہیں۔ بلاشبہ ایک انسان ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کے اس تاثر کی حد اس کی اپنی ذہنی صلاحیتوں فطری رجحانات اور جذبات و خیالات سے متعین ہوتی ہے لیکن انسان ماحول پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ جو لوگ جتنے زیادہ حساس ہوتے ہیں اور جن کے افکار و جذبات جتنے زیادہ پختہ اور بلند ہوتے ہیں وہ اتنی ہی زیادہ اثر اندازی کی صلاحیت رکھتے ہیں ایک اچھا ادیب عموماً ان لوگوں میں سے ہوتا ہے جو متاثر کم اور موثر زیادہ ہوتے ہیں۔ دنیا کے عظیم شعراء اور ادباء وہی لوگ تھے جنہوں نے اپنے ماحول سے بلند ہو کر سوچا اور اس پر گہرا اثر چھوڑ گئے۔ ادیب کو ماحول کا مجبور و پابند عکاس کہنا ادیب اور ادب دونوں پر ظلم ہے تخلیقِ ادب کا صدور ادیب کے ایک شعوری فعل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ادیب کوئی مشین نہیں، ادیب اپنے ادب کا باشعور خالق ہوتا ہے۔ ایک اچھا ادیب یہی نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے بلکہ اس کے نزدیک یہ بھی ایک سوچی سمجھی بات ہوتی ہے کہ وہ کیوں کہہ رہا ہے؟ یہی نہیں بلکہ اس کا اندازہ کرنے پر بھی بڑی حد تک قادر ہوتا ہے کہ اس کے کلام کا اثر کس حد تک اور کتنا ہو سکے گا۔

ایک وقت تھا جبکہ ادب میں مقصدیت محدود اور ہلکی تھی۔ لیکن اب تو مقصدیت ہی کا دور دورہ ہے کہ آج کا ادیب پہلے یہ طے کرتا ہے کہ اسے کیا مطلوب ہے اور کیوں؟ پھر وہ اپنے ادب کو ان مقاصد سے ہم آہنگ دیکھنا چاہتا ہے۔ مقصد کے بارے میں اس کا فیصلہ اس کے ذہن و دماغ پر چھا جاتا ہے اور اب اگر کوئی بیساختہ شعر بھی زبان سے نکلتا ہے تو وہ ان فیصلوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے۔

ادب زندگی کا عکاس ہے لیکن یہ عکاسی بے مقصد اور بے معنی نہیں ہوتی جس طرح کوئی آدمی زندگی میں حق و باطل، صحیح و غلط اور اچھے اور برے کے معاملے میں معقولیت کے ساتھ غیر جانبدار نہیں رہ سکتا اسی طرح ادیب کے لئے بھی ایسا ہونا ناممکن ہے۔ ادب زندگی کی عکاسی تنقید و تحریب کے لئے بھی کرتا ہے اور تائید و تعمیر کے لئے بھی وہ پسندیدہ کی تعریف و تائید کرتا ہے اور ناپسندیدہ پر کبھی اشاروں کنایوں میں اور کبھی کھلم کھلا تنقید کرتا ہے۔ بعض اوقات اس کے یہ رجحانات اتنے شدید ہو جاتے ہیں کہ وہ ناپسندیدہ پر حملے کرنے لگتا ہے اور پسندیدہ کی طرف دامن پکڑ کر کھینچنے لگتا ہے۔

پھر ادب اس تک محدود نہیں رہتا جو موجود ہے۔ وہ موجودہ اقدار کی تنقید و تائید کے علاوہ زندگی کو نئی اقدار اور نئے خیالات سے معمور کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ اپنے سماج سے بے اطمینانی ادیب کو ایک نئے اور بہتر نظام اور بہتر اور بلند اقدار کی تلاش میں لگا دیتی ہے۔ اس تلاش کے نتیجہ میں وہ کبھی ماضی کی طرف جاتا ہے اور وہاں سے خوبصورت جواہر ریزے چن لاتا ہے اور کبھی مستقبل کے دھندلکوں میں جھانکتا ہے اور پھوٹنے والی کرنوں کا مژدہ سناتا ہے کبھی وہ غور و فکر اور تخیل کی فضاؤں میں پرواز کرتا ہے اور سماج کو زندگی بخش افکار کے تحفے پیش کرتا ہے اور کبھی وہ گذرے ہوئے مفکرین اور ماضی کی حیات بخش ہدایات اور قیمتی تجربوں کی روشنی میں بھٹکے ہوئے سماج کو راہ دکھاتا ہے۔

اس طرح ادب اور زندگی کا تعلق ترجمانی اور عکاسی کا بھی ہے اور تطہیر و تعمیر کا بھی وہ اس کے موجودہ خدوخال بھی واضح کرتا ہے اور نئے نقشے کا انحصار اس سمت پر ہوتا ہے جس پر وہ زندگی کو رواں دیکھنا چاہتا ہے۔ زندگی کا مقصد ادب کا مقصد متعین کرتا ہے۔ یہ مقصد ہی ادب کا معیار تنقید بن جاتا ہے اور یہی اس کے قبول اور ترک و اختیار میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔

اب ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ زندگی میں کیا کیا راہیں اختیار کی جاتی رہی ہیں اور آج ادیب ان مختلف نظریہ ہائے حیات کے زیر اثر کن مختلف سمتوں میں جا رہا ہے۔

موجودہ علوم و فنون کی نشوونما زیادہ تر اور بسا اوقات یکسر جاہلانہ ماحول میں ہوئی ہے۔ دنیا اور خصوصیت کے ساتھ یورپ ایک عرصہ سے جاہلیت کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ علوم میں سنجیدہ غور و فکر اگر کسی حد تک ہوا بھی ہے تو ادب اتنے سے بھی محروم رہا ہے۔ زندگی کے بارے میں جتنے ہی غیر متوازن نقطۂ نظر ہو سکتے ہیں چاہے وہ یاس و قنوطیت ہو یا مفرطانہ رجائیت اور چاہے وہ انتہا پسندانہ جبریت ہو یا غیر ذمہ دارانہ لاابالی پن سب کے سب ادب کے سر پر سوار ہیں۔ جن غیر ذمہ دار اور کوتاہ بین نظام ہائے حیات کی آغوش میں ادب نے اب تک پرورش پائی ہے اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر موجودہ ادب میں کچھ مشترک صفات ہیں جو اس کے تمام دھاروں میں یکساں رواں دواں ہیں۔

ان میں سب سے پہلی خرابی زندگی کے بارے میں غیر ذمہ دارانہ رویہ ہے۔ ادیب اپنے آپ اور اپنی زندگی کو آزاد اور خود مختار سمجھتا ہے۔ جو اب وہی اور احتساب کے ہر طرح کے تصور اور احساس سے خالی ہونے کی وجہ سے اس میں ذمہ داریت نہیں باقی رہ جاتی اور کسی مافوق الطبیعی حاکم اور مالک کے تصور سے فقدان کی وجہ سے اس میں ایک طرح کا احساس آزادی پیدا ہوتا ہے جو اس آزادی سے قطعاً مختلف نوعیت رکھتی ہے جو ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ یہ آزادی اسے ہر طرح کی انسانی اور اخلاقی حدود کے حق میں لاپرواہ اور غیر سنجیدہ بنا دیتی ہے۔

اس صفت کے نتیجہ کے طور پر اس کا ادب زندگی میں انہی صفات کی تخم ریزی کرنے والا اور نمو بخشنے والا بن جاتا ہے جس دل میں بھی ضمیر کی آواز کے خلاف نفس پل پل کر بداخلاقی اور بدکرداری کے تقاضے کر رہا ہوتا ہے اس میں یہ ادب نفس کی مدد کے لئے تازہ کمک پہنچاتا رہتا ہے۔ یہ ادیب سماج کی عکاسی خیر متوازن اور غیر ذمہ دارانہ طور پر کرتے ہیں اور سماج کی انسانی اور اخلاقی اقدار کے سلسلے میں لاابالی پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

دوسری چیز جو موجودہ ادب پر بری طرح سوار ہے وہ مادہ پرستانہ لذتیت ہے۔ حیات و کائنات کی بابت جاہلانہ نظریات کے لازمی تقاضے کے مطابق جاہلی ادیب زندگی کو ایک غنیمت موقع سمجھتا ہے دنیا کی لذتیں۔ چاہے وہ جسمانی ہوں یا ذہنی اور نفسیاتی، ان کے حصول کی سعی و جہد اور ان سے لطف اندوزی کے علاوہ اس دنیا میں اسے کوئی اور معقول اور نتیجہ خیز

کام نظر نہیں آتا۔ ایسا ہونا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا۔ جاہلی نظریہ حیات کا۔ اور حیات بعد موت کے انکار کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ یہ مادہ پرستانہ لذتیت جب متذکرۂ بالا آزاد اور غیر ذمہ دارانہ روش کے ساتھ ترکیب پا جاتی ہے تو جاہلی ادب اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ وجود میں آجاتا ہے۔

جب ادیب کا اپنا نقطۂ نظر یہ ہوگا تو ظاہر کہ وہ سماج کو انہی کانٹوں پر گھسیٹنے کا۔ چنانچہ اس ادب کا کام ہر وہ داغ سے مادہ پرستانہ لذت پرستی کے علاوہ اور تمام اقدار حیات کا اخراج ہے۔ جس داغ میں بھی عیش کوشی اور مادی ترقی مادی فلاح کے علاوہ کوئی اور سودا ہوتا ہے یہ ادب اپنی تمام ٹیکنیوں اور فتنہ سامانیوں کے ساتھ اس پر حملہ کرتا ہے اور بالآخر اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔

یہ دونوں خصوصیات پورے جاہلی ادب میں مشترک ہیں۔ آپ پر یہ نظر واضح ہو سکتا ہے کہ ان خصوصیات کے ساتھ صالحیت کا کوئی جزو بھی نہیں پنپ سکتا۔ خصوصیات تمام انسانی اقدار حیات کی دشمن ہیں ان کے فطری نتیجہ کے طور پر سماج میں غیر ذمہ داری۔ بدکرداری۔ عریانیت۔ نود غرضانہ کش مکش ہلاک نفاد پرستی اور عیش کوشی غرض ہر طرح کی پست اقدار حیات اور ابتذاطی کو نشو ونما نصیب ہوتا ہے۔ اور ذمہ دارانہ زندگی بدکرداری عصمت و عفت۔ ایثار و قربانی۔ باہمی تعاون و تواضع اور خصوصاً پسندانہ کفرت کوشی کو زوال نصیب ہوتا ہے۔

آج سرمایہ دارانہ جمہوریت کے زیر اثر تیار ہونے والا ادب ان دونوں خصوصیات کا پوری طرح حامل ہے۔ وہ آزادی فرد اور جمہوریت جس کا یہ آج حریف کے مقابلے میں ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ اسی ہلاک کن اخلاق اور لذتیت موزیر ذمہ داری اور لذتیت پر منتج ہوتی ہے جس تک نام نہاد ترقی پسند اشتراکی ادب پہنچا ہے۔

آج کا ترقی پسند ادب اشتراکی نظام زندگی کا داعی ہے۔ اشتراکیت ایک نظام زندگی ہونے کے ساتھ ہی عام جاہلی اسپرٹ سے علیحدہ کوئی وجود نہیں رکھتی۔ اس کی بنیاد بھی حیات و انسان کے بارے میں انہی نظریات پر ہے جو تمام ہی جاہلی نظاموں کا خاصہ رہے ہیں۔ انسان کی عدم جوابدہی اور خود مختاری اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی آزادروی اور غیر ذمہ داری اور پھر آخرت کے تصور سے خالی نظریۂ حیات اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی دنیا طلبی عیش پرستی اور لذتیت جس طرح تمام جاہلی نظام ہائے جہالت کی بنیاد رہی ہے اسی طرح اس نئے نظام کی بھی بنیاد ہے۔ اس نئے نظام نے اپنے نئے ادب کو کچھ نئے تحفے بھی دیئے ہیں جو سرمایہ دارانہ جاہلیت کی بنیادی خرابیوں میں مزید اضافے ہیں۔

ان میں سب سے نمایاں چیز خونی ٹکراؤ ہے۔ جب ادیب حسن ادا کے ساتھ اثر پذیری کے معقول اور پسندیدہ ذرائع چھوڑ کر اپنے گندے مقاصد کے لئے ہیجان پیدا کرنے والے ہتھ کنڈے استعمال کرتا ہے اور طرح طرح کے داؤں پیچ استعمال کر کے پڑھنے والے کے ذہن پر مستولی ہو کر اسے گولیاں چلانے۔ بم پھینکنے۔ آگ لگانے۔ لوٹ مار مچانے اور قتل و غارت گری کیلئے اکساتا ہے تو وہ ادیب نہیں رہ جاتا۔ ایسا کرنا سماج کا گلا گھوٹنا ہے۔ یہ خونی طریق کار اشتراکی تحریک کی عین فطرت کا تقاضا ہے اور اس تحریک کے آلۂ کار ادب میں اس کا پایا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ البتہ جو چیز ہم سب کے سر جوڑ کر سوچنے کی ہے وہ یہ کہ غیر ذمہ دارانہ روش اور مفرطانہ لذت پسندی کے ساتھ اپنے مقصود کے حصول کے لئے خون بہانا اور آگ لگانا بھی جس ادب کی تبلیغ کا ایک جزو بن جائے۔ وہ ادب سماج کے حق میں کیسا ہوگا؟

آج کے ادب کی ایک اور خصوصیت تنگ نظری ہے۔ جس طرح آج کا انسان قوم پرستی۔ نسل پرستی۔ اور طبقہ پرستی کی بلاؤں میں مبتلا ہے۔ اسی طرح آج کا ادب بھی انسانیت کا علمبردار نہیں رہا۔ مختلف فرقوں۔ قوموں۔ نسلوں اور طبقوں کے نقطۂ نظر کی نمایندگی الگ الگ ادب کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادب ان رجحانات کے سلسلے میں اگر ایک طرف کچھ پیچھے ہے تو ایک طرف سب سے آگے بھی ہے۔ اس نے کسی درجے میں نسلوں۔ قوموں اور فرقوں کے مخصوص نقاط نظر اور مفادات کے تاثر سے ادب کو بچایا ہے لیکن اس نے ادب میں گھناؤنی حد تک طبقہ پرستی پیدا کر دی ہے۔ ایک طبقہ کو اچھالنا اور دوسرے طبقے کو اس کے بنائے ہوئے سماج کو۔ اس کی تمام اقدار کو گرانا اور گرا کر پیش کرنا اس کا شیوہ ہے۔ پھر ترقی پسند ادب اب روسی سماج کا آلۂ کار بن چکا ہے اس طرح طبقہ واریت کے علاوہ ترقی پسند ادب روس پرستی کے خطرناک مرض میں مبتلا ہو چکا ہے۔ یہ خصوصیت اس کے ادب میں [illegible]

ترقی پسند ادب کا ایک اور خاصہ ہے جسے دوسرے مکاتب فکر میں بھی خاص مقام حاصل ہے۔ یہ خصوصیت ہر نئے کی محبت اور ہر پرانے سے نفرت ہے۔ ہر چیز ماضی کی ہے اس کا محض ماضی کا ہونا۔ اور محض پرانا ہونا اس کے ناقابل قبول ناپسندیدہ اور نامعقول ہونے کی دلیل ہے۔ یہاں اس فلسفے کا جائزہ لینا مقصود نہیں جو [illegible]

صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ ماضی کی ہر چیز خواہ وہ خاندان کا محترم ادارہ ہو یا ازدواجی تعلق۔ بڑوں کا ادب ہو یا چھوٹوں سے پیار، ہمدردی وہی خواہی ہو یا رحم و کرم اور ایثار و قربانی۔ ذاتی ملکیت کا اصول ہو یا ایک دوسرے کے حقوق کا احترام سب کے سب ان کے نزدیک قابل تمسخر ہیں یہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کا رد کرتے ہیں اور ان کے خلاف انسانوں کو بھڑکانے اور اکسانے کی نکتہ میں کسی حربے کو بھی نہیں چھوڑتے۔ اس طرح ماضی کی ہر اچھائی سے یہ سماج کو محروم کر دینا چاہتے ہیں اور ہر نئی چیز کو چاہے وہ معقول ہو یا نامعقول، رواج دینا چاہتے ہیں۔ دراصل اس سے ان کا مقصد اپنی ان "بدعات" کے لئے گنجائش نکالنا ہے جن کے لئے اس پوچ دلیل جدیدیت کے علاوہ کوئی اور دلیل نہیں ملتی۔

اب تک ہم نے یاس پسندانہ اور قنوطی ادب پر کچھ روشنی نہیں ڈالی ہے۔ یہ نظریات حق ناشناسی کی پیداوار ہیں اور زندگی کے حق میں مہلک اثر رکھتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ لادینیت کے مزاج سے ان افکار کو یک گونہ مناسبت تھا ہے اور عوام تک اس افیون کا پہنچتے رہنا اسے اپنے مفاد کے مطابق نظر آتا ہے لیکن آج کا ادب ان اثرات سے اس درجے متاثر نہیں جتنا کہ ماضی میں رہا ہے۔

مفرطانہ رجائیت بھی قنوطیت کے پہلو بہ پہلو رومانوں سے نمو پاتی رہی ہے۔ قنوطیت قوائے عمل کو مضمحل کرتی ہے اور رجائیت ایک طرح کی آزادی عطا کرتی ہے۔ اسی طرح یہ فکر غیر ذمہ دارانہ لذت پسند ادب کے پیدا کرنے میں زیادہ موثر رہا ہے۔

ہمارے ملک ہندوستان کا ادب بھی انہی اثرات کا حامل ہے ملک کے موجودہ ادبی رجحانات کو اسلام پسند رجحانات رکھنے والے ادب کے علاوہ ہم مندرجہ ذیل سات اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ ترقی پسند کمیونسٹ ادب
۲۔ ترقی پسند سوشلسٹ ادب جو ساتھ ہی ہندوستانی قوم پرستی کا بھی علمبردار ہے۔
۳۔ ہندوستانی قوم پرستی کا علمبردار ادب جو کانگریس کی کارکردگی پر تنقید بھی کرتا ہے۔
۴۔ ہندو قوم پرستی کا علمبردار آزاد رو، اور سوشلسٹ رجحانات رکھنے والا ادب۔
۵۔ مسلم قوم پرستی کے جذبات رکھنے والا فرسودہ اور رجعتی ادب۔
۶۔ خالص لذت پسندانہ ادب
۷۔ منفرد ادیبوں کا ادب جو موجودہ سماج سے بے اطمینانی کے باوجود متذکرہ بالا کسی گروہ کے ساتھ نہیں ہیں۔

ا۔ ترقی پسند کمیونسٹ ادب

ترقی پسند ادب کے سلسلہ میں اوپر جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ سب ہندوستان کے ترقی پسند ادب پر بھی صادق آتا ہے۔ غیر ذمہ داریت۔ لاابالی پن اور لذتیت عریانیت اور تخریبی طریق کار سب کا سب یہاں موجود ہے ان کی زندگی کی عکاسی بھی یک رخی اور جانبدارانہ ہوتی ہے اور انہیں آج کے سماج میں ایسی اقدار بالکل نہیں ملتیں جو پسندیدہ اور لائق تائید ہوں ... یہ تمام اخلاقی اقدار کے دشمن اور ہر طرح کے مذہبی رجحانات کو ختم کر دینے کے درپے ہیں ان تمام خرابیوں پر مستزاد روس پرستی کا خطرناک حد تک پہنچا ہوا مرض ہے۔

اخلاقی اقدار کی تخریب اور اخلاقی بندشوں میں ڈھیل کے ساتھ یہ اپنے نظام کو خالص استدلال و تفہیم کے سہارے نہیں بلکہ مرعوب کن ہتھکنڈوں جھوٹے دعاوی اور فریب آمیز پروپیگنڈا کاریوں کے سہارے پیش کرتے ہیں۔ ان کے تاریخی استدلال، بھاندر کی بازی کے نمونے ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ عوام کے ذہنوں پر چھا کر ان کی حیوانیت کو ہوا دیتے ہیں۔ ان کو ابھار کر ان میں ہیجان پیدا کر کے یہ خون کی ندیاں بہانا چاہتے ہیں۔ یہ موجودہ سماج کے غلط اصولوں ہی کو نہیں صحیح اصولوں کو بھی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ پھر ان کی جنگ صرف اصولوں سے نہیں معلوم ہوتی یہ افراد کو بھی اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کا ہر مخالف گردن زدنی ہے۔ نتیجتہً ان کا تنقیدی لہجہ انتہا درشت اور سخت ہوتا ہے جو کسی طرح معقول نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ خرابی اب اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ان کے اپنے گروہ کے بعض ادیبوں کو بھی اس کے خلاف زبان کھولنی پڑی ہے

یہ ادب ہمارے ملک میں بڑی تیزی کے ساتھ پھیلتا رہا ہے۔ اس کے زیر اثر ہمارے نوجوانوں میں حیوانیت جاگ رہی ہے۔ ان میں جنسی افراط کی پھیل رہی ہے۔ ان میں قومی اور ملکی مفاد کی طرف سے بیگانہ تغافل اور انتہائی غیر ذمہ دارانہ پرورش پا رہی ہے۔ ان میں غیظ و غضب اور توڑ پھوڑ کا خونی طریق کار سرایت کر رہا ہے۔

ہم تنبیہ کر دینا چاہتے ہیں کہ اس ادب کی کامیابی ملک و ملت کی موت ہوگی۔ اس کی کامیابی ہندوستان میں کمیونسٹ انقلاب کے مترادف ہوگی اور اس انقلاب کے نتیجے میں بچی کھچی اخلاقی اقدار بھی فنا کے گھاٹ اتار دی جائیں گی۔ ہمارے ملک کا امن و چین مدت دراز کے لئے عنقا ہو جائے گا۔ اور پھر ہمارے ملک میں ایک کلیسا پسند اور جابر و ظالم آمریت قائم

ہو جائے گی جو فرد کی آزادی کا گلا گھونٹ دے گی۔ یہی نہیں بلکہ ہمارا ملک روس کا غلام ہو جائے گا اور ہم تاریخ کے ایک ایسے تاریک دور میں داخل ہو جائیں گے جس کی ہولناکیوں کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

۲۔ دوسرا رجحان ترقی پسند سوشلسٹ ادیبوں کا ہے جو ہندوستانی قوم پرستی کے بھی علمبردار ہیں۔ مارکسیت پر ایمان رکھنے والے جو ادیب روسی سامراج کی غلامی کے خلاف ہیں اور اپنی نرمئ طبع کی وجہ سے خونی انقلابی طریق کار کو بھی ملک کے لئے مہلک سمجھتے ہیں وہ کمیونسٹ ترقی پسندوں سے الگ راہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے غیر خونی کمیونزم میں ہندوستانی قوم پرستی کا پیوند بھی لگایا ہے۔ ان ایتسارات کے علاوہ یہ غیر ذمہ دارانہ لذت پرستی میں آوارہ الذکر اور دیگر تمام مکاتب ادب سے پیچھے نہیں ہیں۔ ان کے یہاں بھی عریانیت اور فحاشی کی گندگیاں عام ہیں۔ طبقہ واری تناقر پھیلانے میں بھی یہ کمیونسٹ ترقی پسندوں سے کچھ پیچھے نہیں۔

ان کی قوم پرستی ان کو یہ سکھاتی ہے کہ بیرونی طاقتوں کے مقابلے میں قومی عصبیت ہی نہ پیدا کریں بلکہ دوسری قوموں سے تعلق کے سلسلے میں ہر طرح کی بدعہدی۔ خیانت۔ بدکرداری اور فریب دہی کو روا رکھیں ملک کے اندر کے لئے طبقہ واریت۔ باہر کے لئے قوم پرستی اور پھر جاہلی ادب کی تمام مشترک خرابیاں یہ اس ادب کا سرمایہ ہیں۔

اس ادب سے بھی کچھ کم حیوانیت نہیں ابھرتی۔ یہ صحیح ہے کہ یہ اتنی شدید تخریب کے قائل نہیں ہیں لیکن اخلاقی اقدار کے سلسلہ میں ان کا رویہ بھی وہی ہے جو متذکرہ بالا گروہ کا ہے۔

اس طرح ان بنیادی خامیوں کے ساتھ ان کا ادب بھی سماج کے لئے تخریبی اور مضر اثرات خطرناک حد تک رکھتا ہے۔

۳۔ تیسرا گروہ ان ادیبوں کا ہے جو قوم پرست ہونے کے ساتھ ساتھ گاندھی جی سے بھی متاثر ہیں۔ فکر و نظر کے اعتبار سے گاندھی جی کی ہستی ایک موثر ہستی تھی۔ آپ نے صرف ہندوستانی سیاست پر ہی گہرے اثرات نہیں چھوڑے ہیں بلکہ ادب کو بھی متاثر کیا ہے۔ چنانچہ کوئی ادیب چاہے وہ اجتماعی نظام معیشت میں سوشلسٹ ہی کیوں نہ ہو کچھ اخلاقی اقدار کے بھی حامل ہیں۔ گاندھی جی کے فلسفۂ اخلاق پر سیر حاصل تبصرہ کے لئے تو کوئی دوسری نجمت ہی موزوں ہو سکتی ہے۔ لیکن چند اشارے یہاں بھی ضروری ہیں۔

ایک خاص طرح کا اخلاق ایک خاص نظریۂ حیات و کائنات کے ساتھ ہی پنپ سکتا ہے۔ اخلاقی نظام کی پاکیزگی کے لئے اس کا کوئی مستقل ماخذ ہونا ضروری ہے ورنہ اخلاقی تصورات خرابت پسندوں کی تاویل و توجیہ کے شکار ہو کر اپنا مقصد کھو سکتے ہیں۔۔۔۔ ساتھ ہی اخلاقی تصورات کی پشت پر کوئی قوت محرکہ بھی ہونی چاہئے۔ یہ قوت محرکہ انسان کے ذہن و دماغ میں اس ضابطۂ اخلاق کے مناسب نظریۂ حیات و کائنات کے راسخ ہو جانے سے ہی فراہم ہو سکتی ہے ہم جب اس ادب کے اخلاقی تصورات کا جائزہ لیتے ہیں تو انہیں ان چیزوں کی کمی کا بری طرح شکار پاتے ہیں۔ ان کیموں سے جو خرابیاں رونما ہوتی ہیں ان کی تفصیل مشکل ہے سب سے بڑی بات یہ کہ اخلاقی تلقینات میں ہی اخلاقی ڈھیل کی گنجائشیں چھپی رہتی ہیں۔ یہ اخلاقی تصورات بھی جب قوم پرستی کے تابع ہو جاتے ہیں تو ان کی بری گت بنتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ قوم پرستی اخلاقی ضابطہ کی پابندی کے لئے کوئی معقول قوت محرکہ نہیں بن سکتی بلکہ یہ خود ایک ایسے ضابطۂ فکر و عمل کی تعلیم دیتی ہے جو دنیا کے بھانے بوجھے اخلاقی تصورات کے منافی ہیں۔ سوشلسٹ خیالات کی ہمہ گیر اور مستند اد ہوتی ہے۔ قومی ملکیت کے اصول کو اجتماعی معیشت کے اصول عامہ کے طور پر تسلیم کرنا خود معروف اخلاقی اقدار سے میل نہیں کھاتا۔ اس اجمالی کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

اس طرح گاندھی جی کے اخلاقی تصورات کی خامی قوم پرستی کے مزاج کی بنیادی خرابیاں ـــــ سب کی سب یہاں موجود ہیں اور اس صورت میں یہ ایک ظاہر حقیقت ہے کہ یہ ادب اجتماعی فلاح کا ضامن نہیں۔

۴۔ ہندو قوم پرست ادب

گذشتہ پچاس برس سے پہلے بھی بعض وجوہ سے ہمارے ملک میں شدید فرقہ وارانہ ذہنیت پرورش پاتی رہی ہے پھر گزشتہ دس سال کی سیاست ۱۹۴۷ء کے مصنوعی انقلاب اور گزشتہ تین سال کے ہندو پاکستانی تعلقات اور ہندوستان کی داخلی و خارجی سیاست کے زیر اثر خصوصیت کے ساتھ ہندو قومی تعصب اور دوسری قوم کے خلاف شدید ردعمل اور نفرت کی رفتار بہت بڑھ گئی ہے۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے ادیب شدید ہندو عصبیت میں مبتلا ہیں۔ گذشتہ فسادات پر جو ادب تیار ہوا ہے اس کے ایک حصے میں آپ

اس عصبیت کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ اس ادب میں واقعات کا گلا گھونٹ کر بعض دعاوی کو سچ ثابت کرنے کے لئے زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں۔ جہاں اتنی زیادتی نہیں وہاں کم از کم یہ جرم ضرور ہے کہ مخالف گروہ کے اچھے عناصر سے بالکل صرفِ نظر کر کے ان کے خراب عناصر ہی کو اس طرح اچھالا گیا ہے کہ گویا حریف قوم بس انہی کرداروں کی مجموعہ ہے۔ حالانکہ خراب عناصر دونوں ہی طرف تھے اور انہی عناصر کے غلبہ کے نتیجہ میں ان شیطانی حرکات کا ظہور ہوا جنہیں ہم فسادات کہتے ہیں۔ اس کے بعد کی تحریروں میں بھی یہ اثرات پوری طرح پھلنے پھولنے کے مواقع پا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے موجودہ کردار پر حملے تو خیر کسی درجے میں معقول ہو بھی سکتے ہیں لیکن ان کے کلچر اور ان کے نظامِ زندگی ان کے افکار و نظریات۔ ان کی تاریخ کے روشن اور قابلِ تعریف ادوار سبھی ان کے تعصب کے شکار رہیں اور ان پر کھلے چھپے حملے اور رکیک حملے بھی آپ کو جا بجا نظر آئیں گے۔ یہ لوگ ہندو قوم پرستی کو طاقت پہنچانے کا طریقہ صرف یہی سمجھتے ہیں کہ دوسرے ملکوں اور دوسری تہذیبوں کے خلاف جذبات کو برانگیختہ کیا جائے۔

جہاں تک اخلاقی اقدار کا سوال ہے دھرم کا نام لینے والے یہ ادیب اسی آزاد روی اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ زندگی کی طرف لے جاتے ہیں جو تمام جاہلی ادب کی مشترک منزل ہے۔ ان کے یہاں بھی آپ فحاشی اور عریانیت پائیں گے بلکہ ان کی عریانیت تو ملک کے لئے زیادہ مہلک ہے۔ یہ اپنی محجوب فحاشی اور عریانیت پر سابق ہندو کلچر سے نظائر و شواہد ڈھونڈ لاتے ہیں اور انہیں ایک اُسوہ بنا کر نوجوانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

معاشی نظام کے سلسلہ میں یہ گروہ انتشار میں مبتلا ہے کوئی جاگیرداری اور زمینداری کا حامی ہے تو کوئی اجتماعی ملکیت اور سوشلزم کا۔

اب جبکہ اس قسم کا ادب ہمارے ملک میں اسٹیج و صحافت اور ریڈیو سے لیکر کتابوں۔ افسانوں۔ نظموں۔ گیتوں غرض کہ ہر سطح پر اپنا اثر جما چکا ہے ہندوستان کے تمام سمجھدار لوگوں کے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ سر جوڑ کر اس کے مالہ اور ماعلیہ پر سوچیں کیا واقعی یہ فرقہ وارانہ عصبیت جو ہر طرح کی اخلاقی و انسانی قیود سے آزاد ہے ملک و قوم کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ کیا یہ آزاد روی یہ بداخلاقی اور یہ عریانیت کسی بھی مستحکم کلچر کی بنیاد بن سکتی ہے۔ کیا محض قومی عصبیت اور کسی دوسری قوم کی مخالفت بہت عرصہ تک کسی اتحاد و تنظیم کو پائداری بخش سکتی ہے؟

موجودہ فرقہ پرستانہ تحریک اپنی آزاد روی اور شدت پسندی کے ساتھ حقیقتاً انہی حیوانی جذبات کو اُبھارتی ہے جن کا پھل یہ ملک ایک بار چکھ چکا ہے۔ یہ حیوانی جذبات جب ایک بار کسی قوم میں ابھار دیئے جاتے ہیں تو دبنے کا نام نہیں لیتے۔ کل کو اگر آپ اپنی خواہش کے مطابق اپنے عزائم پورے بھی کر سکے تو بھی یہ رجحانات دبائے نہ دبیں گے۔ آپ آج اپنی قوم کو بداخلاقی۔ بدکرداری اور دوسروں کے جائز حقوق کو غصب کرنے کی جو عام تربیت اپنے ادب کے ذریعہ دے رہے ہیں وہ کل کو بھی اپنے اثرات باقی رکھے گی۔ اور یہ اخلاقی گھن آپ کے اس مضبوط ستون کو جو آپ فرقہ پرستی کے مصالحے سے تعمیر کر رہے ہیں لے بیٹھے گا۔ پوری انسانیت اس سے جس طرح متاثر ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی اس پر تبصرہ تحصیلِ حاصل ہے۔

۵۔ مسلم قوم پرستی کے جذبات رکھنے والا ادب

تقسیم کے بعد سے ہندوستان میں مسلم قوم پرستی کے شدید جذبات کے پھلنے پھولنے کے مواقع ختم ہو گئے اور یہ جذبات اپنے لئے مناسب زمین پا کر پاکستان میں پھلنے پھولنے کے متمنی ادھر کو منتقل ہو گئے۔ لیکن گزشتہ فسادات اور بعد کے حالات ان ادیبوں میں ان رجحانات کی مزید پختگی کا باعث بنے ہیں جو نسلاً مسلمان ہیں۔ یہ مسلمانوں کو مجبور و مقہور دیکھتے ہیں۔ یہ ہندو قوم پرستی کے خطرناک رجحانات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر مسلمانوں کی موجودہ سہمی ہوئی حیثیت بھی دیکھتے ہیں اس کا اثر ان پر کبھی یاس و قنوطیت کبھی داد و فریاد اور کبھی بپھری ہوئی مظلومیت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے یہ کوئی مستقل ادب نہیں ایک ہنگامی نوعیت رکھتا ہے لیکن یہ ہنگامہ جتنا کاغذ پر منتقل ہو جاتا ہے اس سے زیادہ دلوں میں ہے اس لئے میں صفائی کے ساتھ اس پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ ایک طرف تو اس سلسلہ میں ہماری طرف سے کوئی غلط فہمی نہ رہ جائے دوسری طرف ہم اپنے ان بھائیوں کا تعاون حاصل کر سکیں جو اپنی غلط اور شاید کچھ طبیعت کی کمزوری کے باعث ان رجحانات کا شکار ہو گئے ہیں۔

آج کے یہ ادیب موجودہ صورتِ حال کی تمام تر ذمہ داری صرف دوسرے فرقہ کے سر تھوپ دیتے ہیں حالانکہ اس کے وجود میں لانے کے باعث کسی حد تک خود مسلمان بھی ہیں۔ مسلمانوں کے موجودہ اجتماعی کردار کے علاوہ گزشتہ نصف صدی کی سیاست کا ان حالات میں زبردست حصہ ہے۔ ادیبانہ حکمت و بصیرت کا تقاضا تھا کہ اس دور میں خصوصاً پچھلے دس پندرہ سالوں میں بجائے وقت کی سیاسی رو میں بہنے کے ہمارے ادیب اپنے

مقام کا حق ادا کرتے اور ملک و قوم کی رہنمائی انسانی و اخلاقی اصولوں کی طرف کرتے لیکن افسوس کہ ایسا نہ کیا گیا اور صرف اسلام پسند ادیبوں کا بہت ہی مختصر گروہ وقت کی عام سیاسی رو سے الگ رہکر ان قدروں کی حمایت کر سکا۔

پھر یہ کہ اب جبکہ کچھ ناپسندیدہ حالات پیدا ہی گئے ہیں تو دوسروں کو کوسنے دینے اور حالات بیان کر کر کے آنسو بہانے کے بجائے ادیب کا فریضہ یہ ہے کہ اپنے دل و دماغ کی بیداری کا ثبوت دے، یہ ثبوت فریاد و مرثیہ خوانی سے نہیں بلکہ حالات کے صحیح تجزیئے اور ایک واضح لائحہ عمل کی طرف قوم کو دعوت دینے ہی سے فراہم ہو سکتی ہے۔

پھر ہمارے نزدیک یہ بات ہی سرے سے غلط ہے کہ آپ محض مسلمانوں ہی کے غم میں گھلے جائیں۔ آج خرابی صرف مسلمانوں کے سلسلے میں کسی فرقہ کے تکلیف دہ رویے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ پورے کا پورا سماج سڑ چکا ہے۔ یہ پورا ہندوستانی سماج جس میں ہندو مسلمان سبھی شامل ہیں مصیبت میں مبتلا ہے۔ اخلاقی اقدار میں ایک زبردست انحطاط رونما ہو چکا ہے اور خطرہ ہے کہ کہیں پورا سماج ہی ہلاکت اور تباہی کے گھاٹ نہ اتر جائے۔ یہ پورا سماج آپ پر اپنا حق رکھتا ہے۔ انسانیت آپ سے مطالبہ کرتی ہے کہ آپ پورے سماج کے بہی خواہ اور ہمدرد ہوں۔ پھر آپ کا دین بھی اس پر مزید زور دیتا ہے یہ تنگ نظری آپ کو کس نے سکھائی؟ پھر یہ بھی واضح رہے کہ کسی ایک برائی کا الگ سے کوئی علاج ممکن ہی نہیں۔ پورے بدن کا علاج ہی اس کے ہر ہر عضو کی صحت و توانائی کا ضامن ہو سکتا ہے۔

ہمیں یہ دیکھ کر بھی افسوس ہوتا ہے کہ یہ ادیب مسلمان ہیں لیکن اخلاقی اقدار کے معاملے میں اپنے ادب اور اپنی زندگی دونوں میں غیر محتاط ہیں عریانی اور فحاشی کا جو سیل عظیم آج سارے ادب کو بہائے لئے جا رہا ہے اس کی زد سے یہ کچھ زیادہ محفوظ نہیں۔ پھر مستزاد یہ کہ ان میں سے اکثر کمیونسٹ اور ترقی پسند رجحانات کے حامل ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ ادب بھی سماج کے لئے ایک مخرب ہی کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر طرح ناپسندیدہ ہے۔

۶۔ لذت پرستانہ ادب

گو لذت آج کے ادب کی ایک مشترک قدر ہے لیکن تلاش مسرت۔ واقعیت اور تحلیل نفسی کی نقاب اوڑھے ادیبوں کا یہ گروہ سماج میں جنسی انارکی اور فحاشی پھیلانے کا کام سب سے زیادہ قوت کے ساتھ انجام دے رہا ہے صرف یہی نہیں کہ یہ صفحہ قرطاس پر موجودہ سماجی زندگی کے گھناؤنے ہی پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اس کے انداز بیان میں تشویق اور اکساہٹ پوشیدہ رہتی ہے کمزور سماج میں برائی اور فحاشی کی تبلیغ کے لئے ظاہر ہے کہ کسی دلیل یا برہان کی ضرورت نہیں۔ چٹخاروں کے ساتھ تذکرہ ہی کافی ہے۔ چنانچہ یہ ادب اس کام کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔ اس نے سند جواز حاصل کرنے کے لئے علمی انداز کی بحثوں کا بھی سہارا لیا ہے۔ یہاں فرائڈ کے فکر و فلسفے کے تجزیئے کی گنجائش نہیں۔ فی الحال ہم صرف ان برے اثرات کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں جو اس ادب سے ہمارے سماج پر مرتب ہوتے ہیں۔

سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ غلط کاروں کو اپنی غلطی ایک فطری ضرورت اور اپنی خلقت اور موجودہ ماحول کے ایک لازمی تمہ اور منطقی نتیجہ کی حیثیت سے نظر آتی ہے۔ یہ احساس تمام اصلاحی کوششوں کو بیکار کر دینے والا اور ہر طرح کے اخلاقی اٹھان کے رجحانات کو دبا دینے والا ہے۔ یہ اس جذبہ کو کچل دیتا ہے جو ہر ضمیر میں برائی کے ارتکاب کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

اس ادب سے ذہن پر یہ اثر بھی مترتب ہوتا ہے کہ یہ پورا سماج اپنے اندر خیر کا کوئی پہلو بھی نہیں رکھتا۔ اس میں جو کچھ ہے شر ہی شر ہے ایک آدمی اگر اس مغالطے کا شکار ہو جائے تو وہ بھلا بننے اور بھلائی پھیلانے کا تصور بمشکل ہی اپنے ذہن میں لا سکتا ہے۔ آخر جو قدریں پورے سماج میں کہیں زیادہ کہیں کم پائی جاتی ہیں ان کو وہ اپنے دوش ناتواں پر اٹھانے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے۔ یہ غیر معمولی جرأت و کردار کے لوگوں کا تو بلاشبہ شیوہ ہے لیکن ایک عام آدمی سے یہ توقع فضول ہے ——— حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے اس سماج میں بھی خیر کسی نہ کسی مقدار میں ضرور موجود ہے۔ یہاں جھوٹ کے پہلو بہ پہلو سچ۔ بددیانتی کے ساتھ ہی دیانت داری۔ صنفی انارکی کے پہلو بہ پہلو صنفی پاکیزگی اور ستھرائی بھی موجود ہے۔ یہ رکھ رکھاؤ اور جانبداری واقعیت اور حقیقت پسندی کا نہیں غیر تمارانہ بدکرداری کا نتیجہ ہے جو ادیب کو سماج کے گلے پر چھری چلانے پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ ادیب سماج کا بہی خواہ ہرگز نہیں قرار دیا جا سکتا جو سماج کی بھلائیوں کو ابھارنے اور ان کی تائید کرنے اور ان کو نشوونما بخشنے کے بجائے سارا زور برائیوں کو سنوارنے پر سامنے لانے میں صرف کرے۔

حیرت یہ ہے کہ ان میں سے بعض طالع کھلم کھلا اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ہم اپنی ذہنی عیاشی نفسانیت کی تسکین اور تلذذ کی خاطر ہی لکھتے ہیں اور اسی مصرف میں کام آنے کے لئے یہ تحفہ سماج کو بھی دیتے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ تاریخ کے کسی اور دور میں بھی بے حیائی اور فحاشی اس طرح کھل کھیلی ہو۔ یہ ادیب نہ صرف خود حیوانیت کی سطح تک گر گئے ہیں بلکہ انہوں نے سارے سماج کو گرانے کا عزم بھی کیا ہے۔ یہ نوجوانوں کے ذہن کو مصنف مقابل کے اعضا ہی میں محو کر دیتے ہیں۔ گرم گرم خون اور فولادی بازو رکھنے والے وہ جوان جو اپنی فکر و نظر کی تربیت اور اپنی جسمانی صلاحیتوں سے کام لے کر سماج کو حیات و قوت بخش سکتے تھے۔ جنسی افیون کی گولیاں کھا کھا کے پینک میں پڑے رہتے ہیں۔

اس سماج کے مہلک اور تباہ کن اثرات خطرناک حد تک زیادہ ہیں۔

۷۔ انفرادیت پسند ادیبوں کا ادب

یہاں ہم انفرادیت پسند ادیبوں پر کوئی بھی تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں۔ ان میں سے ہر فرد الگ الگ راگ الاپتا ہے۔ کوئی ہے کہ اسے خیر و شر اور مطلوب و مردود کی بحث سے کوئی مطلب ہی نہیں۔ کوئی یاس و قنوطیت کی افیون میں محو ہے اور سماج کو بھی یہی تحفے دے رہا ہے۔ ان میں ایسے نیک نیت بھی موجود ہیں جو موجودہ سماجی بدحالی اور پستی سے متاثر ہیں۔ ساتھ ہی متذکرۂ بالا مکاتب ادب میں سے کسی کو بھی اپنا صحیح مقام نہیں خیال کرتے۔ ان میں ان لوگوں کا بھی ایک طبقہ ہے جو جو کچھ ہو رہا ہے اس پر محض اظہار حیرت کر کے اپنا فرض ادا کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی معقول بات نہیں۔

کچھ وہ لوگ بھی ہیں جو کچھ بنیادی انسانی اخلاقیات کو بھی ہم پہنچتے ہیں لیکن ایک ایسے عام اخلاقی انحطاط کے حالات میں جیسا کہ آج ہمارے سماج کا ہے کیا ان منفرد ادیبوں کی محض یہ ابتدائی اور ہلکی سی پکار زیادہ اثر رکھ سکتی ہے؟

ان میں سے جو لوگ جاہلی ادب کی بنیادی خرابیوں سے کسی قدر بلند اور پاک ہیں ان سے ہم موجودہ حالت میں اجتماعی فلاح کے سلسلہ میں کوئی زیادہ توقع تو نہیں وابستہ کر سکتے البتہ ہم یہ توقع ضرور رکھتے ہیں کہ جس بنیادی صفت کی موجودگی نے انہیں آج کے عام جاہلی دھارے سے الگ رکھا ہے وہی تعارف اور غلط فہمیوں کے رفع ہونے کے بعد انہیں بالآخر منظم جماعت کے پلیٹ فارم پر لا کھڑا کرے گی۔

آج کے تمام ہی مکاتب ادب کے ادیبوں کے سلسلہ میں ایک قابل تذکرہ بات اور حقیقتاً بہت اہم بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کا ادب محض ان کے اصول حیات کے تحت خواہ وہ جو بھی ہو نہیں ہوتا۔ اصول کے تحت تیار ہونے والا ادب بہرحال ایک مقام رکھتا ہے لیکن آج کے ادب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اکثر و بیشتر حصہ "معاش" کے لئے رکھا اور تیار کیا گیا ہے۔

اکثر ادیبوں کے مادی اور معاشی مفادات پوری طرح ان کے ادب سے وابستہ ہیں۔ چنانچہ آج کا کامیاب ادیب اپنا ایک بازار رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں پریس سٹہ باز تاجروں کا کاروبار سنبھالے ہوئے ہے۔ ادیب اپنی مصنوعات ان تاجروں کے سپرد کرتا ہے جو اپنی زمانہ شناسی کے بل پر اس کے دام لگاتے ہیں اور اس طور پر ادیب تخلیق ادب کے ضمن میں دو مختلف رجحانات سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک تو وہ اصولی نقطۂ نظر ہے جو اس نے کسی بھی وجہ سے اختیار کیا ہو۔ اور دوسرے یہ سوال کہ زیادہ سے زیادہ شہرت اور داد و مقبولیت اور زیادہ سے زیادہ پیسے کس شکل میں مل سکیں گے۔ ان رجحانات میں سے کون حقیقی اور غالب نوعیت رکھتا ہے اظہر من الشمس ہے۔ کم از کم یہ تو طے شدہ بات ہے کہ بہت عظیم الشان اکثریت دوسرے ہی رجحان سے متاثر ہوتی ہے۔ اگر آپ میدان ادب کے نو واردوں کا تصور کریں تو اس سلسلہ میں ان کی حالت آپ کو واقعی قابل رحم نظر آئے گی۔ ان بے چاروں کا انتخاب اصول و نظریہ بھی اسی دوسرے رجحان کا ایک دم غلام ہوتا ہے۔ چونکہ یہ بات آج کی ادبی دنیا میں ایک مسلم حقیقت کی سی نوعیت رکھتی ہے۔ جسے ہر قریب سے دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے لہٰذا میں اس پر مزید بحث نہیں کروں گا۔ البتہ سماج کو یہ سوچنا ہے کہ واقعتاً جب ادب جسے اپنی حقیقت کے اعتبار سے تنقید حیات اور تعمیر حیات کا کام انجام دینا چاہئے تھا اصول و نظریات پر لات مار کر حرص دینا اور جاہ پرستی اور زر طلبی کو قبلہ بنا لے تو وہ سماج کے حق میں کیا ہوگا اور اس کے اثرات کو ہمارے سماج کو کس حد تک خوش آمدید کہنا ہے؟

یہ دنیا اور ہمارے ملک کے ادب کا ایک جائزہ تھا جو آپ کے سامنے لایا گیا۔ غیر عاملیت کا یہ دور دورہ خود پکار پکار کر تغیر کی ضرورت کا اعلان کر رہا ہے۔ ملک کے جو لوگ اس عام بحرانی دور میں بھی عقل و ہوش سلامت رکھتے ہیں۔ اور مفاد و معاش سے بلند ہو کر خیر و شر اور اجتماعی فلاح و ہلاکت کے نقطۂ نظر سے بھی کچھ سوچ سکتے ہیں

ان کا ذہن اس پکار کا جواب ہے۔ یہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس کے قانون کی رو سے بھی صالحیت کا فقدان صالحیت کے ابھار کا داعی اور محرک بن جاتا ہے اور جب برائی بظاہر بھلائی پر چھاتی نظر آتی ہے اور پیاسا محسوس ہوتا ہے کہ شر خیر پر غالب آجائے گا اور انسانیت اپنی موت مر جائے گی انسانیت کا بچا کھچا شعور ضمیر کی بچی کھچی قوت اور انسانی فطرت کا "خیر" انگڑائی لیتا ہے۔ اور دیکھتے دیکھتے برائی۔ بدی۔ اور ہلاکت کی چھائی ہوئی تاریکی میں بھلائی نیکی اور صالحیت کا نور ابھرنے لگتا ہے۔

غیر صالح ادب ان لوگوں کی ہمدردیاں بالکل نہیں حاصل کر سکا جو صالحیت کی بنا پر اپنی زندگی گذار رہے تھے اور جن کا نظریۂ ادب کیا پورا کا پورا نظریۂ حیات ہی صالح تھا۔ اس کے برعکس ان کے شعور ان کے احساس شرافت اور ان کے سماجی خدمت کے جذبہ نے ان کو صالح ادب کی طرف تخلیق ہی پر نہیں منظم تحریک چلانے کے لئے تیار کیا۔ اب میں آپ کے سامنے غیر صالح ادب کے مقابلے میں اسی صالح ادب کے امتیازات پیش کر رہا ہوں۔ اسلام پسند ادیب کے ان تمام مکاتب فکر سے الگ سماج کی بہتری کے لئے انسانی بنیادوں پر تعمیر حیات کا کام کر رہے ہیں ہم غیر صالح ادب سے الگ صالح ادب کے علمبردار ہیں۔ غیر صالح ادب کا جو تجزیہ میں نے ابھی کیا ہے اس سے یہ تو واضح ہی ہے کہ صالح ادب وہی ہو سکتا ہے جو مندرجہ بالا تمام خرابیوں سے پاک ہو۔ جو انسانوں کے حیوانی جذبات کو اکسانے اور انسانوں کو حیوانیت پر منظم کرنے کے بجائے ان کو انسانیت اور صالحیت کی طرف بلائے۔ ان میں پاکیزہ رجحانات اور اخلاقی اقدار کا احترام پیدا کرے جو ان کے ضمیر کو ان کے نفس پر فتح پانے میں مدد دے۔ آسانی کی خاطر ہم صالح ادب کو غیر صالح ادب سے متاز کرنے کے لئے اس کی ان خصوصیات کی نشان دہی کر سکتے ہیں۔

صالح ادب انسان میں ذمہ دارانہ کیریکٹر کی تخلیق کرتا ہے۔ وہ صحیح سمجھ کا کام کرنے اور نتائج پر غور کر کے قدم اٹھانے کی تربیت دیتا ہے۔ وہ سماج کے مفاد پر ذاتی مفاد کی قربانی کا درس بھی دیتا ہے۔ فرد کو اپنے فرائض کی انجام دہی اور دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کی تعلیم دیتا ہے۔ غیر صالح ادب اپنی مطلوبہ غیر ذمہ دارانہ آزاد روی اور لاابالی پن کی پشت پر الادینیت اور مادیت یعنی انکار خدا اور خود مختاری کے جو نظریات کھڑے کرتا ہے انہیں صالح ادب استدلال و استشہاد کے زور پر رد کرتا ہے اور انسان کو حاکمیت الٰہ کا فطری سبق پڑھاتا ہے۔ اس طرح اپنے مطلوبہ ذمہ دار کیریکٹر کی تخلیق کے لئے وہ صرف مبہم اور غیر واضح اخلاقی اصول نہیں سکھاتا بلکہ ایک پورے ضابطۂ حیات ——— بندگیٔ رب ——— کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

یہ ادب حیات بعد موت اور اعمال کی یاد دہانی کے ذریعہ انسان کو صحیح نظریۂ حیات سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ کائنات کوئی خود رو نظام نہیں جس پر ہمارا ورود ایک اتفاقی حادثہ ہو بلکہ یہ ایک امتحان گاہ ہے جس میں ہمیں پوری تندہی کے ساتھ حیات اخروی کے لئے اعمال صالحہ کے نمبر حاصل کرنے ہیں۔ اس طرح وہ لذت پرستی کا خاتمہ کرتا ہوا انسان کو بلند اقدار حیات کی طرف لے جاتا ہے یہ انسانوں میں لذت پرستانہ خود غرضانہ خود غرضانہ مسابقت اور مہلک تنازع للبقا کے سماج دشمن رجحانات کے بجائے آخرت پسندانہ حسن کردار بھی خواہانہ تو افق و تعارف اور ایثار و قربانی کی مبارک روح پیدا کرتا ہے۔

ہمارا ادب مفرطانہ رجائیت اور قنوطیت دونوں سے ہٹ کر ایک درمیانی راہ اختیار کرتا ہے وہ انسان کو اپنی غلطیوں پر ندامت اور خوفناک انجام اور اپنی نیکیوں پر جزائے خیر کی توقع کا سبق دیتا ہے اسی طرح وہ انسان کو خوف و رجا کے درمیان ایک خوشگوار مقام پر لا چھوڑتا ہے۔

صالح ادب آج کے سماج کو نیکی سے عاری نہیں دیکھتا۔ اس کا مشاہدہ ہے کہ برائی کے ساتھ ساتھ بھلائی بھی موجود ہے گو غلبہ بھلائی کا نہیں برائی کا ہے۔ برائی کہیں بھی اپنے مقابل بھلائی کو فنا نہیں کر سکی ہے۔ دونوں میں کش مکش جاری ہے۔ یہ کش مکش خیر کی زندگی کا ثبوت ہے ہاں بھلائی کو مدد درکار ہے۔ اسے تعاون کی طلب ہے صالح ادب بھلائی اور خیر کی چاہے وہ جہاں کہیں بھی ہو تائید کرتا ہے۔ اور اسے ابھارنے اور شوونما بخشنے کی سعی کرتا ہے۔

صالح اور تعمیری ادب غلط کاری کو غلط کاری ہی سمجھتا ہے اور غلط کار کو اطمینان بخش دلائل فراہم کرنے کا سماج دشمن کام کرنے کے بجائے اسے ندامت اور احساس جواب دہی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس طرح وہ اصلاح پسند رجحانات کو تقویت بخشتا ہے۔ اس کے خیال میں گناہ مزوری کا نتیجہ ہے نہ کہ ضرورت کا تقاضا۔

اسی طرح نہ نوجوانوں کو کسی پینک میں مبتلا کرنے کے بجائے درس حیات دیتا ہے اور ان کے فولادی بازوؤں کو غیر ضروری شغف پیدا کر کے مفلوج کرنے کے بجائے ان کو تعمیر حیات کے کام میں لگاتا ہے۔ اس کے نزدیک ادب کا مصرف تلذذ نہیں بلکہ تزکیۂ حیات ہے۔

صالح ادب محض چند بنیادی اخلاقیات کو لے کر نہیں اٹھتا ہے بلکہ وہ ایک وسیع ضابطۂ اخلاق رکھتا ہے جس کی شقیں اچھی طرح متعین ہیں۔ وہ اخلاق

کا ایک ماخذ رکھتا ہے اور وہ ہے خدائی ہدایت۔ اس کے نزدیک انسانی قانون سازی، فساد کی جڑ ہے اور انسانیت کی فلاح و بہبود اسی ہدایت کی پیروی میں مضمر ہے۔ وہ اپنے ضابطہ اخلاق کی پشت پر بندگیِ رب آخرت کی جواب دہی اور موجودہ زندگی کی آزمائشی نوعیت کے نظریات رکھتا ہے جو اسے مستحکم بناتے ہیں اور اسے ایک زبردست قوت محرکہ فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح اس کے اخلاقی تصورات گاندھی جی کے اسکول کے تصورات کی تمام خامیوں سے پاک۔ زیادہ قابل عمل اور بلند ہیں۔

صالح ادب کوئی فریادی اور مدافعانہ معذرت خواہی کا ادب نہیں نہ ہی یہ پھری ہوئی مظلومیت کا نمائندہ ہے اس کی نوعیت انفعالی نہیں فعالی ہے پھر اس کی نظر کسی خاص مذہب و ملت کے لوگوں تک محدود نہیں ہے کہ یہ انہی کے مفاد کے مطابق سوچے۔ اس کی نظر تمام انسانوں پر ہے اور یہ اپنے اوپر تمام انسانوں کا حق تسلیم کرتا ہے۔

صالح ادب کسی قسم کی تنگ نظری سے بھی کوئی ہمدردی نہیں رکھتا یہ فطرتاً وسیع النظر ہے۔ چنانچہ صالح ادب خود غرضانہ قوم پرستی کو انسانیت کے لئے مہلک سمجھتا ہے۔ صالح ادب تمام انسانوں کو ایک سمجھتا ہے۔ یہ قومیت کو بجا قرار دیتا ہے جو حب وطنی اور وطن کی خیر خواہی کی تلقین کرتی ہے لیکن وہ اس قوم پرستی سے ہمدردی نہیں رکھتا جو دوسری قوم کے ساتھ جھوٹ۔ وعدہ خلافی۔ بدعہدی۔ بد دیانتی اور ظلم و زیادتی بھی کچھ جائز قرار دیتی ہے۔

اسی طرح صالح ادب فرقہ پرستی کے بھی خلاف ہے وہ ایک طرف تمام انسانوں کے ایک ہونے کا نظریہ رکھتا ہے اور دوسری طرف اصول۔ طرز فکر۔ اور طرز زندگی کے اختلافات کو ناپسندیدہ سمجھتے ہوئے بھی تسلیم کرتا ہے اور ہر گروہ کو اپنے کلچر اور طرز فکر کے سلسلہ میں ایک پابند آزادی کا بجا طور پر حق دار سمجھتا ہے۔ وہ کسی فرقے کا یہ حق نہیں تسلیم کرتا کہ وہ اپنے طرز فکر اور اپنے کلچر کو تبلیغ و اشاعت کے جمہوری طریقوں سے رواج دینے کے بجائے اسے شیطانی طریق پر مسلط کرنے کی کوشش کرے۔

ہمارا ادب فرقہ پرستانہ عصبیت اور فرقہ پرستی پر منظم ہونے کا داعی نہیں ہے اصول پرستی سکھانا چاہتا ہے وہ اصولوں پر منظم کرنا اصولوں کی خاطر جینا اور اصولوں کی خاطر مرنا سکھاتا ہے۔ ہمارے ادب کو اس کی اصول پرستی سے فرقہ پرستی کی طرف لے جانے میں کوئی قوت موثر نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی فرقہ پرستی کے نشے میں چور ہے اور اس راہ میں مسلسل آگے بڑھتا جا رہا ہے تو سنت آلہی اس سے نبٹ لے گی۔ یہ چیز ہمیں بہر حال ہماری اصول پرستی سے نہیں ہٹا سکتی۔

اسی طرح صالح ادب طبقہ پرستی اور طبقہ واریت کے بھی خلاف ہے۔ وہ دنیا میں طبقات کے وجود کا منکر نہیں۔ وہ بعض طبقات کی مظلومیت کا بھی احساس رکھتا ہے لیکن وہ ظلم کو کسی طبقے کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ اور کسی خاص معاشی پوزیشن کا جزو لاینفک نہیں سمجھتا ظلم و زیادتی۔ ناخدا ترسی اور غیر صالحیت کا نتیجہ ہے وہ صالحیت کی تبلیغ اور صالح نظام معیشت و نظام زندگی کے حق میں ایک ذہنی انقلاب برپا کرنے کی سعی کے ذریعہ اس کے علاج میں یقین رکھتا ہے۔

ہمارا ادب معیشت کے سوشلسٹ نظم کو فطرت انسانی کے خلاف اور معاشرہ کے لئے نامناسب قرار دیتا ہے یہ انفرادی ملکیت کے ادارہ کو تسلیم کرتے ہوئے فرد کی اخلاقی تربیت اور ایک صالح نظام حکومت کے ذریعہ قیام عدل و قسط میں یقین رکھتا ہے۔

صالح ادب انقلاب کے خونی طریق کار کو غلط سمجھتا ہے وہ کسی مقصد کے لئے بھی اور کسی قیمت پر بھی انسان کے حیوانی جذبات کو اکسا ہرٹ کی شراب پلا پلا کر بدمست ہاتھی بنا ہوا انہیں دیکھ سکتا۔ وہ انسانی ذہنوں کی فیصلہ کن پوزیشن کو تسلیم کرتا ہے اور اپنے مقصد کے حصول کے سلسلے میں ایک ایسے ذہنی انقلاب پر ایمان رکھتا ہے جو بالآخر فضا کو صالحیت کیلئے سازگار بنا دے گا اور غیر صالحیت اپنی موت آپ مر جائے گی۔

اس طریق کار کے تحت یہ ادب ذہنوں پر قبضہ پانے کے لئے مرعوب کن ہتھکنڈوں، کذب و افترا، غلط تاریخی استشہاد اور دھاندلی بازی میں یقین نہیں رکھتا۔ وہ سچائی کے ساتھ حق کے پیش کرنے۔ باطل پر تنقید کرنے اور اس سلسلے میں افہام و تفہیم۔ استدلال و استشہاد بحث و مباحثہ اور دعوت مشاہدہ و مطالعہ کے فطری اور جمہوری طریقوں پر کامل اعتماد رکھتا ہے وہ اپنی باتوں کو قابل قبول بنانے کے لئے انہیں غیر یقینیت اور فحاشی کی شکر آمیزی کے ساتھ بھی نہیں پیش کرتا۔

اسلام پسند ادب انفرادی کوششوں میں نہیں بلکہ اجتماعی سعی و جہد میں یقین رکھتا ہے۔

صالح ادب کا سب سے آخری امتیاز یہ ہے کہ اس کے کارکن ادب کی تخلیق معاش کے لئے نہیں کرتے اصول کے لئے کرتے ہیں۔ ہم ادب کا قبلہ معاش کو بنانے کو کسی طوائف کے پیشے سے کم نہیں سمجھتے۔ ہم اصولوں کے لئے

ادب پیدا کرتے ہیں۔ تخلیق ادب ہی نہیں صالح ادیبوں کی ساری زندگی ہی ان کے اصولوں کے لئے گذرتی ہے۔ صالح ادیب وہی ہے جس کی سیرت ادب میں توافق اور ہم آہنگی ہے جو لوگ سماج اور اس کی پیچیدگیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اس "تحویل قبلہ" کے نتیجہ میں ہمارے اور معاشی غلام ادیبوں کے ادب میں کتنا بُعد ہو جاتا ہے۔ شہرت اور معاشی مفاد کے تحت تیار کئے ہوئے ادب اور اصول پرستی اور سماجی خدمت کے جذبے کے تحت تیار ہونے والے ادب میں سے سماج کی سچی خدمت کون کر سکتا ہے۔ اس کا جواب سماج ہی کو دینا ہے۔ یہ ہیں اس صالح ادب کے خدّ و خال جس کی تحریک ہم چلا رہے ہیں ہر صاحب نظر سمجھ سکتا ہے کہ غیر صالح ادب کی مہلک خامیوں کے بالمقابل انہی خصوصیات کا حامل ادب ساری دنیا اور بالخصوص ہمارے ملک کی اجتماعی فلاح کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔

ہمارا ادب آج اپنی مقدار کے اعتبار سے ضرور غیر صالح ادب کی بے پناہ وسعتوں کے مقابلے میں حقیر سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں سماج پر ہے۔ ہم اپنی ساری متاع ذہن و دماغ سے لیکر جان و مال تک اس راہ میں لیکر نکل پڑے ہیں۔ اب یہ سماج کا کام ہے کہ وہ حق و باطل، اخلاق و بداخلاقی، پاکیزگی و غلاظت، اور فلاح و ہلاکت میں سے جسے چاہے پسند کرے اور اپنا لے۔

اعتذار

بعض مجبوریوں کی بنا پر اپریل کا شمارہ شائع نہیں کیا جا سکا اس کے لئے ہم قارئین معیار سے معذرت خواہ ہیں۔

مینیجر

ابنِ فرید۔ بی۔ اے

ادب ایک نیا موڑ مڑ گیا

"چراغ راہ" کی اشاعتِ خاص پر تبصرہ

ادب نے ہر زمانہ میں غالب نظریہ کا ساتھ دیا ہے۔ اور اُسی کی ترجمانی کی ہے۔ تاریخ کے صفحات الٹ جائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ کبھی وہ دیو مالائی رہا ہے۔ کبھی وہ جمالیاتی رہا ہے۔ کبھی درباری ہو گیا ہے اور کبھی عوامی! اس نے صداقتوں کی ضوباریاں بھی کی ہیں اور تاریکیوں کو بھی فروغ دیا ہے۔ اس نے اعلیٰ انسانی اقدار کو جلا بھی دی ہے اور اُسے تعفن میں غرق بھی کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اتنی بڑی قوت رکھنے کی بنا پر بذاتِ خود منتہا و مقصد سمجھ لیا گیا ہے۔ جاگیردارانہ دور میں اس کی توضیح تلاش کیجئے تو واضح طور پر آپ یہ پائیں گے کہ وہ جمالِ محض ہے اور اس کا تعلق غمِ روزگار سے نہیں۔ طرح طرح کی بوالعجبیاں اس میں سمو دی گئی ہیں۔ ایسا بے سروپا شعری اور افسانوی ابنار لگا دیا گیا ہے کہ جب تک ذہن میں حقیقت چٹکی نہیں لیتی تخیل و تصور مبہوت اور مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور اگر اس کے پیچھے چھپی ہوئی اُن نمایاں خصوصیات کا تجزیہ کیجئے تو آپ دیکھیں گے خوشامد۔ خانِ تفاخر اور خود پرستانہ چٹپلش کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آخر یہ ہجو اور ہزل کیا ہیں جن میں افعاء صنفی ردیف و قافیہ اور بحر و وزن میں لائے گئے ہیں۔ یہ واسوخت اور یہ جنسی اختلاط کو مشتہر کرنے والی مثنویاں اور یہ بادہ و گلفروش کے تذکروں سے معمور قصائد اور مدحت سرائیاں کیا ہیں؟ وہی انحطاطی ذہن و معاشرے کی کامل نشانیاں۔ جو زبانِ حال سے چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں کہ یہ وہ دور تھا جب انسانیت مر رہی تھی اور بہیمیت سرمستِ ناز تھی۔ جب جفاکشی کا گھر ویران ہو رہا تھا اور خبثِ باطن اپنے خونخوار دہانے کو معصوموں کے خون سے رنگ رہا تھا۔ پھر اچانک یہ گھر ٹوٹ گیا۔ دبی ہوئی چنگاری نکل پڑی۔ خدید غم و غصہ کے ساتھ بے نیازیٔ ماحول کے خلاف حقیقت پسندی نے جنگ شروع کر دی۔ جمال پرست اپنے محل کی سمار ہوتی ہوئی دیواروں کو پشتے باندھکر اور سہارے دے کر قائم رکھنے کی کوشش پر کوشش کرتے رہے لیکن بڑھتا ہوا سیلاب ریت کے تودوں سے نہیں رکا کرتا۔ ایک متحرک قوت منجمد ذروں کو اپنے ساتھ بہا ہی لے جاتی ہے اور پھر اُن کو اس طرح یکے بعد دیگرے منتشر کر کے کناروں پر چھوڑتی چلی جاتی ہے کہ وہ اس متحرک قوت کے لئے ایک بھاری بھرکم ڈھیر کے بجائے منفرد بے حقیقت ذرّے ہی رہ جاتے ہیں۔ جمال پرستوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اربابِ ذوق منکر وہ دل کی بھڑاس کو نکال سکتے ہیں لیکن بڑھتے ہوئے کارواں کو اپنی گیدڑ بھبکیوں سے نہیں روک سکتے۔ اب وہ صرف حال دل کہنے والے مرثیہ خواں تو بنکر زندہ رہ سکتے ہیں لیکن اپنی خواب پروری کے ساتھ فضاء پر چھا نہیں سکتے۔ چنانچہ وہ اس بات کا اظہار کرتے ہوئے بھی جھجکتے ہیں کہ اُن کی اپنی زندگی ان کے ادب میں منعکس نہیں۔ آخر یہ کیوں ہے؟ کیا یہ وہ نہ تھے جن کی ایک زمانہ میں ادب پر اجارہ داری تھی اور جو اپنی روش سے ہٹی ہوئی ادبی کاوش کو بے وقعت کہہ کر ٹھکرا دیا کرتے تھے اور کیا اب یہ وہ خود نہیں ہیں جو اسی "بے وقعتی" کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے ہیں؟ پھر یہ حقیقت پرستی پروان چڑھتی رہی۔ اس نے انسانوں سے نزدیک آنے کی کوشش کی۔ پریوں اور جنوں سے گریز کیا۔ کائناتِ ہستی کے ہر خطہ کے انسانوں کی زندگیوں کا جائزہ لینے لگی۔ ان کے دُکھ درد کو اپنانے لگی اور زندگی پرستی کا نعرہ اطراف و اکناف میں گونجنے لگا لیکن یہ زندگی پرستی کیا تھی؟ ایک ردِّ عمل، ایک مخصوص نظریہ! بلکہ یوں کہئے کہ یہ مخصوص نظریہ ایک سحر باطل کے خلاف دوسرے سحر باطل کا ردِّ عمل تھا۔ اور اسی ردِّ عمل کی وجہ ہی سے اس نے اُن تمام اقدار کو ٹھکرا دیا جو

کسی طرح ماضی سے وابستہ تھیں۔ اُس نے یہ غور کرنا بھی بارِ خاطر سمجھا کہ وہ ہزاروں خزف ریزوں کے ساتھ چند صدفہائے گہر بھی پھینکے دے رہا ہے۔ وہ متعدد فانی اصولوں کے ساتھ معدودے چند ابدی اصول بھی ٹھکرائے دے رہا ہے۔ ایک رَو تھی ایک جوش تھا ایک تیز بہاؤ تھا جو سب کچھ بہائے لئے جا رہا تھا۔ وہاں ٹھہرنے اور پھر ٹھہر کر سوچنے کی مہلت کسی کو بھی نہ تھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ بلا تجربہ اصلح تھا اور جو فنا ہو رہا تھا وہ بلاشبہ ناقص تھا۔ نتیجہ ظاہر تھا توازن کا فقدان ایک ساعت کے لئے تو باطل کو چاہے قائم رکھ سکے۔ لیکن اس کے بعد پھر یہ اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ایک ساعت کا قیام بھی عدمِ توازن کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک معتاد Quantum ہوتا ہے جو اُسے لمحاتی ثبات بخش جاتا ہے اور جب یہ معتاد ختم ہو جاتا ہے تو توازن بھی ختم ہو جاتا ہے اور پھر لازمی طور پر وہ ردِ عمل بھی مائل بہ فنا ہو جاتا ہے بالکل یہی اس نام نہاد زندگی پرستی کے ساتھ ہوا۔ اس کا معتاد ختم ہو چکا ہے۔ عوام اور ذہین طبائع اس کے کھوکھلے پن سے واقف ہو چکے ہیں اور ان میں ایک بے اطمینانی سی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی وہ فطری پیاس جو اُن کو ہر وقت اعلیٰ اقدار کی تلاش و جستجو کے لئے اکسایا کرتی ہے پھر بھڑک اٹھی ہے اور زندگی پرستوں کو یہ سمجھانا بڑا مشکل ہو گیا ہے کہ وہ جس تنگ نظریہ کو زندگی کہہ رہے ہیں وہ واقعی زندگی ہے۔ آج ہم سب یہ اعتراف کرتے ہوئے بھی کہ انہوں نے شکست خوردہ انسانیت کو اوپر کی نگاہ سے دیکھنے کی طرف اکسایا ہے۔ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ اُن کی پیش کردہ زندگی ایک دم کھری ہے۔ اُن کی دل شکنی کا لحاظ رکھنے کے باوجود آج ہمیں کہنا پڑ رہا ہے کہ انہوں نے دوسروں کو تو زندگی کے نزدیک لانے کی کوشش کی لیکن خود اتنی دور کھڑے رہے کہ اس نعمت سے محروم رہ گئے۔ انہوں نے دنیا کو خشکی کا جائزہ لینے کی کوشش کی، پہاڑوں کے آراستہ دریچوں سے کھیتوں میں جھانکنے کی کوشش کی، صوفوں پر دراز ہو کر چلچلاتی دھوپ میں مرنے والے محنت کشوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اور مئے ارغوان کے خم پر خم لنڈھا کر فاقہ کشوں کے ڈھلکتے کو سمجھنا چاہا مگر وہ سمجھ نہ سکے۔ یہ اُن کی ناکامی تھی ماحول کی کوتاہی یا کوتاہ نظری تھی۔ اس میں طبائع کا قصور بھی نہ تھا کیونکہ انھوں نے بالکل غیر فطری چیز اُن پر مسلط کرنی چاہی تھی اُن کے قول و فعل کے تضاد نے اور بھی اچھی طرح واضح کر دیا تھا کہ اُن کی پیش کردہ حقیقت ناقابلِ عمل ہے اور یہ جاگیردارانہ دور کی طرح وہ بھی سراب ہی ہے، اُن کے یہاں ایسی چیزیں جگہ پا گئی ہیں جن کے خلاف انہوں نے تند و تیز بغاوت کی تھی۔ قالب وہی ہے پیرہن نو

ہے۔ اس لئے فطری طور پر اس کے خلاف بھی الحذر کا نعرہ بلند ہو گیا اور یہ نام نہاد ترقی پسندی جس کے بہاؤ میں ٹھہراؤ آ گیا ہے بے شمار غلاظتوں سے بھر گئی اپنی تگ و دو سے اُس نے جو مقام پیدا کر لیا تھا وہ جاگیردارانہ نظام کی طرح اُسے اپنی ملکیت سمجھنے لگی اور بالکل اُسی طرح اُس نے بھی اجارہ داری جتلانے کے انداز میں نئی ابھرتی ہوئی صداقتوں کو ٹھکرانا شروع کر دیا۔ لیکن دنیا اُن کے بس میں نہیں ہے وہ حقیقت کی پیاسی ہے۔ چنانچہ وہ اس وقت بھی آگے بڑھ رہی ہے جب ساری حقیقتیں اس کے سامنے آشکارہ ہو کر آ رہی ہیں۔ جس طرح ایک بوسیدہ نظام کو اُن کے سیلاب کے روکنے میں بُری طرح ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا تھا آج وہ اُسی طرح اپنی باطل پرستی کی بنا پر اس خارا شگاف زندہ رود کو روکنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ہونا لازمی تھا۔ باطل زیادہ دنوں فروغ نہیں پاتا۔ آکاش بیل کی طرح انہوں نے بہت عرصہ پرورش پالی اب یہ واضح ہو گیا ہے یہ جھاڑ اضافی ہے اس کا اصل جڑ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ چنانچہ اب اس کا نوچ پھینکنا لازمی ہو گیا ہے اور مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کی تمام حق پسند قوتیں مجتمع ہو رہی ہیں۔ انہوں نے ایک ہی محور پر سوچنا شروع کر دیا ہے۔ اور زندگی کو عملی طور پر ایک صالح فکر و نظام کے خطوط پر فروغ دے رہے ہیں۔ اب اگر باطل ہر اسان بھی ہو تو کیا ہوتا ہے۔ صبح کی سپیدی ہویدا ہوتے ہی رات کی تاریکی کو فنا ہونا ہی پڑے گا۔ اور تمام فرامتوں کے باوجود یہی ہو گا چنانچہ یہی ادب میں بھی ہو رہا ہے۔ اور بڑھ کر دور میں اس کی سعادت اُردو ادب کو نصیب ہوئی ہے۔ لیکن جس تیز رفتاری کے ساتھ یہ صالح قدریں پروان چڑھ رہی ہیں اُسی قدر جھنجھلاہٹ کے ساتھ مخالف کیمپوں میں ردِ عمل بھی شروع ہو رہا ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ یہ بوکھلاہٹ بیحد عارضی ہے۔ ادب کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، اگر اب تک اُسے باطل کی افزائش کے لئے استعمال کیا گیا ہے تو آج اُسے حق کے لئے بھی اپنی آغوش وا کرنی پڑے گی۔ اگر ابتک وہ صرف الحادی فلسفوں کو اپنے اندر جذب کرتا رہا ہے تو آج اُسے اپنے اندر خدا پرستی کو بھی جگہ دینی ہو گی۔ اگر اب تک وہ صرف زندہ ہوسناکیوں کے افکار کے لئے وقف رہا ہے تو آج اُسے تمام پاکیزہ جذبوں کو قبول کرنے کی استعداد پیدا کرنی ہی پڑے گی۔ اگر اب تک وہ اشتراکی سماجی تصور کا اجارہ نکر رہا ہے تو آج اُسے اسلام کے سماجی تصور کا ترجمان بننا ہی پڑے گا۔ اگر اب تک وہ صرف افادی نظریۂ اخلاق کی پسندیدہ قدروں کو نمایاں کرتا رہا ہے تو آج اُس کو اسلامی فلسفۂ اخلاق کی قدروں کے دیئے بھی اپنے اندر روشن کرنے

پڑیں گے۔ اگر اب تک وہ صرف صنفی انارکی اور زنا کے واقعات کا آلۂ کار بنکر رہا ہے تو آج اُسے زر جیت اور عصمت کے رجحانات کو منتشر کرنا پڑے گا۔ اگر اب تک اس کی جمالیت و فیقیت فقط اُن افکار کے لئے وقف رہی ہے جو انسانیت کے لئے مہلک ہیں تو آج اُسے اپنے جمالی اور فنی پہلو کو اُن افکار کے لئے پیش کرنا پڑے گا جو انسانیت کے لئے اصل جوہر حیات ہیں اور یہی وہ سلیقہ ہے جو تعمیری اور صحت مند ادب اُسے سکھانے کے لئے کمر بستہ ہوا ہے۔ اور اس کے لئے کرۂ ارض کے تمام صالح ادیب شیرازہ بند ہونے کے بجائے خالق کائنات کے شکر گزار ہیں۔ آج اُن کے قلم سے وہ ادب نمو پذیر ہے جس کے لئے انسانیت ایک عرصہ سے منتظر تھی اور جس کی تلاش و جستجو میں وہ کتنی ہی بار غلط راہوں پر نکل گئی ہے اور پھر ناامید ہو کر اُسے وہیں واپس آنا پڑا ہے جہاں سے وہ چلی تھی۔ مگر اب آج جس طرف وہ بڑھ رہی ہے وہ ادھر بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

چراغ راہ کا یہ اشاعت خاص جو جنوری ۱۹۵۳ء میں منظر عام پر آنا ہے اسی ارادہ کی نمایندگی کر رہی ہے۔ اسے سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ سنگ میل نہیں ہے۔ کیونکہ یہ منزل کے دور کو عبور کرنے کے بعد پہلی پختہ کاری ہے اور اسی وجہ سے اکثر جگہ پر اپنے خطوط اب بھی جھلک رہے ہیں۔ چنانچہ جب تک یہ ساری خام کاری رفع نہ ہو جائے کسی طرح مطمئن نہیں ہوا جا سکتا۔

پیش نظر شمارہ کا غالب حصہ ادبی نمایندگی کر رہا ہے اور آخر کے کچھ صفحات خصوصی طور پر پاکستان سے متعلق ہیں۔ آج پاکستان کیا ہے۔ اور آزادی سے آج تک وہ کس قدر آگے بڑھا ہے یہ ان بدنصیبوں کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہے جنھوں نے اپنی خواہش اور اپنے جذبۂ خداوندی کے لئے لاتعداد معصوم جانوں کا خون بہا دیا۔ کون کہہ سکتا ہے ان کے اس بہیمی مشغلے نے اُن کو ہی کچھ فائدہ پہونچایا ہے جن کو انہوں نے کتنے ہی سبز باغ دکھائے تھے۔ پاکستان کے خصوصی مسائل پر ان مضامین نے اُن بھیڑیوں کے منہ پر سے نقاب نوچ لی ہے جو اُن کے درمیان بڑی معصومیت کے ساتھ گھوما کرتے تھے اور یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ تو مظلوم بھیڑیں ہیں مگر اب آج وہ دور ختم ہو رہا ہے۔ جب محض دھن، دھونس اور دولت کے بل پر ملکوں کی قسمت بدل دی جایا کرتی تھی۔ پاکستان کیا کر رہا۔ چین اور روسی ترکستان کے عوام تک اس فریب سے اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب ان سازشوں کے خلاف یہ جوار بھی پھوٹ پڑے گا۔

چونکہ اس تبصرے میں تفصیلی طور پر ادبی مضامین کا جائزہ لینا ہے۔ اس لئے اپنی توجہ اسی طرف مبذول کریں گے۔

اس اشاعت خاص کے دوسرے صفحے پر اس حقیقت کا اعلان ہے کہ ادب ایک نیا موڑ مڑ گیا ہے۔ پھر تیسرے صفحہ پر حلقۂ ادب اسلامی پاکستان کا کلمۂ ادب واضح اور جلی حروف میں درج ہے۔ پھر صفحہ چھ پر آسمانی ادب کی صورت میں خاموش تفسیر یہی ادب کے لئے المناک عذاب کا مژدہ درج ہے۔ اور پھر چند یار ان حلقہ کا تذکرہ ہے۔ ان سب کڑیوں کو منسلک کیجئے تو ایک بڑی سیدھی سی راہ ابھر آتی ہے جیسے یہ کوئی غیر فطری چیز نہیں ہے جو مرتب آپ کے سامنے پیش کر رہا ہے بلکہ اکثر کے ساتھ منہ پھیر لینے والے ہی غلط سمت بھاگے جا رہے تھے اور وہ عوام جو کچھ غور کرنے سے عاری تھے۔ وہ بھی انہیں قابل اعتبار سمجھکر اُن کی تقلید میں گم کردہ راہ ہو گئے تھے لیکن اچانک دفعتاً میں ایک نئی آواز گونج اٹھی اور وہ اُسے کانوس پاکر اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ آواز دینے والے جادہ پیماؤں میں سے اکثر وہی جو باطل پرستوں کے ریلے میں بہے چلے جا رہے تھے اور جیسے ہی انہیں غور کرنے کا موقع ملا انہوں نے اس بودے مجمع کو چیر کر اپنی راہ بنالی اور وہاں سے نکل آئے۔

نسیم صدیقی نے اُن میں سے چند کا تعارف کرایا ہے جن میں ماہر القادری درحقیقت اس قدر بلند پایہ ہے کہ صالح ادب اس پر ناز کرے۔ جب اس کی زندگی کا جائزہ لیا جاتا ہے تو دل کو کتنی طمانیت ہوتی ہے کہ وہ صاحب قلم جو صرف پیسوں کے لئے مست قلندرانہ گرے ہوئے رسالوں میں بھی لکھنا عار نہ سمجھتا تھا آج اُس نے اپنی ساری صلاحیتیں حق کے فروغ کے لئے وقف کر دی ہیں۔ ماہر کی عظمت اس کے اس دور سے پہلے بھی ادب نواز دلوں پر آشکارا تھی جب اس نے اپنا مدلل اور فکر انگیز مضمون "نیا ادب میری نظر میں" پیش کیا تھا۔ مگر یہ اس زمانہ کا تذکرہ ہے جب ادب کی یہ صالح تنظیم وجود میں نہیں آئی تھی۔ آج ماہر کا لفظ لفظ صاحب اقتدار طبقہ کے دلوں کو پارہ پارہ کر جاتا ہے۔ اور وہ اپنی بات اتنے ہی استحکام سے کہتا ہے جتنے مستحکم اس کے ارادے اور دلولے ہیں۔

اسعد گیلانی میں اتنا جوش اور جذبہ مدفون ہے کہ ایک زمانہ میں وہ اُسے منظر عام پر لانے کے لئے بیقرار ہو جاتا تھا۔ یثرب۔ چراغ راہ۔ کوثر۔ مشیر اور جہان نو میں اس نے اکثر کئی کئی صفحات اپنے لئے وقف کرائے ہیں اور اسی وجہ سے وہ افسانوں میں کافی حد تک آگے بڑھ چکا تھا۔ "ایک بہتر اشتراکی کے مقابلے میں مینا پھپی یا کیڑے مکوڑے" رکھئے تو واضح طور پر اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کتنی پختہ کاری حاصل کر چکا تھا۔ "مینا پھپی کا مندر" کو

صرف یہ کہہ کر نہیں ٹھکرایا جا سکتا کہ وہ منظر نگاری اور ماحول کی عکاسی کے سوا کچھ نہیں ہے کیونکہ افسانہ صرف وہی نہیں ہے جس میں بہت کچھ بیانِ واقعہ کے طور پر ہو بلکہ وہ تو ذہن میں ایک ایسی تلاش و جستجو بھی چھوڑ جا سکتا ہے جس کی بنا پر پڑھنے والا خود بھی تلاش کرنے پر مجبور ہو جائے کہ "مندر" کے دیوتا مائی اندھیرے میں روشنی کی کرن راہ بھی پا رہی ہے یا نہیں۔ اسعد گیلانی کو جو بات کہنی تھی اُس نے بڑے نفسیاتی اور تحلیلی انداز میں کہہ دی ہے۔ اور نفسیاتی تحلیل درحقیقت موجودہ افسانوی ادب کا ایسا ناگزیر لازمہ ہے کہ افسانہ کی تکنیک کو اس کی طرف مڑنا ہی پڑا ہے۔ اب اُردو افسانہ میں بھی وہ طرزِ تحریر پرانی ہو چکی ہے جو افسانہ کو خالص روزنامچہ بنا کر پیش کر دیتی تھی۔ اس وقت اُردو داں طبقہ کا ذہن افسانہ سے اچھی طرح مانوس نہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس پھوٹتی ہوئی کونپل کا مشاہدہ ہی کافی تھا مگر اب یہ کونپل بڑھ کر ایک تنومند شاخ بن چکی ہے اور اب اس کی تمام خصوصیات کا جائزہ لینا ہے۔ چنانچہ یہی اس وقت افسانہ لکھتے ہوئے ہمارے واسطے بھی لازم ہے۔ ہماری کامیابی اس میں نہیں ہے کہ ہم پیوندکاری کر کے ایک کہانی بنا لیں بلکہ ہمارا مقصود تو یہ تھا کہ ہماری کہانی اپنی پیش کردہ حقیقت میں تاثر اور کشش بھی رکھے۔ اسعد گیلانی کے اس افسانہ میں یہی خوبی ہے اور اسی وجہ سے یہ اس کا کامیاب ترین افسانہ شمار کیا جاتا ہے۔ مگر اب اسعد کی خاموشی نے صرف ادبی تحریک کو ہی کم مایہ نہیں کر دیا ہے بلکہ یہ خود اس کے لئے بھی مضر ہے معلوم نہیں وہ کیوں نہیں سوچتا کہ جتنے دن وہ اپنے قلم کو معطل رکھے گا اتنے دن اس کا آرٹ بھی آگے بڑھنے سے قاصر رہ جائے گا۔ اور یہ اس کا اپنے اوپر ہی ظلم نہ ہوگا بلکہ اس نصب العین کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ جس کے لئے اس نے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔

اس تعطل میں کچھ دنوں سے عاصی ضیائی اور مسعود جاوید بھی اس کے شریک ہو گئے ہیں۔ مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ ادیب شاید یہ سوچ رہے ہیں کہ ادبی تحریک کی بقا کچھ انہیں پر منحصر نہیں ہے۔ اس راہ میں اور بھی ہیں۔ وہ ان کی کمی کو پورا کر دیں گے لیکن خواہ نعیم صدیقی ہو۔ یا ماہر القادری! کوئی عاصی۔ اسعد اور مسعود کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتا۔ ان کی اپنی جگہ خالی ہی رہے گی۔ نعیم اور ماہر اپنے ہی ذوق و طبع کے مطابق آگے بڑھ سکتے ہیں۔ عاصی۔ اسعد اور مسعود کا رجحانِ طبع کوئی اپنے اوپر مسلط نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جب ان لوگوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے جو کسی قدر آگے بڑھ چکے ہیں تو اُن سے پیچھے چلنے والے اپنے آپ پر ہی اکتفا کرنے لگتے ہیں ان کے لئے اپنی خام کوششیں ہی مثالی ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحریک کی رفتار رک جاتی ہے۔ ادب ترقی کرنے کے بجائے تنزلی بھی نہیں کرتا بلکہ ذخیروں پر ذخیرے لگانے کے باوجود بھی ایک دانہ اس قابل نہیں ہوتا کہ اُس کو اطمینان کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اگر بہتری اچھے نمونوں سے محروم ہو جائیں گے تو وہ ناقص فن پاروں ہی کو اپنی منزلِ مقصود قرار دے لیں گے۔ اور ان کی ساری جدوجہد ایک مقام پر آ کر ٹھہر جائے گی۔ اگر اس امر پر ہندوستان اور پاکستان کے تمام صالح ادیب سنجیدگی سے غور کریں تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اُن کا قصور صرف اسی قدر نہیں ہے کہ وہ شریکِ بزم نہیں ہیں بلکہ خود تحریک کی رفتار ان کی اس بے اعتنائی سے مجروح ہے۔ انہیں چاہئے تو یہ تھا کہ وہ جس مقصد کو لے کر اُٹھے ہیں اس کو جلد از جلد تمام عالم میں عام کر دیں مگر وہ خود اس میں حارج ہو گئے ہیں۔ عاصی نے تنقیدی مضامین کی طرف سے ایک دم کنارہ کشی کر لی ہے۔ اس نے اپنا منظوم ڈرامہ بھی منقطع کر دیا ہے جو اُردو ادب میں ایک انوکھی چیز تھا۔ مسعود نے ساقی اور عالمگیر میں ایک زمانہ میں پُرکشش نظموں کا انبار لگا دیا تھا مگر صارع ادب میں وہ صرف چند دانے بکھیر کر خاموش ہو گیا ہے۔ اسعد نے تو ایک دم ادبی مقاطعہ کر لیا ہے۔ پھر اس کے علاوہ ہندوستانی اور پاکستانی جریدوں میں صالح ادیبوں میں یہ ایک بڑی خطرناک روش ابھر رہی ہے کہ وہ کسی مخصوص جریدہ کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ جیسے وہ ان کے مخصوص گروپ ہوں۔ یہ گروپ بندی ایک وسیع نظریہ کو کبھی بھی عام نہیں کر سکتی۔ اس سے اگر جریدوں کے معیار اور تنوع کو نقصان پہونچتا ہے تو ان مخصوص ادیبوں کے صحیح مقام کو بھی ٹھیس لگتی ہے جو اس گروپ بندی کا شکار رہیں۔ اسعد نے ایک بار ایک مذاکرے میں تحریر کیا تھا کہ صالح ادب کے ترجمان جریدوں کا فقدان ہے۔ مگر میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ صالح ادیبوں کے تعاون کا فقدان ہے۔ اگر پاکستانی ادیب چاہیں تو اس وقت بھی چراغ راہ اور مشیر کے دامنوں کو فیضِ مطبوعہ فن پاروں سے بھر سکتے ہیں۔ اور یہاں ہندوستان کے ادیب اپنے نمائندے معیار کو مالا مال کر سکتے ہیں اور پھر ہندوستان اور پاکستان کے ادیب ان ملکوں کی حدود کو بالائے طاق رکھ کر ایک دوسرے کے جریدوں کو فیض پہونچا سکتے ہیں۔ مگر حیرت تو یہ ہے کہ جب کوئی وجہ سکوت تلاش کی جاتی ہے تو بنفسِ نفیس اپنے آپ کو اس سے ماورا ہی تصور کیا جاتا ہے یہ بڑی ناپسندیدہ چیز ہے ہمیں اسے فوراً دور کرنا ہے ورنہ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس بہاؤ میں بھی ٹھہراؤ پیدا ہو جائے؟ ——— نعیم صدیقی نے سچ بچا

میں تقریباً یہی بات کہی ہے اور بڑے وقار کے ساتھ کہی ہے۔ اب ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ یہ مہیج "جمود پسندوں" کے لئے کارگر ہو۔

سوچ بچار میں "چراغ راہ" کی گذشتہ ادبی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے نعیم نے چند ایسے مضامین کا تذکرہ کیا ہے جن کی ادبی سالمیت میں کچھ شک ہے۔ "چارلس فلپس کا کیس" کچھ ایسی تکنیک میں پیش کیا گیا ہے کہ اس میں شروع ہی میں بڑی پُراسراریت پیدا کی گئی ہے۔ یہ انداز اُردو افسانوں میں تقریباً ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک بہت عام رہا تھا۔ لیکن اب ڈائری، روزنامچوں اور خطوط میں وہ جذب و کشش باقی نہیں رہی ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے کافی حد تک ذہنی تجزیہ کی طرف طرز تحریر کو موڑ دیا ہے۔ پھر "چارلس کا کیس" تو نفسیاتی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر اس کے لئے کوئی ایسا ہی ماحول منتخب کیا جاتا تو افسانہ میں اور بھی ندرت آجاتی مثلاً وہ نفسیاتی محل میں پیش کی جاتی اور یہ سب کچھ ایک بازیافتہ ڈائری میں دکھلائے جانے کے بجائے Running Commentary کے طور پر بیان کیا جاتا تو افسانہ اور نکھر جاتا۔

"نقطے اور لکیریں" نعیم کے افسانوں میں اچھا افسانہ ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ کامیاب Allegory ہے لیکن آخری حصہ میں سحر افتی رنگ کچھ اس قدر نمایاں ہوگیا ہے کہ یہ Allegorical انداز فنا ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ابتداء میں Symbols کافی آفاقی معلوم ہوتے ہیں لیکن اختتام کو پہونچتے پہونچتے بڑے محدود اور مخصوص ہوگئے ہیں۔ افسانہ شروع Charles Zamb کے مشہور Revevie-My Child کے طرز پر ہے لیکن آخر میں طنز ہوگیا ہے۔ Disintegration ہی اس افسانہ کی خامی ہے۔ "یہ ملا یہ مولوی" طنز ہے اور نعیم کے صحافتی انداز میں ہے۔ "اور ڈھک ڈھک دھم" میں بھی یہی بات ہے نعیم اتنا زود نویس ہے کہ شاید اس کو نظر ثانی کا موقع نہیں ملتا یہی وجہ ہے کہ جب اس کی تحریر پر اس کے جذبات غالب آجاتے ہیں اور وہ ایک چیز کو افسانوی انداز میں بیان کرتے کرتے صحافتی انداز میں بیان کرنے لگتا ہے تو اُسے تسلسل اور توازن کا خیال نہیں رہتا۔ اگر وہ غور کرے تو اُسے یہ اندازہ کرنا پڑے گا کہ اس کی افسانوی زبان ہموار یت Uniformity کی کافی حد تک محتاج ہے۔

ڈھک ڈھک دھم میں ایک اور بھاری خامی ہے جس کا اعتراف نعیم نے چراغ راہ بابت دسمبر ۱۹۵۲ء کے اداریہ میں کیا ہے۔ یعنی اس میں فصلوں کا تذکرہ انتہائی غیر شاعرانہ ہے۔ شاد عارفی کی نظم "فرقانِ حمیدہ" اس کے اپنے رنگ میں نہیں نعیم نے خود اس پر کثرت سے حاشیے لکھے ہیں۔ یہ نظم آمد کے بجائے آورد سی معلوم ہوتی ہے۔ نعیم کی اپنی نظمیں بھی کچھ فکری لحاظ سے گہری نہیں ہوتی ہیں۔ وہ جس بات سے متاثر ہوتا ہے اس کو اتنی عجلت کے ساتھ نظم کر لیتا ہے کہ اکثر غور طلب پہلو تشنہ رہ جاتے ہیں۔ "بھوکے کتے" اس کی بڑی اچھی نظم ہے۔ لیکن اس میں بعض بندوں میں یہی کمی ہے۔ "مالی مالی" اس کی منتخب نظم قرار دی جانے کی مجاز نہیں ہے۔ "اقبال کے قدرداں" میں اقبال کے اشعار کی جو تحریف کی گئی ہے اس نے بحر و وزن میں ہم آہنگی تو پیدا کر دی ہے لیکن شعر کا اصلی کیف ختم ہو گیا ہے۔ نعیم کے فن پر اگر کچھ زیادہ لکھنے کے بجائے اُسے عاصی کے اُس تبصرہ کی طرف متوجہ کر دیا جائے جو شعر نمبر پر کیا گیا ہے تو بڑا مناسب ہوگا۔ نعیم کو اس پر غور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

احوبہ جیلانی کا یقیناً کامیاب افسانہ ہے لیکن "انانی مس انڈیا" پڑھکر تو منظر حسین کے اس خیال پر صاد کرنا پڑتا ہے جو شعر بابت فروری ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا ہے ——— یہ افسانہ بڑا اچھا مرکزی خیال رکھتا ہے اور اس کی روانی میں بھی جیلانی نے اپنے اسٹائل کو نہیں کھویا ہے۔ لیکن جس وقت وہ جنسی اختلاط کے تذکرے کرتا ہے تو جیسے اپنے مقام کو بھول جاتا ہے اور روایتی ترقی پسندانہ انداز میں حیا و شرم کی حدیں پار کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جب وہ مشرقی پنجاب کا تذکرہ کرتا ہے تو جلے جلے میں تحیر چھپا ہوا نظر آتا ہے دل چاہتا ہے پڑھتے چلے جائیے لیکن جب وہ پادری کے چلے جانے کے بعد کہانی کو ایک نیا موڑ دیتا ہے تو جیسے وہ اپنے فطری انداز کو بھول جاتا ہے اور کہانی کو عجب اکھڑے اکھڑے انداز میں مربوط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ اس موڑ پر محتاط رہتا تو شاید کہانی میں اتنی بڑی خامی نہ پیدا ہوتی مگر شاید وہ جس فارم میں کہانی کو پیش کرنا چاہتا تھا وہ اس کو ذہن میں پوری طرح تیار نہ کر سکا تھا۔ اسی وجہ سے یہ کہانی اس کے قابو میں نہ رہی۔

"اکبر کا تصور مذہب" صرف ترتیب دیئے ہوئے نوٹ ہیں۔ کاش نعیم کو اتنا وقت میسر آتا کہ وہ جس بات کو پیش کرنا چاہتا تھا وہ اور واضح ہو جاتی۔ اس لئے اگر وہ اُسے بہترین مضمون تصور کرنے کے بجائے پھر سے لکھے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اقبال پر پیش کئے جانے والے بیشتر مضامین فکر کی گہرائی کے متقاضی ہیں۔ خاص کر اقبال کا تصور جماعت" بڑا ہی خام ہے۔

"دو خاص نمبر" اور ہمارے ادبی محاذ پر جمود، سفر اور مذاکرہ ہیں مستقل مضمون نہیں۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے ان کا انتخاب اس وقت گوارہ کیا جا سکتا ہے جب تنقیدی مضامین کی صلاحیتیں فنکاروں میں ختم ہو جائیں گی۔ شعری تنقید کی اور افسانوی انتخاب میں اس کا بھی خیال رکھنا از بس ضروری ہے کہ جس چیز کو ہم ایک بار خام قرار دے چکے ہیں وہ "امتداد زمانہ" سے پسندیدہ نہ ہو جائے۔ جن مضامین کے بارے میں سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے خود ان کے لئے نعیم نے بھی کچھ ایسے ہی جملے تحریر کئے تھے لیکن آج وہ اُن جملوں کو نظر انداز کر گیا ہے۔ کیا اس طرح شرپسندوں کو کہنے کا یہ موقع فراہم نہیں کیا جا رہا ہے کہ آپ اپنی ناقص تخلیقات پر ہی مطمئن ہو گئے ہیں۔

سوچ بچار پر اتنی علوالت کے ساتھ جمود کرنا اہم نہ تھا لیکن اس وقت ہمارے پیش نظر جو امر ہے وہ یہ کہ صالح ادیب کسی طرح اپنی ابتدائی کوششوں پر مطمئن نہ ہو جائیں جہاں انہیں پہلے قدم پر احساس ہو کہ ان کی مساعی بار آور ہو رہی ہیں وہاں اس کا بھی اعتراف کرتے جانا چاہئے کہ ابھی منزل نہیں آئی۔

"پاکستان بننے کے بعد ادبی رفتار و رجحانات" کے عنوان سے عاصی ضیائی نے ایک اجمالی ادبی جائزہ لیا ہے۔ مضمون میں ایک تاریخی امتزاج رکھا گیا ہے اور اسی انداز میں لکھا گیا ہے۔ پھر ترقی پسند تحریک، سرکاری ادب، بازاری ادب اور اسلامی ادب کے ضمنی عنوانوں کے تحت ہر مکتبۂ فکر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ عاصی نے ایک بہت طویل تذکرے کو مختصراً بیان کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے مقالہ میں کافی تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مقالہ کے تمام واقعیات مثالوں سے مبرا ہیں جس کی وجہ سے محض عاصی کی بات مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عاصی نے جو بات کہی ہے وہ سو فیصدی صحیح ہے۔ ترقی پسندوں نے اپنے مفاد اور حصول مقصد کے لئے اپنے نظام فکر تک سے انحراف کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا۔ عوام میں غیر فطری طبقہ واریت پیدا کرنے کے لئے انہوں نے وہ ادبی انداز بھی اختیار کئے ہیں جن کی شد و مد سے مخالفت کی ہے یہاں تک کہ انہوں نے برسر اقتدار گروپ سے بھی مصالحت کر لینے میں اپنے کسی اصول کو خارج نہیں سمجھا ہے، اُن کی ایسی ہی بوالعجبیاں یہ اچھی طرح واضح کر دیتی ہیں کہ باطل حق پر غالب آنے کے لئے تمام حربے استعمال کر تا ہے یہاں تک کہ حق کو شکست دینے کے لئے وہ ان طاقتوں سے بھی ساز باز کر لیتا ہے جن سے اس کو ازلی بیر رہا ہے۔ خدا کو خطرناک ترین دشمن گردانے والے یہ سیاسی بازی گر آج اُس پارٹی سے مفاہمت کئے ہوئے ہیں جو انتہائی فرقہ پرست، جنبہ پرست اور عوام دشمن ہے۔

اس ادبی گروہ کے دوش بدوش ایک اور ادبی جتھا ہے جو وہاں "باقیات الصالحات" کی طرح سانس لے رہا ہے۔ درحقیقت یہ وہ عیش پرست ہیں جو ادب کو جاگیر دارانہ دور کی نگاہ سے اب بھی دیکھ رہے ہیں۔ وہ Art for Art کو آنی عنایت کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ اب پاکستان میں درباری فضا پیدا ہو گئی ہے، ایک مخصوص حلقہ اُن کا سلیٹ گرویدہ ہے کہ وہ حکومت کی زبان ہیں اور حکومت انہیں مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ ابھی حال ہی میں ترقی پسند اور ارباب ذوق میں ایسی مصالحت ہو گئی ہے جس کا اقرار کرنے کے لئے شاید دونوں میں سے کوئی بھی تیار نہ ہو۔ اور یہ مصالحت ہے حکومت پرستی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اب ان جتھوں اور حکومت کو امان مل بیٹھنے ہی میں نظر آ رہی ہے۔ عاصی اگر اس مضمون میں محض تبصرہ و نکات پیش کرنے کے بجائے اپنے تنقیدی شعور کا پورا مظاہرہ کرتا تو ہمیں اس کی طرف سے یہ اُمید تھی کہ اس کا یہ مضمون اپنا ایک خاص مقام پیدا کر لیتا۔

اس نے ادبی گروہوں کے سلسلہ میں بازاری ادب کو جگہ دیکر ایک بے وقعت چیز کو اہمیت دی ہے۔ یہ لوگ کبھی ادب پیدا کرنے کے لئے نہیں لکھتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنی جیبوں کو بھر لیں۔ یہ آج نحس لٹریچر لکھکر حشرات الارض کی طرح پھیلتے جا رہے ہیں لیکن کل اگر بازار کی یہ مانگ فنا ہو جائے اور صالح ادب عام ہو جائے (جس طرح وہ رفتہ رفتہ ہوتا جا رہا ہے) تو وہ خود اپنے قلم کی باگ موڑ دیں گے۔ اس مفاد پرستی اور موقع پرستی سے مائل، ہکسلے اور برنارڈ شا تک فیض یاب ہوئے ہیں چہ جائیکہ وہ بد باطن جنہوں نے اپنے قلم کو اپنے پیٹ کیلئے ہی وقف کر دیا ہو۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے موقع نہ ہوگا کہ ہمارا اشتراکی ادیب جو ہر حیاتی فعل کو معاشی محور پر گھماتے ہیں، ہم اُن سے پوچھیں گے کہ کیا یہ ناقص ادب جو فرد کے سفلی جذبات کو ابھار کر جیبیں خالی کرنے کے لئے لکھا جاتا ہے ان کا جنبہ دار نہیں ہے؟ جیبیں بھرنے ہی کی ضرورت نہیں اس بازاری طبقہ کا واحد مقصد پیٹ ہے۔ اور پیٹ کی یہ پکار موجودہ معاشرے کے لئے اتنی خطرناک ہے کہ ایک دن یہ گرانباری پوری کشتی کو ہی لے ڈوبے گی۔ مگر شاید یہ سوچنے کی ان ہوس پرستوں کو مہلت نہیں ہے۔ بہرحال یہ ادب نہیں۔ ہے بردہ فروشی ہے اور یہ بردہ فروشی اُسی وقت بند ہو سکتی ہے جب اس کو سانس لینے کا موقع نہ رہے۔ اگر اسے غنا منہ چڑھایا گیا کہ اس کا تذکرہ اعلیٰ ادبی محفلوں میں کسی فکری تذکرے کی شکل میں ہونے لگا تو یہ اپنے گناہ کو اور حسین بنا لیگی۔

اسلامی ادب کی وضاحت کے سلسلے میں پھر ایک بار یہ شکایت پیدا ہوتی ہے کہ عاصی نے بڑے دھندلے خطوط پیش کئے ہیں۔ خاصکر مشکلات موانع کے بیان میں تو اُس نے صرف ایک مسلسل چلے پر اکتفا کیا ہے حیرت ہے کہ عاصی ایسے باریک بین کو اتنا مواد نہ مل سکا کہ وہ اجمالی طور پر ہی اپنی تحریک کا تجزیہ کر سکتا۔ یا شاید یہ کہ عجلت اور تنگیٔ وقت مانع رہی۔ اُس نے تین موانع کا تذکرہ کیا ہے۔ اوّلاً ان ادیبوں کی اکثریت میں اپنے نصب العین کا عشق پوری طرح ساری نہیں ہوا ہے۔ ثانیاً اُن کے وسائل محدود ہیں اور ثالثاً ابھی قوم میں "چٹیٹے" ادب کی چاٹ اس قدر رچی ہوئی ہے کہ وہ اس کو چھوڑ کر اس روکھے پھیکے بے کیف ادب کی طرف آنے میں تکلف کر رہی ہے۔ پہلے دو موانع اسلام پسند ادیبوں کے خود پیدا کردہ ہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جب مشق اور تجربہ کرتے کرتے ایک دم سکوت اختیار کر لیا جائے تو استعداد (خواہ وہ کسی قسم کی ہو) کیونکر بڑھ سکتی ہے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ اسلام پسند ادیبوں کا مقصد ادب نہیں ہے بلکہ ادب کے ذریعہ صالح قدروں کا عام کرنا ہے لیکن کیا یہ عرض کرنا بے موقع نہ ہوگا کہ ان صالح قدروں کو ادبی قالب میں ڈھالنے کے لئے ادبی جولانگاہ میں بھی محنت و توجہ صرف کرنا پڑے گی۔ اگر اس سعی و کاوش سے بے توجہی اختیار کر لی جائے تو آخر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ مذکورہ دو خامیاں خود بخود دور ہو جائیں۔

جہاں تک قوم کے چٹیٹے ادب کے پسند کرنے کا تعلق ہے ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ روکھے پھیکے ادب کے پسند کرانے کی ذمہ داری اسلامی ادیبوں پر ہی آتی ہے۔ وہ عوام کو قصوروار ٹھہرا کر خود بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔

"چٹپٹا ادب" فنّی اور ادبی حیثیت سے ابھی اس قدر نشاۃ ادب سے بلند ہی ہے۔ اور جب تک فن کی اس پختگی کو اسلامی ادیب جذب نہیں کر لیتے ان کا یہ شکوہ بے جا ہے۔ اور اس کے لئے پھر ایک بار کہنا پڑتا ہے کہ جمود و سکوت کی نہیں حرکت اور مشق کی ضرورت ہے۔

"مشرقی پاکستان میں نئے ادبی و سماجی رجحانات" کا پس منظر و پیش منظر فروغ احمد نے بڑی بالغ نظری اور نکتہ رسی سے قلمبند کیا ہے۔ فروغ احمد حالانکہ ادبی میدان میں "عمر رسیدہ" نہیں ہوا ہے لیکن اس کے قلم میں جو پختگی ہے وہ اُسے ہمیشہ نمایاں رکھتی ہے۔ دوسرے جمود پسندوں کی طرح حالانکہ وہ بھی گاہے ماہے ہی نظر آتا ہے لیکن جب کبھی وہ کچھ پیش کرتا ہے تو غور و فکر کے لئے کافی مواد فراہم کر جاتا ہے۔ اس مقالہ میں بھی اُس نے مشرقی پاکستان کے باسیوں کے ذہن و شعور میں بسے ہوئے تو ہماتی تصورات کا بڑی چابکدستی سے تجزیہ کیا ہے۔ جہاں کہیں اُس نے حقیقت کی رمق دیکھی ہے وہاں اس کے تذکرے سے بھی اس نے گریز نہیں کیا ہے لیکن اس کے ساتھ اس نے یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ ذہنی کجروی اُس حقیقت کی رمق میں کہاں پرورش پا رہی تھی۔ ندوۃ الاسلام اور جمیل الدین مشرقی پاکستان میں ایسی مہیب چٹانیں ہیں کہ جن کا مقابلہ کوئی نظریہ نہیں کر پاتا۔ اور انجام کمزور کی موت ہوتی ہے۔ لیکن فروغ احمد نے ان چٹانوں کے بھی شگاف سرعام عریاں کر دیئے ہیں اور یہ واضح کر دیا ہے کہ ان کے پرستے ہوئے ناسور کہاں ہیں۔

مقالہ کے آخر تک قاری کے ذہن میں اس قدر مایوسی پیچ لبس جاتی ہے کہ وہ وہاں کسی صالح قدر کی نمود و پرورش سے مایوس ہو جاتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اشتراکی مفاد پرست وہاں قومی زبان اور قومیت کے اندھے جذباتی نگاؤ کو پیدا کر کے اقبالؒ ایسے حق گو کو قدم جمانے نہیں دیتے تو پھر وہ یہ سوچنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے کہ برّ عظیم ہند کا یہ خطہ ایک دن طبقہ واریت کی ناعاقبت اندیش دوزخ کی نظر ہو جائے گا۔ لیکن فروغ احمد امید کی شعاع کا تذکرہ کر کے اس خدشہ کو ضرب کاری پہونچاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ وہاں بھی صالح عنصر بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی جد و جہد میں مصروف ہے مگر یکایک مقالہ ختم ہو جاتا ہے۔ ذہن بڑے مبہم سے خیالات میں گم ہو جاتا ہے۔ بات نامکمل رہ جاتی ہے۔ وہ صالح عنصر کون ہے؟ وہ صالحیت کیا ہے؟۔ کہاں فروغ پا رہی ہے؟ کیسے آگے بڑھ رہی ہے؟ اس کا کیا ادبی مقام ہے؟ اور وہ کیسے ادبی نمونے ہیں؟۔ اور ایسے ہی جانے کتنے سوالات دماغ میں چکر کاٹنے لگتے ہیں۔ مگر ان کا کوئی حل نہیں ملتا۔ اور جب یہ حل نہیں ملتا تو اندازہ ہوتا ہے کہ فروغ نے صرف پس منظر بیان کیا ہے پیش منظر سے وہ بے اعتنا رہا ہے۔ اس کمی نے مضمون کی غالب افادیت ختم کر دی ہے اور معلوماتی حیثیت سے بھی وہ تشنہ رہ گیا ہے۔

حمید اللہ صدیقی کا مقالہ "پاکستان کے ترقی پسند ادب کا سرسری جائزہ" کافی مبسوط اور بصیرت افروز ہے۔ چند سال پہلے تحریک اسلامی کے کٹر مخالف کے قلم سے یہ دوسرا تنقیدی مقالہ بیحد اہم ہے۔ نعیم صدیقی نے اس مقالہ کے شروع میں ایک ادارتی نوٹ لکھا ہے جس کا ایک جملہ یہ ہے ——

——— حمید صدیقی کے اندر ایک زوردار تنقیدی
رجحان پرورش پا رہا ہے۔ ہم بڑی مسرت کے ساتھ
اپنے اس تنقید نگار کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

اور یہ حقیقت ہے! حمید نے جس بالغ نظری اور تحقیق کے ساتھ ترقی پسند ادب کا جائزہ لیا ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے اندر یہ مواد ایک عرصہ سے

جمع ہوتا رہا ہے اور رفتہ رفتہ وہ اس کے لئے اس قدر ناقابل برداشت ہوگیا کہ وہ اُسے اسی جوش و شدت کے ساتھ پیش کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے یہ سب مواد کہیں اور سے نہیں جمع کیا ہے بلکہ اس کی تمام معلومات کا منبع خود اسی تحریک کے سرکاری اور غیر سرکاری ترجمان ہیں۔ اس لئے اس نے جو بات کہی ہے اس میں وزن ہے۔ صداقت ہے۔ اور یہاں اس کا اعادہ کرنا بھی بے موقع نہ ہوگا کہ حمید صالح ادب کے اُن معدودے چند تنقید نگاروں میں سے ہے جو اپنی تحریر سے اپنے مطالعہ کا ثبوت دیتے ہیں۔ ترقی پسند ادب پاکستان میں جس قدر ادبی بلیک میلنگ کر رہا ہے اس کا اندازہ اس وقیع مقالہ سے کیا جا سکتا ہے۔

حمید نے فن۔ مقصد۔ تکنیک اور زبان وغیرہ تمام اجزاء کا تجزیہ کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ ترقی پسند ادب جس طرح پہلے آمنا و صدقنا کہلانے کا مصداق نہ تھا اسی طرح وہ آج بھی نہیں ہے۔ اس نے موضوعات کے تجزیہ کے سلسلہ میں کتنی بیباکی سے عریاں کر دیا ہے کہ ترقی پسندوں نے اپنے ذہنوں پر ایک مخصوص فلسفہ طاری کر لیا ہے۔ وہ ہر چیز کو اسی مخصوص زاویہ سے دیکھتے ہیں یہاں تک کہ جو حقیقتیں ان کے چاروں طرف بکھری پڑی ہیں اُن کو بھی وہ بالواسطہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ تکنیک میں بھی ترقی پسندوں نے اپنی اختراع اور اُپج کو استعمال نہیں کیا ہے بلکہ بقول نعیم Second Hand استعمال شدہ طرزوں پر ہی اپنے محل تعمیر کئے ہیں۔ چنانچہ حمید نے نظم و نثر کی مختلف مثالوں سے اس حقیقت کی طرف خفیف سا اشارہ بھی کر دیا ہے کہ کس طرح محض مغربی فن کاروں کی کورانہ تقلید میں اکثر مقالے اتنے غیر فطری پیش کئے گئے ہیں کہ دیہات کے جاہل افراد کیا شہر کے عام افراد سے بھی ان کے اعادہ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ حمید کے موضوع پر زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس نے خود اطمینان بخش حد تک کافی شرح و بسط سے لکھا ہے اور بعض جگہوں پر نعیم نے اپنے حاشیوں سے اس مقالہ کی کمی کو پورا کر دیا ہے۔ البتہ ایک خاص امر جس پر نعیم کی توجہ بھی منعطف نہ ہو سکی پیش کر دینا ناگزیر ہے۔ اکثر غیر ترقی پسند تنقید نگار ترقی پسند ادیبوں کے زمرہ میں نئے ادیبوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ترقی پسند تحریک ان کو "برادری باہر" کر چکی ہے۔ چنانچہ جب ایسی تنقید منظر عام پر آتی ہے تو اپنا گناہ بڑی صفائی اور چابکدستی کے ساتھ نئے ادیبوں کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا ہے اور اپنی برأت کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو طاہر دانیال کے ایک انتہائی متعصبانہ مقالہ "اسلامی ادب ایک جائزہ" کا ایک اقتباس۔

"ترقی پسند ادب پر جنسی خواہشوں کی آسودگی کے لئے جدوجہد کا الزام لگانا اوّل درجہ کی یا تو لاعلمی ہے۔ یا ہٹ دھرمی۔ ماہر القادری کو اگر نفرت تھی جنسیات پر لکھنے والے فرائڈ و ادیبوں سے تو کیا وہ بتائیں گے کہ انہوں نے ن۔ م راشد۔ میراجی۔ سعادت حسن منٹو۔ حسن عسکری۔ ممتاز شیریں وغیرہم پر کتنی تنقید کی زحمت گوارہ فرمائی؟"

یہ ضرور ہے کہ نئے ادیبوں میں اکثر ذہنی بے راہ روی کے شکار ہیں اور ان کی یہ ذہنی بے راہ روی کوئی خاص مقصد اور نصب العین پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے ہے لیکن ترقی پسند اس کے کہاں تک سزاوار ہیں اس کی تفصیل ایسے تحقیقی مقالے میں ضرور کر دینی چاہئے تھی۔ اگر ذرا سی تلاش و جستجو کی جاتی تو معلوم ہو جاتا کہ کون ترقی پسند ہے اور کون نیا ادیب اور پھر موازنہ کر کے دکھلا دیا جاتا کہ دونوں گروپوں کی جنسی تحریریں ایک ہی سی ہیں تو بات میں اور بھی وزن پیدا ہو جاتا۔ منٹو اور مفتی کی طرح کے عریاں لکھنے والے ترقی پسندوں کی صف میں کثرت سے موجود ہیں۔ کرشن چندر کے افسانے۔ جمال۔ چاند فی رات۔ انور کے تقریباً سارے افسانے ہاجرہ مسرور کے سارے افسانے اور بالخصوص کوٹھی اور کوٹھی اور ہائے اللہ وغیرہ۔ اسی طرح خدیجہ مستور کے تقریباً سب ہی افسانے۔ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "محرّب شیشے میں" عصمت چغتائی کے خصوصی طور پر یہ افسانے۔ تل۔ لحاف۔ ٹیڑھی لکیر کے اکثر حصے اور اختر حسین رائے پوری کا افسانہ جسم کی پکار وغیرہ۔ کیا یہ اور ایسا ہی ایک اور بڑا انبار جنسیت اور فرائڈ زدگی کے زمرہ میں نہیں آتے ہیں؟۔ ڈاکٹر عبدالعلیم اور طاہر دانیال اگر غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ خواہ منٹو اور مفتی و میراجی کا محاسبہ کیا جائے یا عصمت، ہاجرہ۔ خدیجہ۔ انور۔ ندیم اور مخمور کا، بات اپنی ہی جگہ رہتی ہے اور ترقی پسند ادب کی پیشانی سے اس آوارگی اور فحاشی کا داغ نہیں مٹتا۔

حمید نے ترقی پسندوں کو زبان کے استعمال میں بے احتیاطی کا بھی ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اس کی وجہ ان کی نظر میں انگریزی اور غیر ملکی زبانوں کے محاوروں کا اردو میں منقلب کر لینا ہے۔ یہ درست ہے۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ وبا اسلام پسندوں میں بھی عام ہوتی جا رہی ہے۔ اسی اشاعت خاص میں جیلانی نے یعلم بن بعور میں ایک جملہ یوں تصنیف کیا ہے "یہ

دکھیت میں دلکش لیکن چھوت میں ناگ کا ڈنک تھی" اور ایسے ہی چند ایک اور فقرے اور مغربی ادبی سے مرعوب دوسرے اسلامی فن کاروں کی تحریروں کے اقتباسات ہیں جن کا پیش کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ بہرحال یہ نقص جہاں کہیں بھی ہو قابل گرفت ہے۔

یہاں ان دو نکات کا تذکرہ جو حمید صدیقی کے مقالہ کی خامی کے طور پر نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ مزید وضاحت کے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک حمید کے مقالہ کا تعلق ہے اسلامی ادبی تحریک کی تنقیدوں میں یہ پہلی مدلل اور مفصل تنقید ہے جو منظر عام پر آ رہی ہے۔ خدا کرے حمید کا قلم اسی طرح مصروف رہے۔

"پاکستان کے مشاعرے۔ جب سے اب تک" ماہر القادری کا معلوماتی مقالہ ہے۔ شروع میں شاعری کی تعریف پھر اس کی نوعیت اور اس کے مختلف قدیم مشاعروں کا ذکر ہے۔ پھر پاکستان کے مشاعروں کا تذکرہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ سامعین کا رجحان کس طرف سے کس طرف کو ہوتا جا رہا ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ پاکستان کے مشاعروں میں صالح نظریۂ حیات کے ساتھ ایک خاص دلچسپی اور لگاؤ پایا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہ اب گویئے شعراء کے مقابلہ میں فکر انگیز کلام قبولیت عام حاصل کر رہا ہے۔ گویا اب عوامی نفسیات Mob Psychology زیادہ استدلالی Rational ہو گئی ہے۔ ماہر کے طرز تحریر کے بارے میں اگر کچھ نہ کہا جائے تو بہت کچھ کہنے کے برابر ہوگا۔ اسے ملکہ حاصل ہے کہ وہ جس بات کو پیش کر رہا ہوتا ہے اس میں اپنی ترتیب الفاظ سے ایک دلچسپی، توجہ اور تجسس پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا یہ مقالہ اس لحاظ سے اور اپنی معلوماتی گرانباری کی وجہ سے پسندیدہ ہے۔

اس مقالہ کے بعد اصغر علی عابدی کے ایک طویل مضمون "افسانے کی اصل بنیادی قدریں" کی دوسری قسط شائع ہوئی ہے "جو معیار" بابت اکتوبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اصغر علی عابدی ایک زمانہ میں شاعر تھا۔ پھر افسانہ نگار ہوا۔ اس کے بعد افسانہ نگاری کو بھی خیرباد کہا اور مقالہ نگار بن گیا لیکن ایک بار۔ پھر اس نے حسب سابق ادبی سرگرمیوں کو ترک کر کے صحافت اختیار کر لی ہے۔ اس نے ہمارے ادب پر کب کب اور کس کس طرح ظلم کیا ہے۔ اس کا اندازہ اس تذکرہ سے کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے احتجاجاً میں بھی اس کے اس مقالہ پر تبصرہ نہیں کر رہا ہوں۔ شاید کہ اسے کچھ احساس ہو اور وہ اپنا مقالہ پورا کرے۔ (نامکمل مضمون پر تبصرہ کرنا یوں بھی کوئی معنی نہیں رکھتا)

آخری مقالہ نعیم صدیقی کا "اسلامی ادب کا فلسفیانہ پس منظر" ہے۔ میری ناقص رائے میں یہ مقالہ تنقید سے بالاتر ہے نعیم نے جس اچھوتے موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس پر اب تک ایک مختصر سا نوٹ بھی نہیں لکھا گیا ہے۔ طرز تحریر کی سنجیدگی اور گہرائی کے لحاظ سے یہ نعیم کے دوسرے ادبی مقالوں سے سبقت لے گیا ہے۔ نعیم نے اسلامی ادب کا محور خیر و شر کو قرار دیا ہے۔ اور خیر کی طرف میلان کو فطری قرار دیا ہے۔ اسلامی ادب میں جو مخصوص رجائیت پائی جاتی ہے اس کی بین وجہ یہی ہے اور اسی وجہ سے اسلامی ادیب کے ذہن میں الجھن اور گتھیاں صفر کے برابر ہوتی ہیں۔ وہ بات کو عیاں اور واضح انداز میں کہتا ہے۔ اور بعض وقت وہ بات کہتے کہتے آگے نکل جاتا ہے تو فن پیچھے رہ جاتا ہے اور صرف مقصد ہی ساتھ ہوتا ہے۔ کاش تنقیدی مقالات کا یہ سلسلہ چل نکلتا اور فن اور مقصدیت پر ایسے ہی چند ایک اور مقالے لکھے جا سکتے۔ نعیم کا یہ مقالہ اس قدر اہم ہے کہ ہر اسلامی ادیب کی نظر سے گزرنا ناگزیر ہے۔ اور ان لوگوں کے لئے بھی جو اسلامی ادب کو سمجھنا چاہیں۔

یہاں یہ کہہ دینا بے موقع نہ ہوگا کہ علمی اور خطابتی انداز میں جو امتیاز ہے۔ اس کو ملحوظ رکھنا چاہئے تھا۔ نعیم نے مقالے کے شروع میں اور آخر میں جو طرز اختیار کیا ہے وہ درمیانی حصہ سے میل نہیں کھاتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے مقالات کا حصہ معیاری اور فکر انگیز ہے۔ خاص طور سے حمید صدیقی اور نعیم صدیقی کے مقالات!۔

(باقی آئندہ)

(مولانا) درد گورکھپوری

نواب جھانسوی کی غزل گوئی پر اجمالی نظر

جھانسی کا ادبی ماحول کچھ اچھا نہیں یہاں کی آب و ہوا شعر و سخن کیلئے ابتدا ہی سے موافق نہیں مگر ۱۸۵۷ء کے بعد تہذیبی اختلاط کا اثر تھوڑا بہت یہاں پر بھی پڑا۔ لکھنؤ، دلی اور آگرہ کے نغمہ پردازوں کی گونج کی خفیف سی لہر یہاں بھی آئی اور ادبی ارتعاش پیدا ہوا۔

یہاں ۱۹۲۰ء کے بعد شعر و سخن کا چرچا عام طور پر ہونے لگا۔ عادق نے خضر راہ بن کر رہنمائی کی۔ حامد شاہجہانپوری معین احسن جذبی۔ نواب جھانسوی منظر عام پر آئے۔ عادق نے ملازمت کے باعث اپنے وطن کو خیرباد کہا۔ حامد شاہجہانپور چلے گئے۔ معین احسن جذبی نے آگرہ میں اقامت اختیار کی جھانسی میں شعر و سخن کا ماحول مشاعروں کی گرما گرمی۔ ادبی چہل پہل انیس کے دم سے قایم ہے۔ باقی شعراء ان کے حلقۂ اثر میں ہیں۔ واسطہ اور بلا واسطہ طور پر ان سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

نواب کی غزل گوئی کی سب سے بڑی خصوصیت خلوص۔ ایمائیت اور طرفداکانہ لاپن ہے۔ ہر ہر شعر تعبیری ہوتا ہے چونکہ ان کی غزلوں میں زندگی اور کائنات کے مظاہر کی جھلک ہوتی ہے۔ وہ اپنے وجدان و شعور سے جو کچھ اپنی زندگی میں محسوس کرتے ہیں اس کو وہ کائنات فطرت میں بھی تلاش کرتے ہیں۔ اس جستجو میں جب ان کو کامیابی ہوتی ہے تو ان کی احساس کی گہرائیوں میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے اور جذبات امڈ پڑتے ہیں۔ ان کی بوقلموں سے ایک رنگا رنگ نمودار ہوتا ہے۔ وہی رنگ الفاظ پر چڑھکر معانی کا قالب بن جاتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ غزل کی تعمیر و تاثیر کے لئے سوز و اخلاص ناگزیر ہے نواب اپنے جذبۂ سوز و خلوص کے باعث چمنِ روزگار کی بے رنگیوں سے بدل نہیں ہوتے۔ ان کو اپنے خونِ دل اور خونِ جگر پر پورا اعتماد ہے۔ وہ اس رمز سے پوری طرح واقف ہیں کہ اگر نوائے غزل کی پرورش خونِ دل سے ہو گی تو بے اثر نہ ہوگی۔ جب نغمہ پرداز کا لہو رگِ ساز میں رواں ہو تو نغمہ کا ہر زیر و بم چمن کی تسخیر گلوں کی مسکراہٹ اور کلیوں کے تبسم کی ضمانت بن جاتا ہے۔

مٹا کے چھوڑوں گا خونِ دل سے چمن کی بے رنگیوں کا عالم
گلوں کے چہروں پہ ہوں گی خوشیاں کلی کے لب پر ہنسی ملے گی

آرٹسٹ اور فن کار کسی مقصد کا تعین کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا تعین مقصد ہی کے ذریعہ سعی و عمل کی منزلیں طے ہوتی ہیں۔ اگر آرٹ اور فن کا کوئی مقصد نہ ہو تو ارتقاء کی رفتار سست ہو کر موت کے جمود سے ہمکنار ہو جائے گی اور مستقبل کی جد و جہد کا دلکش منظر نظر سے اوجھل ہو جائے گا۔ یہ ویسا جانتی ہے کہ میکانکی عالم میں اہمیت ماضی کو ہے اور شعور و احساس کی دنیا میں مستقبل زیادہ اہم ہے۔ نواب کے یہاں مقصد آفرینی کا پرتو ہے۔ ان کو یہ رمز اچھی طرح معلوم ہے کہ غیر تشفی یافتہ امیدوں کی تکمیل کا ذریعہ نفس انسانی کے لئے مقناطیسی آفرینی ہے نفس کی حیثیت انفعالی نہیں شعوری ہے۔ نواب نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ادب کو وسیلہ ٹھہراتے ہوئے فوق الفطرت ہستی (خدا) سے یہ تمنا کی ہے کہ تو تو خدا ہے۔ تیرا اختیار و اقتدار غیر محدود ہے تو اگر چاہے تو سعی و عمل کے پیکر کو کائنات کا رہنما بنا سکتا ہے۔ نواب نے انسانیت کی رہبری کے لئے اپنے حصولِ مقصد کی خاطر آرٹ میں جذبہ و خلوص کی دعا مانگی ہے۔ ان کو یہ نکتہ اچھی طرح معلوم ہے کہ خلوص کلام کی جان اور تکمیل مدعا کی روح ہے

خدا تو ہے تو مجھ کو نا خدائے ما سوا کر دے
مرے اشعار کو جذبات کی دنیا عطا کر دے

دنیا حرکت و عمل کا نام ہے۔ نواب نے کائنات فطرت کو نہ صرف تغیر پذیر ہوتے دیکھا ہے بلکہ اس کی تغیر پذیری کے اسباب و علل کی چھان بین بھی کی ہے۔ کائنات کے بارے میں ان کا مطالعہ وسیع ہے نفس انسانی کا تجزیہ کر کے روح کی بیماری اور اس کی ناتوانی کے اسباب کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ سماج کے مزاج داں ہونے کے باوجود بددل نہیں ہوئے ہیں۔ ان کو یہ یقین رہا ہے کہ جب ہیزم ترے آگ پیدا ہو سکتی ہے تو کیا نفس کے آہن سرد کو کلام کی شعلہ نوائی سے پگھلایا نہیں جا سکتا۔ اقبال کے غیر فانی بیانات اور پیران کے اثرات

نواب کے سامنے ہیں۔ کلام میں اگر خلوص ہے اور اس کے ساتھ خلوص کو آرٹ کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا گیا تو گداختگی ضرور پیدا ہوگی مگر کامل آرٹ کے لئے ضروری ہے کہ اس میں تسخیر فطرت کی وہ ساری قوتیں ہوں جن سے فطرت بنتی اور بگڑتی ہے۔ یہی حقیقت نواب کے سامنے ہے ؎

مری ہستی سراپا آئینہ ہے رازِ فطرت کا
نہاں ہے پیکرِ خاکی میں اک شعلہ محبت کا

جب تک دنیا قائم ہے تبدیلیاں ہوتی رہیں گی مگر محبت کی جلوہ گری سے کوئی نقش معرا نہ ہوگا۔ کسی شے کا انحطاط پھر اس کی بربادی محبت کی کمی اور فقدان ہی کے باعث ہوتی ہے۔ یہ کائنات کا ابدی جوہر ہے اور انکشافِ حیات کا بہترین وسیلہ ہے۔ شاعر کا سینہ محبت کی جلوہ گاہ ہے۔ اس کے دل میں کائنات کے حسین پرتو ہیں۔ اس میں وہ اپنی شخصیت کو جذب کرتا ہے۔ جب اس کی شخصیت سراپا محبت بن جاتی ہے تو وہ حسنِ فطرت کو بھی اپنے اندر جذب کرتا ہے۔ اس کو جہاں بھی حسن نظر آتا ہے وہ اس کی تشریح و توجیہہ کے لئے بیقرار ہو جاتا ہے۔ بغیر جلوۂ حسن وہ تخلیقِ شعری سے قاصر رہتا ہے۔ اگر حسن نہ ہوتا تو محبت ساز کے شکستہ تار کے مانند ہوتی ؎

اس قدر سجۂ جمالِ دل ربا ہو جائیے
سر سے پا تک آئینہ ہی آئینہ ہو جائیے

عرفانِ حسن کے لئے عرفانِ حیات لازمی ہے۔ حسن دینا کی ہر شے میں رواں ہے۔ جو انسان اپنے اندر جلوۂ حسن کی تابانی کو نہیں دیکھ سکتا اُسے عرفانِ حیات حاصل نہیں پھر نواب کے لفظوں نظر سے اس کو انسان نہیں کہا جا سکتا۔ انسان تو محبت کا پتلا ہے اور محبت سیماب کی طرح ہمیشہ مضطرب رہتی ہے۔ اس پر حسن کا فوری اثر ہوتا ہے ؎

نگاہِ حسن سے کونین کا سینہ دھڑکتا ہے
وہ انسان کیا محبت کا جسے عرفاں نہیں ہوتا

اگر محبت میں استقلال اور اکملیت ہے تو یہی موت و زندگی کے بندشِ تحصیلِ مقصد سے نہیں رک سکتے۔ کوئی منزل ہو قدم آگے بڑھنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ والہانہ طور پر وہ گذرتا ہی جائے گا۔ واماندگی ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جائے گی۔ توانائی اس سے بغلگیر ہوگی۔ محبت اس کی رہنما بن جائے گی۔ اسے کبھی دل کا دست نگر ہونا نہ پڑے گا۔ محبت کی ابدیت کے سامنے موت و زندگی کی منزلوں سے والہانہ گذر جانا کچھ مشکل نہیں بشرطیکہ محبت پر اعتماد ہو یا یوں کہہ لیجئے کہ خلوص کامل ہو۔ اگر یہ ہے تو دیر کیا ہے ؎

گذر بھی جا موت و زندگی کی ہر ایک منزل سے والہانہ
اگر محبت پہ ہے بھروسہ تو حاجتِ کارواں نہیں ہے

نواب کی غزلوں میں زندگی کا عکس ہے وہ ایک شاعرِ جہات کی طرح زندگی کے سوز و ساز کو نہایت لطیف پیرائے میں ادا کرتے ہیں۔ شعرائے جھانسی میں کسی نے بھی حقیقی زندگی کو آرٹ سے ہم آہنگ نہیں کیا ہے۔ یہ جھانسی کے پہلے شاعر ہیں جن کا نظریۂ ادب برائے زندگی ہے۔ یہاں سب سے پہلے نواب ہی زندگی کے رازہائے دروں کو آشکار کرنے کے آرزومند ہوئے ہیں۔ اگر نواب زندگی سے دُور رہتے تو ان کی تخلیق بلاشبہ مصنوعی اور بناوٹی ہوتی۔ انہوں نے اپنے واردات کو زندہ اور بیدار حقیقت بنا کر پیش کیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جذبہ سے زیادہ کوئی دوسری چیز زندہ اور ٹھوس حقیقت نہیں بن سکتی۔ کیونکہ یہ عاشقانہ اور دردانہ اور تمام بنی نوع انسان کی مشترک فطرت ہے۔ زندگی کی سب سے بیش بہا چیز "دل" ہے۔ اس کا اپنا کام "زندگی" ہے۔ زندگی کیسی ہی ہو مگر موت کے مقابلے میں دلکش ہے۔ زندگی کے مختلف رخ ہیں اور شاعر کی نظر سے کوئی رخ اوجھل نہیں رہتا ہے مگر موضوع کے اعتبار سے زندگی کے اس رخ کو وہ ترجیح دیتا ہے جو منقلب ہوتا رہتا ہے۔ نواب کی نظر بھی اُن رخ پر ہے۔ وہ زندگی کی تہوں میں اپنے نقش و نگار دیکھتے ہیں جسے عوام کی آنکھیں اعتبارات میں محدود ہونے کے باعث نہیں دیکھ سکتیں۔ وہ اپنے جذبہ سے اس میں عمق پیدا کر دیتے ہیں۔

اگر آرٹسٹ میں توانائی ہے تو اس کا آرٹ بھی جاندار ہوگا۔ اس کی تخلیقی قوت اپنے عمل سے کہیں بھی مجبور نہیں ہو سکتی ہے۔ چونکہ شاعر کے پہلو میں ایک دردمند دل ہوتا ہے۔ وہ ہر انسان کے درد و غم کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور اپنی شعری تخلیق سے جو مرہم تیار کرتا ہے وہ پورے سماج کے زخموں کے اندمال میں موثر ثابت ہوتا ہے۔ وہ اس دنیا میں نہیں رہتا مگر اس کے تخلیقی افکار کے پیکر خضر بنکر سماج کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے شاعر بھی خضر کی طرح زندہ رہتا ہے ؎

نہیں ممکن کہیں فطرت مری مجبور ہو جائے
اگر ہو آسماں بھی راہ میں تو دور ہو جائے

میں شاعر ہوں ملا ہے دردِ انساں سے سوا مجھ کو
فنا کے بعد بھی حاصل ہے دنیا میں بقا مجھ کو

شاعر فطرت اپنے جذبات و تاثرات کے ذریعہ اپنے دل کو کائنات

کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے۔ اس کے دل کی ہنگامہ آرائی، شورشِ حیات کی زندہ تصویر بن جاتی ہے۔ اس کی توازن گی کے اتار چڑھاؤ میں توازن قائم رکھتی ہے۔ اس کا اضطراب کائنات کو بیقرار کر دیتا ہے۔ اس طرح اس میں اور کائنات میں رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور اس کا ادبی سلسلۂ ارتباط کو استوار کر دیتا ہے۔ اس کے نغمے سے کائنات میں زندگی کی لہر دوڑنے لگتی ہے۔ اس لئے سارا عالم اس کے نغموں پر کان لگائے ہوتا ہے۔ اسکے تاثرات نغمہ پردازی کے محرکات کو تحریک میں لاتے ہیں۔ نواب نے اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

چھیڑ نغمہ کوئی اور نغمہ طراز
سارا عالم ہے گوش بر آواز

نواب کی غزل گوئی کی دوسری خصوصیت "ایمائیت" ہے چونکہ غزل گوئی کی کیفیت خواب کی سی ہوتی ہے مگر عام خواب اور اس خواب میں بڑا فرق ہے۔ غزل گوئی کے خواب میں تحیر اور مستی بھی شامل ہوتی ہے غزل گو شاعر اپنے نفس کے تجربہ کے علاوہ کسی دوسرے کے تجربے کا قائل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے نفس کے تجربات کو رمز و کنایہ کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے نواب کی غزل گوئی کا کمال رمز و ایما میں مضمر ہے۔ وہ اپنی بات "در حدیثِ دیگراں" بیان کرتے ہیں رمز و کنایہ میں جو لطف ہے وہ تشریح و وضاحت میں نہیں ہے۔ غزل کا ہر شعر رمزیت کے باعث وقت ہوتا ہے۔ چند لفظوں میں غزل گو اپنے "رازِ دروں" ظاہر کرتا ہے حسن و عشق کا کوئی بھی اثر اتنا مختصر نہیں ہے کہ ایک شعر کے ذریعہ اس کی ترجمانی ہو سکے مگر غزل گو ایک ہی شعر میں بڑی سے بڑی تحریکات کو نظم کرتا ہے اور اس کے افہام و تفہیم میں ذرا بھی دماغ پر زور دینا نہیں پڑتا۔ اور روح پر مستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ نواب نے غزل میں جو ایمائی اسلوب بیان اختیار کیا ہے وہی ان کی غزل کی جان ہے اگر ایماء کے بجائے صراحت برتی جاتی ہے تو غزل کا ہر شعر اس کے حدود سے نکل جاتا اور پند و موعظت یا فلسفہ و حکمت سے جا ملتا ہے۔ شعریت باقی نہیں رہتی۔ نواب نے معمولی اور سادہ الفاظ سے گہرے جذبات اور معانی کی تخلیق کی ہے۔ ایمائی اسلوب کی بدولت ان کے محدود مشاہدے میں لامحدودیت کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شعر اتنا معنی خیز ہے کہ ذہنی برانگیختگی اس کے اندر مختلف جذباتی دھارے پنہاں دیکھتی ہے۔ نواب کے مجموعۂ کلام میں اکثر اشعار ایسے ہیں جن کے مفاہیم زندگی کی طرح لامتناہی ہیں اور شعر کا واحد آرٹ بھی یہی ہے کہ اس کا مطلب محدود نہ ہو۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

دنیا کو رازِ عشق بتاتا چلا گیا
بجھتے ہوئے چراغ جلاتا چلا گیا

آپ کے جلوۂ رنگیں میں نہاں ہے دنیا
آپ ہٹ جائیں تو دیکھوں کہ کہاں ہے دنیا

جہانِ یاس کی بیرنگ منزلوں سے ہنوز
گذر رہا ہوں امیدوں کا کارواں لیکر

فرشتے کرتے ہیں ذکر ابتک فلک پہ یوں مری بیکسی کا
بڑی مصیبت ہے آدمی پر بڑا کلیجہ ہے آدمی کا

نواب کے یہاں رمزیت اور رومانیت کچھ اس طرح جامہم دست و گریباں ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا یہ شاعر کے آرٹ کا کمال ہے کہ اس نے رمزیت کو اخلاق اور عبوسیت سے بچانے کے لئے اور اپنی تخلیق کو دلکش بنانے کے لئے ایسا اسلوب اختیار کیا جو دونوں کو باہم ممزج کر کے شعریت کی حدود میں غیر معمولی وسعت پیدا کر دیتا ہے۔ نواب اپنی ذہنی پیداوار کو کسی خاص ماحول تک محدود نہیں رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی غزل کے تخلیقی عناصر ابدی اور آفاقی ہیں ؎

رازِ حقیقت کھل جائے گا۔ باتیں کر سیاروں سے
انساں ہو کر ڈرنا کیسا چرخ کے پہرہ داروں سے

کسی کی جب سے مرے حال پر نگاہ نہیں
ہیں روز و شب وہی لیکن وہ مہر و ماہ نہیں

یہ مہر و ماہ یہ انجم کی محفلیں کیا ہیں
اگر حسین نگاہوں کی جلوہ گاہ نہیں

یہ رنگیں پھول۔ یہ شبنم۔ یہ انجم۔ یہ مہ کامل
ترا افسانہ کہتے ہیں زبانِ بے زبانی سے

نواب نے طرزِ ادا میں نرالا پن پیدا کر کے غزلوں میں کیف اور مستی بھر دی ہے۔ فلسفہ تمدن کے بعض مسائل کو طرزِ ادا کی جدت سے غیر شعری نہیں ہونے دیا۔ حالانکہ علم تمدن بہت سنجیدہ اور خشک موضوع ہے۔ اس کو شعری بنانا اور غزل کے حدود میں لانا ہر شاعر کا کام نہیں ہے۔ اس راہ میں غزل گو شاعر دو قدم بھی نہیں چل سکتا ہے۔ لیکن نواب نے رومانیت اور رمزیت کا سہارا لیکر عام غزل گو شاعروں کے سامنے یہ نمونہ پیش کر دیا ہے کہ غزل انسانی ذہن کی تمام جد و جہد اور قدر آفرینی کی حامل بن سکتی ہے۔ بشرطیکہ شاعر کے افکار میں وسعت اور توانائی ہو۔

نواب کے کلام میں جاندار پیام ہوتا ہے مگر مصلح اور واعظ بنکر وہ کچھ نہیں کہتے۔ وہ شاعرانہ لب و لہجہ میں ویسے ہی جلی کٹی باتیں سنا جاتے ہیں جیسی مصلح کی فطرت ہوتی ہے۔ مگر فرق یہ ہوتا ہے کہ مصلح اور واعظ کا خطاب براہِ راست سامعین سے ہوتا ہے مگر نواب ایک شاعر ہیں۔ وہ شاعرانہ لب و لہجہ میں وہی بات اس عمدگی سے کہتے ہیں کہ قوموں کی تاریخ عروج و زوال اس کے اسباب و علل کی پوری تفصیل۔ اخلاقی اقدار کا مرتبہ۔ بداخلاقی کے نتائج کا فوٹو نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

بہوش باش کہ اے بندگانِ حرص و طمع
ہر اک عمل میں مشیت کے تازیانے ہیں

جُوں جُوں دنیا اخلاقی اقدار سے دور ہوتی جاتی ہے توں توں اس کے مصائب اور آلام میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ عوام میں نراش نا امیدی گھر کر لیتی ہے۔ نواب نے ایسے لوگوں کو بھی درس دیا ہے کہ دنیا کی نجات کا راستہ ٹھوس اخلاقی قدروں کی پذیری میں ہے۔ مگر چونکہ مادیت۔ روحانیت پر ایسی غالب آچکی ہے کہ اخلاقی اقدار و روحانیت کا بلد کا سا عمل بھی باقی نہیں رہا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ انسان بے عملی کا شکار ہو کر تقدیر کا رونا روتا ہے اور کبھی چمکتے ہوئے تاروں کی دنیا کو حریص نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ نواب نے اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

حریص بن کے ستاروں کے دیکھنے والے
سمندروں کی تہوں میں بڑے خزانے ہیں

جدوجہد اور حرکت و عمل سے ہر چیز کی تخلیق ہوتی ہے اور اثبات عمل کے موافق محرکات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ پھر وہی اثباتی محرکات عمل منفی کی تحریکات کو ابھرنے نہیں دیتے ہیں۔ جو عمل جس مقصد کے لئے ہوتا ہے ویسا ہی نتیجہ پیدا کرتا ہے ؎

جہاں میں آگ لگا دے کہ پھول برسا دے
ترے عمل میں ہر اک رنگ کے زمانے ہیں
بلند ہوں تیری نظریں تو شاخ و گل کے اسیر
جہاں کے سارے چمن تیرے آشیانے ہیں

نواب اپنی طرزِ ادا کے نرالے پن کے باعث سیدھے سادے الفاظ میں جادو بھر دیتے ہیں۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ بلند ایوان جہاں دولت مندی کا پتہ دیتے ہیں وہیں ملکیں کی سطوت و جبروت کی بھی غمازی کرتے ہیں۔ غریب طبقہ بلند ایوانوں کو دیکھ کر ہی خوفزدہ ہو جاتا ہے اور مقتدر طبقہ کے استحصال کا آلۂ کار بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ایوان کی بلندی اس کے ظلم و استبداد کی بیکرانی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس کی آرائش و پیرائش میں معیشت انگڑائی لیتی ہے۔ گناہوں کا یہ پہاڑ ہے اس کی چوٹی پر شیطانوں کا رقص ہوتا ہے مگر غریب طبقہ کی فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ جب قصر ہائے بلند کو دیکھتا ہے تو پست ہمتی کے جذبات اس میں پیدا ہوتے ہیں اور انہیں جیسا خود بھی بننے کا کوشاں ہوتا ہے نفس کی اس بیماری کا علاج سوائے اس کے اور ہو ہی کیا سکتا ہے کہ قصر ہائے بلند کی بلندی اور ان کی آرائش کے پردہ میں جو گھناؤنا پن چھپا ہوتا ہے اسے ظاہر کیا جائے۔ یہ امر مسلم ہے کہ موجودہ نظام جابرانہ عیش پرستی و تعیش کا دوسرا نام ہے۔ بلند عمارتوں کی تعمیر اور اس کی آرائش میں صرف یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ نواب نے ان بلند ایوانوں کا گھناؤنا پن اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ بجائے تحریص کے گھن پیدا ہونے لگتی ہے۔ یہی ہے طرزِ ادا کا نرالا پن ملاحظہ فرمائیے ؎

تو قصر ہائے فلک بوس پر نگاہ نہ کر
نگار خانے نہیں، یہ سیاہ خانے ہیں

نواب کی غزل گوئی میں جانداری اور توانائی ہے جب اُردو شاعری پر فیوڈ ازم کے گہرے اثرات چھائے ہوئے تھے اس وقت نواب کے یہاں شیلے اور کیٹس کا رومان تھا۔ اب ان کی غزلوں میں ٹھوس اخلاقی اقدار ہیں۔ ان کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ ہندوستان کی موجودہ نام نہاد آزادی میں فلاح نہیں ہے حصولِ آزادی کے لئے اس وقت تک جدوجہد ناگزیر ہے۔ جب تک ٹھوس اخلاقی اقدار پر حکومت کی بنیاد قائم نہیں ہو جاتی ہے ؎

نواب ذہن میں ہے ایک منزلِ مقصود
خبر نہیں ابھی کتنے قدم اٹھانے ہیں

نواب کا کلام جھانسی کے ماحول کے پیشِ نظر ضرور لائق اعتنا ہے۔ ورنہ ان کی شاعری میں اور پختگی ہونی چاہئے۔ کہیں کہیں لسانی خامیاں غلط ترکیبیں۔ تضادِ خیال اور الجھاؤ پایا جاتا ہے۔ شعر میں رنگینی پیدا کرنے کے لئے نواب کہیں، اتنے محو ہو گئے ہیں کہ مفہوم کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے ؎

شورِ اجل ہے گرم کا عالم نفسیات میں
تم کو جو نیند آگئی بارگہِ حیات میں

عالمِ نفسیات میں شورِ اجل کا گرم کار ہونا کوئی مفہوم نہیں رکھتا پھر گرم کار کی ترکیب بھی محلِ غور ہے ؎

جلوۂ سوزِ حسن سے کانپ رہا ہے دل مرا
اتنا بھی غیر سے نہ دیکھ آئینۂ حیات میں

جلوۂ سوزِ حسن کی ترکیب مہمل ہے۔
کہیں کہیں نواب نے ایسے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ جو حدودِ غزل سے باہر ہیں ؎

زمانہ واقعاتِ حضرتِ موسیٰ سے خائف ہے
وہ ہونے کو تو اب بھی جلوہ ریز طور ہوتے ہیں

"واقعاتِ حضرتِ موسیٰ" میں تنافر ہے ؎

رہنما ہے نا مرادِ تجسس مجھے سدا
عنصرِ میری سرشت میں ہے گرد راہ کا

عنصرِ میری سرشت کا ٹکڑا ایسا ہے جس کی متحمل زبانِ غزل نہیں ہو سکتی ؎

نواب کے ہاں اہمال اور الجھاؤ بھی ہے ؎

محبت کی سکوں ناآشنائی کیا کہوں ہمدم
اگر مرتا ہوں تو مرنے کا بھی ساماں نہیں ہوتا

بڑھے جاتے ہیں زخمِ دل گری جاتی ہے برقِ دل
خزاں کا زور ہے لیکن چمن ویراں نہیں ہوتا

تدبیر فنا سے انساں کی تقدیر بنائی جاتی ہے
وہ شمع جو بجھنے والی ہو تو اس کی بڑھائی جاتی ہے

نواب کو مہر و ماہ۔ انجم و کہکشاں سے اتنی محبت ہو گئی ہے کہ غزل کے دو تین شعر میں مہر و ماہ۔ انجم و کہکشاں کے الفاظ ضرور ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کی کثرت استعمال سے شعر میں بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ نواب کو چاہئے کہ وہ ذوقِ سلیم سے کام لیں اور ان الفاظ کے استعمال میں احتیاط برتیں۔ ان الفاظ کا استعمال مقتضائے حال کے مطابق ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ محاسنِ شعری کا قرینہ اور سلیقہ کے ساتھ بہت گہرا ربط ہے۔ اصغر کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

ردائے لالہ و گل، پردۂ مہ و انجم
جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے

یہاں مہ و انجم کا لفظ اتنا بلیغ ہے کہ اس کے مقابلے میں اگر دوسرا لفظ رکھ دیا جائے تو شعریت اور معنویت ختم ہو جاتی ہے۔ نواب کو الفاظ کے استعمال میں ترنم و نغمہ مفہوم معنی وغیرہ کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ چند مخصوص الفاظ کے ذریعہ اظہار خیال میں انقباض پیدا ہو جاتا ہے۔

ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ مہر و ماہ کی کرنیں مری ہستی کا منظر ہیں
جہاں تاریک ہوتا گر نہ ہوتا حسنِ غم میرا

پہلا مصرع دعویٰ ضرور ہے مگر شاعرانہ تعلیل نہ ہونے سے بے تعلق ہو گیا ہے۔

چونکہ جھانسی کا ادبی ماحول بہت پست ہے تعلیم کی بے حد کمی ہے۔ چند گنے چنے شاعر ہیں۔ ان کا علم اور مطالعہ اتنا کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے ایسی ادب کش فضا میں کبھی کبھار جو شعری نغمہ گونج جاتا ہے اسی سے یہاں شعر و سخن کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ نواب نے یہاں کی فضا میں ایسی گرمی پیدا کر دی ہے کہ مستقبل میں اس کا اثر نمایاں ہو کر رہے گا۔ کچھ شعرا جن کی شعری تربیت نواب کے سائے میں ہوئی ہے۔ منظر عام پر آ رہے ہیں۔ ان میں ظہور۔ ضمیر۔ آصف۔ ساقی۔ ایاز۔ امین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

نواب کے مجموعہ سے چند شعر فیافتِ طبع کے لئے پیش کئے جاتے ہیں ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ پردہ داری یہ بے رُخی کیا، یہ تو بتو ہے حجاب کیسا
مری نگاہوں سے چھپنے والے میں تیری نظروں کا ہوں فسانہ

مری فطرت کا ہم پلہ فرشتہ ہو نہیں سکتا
میں جیسا بن گیا ہوں کوئی ویسا ہو نہیں سکتا

چارہ گر نشترِ جہاں دیتے ہیں اٹھتا ہے دھواں
تیرے غم کی آگ رگ رگ میں نہاں رکھتا ہوں میں

وہ رسم و راہِ محبت سے آشنا ہی نہیں
قدم قدم پہ جو منزل نئی بنا نہ سکے

دامنِ ضبط پہ کچھ اشک گراؤں کہ نہیں
اپنے غم کی کوئی تصویر بناؤں کہ نہیں

کس گناہ پہ چھینی گئی ہے خلد مری
نہ دیکھنے دیا مڑ کر بھی ایک بار مجھے

ترے بغیر بھی کٹتی ہے زندگی لیکن
گناہگار پہ جیسے عذاب ہوتا ہے

درسِ عبرت ہماری ہستی ہے تو اک دلیلِ عزم و پستی ہے
نہ ہوتا در اگر دل میں زندگی کے لئے
یہ کائنات جہنم تھی آدمی کے لئے

محمود الحسن شاہدی

عورت کا تخیل اقبال کی فکر میں

کائنات کے اسرار و رموز کو فاش کرنے والے اقبال نے جہاں اس عالم رنگ و بُو کے باریک پردوں کو چاک کیا اور عناصر و موجودات کی حقیقتوں کو بے نقاب کیا وہیں اس نے قدرت کی دو عظیم الشان اور خالق فن کار کی دو اعلیٰ شاہکار جو درحقیقت ایک ہی جوہر خالص کی دو مختلف تصویریں ہیں ان کے میدان فکر و عمل رزم گاہ نشو و نما جائے ارتقاء کے حدود و مراتب بھی متعین کئے ان کی بالیدگی اور ظہور کے خارجی نشان دہی کی نبی نوع کی تخلیق سے فراغت کے بعد فطرت نے ان دونوں کے دائرۂ حیات کی بہت کچھ مختلف بنیادیں کی ذہنی و دماغی ساخت کے سانچے میں کمی و بیشی کر دی۔ ایک میں تولیدی طاقت کا غلبہ ہے دوسرے میں نقصان یعنی عورت کو نسلی بقا و زیادتی و تکثیر کا رتبہ عنایت کیا گیا اور مرد کو حفاظت نسل اس کی تعمیر و تزئین۔ مقاصد دونوں کے ایک یعنی ارتقاء انسانی مگر کام کرنے کے خطوط مختلف راہیں الگ الگ ایک میں نعالیت کا غلبہ دوسرے میں انسانیت کی زیادتی جو در اصل ملکر تمدنی ڈھانچے کو متوازن کر دیتے ہیں اس قدرتی تقسیم کو برقرار نہ رکھنا عمرانی و معاشرتی فساد کو دعوت دینا ہے تہذیب کی پائدار دیواروں میں شگاف بنا کر اس کو کمزور کرنا ہے ان حقائق سے اغراض سماجی و قومی تعمیر میں انتشار اور بوکھلاہٹ کو راستہ دینا ہے چنانچہ اقبال مرحوم نے اسی مضمون کو صرف ایک شعر میں ادا کیا ہے ؎

بڑھ جاتا ہے جب ذوق نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

مرحوم کے نزدیک نسوانیت کا امتزاج ہی کچھ ایسے اصولوں پر ہوا ہے جس سے اس کے اندر انقیاد و اطاعت پست ہمتی و خام خیالی حالات کے آگے سپر ڈال دینے کا رجحان غایت درجہ کی شفقت و تاثر اس کی فطرت ثانیہ ہے برخلاف اس کے مرد کے ضمیر میں انانیت و اقدام بلند ہمتی و جوش استقامت عزم پیہم و یقین محکم اصابت رائے صحت فکر تاثیر و تحکم کا جذبہ پوری طرح کارفرما نظر آتا ہے۔ اس اختلاف نوعی کے باوجود اس صنف لطیف کے کاندھوں پر ایسے بوجھ کو لادنا جس سے اس کی فطرت کپکپا اٹھے نہ صرف ایک تاریخی حماقت ہوگی بلکہ سوسائٹی کے ساتھ زبردست قسم کا دھوکا ہوگا۔

اس نازک آبگینہ پر یہی کیا کم بار ہے کہ وہ اس عظیم ذمہ داری کو اپنائے ہے جو درحقیقت انسانی دیوار کی اولین اینٹ ہے اس کائنات میں اسی کے حسن کی جگمگاہٹ ہے تاریک عناصر میں روشنی و نظام ہست و بود میں وہی ایک گونہ کشش کا سہارا ہے اگر اس پاک و لطیف انوار کی چھاؤں سے زندگی کا وجود ایک منٹ کے لئے ہٹ جائے تو مرد کا سرمایۂ حیات عدم کے نامعلوم پردوں سے اپنے کو ڈھک لے علامہ مرحوم نے اپنے خاص انداز میں مضمون بالا کو یوں پیش کیا ہے ؎

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا دُر مکنوں

مرد و عورت کے فرائض میں تباین و اختلاف پایا جاتا ہے عورت کو گھر کی چہار دیواریوں میں عظیم ذمہ داریاں سپرد کی گئی ہیں ایک تو وہ پیدائش کے مختلف مراحل سے گذرتی ہے مرد سے ایک جوہر لیکر اپنے تولیدی طاقتوں کے خزانے اس پر صرف کرتی ہے خون جگر سے اس کھیتی کو سینچتی ہے حزم و احتیاط کے بہت سے مقامات سے گذرنا پڑتا ہے پھر ایام زچگی سے پہلے اسے مسلسل آرام و سکون کی طلب ہوتی ہے تب جاکر کہیں وہ اپنی امانت کو پوری طرح واقعات کی دنیا میں ایک عملی صورت میں پیش کرتی ہے۔ ہمیں سے ایک ایک صالح و صحتمند نسل کو بروئے کار لانے کا ایک موقع نصیب ہوتا ہے پاکیزہ و تعمیر پسند سوسائٹی کو برپا کرنے کا ایک عظیم الشان چانس ہاتھ آتا ہے۔ پھر اسے مسلسل دو سال تک انہیں قوتوں کی تخلیق میں خون پسینہ ایک کرنا ہوتا ہے اور جیسے ہی وہ فراغت پاتی ہے فوراً ہی ایک دوسرے برگ و بار کے موسم میں پہنچ

جاتی ہے۔ اس لئے اسے ان شعبوں میں دلچسپی کا موقع قطعاً نہیں ملتا جو صرف مردوں سے متعلق ہیں اور اگر کوئی عورت اپنے اوّلین تقاضوں کو فراموش کر کے ایک دوسرے میدان میں اپنے کو پیش کرتی ہے تو وہ پھر اپنی جنسیت کو کھونے کا اعلان کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جو عورتیں مردوں کے دوش بدوش زندگی کی ترقی میں کوشاں ہیں وہ زیب گلو و آرائش محفل زینت اسٹیج بنی جا رہی ہیں شاعر مشرق کی عقابی نظر نے عورتوں کی اس بے حرمتی کا صرف ادراک ہی نہیں کیا بلکہ مردوں کے ان ہوسناک عزائم کا راز بھی فاش کیا۔ جو آزادیٔ نسواں و ہمدردیٔ نسواں کے پیچھے پوشیدہ ہے چنانچہ انھوں نے اس کا فیصلہ عورت کی بصیرت ہی پر کو چھوڑا ؎

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں میں یہ زہر ہے یہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

اقبال کے نزدیک آزادیٔ نسواں کی مدح میں قصائد پڑھنے والے اس کو اچھال اچھال کر ایک انسانی مسئلہ کی صورت دینے والے اس بات کے درپے ہیں کہ عورت کی بیٹیاں ان کی تسکین ہوس والی کے لئے اپنے آپ کو بازاروں، سڑکوں۔ درس گاہوں۔ دفتروں۔ ٹیکنیکل شعبوں و تعلیمی اداروں۔ کلبوں۔ گھروں اور پارلیمنٹ کے ایوانوں غرض کہ ہر ہر قدم پر پیش کر دیں۔ پھر جس کی پاکدامنی و عفت پر ہر ماہ و شریا کی زبان حال نہ مرثیہ تھی اس کی بے حرمتی پر صرف ریزے بھی شرما جائیں مرحوم اقبال نے اس کو بھانپ کر کہا ہے ؎

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بیکار و زن تہی آغوش

علامہ کے نزدیک عصر حاضر کی تہذیب جو تمام کی تمام مغرب سے متاثر و مستعار ہے وہ اصل وہی ذمہ دار ہے اور آزادیٔ نسواں کی محرک ہے لیکن مغرب نے اس فکر کی نشو و نما کیوں کی تھی اس کے پیچھے اٹھارہویں صدی کی وہ مغربی "بیداری" کی روح کارفرما تھی جو ہر مذہب سے تنگ آکر انتقامانہ جذبہ کے تحت یورپ نے ہر قدیم چیز کو بغیر سوچے سمجھے اپنی معاشرت و ریاست و اجتماعیت سے برخاست کر دیا حتیٰ کہ بقول لیبان کے "اپنا آخری سررشتۂ امید تخیل الاہ سے توڑ لیا" انھیں بہت سارے مسائل میں۔ عورتوں کا مسئلہ تھا عورتیں قدیم عیسائیت کے نزدیک "خالق شر" کا درجہ رکھتی تھیں ان کا طرز عمل ایک طرف وحشیانہ تھا۔ عورتوں کے جائز حقوق کی پامالی جان بوجھ کر کی جاتی تھی الغرض جس طرح حقوق نسواں کا قدیم عیسائیت نے لحاظ نہ رکھا بعینہٖ جدید مغرب نے بھی اس کے صحیح موقف کو نہ پہچان کر اس کو بازاروں کا کھلونا بنا کر رکھ دیا۔ اصل عورت معاشرت کی تکمیل کا ایک آلہ و مشین ہے اس کی ٹھنگ زندگی کے انجن میں اسی جگہ ہونی چاہئے جہاں رہ کر وہ اپنے جوہر نسوانیت کو پوری طرح اجاگر کرے۔ عورتوں کا مسئلہ اصل قوم کی حیات، دمات کا فیصلہ کن پہلو ہے اس میں ذرا بھی افراط و تفریط قوم و ملک کی بقاء کو متزلزل کر دیتی ہے ترجمان حقیقت علامہ مرحوم نے مضمون بالا کو اس انداز میں پیش کیا ہے ؎

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت یہ ہیں نہ وہ چیریں
فساد کا ہے فرنگی معاشرہ میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

دوسری جگہ ایک اٹل اور دو ٹوک فیصلہ سناتے ہیں ؎

اِلا زندہ حقیقت تیرے سینہ میں ہو تو کر گیا تجھے کاہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پروہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی تو نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا تو اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

اقبال کے نزدیک جو ہر مرد بغیر کسی کے تعاون و امداد کے آشکارا ہو سکتا ہے لیکن عورت کی صحیح پرورش صرف مرد کی رہین منت ہے کیونکہ مرد و عورت کی قوت عاقلہ میں نوعی فرق ہے ان دونوں کا عقلی مزاج تمدنی نقطۂ نظر مختلف اور الگ الگ ہے چنانچہ ڈاکٹر گستاولی بان یورپ کے اس مساویانہ طرز عمل کو ان الفاظ میں گمراہ کن بتاتا ہے "اس مساویانہ نظریہ کی بنا پر عورت مرد سے مساویانہ حقوق مساویانہ تربیت کی خواہشمند رہے اور دونوں جنسوں کی قوت عاقلہ میں جو نوعی فرق ہے اس کو بھول گئی ہے لیکن اگر وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئی تو نہ تو مرد کو قیام کے لئے گھر ملے گا اور نہ ظاہر قلب حاصل کرنے کیلئے کنبہ و خاندان میسر آئیگا" حاصل یہ ہے کہ اقبال کی فکر فلک رسا نے عورتوں کے بارے میں وہی طرز اختیار کیا۔ عورت کی فطرت جس کی متقاضی تھی۔

حقّی حزیں۔ ایم۔ اے

غزل

پہلی سی اِس نظر میں کوئی بات ہی نہیں
وہ دلنوازیاں، وہ مدارات ہی نہیں

لب پر سکوتِ غم ہے کوئی بات ہی نہیں
اب زندگی میں حرف و حکایات ہی نہیں

اب یُوں تری نظر میں ہیں بیگانگی کے طور
جیسے کہ ہم سے رسمِ ملاقات ہی نہیں

یُونہی گزار دیں جو تری یاد کے بغیر
شاید کہ زندگی میں وہ لمحات ہی نہیں

مجھکو نصیب عیش دو عالم سہی مگر
کچھ بھی نہیں جو تیری عنایات ہی نہیں

یہ بندۂ خلوص و وفا یہ ترا حزیں
کچھ اور بھی ہے رندِ خرابات ہی نہیں

چندر پرکاش جوہر بجنوری

غزل

چمن سے دُور ہے کوسوں سکوں کا نام ابھی
کہ اِنقلابِ گلستاں ہے نا تمام ابھی

طلوعِ صبحِ بہاراں سہی مگر یہ کیا
فضا پہ چھائی ہے کچھ تیرگیٔ شام ابھی

قدم قدم پہ سمجھتے ہیں زیرِ پا منزل
چلے ہیں راہِ عمل میں جو چند گام ابھی

خلوصِ ذوقِ عمل ہے نہ اعتمادِ خودی
ہوس بھی خام ابھی ہے طلب بھی خام ابھی

بجا یہ شوخیٔ طرزِ بیاں، مگر واعظ
گراں ہے گوشِ جہاں پر ترا پیام ابھی

گریز عینِ فرائض سے تا بکے غافل
تجھے تو لینا ہے کچھ زندگی سے کام ابھی

کچھ اور فکر و نظر کو بلند کر جوہر
تجھے ستاروں سے ہونا ہے ہمکلام ابھی

شبنم الہ آبادی

چاہے کشتی مری ڈوب جائے
کون طوفاں سے دامن بچائے
کتنا احساس تھا تیرے غم کا
عمر بھر مسکرائے نہ پائے
لوگ بیٹھے ہیں کنج قفس میں
اِک خیالی نشیمن بنائے
خیر ہم ڈوب جائیں گے لیکن
ناخدا بچ کے جانے نہ پائے
یہ تری رہگذر تو نہیں ہے
یک بیک کیوں قدم ڈگمگائے
ناخدا بے خبر سو رہے ہیں
ہر طلاطم سے دامن بچائے
کیسا نظم چمن ہے یہ شبنم
کوئی روئے کوئی مسکرائے

اعجاز اعظمی

عشق کی سادگی سے ڈرتا ہوں
حُسن کی برہمی سے ڈرتا ہوں
اشکِ شبنم جسے ہنساتے ہوں
ایسے گُل کی ہنسی سے ڈرتا ہوں
اپنی پردہ دری بجا لیکن
اُن کی پردہ دری سے ڈرتا ہوں
جس سے تسکین قلب ہو نہ سکے
ایسی ہر بندگی سے ڈرتا ہوں
تم گلوں کی ہنسی پہ شاداں ہو
میں مآل خوشی سے ڈرتا ہوں
شمع کیونکر جلے نہ پلکوں پر
وقت کی تیرگی سے ڈرتا ہوں
ایک اللہ کے سوا اعجاز
یہ نہ سمجھو کسی سے ڈرتا ہوں

محمود فاروقی

جب انڈا ٹوٹے گا ــــ ؟

جگہ بڑی مختصر تھی اور فضا دم گھونٹ دینے والی نہ بہت زیادہ اندھیرا تھا اور نہ کھلی ہوئی روشنی۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس مختصر سے خلا پر کسی نے دودھیئے رنگ کا نرم نرم لجلجا غلاف چڑھا دیا ہے۔ موٹا اور دبیز غلاف جس کے اندر ہلکی ہلکی گرمی پریشان کئے دے رہی تھی۔

میں معلوم نہیں کس طرح وہاں پہنچ گیا تھا اور مجھے رہ رہ کر باہر کی وسیع و بسیط دنیا یاد آ رہی تھی ــــ پھیلی ہوئی زمین بلند نیلگوں آسمان۔ کھلا کھلا ماحول اور وہ سب کچھ جو قدرت نے ہم کو دیا تھا اور ہم نے قدرت سے حاصل کیا تھا۔

قریب تھا کہ میں رو پڑوں کہ میرے پاس ہی سے کسی کی سرسراتی ہوئی آواز آئی۔

اجنبی ــــ !

میں نے اس طرف غور سے دیکھا ایک ننھا سا سرخ سرخ جسم کیڑے کی طرح کلبلا رہا تھا۔

اجنبی ــــ وہ بولا۔ تم بڑے بے چین نظر آ رہے ہو؟

"بے چین"! مجھے اس پر بڑا غصہ آیا یہ بھی آخر کوئی پوچھنے کی بات تھی۔ تم کو بے چینی نہیں ہو رہی ہے؟"

نہیں تو وہ بڑے اطمینان سے بات کر رہا تھا جیسے اُسے کوئی تکلیف ہی نہیں ــــ نہیں تو یہاں آخر کون سی چیز ایسی ہے جو بے چین کر دے کتنی خوبصورت جگہ اور کتنی آرام دہ۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میں نے یہاں کوئی تکلیف محسوس نہیں کی بلکہ میں تو اپنے جسم میں خوشی اور مسرت کی گرم گرم لہروں کو دوڑتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ البتہ اس وقت ..... وہ خاموش ہو گیا!

اس کی اس لایعنی تقریر پر میرے آگ ہی لگ گئی شریر مجھے بنانے کی کوشش کر رہا تھا میں نے غصہ کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

چپ کیوں ہو گئے۔ کہو نا اس وقت کیا تکلیف ہو رہی ہے۔ تمہارے منہ سے کوئی ایک شکایت تو نکلے۔

جرانہ مانو ــــ وہ بولا شکایت تو نہیں البتہ اظہار واقعہ ہے کہ میں نے تمہاری آمد کو کچھ پسند نہیں کیا وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے تمہارے آنے سے کوئی تکلیف ہو رہی ہے بلکہ صرف یہ بات ہے کہ ــــ !

وہ پھر خاموش ہو گیا اور مجھے ٹک ٹک دیکھنے لگا۔

بات پوری کر لو تمہارے دو چار جملوں سے میرا کچھ بگڑ نہ جائے گا۔

اس نے آنکھیں بھینچتے اور تمدرے بجاتے ہوئے کہا ــــ بات دراصل یہ ہے کہ تمہاری آمد سے پہلے میں اس جگہ کا تنہا مالک تھا اور اس دنیا کا بلا شرکت غیرے حاکم لیکن جب سے تم آئے ہو میں محسوس کر رہا ہوں کہ میری ملکیت اور میرے اختیارات میں ضرور کچھ نہ کچھ ردوبدل ہو کر رہے گا ــــ اس نے اپنی بات تیزی سے ختم کی اور میرے چہرے کو بڑی تشویش سے گھورنے لگا۔ باوجود غصہ کے مجھے اس پر ہنسی آ گئی ــــ بیوقوف مجھے اپنا حریف سمجھ رہا ہے میں اس کے ساتھ اس قید خانہ کا بٹوارہ کروں گا قاہ، قاہ، قاہ ..... !

میں نے زور سے قہقہہ لگایا اور دودھیئے رنگ کی وہ چھوٹی سی دنیا تہ و بالا ہو گئی جیسے اس میں بھونچال سا آ گیا ہو۔ میرا ننھا سا ریڑھی جو بیضہ ہوٹی کی طرح سرخ ہو رہا تھا سینکڑوں بار قلابازیاں کھا گیا۔ اور جب کچھ سکون ہوا تو اس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں اور ڈرتے ڈرتے چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

یہ آخر کیا ہو گیا تھا؟

کچھ نہیں پروردگار عالم ذرا سی دیر کے لئے تمہاری سلطنت جھولا جھولنے لگی تھی سمجھ میں آیا جہاں پناہ کے۔

پروردگار عالم اور جہاں پناہ کے خطابات سن کر وہ بڑا خوش ہوا

اور بڑے فخر سے اپنی گردن اونچی کر لی ـــــ ادھر غصہ کے مارے میرا دل چاہا کہ اس کی مغنی سی گردن کو چٹکی سے مڑوڑ کر رکھ دوں۔

احمق کہیں کا۔ بیہودہ دنیا بھر کا جانے اپنے آپ کو کیا سمجھ رہا ہے ـــــ میں نے غصہ سے چلاتے ہوئے کہا۔ اجبک بوزنے میں تجھے اور تیری اس دنیا کو ٹھوکر پر اڑاتا ہوں سمجھا ٹھوکر پر مجھے دیکھ کیا رہا ہے کیا تجھے شک ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا بتا دکھی کی اولاد چڑیا کے بچے کیا میں ٹھوکر پر نہیں اڑا سکتا۔

وہ سہمے ہوئے انداز میں پٹ پٹ میری طرف دیکھے جا رہا تھا اور جب میں نے ٹھوکر والے سوال کو بار بار دہرا کر اس کے جواب پر اصرار کیا تو اس نے رونہار لہجہ میں منمناتے ہوئے کہا نہیں مجھے اس معاملہ میں کوئی شک نہیں!

کچھ دیر کے لئے خاموشی طاری رہی اور وہ دوسری طرف منہ پھیر کر اونگھنے لگا جیسے وہ تھک گیا ہو یا کسی بڑے علمی مسئلہ کو حل کرنے لگا ہو۔ مجھے اس کے اس فلسفیانہ انداز پر بڑا غصہ آیا۔ میں آخر اس کے ساتھ کیا کروں؟ عجیب بے بسی تھی میں اسے جان سے مار سکتا تھا لیکن یہ بڑی حقیر سی بات ہوتی۔

آخر میں کیا کروں؟ کس قدر اذیت ناک اور نامعقول پیشہ سی ہے یا تو وہ میرے ساتھ مذاق کر رہا ہے یا پھر وہ واقعی نادان ہے اس کو شاید کوئی علم ہی نہ ہو۔ . . . آخری بات ہی ممکن تھی ـــــ اس خیال کے آتے ہی مجھے ایک گونہ خوشی ہوئی انتقام کی ایک راہ نکل آئی تھی ـــــ

میں نے اس کی اونگھتی ہوئی کھوپڑی کو چٹکی سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا

"کیا ہے؟ وہ خواب آلود لہجہ میں بولا"

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"میں ٹھوکر والے معاملہ کا تجزیہ کر رہا تھا کہ کیوں کیسے اور کس طرح؟"

"اب اس تجزیہ کی ضرورت نہیں رہی!"

"واہ کیوں ضرورت نہیں رہی یہ تو بڑا اگر اعلمی مسئلہ ہے"

"مگر اہو کہ اٹھا لا مجھے اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ میں اب یہاں رہنا نہیں چاہتا"

"نہیں رہنا چاہتے . . . ہا ہا ہا تم یہاں نہیں رہنا چاہتے ـــــ

وہ ایک دم سے اچھل پڑا اور دو چار جھرجھریاں لیں ـــــ یہ سنکر میرے جسم میں خوشی اور مسرت کی گرم گرم لہریں دوڑ گئیں۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے دوست کہ تم یہاں رہنا نہیں چاہتے ـــــ لیکن کیوں؟ کیا تم کو یہ جگہ پسند نہیں آئی؟

"قطعاً نہیں!

"مگر جاؤ گے کہاں۔ جہاں بھی جاؤ گے یہی دنیا رہے گی ـــــ یہ کہہ کر وہ بھیو دگی سے مسکرانے لگا"

"نہیں یہ دنیا نہیں رہے گی . . . . ابے احمق یہ دنیا نہیں ہے ـــــ میں زور سے چیخا دنیا تو اس کے باہر ہے بالکل ہی باہر ایک دم سے باہر۔

یہ دنیا نہیں ہے؟ پھر یہ کیا ہے؟ اس کے باہر دنیا ہے؟ اُف یہ تو بڑے عجیب و غریب مسائل ہیں! یہ کہہ کر وہ مجھے اس طرح تکنے لگا جیسے اسے میری دماغی صحت پر شبہ ہونے لگا ہے۔

غصہ تو بڑا آیا لیکن مصلحتاً نرمی سے کام لیتے ہوئے میں نے اس سے کہا

"ہاں تجھے یقین کرو۔ یہاں سے باہر بہت ہی بڑی دنیا ہے۔ وہاں بڑا سا آسمان ہے۔ نیلا نیلا . . . . .

"نیلا۔ نیلا؟"

"سمندر ہے ہوا اور پانی ہے بڑی سی زمین ہے۔ ایک دم سے پھیلی ہوئی زمین"

"سمندر ہوا۔ پانی ایک دم سے پھیلی ہوئی زمین یہ سب کیا ہے؟ عجیب غریب! وہ بڑبڑایا۔

میں نے اس کے بڑبڑانے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ـــــ اور ہاں وہاں تو تمہاری ماں ہے تمہاری ماں۔

"ماں۔ میری ماں۔ واہ واہ یہ ماں کیا چیز ہوتی ہے"

"ماں بہت بڑی چیز ہوتی ہے ننھے ماں وہ چیز ہے پیارے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو تم بھی نہ ہوتے۔

"وہ نہ ہوتی تو میں بھی نہ ہوتا بڑا عجیب فلسفہ اور بہت ہی دلچسپ مذاق ہے"

"مذاق ارے مذاق نہیں سمجھو یہ حقیقت ہے حقیقت مذاق تو تم ہو تمہاری یہ دنیا ہے"

"اگر مذاق نہیں تو پھر یہ تمہارا واہمہ ہے اس نے سنجیدہ بنتے ہوئے۔

"آؤ بحث کر لو" والا انداز اختیار کر لیا تمہاری یہ ساری باتیں علم اور سائنس کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔

"کیا معیار ہے علم اور سائنس کا؟

علم یہ کہتا ہے ـــــ اس نے ایک دم سنتے میں بھی انٹلیکچوئل ہوں" والی شکل بنالی ـــــ ہاں علم یہ کہتا ہے۔ میں ہی سب کچھ ہوں۔ میرے بغیر کچھ بھی نہیں میں اپنے آپ ہوں اور یہ دنیا بس میرے ہی لئے ہے۔ اور مجھ ہی سے ہے۔

"باہر کوئی دنیا نہیں؟" میں نے تڑپ کر سوال کیا۔

نہیں جی کوئی دنیا نہیں ——— آسمان۔ زمین اور وہ نیلا نیلا پانی۔

سمندر ماں بس بس یہ سب واہمہ ہے۔ واہمہ سمجھے؟ علم نہیں سائنس نہیں۔ آخر کوئی ثبوت بھی ہے اس کا؟

"ثبوت مجھ سے ثبوت مانگتے ہو ارے میں تو وہاں رہ بس کر آیا ہوں اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر آیا ہوں۔

تمہارے رہنے سہنے اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سند نہیں میں تو بس اس چیز کو مانوں گا جسے اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور اپنے آپ سے چھو لوں یہ کہہ کر اس نے بڑی بدتمیزی کے ساتھ ——— "میں جیتا تم ہارے" کا لے انداز میں رخ پھیر لیا۔

اچھا ایسا ہی سہی تم بہت جلد دیکھ بھی لوگے اور چھو بھی لوگے۔

——— یہ کہہ کر میں نے بحث ختم کی اور بڑے ڈرامائی انداز میں ———

"پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی" والا اچھا خاصا مصرع بنکر دوسری طرف بیٹھ گیا۔ میرے اس طرح مصرع بنکر بیٹھ جانے والے انداز کو اس نے حقارت اور ناپسندیدگی کے ساتھ دیکھا اور بڑی لاپروائی کے ساتھ کہا ——— دیکھا جائے گا؟

اس چھوٹی سی دنیا میں کچھ دیر کے لئے سناٹا چھا گیا۔

لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میرے "پھر نہ کہنا۔۔۔۔" والے انداز پر دل ہی دل میں ڈر رہا ہے۔ کچھ دیر بے چینی سے پہلو بدلنے کے بعد اس سے رہا نہیں گیا اور قدرے خوشامدانہ انداز میں کہنے لگا۔

چھوڑو یار یہ قصہ دیکھو گرمی کی خوشگوار لہریں کتنی سرور انگیز ہیں۔ میرے جسم میں نشو و نما کی لہریں مچل رہی ہیں۔ ہماری یہ دنیا کتنی خوبصورت اور پرسکون ہے اور یہ ماحول کس قدر خواب آلود ——— میرا دل تو چاہ رہا ہے!

کیا چاہ رہا ہے دل تمہارا؟

"میرا دل گنگنانے کے لئے چاہتا ہے ایک طرب انگیز رسیلا گیت"

گیت ——— تم گیت گاؤ گے دیکھو جی میں اس کو ہرگز برداشت نہیں کر سکوں گا۔

تمہاری برداشت کا سوال نہیں اس نے ایک طرح سے چیختے ہوئے جوش میں کہا اور ایک دم سے بالکل پہلی مرتبہ کھڑا ہو گیا۔

"ارے تم تو کھڑے ہو گئے"

"ہاں ہاں میں کھڑا ہو گیا۔ دیکھو نا میں کھڑا ہو گیا اور اب تو میں ناچ بھی سکتا ہوں اس لئے دوست سوال تمہاری برداشت کا نہیں بلکہ میری خوشی کا ہے۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور بیزار نظروں سے اس کو دیکھتا رہا۔

اس نے اپنا منہ اوپر کر کے اور ناچنے کا زاویہ بناتے ہوئے گیت کا پہلا بول اٹھایا۔

میں اپنے آپ ہوں
اپنا خالق آپ
میری یہ دنیا
میری اپنی حیات

ابھی اس نے دوسرا بول اٹھایا ہی تھا کہ کچھ ایسی آواز آنے لگی جیسے کوئی موسیقی کی لے پر پیچھے سے تھاپ دے رہا ہو۔

اس پُراسرار رسیلی آواز پر وہ بڑا مدہوش ہو کر ناچنے اور گانے لگا۔

آہستہ آہستہ وہ آواز تیز ہونے لگی۔ آواز جس قدر تیز ہوتی وہ اتنی ہی تیزی سے رقص کرنے لگتا۔ میں آنکھیں پھاڑے اس منظر کو دیکھ رہا تھا ——— اور کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑی بات ہونے والی ہو۔ کوئی اچانک پیش آنیوالا واقعہ۔۔۔۔۔

آواز اور زیادہ تیز ہو گئی میرے کان بجنے لگے اور وہ اس قدر تیزی سے ناچنے لگا کہ اس کے جسم پر نگاہ کا ٹھیرنا ناممکن تھا بس چند خطوط اور دائرے تھے جو تیزی سے گردش کر رہے تھے۔

کیا ہونے والا ہے؟ میں گھبرا کر بے ساختہ چیخ پڑا اور عین اس وقت ایک بہت بڑا گلوب چکر کھاتا ہوا میرے سر پر آ پڑا اور چٹاخ سے ٹوٹ گیا۔ گرم گرم لاوے کا ایک سیلاب اس میں سے نکل پڑا اور میں اس میں تنکے کی طرح بہہ گیا۔

ہا ہا ہا۔ ہو ہو ہو، ہی ہی ہی ——— عجیب غریب آوازیں آنے لگیں میں نے ہڑبڑا کر ہاتھ پیر مارے اور بڑی کوشش کے ساتھ اپنا سر اوپر اٹھایا۔

میری بیوی بُری طرح ہنس رہی تھی ——— کیا ہوا؟

ہو ہو ہو کیسے ڈر گئے۔ ذرا اپنا چہرہ تو دیکھئے ———

ہنسی کے مارے اس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا غلیظ سی ریزش ہاتھ کو لگ گئی۔

انڈا ہا ہا ہا۔ انڈا جی چڑیا کا انڈا ہو ہو ہو وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے پیٹ کو تھامتے ہوئے بولی۔

چڑیا کا انڈا ——— ؟ میں نے جو سنبھل کر دیکھا تو میری گود میں ایک چھوٹا سا چڑیا کا انڈا ٹوٹا پڑا تھا اور چڑیا اوپر کارنس پر چڑ چڑ کرتے ہوئے پھر پھرا رہی تھی۔

گھنٹہ بھر سے اٹھا رہی ہوں اٹھتے ہی نہیں۔ اب کیسے اٹھے ——— میری بیوی نے ایک دم سے تنک کر کہا بس سوتے پڑے رہتے ہیں نہ خدا کا خوف نہ آخرت کا خیال بڑی غفلت کی نیند سوتے ہو جی۔

اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ لحاف کھینچا اور "ہم کو تو بڑا غصہ آرہا ہے" والی جھلک اس کے چہرہ پر تمتما گئی ——— سویرے کی نرم نرم کرنوں میں اس کے قدرے جھکے ہوئے سراپا کو میں نے کچھ اس طرح دیکھا جیسے مجھے کوئی گمشدہ حقیقت اچانک مل گئی ہو ——— ایک تمتماتی ہوئی نکھری ہوئی حقیقت جو عرصے میرے سامنے تھی لیکن جسے میں ہٹ دھرمی سے نظر انداز کر رہا تھا۔

دم معلوم میں اور کیا سوچتا کہ چڑیا چڑ چڑ کرتی ہوئی میز پر رکھے ہوئے دینا کے گلوب پر بیٹھی اور وہ گر پڑا۔

پیچ کہتی ہو شمو! میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔ میں بڑی غفلت کی نیند سوتا رہا حالانکہ یہ انڈا کسی نہ کسی دن ٹوٹ جائے گا اور پھر شمو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں رہے گی۔

یہ انڈا ٹوٹ جائے گا!!! ——— شمو کے ہاتھ سے لحاف گر گیا اور وہ کچھ شرما کر ہانپتی ہوئی پائینتی پر بیٹھ گئی اس کی نظریں اپنی گود میں گڑ گئیں اور پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں ——— تم بڑے خراب آدمی ہو جی کیسی بدفالی گرتے ہو۔ خدا نہ کرے ایسا ہو! اوہ شمو یہ بات نہیں تم نے بھی کیا سمجھ لیا میں تمہارے متعلق نہیں کہہ رہا تھا۔ خدا تمہاری آرزو پوری کرے۔

پھر کونسا انڈا؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟

یہ انڈا شمو یہ ——— میں نے فرش پر گرے ہوئے گلوب کی طرف اشارہ کیا ——— ہاں شمو یہ انڈا ایک دن ٹوٹ جائے گا اور معلوم ہے پھر کیا ہوگا۔

کیا؟ وہ بڑے اشتیاق کے ساتھ پوچھ بیٹھی

وہی جس سے تم مجھے ہمیشہ ڈراتی رہتی تھیں اور جس کو میں نے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ آخر کیا؟

اس نے بے صبری کے ساتھ اصرار کیا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ میں اس بات سے مکر نہ جاؤں۔

ہم ایک دوسری دنیا میں پیدا ہو جائیں گے شمو۔ جو ہماری اس دنیا سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ وسیع ہوگی۔

شمو نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور بڑی متانت کے ساتھ میز کے قریب گئی۔

نیچے گرے ہوئے گلوب کو پیر کے انگوٹھے سے ایک ٹھوکا سا دیا اور جب گلوب اپنے اسٹینڈ پر گھومنے لگا تو کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر اسے اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔

کیا مطلب؟ میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ قدرے گھوم کر میری طرف کچھ اس طرح دیکھا ——— جیسے کسی خطرہ سے اچانک بیچ جانے پر ماں اپنے بچہ کی طرف پیار بھری تہدید آمیز نظر سے دیکھتی ہے۔

شمو کی اس نگاہ کو میں نے اپنے دل میں سنبھال رکھا ہے اور وہ نگاہ مجھے ہر ایسے وقت ٹوک دیتی ہے۔ جب میں چلتے چلتے بہکنے لگتا ہوں۔

بھوک

اب اُس گھر کا چراغ گُل ہو چکا تھا . . . .
راموں کی ہائے ہائے ختم ہو چکی تھی . . . .
ماں کی آنکھوں سے آنسو بہنے بند ہو چکے تھے . . . .
تین زندگیاں ختم ہو چکی تھیں . . . . .

صفحہ ۵۵ سے آگے

رات کی سائیں سائیں اُن پر ماتم کر رہی تھی . . . .
غُربت اور بے بسی اُن پر ہنس رہی تھی
. . . . اور دُنیا ابھی گہری نیند سوئی پڑی تھی . . . .

مقبت الحسن رضوی

اے کاش

میں بھی اس قافلہ کے ساتھ ہولیا۔ ہمارا قافلہ جگمگاتے ہوئے حسین تاروں کی چھاؤں میں رات بھر سفر کرتا رہا۔ اور آخر اس وقت جب آسمان پر تاروں کے کارواں نے اپنا رخت سفر باندھا ہمارے قافلہ نے اپنا رخت سفر کھول دیا۔ اب ہم ایک خوبصورت سے شہر کے کنارے اپنے خیمے اور ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ آفتاب طلوع ہو چکا تھا اور اس کی کرنیں لمحہ بہ لمحہ تیز تر ہوتی چلی جارہی تھی۔ رات بھر سفر کرنے کی وجہ سے میں بہت تھک گیا تھا اس لئے اس وقت شہر جانا مناسب نہ سمجھا اور اپنے خادم کو ضروری ہدایات دیکر خیمے میں پڑ رہا۔

..... میں سو رہا تھا کہ یک بیک میرے کانوں میں کچھ شور و غل کی آواز سنائی دی اور میں بیدار ہو گیا۔ تحقیقات کے لئے جب خیمہ سے باہر آیا تو دیکھا کہ قافلہ والے ایک جگہ جمع ہیں اور شور مچا ہوا ہے۔

"کیا بات ہے"؟ میں نے ایک شخص سے پوچھا جو تیزی سے مجمع کی طرف بھاگا جارہا تھا۔

"قافلہ میں کہیں سے کچھ اونٹ بھٹک کر آ گئے ہیں" اس نے چلتے چلتے جواب دیا۔

شوق تجسس نے مجھے بھی دریافت حال پر مجبور کیا اور میں بھی ہجوم کی طرف چل پڑا۔ معلوم ہوا کہ یہ اونٹ شہر کی جانب سے بھٹکتے ہوئے اس طرف آ گئے ہیں۔ جب یہ قافلہ میں پہونچے تو یہاں کے اونٹوں نے انہیں اجنبی پاکر تنگ کرنا شروع کیا۔ قافلہ والوں نے انھیں جدا کرنے کی کوشش کی اور اس طرح ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ——— یہ ہنگامہ ابھی جاری تھا کہ یکایک ایک شخص ہجوم کو چیرتا ہوا اونٹوں تک پہونچا۔ یہ نووارد ایک سن رسیدہ انسان تھا جس کے سارے کپڑے گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے اور جس کے جھریاں پڑے ہوئے چہرے کو اس گرم ملک کی خشک ریز ہواؤں نے جھلسا دیا تھا۔ یہ ضعیف انسان ہمارے درمیان ایک اجنبی تھا ——— بالکل اجنبی ——— لیکن میں یہ دیکھکر حیران رہ گیا کہ اس کے آتے ہی یہ ہنگامہ خیز مجمع کچھ اس طرح خاموش اور مرعوب ہو گیا جیسے یہ ان تمام کھڑے ہوئے لوگوں سے زیادہ بلند اور باوقار ہو۔

"یہ سرکاری اونٹ ہیں بھائی۔ میری کوتاہی نے انہیں بھٹکا دیا ہے" اس نے کہا۔ اس کی آواز میں بڑی نرمی تھی اور چہرے سے کوتاہی فرض کا احساس نمایاں۔ لوگوں نے اس کے اونٹ واپس کر دیئے۔ اور وہ ان کی دعا تھامے خاموشی سے لوٹ گیا۔

(۲)

شام ہو رہی تھی۔ دن بھر کا تھکا ماندہ سورج اپنی لٹی ہوئی کرنوں کا سچا کھچا سرمایہ اپنے دامن میں چھپائے سواد مغرب کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا اور ڈھلتا ہوا دن ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنے چہرے کی ساری آب و تاب کھو کر اہل دنیا کی نگاہوں سے بچتے ہوئے ان کی محض سے دبے پاؤں رخصت ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے خادم کو بلایا اور اسے خیمہ کی حفاظت پر چھوڑ کر خود شہر کی جانب چل پڑا۔ شہر میں خوب چہل پہل تھی۔ طرح طرح کے لوگ اور طرح طرح کے چہرے ان چہروں میں میں نے اس چہرے کو تلاش کرنا شروع کیا جو اسلامانی دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں اونٹوں کو تلاش کرتا ہوا ہمارے قافلہ میں آیا تھا۔ میں متعدد تنگ و تاریک گلیوں اور چوڑے چوڑے خوشنما بازاروں سے گزرا۔ لیکن وہ شخص مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ آخر کچھ خرید و فروخت کے بعد میں تقریباً رات کے دس بجے اپنے قافلہ میں واپس آ گیا۔ قافلہ والے کچھ سو گئے تھے اور کچھ جاگ رہے تھے۔ میں نے رات کا کھانا کھایا اور چہل قدمی کی غرض سے خیمہ سے باہر آ گیا۔ میرے خیمہ کے پاس ہی ایک بڑھیا کا بھی خیمہ تھا۔ جس میں سے دو نو عمر بچوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے بڑھیا ان بچوں کو تسلی دینے کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے آدمی سے گفتگو بھی کر رہی ہے۔ میں خیمہ کے پاس سے گذرا تو سنا بڑھیا کہہ رہی تھی۔

"اس ہنڈیا میں کچھ تو نہیں محض تھوڑا سا پانی ہے اور تھپکے ہنڈ ٹکڑے جو ان بچوں کے بہلانے کو میں نے ہنڈیا میں ڈال رکھے ہیں"۔

"اُف — ! میرے خدا" اس شخص کی زبان سے نکلا — میں نے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ وہی شخص تھا جو اونٹوں کی تلاش میں اس وقت جب سورج نصف النہار پر تھا حیران و پریشان ہمارے قافلہ میں آیا تھا۔ اس کی باتیں سننے کے لئے میں کھڑا ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا "اچھا ماں ذرا اور صبر کرو۔ میں ابھی آیا" اور ان لفظوں کے ساتھ وہ خیمہ سے باہر نکل آیا اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں اس بار اسے دیکھکر بڑا ہی متعجب ہوا اور جی چاہا کہ اس کا پیچھا کروں۔ پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔ لیکن اس مرتبہ میں نے خود کو اس سے کچھ مرعوب پایا اور مجھے محسوس ہوا جیسے یہ کوئی معمولی شخصیت کا انسان نہیں۔ بہرحال میں بڑی بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

کوئی گھنٹہ بھر گذرا ہوگا کہ میں نے کچھ قدموں کی چاپ سنی۔ شاید وہ واپس آ رہا تھا میں نے جلدی سے خود کو ایک خیمے کی آڑ میں پوشیدہ کر لیا۔ وہ اب بڑھیا کے خیمہ تک پہونچ چکا تھا۔ لیکن اس بار وہ تنہا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ نووارد کے ہاتھ میں ایک برتن تھا اور اس شخص کی پیٹھ پر ایک بڑا سا بوجھ۔ وہ جب خیمہ میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اس نے ان روتے ہوئے بچوں کو پیار کیا جو بھوک سے بلک رہے تھے۔ پھر چولھا پھونک کر آٹا گوندھا اور روٹیاں پکانی شروع کیں۔ تھوڑی دیر میں اس نے کئی ایک روٹیاں پکالیں اور بچوں کو اس پیار اور شفقت سے کھلایا جیسے مائیں کھلایا کرتی ہیں۔ بڑھیا اسے لاکھ لاکھ دعائیں دے رہی تھی۔ "خدا کرے تو اس سرزمین کا بادشاہ ہو جائے" اور شکم سیر و آسودہ بچے جن کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت آنکھیں خوشی سے چمک اٹھی تھیں مسکرا مسکرا کر کہہ رہے تھے۔

"دادی اماں یہ کون ہیں"؟

"میں تمہارا خادم ہوں میرے بچے" اس نے کہا اور بڑھیا سے رخصت ہو کر خیمہ سے باہر نکل آیا۔ صبر کا دامن اب میرے ہاتھوں سے چھوٹ چکا تھا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا اور آگے بڑھکر اسے روکتے ہوئے پوچھا "اجنبی تم کون ہو؟ میں نے تمہیں دوپہر کو بھی اپنے قافلہ میں دیکھا ہے"

اس نے جواب دینے سے تامل کیا تو اس کے ساتھی نے بڑے ادب سے کہا۔

"آپ اس سرزمین کے حکمراں ہیں"

"ایں" میرے منہ سے نکلا اور میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر پوچھا "اور تم کون ہو"؟

"آپ کا غلام" اس نے جواب دیا۔ میری حیرانی کی حد نہ رہی اور میں بت بنا کھڑا رہ گیا۔ حیرانی اور خوف کے ملے جلے جذبات نے میری عجیب حالت کر دی تھی۔ بولنا چاہتا تھا لیکن الفاظ گلے میں پھنس جاتے تھے۔ اس شخص نے میری کیفیت بھانپ لی اور کہا۔

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے حکمراں تو اپنی رعایا کا خادم ہوا ہی کرتا ہے۔ اور یہ میں نے جو کچھ کیا وہ تو میرا فرض تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اُن لوگوں کے سامنے کس منہ سے اُن کے مجمع میں جاتا جنہوں نے مجھپر اعتماد کر کے مجھے اپنے خون اور مال کا مالک بنا دیا ہے، اور پھر حشر کے روز خدا کو کیا جواب دیتا جس کو گواہ کر کے میں نے حلف وفاداری اٹھایا تھا"

وہ خاموش ہو گیا۔ میں بھی سر جھکائے کھڑا خاموش تھا۔ زمین و آسمان سب خاموش تھے جیسے اس رہنما کی باتوں پر غور کر رہے ہوں۔

"یہ انسان ہے یا فرشتہ" میرے اندر سے ایک آواز آئی

"بظاہر تو ایک انسان ہی ہے لیکن اس کے اندر فرشتوں کی روح کھیل رہی ہے" دوسری نے جواب دیا۔

(۳)

میری آنکھ کھل گئی باہر سڑک پر ایک ہنگامہ برپا تھا میں نے جنگلہ سے دیکھا کہ ملک کا ایک بڑا رہنما ایک عالی شان جلوس کے جلو میں بینڈ باجوں، فوج کے شاہی دستوں، وزرائے سلطنت و اعیان دولت اور دوسرے اکابر مملکت کے ہمراہ ایک نہایت ہی عمدہ فٹن پر سوار جو رنگ برنگ کے سفید و سیاہ، سرخ و سبز اور زرد و بنفشی پھولوں سے لدی ہوئی تھی سڑک سے گذر رہا تھا اور اس صاف اور چمکیلی سڑک کے دونوں کناروں پر سادہ لوح عوام کا ایک اژدہام اشتیاق دید میں آنکھیں پھاڑے اپنے اس "دردمند لیڈر" اور "محبوب رہنما" کو دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر گرا پڑتا تھا۔ میں یہ منظر دیکھکر حیران رہ گیا۔ اور میرا دماغ ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ میں نے یکایک دیکھا کہ کئی ایک لال پگڑیاں ایک دم سے حرکت میں آ گئیں اور عظیم الشان جلوس رک گیا۔ میں اٹھ بیٹھا اور اس منظر پر آنکھیں جما دیں میں نے دیکھا کہ کئی ایک لال پگڑیوں نے ایک نیم عریاں، نحیف اور لاغر شخص کو گھیر لیا جو سڑک کے اس پار سے اس پار جانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے درمیان ہی میں چکر اکر گر پڑا تھا، اور اسے گھسیٹ کر گالیاں دیتے ہوئے سڑک کے اس پار اس طرح پھینک آئے جیسے کوئی گندی اور غلیظ چیز پھینک دیا کرتا ہے۔ پھر بینڈ بجا اور "عزت مآب لیڈر" کی گدی دار اور پھولوں سے لدی ہوئی فٹن چوڑی چکلی

(ملاحظہ فرمایئے صفحہ ۵۲)

اقبال احمد انصاری

مُلّا

اتوار کی سہ پہر کو وہ تنہا بیٹھا تھا۔ پورا ہفتہ دفتر میں گھس گھس کرنے کے بعد ایک روز چھٹی ملتی ہے۔ وہ شدت کے ساتھ کسی تفریح کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ بغیر کسی تفریح کے کوئی انسان کیسے زندہ رہ سکتا ہے" "تفریح کیلئے کہاں چلا جائے" وہ سوچنے لگا۔ اور بہت سر مارنے کے بعد بھی جب اس کو تفریح کا کوئی معقول ذریعہ نظر نہ آیا تو وہ بری طرح جھنجھلا اٹھا۔ "آخر یہ بھی کوئی شہر ہے جہاں نہ کوئی معقول قسم کا کلب نہ پارک نہ دلچسپی کا کوئی اور ہی سامان شہر کے لوگوں کی بدذوقی کی بھی انتہا ہو گئی ہے" شہر کی حد سے بڑھکر ملک اور پھر ساری مشرقی دنیا پر اس کو جھنجھلاہٹ محسوس ہونے لگی۔ مغرب کا ایک پُرکیف تخیل اس کے ذہن میں ابھرنے لگا جہاں ہر قسم کی دلچسپی اور تفریح کے ذرائع موجود ہیں۔ جن سے ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق تسکین حاصل کر سکتا ہے۔ اس کی نگاہیں سامنے میز پر پڑے ہوئے اخبار پر رینگنے لگیں اور سینما کے اشتہارات کے کالم پر جاکر رک گئیں۔ موٹے موٹے خوشنما حروف میں "داغ" لکھا دیکھکر وہ اچھل پڑا پھر تفصیل غور سے پڑھنے لگا۔ ایک شو ۳ بجے سے شروع ہونے والا تھا۔ اس نے تھیٹر میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور جانے کے لئے تیاری میں مشغول ہو گیا۔۔۔

شام کو جب فلم دیکھکر واپس آیا تو بیوی سے کسی بات پر تُو تُو مَیں۔ مَیں ہو گئی جس سے اس کی طبیعت بہت مکدر ہوئی۔ جب غصہ ذرا دھیما ہوا تو بار بار اس کے ذہن میں یہ بات آتی رہی کہ فلم دیکھنے نہ جاتا تو ہی اچھا ہوتا" میری بیوی بھی کس قدر تنگ دل اور بخیل ہے اسے یہ برداشت نہیں کہ میں سینما میں ڈیڑھ دو روپے صرف کروں۔ بات تو دراصل یہی تھی۔ اور دوسری چیز کی آڑ لیکر وہ مجھ سے لوٹ لیتی" وہ سوچنے لگا "میں فلم دیکھنے نہ جاتا تو کیا کرتا۔ لے دے کر بھلا یا بُرا یہی تفریح کا ایک سامان ہے اگر اسے بھی اپنے لئے حرام کر لوں تو زندگی بالکل اجیرن ہو جائے"

دوسرے دن دفتر میں جب اس نے لکھنے کے لئے جیب سے قلم نکالا۔ تو اسے یاد آیا کہ اس کا قلم خراب ہو چکا تھا اور ایک نیا قلم خریدنا تھا۔ اس نے اسی سے لکھنے کی بہت کوشش کی لیکن قلم بالکل نہیں چل رہا تھا۔ پریشان ہو کر اس نے چندرا کی دوکان سے ساڑھے تین روپئے والا قلم خریدنے کا مصمم ارادہ کیا۔ لیکن جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں صرف دس روپئے رہ گئے تھے۔ اور ابھی تنخواہ ملنے میں کئی دن باقی تھے۔ اسی وقت سینما کا خیال پھر اس کے ذہن میں آگیا۔ اور اسے ڈیڑھ روپئے مفت میں خرچ کر دینے پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ اگر میں نے فلم نہ دیکھی ہوتی تو آج قلم خرید لیتا۔ ابھی سگریٹ والے کا بھی حساب دینا ہے۔۔۔ وہ روز تقاضہ کرتا ہے۔ میں اس سے ہفتوں سے کل کہکر ٹالتا رہا ہوں۔ آف یہ سگریٹ بھی وبالِ جان ہو گئی ہے۔ کیسا ایسا ممکن نہیں کہ میں سگریٹ پینا بھی ترک کر دوں۔ اس طرح مہینہ کے ضروری اخراجات میں جو دقت ہوتی ہے اس میں کچھ تو سہولت ہو جائے گی"

دفتر میں میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا وہ انہیں خیالات میں محو تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے تخیل میں استغراق بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ غور کرنے لگا "یہ سب روپیہ جو میں ہر ہفتہ سینما دیکھنے میں صرف کرتا ہوں وہ جاتا کہاں ہے؟ میری جیب سے بکنگ آفس وہاں سے منیجر کے پاس۔ منیجر سے فلم کمپنی اور وہاں سے ڈائریکٹر اور ایکٹرس اور ایکٹر پلیسنر کی جیب میں۔۔۔۔" اسی وقت اسے یاد آیا کہ اس نے سنا تھا کہ ایک فلم اسٹار ایک فلم میں کام کرنے کے لئے ایک ایک لاکھ روپیہ لیتی ہے۔ "وہ یہ تمام روپیہ کیا کرتی ہیں۔۔۔۔ بلاشبہ ریس کورس، تاج ہوٹل اور شراب میں تمام روپیہ صرف ہوتا ہے۔۔۔۔ آف! میرے اور مجھ جیسے ملک کے کروڑوں انسانوں کی جیب سے روپیہ سمٹ سمٹا کر ریس کورس، تاج ہوٹل اور شراب میں صرف ہوتا ہے۔۔۔ فلم ریلوں کی تیاری کے لئے کافی روپیہ پانی کی طرح بہا دیا جاتا ہے۔ اسی لئے امریکہ سرمایہ دار بن گیا ہے۔۔۔ یہ تخیل اسی طرح زینہ بہ زینہ کرتے معلوم نہیں اسے کس مقام پر لے جاتا۔ لیکن اس نے گھبرا کر خیالات کے اس تانے بانے کو کمسوٹ پھینکا "میں سینما اب کبھی نہیں دیکھوں گا اور ملک کے تمام سینما دیکھنے والے جو میری طرح تنگدست ہیں ان سے بھی کہوں گا کہ سینما نہ دیکھیں" اس نے خیالات کا سلسلہ منقطع کر کے میز کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایک طرف اس کی نظر ایک کتاب

"سرمایہ دار ہمارا دشمن ہے" پڑھی۔ اور دوسرے ہی لمحہ ایک انگریزی رسالہ کے صفحۂ آخر پر یہ حروف لکھے نظر آئے۔ کیپٹن ( ) سگریٹ آپ کو تازگی اور فرحت بخشتی ہے"۔ اس وقت اس کی قوتِ فکر بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ غور کرنے لگا "کوئی شخص یا ملک سرمایہ دار بن کیسے جاتا ہے؟" کیا سگریٹ واقعی فرحت تازگی بخشتی ہے"۔ . . . یہ کمبخت میری ضروریاتِ زندگی میں کس طرح داخل ہوئی جبکہ قلیل تنخواہ دال روٹی کے لئے بھی کافی نہیں ہوتی!۔ . . . ان فضولیات کا تو دروازہ ہی استہتارات ہیں۔ . . . . بالکل ٹھیک! سرمایہ دار ہر ممکن ذرائع سے اپنی ضروری و غیر ضروری، اچھی اور بُری ہر پیداوار کو ہمارے سامنے دلچسپ طریقوں سے لاتا ہے اور ہم بیوقوف انسان اپنی جدّت پسندی کی رَو میں آنکھ مُدھند اس کی ہر پیداوار کو اپنی ضروریاتِ زندگی میں شامل کر لیتے ہیں۔ وہ سرمایہ دار بنتا چلا جاتا ہے۔ اور ہم مفلس تر ہوتے جاتے ہیں۔ . . . ہاں ہاں بالکل ٹھیک وہ اسی طرح سرمایہ دار بنتا جاتا ہے۔ اسی لئے میں سگریٹ بھی نہیں پیوں گا۔ . . .

وہ دفتر میں کام کرتے ہوئے دوسرے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا اور اس کی نظر سامنے کچھ دور پر بیٹھے ہوئے مشتاعت احمد پر پڑی جسے وہ ہمیشہ "ملّا" سمجھتا تھا لیکن اس لمحہ وہ اس پر رشک کر رہا تھا کیونکہ مشتاعت احمد نہ تو سگریٹ پیتا تھا اور نہ سینما دیکھتا تھا۔

اُس دن شام کو دفتر سے واپس ہوتے ہوئے اس نے سگریٹ نہیں خریدی۔ اگلے اتوار کو ناشتہ کے بعد حامد کو ایک دوست کا رقعہ ملا جس میں اس نے فلم "یونک" دیکھنے کے لئے بیگم کے ساتھ اسے مدعو کیا تھا۔ رقعہ کے ساتھ دو پاس بھی تھے۔ رقعہ پڑھکر اس نے بید لی سے رکھ دیا۔ جب محمودہ نے اسے پڑھا تو بہت خوشی ہوئی۔ وہ جلدی سے کپڑوں کے لئے اپنا بکس دیکھنے گئی لیکن اس میں کوئی اچھے قسم کا سُوٹ موجود نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس کے سنگار کے سامان میں روژ اور لپ اسٹک ختم ہو چکے تھے۔ وہ اس فکر میں پڑ گئی کہ ان سب چیزوں کا انتظام کہاں سے ہو۔ آخر یہ فیصلہ کیا کہ صندوق کے حامد سے مانگا پٹے۔ اپنے خیال میں مگن کمرے کے دروازہ تک پہنچی ہی تھی کہ خیال آیا کہ اس کے پاس کوئی نئے فیشن کا زیور بھی تو نہیں۔ اچھے کپڑوں میں طبوس اور سنگار کے باوجود بغیر کسی زیور کے وہ کیسی بھونڈی نظر آئے گی!۔ . . .

حامد آرام کرسی پر دراز کسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول تھا۔ محمودہ وہاں پہنچی اور کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔ حامد نے ایک جماہی لی اور کتاب میز پر رکھ دی۔

"آج اس وقت اتنی خوش کیوں نظر آ رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔ "خوش کیا ہوں گی خاک! نہ میرے پاس اچھے کپڑے ہیں نہ کوئی زیور ہے اور نہ سنگار کا سامان۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اسی طرح فلم شو میں چلی چلوں گی اور سوسائٹی میں تمام عورتوں اور مردوں کے مضحکوں کا نشانہ نہ بنوں گی؟ اگر تم مجھے آج فلم شو میں لے جانا چاہتے ہو تو ابھی ان سب چیزوں کا انتظام کرو۔ ایک فیروزی رنگ کے ریشمی سوٹ پر ایک نکلس خوب جچے گا۔ . . . اگر خریدا نہیں جا سکتا تو کرایہ پر سب سامان مل سکتا ہے" حامد گونگا بنا اس کی باتوں کو سنتا رہا۔ پھر بہت اطمینان سے کہا "اُف اوہ! انہیں اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔ فلم شو میں جانا ہی کون چاہتا ہے"۔

"تنہا تو آپ ہر اتوار کو دیکھتے تھے آج جو مجھے بھی ساتھ لے چلنے کا موقع آیا تو مخرے کرنے لگے"۔ محمودہ نے تلملا کر کہا "نہیں۔ میں نے نہ دیکھنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے۔ کیا تمہیں یہ سُنکر خوشی نہیں ہوئی؟ اور میں نے سگریٹ بھی چھوڑ دی۔ تمہاری نصیحتوں کا بھی اس میں حصہ ہے۔ ہم سینما دیکھنا چھوڑ دیں تو کتنے پیسے بچا کریں گے۔ کتنے فضول خرچ ہو گئے ہیں ہم"۔ اس نے محمودہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اور پھر سوال آج ایک دن کا نہیں بلکہ عادت کا ہے۔ کسی بری بات کو ایک بار کرنا آئندہ دس بار کرنے کا مقدمہ بن جاتا ہے اور جی کڑا کر کے ایک بار چھوڑ دینا آئندہ اس کے ترک پر جمے رہنے کی ضمانت ہوتا ہے"۔ محمودہ کے چہرہ کا رنگ اتر گیا وہ شوہر کے اس اقدام سے مسرور ہونا چاہتی تھی لیکن آج کی خوشیوں اور امنگوں کو یکسر ختم ہوتے دیکھکر اس کی طبیعت مضمحل ہو رہی تھی۔ کفایت شعاری پر تو کتنے وعظ اس نے خود کہے تھے لیکن اسے سینما کا جگمگاتا ہوا ہال دکھائی دینے لگا۔ وہ اس میں فیروزی سوٹ پر سنہری نکلس پہنے حامد کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے داخل ہو رہی تھی" لیکن اس ملّائیت کو آج ہی زور کرنا تھا۔ چلو آج ضرور چلو" اس نے تحکم اور ناز دونوں کا پورا زور صرف کرتے ہوئے حامد کے اوپر جھکتے ہوئے کہا۔ لیکن حامد کی مسکراہٹ کے پیچھے غیر مصالحانہ عزم کام کر رہا تھا "میں دو دن سے سگریٹ نہیں پی رہا ہوں تم ایک شو سینما بھی قربان کر دو۔ میری رفیقۂ حیات!"

اس کی آواز بھرا گئی۔ نسائی انفعالیت نے بنا دلی عزم کے تار و پود بکھیر دیئے۔ محمودہ کے چہرہ پر نرمی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ پھر بھی اسے بہت شاق گذرا۔ "دیکھنا ہے کب تک قائم رہتی ہے یہ ملّائیت" وہ آخری تیر چلا کر کمرہ سے نکل گئی۔

"ملّائیت" ——— حامد کے چہرہ پر شکن آ گئی۔ کوئی سُن تو نہیں رہا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "ملّائیت" جیسے کسی نے اُسے گالی دیدی ہو۔ لیکن یہ لفظ محمودہ نے کیوں استعمال کیا۔ کیا کفایت شعاری ملّائیت ہے۔ کیا

سگریٹ اور سینما چھوڑ دینا ملائیت ہے۔" وہ سوچنے لگا شفاعت کو بھی تو اسی لئے لوگ ملا کہتے تھے۔ آخر وہ کس بات میں دوسروں سے کم تھا۔ بلکہ کس بات میں اور لوگ اس کے برابر تھے۔ دفتر کے کام کے سلسلہ میں زحمتیں لوگ اسی سے تو دور کرتے تھے۔ کتنا قابل اور کتنا شریف ـــــ پھر بھی وہ ملا تھا اس لئے کہ وہ سینما نہیں دیکھتا تھا۔"

"تو پھر مجھے بھی لوگ ملا کہیں گے۔ کل شام دفتر سے چلتے وقت جب میں نے کلیم کی دعوت سینما رد کی تو اس نے کہا اور آج بیگم نے بھی یہی لقب عطا فرمایا۔" اور اس کا جی ننگی محسوس کرنے لگا جیسے اس کا پسینہ سکڑا جا رہا ہو۔ ملا۔"

"بیگم چار کے لئے بلا رہی ہیں" خادمہ کی آواز سے اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ اٹھا اور کمرے میں داخل ہوا۔ محمود کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کچھ بدل چکی تھی۔ ندامت۔ نرمی اور بشاشت کتنا حسین امتزاج تھا۔ اس نے چار پیتے ہوئے پھر محمودہ کی طرف دیکھا۔ آنکھیں چار ہوئیں۔ جو بات محمودہ زبان سے نہ کہہ سکی وہ آنکھیں کہہ گئیں۔ برائی راسخ نہ ہو گئی ہو تو فطرت بہت جلد اصلاح کر لیتی ہے۔ حامد کے سر سے بڑا بوجھ ہلکا ہوا۔ اب اس کی طبیعت بشاش تھی۔ کلیم بھی کب تک ملا کہے گا! اس نے چائے کی دوسری پیالی اٹھائے ہوئے سوچا۔

(صفحہ ۴۹ سے آگے)

صاف اور چمکدار سڑک پر محو خرام ناز ہوئی۔ میں گھبرا سا گیا۔ اور خدا جانے کیوں یک بیک اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر کہہ نہیں پا رہا ہوں ـــــ کہ میرے اندر سے ایک آواز بولی "یہ رہنما ہے یا رہزن؟"

"بظاہر تو ایک رہنما ہے لیکن اس کے اندر رہزنوں کی روح رقص کر رہی ہے۔" دوسری نے جواب دیا۔ میری آنکھیں پرنم ہو گئیں اور میں نے سوچا۔ کاش کہ میں بیدار ہی نہ ہوتا اور اگر بیدار ہی ہونا تھا تو اس وقت بیدار ہوتا جب یہ دنیا اپنی ساری زہرناکیوں اور فتنہ سامانیوں کے ساتھ ہلاک ہو چکی ہوتی اور اس کی خاک سے ایک ایسی دنیا پیدا ہوتی جس کے رہنما صحیح معنوں میں رہنما ہوتے اور صحیح معنوں میں ایک ایسا درد مند دل رکھتے جو عوام کے معمولی سے معمولی دکھ درد پر بھی تڑپ اٹھتا۔ اے کاش کہ انہیں انسانوں میں کوئی ایسا انسان پیدا ہوتا جو ان لوگوں کی صحیح راہنمائی کرتا اور جو دیکھنے میں تو بظاہر ایک معمولی انسان ہی معلوم ہوتا۔ لیکن جس کے اندر فرشتوں کی روح کھیل رہی ہوتی۔

بلدیو راج شرما

بھوک

. . . ٹن . . . ٹن . . . ٹن . . . .

. . . . . رات کے بارہ بج رہے تھے

ساری دُنیا نیند کی آغوش میں تھی . . . سوائے اُن لوگوں کے جنہوں نے پیٹ کی خاطر اپنے جسم کو دالیں دینے . . . رات کی میٹھی میٹھی نیند چھوڑ کر دوسروں کی تجوریوں کی حفاظت کرنے . . . شرم و حیا سے کپکپ پتھریلی دیواروں کے پیچھے دوسروں کے وصل کا سامان بننے کے لئے مجبور کر رکھا تھا۔

شہر کی اُونچی اُونچی دیواروں والے محلوں سے دُور . . . بڑی بڑی . . . . پکی پکی سڑکوں سے دُور . . . بجلیوں کی چمک سے دُور . . . . . ایک اندھیرے محلّے میں جہاں سارے گھروں کے چراغ بجھ چکے تھے ایک جھونپڑی میں ایک چراغ اب بھی ٹمٹما رہا تھا . . گھر کے افراد اب بھی جاگ رہے تھے . . . . ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر پھٹے پرانے چیتھڑوں میں لپٹا ایک بیمار نوجوان پڑا تھا . . . نیچے ایک پرانے ٹاٹ پر اس کی ماں . . . اپنے بیمار بیٹے کیلئے آنسو بہا رہی تھی . . . اُس کی بیوی اپنے منہ کو اپنے پارچہ دامن کے پلّے کیلئے سسکتے میں چھپا کر رو رہی تھی۔

. . . . بچے بھوک سے بلبلا کر ابھی سوئے ہی تھے . . . . .

اچانک بیمار درد سے کراہ اٹھا . . . . . ہائے!

. . . . اور ہائے ماں کا کلیجہ چیر گئی

اور بیوی کا سینہ چھید گئی

ماں کا ہاتھ بیٹے کے ہاتھ میں دب گیا

اور بیوی کا آنسوؤں سے گیلا کھڑا اپنے خاوند کے منہ سے چھٹ گیا۔

. . . . اور بچے تڑپ اُٹھے!

ننھی مُنّوں نے پھر رونا شروع کر دیا . . . . وہ اپنے بیمار باپ کے لئے نہیں رو رہی تھی . . . اُسے اپنے باپ کی بیماری کی کوئی خبر نہ تھی . . . . اُس کے آنسوؤں سے باپ کی ہمدردی نہیں بھوک کی تصویر نظر آ رہی تھی . . . . . وہ رو رہی تھی . . . روٹی کے صرف ایک ٹکڑے کی خاطر!

. . . . اور چھوٹا منّا اُسکے مُنہ کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا . . . . .

. . . . شاید اُسے اب بھوک نہیں تھی . . . . .

. . . . اور شاید وہ اپنی ماں کے سُوکھے ہوئے پستانوں سے کچھ دودھ حاصل کر چکا تھا۔

بوڑھی ماں اپنے بیٹے کی تکلیف برداشت نہ کر سکی اور وہ ہسپتال کی طرف بھاگی

. . . . دروازے کی دہلیز سے اُس کا پاؤں ٹکرایا

. . . . ہڈیوں کے زندہ ڈھانچے سے سردی کی چوٹ نہ سہی گئی

. . . . اور وہ گر پڑی

اب وہ دُنیا کی سب مصیبتوں سے بے خبر تھی . . . .

سنبھل گئی . . . ماں کو اسی طرح دہلیز پر گرا ہوا چھوڑ کر . . . . اُسے اپنے مانگ کے سیندور کی حفاظت کی ضرورت تھی . . . اپنی ساس کی نہیں . . . !

گندگی سے بھری ہوئی گلیوں . . . . اور پھر چوڑی چوڑی سڑکوں کو پار کرتی ہوئی وہ ہسپتال پہنچی . . . لیکن وہاں چوکیدار کے سوا، اور کوئی نہیں تھا۔

. . . . اور وہ اُسی کے پاؤں پر گر پڑی

پرماتما کیلئے مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو، وہ چیخ اٹھی!

لیکن چوکیدار بھی غریب تھا . . . . بالکل اُسی کی طرح . . . . آدھی رات کے وقت وہ ڈاکٹر کو جگا کر اپنے آپ کو بھوک کی آگ میں نہیں جھونکنا چاہتا تھا۔ جہاں لاکھوں غریب روز جیتے مرتے ہیں۔

. . . . . وہ خاموش کھڑا رہا

. . . . اور وہ اُسے جھنجھوڑتی رہی . . . .

. . . . اُس کی آنکھوں سے آنسو . . . ترس کے آنسو بہتے رہے۔

اور وہ چلاتی رہی

. . . . لیکن وہ مجبور تھا . . . بے بس تھا . . . لاچار تھا . . . بے یار و

مددگار تھا۔۔۔ وہ دوسروں کی مدد کیا کرتا؟

اُسے چھوڑ وہ ہسپتال کی شاندار عمارت کی طرف بھاگی۔۔۔ اچانک وہ رک گئی۔۔۔ ایک خوفناک وہم نے اُسے چونکا دیا۔۔۔ اُسے اُس شاندار عمارت سے ڈر لگنے لگا۔۔۔ اُسے یوں معلوم ہوا جیسے مجوریاں اُسے پکڑ کر جیل میں بند کرنے لئے جا رہی ہوں۔۔۔ اُسے یاد آگیا وہ دن جب اُسی طرح کی ایک خوبصورت بلڈنگ میں اُس کے باپ کو پیٹ پیٹ کر جان سے مار دیا گیا تھا۔۔۔ اُن دنوں وہ سولہ سال کی تھی۔۔۔ وہ حسین تھی اور اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی! غربت میں حسن بھی اُس کا اور اُس کے باپ کا دشمن بنا!۔۔۔ اُس کا باپ ایک جاگیردار کے ہاں نوکر تھا اور وہ روز اُس کے لئے روٹی لیکر جایا کرتی تھی۔۔۔۔ ایک دن جاگیردار کی شہوت سے بھری ہوئی آنکھوں نے اُسے دیکھ لیا۔

یہ کون ہے راگھو؟ جاگیردار نے اُسے پیاسی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

آپ کے غلام کی لڑکی ہے مالک! راگھو نے ہاتھ جوڑتے ہوئے ڈرتے ڈرتے اپنے مالک کی اُن آنکھوں کو دیکھا جو اُس کی بیٹی کا حسن لٹتا دیکھنا چاہتی تھیں۔

نام کیا ہے؟ جاگیردار نے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا

۔۔۔۔ اور راگھو کانپ گیا۔۔۔ را۔۔۔ جی، جواب دیتے ہوئے راگھو کی زبان لڑکھڑا گئی۔ جاگیردار کی بھوک تیز ہو گئی۔۔۔۔ وہ نشہ میں لڑکھڑاتا ہوا راجی کی طرف بڑھا۔۔۔ وہ بھاگ کر دور چلی گئی۔

اِس واقعہ نے راگھو کو تڑپا دیا۔۔۔ لیکن وہ جاگیردار کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔

۔۔۔ پھر بھی اُس نے راجی کو روٹی لانے سے منع کر دیا۔

۔۔۔ لیکن جاگیردار کے دل میں راجی گھر کر چکی تھی۔۔۔۔

اور ایک دن۔۔۔۔

تمہاری راجی آج کل کہیں نہیں دیکھی راگھو؟ جاگیردار نے اُون کوٹ اور ٹُرے دار پگڑی اُس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے پوچھا۔

بس گھر میں ہی رہتی ہے مالک، راگھو نے پگڑی اور کوٹ ایک کھونٹی پر ٹانگتے ہوئے کہا۔ اب بڑی جو ہو گئی ہے سرکار!۔۔۔ اُس کا مانا تھا ٹھنڈا جیسے کوئی بڑی مصیبت اُس پر نازل ہونے والی ہے۔

ہمیں تم غریبوں پر بڑا رحم آتا ہے۔ راگھو، جاگیردار نے ایک صوفہ پر گرتے ہوئے کہا۔۔۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ صرف تیس روپے میں تم بھلا کیسے گذارا کرتے ہوگے۔۔۔ مہنگائی کا زمانہ ہے۔۔۔ اگر تم اپنی لڑکی کو ہمارے گھر کا کام دھندا کرنے کے لئے بھیج دیا کرو تو ہم تمہیں تیس روپے اور دیدیا کریں گے۔۔۔۔۔

ساٹھ روپے میں تم موجیں مار سکتے ہو۔۔۔ بولو ٹھیک ہے نا؟

راگھو پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔۔۔ اُس کے حواس باختہ ہو گئے۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کا مالک کیا چاہتا ہے۔۔۔ وہ اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھتا رہا۔۔۔ اُس کی رگ رگ سے شہوت ٹپک رہی تھی۔۔۔ وہ کچھ سنبھلا اور بولا۔

ایک ہی لڑکی ہے سرکار۔۔۔ وہ بیچاری کام کرنے کے لائق کہاں؟ میں خود دُکھ اُٹھا لوں گا لیکن اُسے تکلیف نہ ہونے دوں گا۔

ہم اُس سے زیادہ کام نہیں لیں گے راگھو! جاگیردار اُسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ وہ بڑے سکھ سے رہے گی۔۔۔ اچھا کھائے گی۔۔۔ اچھا پہنے گی اور اُس نے اُسے کئی طرح کے لالچ دیئے۔

میں راجی سے پوچھوں گا سرکار۔ راگھو نے جاگیردار کو ٹالتے ہوئے کہا اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ اور ایک دن جب راگھو جاگیردار کے کمرے کی صفائی کرنے گیا تو جاگیردار نے اُسے پھر راجی کے لئے پوچھا۔

اُسے بھیجے گا کہ نہیں؟

راگھو خاموش تھا

میں کیا پوچھ رہا ہوں؟ جواب دو۔ جاگیردار گرجا۔

راگھو اب بھی خاموش تھا۔

جانتے ہو اِس گستاخی کی سزا؟۔۔۔ اور نہ جانے جاگیردار کی لال آنکھیں کب ایک طرف اُٹھیں اور دو ہٹے کٹے مسٹنڈے راگھو کے پاس تھے۔

۔۔۔ اور کچھ دیر بعد راگھو کی ننگی پیٹھ پر کوڑے لگائے جا رہے تھے۔۔۔

۔۔۔ اور راگھو کی اکلوتی بیٹی زبردستی جاگیردار کے محلوں میں لائی گئی۔۔۔ جہاں اُس کا حُسن۔۔۔ جہاں اُس کی عصمت۔۔۔ جہاں اُس کا سب کچھ کئی مرتبہ لُوٹا گیا اور ایک رات وہ موقعہ پا کر جاگیردار کے محلوں سے بھاگ آئی۔

وہ گاؤں سے شہر کی طرف بھاگی۔۔۔ اُس نے سوچا شاید شہروں میں جاگیردار نہ ہوتے ہوں۔۔۔ اور تب وہ راموں کو ایک ننگ سی گلی میں ملی تھی۔۔۔۔۔

اُس وقت کارخانے سے کام کر کے واپس لوٹ رہا تھا۔۔۔ راجی اُس وقت بھوکی تھی۔۔۔ دو دن سے اُس نے کھانے کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔

راموں بھوک کی مصیبت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔۔۔ بڑی منتوں اور سماجتوں کے بعد وہ اُسے اپنے گھر لے گیا۔۔۔ اور اُس دن راجی کو ساگ کے ساتھ باجرے کی روٹی بہت مزیدار لگی تھی۔

۔۔۔ اور کچھ دن بعد راجی اُس گھر کی مہمان نہیں بلکہ بہو تھی۔۔۔ لیکن بدقسمتی نے ابھی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔۔۔ اُس کے راموں کی حالت

کچھ دنوں سے بہت خراب تھی۔۔۔ بہت زیادہ محنت کرنے اور رُوکھا اناج کھانے سے اُس کی انتڑیاں خشک ہو چکی تھیں۔۔۔ اُس کے پیٹ میں بہت زیادہ درد تھا۔۔۔ کچھ دن کام پر نہ جا سکنے کی وجہ سے اُن کے گھر چھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔۔۔ اب بچے بھوک سے بلبلا رہے تھے۔۔۔۔ راموں۔۔۔۔ اُس کا پیارا راموں۔۔۔ جس نے اُس کی زندگی کو سہارا دیا ـــــ اب درد سے ہائے ہائے کر رہا تھا۔۔۔ ہائے کے خیال نے اُس کے سارے خیالات کا جال توڑ دیا۔

میں اُسے ضرور بچاؤں گی ـــ جھینچی ہوئی وہ ہسپتال کے نزدیک ہی ڈاکٹر کی کوٹھی کی طرف زور سے بھاگی۔۔۔

۔۔۔ ڈاکٹر صاحب۔۔۔ ڈاکٹر صاحب۔۔۔ اُس نے زور زور سے آوازیں دینی شروع کیں۔۔۔۔ اور کچھ دیر بعد اندر سے آواز آئی۔

کون ہے؟

راجی شش و پنج میں پڑ گئی۔۔۔ اُس سے کوئی جواب نہ بن پایا۔ لیکن ہمت کر کے بولی۔۔۔

جی۔۔۔ میرا خاوند بہت زیادہ بیمار ہے۔۔۔ اُس کے پیٹ میں بہت سخت درد ہے ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔۔۔۔ میں نے سُنا ہے یہاں دوا مفت۔۔۔۔

راجی کہہ ہی رہی تھی کہ تڑاک سے دروازہ کھلنے کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔۔۔ وہ سہم کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

کمبخت نے نیند حرام کر دی۔ ایک لمبے سے آدمی نے باہر نکلتے اور آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا ـــــ تم کس لئے یہاں آئی ہو؟

راجی اُس کے پاؤں پر گر کر۔۔۔ بولی "میں بڑی مصیبت میں ہوں۔۔۔ پرماتما کے لئے مجھے بچا لو۔۔۔ میرا خاوند بہت بیمار ہے۔۔۔ میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔۔۔ پرماتما کے لئے اُسے بچا لو۔۔۔ نہیں تو میں اناتھ ہو جاؤں گی۔ بچے بھوکے مر جائیں گے۔۔۔

لمبا آدمی اُس کی بات سُن کر خوب ہنسا۔۔۔ خوب ہنسا۔۔۔ اور پھر ایک دم سخت ہو کر بولا۔۔۔ بڑی ہمت کی ہے تُو نے۔۔۔۔ بھلا ڈاکٹر اتنی کڑاکے کی سردی میں تمہارے ساتھ جا سکتے ہیں۔۔۔ جاؤ۔۔۔ بھاگ جاؤ۔۔۔ کل دس بجے آنا۔۔۔ یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔

راجی کو ایسے لگا جیسے اُس کی قسمت کا دروازہ ہمیشہ۔۔۔ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہو۔۔۔

راجی کی آواز میں سوز تھا۔۔۔ درد تھا۔۔۔ معصومیت تھی۔۔۔ پاکیزگی تھی۔ لیکن پتھریلی دیواروں کے پیچھے رہنے والے پتھر دل انسانوں پر اِس کا کوئی اثر نہ تھا۔۔۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا۔۔۔ اُس وقت اُس کی حالت بیان سے باہر تھی۔۔۔ سردی سے اُس کے دانت بج رہے تھے۔۔۔ اُس کا لاغر اور کمزور جسم اکڑتا جا رہا تھا۔۔۔ اُس کے سینے میں درد ہونے لگا۔۔۔ لیکن اُسے اپنی کوئی فکر نہ تھی۔۔۔ راموں کا خیال اُسے بے چین بنائے جا رہا تھا۔۔۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی مجبوریوں سے جکڑی ہوئی وہ ہسپتال کی پتھریلی دیواروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔۔۔ اُس نے چاہا کہ پتھریلی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ لے لیکن وہ اس کے لئے بھی مجبور تھی زندگی اُس کے لئے بوجھ تھا لیکن پھر بھی وہ جی رہی تھی۔۔۔ اپنے لئے نہیں اپنے سہاگ کے لئے۔

اب وہ پھر گھر کی طرف بھاگی۔۔۔ اُسے خیال آیا۔

اُس کا راموں اب بھی ہائے ہائے مر رہا ہو گا۔۔۔۔۔

ماں اُسی طرح دہلیز پر گری پڑی ہو گی۔۔۔۔۔

چھوٹی منّوں اب بھی بلبلا رہی ہو گی۔۔۔۔

اُس نے چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے لیکن وہ رو نہ سکی۔

راموں کی ہائے اُس کا کلیجہ چیر رہی تھی۔۔۔۔

چھوٹی منّوں کا رونا اُس کے کانوں کو پھاڑ رہا تھا۔۔۔۔

سردی سے اُس کے پاؤں اکڑ اکڑ گئے۔۔۔ اور وہ گر پڑی دُنیا کے مقام سے اب اُس نے چھٹکارہ حاصل کر لیا تھا۔۔۔۔

بدقسمتی نے اُس کا بیچا چھوڑ دیا تھا۔۔۔۔

۔۔۔ ٹن۔۔۔ ٹن۔۔۔۔

رات کے دو بج رہے تھے۔

ماحول سُنسان تھا۔۔۔ چوکیدار کی آواز اور کتے کی بھونک کبھی کبھی خاموشی توڑ دیتی تھی۔۔۔

بڑی بڑی سڑکوں سے دُور ایک تنگ سی گلی میں ایک عورت کی لاش پڑی تھی یہ تھی معصوم۔۔۔ بے بس۔۔۔ لاچار۔۔۔ بے یار و مددگار "راجی"

اُس لاش سے کچھ قدم دُور ایک گھر میں دو بچوں کے رونے کی آواز آ رہی تھی یہ بچے جو کل اِن چوڑی چوڑی سڑکوں پر آپ سے پیسہ مانگتے نظر آئیں گے۔۔۔ کل کے بھکاری!

(ملاحظہ فرمائیے ص ۴۷)

صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

جلد ۳، شمارہ ۵

جون سنہ ۱۹۵۳ء

معیار

ترتیب دینے والے

اصغر علی عابدی

نجم الاسلام

ہیڈ آفس :- خندق اسٹریٹ میرٹھ شہر

سب آفس :- محلہ کشن گنج دہلی ۶

تعاون

سالانہ پانچ روپے

ششماہی تین روپے

مضامین، خط و کتابت۔ ترسیل زر۔ بنام مدیر جرائد کیلئے ہیڈ آفس

ترسیل زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب۔ فیملی لائن جیکب آباد

قیمت فی پرچہ — آٹھ آنے

ترتیب

نقشِ اوّل ۔۔۔۔۔ اصغر علی عابدی ۔۔۔۔۔ ۳

نظمیں

یو۔این۔او ۔۔۔۔۔ تنویر احمد علوی۔ایم۔اے ۔۔۔۔۔ ۵
وہ کارواں ۔۔۔۔۔ انور صدیقی ۔۔۔۔۔ ۶
کب تک ۔۔۔۔۔ ملّا رموزی (مرحوم) ۔۔۔۔۔ ۷
آخری رات ۔۔۔۔۔ محمود عالم ۔۔۔۔۔ ۸
جھنکار ۔۔۔۔۔ منظر اعظمی ۔۔۔۔۔ ۱۰
ایک سوال ۔۔۔۔۔ اعجاز اعظمی ۔۔۔۔۔ ۱۱
نئے زاویے ۔۔۔۔۔ حسّان کلیمی۔بی۔اے ۔۔۔۔۔ ۱۲

مقالے

اسلام کا ادبی تصوّر ۔۔۔۔۔ افتخار اعظمی ۔۔۔۔۔ ۱۳
ہم ــــ اور ہمارے ادبی تصوّرات ۔۔۔۔۔ جمیل احمد خاروقی ۔۔۔۔۔ ۱۸
عورتوں کے لئے لمحۂ فکر ۔۔۔۔۔ متین طارق ۔۔۔۔۔ ۲۱

غزلیں

غزل ۔۔۔۔۔ سیّد احمد سیّد میرٹھی ۔۔۔۔۔ ۲۵
غزل ۔۔۔۔۔ الم مظفر نگری ۔۔۔۔۔ ۲۶
" ۔۔۔۔۔ برق کاکوڑی ۔۔۔۔۔ ۲۷
" ۔۔۔۔۔ عرفی بھوپالی ــ ابوالمجاہد زاہد ۔۔۔۔۔ ۲۸
واقف رائے بریلوی ــ محمد انصار اللہ نظر ۔۔۔۔۔ ۲۹

افسانے اور خاکے

کشمکش ۔۔۔۔۔ محمد نجات اللہ صدیقی ۔۔۔۔۔ ۳۰
ایک تھا شکاری ۔۔۔۔۔ منظر حسین ۔۔۔۔۔ ۳۵
سیدی مولیٰ ۔۔۔۔۔ عاصی ضیائی رامپوری ۔۔۔۔۔ ۴۶
عیال اپنا اپنا ۔۔۔۔۔ ع۔م ۔۔۔۔۔ ۵۱

نقشِ اوّل

"اسلامی ادب"۔ فرقہ واریت اور اسی طرح کی دوسری تنگ نظریوں کو پسند نہیں کرتا۔ اسلام ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی ہے جو تمام دنیا کے لئے آیا ہے۔ یہ کسی قوم یا فرقہ کا آبائی مذہب نہیں ہے۔ جو لوگ اسلام کی اس حیثیت سے ناواقف ہیں وہ ہر اس چیز کو جس کا تعلق اسلام سے ہو "فرقہ وارانہ" اور "تنگ نظرانہ" قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اسلام کے بارے میں اس قسم کے الفاظ استعمال کرکے وہ خود اپنی تنگ نظری اور لاعلمی کا ثبوت دیتے ہیں۔ بلاشبہ مسلمانوں کا موجودہ عمل صحیح اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں ہے۔ لیکن مسلمانوں کے موجودہ غلط عمل اور اسلام کے اصولی پیغام میں جو فرق ہے اس کو صرف کم علم اور جاہل لوگ ہی نظر انداز کر سکتے ہیں۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ جب اس طرح کی باتیں کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مقصد صرف اعتراض برائے اعتراض ہے۔

"اسلامی ادب" کے پیشِ نظر محض مسلمانوں کے مقاصد نہیں اور نہ موجودہ حالات میں سربرآوردہ لوگوں تک اس کی "درخواست" پہنچانا ہے۔ اور نہ "اسلامی ادب" "جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے" کے لئے وجود میں آیا ہے۔ درخواست گذاری اور دل کی بھڑاس نکالنے کے اس طریقے سے جو آج کل اکثر مسلمان ادیبوں میں مروج ہے۔ ہمارا راستہ بالکل جدا ہے۔ ہم کسی قوم اور طبقے کی مادی غرض سے بالاتر ہو کر صرف "اسلام" کو تمام انسانوں کے مسائل حل کرنے والے بہترین نظام کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

"اسلامی ادب" "قدامت پسندی" اور "ترقی پسندی" کی بحث میں بھی نہیں پڑتا۔ اس کا راستہ صاف اور سیدھا ہے۔ اس کے نزدیک اسلام ایک ایسا نظامِ زندگی ہے۔ جس کا مدار کائنات اور زندگی کی اٹل قدروں پر ہے۔ ایسی قدروں پر جو غیر متغیر ہیں۔ اسی لئے "اسلامی ادب" کے "ترقی پسند" یا "قدامت پسند" ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم تغیر کے مسئلہ کو نہیں سمجھتے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ زندگی اور تاریخ میں جو تغیر ہوتا ہے وہ انسانی فطرت، انسان کے مطالبات اور ضروریات میں نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان کی ضروریات اور مطالبات کی تکمیل کے ذرائع میں ہوتا ہے۔ پہلے بھی انسان کھاتا تھا۔ اور آج بھی کھاتا ہے۔ پہلے بھی سفر کرتا تھا اور آج بھی سفر کرتا ہے۔ اور پہلے بھی وہ موسم سے حفاظت کا طالب تھا آج بھی ہے۔ لیکن پہلے جو غذائیں کھاتا تھا۔ جن ذرائع و وسائل سے سفر کرتا تھا۔ جس طرح کے مکانات میں رہتا تھا آج وہ سب بدل گئے ہیں۔ اس لحاظ سے تغیر جو کچھ ہوا ہے وہ زندگی کے بنیادی مطالبات میں نہیں بلکہ ان کی تکمیل کے ذرائع میں ہوا ہے۔ انسانی تہذیب کے اوپری خول میں ہوا ہے۔ اس کی شکل ( ) میں ہوا ہے۔ اس لئے اوپری شکل کی تبدیلی کو بنیاد بنا کر اصل حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہم تمام اوپری تبدیلیوں کو گوارا کرتے ہیں۔ لیکن کسی بنیادی تبدیلی کے لئے تیار نہیں۔ کیونکہ اس تبدیلی کا انسانی فطرت سے کوئی تعلق نہیں۔

"اسلامی ادب" ہر قسم کی غیر اسلامی قدامت پسندی کا مخالف ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ ہر قسم کی غیر اسلامی ترقی پسندی اور جدت پسندی کا بھی مخالف ہے۔ وہ ان دونوں کے درمیان صرف حقیقت کی بنیاد پر اپنی عمارت تعمیر کرتا ہے۔ اسلامی ادب اپنے اندر تمام اوپری شکلوں کے لئے گنجائش رکھتا ہے۔ فن اور تکنیک سے اس کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اصلی چیز تو مقصد ہے۔ سوال یہ ہے کہ آج کا ادب کس طرف جا رہا ہے؟

وہ انسانیت کو اخلاقی اور سماجی تباہی کی طرف دھکیل رہا ہے۔ یا خدا پرستانہ بنیادوں پر انسانیت کے سُدھار کی جدوجہد میں لگا ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک صرف اسلام کی دی ہوئی قدروں پر زندگی کی تعمیر ممکن ہے۔ خالص خدا پرستی ہی سماج کو منظم کر سکتی ہے اور اس کے اخلاقی بگاڑ کو دور کر سکتی ہے۔ ایک انسان کی دوسرے انسان سے آزادی ہی اُس کی سچی آزادی قرار دی جا سکتی ہے۔ زندگی کے لئے "دُنیا پرستی" نہیں بلکہ آخرت میں خدا کے سامنے اپنے تمام اچھے اور بُرے اعمال کی جوابدہی کا احساس ہی آدمی کو نیک بنا سکتا ہے۔ ہم زندگی کی ان قدروں کو دُنیا بھر کے ادیبوں مفکروں۔ اور سمجھدار لوگوں کے سامنے غور و فکر کے لئے پیش کرتے ہیں۔

"اسلامی ادب" کی تحریک زبان کے بارے میں بھی ایک وسیع نقطۂ نظر رکھتی ہے۔ آج کل ہمارا کام عموماً اُردو زبان میں ہو رہا ہے اس لئے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ شاید ہم صرف اُردو کے حمایتی ہیں۔ یقیناً اُردو زبان ایک عمدہ زبان ہے۔ اور اس کے اندر ادب کا بہترین سرمایہ ہے لیکن آج کل یہ زبان ایک خاص طبقہ کے غلط طرزِ فکر کا نشانہ بن گئی ہے۔ ہمارے بہت سے دوستوں نے اُردو زبان کو اپنا محور بنا لیا ہے اور وہ اس کی خاطر مرمٹنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ حالانکہ سب سے زیادہ اہم سوال ان افکار و خیالات کا ہے جو اُردو زبان میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر یہ افکار و خیالات صالح ہوں گے۔ ہمہ گیر ہوں گے، قوم، جماعت اور طبقہ کے مفاد سے آزاد ہوں گے تو خود بخود اُردو کا تحفظ بھی ہو جائے گا اور دنیا اُردو سیکھنے کی طرف مائل ہو جائے گی۔ اُردو زبان پر اسلامی تہذیب کا گہرا اثر ہے۔ اِس لئے جو لوگ اسلامی تہذیب کو پسند نہیں کرتے وہ اُردو کو بھی پسند نہیں کرتے۔ ہمارا کام یہ ہونا چاہئے کہ ہم اُس تہذیب کے بارے میں دنیا کی غلط فہمی کو دُور کریں جس کا اثر اُردو پر ہے۔ اِس طرح اُردو بھی بچ جائے گی اور وہ تہذیب بھی لیکن یہ بات واضح رہے کہ یہ اُونچا کام محض زبان کی خاطر نہیں کرنا ہے۔ بلکہ خود اسلامی تہذیب اور فکر کی اشاعت ہی سب سے بڑا مقصد ہونا چاہئے۔ اور اس کے لئے صرف اُردو ہی کو ذریعہ بنانا صحیح نہ ہوگا۔ ہندوستان اور دنیا کی تمام زبانوں میں یہ کام ہونا چاہئے کیونکہ یہ ایک بنیادی کام ہے۔

تنویر احمد علوی۔ ایم۔ اے

یو، این، او

اے علم کے پروانو
اخلاق کے دیوانو
اے امن کے رکھوالو
انساں کے نگہبانو
"انسان کو جینے دو"

اے حق کے طرف دارو
فطرت کے پرستارو
اے آرٹ کے گلچینو
تہذیب کے معمارو
"انسان کو جینے دو"

اے صلح کے ملّاحو
انصاف کے مدّاحو
اے درد کے درمانو
ناسور کے جرّاحو
"انسان کو جینے دو

اے روح کے صیّادو
سائنس کے اُستادو
اے ذہات کے کل پُرزو
آلات کی اَو لادو
"انسان کو جینے دو"

اے دہر کے نیتاؤ
جمہور کے شیداؤ
اے خلق کے ہمدردو
دُنیا کے مسیحاؤ
"انسان کو جینے دو"

آخر یہ جنوں کب تک
یہ سحر و فسوں کب تک
تہذیب کے ہاتھوں میں
یہ ساغرِ خوں کب تک
انسان کو جینے دو
انسان کو جینے دو

انور صدیقی

وہ کارواں

مہیب سائے گناہوں کے رینگتے ہیں یہاں
یہاں ستاروں کی آنکھیں بھی ڈبڈبا تی ہیں
یہاں نگاہوں سے عصمت کے پھول نچتے ہیں
سیاہیاں رُخِ عشرت پہ جگمگاتی ہیں

•

فروغِ تیرہ شبی میں ہر ایک راہگذر
نہ جانے کتنی اُمیدوں کو لے کے سوتی ہے
سیاہیٔ شبِ دوراں کو دیکھکر شبنم
تمام رات امیدِ سحر میں روتی ہے

•

مگر یہ راہگذر ـــــ یہ فسردہ راہگذر
ہے منتظر کہ سحر کا وہ کارواں آئے
بکھیرتا ہوا عزم و یقیں کی تنویریں
وہ مہرِ زیست کا سیلابِ زرفشاں آئے

•

وہ نوچتا ہوا تاریک پردہ ہائے حیات
رموزِ فطرتِ آدم کا رازداں آئے

وہ روندتا ہوا نسل و وطن کی دیواریں
پیامِ وحدتِ انسان کا کارواں آئے

•

وہ کارواں کہ ہے جس سے رُخِ حیات پہ رنگ
وہ کارواں کہ ہے جس سے حیات میں آہنگ؛
وہ کارواں کہ شکستہ ہے رنگِ آہن و سنگ!
وہ کارواں کہ بکھرتا ہے جادوئے افرنگ

•

وہ کارواں مرے ہمدم قریب آپہنچا
مہیب سایہ، کہو راستہ سے ہٹ جائے
فسردہ چہروں سے کہہ دو کہ جگمگا اٹھیں
سیاہ ابر سے کہہ دو کہ آج چھٹ جائے

•

"جہانِ نو" جسے الحاد نے سجایا تھا
اب اس کے محلوں کی بنیاد ہلنے والی ہے
دُھندلکے کُفر کے پیچھے کھسک رہے ہیں ندیم
"نئے سماج" کی اب شمع جلنے والی ہے

ے مشہور اشتراکی شاعر سآحر لدھیانوی کے اِس شعر کے جواب میں ے

الحاد کر رہا ہے مرتب جہانِ نو
دیر و حرم کے حیلۂ غارتگری کی خیر

بابائے گلابی اردو حضرت ملّا رموزی (مرحوم)

کب تک رہے گی لالہ و شبنم کی شاعری

کب تک رہے گی لالہ و شبنم کی شاعری
یا پھر وہ آہ و نالہ و ماتم کی شاعری

ہوتے ہی عشق حسن سے یہ انتہا تو دیکھ
ہو جاتی ہے شروع بس اک غم کی شاعری

گویا یہ حسن بھوت ہے یا مرگِ والدین
ہے جب تو اس پہ نالۂ پیہم کی شاعری

آزاد ہو کے اب تو کہو قورمہ پہ شعر
چھوڑو یہ دال بھات کی شلجم کی شاعری

خود کیجیے کچھ پلاؤ کے اشعار جمع آپ
اور مجھ سے لیجیے مرغِ مسلّم کی شاعری

ظالم اگر ہو حسن تو لٹھ کیجیے رسید
فدوی کے بدلے کیجیے رستم کی شاعری

میں بارگاہِ حسن میں پڑھتا ہوں جب غزل
ہوتی ہے اس میں صدرِ معظّم کی شاعری

میری غزل کے حسن و مقامِ بلند کی
قائل ہے جام و مربّہ جم کی شاعری

میں غمزہ و نگاہ غزل ساز تک سے آج
کرتا ہوں جوشِ رفعتِ پرچم کی شاعری

میری تو شاعری میں ہے پرچم کی شاعری
یورپ میں ہو رہی ہے اب ایٹم کی شاعری

محمود عالم

آخری رات

مرے عزیز ساتھیو
اور تیز گام ہو
اور تیز تر کرو یہ روشنی
کس قدر مہیب ہے یہ رات میرے ساتھیو
پھر بھی کچھ غمیں نہ ہو
کہ یہ مقامِ غم نہیں
یہ مقامِ عزم ہے
شہادتِ حسین ہے یزید کی یہ مرگ ہے
مرے عزیز ساتھیو
بڑھے چلو
جلو میں لے کے ماہتاب
بصد وقار و آب و تاب
جب تلک سحر نہ ہو بڑھے چلو بڑھے چلو
مرے عزیز ساتھیو
غمیں نہ ہو
کہ ایسے مرحلے ابھی تو بار بار آئیں گے
یہ تیرگی کے پاسباں یہ ظلمتوں کے رازداں
ہے جن کا ہر نفس ضلالتوں کی ایک داستاں
تمھاری راہ میں ہزار بندشیں یہ لائیں گے
قیامتیں اٹھائیں گے
مگر جو صبح آئے گی تو آپ بھاگ جائیں گے
ساتھیو بڑھے چلو
اور تیز گام ہو
وہ سامنے ہے وادیٔ سحر عزیز دوستو

مرے عزیز ساتھیو
یہ تیرگی کے پاسباں
اِک چراغ کو اگر بجھا بھی دیں تو غم نہیں
یہ ایک پھول کو اگر مسل بھی دیں تو غم نہیں
دلوں میں پُرفشاں ہیں جو چراغ انہیں بجھائیں تو
محل رہے ہیں ذہن میں جو باغ انہیں مٹائیں تو
ہے ان میں حوصلہ تو یہ دلوں کا نور چھین لیں
یہ آدمی کا ذہن، ذہن کا شعور چھین لیں
مرے عزیز ساتھیو
یہ اک چراغ کو اگر بجھا بھی دیں تو غم نہیں
یہ سُرخیٔ شفق جو صبحِ نو کا اِک نکھار ہے
یہ اِک ہجوم رنگ و نور ساتھ ساتھ لائی ہے
یہ صد ہزار جلوہ گاہ طور ساتھ لائی ہے
مرے عزیز ساتھیو
یہ ایک پھول کو اگر مسل بھی دیں تو غم نہیں
پھول کا تو ذکر کیا یہ سارے باغ کو بھی گر اُجاڑ دیں تو غم نہیں
بہار پھر بہار ہے
یہ نظمِ گلستاں کا اِک شعور ساتھ لائی ہے
مرے عزیز ساتھیو
اور تیز گام ہو
بڑھے چلو
بصد وقار و آب و تاب
ہزار بندشوں کے باوجود صبح چھائے گی
تمہارے عزم کی قسم یہاں بہار آئے گی

منظر اعظمی

جھنکار

خدا پرستو اٹھو کہ شعر و ادب کے دھاروں کو موڑنا ہے
"ادب برائے ادب" کا سحر حسین و رنگین توڑنا ہے
"خیالی دنیا کے رہنے والوں کے ہر تخیل کو ڈھالے چھوڑیں
"ادب برائے ادب" کے شاہوں کا قصر زریں مٹا کے چھوڑیں
ادب پہ چھائے ہیں جو جراثیم ان کو بل کر ہلاک کر دیں
ادب کے دامن کو معصیت کے کریہہ اغوں سے پاک کر دیں
ضرورت اس کی ہے بحر عریانیت کے دھاروں کو موڑ ڈالیں
جو ہیت کے صنم کدے میں سجے ہیں بت ان کو توڑ ڈالیں
یا ابروؤں اور چتونوں کے "سنان و خنجر" کے گیت کب تک
خیالی لیلاؤں کی نگاہوں کے "تیر و نشتر" کے گیت کب تک
"شراب شاہد" کی محفلوں میں قلندری کا جلال بھر دیں
"رباب طاؤس" کی فضاؤں میں زندگی کا جمال بھر دیں
مرے رفیقو نظر اٹھاؤ "بہار نو" گنگنا رہی ہے
مرے ندیمو قدم بڑھاؤ کہ کامرانی وہ آ رہی ہے
یقین محکم کی جگمگاتی لطیف کرنوں سے کام لو کچھ
نگاہ مومن کی غازیانہ جواں امنگوں سے کام لو کچھ
ادب پہ تاریکیاں مسلط ہیں ان کو مل جل کے دور کر دیں
یقین و ایماں کا نور برسائیں، زیست کو غرق نور کر دیں

اعجاز اعظمی

ایک سوال

آپ ہی سوچ کر یہ بتائیں ذرا
حُسن کیوں بن گیا زینتِ انجمن ؟
عصمتیں سِسک رہی ہیں کیوں اپنا کفن؟

آج رادھا کی مانگوں میں افشاں نہیں
کوئی حسرت نہیں
کوئی ارماں نہیں
جیسے اِس درد کا کوئی درماں نہیں

اپنے بھائی ہلوں کو چلاتے رہیں
اور بہنوں کو کپڑے میسّر نہ ہوں
اپنے بھائی ہلوں کو چلاتے رہیں
اور روٹی کے ٹکڑے میسّر نہ ہوں

آہ! کب تک یُوں ہی
خونِ اِنسان پیالوں میں ڈھلتا رہے ؟

دَور چلتا رہے
اور کب تک یُوں ہی
چرخِ اِنسان کی
ایک انسان چہرے پہ ملتا رہے ؟

اہلِ زر کی سلامت رہیں آندھیاں
بن کھلے غنچے مُرجھائیں گے اور بھی
ضبط! لیکن ہے خاموش آتش فشاں
آپ نے غور اس پر کیا ہے کبھی ؟

آپ ہی سوچ کر یہ بتائیں ذرا
حُسن کیوں بن گیا زینتِ انجمن ؟
عصمتیں سِسک رہی ہیں کیوں اپنا کفن؟

حسان کلیمی۔ بی۔ اے

نئے زاویئے

۱۔ ادب کے پیمانے

لوگ کہتے ہیں شاعری بدلے
اور مذاقِ سخن وری بدلے
خاک بدلیں ادب کے پیمانے
جب نہ اپنی ہی زندگی بدلے

۲۔ تلاشِ زیست

زندگی کی تلاش اب بھی ہے
دِل بُتوں سے لگا کے دیکھ لیا
سُرخ جامِ شراب بھی ہمدم!
بارہا آزما کے دیکھ لیا

۳۔ لہو

جو برق بنے اور رگِ زیست میں دوڑے
اُس خُون کی سُرخی میں نئی صبح ڈھلے گی
لیکن جو لہو سرد ہو ابر کی مانند
پی کر اُسے پُر ہول شبِ تار پلے گی

۴۔ فریبِ بہار

سمجھ تو سکتا ہُوں میں بھی حدیثِ غنچہ و گُل
مگر خزاں میں فریبِ بہار کیوں کھاؤں
جو آنکھ کھولی تو شعلوں کے درمیاں کھولی
بھلا میں نغمۂ عیش و نشاط کیا گاؤں

۵۔ غمِ زیست

چھاؤں میں عنبریں زلفوں کی تری اے ہمدم!
اپنے افکارِ پریشاں کو سُلانا چاہا
ناگ احساس کے لیکن مجھے ڈستے ہی رہے
میں نے تو لاکھ غمِ زیست بھلانا چاہا

افتخار اعظمی

اسلام کا ادبی تصوّر

اسلام محض چند رسوم اور چند روایات کے مجموعے کا نام نہیں ہے وہ نوعِ انسانی کے لئے پہلے بھی ایک پیامِ حق تھا اور اب بھی ہے اُس کے تصورات سمٹے ہوئے نہیں بلکہ پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ صرف خدا اور بندے کے درمیان وسیلہ ہی نہیں بنتا ہے بلکہ ہماری اس چلتی پھرتی دنیا کو بھی ایک نظامِ خاص عطا کرتا ہے۔ زمانے کے اُبھرتے ہوئے مسائل کا ایک خاص انداز میں حل پیش کرتا ہے۔ دنیا خواہ کتنا ہی رنگ بدلے، زندگی خواہ کتنی ہی کروٹیں لے لیکن اُس کی بتائی ہوئی محسوس قدریں جس طرح پہلے کارآمد تھیں اب بھی کارآمد ہیں۔ وہ صرف مسجد و خانقاہ کا دین نہیں ہے بلکہ ایوانِ حکومت کے لئے بھی ایک لائحہ عمل اور ایک نظامِ فکر رکھتا ہے۔ وہ ملّا و پیر کا اجارا نہیں ہے بلکہ وہ نوعِ انسانی کے لئے ایک شمعِ ہدایت ہے۔ وہ ایک تحریک ہے۔ ایک انقلاب ہے۔ اور اُس میں ایک مرکزی فکر۔ ایک مرکزی تصور۔ ایک نظامِ حیات اور ایک ہمہ گیر پیامِ حق ہے وہ پہلے بھی رُوحِ عصر تھا اور اب بھی رُوحِ عصر ہے۔ وہ راہِ حیات کے ہر موڑ پر شمعِ ہدایت لئے کھڑا رہتا ہے۔ بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھاتا ہے اور گرتے ہوؤں کو سنبھالتا ہے۔ ہر مسئلۂ حیات کا وہ ایک حل پیش کرتا ہے۔ سیاسیات ہو یا معاشیات۔ تہذیب ہو یا تمدن۔ علم ہو یا ادب ہر شعبۂ حیات کو ایک صحیح راہ پر لگاتا ہے۔ گویا زندگی کی تمام قوتوں کو ایک خاص مقصد اور ایک خاص نصب العین کے حصول میں صرف کرتا ہے۔ اس مختصر سی مجلس میں یہ تو ناممکن ہے کہ اسلام ہر شعبۂ حیات کی اصلاح کے لئے جو اصول پیش کرتا ہے اُسے ایک ایک کر کے بیان کروں۔ آج کی ادبی مجلس کے لئے مناسب یہ ہے کہ شعبۂ ادب کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر پیش کروں لیکن بہتر ہوگا کہ اس ادبی بحث کو اُٹھانے سے پہلے اسلام کے صحیح اور حقیقی مطمحِ نظر کو اب کے سامنے اُجاگر کیا جائے۔

اُستاذ احمد امین بک نے اپنی کتاب "فجر الاسلام" میں لکھا ہے۔

"اسلام نے زندگی کی قدریں معین کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اسلام ہی کا اثر تھا کہ بعض قدریں اُبھر آئیں اور بعض دب گئیں۔ گویا زندگی کا مطمحِ نظر جو کل تھا وہ آج نہیں رہا۔ دورِ جاہلیت کا عقلی ڈھانچہ بدلنے میں رسولؐ کو ابتداء میں بہت سی مصیبتیں اُٹھانی پڑیں۔

اسلام کی آمد سے پہلے جو نظامِ فکر رائج تھا اُس میں انسان کی حیثیت درجہ دار کی سی تھی اُس کی آزادی اپنی حدوں سے نکل چکی تھی ہر طرح کی زیادتیاں اس کے لئے مُباح تھیں۔ اخلاقی بندشیں اگر ٹوٹی نہیں تھیں تو ڈھیلی ضرور پڑ گئی تھیں۔ اجتماعی مفاد کا کوئی تصور نہ تھا۔ فلاح و بہبود کے سارے امکانات قبیلے کی حدوں میں گھرے ہوئے تھے۔ مساوات بیگانگت اور اُخوّت کا احساس تو ضرور تھا لیکن وہ بھی کنبے اور قبیلے کی حدوں سے باہر نہ نکلتا تھا۔ نسلی امتیاز۔ قبائلی برتری اور شخصی تفوق اس جاہلانہ نظامِ تصور کی بنیاد تھی۔ پتہ نہیں کتنے "ستانِ رنگ و بُو" تھے جن کے سامنے دورِ جاہلیت کے عرب عجز و نیاز کی نذریں پیش کرتے۔ بہادری شجاعت اور فیاضانہ بخشش یقیناً قابلِ تعریف ہے لیکن جب یہ خوبیاں حدوں سے گزر جاتی ہیں تو اچھائیوں کے بجائے برائیاں بن جاتی ہیں۔ خیر کے بجائے شر کا پیش خیمہ ہو جاتی ہیں۔ دورِ جاہلیت کے عربوں میں بہادری تھی، لیکن صرف قبیلے کی حفاظت کے لئے۔ فیاضی تھی لیکن حاتم اسرائیلی۔ حضرت جعفرؓ ابن ابی طالب نے نجاشی کے دربار میں جو تقریر کی تھی وہ جاہلانہ نظامِ تصور اور اسلامی نظامِ فکر کے فرق کو بڑی وضاحت سے بے نقاب کرتی ہے۔ میں اُس تقریر کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

دورِ جاہلیت میں ہم بتوں کو پوجتے تھے۔ بُرائیاں کرتے تھے۔ پڑوسیوں کو ستاتے تھے رشتے داروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے تھے۔ کمزور کی زندگی سرتاپا عذاب تھی۔ قوت والا اُسے مشقِ ستم بنائے ہوئے تھا۔ ایسے حالات میں خدا نے ہمارے پاس اپنا پیامبر بھیجا اُس نے ہمیں ایک خدا کی عبادت کرنے کی تعلیم دی اور ہمیں بتایا کہ سچ بولنا چاہئے۔ ہمسائے کا خیال رکھنا چاہئے۔ رشتے داروں کے ساتھ بھلا برتاؤ کرنا چاہئے۔ خونریزیوں سے گریز کرنا چاہئے۔ یتیموں کا مال نہ کھانا چاہئے اور نہ شریف زادیوں کی پاکدامنی پر حملہ کرنا چاہئے۔

حضرت جعفرؓ کی یہ مختصر سی تقریر دو نظامِ فکر اور دو تصورِ زندگی میں جو فرق ہے اس کی مختصر مگر جامع تعبیر ہے۔ اسلام نے یقیناً انسانی زندگی کے لئے ایک ایسی راہ کا تعین کیا جس کی منزل امن و سلامتی کا آخری نشان ہے۔ اُس نے انسانی ہستی کو خدا کے سامنے جواب دہ

قرار دیا۔ اُس نے بتایا کہ زندگی ایک سنجیدہ چیز ہے۔ ہمارا ہر عمل اور ہماری ہر حرکت ایک خاص دائرۂ اعتدال میں ہونی چاہئے۔ اور ہمارا ہر فرض ایک احساسِ ذمہ داری لئے ہوئے۔ نظمِ ہستی ایک خراب جنوں نہیں جس کی کوئی تعبیر نہ ہو۔ دنیا ایک ایسا آغاز نہیں جس کی انتہا نہ ہو۔ نظامِ عالم کی تخلیق بے مقصد نہیں۔ اس کارزارِ انسانیت کی ایک منزل ہے۔ اس تماشائے رنگ و بُو کے پیچھے کوئی مقصد کارفرما ہے اور وہ مقصد اس جہانِ کاخ و کُو کے بنانے والے کی اطاعت اور اس کے منشاء کی تکمیل ہے مگر یہ اطاعت محدود نہیں ہے بلکہ ہمہ گیر ہے۔ زندگی کی ہر راہ پر بس ایک ہی نُور کے سائے میں چلنا۔ ایک ہی دانائے منزل کی راہبری میں حرکت کرنا۔ یہی اسلام کے نزدیک اطاعتِ الٰہی کے معنی ہیں۔ ایک ہی قانون ہو جو زندگی کے ہر میدان میں قانونِ ہدایت بنے سیاست۔ معاشرت۔ تہذیب۔ تمدن اور علم و ادب کا ہر چراغ ایک ہی نُور سے اکتسابِ فیض کرے اور وہ نُور ہے شریعتِ اسلامی۔ اسلام کا یہ بنیادی تصوّر تھا جسے میں نے بیان کیا۔ فلاحِ انسانیت کے لئے دوسرا بنیادی تصوّر جو اسلام نے پیش کیا وہ یہ ہے کہ قومی اور نسلی بنیادوں پر جو تفریقیں ہیں وہ یکسر غلط ہیں۔ وجہِ امتیاز اگر کوئی چیز بن سکتی ہے تو وہ ہے بلندیٔ کردار، نگاہِ پاکباز اور نیکیٔ عمل۔ اسلام نے ان بتانِ رنگ و بُو کو توڑ کر نوعِ انسانی کو یہ دعوت دی کہ وہ ایک ہی خدا کے بندے ہیں۔ ایک ہی باپ سے مختلف بیٹے ہیں۔ ایک ہی چمن کے مختلف پھول ہیں۔ ایک ہی دریا کی مختلف موجیں ہیں۔ ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں۔ ایک ہی نُور کی مختلف شعاعیں ہیں۔ یہ تعلیم تھی جس نے بلالؓ و سلمانؓ جیسے غلاموں کو اُمرائے عرب کی صف میں کھڑا کر دیا۔ انسانی تفریق کے نشیب و فراز مٹا دیئے۔ پستی و بلندی کا احساس دلوں سے نکال دیا۔ تاجِ سر اور فقیرِ رہ گذر کو یکجا کر دیا۔ کیا یہ امن و صلاح کی دعوت نہ تھی۔ کیا یہ کچھ ٹکڑوں کو ملانے اور گروتوں کو سنبھالنے کے لئے ایک پیام نہ تھا۔ اسلام نے اتنا ہی نہیں کیا کہ اس نے دلوں کو اُخوت و محبت کی جلوہ گاہ بنایا ہو بلکہ اُس نے کچھ ایسے قوانین بھی بنائے جو امن و سکون کی فضا کو ہموار کئے رہیں۔ اُس کی تعلیمات میں جان و مال کا احترام ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ انتقام لینا اسلام کے نزدیک کچھ اچھی بات نہیں عفو و درگذر اُس کے یہاں ایک قابلِ تعریف خوبی ہے شخصی آزادی جہاں تک کسی فساد کا باعث نہیں ہوتی وہیں تک صحیح ہے۔ دوسرے اقتصادی اطمینان جو سوسائٹی کی ذہنی و اخلاقی ترقیوں کا ایک اہم زینہ ہے اُسے حاصل کرنے کے لئے اسلام نے مختلف قسم کے کچھ اتنے ٹیکس لگائے ہیں کہ دولت ہی نہ ہو جائے بلکہ کچھ عرصے کے بعد چراغ لے کر ڈھونڈا جائے تو بھی کوئی غریب نہ ملے۔ موروثی اسباب پر بھی ہیں کہ

[illegible] معاشی نظام کا فیض تھا جس کی بدولت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا [illegible] اطمینان و سکون کا دور کہا جاتا ہے۔ اس وقت اسلامی

حدود و حکومت میں غُربت کہیں نام کو نہ تھی اور غریب کہیں ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا۔

میں نے مختصراً جو اسلامی فکر کی طرف یہ ہلکا سا اشارا کیا ہے اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ اسلام کے تمام اصول انسانی فلاح کے لئے بنائے گئے ہیں گویا فلاحِ انسانی ہی ہماری منزل ہے۔ ہمارا کارواں اسی طرف بڑھ رہا ہے اور ہم دوسرے لوگوں کو بھی اسی طرف لے جانا چاہتے ہیں میرا خیال ہے کہ میں نے اجمالاً اسلامی مطمحِ نظر کی وضاحت کر دی ہے۔ اس مطمحِ نظر کو حاصل کرنے کے لئے تحریکِ اسلامی شعر و ادب سے ایک مخصوص انداز میں کام لینا چاہتی ہے چونکہ ہمارا مقصد فلاحِ انسانیت ہے اور ادب کا بھی یہی مقصد ہونا چاہئے اس لئے اسلام کا جو لوگ ایک بسیط تصوّر رکھتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ادبی جولانیوں کو اسلامی قدروں کے پھیلانے اور اُنھیں اپنے دامن میں سمیٹنے کے لئے صرف کیا جائے، اسلام کا یہ تصوّر ہے کہ بغیر اخلاقی رعنائیوں کے انسانیت پُورے طور سے نہ بنتی ہے اور نہ سنورتی ہے اس لئے اسلامی ادب کا یہی اقتضا ہے کہ وہ انسانی ضمیر کو کچھ اس لطیف انداز سے اُبھارے کہ انسان کا ہر عمل خود فلاحِ انسانیت کی طرف پھر جائے۔ اسلام مخلص ادب کو اس لئے معاف نہیں کر سکتا کہ وہ ادبی محاسن اور فنی خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ جس طرح ایک مخلص اور حق پرست جج ایک نوجوان قاتل کو اس لئے سزا دینے سے اجتناب نہیں کر سکتا کہ شباب کی بہاریں اُس کا قدم چوم رہی ہیں اور حُسن کی رعنائیاں اُس کی بلائیں لے رہی ہیں۔

شعر ہو یا نثر۔ فی نفسہٖ وہ نہ بُرے ہیں نہ بھلے۔ اُس کی اچھائی اور بُرائی مضامین کی نوعیت پر مبنی ہے اگر کوئی ادبی تخلیق انسانیت کو اعلیٰ مراتب سے گراتی ہے تو وہ خواہ کچھ بھی ہو اسلام اُسے برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ چونکہ ادب خیالات کی اشاعت کا موثر ترین ذریعہ ہے اس لئے اسلام اُس سے اپنی اعلیٰ قدروں کے پھیلانے کا کام لیتا ہے۔ سیاست ہو یا معاشرت۔ دین ہو یا دُنیا سبھی کو اسلام اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے وہ ہمیشہ اپنے کو ایک کلی نظامِ حیات کی حیثیت سے بغیر ہوتا ہے زندگی کے مسائل سے وہ کہیں بھی قرار اختیار نہیں کرتا۔ اُس کی باتیں خیالی نہیں بلکہ عملی ہیں۔ اس لئے اسلامی یا یُوں کہئے کہ تعمیری ادب کو واقعیت سے زیادہ قریب ہونا چاہئے۔ اور ذہن کو خارج سے کلی لگاؤ رکھنا چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک حساس طبیعت واقعات سے متاثر ہوتی ہے اور یہ تاثر اُس کی تخلیقی قوتوں کو اُبھارتا ہے۔ اس تاثر کی نوعیت کے مطابق ادبی تخلیقات میں بھی فرق پیدا ہوتا ہے اگر واقعات صالح ہیں تو تاثر بھی صالح ہوگا ورنہ نہیں لیکن اسلامی یا تعمیری ادب نرے واقعاتی ادب سے کچھ مختلف بھی چیز ہے۔ تعمیری ادب زمانہ کے اُبھرتے ہوئے حالات و واقعات کی صرف تصویر کشی ہی نہیں کرتا بلکہ اُن میں اپنے تصورِ زندگی کا عکس بھی پیش کرتا ہے۔ وہ حالات کا تنقیدی انداز میں جائزہ لیتا ہے اور پھر اُنھیں بنانے اور سنوارنے کے لئے ایک اصلاحی لائحہ عمل

ں کرتا ہے۔ تعمیرِ ادیب کے یہاں تری جذباتیت نہیں ہوتی ہے بلکہ جذباتیت کے
تھ ساتھ ایک رکا تھما انداز فکر بھی ہوتا ہے اس کی تخلیقات میں صالح جذبات
ساتھ ساتھ صالح افکار کی ایک معتدل آمیزش ہوتی ہے۔ تخیل کی رعنائیاں
تعمیری ادب میں پائی جاتی ہیں مگر کہیں واقعیت کی حدوں سے نہیں نکلتیں گویا
یل اور واقعات میں ایک ایسا ربط پنہاں ہوتا ہے جسے ہر صاحبِ ذوق محسوس
سکتا ہے اور واقعیت اور حقیقت سے یہ لگاؤ اس لئے ہونا چاہئے کہ اسلامی
ر سادہ مگر لطیف انداز میں پیلوں کے اندر گھر کر سکے۔

تعمیری ادب کی اس بلند منزل تک پہونچنے کے لئے ضروری ہے کہ احساسات
رجذبات میں ایک توازن ہو اور پر اضطراب ربودگی کے بجائے ایک رکا تھما
روقار انداز فکر بھی ہو۔ جذباتی ہیجان اس درجہ نہ ہو کہ حقیقت کی حدیں توڑ کر
ی شر کا موجب بن جائے میں نے اس لئے کہا کہ فکری اعتدال اور جذباتی ٹھہراؤ
بغیر اسلام جیسے سنجیدہ اور ٹھوس نظامِ حیات کو اس کی حقیقی شکل میں پیش نہیں
یا جا سکتا گویا ایک تعمیری ادیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ فکری ہمواری اور جذباتی
توازن کا مالک ہو تاکہ سیدھی راہ سے ایک قدم بھی نہ ہٹے یہی وجہ ہے کہ اسلام
یسے شعرا کو پسند نہیں کرتا ہے جن کے افکار میں کوئی استواری نہیں ہے اور جن کے
خیالات میں صالح عناصر نہیں ہیں۔ قرآن میں اسی طرف اشارہ ہے۔

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ (یہ جاہلی شعراء) ہر وادی خیال میں سرمارتے
پھرتے ہیں اور پھر یہ لوگ (کہنے کو) ایسی باتیں کہتے ہیں جن پر
خود عمل نہیں کرتے سوائے اُن کے جو (کائنات کی بنیادی صداقتوں)
پر ایمان لائے جنہوں نے (زندگی کے) اصولوں پر عمل کیا جنہوں نے
خدا کو یاد رکھا اور جنہوں نے ظلم سہنے کے بعد خدا کے قانون کی
عملاً مدافعت کی۔"

ان آیات سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ ایک اسلامی ادیب
و پہلے چاہیے کہ جو چراغ دل میں یقین کی شمع روشن کرے۔ ذہنی صلاحیتوں کو اسلامی
اصولوں پر تربیت دے لے پھر اس کی ہر ادبی تخلیق خود بخود ایک خاص مزاج اور
ایک خاص انداز کی حامل ہوگی گویا اس طرح اس کی تمام ذہنی حرکات و سکنات
کا بہاؤ ہمیشہ اسلامی راہوں پر ہوگا اور اس کی تخلیقی کیفیات خود بخود اسلامی رنگ
لئے ہوں گی۔ بغیر اسلامی تربیتِ فکر کے وہ سلجھی ہوئی طبیعت اور رکا تھما انداز
ظہور میں نہیں آسکتا جو صالح قدروں کی لطیف عکاسی اسلامی ادب میں
پیش کر سکے یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک شاعر کو قرآن پڑھنے اور سمجھنے کی تلقین
کی کیونکہ اس طرح ذہن و فکر کی اسلامی خطوط پر تربیت ہو سکے گی شعر چونکہ

شاعر کے ذہنی خیالات کا پرتو ہوتا ہے اس لئے جب ایک اسلامی شاعر قرآن میں
اپنے کو جذب کرے گا تو خود بخود اس کی ادبی تخلیقات قرآنی افکار کی پرتو فشانی ہوگی۔

عرب کا مشہور شاعر فرزدق واقعۂ جمل کے بعد بصرہ میں حضرت
علیؓ کے پاس آیا اس کے ساتھ اس کا نوجوان لڑکا بھی تھا۔
حضرت علیؓ نے اس سے کہا "یہ میرا لڑکا ہے مضر کے شاعروں میں
سے یہ بھی ایک شاعر ہے آپ اس کا کلام سنئے" حضرت علیؓ
نے فرمایا "اسے قرآن کی تعلیم دو۔"

حضرت علیؓ نے جو تلقین کی اس کا منشا یہی تھا کہ قرآن چونکہ فکرِ اسلامی کا
مرکز ہے اس لئے جب شاعر اسے پڑھتا رہے گا تو اس کے افکار میں خود بخود وہی رنگ
آجائے گا۔

اسلام کا مقصد اخلاقی قدروں کو ابھارنا ہے اس لئے وہ چاہتا ہے کہ ادب
زیادہ سے زیادہ فکری اور اخلاقی اقتباس سے پاکی اور طہارت کا آئینہ دار ہو۔
تحریکِ اسلامی کا مقصد انفرادی سیرتوں کو سدھارنا ہے اور ان کی ترکیب سے ایک
صالح سماج تیار کرنا ہے اس لئے اسلامی ادب جنسی تلذذ۔ عاشقانہ آوارہ گردیوں
اور بیجا فخر و مباہات جیسی چیزوں سے پرہیز کرتا ہے۔ محبت ضرور ایک پاک جذبہ ہے
لیکن یہ جب رندی و ہوسناکی کے بھیس میں آتا ہے تو بداخلاقیوں کے بہت سے
دروازے کھل جاتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو اسلامی ادب یا اسلامی شاعری "داستانِ
بینا و جام" ہے اور "زحدیثِ رنگ و بو" وہ کوئی "خوابِ لطیف" نہیں وہ کوئی "یا دشیریں"
نہیں وہ تو زندگی کے لئے ایک پیام عمل ہے اور نغمۂ طاؤس در باب کے بجائے
بیداریِ دل و دماغ کی ایک نوید ہے، وہاں "حق بینی" "حق اندیشی" ہے بلندیِ نگاہ
ہے اور پاکیِ دل و دماغ ہے "عشرتِ پرویز" کے بجائے وہاں "غمِ فرہاد" ہے۔ اس میں
محبت کی حرارت ہے، فلاحِ انسانیت کی تمنا ہے۔ جوشِ عمل کی نمود ہے اس کے
اشعار میں بقول اقبال وہ چمک ہے جو ظلمتِ شب میں بیٹھے ہوئے راہیوں کو راہ دکھا
اسلامی شاعر کے گیت سادھوؤں کے مگر نہایت پرسوز اس کے کلام میں راحتِ منزل
کے بجائے نشاطِ رحیل کا پیام آپ کو ملے گا۔ اس کے یہاں "جذب و مستی" بھی ہوگی۔
اور "خاموشی وہ لَے سوزی" بھی۔ اس کا کلام انسانی محبت کی ایک لطیف تصویر ہوگا۔
مختصر یوں سمجھئے کہ ایک تعمیری ادیب نقش و نگارِ زمانہ کو بگاڑتا نہیں بلکہ بناتا ہے وہ
اس مرغِ چمن کی مانند ہے جس کے نفس سے آتشِ گل کچھ اور تیز ہو جاتی ہے اور جس کی
نواؤں سے سوتی ہوئی کلیاں جاگ اٹھتی ہیں وہ نونہالانِ چمن کے لئے نسیمِ آخوت ہے
اور سوکھتے ہوئے سبزہ و گل کے لئے ابرِ رحمت۔ اس کی نگاہ میں رنگ و نسل کی بنا پر کوئی
کوئی تفریق و امتیاز نہیں۔ اس کے نزدیک شرف کا معیار نیکیوں اور صرف نیکیوں پر

ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی ادبی تخلیقات میں انسانی محبت اور انسانی اخوت کی جلوہ گاہیں ملیں گی۔

فحش ادب خواہ کتنی ہی رنگینیاں لئے کیوں نہ آئے اسلامی ادب نہ اسے معاف کر سکتا ہے اور نہ اسلامی ادیب۔ روئے زمین پر جب اسلام کا غلغلہ بلند ہوا تو اس وقت عربی شاعری عریانی و فحاشی سے اگر بالکل نہیں تو بھی بہت حد تک پُر تھی۔ اچھے اخلاق اور اچھے جذبات کی پورے طور سے حامل نہ تھی۔ خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام نے جہاں اور دوسرے شعبہائے زندگی کی اصلاحیں کیں وہیں شعبۂ ادب کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کی اور اس کے لئے کچھ اصول بھی بنائے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں شعر و ادب کی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ چونکہ انھیں سماج کی رگوں میں نیکی و اخلاق اور اخوتِ عام کا خون صالح دوڑانا تھا اس لئے انھوں نے رندی و ہوسناکی کے اظہار کی سخت ممانعت کی۔ شعرائے عرب کا یہ قاعدہ تھا کہ شریف عورتوں کے نام علانیہ اپنے اشعار میں لیتے اور ان سے عشق و محبت کا برملا اظہار کرتے حضرت عمرؓ نے اس مذموم رسم کو بالکل بند کر دیا۔ اسلام سے پہلے عرب نسلی امتیاز اور قبائلی عصبیت کی بنا پر ایک جنگجو بنا ہوا تھا۔ ہر قبیلہ کا شاعر دوسرے قبیلے کی ہجو کرتا اور نسلی امتیاز کی بنا پر دوسرے پر اپنی عظمت کا اظہار کرتا چونکہ یہ ہجو گوئی انسانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں حائل تھی۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے اسے بھی ایک جرم قرار دیدیا۔

حضرت عمرؓ ایسے اشعار پسند کرتے تھے جو انسان کے اعلیٰ جذبات کو ابھاریں اس میں ولولۂ عمل اور بلندی کردار پیدا کریں اور خود داری و ذوقِ صلح کی طرف مائل کریں یہی وجہ ہے کہ انھیں عرب کے ایک شاعر زہیر کا کلام بہت پسند تھا کیونکہ زہیر اپنے کلام میں بلند اخلاقیوں کا اظہار کرتا جب کسی کی مدح کرتا تو وا قعیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتا مطالب ادا کرتا تو سادہ و لطیف انداز میں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری کو انھوں نے یہ فرمان بھیجا تھا کہ لوگوں کو اشعار یاد کرنے کا حکم دو اچھا شعر بلندیِ اخلاق۔ اصابتِ رائے اور انساب کی طرف راستہ دکھاتا ہے تمام ضلعوں میں جو حکم بھیجا تھا وہ یہ تھا کہ اپنے لڑکوں کو تیرنا سکھاؤ شہ سواری کی تعلیم دو پاکیزہ اشعار اور عرب کی امثال یاد کرائو۔"

حضرت امیر معاویہ شعر کو ایک اخلاقی قوت تصور کرتے تھے۔ ایکبار انھوں نے فرمایا کہ شعر کو اپنا سب سے بڑا سطحِ نظر بنا لو۔ جنگِ صفین میں میں نے لیلۃ الہریر کو بھاگنا چاہا تو مجھے عمرو بن العاص کے اشعار نے ثابت قدم رکھا۔"

یہ جو میں نے اقوال نقل کئے ہیں کیا ہمارے لئے ایک پیغام نہیں ہے کیا ان سے نہیں ہوتا کہ اخلاقی قدروں کو جو ادب سمیٹتا ہے وہ عظیم شخصیتوں کو بناتا سنوارتا ہے کہ اسلام نے ادب کو ہمیشہ ایک خاص جہت میں لگانا چاہا تاکہ اس کے ذریعہ وہ حیات، وہ خیالات، وہ تصورات ابھر سکیں جو زندگی کو بناتے ہیں۔ فلاحِ انسانیت کے لئے راہیں کھولتے ہیں اور اس چلتی پھرتی دنیا کو پیامِ مسرت اور پیامِ امن دیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ کوتاہ بات کو ختم کرتے ہوئے کہ اسلام ایک نظامِ انسانی کی حیثیت سے جو اقدار اور ہمہ گیری رکھتا ہے تعمیری ادب اسے اپنے دامن میں پورے طور سے سمیٹ لیتا ہے۔ اسلامی تحریک اپنا ایک خاص مزاج اور ایک خاص انداز رکھتی ہے اور جب اس تحریک کا مخصوص مزاج اور مخصوص اندازِ فکر ایک شاعر میں پھر جاتا ہے تو اسی کے مطابق اس کا طرزِ نگارش اور اسلوبِ ادبی بنتا ہے۔ چونکہ اسلام اخلاق کی اعلیٰ قدروں کو ابھارنا چاہتا ہے اس لئے تعمیری ادیب کے اسلوبِ فکر میں ایک اخلاقی وقار، شریفانہ انداز اور لطیف ظرافت پائی جائے گی گویا ہر گوشۂ زندگی میں جس طرح اس کے جذبات و خیالات میں ایک ٹھہراؤ اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ یوں ہی اس کے اسلوبِ تحریر اور طرزِ ادا میں بھی ایک خاص شانِ متانت اور اندازِ نفاست ہوگا۔ ایک مؤمن کی رفتار میں جس طرح ایک پُر وقار کیفیت ہوتی ہے یوں ہی ایک اسلامی شاعر کے کلام اور اندازِ بیان میں بھی حسنِ شعری کے ساتھ ساتھ ایک اخلاقی رکھ رکھاؤ اور ایک شریفانہ متانت ہوگی۔ شوخی اس کے یہاں ضرور ہوگی مگر سنجیدگی کا دامن نہ تو کبھی نہ چھوٹے گا۔

بعض حقیقتیں اور بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جنھیں پورے طور سے بے نقاب نہیں کیا جاتا بلکہ انھیں بیان کرنے کے لئے رمزیہ انداز اختیار کیا جاتا ہے اسلامی ادیب کا مقصد چونکہ صحت مند جذبات اور بلند اخلاق کو ابھارنا ہے اسلئے وہ حقیقت پسندانہ طرزِ نگارش میں بھی اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ لذتِ گناہ سے کون واقف نہیں لیکن جب گناہ کا اس کی تمام لذتوں کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے تو صرف گناہ ہی کی حسین تصویر صفحۂ قرطاس پر نہیں آتی بلکہ اس میں جو لذتیں چھپی ہوئی ہیں وہ بھی ظہور میں آجاتی ہیں اور پڑھنے والے پر اپنے اثرات چھوڑے بغیر نہیں رہتیں۔ کتاب الٰہی نے ایسے مواقع پر جو اظہار بیان کا طریقہ اختیار کیا ہے وہ لطیف و بلیغ اشاریت ہے۔ زندگی میں گناہ بھی ہے اور ثواب بھی ہے۔ لذت بھی ہے اور بے کیفی بھی۔ خوبی بھی ہے اور خرابی بھی۔ شر بھی ہے اور فساد بھی۔ اس لئے تعمیری ادب جب زندگی کی عکاسی کرے گا تو اسے زندگی کے ان دونوں رخوں سے سابقہ پڑے گا ایسے مواقع پر وہ بعض برائیوں کی نقاب کشائی میں رمز و کنایہ اور لطیف اشاریت سے کام لے گا اور بھلائیوں کو ابھری ہوئی اور واضح شکل میں پیش کرے گا۔ ان کی تصویریں نہایت صاف و جلی ہوں گی کیونکہ اس طرح وہ پڑھنے والے کے ذہن میں صالح عناصر کے جذب کرنے کا میلان و اشتیاق پیدا کر سکے گا۔ قرآن جو ہمارا راہ نما

تصوف ہے اس نے ایسے موقعوں پر ہمیشہ لطیف اشاریت سے کام لیا ہے عربی زبان کی ہم بستری کے لئے یوں تو بہت سے الفاظ ہیں لیکن قرآن نے ان الفاظ میں سے چند کا انتخاب کیا ہے۔ اس انتخاب میں اس نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ایسے الفاظ رکھے جائیں جن سے تصور کی لذت میں ہلکی پڑ جائے مگر لطیف انداز میں بات بھی ادا ہو جائے۔ جنس کا لفظ جس کے معنی چھونے کے ہیں۔ قرآن نے ایسے موقعہ کے لئے اسے اختیار کیا۔ ایک جگہ اس فعل کو ڈھانک لینے سے تعبیر کیا ہے۔

یوسف زلیخا کا قصہ جو اپنی رنگینیوں کی وجہ سے عربی و فارسی شاعری میں مشہور ہے۔ قرآن جب اس حکایت کی تصویر کشی کرتا ہے تو نہایت متین و سنجیدہ انداز میں تبلیغ اشاریت کا دامن وہ یہاں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اور الفاظ کے انتخاب میں نہایت وقت نظر سے کام لیتا ہے۔ سورۂ یوسف کا یہ حصہ حقیقت پسندانہ طرز نگارش میں قرآن کے ایک خاص اسلوب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ترجمہ میں وہ زبان و بیان کا لطف تو نہ آئے گا لیکن اس سے اسلامی اسلوب کا خد و خال اجاگر ہو جائے گا۔

"یوسف جس عورت کے گھر میں قیام فرما تھے اس نے انہیں اپنی جانب مائل کرنا چاہا۔ دروازے بند کر لئے اور کہا آؤ یہ تمہارے لئے اچھا موقعہ ہے۔ یوسف نے کہا خدا بچائے میرے مالک نے مجھے ایک مرتبہ خاص عطا فرمایا ہے۔ بے انصاف کبھی فسلاح نہیں پاتے عورت نے برائی کا بالکل ارادہ کر لیا تھا یعنی یوسف بھی شاید ایسا ہی ارادہ کر چکے ہوتے اگر انہوں نے اپنے خدا کی دلیلیں نہ دیکھ لی ہوتیں۔ یہ بات اس لئے ظہور میں آئی کہ ہم اس سے برائیوں کو ہٹا دیں۔ وہ تو ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے ہے۔ بالآخر وہ دونوں آگے پیچھے دروازہ کی جانب بھاگے پیچھے سے عورت نے یوسف کی قمیص پھاڑ دی۔"

اسلام کے ادبی اسلوب بحث کا اپنی آیات سے پتہ چلتا ہے جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ اسلام جس طرح ہر شعبۂ زندگی میں اپنے ہر افراد سے ایک رکھ رکھاؤ چاہتا ہے۔ یونہی وہ ادبی طرز ادا کی تعمیر میں بھی ایک ٹھیراؤ ایک اعتدال اور ایک توازن کی طرف توجہ دیتا ہے بقول علامہ حمید الدین "قرآن مجید میں قصہ عبرت کے لئے بیان ہوتے ہیں۔ یا حکمت کے لئے؟ اس معنوں کہ پیش نظر جس طرح اسلامی ادب خیالات میں پاکیزگی کا خیال رکھتا ہے یونہی ادبی اسلوب میں بھی متانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ممکن ہے بعض لوگ اس سے یہ نتیجہ نکالیں کہ اسلامی ادب شاید کوئی خشک سی چیز ہوگی لیکن ایسا نہیں ہے۔ اسلامی ادب میں رنگینیاں تو نہ ہوں گی لیکن اس میں جاذبیت کشش۔ اور سوز و گداز ہوگا۔ اس میں حسن کی داستان رنگین تو نہ ہوگی۔ لیکن زمانہ کے مسائل کی لطیف و سادہ تصویریں ضرور ہوں گی۔

جب کسی نظام میں وسعت ہوتی ہے اور اس کی قدریں بلندی و رفعت لئے ہوتی ہیں تو اس کا اثر جب ادب پر پڑتا ہے تو اس میں بھی وہی وسعت وہی ہمہ گیری اور وہی آفاقیت آجاتی ہے۔ مرد آفاقی کی تعمیر وہی نظام کر سکتا ہے جس میں خود آفاقیت ہو جس کی قدریں ٹھوس اور دائمی ہوں اور جس میں فلاح انسانیت کے لئے ایک اضطراب اور ایک تپش ہوتی دھڑکن ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ ہر صدی میں اس نظام نے نقش دیگر۔ ترانۂ کی آرائش میں حصہ لیا ہے۔ اگر اس نظام حیات میں یہ وسعت۔ یہ ہمہ گیری۔ یہ صداقت اور یہ بلند قدریں نہ ہوتیں تو کیا اردو میں عالی و اقبال کے ترانے ہم سنتے۔ عربی میں شوقی اور رصافی کی نغمہ سنجیاں ہمارے دلوں کو گرماتیں۔

اسلام کی ہمہ گیر صداقت ہے جس نے تیرکی کی خاک سے شکیب ارسلان جیسے ادیب کی شخصیت کو بنایا۔ اور سنوارا اور وادی نیل سے محمد عبدہ جیسے شگار کی تخلیق کی۔ جمال الدین افغانی کا رسالہ عروۃ الوثقیٰ۔ اقبال کی بال جبریل اور علامہ شبلی کی تحریریں اس بات کی شاہد ہیں کہ اسلامی ادب ایک رو کھی پھیکی سی چیز نہیں ہے۔ اس میں عمل کی تڑپ ہے۔ فلاح انسانیت کے لئے اضطراب ہے ظلم کے خلاف بغاوت ہے۔ اور اس میں محبت کی حرارت ہے۔ اور تمنا کی نمود ہے۔ جو نظام حیات ہر دور میں ادب کے اندر اعلیٰ قدروں کو سمونے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ نظام اس قابل ہے کہ اس پر سوچا جائے اور غور کیا جائے۔ اسے پرکھا جائے۔ اور جانچا جائے۔

---

۴۴ کا ایک بسیط تصور موجود ہو۔ اسلام واقعی ایسا ہی ایک نظام ہے۔ یہ ایک ایسی تحریک ہے جس کے اندر فلاح انسانیت

جمیل احمد فاروقی

ہم — اور ہمارے ادبی تصورات

اسلام — زندگی — اور ادب — ہم ان میں سے کسی کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے!

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک مذہب نہیں — ایک کبھی ختم ہونے والی ریک ہے تو ذہن میں طبعاً عموم ابھرتا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام چند مخصوص عقائد و عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے تمام شعبوں حاوی ہے۔ خواہ وہ شعبہ تمدن و سیاست کا ہو یا سیاست و معیشت کا تو ساری ذہنیں جھک جاتی ہیں اور ان لوگوں کی آنکھیں بھی چمک اٹھتی ہیں جو صرف انسانی قل ہی کی کسوٹی پر سارے معاملات کو پرکھنے کے عادی ہیں!

اسی طرح جب ادب کا سوال آتا ہے اور ہم یہ کہتے ہیں کہ ادب بھی زندگی ایک شعبہ ہے اور انسانیت ادب سے زیادہ بلند ہے تو ہمارے ادبی مفکرین اسے ی تسلیم کرتے ہیں لیکن جب ہم اس گرتی ہوئی انسانیت کے لئے اسلام کو پیش کرتے ں اور ادب کی بنیاد اسلام کی فکری بنیادوں پر رکھنا چاہتے ہیں تو بعض ادبی حلقوں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ عجیب عجیب سوالات اٹھائے جاتے ہیں، طرح طرح کی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں اور ادب کو اسلامی اساس فکر سے الگ تھلگ رکھنے کھا جاتا ہے۔

اس تضاد و اختلاف کے اسباب بظاہر متعدد ہیں لیکن سب سے زیادہ واضح سبب جو عام طور پر نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ عام ادیبوں کے ذہن نہ صرف اسلام کے صوری تصورات اور تقاضوں سے ناآشنا ہیں بلکہ وہ ادب کے متعلق بھی کوئی گہرا اور توازن نقطۂ نظر نہیں رکھتے جو ان اپنے انفرادی جذبات کی عکاسی ادب سے متعلق سمجھتے ہیں اور جب اجتماعی اور ہمہ گیر انسانی تقاضوں کی ترجمانی ادب کا مقصد بنایا جاتا ہے تو وہ تلملا اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو ادیبوں کو آہنی زنجیروں میں لڑنے کے مترادف ہے اور یہ تو کسی منظم عقیدہ پرستی کی نشر و اشاعت کے لئے سنہرے ال بچھائے جا رہے ہیں۔

منظم عقیدہ پرستی اور ادب میں غیر جانبداری وغیرہ کی مفروضہ اصطلاحات

پر تو بعد میں گفتگو ہوگی۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اگر اس وقت دنیا کی تمام مختلف ادبی تحریکوں کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اگرچہ ہر دور کا ادب اس دور کی مخصوص خصوصیات۔ روایات۔ تمدن و معاشرت اور داخلی و خارجی کیفیات کا کم و بیش آئینہ دار رہتا ہے مگر نسلی و قومی۔ وطنی و ملکی تصورات کے حدود سے آگے کبھی نہ بڑھ سکا۔ کوئی خدا پرستانہ اور آفاقی تصور حیات سامنے نہ آسکا جو زندگی کی وہ تمام بنیادی قدریں جن پر ایک صالح معاشرہ کی نشوونما ہو سکتی ہے ہمیشہ ملحد ادب و بے دین انسانوں کے ہاتھوں تباہ ہوتی رہیں اور آج — سارا ادب محض خاشاک بن کر رہ گیا ہے!!

ہم اس طرح کی تمام ادبی تحریکوں اور شخصیتوں کا انکار کرتے ہیں جنہوں نے ادب کو اپنی ذاتی خواہشات کا آلۂ کار بنا رکھا ہے اور اپنی خود ساختہ راہوں پر لے جانا چاہتے ہیں۔ ہم ادب میں جانبداری اور منظم عقیدہ پرستی کے الزامات بخوشی قبول کر سکتے ہیں۔ مگر اسلام کے قائم کئے ہوئے حدود کو پامال ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے جب ہم ادب کا نام لیتے ہیں تو ہمارے سامنے صرف ایک ہی تصور ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ہمیں ایک عظیم و حسین ہستی کے سامنے ایک دن اپنی تخلیقات کا جوابدہ ہونا ہے۔ احساس ہمیں لازمی طور پر اسلام سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہونے کے لئے مجبور کر دیتا ہے ظاہر ہے کہ اس مرکزی تصور کے بغیر نہ صرف ادب بلکہ زندگی کا کوئی گوشہ بھی تخریب و فساد سے خالی نہیں رہ سکتا!

ہمارا انسانی عقل کو محدود اور نامکمل تصور کرتے ہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ صرف قانونِ الٰہی حیاتِ انسانی کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔ اگر انسانی عقل ہی کو سب کچھ تسلیم کر لیا جائے تو پھر باوجود سائنٹیفک انکشافات اور مادی وسائل کی انتہائی وسعت و ہمہ گیری کے آج ساری دنیا ایک عذاب الیم میں کیوں مبتلا ہے؟ ہر ملک کا ادب سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ کس کس طرح سے ان ادیبوں نے انسانیت پر کوڑے برسائے ہیں! کہیں انفرادی خواہشات کی تسکین کے لئے ادب برائے ادب کی تحریک چلائی گئی اور ادب کی ساری افادیت کو رومانیت کی بھٹی میں جھونک دیا گیا

اور کہیں ادب برائے زندگی کا نعرہ لگا کر جنسیت کا ہوا کھڑا کر دیا گیا۔ کسی نے زندگی کی عریاں حقیقتوں کی ترجمانی کا بیڑا اٹھایا تو اُس کی آڑ میں اپنی فطرت کی تمام غلاظتوں کو نچوڑ کر رکھ دیا اور کسی نے انسان دوستی کے پردے میں انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ ڈالا۔ آج سارا نظام درہم برہم ہے۔ انسان جانور کی سطح پر پہونچ چکا ہے اور ہمارے یہ ادبی مفکرین وہی پرانا راگ الاپ رہے ہیں۔

دوسرے اصنافِ ادب کو چھوڑ کر صرف موجودہ شعر و ادب پر نظر ڈالئے تو اس میں بھی تخریب و فساد کے بے شمار نمونے نظر آئیں گے۔ ملک کے ممتاز اہلِ قلم جن میں شاعر۔ افسانہ نگار اور ناقد بھی شامل ہیں آج بُری طرح اِس کار زیر میں منہمک ہیں ——— مثال کے طور پر ساحر لدھیانوی کو لیجئے جن کے متعلق احمد ندیم قاسمی کی رائے ہے کہ جدید شعراء میں اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے اور اُن کی جیسی مکمل انفرادیت کہیں نظر نہیں آتی۔ جاگیر اور جاگیر دارانہ نظام کی خرابیوں کے ایک خاص پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے اُس جاگیر کی طرب گاہوں کا ذکر پہلے اِن الفاظ میں کرتے ہیں ؎

میرے احباب کے ساماںِ تعیش کے لئے
شوخ سینے ہیں۔ جواں جسم۔ حسیں بانہیں ہیں

اور پھر اِن طرب گاہوں کی تفصیلات بھی سُن لیجئے ؎

سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
اِن کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے!
کس میں جرأت ہے کہ اِس راز کی تشہیر کرے
سب کے لب پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے
ہائے وہ گرم، دلآویز، اُبلتے سینے!
جن سے ہم سطوتِ آبا کا سہارا لیتے ہیں
جانے اِن مرمریں جسموں کو یہ مَریل دہقاں
کیسے اِن تیرہ گھروندوں میں جنم دیتے ہیں

بے شک اس سے زیادہ "مکمل انفرادیت" شاید ہی کسی شاعر میں پائی جاتی ہو۔ بیحیائی اور لذتیت ہی کا نام اگر مکمل انفرادیت ہے۔ اور ادب کا مقصد صرف یہی رہ جاتا ہے کہ انسان و حیوان کے فطری امتیازات کو ختم کر دے تو یقیناً ہم ایسے ادبی جواہر ریزوں کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دینا چاہتے ہیں! اب دیکھئے کہ اس شوخ و شنگ اور بلند اسلوبِ بیان کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ جس تعیری مقصد کو سامنے رکھکر جاگیردارانہ نظام پر تنقید کی جارہی ہے۔ اُس نے کس طرح کی تصویر بنتی ہے۔ اُس میں صالح قدروں کے تناسب کو کس قدر ملحوظ رکھا گیا ہے اور سب سے بڑھکر اِن اشعار کا مجموعی تاثر کیا رہا؟ جن گھناؤنے حالات کے خلاف جذبۂ نفرت اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے کیا واقعی شاعر اُس میں کامیاب رہا؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ قاری کے ذہن پر جنسی نگار کی کا وہ خوفناک اور گرانقش ثبت کر دیتے ہے کہ جاگیردارانہ سماج کا یہ ہولناک پہلو اُس کے لئے اور بھی کشش و جاذبیت کا باعث بن جاتا ہے۔ ذرا نظم کے آخری بند کو ملاحظہ فرمایئے جس سے شاعر کی تکمیلِ نفسی میں مزید مدد ملتی ہے۔ اور اُس کے اصل مقصد کی پوری جھلک سامنے آجاتی ہے ؎

ہائے یہ شام، یہ جھرنے، یہ شفق کی لالی!
میں اِن آسودہ فضاؤں میں ذرا جھوم نہ لوں!
دو دبے پاؤں اُدھر کون چلی جاتی ہے!
بڑھ کے اُس شوخ کے ترشے ہوئے لب چوم نہ لوں!

موضوع اور مواد کا جائزہ لیجئے اور شاعر کا ذہنی تجزیہ کیجئے۔ وہ کس ڈھنگ سے سوچتا ہے۔ اُس کے افکار و محسوسات میں کون سی مرکزی رَو کام کر رہی ہے اور پھر آخری بات یہ کہ کیا یہ ادبی شہ پارے آج کی کچلی ہوئی انسانیت کے لئے کوئی تعمیری تحرکات بھی رکھتے ہیں؟ شرافت و تہذیب کی پیاسی دُنیا کے لئے یہ ایک کھلا ہوا چیلنج ہے!

تخریب و فساد پھیلانے والوں نے کن کن نفسیاتی حربوں سے انسان پر ظلم کیا ہے اور کر رہے ہیں اُس کو صحیح اور پُورا پورا اندازہ اس وقت مشکل ہے۔ زندگی کے مختلف مسائل پر جب ہمارے یہ جدید شعراء قلم اٹھاتے ہیں تو تقریباً یہی انداز فکر اور یہی کھلا پن ہر جگہ ملتا ہے۔ مسعود اختر جمال اپنے مجموعۂ کلام کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں۔ "میرے جذبۂ خلوص اور احساسِ نفرت دونوں میں اعتدال کو دخل نہیں۔ انتہا پسندی میری فطرتِ ثانیہ ہے۔ اور اسی انتہا پسندی نے مجھے ڈبویا"

اسی اعترافِ شکست کے بعد "صوفی غزیبی ایک لعنت ہے" کے عنوان پر غربت اور افلاس کے لئے "نسخۂ شفا" تجویز فرماتے ہیں۔ آپ بھی سُن لیجئے اور شاعر کے ذہن کی داد دیجئے ؎

سمجھ گئے ہیں اہلِ زر کے آستانوں پر جبیں کب تک
قیامت پر رہے گا ذہن انساں کو یقیں کب تک
دکھائے گا زمانہ خواب فردوسیں بریں کب تک
اسی دُنیا کو فردوسِ بریں اک دن بنائیں گے
غریبی کو مٹا دیں گے۔ غریبی کو مٹا دیں گے

اِس غریبی اور عالمگیر اخلاقی انحطاط کے پسِ منظر پر جو تخریبی قوتیں کام کر رہی ہیں

اُن کے استیصال کے لئے آپ کے پاس کون سا ضابطۂ حیات ہے؟ کیا تصورِ آخرت کے بٹھانے کے بعد بھی ایسا انسانی معاشرہ معرضِ وجود میں آسکتا ہے جہاں دوسروں کے حقوق کی پاسداری خلوص اور دیانتداری کے دروازے کھل جائیں اور سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کے دروازے بند ہو جائیں؟ اگر اس طرح کا کوئی مثالی معاشرہ وجود میں آچکا ہے اور اسی زمین پر موجود ہے تو اُس کی برکتوں کو عام کیا جائے۔ صرف قصیدہ خوانی اور تصوریت کی خالی خولی باتوں سے اپنے ذہنی اور اخلاقی افلاس کا مظاہرہ نہ کیا جائے!

ہم جس طرح زندگی کے تمام معاملات کو خواہ وہ کسی شعبے سے متعلق ہوں ایک دوسرے سے مربوط اور منسلک تصور کرتے ہیں اور اُن میں نظم و ہم آہنگی برقرار رکھنے کیلئے خدا پرستانہ اصول و ضوابط کو ضروری سمجھتے ہیں اُسی طرح شعر و ادب میں بھی ہمارا ایک ہی زاویۂ نگاہ ہے۔ اگر دُنیا کے کسی ادبی نظریہ کے معیار پر ہمارا نظریۂ ادب پُورا نہیں اُترتا تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور نہ ہمیں اس کی فکر ہے۔ ہمارے ادب کو جانچنے کے لئے کسی ہیتھوآرنلڈ اور میکاؤلی کی ضرورت نہیں جو بنیادی اسلام اور انسانیت کی ضرورت ہے۔

یہی وہ بنیادیں ہیں جو اسلامی ادب کے لئے اصل رُوح کا درجہ رکھتی ہیں۔

یہی اُس کی امتیازی شان ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں وہ دوسری ادبی تحریکوں سے قطعی طور پر الگ ہو جاتا ہے اور کسی طرح بھی مفاہمت کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔

انفرادیت ہو یا اجتماعیت۔ داخلیت ہو یا خارجیت بڑی باتیں ہوں یا چھوٹی سی چھوٹی۔ قدرتی مناظر ہوں یا موجودہ نظام اور اُس کے گوناگوں مسائل ـــــ ہمارا صرف ایک ہی نقطۂ نظر اور ایک ہی ماخذ ہے۔ اس تھوڑی سی مدت میں ہمارا جو کچھ بھی ادبی سرمایہ منظرِ عام پر آچکا ہے وہ خواہ کتنا ہی قلیل اور حقیر کیوں نہ سہی۔ اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔

ہم نے جدید تقاضوں اور عصری میلانات کی آڑ میں نفسانی خواہشوں کا پرچار نہیں کیا ہے۔ ہم نے انسانی مسائل کے حل کے لئے روس اور نئے چین کو اپنا مطمحِ نظر نہیں بنایا یا ہم قوم پرستی۔ وطن پرستی اور شخصیت پرستی سے ہٹ کر ایک آفاقی نظامِ زندگی کی جھلک پیش کرتے ہیں جس میں انسانیت کی فلاح خدا سے باغی بنکر نہیں بلکہ صرف اُس کی مکمل اطاعت و رضاجوئی پر مبنی ہے۔

شعر و ادب کا تفصیلی جائزہ لینا اس وقت دشوار ہے تاہم ذیل میں کہیں کہیں سے بعض نظموں کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ ان سے ہمارے اُن بنیادی تصورات و عوامل Factors کا جو ہمارے شعر و ادب کے اجزائے ترکیبی کی حیثیت رکھتے ہیں ایک سرسری خاکہ تیار کیا جا سکتا ہے اور ان سے ہماری رسائی Approach کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ابوالمجاہد زاہد عالمی حکومت میں موجودہ نظام کا نقشہ یوں پیش کرتے ہیں ؎

موت کا ہے سناٹا ؛ زیست کی فضاؤں میں
وحشتیں برستی ہیں ؛ پیار کی گپھاؤں میں
حُسن آدمیت ہے ؛ شہر میں نہ گاؤں میں
اقتدار بازی ہے ؛ مختلف خداؤں میں

اور پھر امن و مسرت کے متوالوں سے صاف صاف کہہ دیتے ہیں ؎

امن و مسرت کے ؛ خواب دیکھنے والو
زندگی کی رفعت کے ؛ خواب دیکھنے والو
حُسن آدمیت کے ؛ خواب دیکھنے والو
عالمی حکومت کے ؛ خواب دیکھنے والو

بے نیاز ہو کر تم ؛ حکمتِ خدائی سے
بے نیاز ہو کر تم ؛ فکرِ ابتدائی سے
بے نیاز ہو کر تم ؛ راہِ مصطفائی سے

امن کی سجے رنگیں ؛ پی پلا نہیں سکتے
زندگی کی رفعت کے ؛ گیت گا نہیں سکتے
روئے آدمیت کو ؛ جگمگا نہیں سکتے
عالمی حکومت کی ؛ چھاؤں پا نہیں سکتے

عورت کی بے پردگی اور بے حیائی پر عبدالقدیر اصغر کے تاثرات سنئے

آپ کے چہرے سے ظاہر ہیں غلامی کے نقوش
کون کہتا ہے کہ تقلید کے بندھن ٹوٹے
میں نے تنقید کے معیار پر پرکھا تو نظر آیا مجھے
نئی تہذیب مصائب کا مداوا تو نہیں
کچھ دی فطرتِ انسان کا تقاضا تو نہیں
حُسن آزاد ہے بازاروں میں آوارہ پھرے
مرد کی خواہش و جذبات کی تسکیں کے لئے

آہ! عورت کی خودی جانے کہاں سوتی ہے
اپنی بربادی و تضحیک پہ خوش ہوتی ہے

(ملاحظہ فرمایئے صفحہ ۳۳)

متین طارق

عورتوں کیلئے لمحۂ فکر

دنیا میں ہر کام کسی نہ کسی فائدے کے پیشِ نظر اختیار کیا جاتا ہے مگر بُرا ہونا تجربہ کاری کا کہ اکثر بنے بنائے کام بگڑ جاتے ہیں، طے شدہ تدبیریں اُلٹ جاتی ہیں اور انسان بے چارا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ عورت کے معاملے میں بھی کچھ ایسی ہی بات ہوئی سوچا کیا تھا ہوا کیا وہ دبی دبی سہمی سہمی زندگی گذار رہی تھی گھر کی چہار دیواری میں خادمہ کی طرح کام کرتی اور مرد کی مرضی کی غلام تھی اُسے دوزخ کا ایسا کندہ کہا جاتا تھا جس میں جان تھی نہ رُوح۔

آخر یہ طلسم ٹوٹا اور احساس ہوا کہ عورت جیتا جاگتا وجود ہے اُس کے اندر بھی رُوح ہے دل و دماغ ہیں احساسات و جذبات ہیں مختلف قسم کی قوتیں ہیں نیز عورت و مرد کی کام کرنے کی صلاحیتوں میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں اس لئے ضروری ہے کہ وہ تمدن کی تعمیر میں شریک ہو مرد کے قدم بقدم گھر، بازار، حکومت، کارخانوں اور دفتروں میں کام کرے ویسے بھی انسان فطرتاً آزاد پیدا ہوا ہے پھر وہ کونسا معیار ہے جس کی بنا پر عورتوں کو آزادی سے محروم رکھا جائے۔

چنانچہ مساوات کی اس آرزو میں عورت گھر کی چہار دیواری سے باہر آگئی اُس نے مردوں کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے کاموں میں حصہ لیا اور طالبات عورتوں پروفیسر عورتوں۔ ڈاکٹر عورتوں۔ وکیل عورتوں حتیٰ کہ لوہار عورتوں تک کی اچھی خاصی تعداد ہر طرف نظر آنے لگی۔ لیکن کیا کیا جائے نتائج کا کہ وہ زبانِ حال سے گویا ہیں کہ

اے بیتیں کے ٹکڑے کو سونا سمجھنے والو!

"آج نہ مردوں میں عزت باقی ہے نہ عورت میں عفت زندگی تباہ ہے۔ نیز آج نہ عورت کو مرد کی پرواہ ہے نہ مرد کو عورت کی دوست واحباب کے لئے فی زمانہ بہترین تحفہ بیوی اور بیٹی ہے اور عزت کے لئے سب سے مسرور کن نظارہ مرد کی نگاہ شہوت ہے۔"

(الانصاف ۔ ۲۸ فروری ۱۹۵۲ء)

یہ امریکی دانشمند کا قول ہے جو آج کی تہذیب کا پروردہ ہے لیکن موجودہ فحاشی و عریانیت کو دیکھ کر چپ نہیں رہ سکا۔ اسی سلسلے میں مشہور فیلسوف ژول سیمان کے الفاظ بھی اہمیت سے خالی نہیں وہ لکھتا ہے کہ

"اٹھارویں صدی میں لوگوں کو شکایت تھی کہ عورتوں کی تہذیب و تربیت پر ذرا بھی توجہ نہیں دی جاتی مگر آج عورتوں کی تہذیب اعتدال کی حد سے گذر کر افراط کے مرتبہ تک پہنچ گئی ہے۔"

جس کے ثبوت کے لئے انگلستان کے ڈیلی ٹیلی گراف کے یہ اعداد شمار کافی ہوں گے جس میں مارٹن مورنے "گناہ کا پہلا قدم" کے عنوان سے راہ روی کی نشان دہی کی ہے۔

"گذشتہ سال، ۱۹۵۰ لڑکے اور اٹھارہ سولہ لڑکیاں گھناؤنے جرائم میں مبتلا ہوئیں۔"

یہ اعداد و شمار کسی طرح بھی خوش آیند نہیں کہے جاسکتے نہ عورتوں کے لئے نہ مردوں کے لئے بھلا ایسا کون عورت ہوگی جو دیدہ و دانستہ اپنے جسم و جان کو ہوس مایانوں کے لئے وقف کرے اور پھر یہ سب کس لئے محض پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کے لئے اُسے چند پیسوں کی ضرورت ہے جس کے لئے وہ ماری ماری پھرتی ہے۔ در در جاتی ہے۔ ٹھوکریں کھاتی ہے خوشامدیں کرتی ہے جھڑکیوں میں کوملاہٹ ہے۔ اور کڑوے۔ ناگوار دھوئیں میں سانس لیتی ہے یہاں تک بسا اوقات بھوک کی ناقابلِ برداشت تکلیف سے نجات پانے کے لئے خودکشی بھی کرلیتی ہے۔

عورت و مرد دونوں ہی تمدن کی گاڑی کے پہیے ہیں انہیں کے سہارے زندگی آگے بڑھتی ہے اگر ایک کو دوسرے سے الگ رکھا گیا تو ہو سکتا ہے کہ اکیلا چنا بھاڑ کو نہ جھونک سکے اسی لئے اس سلسلے میں حرص و جلد بازی اچھی نہ تھی دیکھنا یہ تھا کہ عورت عورت رہ کر جیے یا مرد بنکر نیز وہ کیا فرائض ہیں جو فطرتاً اُس پر عائد ہوتے ہیں اور کیا کوئی ایسی اساس ہو سکتی ہے کہ عورت ترقی حاصل کرسکے۔

عورت کا اصل مقام

یہ تو ظاہر بات ہے کہ بحیثیت انسان عورت مرد سے پیچھے نہیں اُس کو قدرت نے دل و دماغ عطا کیا ہے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے اُس کی اس قوت پر کسی طرح بھی پہرہ نہیں بٹھایا جاسکتا۔ وہ جس طرح رونے اور ہنسنے میں آزاد ہے اسی طرح سوچنے سمجھنے اور زندگی کو بنانے بگاڑنے میں بھی آزاد ہے لیکن یہ آزادی قدرت نے جس طرح ہر ذی روح کو ایک خاص حد تک دی ہے اسی طرح عورت بھی اِس قانون کی پابند ہے جو فہم و عقل کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ کچھ فرائض بھی عائد کر دیئے ہیں نیز اُسی کے لحاظ سے قوتیں اور اعضاء کا تناسب عطا کیا گیا ہے۔

چنانچہ توسیع نسل انسانی اور اُس کی حفاظت و تربیت عورت کے فرائض ہے جس کو مشکل ہی سے بانٹا جا سکتا ہے مرد کے بغیر بچہ ہونا ممکن ہے مگر عورت کے بغیر محال جس کے لئے اُس کے جسم کو ایک خاص قسم کی ساخت پرداخت عطا کیا گیا جو بقائے نسل کے کام میں معاون ہے شعر و شاعری محض لفاظی فلسفہ و حکمت محض افسانہ ہے لیکن بچے کا پیدا کرنا ایک حقیقت ہے جس کی طرف اقبال نے بھی اشارہ کیا ہے ؎

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اِسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

فطرت کا صرف ایک منشاء ہے بقائے حیات اس کے حصول کا اہم ترین ذریعہ عورت ہے اب بالفرض اگر اُس ذمہ داری سے الگ ہو کر جو قدرت نے مقرر کر دی ہے عورت سے کوئی کام لیا بھی جائے تو اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اکثر و بیشتر اپنی فطری عاجزی کے باعث وہ ناکارہ ثابت ہوگی بہت سی ضرورتیں ادھوری پائے سے رہ جائیں گی بقول شخصیکہ اگر عورتیں کی بھی فوج محاذِ جنگ پر کام کر رہی ہو اور ایسے وقت اُن میں کثیر تعداد ایام مخصوص کی شکار ہو جائے جو کچھ بعید بھی نہیں تو شاید سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔

آج کل ضبطِ تولید کی تحریک بھی زوروں پر ہے لیکن یہ کون نہیں جانتا کہ بچے خدا کا جلوہ اور گھر کے چراغ ہیں جس گھر میں بچے نہیں وہ گھر ویران ہے جس کی گود بھری ہے بھی زیادہ بھیانک ہے۔ دن رات کی علاوتیں ایک دائمی بیزاری کی نذر ہو جاتی ہیں زندگی کاٹے نہیں کٹتی جس کی ابتداء ہی اس کی انتہا معلوم۔

تلاشِ معاش

پھر اس ساری جد و جہد کا مقصد ہوا ہے اس کے کچھ نہیں کہ پیٹ بھر روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا ورکار ہے ایک وقت تھا کہ عورت کو یہ سب چیزیں بلکہ اور مزید آرام و آسائش گھر بیٹھے نصیب تھیں وہ اپنی مرضی سے صرف کرتی اور بشاش رہتی تھی لیکن اب وہ سخت محنت کے بعد چند پیسے کماتی ہے اپنا حسن اور اپنی رعنائی کو کرای جانفشانی کی نذر کر کے پیٹ بھرتی ہے۔

یہاں ہم یہ نہیں کہتے کہ عورت کمزور ہے یا وہ ایسے کام نہیں کر سکتی جیسے مرد بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ آیا لطف زندگی اس میں ہے کہ مرد تلخ و ناگوار صعوبتوں کو برداشت کر کے ضروریاتِ زندگی فراہم کرے اور عورت گھر کی مالکہ کی حیثیت سے انہیں استعمال کرے یا اس میں ہے کہ وہ تلاشِ معاش میں ایک دوسرے دوسرے زبردست ماری ماری پھرے۔ ہٹ دھرمی کی دوسری بات ہے ورنہ غلام گردش کوئی مستحسن فعل نہیں پھر اس کے علاوہ جب عورت بے محابا بازار میں آتی ہے تو مرد کی حرص نگاہیں اُس کا پیچھا کرتی ہیں دکان ہو کہ موٹر ہر جگہ پر گھورتی ہیں جس سے کمسن عادتیں۔ گندہ خصلتیں اور جنسی آوارگی پرورش پاتی ہیں جس میں نقصان ہمیشہ عورت کا ہی ہوتا ہے ایک مرد دوسروں کی نگاہوں میں مقام حاصل کر سکتا ہے مگر عورت کا پردہ کسی حال بھی ڈھکا نہیں رہ سکتا اسی لئے علامہ پرڈون نے عورتوں پر ترس کھا کر کہہ ہی دیا کہ

"میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا جس کا نام آج کل لوگوں نے عورت کو آزادی دلانا رکھ چھوڑا ہے میری یہ خواہش ہے کہ اگر ضرورت اور حالت کا اقتضاء ہو تو زمانہ سابق کی طرح میں عورت کو قید کرنے کا مشورہ دوں"

پردہ

اگرچہ کہ یہ باتیں شدید جذبے میں کہی گئی ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ صنفِ نازک اور عصمت دری کے مقابلے میں اپنے اندر گوناگوں مفاد بھی رکھتی ہیں گو کچھ کوتاہ عقل اور حق ناشناس لوگوں نے عورت کو یقین دلایا ہے کہ پردہ عورت کے کمال میں مانع ہے اس سے اُس کے جوہر کھل کر سامنے نہیں آتے نیز اُس کی صحت پر اثر انداز ہو کر اُس کو نحیف و ناتواں بنا دیتا ہے لیکن یہ سب اعتراضات یا تو من گھڑت ہیں یا مستعار لیے ہوئے ہیں ورنہ جس کثرت سے امراض و خودکشی کے واقعات کھلے بندوں پھرنے والی عورتوں میں نظر آتے ہیں اتنے پردہ نشین عورتوں میں نہیں جس کی شاہد ریویو آف ریویوز جلد ۱۱ ایڈیشن کی سرکاری رپورٹ ہے کہ وہاں پانچ سال کی مدت میں ۵۶۹ عورتوں نے خودکشی کی اور اتنے ہی عرصے میں ملک فرانس کے اندر ۵۸۶۹ عورتیں خودکشی کر کے مریں۔

نیز دو ملکوں کا حال ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نسبت کے چوتھے حصے میں کیا حال ہوگا۔ جہاں واقعی عورتیں بے پردہ ہیں ہمارا کام صرف اعداد و جمع کرنا نہیں ورنہ اچھا خاصا چٹھا تیار ہو سکتا ہے البتہ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ صرف پردہ پردہ کہنے اور چادر کی اوٹ کرنے سے مقصد پورا نہیں ہوتا بلکہ اس کی اصل ایمان و حیا ہیں کیونکہ یہ ایسا مستحکم قلعہ ہیں جس کے حصار میں رہ کر عورت اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کر سکتی ہے لیکن جہاں ایمان نہ ہو

وہاں بے پردگی عام ہوتی ہے اور جہاں بے پردگی ہوتی ہے وہاں آپ سے آپ بے حیائی چھا جاتی ہے کیونکہ نسل انسانی کی کچھ ایسی عادت ہے کہ اِدھر بقدر امکان موقع ملا اور وہ گناہ و معصیت کی طرف جھکی چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج متمدن ممالک گندگیوں کا منبع بن گئے ہیں وہاں گلی گلی۔ کوچے کوچے اور گھر گھر میں بدچلنیوں کے اڈے ہیں جن کو دیکھ کر آخر کار لوگ چیخ اٹھے ہیں کہ

"واشنگٹن اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ آزادی نسواں ایک حسین دھوکہ ہے یہاں تمام سرائیں اور شراب خانے بدچلن عورتوں سے بھرے ہیں نوآموز لڑکیاں عصمت فروشی کے لئے باقاعدہ بھرتی کی جاتی ہیں جنہیں قانوناً اکیلے رہنے کی آزادی ہے یہ دن میں حکومت کے دفتروں میں کام کرتی ہیں اور رات کو پارک پارکوں میں لڑکوں کی تلاش میں چکر کاٹتی ہیں جن کے ساتھ آزادانہ جنسی حرکات کا لطف اٹھاتی ہیں واشنگٹن اور کمپنی گورنس الگ الگ ہیں۔ (یقین کرائیے)

یہ پکار بانگ اسرافیل سے کم نہیں مگر اُن کے لئے جو کچھ عمل و خرد رکھتے ہیں ایک واشنگٹن کیا ہر ہر شہر میں یہی گل کھل رہے ہیں۔ گھر، بازار، دفاتر سب جگہ شہوانی بدمستی کی فراوانی ہے جس میں بڑے سے لیکر چھوٹا تک ملوث ہے جس کو حکومت کے نرسری ہاؤسز نے اور بھی عام کر دیا ہے جس کے بعد ماں۔ بیٹی۔ بہن کی تمیز بھی اٹھ جاتی ہے دن بھر میں ہزاروں واقعات ایسے سننے میں آتے ہیں کہ کانوں میں انگلیاں دینے کو جی چاہتا ہے۔

ان واقعات کو دیکھ دیکھ کر لوگ ردِ عمل کی طرف بھی جھکنے لگے ہیں۔ چنانچہ "الانصاف الہ آباد" کی حالیہ اشاعت کے تلخ و شیریں کے کالم میں سب سے زیادہ آمدنی کے عنوان سے اطلاع دی گئی ہے کہ

"مصر میں عصمت فروشی کی کمائی حکومت کی آمدنی سے زیادہ ہے جس کے لئے وہاں کی نئی حکومت کے کرتا دھرتا قانون بنا رہے ہیں جس کی رُو سے ان رقاصاؤں کو پرائیویٹ محفلوں میں رقص کرنے کی ممانعت ہو گی۔"

یہ اقدام بہت مبارک ہے خدا کرے لوگ موجودہ گندگی کی بنیاد معلوم کر کے اسے ختم کر سکیں لیکن آگے چل کر اخبار مذکور رقمطراز ہے کہ

"معلوم نہیں کہ جنرل نجیب کا یہ اقدام ماڈرن دنیا میں کس عینک سے دیکھا جائے گا کیونکہ تہذیب جدید کی رُو سے یہ تو مظلوم عورتوں کو ان کے روزگار سے محروم کرنا ہے پھر آخر فیشن نے عورتوں کی ضروریات کو بھی تو بڑھایا ہے جن کے بل پر انگلستان و امریکہ کے بہت سے کارخانے محض بناؤ سنگار کی اشیا و تیار کر کے چل رہے ہیں۔ ورنہ دوسری صورت میں وہ بالکل بند ہو سکتے ہیں؟"

واقعی اس مسئلے میں یہ پہلو بھی غور طلب ہے کہ عورت کو چراغ خانہ سے شمع انجمن بنانے والے کہاں تک اُس کے بھی خواہ ہیں اور کہاں تک مفاد پرست نیز عورت جیسے قابلِ احترام وجود کو گھوڑوں اور گایوں کی طرح نمائش میں پیش کر کے وہ صنف نازک کی خدمت کر رہے ہیں یا اُس کو واہیات اور کمینہ نفس کا سامان فراہم کرنے کے لئے اپنا آلہ کار بنا رہے ہیں۔

یہ ہے ایک مختصر سا واقعاتی جائزہ جس کو نہ اچھا یا جا سکتا ہے نہ اچھا ہی کہا جا سکتا اگرچہ دنیا میں ایسے بھی آدمی ہیں جن کو گندہ رہنا پسند ہے مگر انسانیت کی نظر میں اُن کا مقام معلوم اسی طرح جنسی کاروبار کو بڑھتے ہوئے دیکھکر خوش ہونے والے بھی مل سکتے ہیں مگر نتائج اعمال کی دنیا میں اُن کا کوئی مرتبہ نہیں اس لئے ہمارے خیال میں اس مسئلے پر بجائے مردوں کے خود عورتوں کو ہی غور کرنا چاہئے کیونکہ یہ اُن کا اپنا معاملہ ہے اگر کچھ نقصان ہو گا تو اُس کو خود انھیں اٹھانا ہے اور اگر کچھ فائدہ ہے تو بہرحال وہ اُس کی حق دار ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ تمدنی زندگی میں عورت کے اشتراک سے ملکی ثروت اور قومی دولت میں اضافہ ہوتا ہے مگر اس کے بدل میں جو چیز خزانۂ انسانیت سے نکلتی ہے وہ بہت بیش بہا جس کو کھونے کے بعد ہزار کوششوں سے بھی واپس نہیں لائی جا سکتی اسی لئے ہمارا اعتقاد ہے کہ اگر اس منزل میں عورت نے ذرا بھی تدبر سے کام لیا تو حقیقت کو پا لے گی۔

بات یہ ہے کہ جب تک کوئی چیز ڈھکی چھپی رہتی ہے اُس وقت تک اُس کے عیب و ہنر پر حکم نہیں لگایا جا سکتا لیکن جب وہ کھل کر سامنے آجاتی ہے تو معمولی سمجھ رکھنے والا بھی اُس کے اچھا یا بُرے ہونے کا فیصلہ دے سکتا ہے چنانچہ آج عورتوں کی آزادی کا مسئلہ جو دراصل ایک اہم مسئلہ ہے جس پر پچھلے کتنے ہی برسوں سے نہ صرف تبادلہ خیال ہو رہا ہے بلکہ آثار و نتائج بھی کھل کر سامنے آچکے ہیں اب اُس پر ضد اور ہٹ دھرمی اچھی نہیں عورتیں نہ علمی لذت سے ناآشنا ہیں اور نہ عقلی نشو و نما سے محروم بلکہ برخلاف اس کے مردوں کی طرح ہر میدان میں جوہر دکھا رہی ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی خود مختیاریت کی بدولت تمدن و معاشرت کے تانے بانے کو اس طرح اُلجھے ہیں کہ اب سلجھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ یورپ جس نے ایک فصل بعید سمجھکر اس کو اپنایا تھا اب پانی کو سر سے گذرتے دیکھکر ماتم کناں ہے کہ

"عورتوں کا طبعی فرض نوع انسانی کی حفاظت اور تربیت ہے اس دائرے سے جب وہ باہر قدم نکالتی ہے تو عورت نہیں رہتی

بلکہ عورت اور مرد کے علاوہ ایک تیسری جنس کا نمونہ بن جاتی ہے
مرد تو اس لئے نہیں رہتی کہ مرد سے طبعاً اور ترکیباً مختلف الجنس ہے
اور عورت اس لئے نہیں کہ ان کا عمل فرائض نسوانی سے بالکل جدا ہے"

(پروفیسر جیوم فریڈو)

یہی مصنف آگے چل کر بطور پیشین گوئی کہتا ہے کہ

"اگر عورتوں کی یہی افسوسناک حالت اسی طرح کچھ عرصہ قایم رہی تو کچھ لینا چاہئے کہ عنقریب سوسائٹی میں ایک عظیم الشان خلل پیدا ہونے والا ہے جو تمدن و معاشرت کی بنیادوں کو متزلزل کر دے گا"

صنفی انارکی کی یہ شکل جس نے عورت کو عورت نہیں رہنے دیا ہے۔ واقعی انتہائی خطرناک ہے کیونکہ جہاں تک عورتوں کی تہذیبی و اخلاقی ترقی کا سوال ہے اس کا نہ کوئی مخالف اور نہ اس کے لئے کوئی رکاوٹ لیکن جہاں تک سبھا کی پری "بننے کا معاملہ ہے وہ نہ صرف معیوب ہے بلکہ خود صنف نازک کے لئے مضر ہے اور یہ غیر "یعنی" صنگ اس کو گھر اور گھاٹ دونوں جگہ سے کھو دیتا ہے اور کھو رہا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ مسئلہ کی صحیح نوعیت سامنے رکھکر غور کیا جائے۔

(باقی آئندہ)

ہم ——— اور ہمارے ادبی تصوّرات ! ——— بقیہ صفحہ ۲۰

میں نے تہذیب کے رنگین فسانوں کے عوض
تلخیاں جامِ حقیقت کی طلب کر لی ہیں
آپ کہہ دیں گی قدامت کا پرستار مجھے
میں مگر وقت کی لہروں پہ نہیں بہہ سکتا
میں فسانوں کو حقیقت تو نہیں کہہ سکتا

اور آج یہ کاروانِ حق کس منزل پر ہے ——— انور صدیقی اس کا بھی اعلان کر دیتے ہیں ———

"جہانِ نو" جسے الحاد نے سجایا تھا
اب اُس کے محلوں کی بنیاد ہلنے والی ہے
وُہ ہند کے کفر کے پیچھے کھسک رہے ہیں ندیم
نئے سماج کی اب شمع جلنے والی ہے

غالباً اب یہ اشعار کسی تشریح کے محتاج نہیں رہ جاتے ———

سید احمد سید میرٹھی

غزل

تو جو کچھ کہلوائے پیرہن کہنا ہی پڑتا ہے
چمن کے نوحہ خواں کو نغمہ زن کہنا ہی پڑتا ہے

میں گو مجرم نہیں لیکن کمالِ جور تو دیکھو
کہ خود کو قابلِ دار و رسن کہنا ہی پڑتا ہے

حمیّت کھو چکا ہوں یا تقاضا ہے محبّت کا
تجھے اے تلخ گو شیریں سخن کہنا ہی پڑتا ہے

جنہیں ہم پر کبھی انگلی اٹھانے کی نہ جرأت تھی
جھکا کر سر انھیں اب تیغ زن کہنا ہی پڑتا ہے

جفاکاری، دلآزاری، ستم سازی، دغا بازی
تری خاطر سے ان عیبوں کو فن کہنا ہی پڑتا ہے

جہاں بیگانۂ آدابِ گلشن کا تسلّط ہو
وہاں تنکے کو بھی سروِ چمن کہنا ہی پڑتا ہے

محبّت بے وفاؤں سے، وفاداروں سے ہے نفرت
عمل کو ان کے یہ دل شکن کہنا ہی پڑتا ہے

الم مظفر نگری

غزل

بگڑنے پر بھی تو دُنیا کی رونق کم نہیں ہوتی
یہ وہ محفل ہے برہم ہو کے جو برہم نہیں ہوتی

نہیں آساں مزاجِ حُسن کے تیور سمجھ لینا
گلوں کی رازداں اِک رات میں شبنم نہیں ہوتی

ہے پیغام فنائے زندگی اہلِ محبّت کو
وہ دل کی ایک دھڑکن جو نویدِ غم نہیں ہوتی

بہر عالم حریمِ عشق کو پُر نُور رکھتا ہے
وہ اِک شعلہ کہ جس کی لَو کبھی برہم نہیں ہوتی

وقارِ زندگی کی وہ حفاظت کر نہیں سکتا
نظر جس کی حریفِ گردشِ عالم نہیں ہوتی

پتنگوں کے تڑپنے شمع کے رونے سے ثابت ہے
وہ محفل ہی نہیں جو محفلِ ماتم نہیں ہوتی

مغنی تیرا نغمہ گرمیِ محفل سہی لیکن
شکستِ سازِ دل کی بھی صدا کچھ کم نہیں ہوتی

کہاں ہے تبصرہ ممکن محبّت کی تباہی پر
نظر کے سامنے جب خلوتِ ہر غم نہیں ہوتی

الم وہ قوم جو تاجِ شہی پر ناز کرتی ہے
شناسائے مزاجِ گردشِ عالم نہیں ہوتی

برقؔ کاکوروی

غزل

ذرا بڑھنے تو دے بیتابیِ جوشِ جنوں ساقی
علم باطل کا ہو جائے گا خود ہی سرنگوں ساقی

ابھی شائستۂ منزل نہیں میرا جنوں ساقی
نہ جب تک ٹوٹ پائے گا یہ باطل کا فسوں ساقی

وہ اپنے کام آئے یا کہ بیگانوں کے کام آئے
کسی مصرف کا ہو جائے یہ میرے دل کا خوں ساقی

تمنا، آرزو، اُمید، سب کا خوں کیا برسوں
بڑی مشکل سے آئے ہیں یہ آدابِ جنوں ساقی

خلوصِ دل سے مل جائے تو بیڑا پار ہوتا ہے
بہت کافی ہے راہِ عشق میں تھوڑا سا خوں ساقی

خود اپنے جیب و داماں سے اُلجھ پڑتے ہیں دیوانے
ابھی دیوانگی ہے ان کی محرومِ جنوں ساقی

حصولِ گوہرِ مقصود آسانی سے ناممکن
ہزاروں بار ہوتا ہے تمناؤں کا خوں ساقی

ہوس کے جال میں پھنس کر محبت ہو گئی رُسوا
محبت پاک دامن ہے یہ میں کیونکر کہوں ساقی

یقین و عزم ہاتھ آئے تو دُنیا برقؔ کی ہو گی
حصارِ کوہ سے کچھ اور کیا آگے بڑھوں ساقی!

جون ۱۹۵۳ء

عرشی بھوپالی

کوئی ساغر بکف اور کوئی تماشائی ہے
یہ تو ساقی ترے میخانے کی رسوائی ہے

امن کے نام پہ اک جنگ نئی چھیڑوں گا
سُرخ جھنڈے کی سٹالن نے قسم کھائی ہے

وہی شعلے، وہی گلچیں، وہی آدابِ قفس
کون کہتا ہے گلستاں میں بہار آئی ہے

زہر برسائیگی کیا کیا یہ بتائیں کس کو
سُننے میں چین میں اک سُرخ گھٹا چھائی ہے

ہو گئی رُوس میں شدّاد کی جنّت تیّار
آہنی پردے کے پیچھے سے خبر آئی ہے

ابوالمجاہد زاہد

بادۂ دورِ نو ہے عام اے دِل
پھر بھی انساں ہے تشنہ کام اے دِل

نہج روشن کی آمد آمد ہے
ہچکیاں لے رہی ہے شام اے دِل

بڑھکے منزل تجھے پکارے گی
اٹھ تو لیکر خدا کا نام اے دل

عقل بھی کھو گئی اندھیرے میں
اب تری روشنی ہو عام اے دل

سوز ایماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
زندگی ہے اِسی کا نام اے دل

واقف۔ رائے بریلوی

زندگی کے غم کو سینے سے لگانا ہی پڑا
اِس حقیقت پر ہمیں ایمان لانا ہی پڑا
میری "گمراہی" سے نکلے منزلوں کے راستے
رہنماؤں کو بھی میرے ساتھ آنا ہی پڑا
دھیرے دھیرے زندگی کی تلخیاں راس آگئیں
رفتہ رفتہ تیرے غم کو بھول جانا ہی پڑا
ہائے پھولوں کی محبت نے دیئے کیا کیا فریب
چند کانٹوں کو بھی سینے سے لگانا ہی پڑا
رفتہ رفتہ آگئے طوفان ساحل کے قریب
جو تھے ساحل پر انھیں بھی ڈوب جانا ہی پڑا

محمد انصار اللہ نظر

ٹھوکریں دربدر وہ کھاتے ہیں
اُس کے در سے جو سر اُٹھاتے ہیں
زندگی تھی کہ آفتاب کی دھوپ
صبح آئے تھے شام جاتے ہیں
قابلِ رشک عشق ہے ان کا
جو تہِ تیغ مسکراتے ہیں
ہو کے ہر آستاں سے ہم مایوس
پھر ترے در پہ سر جھکاتے ہیں
تیرے دیدار کی لئے حسرت
تیرے کوچے میں خاک اُڑاتے ہیں
جور افلاک کا نہیں شکوہ
رنج یہ ہے کہ وہ ستاتے ہیں
یہ بھی ان کا کرم ہے ورنہ نظر
کب کسی کو وہ آزماتے ہیں

کشمکش

محمد نجات اللہ صدیقی

اور وہ سائیکل سیمت نیچے گرتے گرتے بچا۔ کتنی سخت بدتمیزی کی حرکت تھی۔

یہ ایک نیم عریاں شوخ لڑکی نے اپنی سائیکل قصداً اُس سے اتنے قریب ہو کر گذاری کہ دونوں کے بدن لڑتے لڑتے رہ گئے۔ سلیم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بڑی مشکل سے وہ سائیکل کا توازن برقرار رکھ سکا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا سانحہ تھا اور بالکل اچھوتا۔

اس نے سامنے نگاہ ڈالی۔ وہ شوخ لڑکی دُور جا چکی تھی لیکن بار بار مڑ مڑ کر دیکھتی اور ہنستی جا رہی تھی۔ وہ اکیلی نہ تھی کئی سہیلیاں اور بھی سائیکلوں پر اس کے ساتھ تھیں۔ جیسے یہ ان سب کی مشترکہ سازش کا نتیجہ ہو۔ اس نے سوچا اور وہ سب اپنی کامیابی پر مسرور تھیں۔ بعض اسی کالج ہی کی لڑکیاں تھیں اور بعض کسی دوسرے کالج کی۔ اب وہ کافی دُور نکل چکی تھیں۔ وہ پہچان نہ سکا۔ سلیم نے چاروں طرف سڑک پر نظر دوڑائی۔ شام کے کوئی پانچ بجے ہوں گے۔ سڑک پر ٹریفک کا ہجوم تھا۔ کالج کے طلبہ۔ نوجوان کلرک۔ شوقین بوڑھے۔ سنجیدہ طبع لوگ اور عورتیں۔ سبھی تھے۔ کوئی پورا مسکرایا جیسے کوئی جوابی حرکت نہ کرنے پر اسے بدھو بنا رہا ہو۔ کوئی شبہ کی نظروں سے دیکھ کر رہ گیا اور کسی نے کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ ایک عام بات جو تھی۔ لیکن سلیم کے لئے یہی واحد موضوعِ فکر بن گیا۔ سڑک نہ ہوئی کالج ہو گیا۔ جب سے اس نے کالج میں داخلہ لیا تھا اپنے کو ایک عجیب ماحول میں پا رہا تھا۔ وہ جہاں تو غیر معاملہ نظر بازی اور جملے چھینکنے تک ہی محدود رہتا لیکن فاضل اوقات میں ملاقاتیں اور بات چیت۔ فلم اور فلمی ستاروں پر تبصرے۔ ریستوران میں گپ بازی اور ریفریشمنٹ اور شام کو پارک یا پکچر ہاؤس میں ملنے کے وعدے سبھی کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا رہتا اور وہ بدھو بنتا رہتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اتنے نیچے نہ گر سکتا تھا۔ اس کے ساتھی کہتے۔ تم ترقی نہیں کر رہے ہو لیکن اسے تنزل کرنا گوارا نہ تھا ——— اور یہاں پہنچ کر وہ سائیکل سے اتر جانے پر مجبور ہو گیا۔ سوچا اور سائیکل چلانا ویسے ہی دوبھر مشکل تھا اب تو آگے بھیڑ کی وجہ سے راستہ جام تھا۔ رکشوں تانگوں موٹروں کی ریل پیل میں پیدل کی تو نبھ جاتی ہے لیکن کسی محو خیال سائیکل سوار کے لئے گذرنا ناممکن تھا ——— مگر اب وہ کیا سوچے۔ خیالات کا راستہ بھی تو مسدود تھا۔ تنزل نہیں گوارا۔ بہت خوب۔ کیا کہنے لیکن اب سوچنے کا رخ ذرا بدلنا پڑا۔ پہلے وہ کسی اجنبی عورت کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ سمجھتا تو وہ اب بھی ہے لیکن پہلے وہ نظریں بھی بچا کر رکھتا تھا۔ یہ اس کے خاندانی ماحول کا فیض تھا۔ اس کی فطری شرم و حیا بچپن کے ماحول اور تربیت کی مرہونِ منت تھی۔ اور اسے اس پر فخر تھا۔ وہ اپنے ان ہم جھتیوں کی طرح نہ تھا جن کے نزدیک خاندانی ماحول اور بچپن کی تربیت ہر پہلو سے قابلِ تنقید ہی ہوتی ہے اور ماں باپ کا کنٹرول سراسر قابلِ نفرت ہی ہوتا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ شاہد نے صاف صاف کہا کہ جو باپ اپنے بچہ کی کسی بھی خواہش کے پوری ہونے میں رکاوٹ ثابت ہو وہ اس پر ظلم کرتا ہے۔ اس کو بقیہ ساری زندگی کے لئے خطرناک رجحانات کا حامل بنا دیتا ہے وغیرہ وغیرہ ..... اور وہ دانت پیس کر رہ گیا تھا اس پر بھلا وہ ان فرائڈ بچوں کا ساتھ کس طرح دے سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی اپنے گھر کے ماحول کے نقائص دیکھ رہی تھیں اور والدین کی بھی کتنی ہی باتیں قابلِ تنقید تھیں لیکن یہ شرافت اور غیرت، عفت و عصمت کا پاس یہ ہمدردی و غمگساری کے اعلیٰ جذبات اور یہ کسر نفسی اور ایثار کی قیمتی قدریں جن کا آج کے سماج میں انہی فرائڈوں، مارکسوں اور ڈاروں کی بدولت فقدان تھا۔ کیا یہ سب اسے اسی اولین مدرسہ سے نہیں ملے تھے۔

——— سڑک پر بدستور بھیڑ تھی۔ وہ اتنی دیر میں مشکل چند قدم آگے بڑھ سکا تھا۔ اس نے چند قدم آگے بڑھ کر سائیکل کو اسٹینڈ کے حوالہ کیا اور سامنے کے ریستوران میں جا بیٹھا۔ وہ سوچنا چاہتا تھا۔ اس بھیڑ میں چلنا مشکل تھا۔ "ایک چائے" اور وہ پھر خیالات میں ڈوب گیا۔ اب وہ بھی کالج کے ماحول سے بہت متاثر ہو چلا تھا۔ چہروں ہی نہیں اب وہ سینوں کی طرف بھی دیکھنے لگا تھا۔ اچٹتی نظریں اب رُکنے اور گڑ جانے کے مرحلہ میں پہنچ چکی تھیں۔ یہ نظریں جب تک نیچی ہیں نیچی ہیں اور جب یہ اُوپر اٹھ گئیں تو پھر زمان و مکان کی پابندی ناممکن ہے ——— ہاں اس کے لئے تو ناممکن ہی ثابت ہوئی تھیں کہ سنا

خواب تھا کالج کا ماحول۔ محلۂ تعلیم تو خیر ایک طرف عریانیت کی بھی کوئی حد نہ تھی۔ مس فاخرہ مستقلاً جالی کے جمپر ہی پہنتی تھی اور اسے کوئی ٹوکنے والا نہ تھا۔ نہ ہی کوئی اس کالی کلوٹی اینگلو انڈین چھوکری کو کان پکڑ کر دو چپت لگا سکتا تھا جو کھنچتی تھی کہ سینہ تان کر چلنے سے اس کے چہرے کی سیاہی ڈھل جائے گی۔ ادھر جب سے کالج کی مختلف تقریبات میں ناچ اور موسیقی کی ہمت افزائی شروع کی گئی ہے یہ لڑکیاں شیر ہو گئی ہیں۔ شوخی اور عریانی دونوں بیحد و حساب بڑھتی جا رہی ہیں۔ ڈرامے اور ناٹک محض بہانہ بنتے ہیں بمقصود رقص اور گانے کے ذریعہ اعضاء کی نمائش اور جنسی کشش آوازی پردہ دوستائش ہوتی ہے۔ پھر اگر کسی لڑکی نے ڈرامہ میں حصہ لیکر کسی ایم۔ ایل۔ اے سے خراج تحسین حاصل کر لیا تو وہ ہر وقت ناچتی ہی پھرتی تھی۔ درجے میں گاتے ہوئے داخل ہونا۔ بیٹھے بیٹھے گنگنانا۔ یا خالی گھنٹوں میں کسی کمرے میں محفل طرب جما لینا تو روایات میں داخل ہوتا جا رہا تھا۔ بس کسر تھی تو اسی کی کہ کالج لائبریری میں کتابوں کی الماریاں ہٹا کر اسٹور روم بھیج دی جائیں اور ان کی جگہ آلات طرب سجا دیئے جائیں۔ اساتذہ کی نئی کھیپ تو فٹ ہے البتہ پرانے بوڑھوں کو جو اب بھی کتابیں پڑھنا اور مذاکرات کرنا ہی فعار طالب علمی جانتے ہیں اور وقت بے وقت سنجیدگی کی اہمیت اور ضرورت پر لکچر پلا پلا کر بوریت پھیلاتے رہتے ہیں ان کو یک قلم برخاست کر کے ماہر گویوں اور طبلہ باز استادوں کی خدمات حاصل کی جائیں ان کے رہنے کے لئے وہ اونچا معیار فراہم کیا جائے جس کے زیر سایہ "فن" پروان چڑھتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے "آرٹ اور کلچر" کی کھیتی لہلہانے لگے گی اور ہمارے نیتاؤں کی دیرینہ آرزوئیں پوری ہو جائیں گی۔

بھرا چاول رکھ گیا۔ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ایک گھونٹ پیتے ہوئے وہ سوچنے لگا۔ خود وہ بھی تو اسی دھارے میں بہا جا رہا تھا۔ پہلے وہ کیچڑ دیکھنے کو کتنا برا سمجھتا تھا لیکن پرسوں شام تو وہ بس چل ہی پڑا تھا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ چچا جان مل گئے۔ اس کے اپنے پروگرام سے ناواقف۔ انہوں نے کوئی کام سپرد کر دیا اور وہ شیطان کھسکنے پر مجبور ہو گیا ورنہ یہ نابہارک شروعات بھی ہو ہی چکی ہوتی۔

اس نے اسٹینڈ سے سائیکل لی اور اب وہ سڑک پر تھا۔ سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ اس نے تیز تیز پیڈل مارنا شروع کر دیا۔ جلد گھر پہنچنا تھا اور خیالات کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ کدھر جا رہا تھا اور وہ سوچنے لگا اور کیوں؟ اس کی سائیکل اس کے چلانے سے سیدھے گھر کی طرف چل رہی تھی کیا وہ خود کو سیدھی راہ پر نہ چلا سکتا تھا۔ کیا اس کی منزل متعین نہ تھی۔ یا اس نے پیڈل مارنے چھوڑ دیئے تھے۔ یا وہ اس بھیڑ میں پھنسے ہوئے آدمی کی طرح تھا جو جانا کسی طرف چاہتا ہے لیکن آدمیوں کا ریلا اسے کسی طرف دھکیل دیتا ہے یہاں تک کہ اس کا دماغ کشمکش ترک کر کے کچھ دور بھیڑ کے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر لیتا ہے لیکن کیا یہ آدمی جلد ہی پھر اپنی منزل کی طرف واپس نہیں آتا۔ اور اس نے تیز تیز پیڈل مارنے شروع کر دیئے۔

اچھا یہ تھی مس فرحت! اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور چہرہ سرخ۔ مس فرحت اسے دیکھ کر کھلکھلا اٹھی۔ اور وہ بھی مسکرا دیا لیکن وہ کیوں مسکرایا۔ اس کو جیسے بریک سا لگ گیا کیوں نہیں اس نے فرحت کا غیر مقدم ایک نفرت اور حقارت میں ڈوبی ہوئی نظر سے کیا۔ اور وہ اپنے اوپر دانت پیس کر رہ گیا۔ یہ بناوٹی سوشل اخلاق کے تقاضے ہی تو تھے جو اس کا سارا اخلاق سوخت کئے دے رہے تھے۔ قدریں خود نہیں بدلتیں یہ ہم ہیں جو کچھ قدروں کو چھوڑ کر کچھ کو اختیار کر لیتے ہیں۔ یونہی فرد کا کردار بدلتا ہے اور یونہی تہذیبیں بدلتی ہیں۔ مس فرحت کلاس میں داخل ہو گئی لیکن وہ کلاس میں جا کر کیا سہارے گا۔ اس کا موڈ بالکل خراب ہو گیا تھا۔ وہ بے دلی کے ساتھ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دماغ میں ایک ہیجان سا بپا ہو گیا تھا۔ اس نے اس بے محل مسکراہٹ سے ایک بدتمیزی کی ہمت افزائی کی کیا ایک برائی کو یوں سند قبول دیکر اس نے اس کو دعوت نہیں دی؟ ابھی رات ہی اس سلسلہ میں اس نے کیا کیا سوچا۔ لاحول ولاقوۃ۔ تنہائی میں سوچنے والا انسان زندگی کی عملی کشاکش میں آ کر کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ ارادہ اور عمل کے درمیان اتنا زبردست خلا کیوں ہے خلا ہے نہیں بلکہ خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان پیدا کر لیتا ہے یہی تو مغالطہ تھا یہی خود فریبی تو فساد کی جڑ تھی۔ عملی کشمکش میں انسان کو برائی سے مغلوب کر دینے والی اصل چیز برائی نہیں بلکہ برائی کے دلائل یہ پوچ اور بے وزن دلائل تھے جو اس وقت سب سے بڑی اور آخری حقیقت بنکر سامنے آتے ہیں۔ ارادہ اور عمل کے درمیان خلا ہے۔ زبردست خلا۔ تم نے جو کچھ دن میں سوچا تھا رات کے اس عملی معرکہ میں اسے ایک طرف رکھکر گھس جاؤ۔ زانی زنا کرے۔ شرابی شراب پئے۔ کالج کا نوجوان سینما دیکھے اور لڑکیوں کے پیچھے سائیکل دوڑاتا پھرے کیوں؟ اس لئے کہ ارادہ اور عمل کے درمیان زبردست خلا ہے۔ جو کچھ تم نے سوچا تھا اس کو عمل کا جامہ پہنانا تمہارے بس کی بات نہیں۔ کیوں؟ کیوں کا جواب یہ کہ یہ حقیقت ہے۔ یہ ایک تجربی حقیقت ہے یا ایک نفسیاتی حقیقت ہے اس پر فرائڈ اور میک ڈوگل۔ ایڈلر اور جیمس سب متفق ہیں۔ یہ ایک فیصلہ کن حقیقت ہے۔ اُف یہ بے بنیاد فلسفے اور من گھڑت اصول جن کی صداقت کی واحد دلیل یہ ہے کہ لاکھوں ہوس پرست اور مغلوب النفس انسانوں نے اپنے کردار سے اس کی تصدیق کی ہے۔

لڑکے اٹھنے لگے۔ اچھا لکچر ختم ہو گیا۔ اس کے پلے کچھ بھی نہ پڑا۔ پتے کیا پڑتا۔ وہ تو کچھ سُن ہی نہ سکا۔ نہ جانے کتنے ہی لڑکے روزانہ اسی طرح لکچر سُنتے ہیں اگر سامنے کی بنچوں پر نظریں گڑائے رکھنے سے فرصت ملے تو پھر یاد مامنی اور توقعات فردا ذہن کو یکسو کر لیتے ہیں ——— اور تعلیم ہوتی رہتی ہے۔ ڈگریاں بٹتی رہتی ہیں۔ پھر یہی سند یافتہ استاد بنتے ہیں ——— کلاس میں لڑکیاں آگے بیٹھتی ہیں۔

"ہلو مسٹر سلیم" اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مس فرحت شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ "مسٹر سلیم کل تو آپ بہت خفا ہوئے ..... دیکھئے میں چاہتی ہوں کہ آپ جو ذرا کم سوشل ہیں جلد ہی ..... دیکھئے۔ میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے جی کڑا کر کے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ارے آپ تو بالکل ہی خفا معلوم ہوتے ہیں۔ لیجئے معافی مانگ لی" اور وہ حیران تھی کہ مسکراہٹ اور اس خفگی کا جوڑ کیسے ملائے۔ "ہوں۔ یہ بھی ایک complex ہے" اس نے جی ہی جی میں کہا اور بولی "اچھا ایک بات۔ ایک بات تو مان لیجئے ..... ریستوران میں کل شام میرے ساتھ چا رپیجئے۔ وہ دیکھئے مسٹر شاہد بھی آ رہے ہیں۔ وہ بھی اور آپ بھی" ..... اس نے سلیم کے بولنے سے پہلے ہی شاہد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "مسٹر شاہد آپ کے ذمہ رہے گا یہ کام۔ سلیم صاحب کو کل شام ریستوران لائیے ——— اور وہ ایک شوخ مسکراہٹ کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ پچھلے تجربات کی روشنی میں اس کیس case کا تجزیہ کرتے ہوئے اور جس جس بات کی تہہ تک پہنچنے سے ذہنی صلاحیتیں جواب دے دیں ان کو کسی نہ کسی طرح کا complex قرار دیتے ہوئے وہ کل کی متوقع صورت حال کی بابت مسکرا مسکرا کر سوچتی رہی .....

"سلیم صاحب آپ تو کمال ہی کرتے ہیں۔ شاہد نے مس فرحت کا مشن پورا کرنے کی خاطر وکالت شروع کر دی۔"

"جی! میں اس کا بالکل قائل نہیں"

"کس بات کے قائل نہیں آپ"

"یہی اس طرح لڑکیوں سے خلا ملا رکھنے کا"

"کیوں"

"میں اسے اخلاق کے منافی سمجھتا ہوں"

"تو یہاں آپ پڑھتے کیوں ہیں حضور ..... پھر اس بیسویں صدی میں آپ نے اس دنیا میں تشریف لانے کی درخواست کس نے کی تھی جناب"

"یعنی آپ کے خیال میں تعلیم اور زندگی دونوں ہی بداخلاقی کے ساتھ ہی نبھ سکتی ہیں۔ اور بس۔ حالانکہ میرے سامنے آپ ہی کی مثال ہے۔ اتنا ذہین اور promising اسٹوڈنٹ اور ان چھوکریوں کے چکر میں خراب ہو کر رہ گیا۔ کیریکٹر کھونا اور تعلیم سے ہاتھ دھو لینا اور کیا نتیجہ ہوتا ہے اس خلا ملا کا جناب ——— کیا یہی پڑھنے کا تقاضا اور بیسویں صدی میں زندہ رہنے کا لازمہ ہے۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ یہ تو خود ایک زبردست بداخلاقی ہے کہ کوئی بات کرنا چاہے اور آپ سیدھے منہ جواب نہ دے سکیں، کوئی چار پر بلائے اور آپ مجسم پتھر گز نہیں" بنے رہیں۔

شاہد نے اپنی جھینپ مٹاتے ہوئے کہا۔

"لیکن بداخلاقی کی دعوت رد کرنا تو بداخلاقی نہیں ہو سکتا۔ آپ ان مسائل میں میرا نقطۂ نظر جانتے ہیں۔ خواہ مخواہ امرار کیوں کرتے ہیں۔ میں نے جو بات کہی اسی کا جواب دے سکیں تو شوق سے دیجئے۔ ورنہ اپنا شوق پورا کیجئے۔ اور بس"۔ سلیم نے کہا۔

"مسٹر سلیم، دیکھئے میرا اسٹینڈ یہ ہے کہ کالج میں پڑھنا اور سوسائٹی سے کترانا دونوں میں نباہ مشکل ہے۔ یہ آپ کے یہاں اخلاق کا تقاضا ہے۔ میں اسے فرار قرار دیتا ہوں۔ سوسائٹی کے تقاضے نہ پورا کرنا اور روکھا پن برتنا کسی طرح بھی معقولیت کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ فرار اور بزدلی کے سوا اسے اور کیا کہا جائے۔"

"اور غلط اقدام کو سب سے بڑی شجاعت قرار دیا جائے! اچھا مذاق ہے۔ چند الفاظ رٹ لئے اور جہاں دلیل نہیں ملی انہی کو جڑ دیا۔ ان الفاظ کے ذریعہ کی جانے والی دھاندلیاں شمار کی جائیں تو اعداد ساتھ نہ دے سکیں گے۔ کیا مطلب ہے فرار سے آپ کا۔ برائی کو چھوڑ دینا فرار ہے۔ کسی لوفر کو دھتکار دینا روکھا پن ہے۔ یعنی جو برائی سامنے آئے اس کے ہو رہئے۔ جو بدکردار ملے اسے سر چڑھائیے۔ کیوں ——— تاکہ فرار اور روکھے پن کا الزام نہ رہے۔ کیا Values ہیں واللہ!

"اوہو۔ آپ کا موڈ اس وقت خراب معلوم ہوتا ہے۔ بالکل تقریر کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اب شام کو ملوں گا" شاہد نے آنکھیں ملاتے ہوئے کہا۔ جیسے دوستی کا حق طلب کر رہا ہو۔

سلیم نے گویا کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ مسکرا کر اس نے جو غلطی کی تھی صاف گوئی نے اس کی تلافی کر دی۔ وہ سوچنے لگا ..... آج شاہد کو بھی اچھی طرح سنا دیا ہے ..... لیکن ..... لیکن کسی نے پھر اس کی خوش فہمی کو بریک لگایا۔ مس فرحت گفتگو کے وقت نظریں کہاں تھیں ——— اور وہ جھینپ سا گیا ———

اُن کیا تضاد ہے۔ انسان اپنے افعال کے اچھے ہی پہلو دیکھنے کا عادی ہے۔ برے پہلو تو تاویل کے لئے ہوتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں اس کے دماغ نے کتنی ہی تاویلیں گھڑ کر رکھ دیں۔ بات بھلا کیسے ہو سکتی تھی اگر وہ نظریں ملا کر بات نہ کرتا۔ وہ بھی کیا گھنٹی کہ سو فیصدی ملا ہی ہے۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور وہ اسی طرح سوچتے سوچتے خود بھی وہیں چلا گیا۔ جہاں نظریں چلی جانے پر احتساب کر رہا تھا۔ پورا نقشہ اس کے سامنے تھا۔ ذہنی لذت لے رہا تھا۔ فرحت! پروین! للتا کتنی ہی لڑکیوں پر روزانہ نظر پڑتی رہتی تھی۔ کس طرح بچا جا سکتا ہے بھلا۔ نہ آنکھ ہی بند کی جا سکتی ہے نہ کان میں ہی روئی ٹھونسی جا سکتی ہے۔ آج جسے بھی کالج میں پڑھنا ہے اسے اساتذہ کے لکچر ہی نہیں اور مردوں کے گانے بھی سننے ہوں گے۔ یہ آرٹ اور کلچر کا دور ہے۔۔۔۔ کچھ اس کے اپنے اندر کے بھی تو تقاضے ہیں۔ وہ سوچتا رہا۔ اٹھتی جوانی گرم خون۔ زندہ جذبات ان کو فرار کے ذریعہ نہیں دبایا جا سکتا۔۔۔۔ فرار، وہ نقطہ جس کے استعمال پر ابھی شاہد کے خلاف پورا زور استدلال صرف کر چکے ہو ضمیر نے ٹھوکر لی۔ لیکن وہ آگے بڑھتا گیا۔ ضمیر کی اس آواز کا نوٹس لینا مناسب نہیں۔ ایسی باتوں سے یونہی گذر جایئے۔ رکے تو پھنسے۔ بس جلدی سے گذر جایئے کہ ضمیر کی آواز پر ٹھٹک کر رک جائے اور غور کرنے اور پھر اسے مان لینے کے درمیان زیادہ فصل نہیں۔ جب اس کو نہ ماننا ہو تو غور ہی نہ کیجئے۔ اور وہ سوچتا رہا۔ تعلیم تو ہر حال حاصل کرنی ہے۔ پڑھنا ہے تو کالج جانا ہی ہے۔ کالج جایئے تو مخلوط تعلیم سے مفر نہیں۔ اور ساتھ بیٹھے لیکن نظریں نہ اٹھیں۔ آپ سے کوئی سوال کیا جائے۔ وہ آپ جواب نہ دیں، کوئی چاہے بلائے اور آپ۔۔۔۔ اور یہاں پہنچ کر ضمیر نے پھر لخاخت لی۔ یہ مسئلہ تو طے ہو چکا۔ اس پر نظر ثانی کی کیا ضرورت۔ اور وہ پھر ایک سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ سوچے کہ نہ سوچے۔

"ہلو مسٹر سلیم! آج شام کو آپ سے ملاقات ہو رہی ہے۔ فرحت نے بتایا ہے۔ ۵ بجے شام کو لیسٹو ران میں آپ اور مسز شاہد کا انتظار کرتا ہے۔۔۔۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ مسٹر سلیم! جتنی جلد آپ سوشل ہوں گے اتنا ہی اچھا ہوگا۔ آپ کا ہر ایک طرح بہت اچھا ہو سکتا ہے۔ آپ کی ذہانت کی تو میں بہت پہلے سے قائل ہوں لیکن بس یہی انگ تھلگ رہنا اور جھجک۔۔۔۔ اچھا شام کو ملیں گے۔" ورنہ نے سائیکل تیز کی اور آگے نکل گئی۔ سلیم مبہوت رہ گیا۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔۔۔۔ فرحت نے اچھا خاصا پروپیگنڈا کر دیا ہے۔ اس نے سوچا۔ لیکن اس نے کوئی جواب کیوں نہیں دیا۔ کیا وہ دھیرے دھیرے پسیجتا جا رہا ہے؟ شام کو شاید آئے گا۔۔۔۔ اور پھر اس آخری کلک کے بعد ایک لڑکھتی ہوئی گیند کی طرح وہ جدھر پھینکا جائے گا چلا جائے گا۔۔۔۔ نہیں نہیں ایسا نہ ہونا چاہئے۔ وہ سنبھالا لیتے ہوئے بڑبڑایا۔ سلیم تم کیا ہوئے جا رہے ہو۔ ضمیر نے چیلنج کیا۔ اور سائیکل کی رفتار سست ہو گئی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ فکر کی رفتار تیز ہوتی ہے تو سائیکل کی رفتار بھی تیز ہو جاتی ہے اور کبھی اس کا الٹا ہوتا ہے۔ جب فکر میں اقدام ہو تو سائیکل میں بھی اقدام اور سرعت ہوتی ہے اور جب فکر کشمکش کے مرحلہ میں پھنس جاتی ہے تو سائیکل بیچاری بھی ڈانوا ڈول ہونے لگتی ہے۔ ذہن کو اقدام میں اتنی کاوش نہیں کرنی پڑتی جتنی کشمکش میں۔ اقدام کی قیمت زیادہ تر مقداری (quantitative) ہے اور کشمکش کی وصفی (qualitative)

۔۔۔۔ اس نے سائیکل کھڑی کی اور کمرے میں داخل ہو گیا وہ بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے بہت دور سے آ رہا ہو۔ آرام کرسی پر دراز ہوتے ہوئے اس نے دایہ کو جگا کے لئے آواز دی۔ اماں کیا کہیں گی۔ آج گھر میں آنے کے بجائے باہر ہی چائے منگوائی ہے۔۔۔۔ دوست احباب آئے ہوں گے۔ اماں سوچ لیں گی۔۔۔۔ اور وہ پھر اپنی سوچ میں ڈوب گیا۔ سوشل ہونا کتنی پُرفریب اصطلاح تھی! پروین کہتی ہے جلد سوشل ہو جایئے یعنی جلد بدکردار ہو جایئے۔ اپنی شرم و حیا۔ اور عصمت اور عفت سے جلد از جلد ہاتھ دھو لیجئے اور ہمارے رنگ میں رنگ جایئے۔ اُف یہ لڑکیاں۔ پوری شیطان کی انجینٹ ہوتی ہیں یہ کالج کی لڑکیاں فلرٹ کیسی کی۔۔۔۔ اور وہ سنیما کی بیٹھ گیا۔ چائے آ چکی تھی۔ پیالی سے پیالی سے تھکن کم ہو چلی۔ فکر میں بھی توانائی آ چلی۔ ضمیر کی آواز زیادہ صاف سنائی دینے لگی۔ یہ تو اعصاب کی زندگی میں ہی بھاؤ پیدا کرتی ہے، اسے نفس کی خاطر استعمال کیجئے تو بھی حاضر ہے اور ضمیر کی مدد کے لئے بلائے تو بھی اسے انکار نہیں۔ اب اس کی نظریں ماضی کا ایک سرسری جائزہ لے رہی تھیں، پہلے پردے کا اتنا خیال تھا کہ مخلوط تعلیم والے کالج میں داخلے سے طبیعت بھاگتی تھی پھر تعلیم کے بہانے اسے گوارا کیا۔ اب نظریں نیچی رکھنے کا سہارا تھا۔ پھر اجتماعیت کے تقاضے سامنے آئے اور نظریں چار ہونے لگیں۔ دو دو باتوں میں بھی مضائقہ نہ رہا۔ اب دوستوں کے حوصلے اتنے بڑھ چلے تھے کہ کوئی سینما کی دعوت دیتا ہے تو کوئی لڑکیوں کے ساتھ چائے پینے اور سیر کرنے کی طرف کھینچتا ہے۔ آج تم ایک بالکل بنیادی دروازہ کھول رہے ہو۔ ضمیر نے سامنے آ کر کہا۔ یہ فیصلہ کن موڑ ہے فیصلہ کن! اب تک تم بیچ بیچ میں تھے لیکن اس اقدام کے بعد تم ان حدود سے تجاوز کر جاؤ گے جن کی پاس داری ضروری ہے۔ آج ان فلرٹ چھوکریوں کے ساتھ خلا ملا کل سیر سپاٹے اور سینما

میں ان کا ساتھ دیا۔ اور پھر ساری اگلی منازل ـــــ لیکن اس طرح سوچنے کا نتیجہ تو دوسرا ہوگا۔ کوئی ضمیر کے مقابلہ کے لئے میدان میں اتر پڑا۔ نہ سوچو یہی تو نفس کا پسلا وار ہے۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ "بھلا اتنی ذرا سی بات پر سوچنا۔ آج ریستوران تک ہوتے آؤ چند منٹ کا معاملہ۔ کوئی موم کی ناک تو نہیں کہ گل جائے۔ واہ کیا میں اتنا کچا ہوں کہ ایک دن کی ملاقات میں پھسل جاؤں۔ مذاق ہے۔ ارے اپنے اوپر اعتماد کرو۔ نفس نے للکارا لیکن ضمیر نے چٹکی لی۔ یونہی تو پھسلا کرتے ہیں۔ برائی کی ساری راہ یونہی ایک ایک قدم کر کے تو طے ہوتی ہے۔ اگر ہر قدم کو حقیر جان کے خود اعتمادی کے زعم میں آدمی قدم اٹھاتا جائے تو اسے ہلاکت تک پہنچ جانے سے کون روک سکتا ہے۔ اپنی ماضی کی تاریخ ۔ ۔ ۔ اور سامنے شاہد آ رہا تھا۔ کشمکش تیز تر ہو گئی۔ اب کیا سوچنا تھوڑی دیر کی بات ہے نفس نے پھر کہا۔ سوچتے جاؤ۔ بلا سوچے کوئی کام نہ کرو۔ ضمیر نے زور دیا۔

"بھئی سلیم آج پوزیشن بڑی خراب ہو جائے گی۔ اگر آپ نے گڑبڑ کی۔"

"دیکھئے شاہد صاحب آپ چاہتے ہیں اپنے اصولوں کو چھوڑ دوں۔"

"اوہ۔ آپ تو بڑے اونچے ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی سی دیر اور شریف دل دہی۔ آپ کے اصولوں پر کون حملہ کرتا ہے۔ یہاں تو سوال ایک انتظار کرنے والے کو مایوس نہ کرنے اور ایک وعدہ کو پورا کرنے کا ہے۔

"دیکھئے پھر وہی باتیں۔"

"کیا باتیں۔ ارے بھائی سائیکل اٹھاؤ۔ چلو معذرت کر دینا۔"

"ہنئے نہیں۔ بہرحال مجھے سوچنے دیجئے۔"

"غضب کر دیا۔ سوچنا سوچنا مصیبت ہے تمہارا سوچنا۔ ایک ذرا سی بات کو اتنی اہمیت جیسے کالج میں لڑکیوں سے نہیں ملتے جیسے کالج میں ایک کلاس میں نہیں بیٹھتے۔ بس سارے اصول آج ہی نکل آئے ہیں۔ ارے بھائی ایک بات ہے اپنی جگہ پر وہ بھی جو تم سوچتے ہو لیکن ذرا اور باتوں کا بھی تو خیال رکھو۔ (سلیم کے چہرے پر نرمی کے آثار دیکھتے ہوئے شاہد سائیکل کی طرف بڑھتے ہوئے کہتا ہے) یہ لیجئے سائیکل آج میری خاطر (آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) سلیم صاحب پر ویں اور فرحت کتنا برا مانتیں اگر آپ نہ چلتے۔

سلیم دیکھئے چل رہا ہوں لیکن معذرت کے لئے۔ میں نے نہ دعوت قبول کی تھی نہ وعدہ کیا تھا۔ آپ کے اصرار پر چل رہا ہوں۔ محض معذرت کے لئے۔"

معذرت کے لئے۔ کس چیز کی معذرت ضمیر نے احتساب شروع کر دیا سلیم! یہ فریب نفس ہے۔ دھوکہ ہے اور سلیم سوچنے لگا۔ اب وہ نفس کی نہ سوچ

والی بات ٹھکرا چکا تھا۔ یہی تو سبق تو تھا جو پچھلی آن گنت لغزشوں نے اسے سکھایا تھا نہ سوچنے کا مطلب گناہ کو کر گذرنا اور سوچنے کے معنی اس سے بچ جانے کے تھے۔ اور وہ سوچ رہا تھا نفس کی بے بسی بڑھتی جا رہی تھی۔ جب یہ وار خالی جاتا ہے تو نفس کا برا حال ہوتا ہے۔ ہر دوسری دلیل بے وزن ثابت ہوتی ہے۔ کیا تو جب شاہد کے اصرار کو نہ ٹھکرا سکا۔ پروین و فرحت کی نگاہوں کی تاب لا سکے گا۔ اور وہ لاجواب تھا۔ "کیا خوب بہانا ہے۔ محض معذرت کے لئے اور اسی کے پاؤں پیڈل پر آہستہ پڑنے لگے۔ اب نفس نے آخری بار زور لگایا۔ گویا کہ پروین و فرحت دعوت مجسم بنی اس کے سامنے تھیں۔ آج چند حسین گھڑیاں ان کے ساتھ گذر کے۔ توبہ کی جائے ـــــ اس اٹھتی جوانی کے کچھ تو تقاضے ہیں لیکن یہ قدم ایک خاص منزل کی طرف لئے جاتا ہے۔ ضمیر پر گرم کار تھا۔ ضمیر کو معطل نہ کیجئے تو نفس امارہ کی فتح ناممکن ہے۔ ہاں پہلے ہی مرحلہ پر "کچھ سوچئے ہی مت" پر ایمان لا کر اس کا گلا گھونٹ دیجئے تو بات ہی دوسری ہے۔

شاہد کا شبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ سائیکل کی چال ذرا دھیمی ہوتی جا رہی تھی مگر ریستوران قریب تھا۔ سلیم صاحب اتنی سستی کیوں، شاہد نے کہا۔ میکش ڈرتے ڈرتے سلیم کے چہرے پر ایک ٹھوس گہرائی نے اسے مرعوب کر دیا۔ یہ عرق آلود پیشانی، وہ بھانپ گیا۔ پیشانی کا یہ پسینہ بتاتا ہے کہ انسان کی فطری شرم و حیا ابھی زندہ ہے۔ اور ریستوران سامنے تھا۔ کنکھیوں سے اس نے ایک بار پھر سلیم کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ عرق آلود پیشانی پر عزم کی پختگی ابھرتی جا رہی تھی۔ سامنے ریستوران کی بالائی کھڑکی پر فرحت اور پروین دعوت مجسم بنی کھڑی تھیں۔ شاہد نے پھر سلیم کی طرف دیکھا۔ سائیکل کی رفتار کچھ تیز ہوئی۔ سلیم مسکرایا۔ مایوس ہو جا دوست شاہد۔ اس نے قدرے تلخی آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اور سائیکل تیزی سے ریستوران کے آگے سے نکل گئی۔ آدمی جب کشمکش کے مرحلہ پر سے گذر جائے تو اقدام خود بخود تیزی ساتھ لاتا ہے۔

منظر حسین

ایک تھا شکاری

بوریت کیے یا کچھ اور، اسے ہر دم اپنے لوگوں کی تلاش رہتی تھی جو اس مرض کے شکار ہوں۔ جہاں کوئی "بور" نظر آیا یا کسی نے ذرا سا بھی بوریت کا اظہار کیا اس کی باچھیں کھل جاتیں اور وہ اس کا نام "بور حضرات" کی فہرست میں لکھ کر اسے اپنے "حلقۂ خاص" میں داخل کر لیتا چنانچہ اب تک اس کے حلقہ میں ایک بور۔ ایک سی بور The Bore ایک بور بالا اور ایک بور اعظم داخل ہو چکے تھے۔ ان کے علاوہ دو تین نیم بور بھی تھے جنہیں وہ مکمل بور بنانے کی فکر میں تھا۔

ایک دن اس نے بیٹھے بیٹھے سوچا اگر ان تمام "بوروں" کو اکٹھا کر دیا جائے تو؟ ــــ تو کیسی رہے؟ ــــ اور اس نے اس کے لئے زمین ہموار کرنی شروع کر دی۔ اس نے بوروں سے کہا "یار۔ پکنک پر گئے ہوئے ایک عرصہ گذرا ــــ کیا خیال ہے تمہارا، پکنک ہونی چاہئے یا نہیں؟

بور نے کہا "ضرور ــــ میرا بھی جی ترس رہا ہے اس کے لئے"

"تو پھر بندوبست کرو نا ــــ کون سی تاریخ موزوں ہوگی؟

"تاریخ؟ ــــ اگلے ماہ کا پہلا اتوار"

"ہوں ــــ اتوار ــــ اچھا تو اتوار ہی سہی ــــ مگر بھئی اس کا انتظام تو شروع کر دو ــــ وہاں پروگرام کیا ہوگا ــــ کیا کھایا جائے گا۔ کیا پیا جائے گا ــــ ارے ہاں یاد آیا، تم نے ابھی تک چائے نہیں منگائی۔

بور نے کہا "میں نے چائے چھوڑ دی ہے"

اس نے کہا "خیر تو ہے ــــ ایسی اچھی چیز سے تم نے توبہ کیوں کر لی؟"

بور نے جواب دیا "میں نے جب سے ایک مضمون پڑھا ہے میری طبیعت اوبھ سے بیٹھ گئی ہے"

"کونسا مضمون ــــ کہاں پڑھا تم نے ــــ کیا لکھا ہے اس میں ــــ کچھ بتاؤ نا ــــ ممکن ہے میں بھی تمہارا ہم خیال ہو جاؤں اور چائے نوشی سے توبہ کر لوں"

بور نے کہا "ہمدرد صحت میں پڑھا تھا ــــ مضمون نگار کا نام یاد نہیں رہا لیکن اس نے چائے نوشی کے مضر اثرات جو بتائے ہیں وہ واقعی قابل غور ہیں ــــ چائے سے صحت پہ ــــ" اس نے کہا "ارے یار ــــ تم بھی کہاں جا کر پھنسے ہو ــــ وہ مضمون تو حکیم نابینا کا لکھا ہوا ہے انہیں میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ وہ چائے خوب پیتے اور پلاتے ہیں ــــ تمہاری طرح اگر تو بہ کر لیتے تو بس زاہد خشک بن کر رہ جاتے ــــ منگواؤ چائے ــــ منہ کیا دیکھ رہے ہو"

بور نے قدرے تنک کر کہا "تو آپ چائے پی کر ہی ٹلیں گے ــــ میرا خون کیوں نہیں پیتے؟"

اس نے کہا "حکیم نابینا نے تو اس کی تائید نہیں کی۔ ویسے ڈاکٹر زنجیار کا کہنا ہے کہ انسان کو کبھی کبھی اپنے دوستوں کا خون نچوڑ کر پینا چاہئے تاکہ ان کے درمیان خونی رشتہ قایم ہو سکے اور ان کی رفاقت میں پائیداری پیدا ہو سکے"

بور نے کہا "ہم تمہارے ڈاکٹر زنجیار کو نہیں جانتے ــــ صاف اور سیدھی بات یہی ہے کہ میں نے چائے قطعی چھوڑ دی ہے"

اس نے کہا "تو میں نے تو نہیں چھوڑی ــــ مجھے تو پلواؤ"

بور نے کچھ سوچ کر کہا "اچھا ــــ صرف تمہارے لئے منگوا رہا ہوں" چائے پینے کے بعد اس نے اٹھتے ہوئے کہا "میں چلتا ہوں۔ تم پکنک کا انتظام کرو ــــ میں سب کو اطلاع دیدوں گا ــــ مگر خیال رہے ــــ چائے کے بغیر پکنک کامیاب نہیں ہو سکتی"

بور نے کہا "میں چائے پینے کے خلاف ہوں ــــ اگر وہاں چائے پی گئی تو میں شریک نہ ہوں گا"

اس نے کہا "اگر تم چائے کے اتنے ہی دشمن ہو تو پھر کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ ایک مضمون اسی موضوع پر لکھ لاؤ ــــ ہم اس پر مکمل کر گفتگو کریں گے"

اور وہ وہاں سے کھسک کر دی بور کے پاس پہنچا۔ جو بڑے انہماک سے رشین ایمبیسی کی لائبریری کی ایک کتاب پڑھ رہے تھے۔

"لائے بھئی کیا پڑھ رہے ہو؟۔ اس نے کہا۔ جب دیکھو۔ موٹی موٹی کتابیں ہی پڑھتے رہتے ہو ــــ تمہاری آنکھیں تو یوں ہی کمزور ہیں اور بھی کمزور ہو جائیں گی ــــ اور تم خدانخواستہ کہیں آنکھیں کھو بیٹھے تو ہمارا حلقہ بے جان ہو جائے گا کیونکہ تم لکھ نہ سکو گے اور ــــ"

"مگر میری آنکھیں جان تو نہیں ہیں؟" دی بور نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ جان کیا چیز ہے۔ کس چڑیا کا نام ہے؟ ــــ کبھی تم نے سوچا ہے؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں" اس نے کہا۔ "ڈاکٹر ڈائی لینڈ نے لکھا ہے جان اس ارشم کے مانند ہے جو کسی انجن کو چلاتی ہے ــــ مگر ڈاکٹر مروزوف کا کہنا ہے کہ یہ سب بکواس ہے جان حقیقت میں بھوک ہی کا دوسرا نام ہے ــــ جب تک بھوک لگتی رہے انسان زندہ رہتا ہے اور جس دن بھوک لگنی بند ہو جائے انسان مر جاتا ہے۔

دی بور نے پوچھا۔ یہ ڈاکٹر مروزوف کون ہیں؟"

اس نے کہا "تعجب ہے تم انھیں نہیں جانتے ــــ یہ انیسویں صدی کے ایک بہت بڑے مفکر گذرے ہیں ــــ اُن کے حالات زندگی پروفیسر ویٹا من نے اپنی کتاب "دی مین آف دی سنچری" میں بڑے موثر انداز میں لکھا ہے۔"

"یہ کتاب مل سکتی ہے کہیں سے؟ ــــ دی بور نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"شاید رشین ایمبیسی سے مل سکے ــــ جس نے اسے بہت دن ہوئے ایک دوست سے مانگ کر پڑھا تھا ــــ "جی یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ میں جس غرض کے لئے آیا تھا وہ یہ ہے کہ اگلے ماہ کے پہلے اتوار کو ایک پکنک ہو رہی ہے۔ جس میں کھانے پینے کے تمام اخراجات تمہارے ذمہ ہوں گے۔"

دی بور نے دریافت کیا "کتنے آدمی ہوں گے؟"

"بس اپنے ہی آدمی ہوں گے ــــ انہیں تم جانتے ہی ہو ــــ دو چار اور سہی"

دی بور نے گھبرا کر کہا "تقریباً ایک درجن؟"

"ہاں ایک ہی درجن سمجھ لو ــــ یہ تو کچھ ایسی زیادہ تعداد نہیں؟"

"بھئی میں ان کے اخراجات نہیں برداشت کر سکتا۔" دی بور نے بوریت پھیلائی۔ ایک دو ہوتے تو کوئی بات نہ تھی ــــ لیکن ایک درجن آدمیوں کے کھانے کی ذمہ داری میں نہیں لے سکتا۔

"ارے جب تم ایک درجن آدمیوں کے کھلانے کی ذمہ داری نہیں لے سکتے تو پوری قوم کی ذمہ داری کیسے لو گے؟" اس نے کہا۔ "ڈاکٹر مروزوف نے کہا ہے کہ جو لوگ انفرادی طور پر بھوکوں کو کھانا نہیں کھلا سکتے وہ اجتماعی طور پر بھی نہیں کھلا سکتے۔ چہ خوش ــــ بڑے افسوس کی بات ہے ــــ کچھ تو شرم کرو ــــ اپنے اصولوں کا کچھ تو خیال کرو ــــ لاؤ مجھے ایک سگریٹ تو پلاؤ ــــ ذرا جلدی کرو۔ مجھے ابھی اوروں کے پاس جانا ہے۔"

اور سگریٹ وصول کر کے وہ بوما لابوار کے گھر پہنچا۔ جو پلنگ پر بیٹھے ہوئے "ملائے اعلیٰ" کی سیر کر رہے تھے۔

اس نے کھنکارتے ہوئے کہا۔ "یا شیخ ــــ یا ایہا الشیخ ــــ میں اندر آ سکتا ہوں؟"

بو رلا بوار نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اشارہ کیا "آ جاؤ"

اس نے پلنگ کی ٹپی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شیخ ــــ" انعکاس طرفین ہو رہا ہے ــــ نور "بروج ظل" میں داخل ہونے والا ہے۔"

"نور بروج ظل میں داخل ہونے والا ہے؟ بو رلا بوار نے چونک کر کہا۔ "جی ہاں"

"مگر ــــ" بو رلا بوار نے کہا "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اب کبھی نہیں ہو سکتا ــــ نور اور بروج ظل؟ ــــ لاحول ولا قوۃ ــــ تمہاری عقل کہاں چرنے گئی ہے؟

اس نے کہا "شیخ میری عقل اپنی جگہ پر موجود ہے مطمئن رہئے ــــ میں نے کوئی بات خلاف واقعہ نہیں کی ــــ کل رات جو خواب دیکھا سو آپ سے عرض کر دیا ــــ آگے جو ارشاد ہو۔ میں تو قسم کا بندہ ہوں۔"

"کیا تم نے خواب دیکھا ہے؟ ــــ ایں دیکھا ہے؟"

"جی ہاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ــــ فوق بروج ظل کے گنبد مندلار ہا تھا۔ اب انعکاس طرفین ہو کو رہے گا۔"

"شاید ــــ مگر مقام کیا تھا؟"

"ایک باغ ــــ کھجوروں کا باغ ــــ یہاں سے تقریباً بارہ میل دور ــــ جہاں کی مٹی کا رنگ سبزی مائل سرخ ــــ امام قدنی نے بھی ایک خواب ایسا ہی دیکھا تھا۔ جس کی تعبیر انہوں نے یہی کی تھی جو میں کر رہا ہوں ــــ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ نور بروج ظل میں داخل ہونے والا ہے۔"

"یقیناً" بو رلا بوار نے بیمار گی کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں وہاں جاؤں گا"

"میں آپ کو ساتھ لے چلوں گا ــــ دن بھر قیام ہو گا۔ وہاں ــــ

نفس ناہنجار کی تسکین کے لئے کچھ پھل وغیرہ خرید لیجئے گا ـــــ اب میں اجازت چاہتا ہوں ـــــ کیا یہ کھجور بھی لیتا جاؤں بچوں کے لئے؟" اس نے سرہانے رکھی ہوئی کھجوروں پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

اور وہاں سے نکل کر سیدھے بورِ اعظم کے درِ اقدس پر حاضری دی ـــــ بورِ اعظم کسی سے گفتگو کر رہے تھے۔

"ہر شخص کا جمالیاتی ذوق مختلف ہوتا ہے" بورِ اعظم کہہ رہے تھے" چنانچہ میرا ذوق تم سے ہر معاملہ میں مختلف ہے ـــــ مثال کے طور پر تم انگریزی شاعری پسند نہیں کرتے لیکن میں کرتا ہوں ـــــ کیٹس کی شاعری پر تو میں جان چھڑکتا ہوں۔ کیا خوب کہا ہے اس نے How I wonder what you are! دیکھئے کتنا جاندار مصرعہ ہے یہ ـــــ اور جانتے ہیں کہ یہ کس کے متعلق کہا گیا ہے۔ شاعر اپنی محبوبہ سے کہتا ہے کہ پیاری تم کیا ہو۔ میں آج تک سمجھ نہ سکا ـــــ کتنی گہری بات اس مصرعہ میں سموئی ہوئی ہے ـــــ عورت بحیثیت عورت ایک راز سربستہ ہے جسے کوئی مرد آج تک سمجھ سکا ہے۔ نہ آئندہ سمجھ سکے گا ـــــ آپ کی اردو شاعری بھلا اس شاعری کا کیا مقابلہ کرے گی ـــــ میں تو کہتا ہوں کہ اردو ادب نے آج تک کوئی ایسی چیز پیش نہیں کی جسے ہم انگریزی ادب کے مقابلہ میں پیش کر سکیں ـــــ ورڈ ورڈ ایک بہت بڑا شاعر گذرا ہے انگریزوں کا ـــــ صاحب اس نے تو فطرت کی نقاشی اور مصوری میں کمال کر دیا ـــــ

اس سے نہ رہا گیا اور بولا "ورڈ ورڈ تو بچہ ہے ہارڈن کے سامنے۔ اس سے بڑا کوئی انگریزی شاعر آج تک نہیں پیدا ہوا ـــــ انگریزی ادب کے نقادوں نے اسے مصورِ فطرت اور شاعرِ اعظم اور جانے کیا کیا کہا ہے"

بورِ اعظم نے کہا "تو میں کب اس کی بڑائی سے انکار کرتا ہوں۔ اس وقت ہارڈن کی بات ہی نہیں ہو رہی تھی ـــــ ورڈ ورڈ اپنی جگہ خود استاد ہے ـــــ مانتے ہو کہ نہیں؟"

"مانتا ہوں" اس نے کہا "لیکن ورڈ ورڈ میں ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ حسنِ فطرت کو تو دیکھتا تھا لیکن حسنِ ازل کو نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ اس کا جمالیاتی ذوق ترقی یافتہ نہ تھا ـــــ ہارڈن نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ اور اسی لئے وہ ورڈ ورڈ سے آگے نکل گیا ـــــ لاؤ اسی بات پر ایک سگریٹ پلاؤ"

"میں تو حقہ پیتا ہوں ـــــ سگریٹ کہاں سے دوں؟"

"اچھا تو حقہ ہی پلاؤ ـــــ چائے تو تم پلاؤ گے ہی؟"

"یہ کھانے کا وقت ہے ـــــ چائے کا نہیں"

"تو کھانا ہی کھلاؤ"

کھانا کھا کر حقہ پی کر اور بورِ اعظم سے پکنک پر چلنے کا وعدہ لیکر وہ "نیم بوروں" کے پاس پہنچا اور انھیں بھی دعوتِ شرکت دیکر گھر لوٹ آیا۔

پکنک کے دن وہ بڑا خوش تھا اور اس کی طبیعت پہلے سے کہیں زیادہ شگفتہ تھی۔ اس نے "بوران کرام" کی طرف دیکھا اور فرطِ مسرت سے جھوم گیا ـــــ یہ اس کے اپنے "نورتن" تھے۔ یہ اس کے اپنے "لاڈلے" تھے ـــــ نیم بور ـــــ بور ـــــ دی بور۔ بورِ لابوار۔ بورِ اعظم ـــــ سب ہی موجود تھے۔

اس نے کہا "بھائیو ـــــ آج کا ایجنڈا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کھاؤ۔ پیو اور خوب اچھی اچھی باتیں کرو ـــــ لیکن چونکہ ہر کام ایک نظم کے ساتھ ہونا چاہئے اس لئے میں نے یونہی ایک ایجنڈا سا بنا لیا ہے جسے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں ـــــ

(۱) ایک نظم معہ چائے و سگریٹ
(۲) چائے نوشی پر گفتگو معہ سگریٹ
(۳) ایک طنز معہ چائے و سگریٹ
(۴) مارکسزم پر گفتگو معہ سگریٹ
(۵) ایک افسانہ معہ چائے و سگریٹ
(۶) نورِ پیر تباولۂ خیال معہ حقہ
(۷) کھانا۔ چائے اور پھل
(۸) گفتگوئے عام ـــــ معہ سگریٹ و پان

"اب آپ لوگ اس میں جو ترامیم یا اضافے چاہیں کرا لیں"

"بورِ اعظم نے کہا" نظم میں پڑھوں گا اور افسانہ بھی میں ہی پڑھوں گا"

اس نے کہا "منظور ـــــ بشرطیکہ کسی کو اس پر اعتراض نہ ہو"

بورِ لابوار بولے "یہ سب کیا ہے ـــــ مجھے تو اس سے کوئی دلچسپی نہیں"

اس نے ان کے کان میں کہا "گھبرائیے نہیں ـــــ یہ سب اسی نور کا پرتو ہے جسے دیکھنے کے لئے آپ بیتاب ہیں"

دی بور نے کہا "طنز میری رکھ لیجئے"

اس نے کہا "اچھا ـــــ کسی کو اعتراض تو نہیں اس پر"

بورِ اعظم نے کہا "مجھے ہوتا ـــــ لیکن افسوس میرے پاس کوئی طنزیہ مضمون نہیں اس وقت"

اس نے کہا "خیر چلئے ——— پہلے آپ اپنی نظم تو سنائیے"

بور اعظم نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کاغذ کا ایک ٹکڑہ نکال کر اسے بغور دیکھا اور پھر کھڑے ہو کر بولے "یہ آزاد نظم ہے جسے میں نے جدید انگریزی ادب سے متاثر ہو کر لکھا ہے ——— اس کا عنوان "بال کی صفائی" ہے ——— ملاحظہ ہو ۔

سر میں میرے بال بہت ہیں
سر پہ میرے جوتے مارو
تیل نہیں پھلیل نہیں ہے
پھوٹی کوڑی پاس نہیں ہے
ایسے میں پھر بال کیا رکھوں
مارو جوتے ——— جوتے مارو

سر میں میرے بال بہت ہیں
سر پہ میرے جوتے مارو

مجھ سے بہتر سب گنجے ہیں
حجاموں کا خیال نہیں ہے
بال میں اپنے کیا بنواؤں
پھوٹی کوڑی پاس نہیں ہے

سر میں میرے بال بہت ہیں
سر پہ میرے جوتے مارو

کالے کالے بال ہیں میرے
جیسے میں نے ناگ ہوں پالے
دیکھا راہوں جیون کا میں
مارو مارو ——— مجھ کو مارو

سر میں میرے بال بہت ہیں
سر پہ میرے جوتے مارو

جوتے مارو ایسے جوتے
جن کے نیچے نعل جڑے ہوں
بال بہت ہیں، بال بہت ہیں
سر پہ میرے جوتے مارو

اور بور اعظم جوتے کی تمنا میں بیٹھ گئے ۔

اس نے پیٹھ ٹھونک کر کہا "یار تم نے تو کمال کر دیا ——— ایسی اچھی نظم سنائی ہے کہ تمہارا کیلے اگر موجود ہوتا تو تمہیں گلے سے لگا لیتا"

بور لالا بوار نے بھی اپنی خشکی جھاڑتے ہوئے کہا "سبحان اللہ ——— کیسی بولتی ہوئی نظم ہے ——— اگرچہ موضوع کو تو رسے ذرا بھی تعلق نہیں"

بور اعظم نے فرمایا "میں نے زندگی میں ڈوب کر یہ نظم لکھی ہے ——— جب زندگی ہی ایسی ہو تو کوئی دوسرا موضوع اختیار کرنا زندگی سے فرار کے مترادف ہو گا"

"ٹھیک" اس نے بور لالا بوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جب بال بڑھے ہوئے ہوں اور انہیں کٹوانے یا تیل لگانے کا موقعہ ہی نہ مل رہا ہو تو شاعر اس کے سوا اور کیا لکھ سکتا ہے ؟"

بور لالا بوار بولے "ایسا ہو سکتا ہے میں کب کہہ رہا ہوں کہ ایسا نہ کرنا چاہئے ——— البتہ اس مقدس موقعہ کی مناسبت سے کوئی نورانی نظم پڑھی جاتی تو بہتر ہوتا ۔

دی بور نے کہا "اس نظم میں شاعر نے اپنی غربت و افلاس کا ایسا عمدہ نقشہ کھینچا ہے کہ بس ——— اور پھر یہ انداز ——— غضب بے غضب"

اس نے فوراً کہا "بے شک ——— یہ نظم گاڈفرے کی مشہور نظم "بھکاری" کی ٹکر کی ہے ۔ میری رائے میں اس کا ترجمہ انگریزی میں کرا کر کسی مشہور انگریزی رسالہ میں بھیجنا چاہئے ——— کیا خیال ہے آپ لوگوں کا ؟"

بور نے جو اب تک خاموش بیٹھے ہوئے تھے کہا "ہونا چاہئے ۔ مگر ترجمہ کون کرے گا ؟"

اس نے کہا "شاعر خود اپنی نظم کا ترجمہ کرے گا ——— ماشاء اللہ انگریزی پر اسے پورا عبور ہے"

بور اعظم نے اپنی تعریف سے متاثر ہو کر کہا "ہاں میں خود ترجمہ کروں گا ——— کسی کے پاس ڈکشنری ہو تو مجھے چند دنوں کے لئے دے دے ——— میں مشکور ہوں گا"

اس نے کہا "میرے پاس ٹوانیٹی ایتھ کنٹری ڈکشنری موجود ہے تم گھر پر لے لینا"

بور اعظم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "مجھے چیمبرز کی ڈکشنری درکار ہے"

اس نے کہا "یہ بھی مل جائے گی ——— ہاں بھائیو اب دوسرا ——— مسئلہ چائے نوشی کے متعلق ہے ——— آپ میں سے جو صاحب اس کے مخالف ہوں وہ اپنے دلائل تحریری یا زبانی طور پر پیش کریں"

بور نے اٹھتے ہوئے پھر بیٹھتے ہوئے کہا "میں چائے کا مخالف ہوں"

دی بور نے کہا "مگر یہ جو آپ کے سامنے چائے کی پیالی دھری ہوئی

ہے۔ اس کے متعلق کیا ارشاد ہے؟"

بورنے کہا: "آپ کو کچھ دکھائی بھی دیتا ہے ـــــ پیالی خالی ہے۔"

دی بورنے کہا: "خالی تو ہے مگر پینے کے بعد خالی ہوئی ہے۔"

بور اعظم نے کہا: "خالی پیالی کو خالی کہنا کوئی جرم تو نہیں۔"

اس نے کہا: "چائے کی پیالی بھری تھی ـــــ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے خالی کس نے کیا۔؟"

دی بورنے اچھل کر کہا: "ہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ بھری پیالی خالی کیسے ہوئی؟"

بورنے کہا: "میں نے چائے پی ہے اس لئے خالی ہو گئی۔"

دی بور کہا: "مگر آپ تو چائے کے مخالف ہیں نا؟"

بورالابورنے کہا: "ٹھیرو۔ ٹھیرو ـــــ پیالی خالی کہاں ہے۔ ـــــ اس کے اندر ظلِ نور جو آ گیا۔"

اس نے کہا: "یہ نکتہ بروقت پیدا ہوا ـــــ آپ لوگ اس پر غور فرمائیے کہ یہ پیالی جو بظاہر ہمیں خالی نظر آتی ہے۔ واقعی خالی ہے؟ کیا اسے خالی کہنا صحیح ہوگا؟"

ایک نیم بھدنے کہا: "یہ بات کچھ غیر متعلق معلوم ہوتی ہے۔"

بورالابور بولے: "کیا کہا ـــــ غیر متعلق؟"

نیم بورنے کہا: "یہ موضوع سے ایک علیحدہ بحث چھڑ گئی ہے۔ یہاں سوال صرف چائے نوشی کا ہے۔"

اس نے بورالابور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "یا شیخ۔ اس بات کو سمجھنے والے کم ہیں یہاں ـــــ لوٹتے وقت ہم اس موضوع پر اطمینان سے گفتگو کریں گے ـــــ اچھا دوستو۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ چائے پینے والے نے چائے پی لی۔ پیالی خالی ہو گئی۔ اور اب وہ کہتا ہے کہ میں چائے کا مخالف ہوں۔"

دی بورنے کہا: "سوال یہ ہے کہ ایک طرف چائے پی جائے۔ اور دوسری طرف اس کی مخالفت کی جائے۔ یہ قول و عمل کا تضاد چہ معنی دارد؟"

بور اعظم نے کہا: "اس میں کیا قباحت ہے ـــــ ذرا آپ اپنی بات کی وضاحت کیجئے۔"

دی بورنے کہا: "قول و عمل کا تضاد آپ کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔ کیسے پاگلوں سے پالا پڑا ہے۔"

بور اعظم نے غضبناک ہو کر کہا: "پاگل؟ ـــــ میں پاگل؟"

اس نے فوراً کہا: "نہیں نہیں ـــــ یہ تو اسے پاگل کہہ رہے ہیں جو تضاد پر ایمان نہیں رکھتا ـــــ آپ کا تو ایمان ہے نا اس پر؟"

بور اعظم نے کہا: "کس کافر کا ایمان نہیں؟"

اس نے کہا: "پھر ٹھیک ہے۔ آپ پاگل نہیں۔"

دی بورنے کہا: "مگر میری بات کا جواب؟"

اس نے بور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ دیں گے ـــــ ہاں بھئی کوئی دلیل تو لا کر دو۔"

بورنے کہا: "حکیم نابینا ـــــ جو چائے کے مخالف ہوتے ہوئے بھی چائے پیتے ہیں۔"

اس نے کہا: "حکیم صاحب وائٹ جاکین پیتے ہیں اور وہ بھی بغیر دودھ کے ـــــ آپ کی ان کی چائے میں بہت فرق ہے۔"

بورنے کہا: "اس سے کیا ہوتا ہے۔ چائے تو پیتے ہیں۔"

دی بورنے کہا: "ہم حکیم نابینا کو نہیں جانتے ـــــ آپ اپنی مخالفت کے وجوہ بیان کریں۔"

بور بولے: "وجوہ؟ ـــــ ہمدرد صحت پڑھئے معلوم ہو جائے گا۔ کچھ زبانی تھوڑے یاد ہے ـــــ البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ چائے صحت کے لئے مضر ہے۔"

بور اعظم نے فرمایا: "بے دلیل بات مانی نہیں جائے گی ـــــ آپ یا تو دلیل پیش کریں ورنہ یہ تسلیم کریں کہ چائے صحت کے لئے مضر نہیں۔"

بورنے کہا: "میں تو اسے ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا۔"

دی بورنے کہا: "تو پھر آپ بحث کیوں کرتے ہیں؟"

بور اعظم نے کہا: "یہ عجیب روش ہے۔ نہ اپنی بات منوائیں گے۔ نہ ہماری مانیں گے۔ پھر یہ بکواس بند کی جائے ـــــ کیلے نے ایسے ہی لوگوں کی شان میں کہا ہے کہ ـــــ"

بورنے کہا: "بکواس تم خود کرتے ہو۔"

بورالابور نے کہا: "ہائے انسان اندھیرے میں گھرا ہوا ہے۔"

اس نے کہا: "انسان کو نور کی ضرورت ہے ـــــ ڈاکٹر پی ہو نے بہت پہلے ہزاروں سال پہلے کہا تھا کہ چائے کے مسئلہ میں دو انسانوں کا متفق ہو جانا ممکن نہیں کیونکہ دنیا اصلی اور نقلی چیزوں میں تمیز نہیں کر سکتی ـــــ اصلی چائے تو ایک کیف آور شے ہے جو صرف چین جیسی جنت میں پیدا ہو کر غائب ہو جاتی ہے ـــــ اس کے بعد تو پھر

نقلی چائے ہی رہ جاتی ہے۔ جسے ہم سب بڑی خوشی سے چائے سمجھ کر پیتے ہیں ـــــ اس لئے یہ کہنا کہ چائے مضر صحت ہے۔ درست نہیں ـــ البتہ یہ چیز جو چائے کے نام سے ہمارے سامنے ہے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس کے نقصانات آج تک مجھ پہ واضح نہ ہو سکے۔"

بورا عظم نے کہا "میں اتنی چائے پیتا ہوں۔ پھر بھی میری صحت یہاں جتنے لوگ موجود ہیں۔ ان سب سے اچھی ہے۔"

بور نے کہا "مگر میری صحت پر چائے نے بُرا اثر ڈالا ہے۔"

بور اعظم نے فرمایا "پھر کیوں پیتے ہیں آپ؟"

بور نے جواب دیا "آپ روکنے والے کون ہوتے ہیں؟"

بور اعظم نے بگڑ کر کہا "آپ کو میری زبان پر تالا لگانے کا کیا حق ہے۔"

دی بور نے کہا "ہاں آپ کو دوسروں کی زبان پر سینسر شپ ایکٹ لگانے کا حق کس نے دیا؟"

بور نے کہا "میں چائے پیوں گا اور پیوں گا ـــــ لاؤ ایک پیالی اور دو۔ دیکھوں تو کون مائی کا لال روکتا ہے مجھے؟"

دی بور نے کہا "آپ کو چائے پینے کی اجازت اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک کہ آپ اس کی مخالفت ترک نہ کر دیں۔"

بور اعظم نے کہا "میں اس پیالی کو توڑ دوں گا۔"

بور الابوار نے مداخلت کی "خبردار ـــ چائے کی پیالی مت توڑنا ـــ اس میں ظل نور آ چکا ہے۔"

بور اعظم چیخے "میں ظل نور کو نکال دوں گا۔"

بور الابوار نے گرم ہو کر کہا "میں تمہاری رُوح قبض کر لوں گا۔"

بور اعظم نے جواباً کہا "آپ ملک الموت کب سے بن گئے؟"

اس نے کہا "جانے بھی دو ـــ معاف کر دو ـــ نہ تم ظل نور کو پیالی سے نکالو، نہ شیخ صاحب تمہاری رُوح قبض کریں ـــ یہاں سوال یہ ہے کہ دوسری پیالی میں ظل نور کہاں سے آیا جسے نکالنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے؟"

بور اعظم نے تڑپ کر کہا "ہاں دوسری پیالی میں ظل نور کہاں سے آیا؟"

بور الابوار نے کہا "ہر پیالی میں ظل نور ہے۔"

اس نے کہا "ظل نور تو وہیں آ سکتا ہے جہاں جگہ ہو ـــ اس دوسری پیالی میں تو چائے بھری ہوئی ہے ـــ جگہ کہاں ہے؟"

بور الابوار نے کہا "یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں ـــ مگر کوئی سنتا ہی نہیں۔"

اس نے کہا "اچھا خیر، اس جھگڑے کو ختم کیجئے ـــ اب آیئے تیسرے مسئلہ کو لیجئے۔"

اس نے دی بور کو اشارہ کیا کہ اپنی طنز پڑھو۔

دی بور بڑی شان سے کھڑے ہوئے ـــ اپنا چشمہ آنکھوں پر سے اتار کر پہلے اسے صاف کیا۔ پھر اسے ناک پر اچھی طرح جما کر گلا صاف کیا۔ پھر اِدھر اُدھر مڑ کر حاضرین کو دیکھا ـــ اور پھر بولے "میں طویل مضامین لکھنے کا عادی نہیں۔ میرے نزدیک ایک مختصر ادب پارہ جس میں گہرا تاثر ہو۔ طویل ادب پارہ سے کہیں بہتر ہے۔ چنانچہ میں نے ایک مختصر ترین طنز لکھی ہے ـــ عنوان ہے "حکومت موت مہیا کرے گی" ـــ سنیئے۔"

"میں نے جیبوں ہی اچھالا ہاتھ میں لیا۔ میری نظر ایک سرخی پر جم گئی۔ میں سٹ پٹا گیا ـــ ہائیں۔ اب حکومت موت بھی مہیا کرے گی۔ گویا لوگ کچھ کم مر رہے ہیں جو انھیں مارنے کے لئے اب یہ تازہ اقدام کیا جا رہا ہے۔"

مگر جب میں نے خبر پڑھی تو معلوم ہوا کہ حکومت صرف موت مہیا کرے گی۔"

دی بور نے داد خواہانہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

اس نے کہا "کیا بات پیدا کی ہے استاد ـــ مین وچ نے بھی ایسی طنز لکھی ہوگی ـــ مین وچ بہت بڑا روسی طنز نگار تھا۔" ـــ آپ لوگ جانتے ہی ہوں گے۔"

بور اعظم نے کہا "یہ طنز تو انگریزی طنز نگار ٹھن لی کاٹ کی ایک طنز سے ملتی جلتی ہے ـــ ایسی نقالی تو میں پسند نہیں کرتا۔"

اس نے کہا "مگر یہ ماننا پڑے گا کہ مین وچ نے ایسی طنز نہیں لکھی۔"

بور اعظم بولے "اس سے مجھے کب انکار ہے۔"

بور نے کہا "طنز موجودہ حالات پر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے آفاقی ہونا چاہئے تھا۔"

دی بورنے کہا "یہ طنز آفاقیت کا حامل ہے۔"

بورِ اعظم نے کہا "یہ طنز حالات پر ہے ہی نہیں ——— اس نے آفاقیت کا سوال ہی بحث ہے۔"

دی بورنے کہا "حالات کا آفاقیت سے کیا تعلق؟"

بورنے کہا "آپ یہ کیسے کہتے ہیں کہ اس طنز کا حالات سے کوئی رشتہ ہی نہیں پہلے ثابت تو کیجئے پھر آفاقیت پر بحث کیجئے گا۔"

اس نے کہا "بھئی ——— یہ یوں نہیں طے ہوتا ——— پہلے اس کا فیصلہ کیجئے کہ طنز کس پر ہے؟"

بورِ اعظم نے کہا "حکومت پر۔"

بورنے ہڑبڑا کر کہا "غلط ——— ان حالات پر ہے جن کے تحت لوگ مر رہے ہیں۔"

بورِ اعظم نے کہا "تو میں غلط کہہ رہا ہوں ——— میں جھوٹا ہوں۔"

دی بورنے کہا "آپ واقعی جھوٹے ہیں۔"

بورِ اعظم چیخے "میں جھوٹا ہوں اور تم ——— تم؟"

دی بورنے کہا "میں کہتا ہوں کہ آپ جھوٹ کہہ رہے ہیں۔"

بورِ اعظم حلق پھاڑ کر چلائے "آپ خود جھوٹے ہیں۔"

اس نے فوراً گرفت کی "بھئی نہ تم جھوٹے ہو اور نہ تم ——— بات صرف اتنی سی معلوم کرنی ہے کہ یہ طنز کس پر کی گئی ہے ——— میری رائے میں طنز نگار کو خود اس کا فیصلہ کر دینا چاہئے۔"

دی بورنے کہا "یہ طنز ہیں نے کتابت پر کی تھی۔"

بورِ اعظم چیخ کر بولے "تو یہ طنز کامیاب نہیں کیونکہ صاحب طنز کو جو تاثر پیدا کرنا چاہئے تھے وہ نہیں پیدا ہوا۔"

بورنے کہا "نہیں ——— طنز کامیاب ہے ——— طنز نگار نے حالات پر بڑی گہری چوٹ کی ہے۔"

بورِ اعظم نے کہا "وہی مرغے کی ایک ٹانگ ——— میں کہتا ہوں ذرا سنئے اور سمجھئے۔ کیلے نے ——— ——"

اس نے کہا "طنز نگار کہتا ہے کہ اس نے کتابت پر طنز کی ہے۔ آپ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں حکومت پر یا حالات پر ——— یہاں یہ ہے کہ بات مانی کس نے جائے؟"

بورِ اعظم نے جواب دیا "جو ہری کی۔"

بورنے عرض کیا "یہاں جوہری کہاں سے آن ٹپکا؟"

بورِ اعظم نے مسکراتے ہوئے کہا "میرا مطلب پرکھنے والے سے ہے ——

تو ابھی بچے ہو ——— ذرا سیکھو کچھ۔"

بورنے بگڑ کر کہا "میں بچہ ہوں ——— میں بچہ؟"

بورِ اعظم بولے "بچے نہیں تو اور کیا ہو؟"

بورنے چلا کر کہا "میں تم جیسے بڈھے طوطوں کو پڑھا سکتا ہوں۔"

اس نے کہا "ان باتوں سے کیا فائدہ؟ ——— بات تو یہ ہے کہ بات مانی کس کی جائے۔"

دی بورنے کہا "میری۔"

بورِ اعظم نے کہا "میری۔"

بورنے کہا "میری۔"

اس نے کہا "شیخ صاحب کی۔"

بورلالا بورنے جواب تک مراقبے میں تھے۔ آنکھیں کھول کر کہا "کیا ہے؟"

اس نے مسئلہ سامنے رکھ دیا۔

بورلالا بورنے فرمایا "جب طنز نگار خود کہہ رہا ہے کہ اس نے کتابت پر طنز کی ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ ایسا ہی ہوا ہے۔"

بورِ اعظم اور بورنے بیک وقت کہا "ہم اسے کیسے مان لیں؟"

بورلالا بورنے کہا "آپ کو ماننا پڑے گا۔"

بورِ اعظم نے کہا "ہم نہیں مانتے۔"

بورنے کہا "ہم بھی نہیں مان سکتے۔"

بورلالا بورنے ارشاد کیا "آپ نہیں مانتے تو پھر مجھ سے پوچھا کیوں تھا؟"

لاحول ولا قوۃ۔ کیسے بیہودوں سے پالا پڑا ہے۔

بورِ اعظم اور بور دونوں نے چلا کر کہا "آپ خود جاہل ہیں۔"

بورلالا بورنے ٹکا سا جواب دیا "جاہل ابنِ جاہل ابنِ جاہل۔"

اس نے کہا "جانے دیجئے۔ شیخ صاحب ——— جہالت تو ظاہر ہے ہی ——— مگر ایک لطیف نکتہ پر آپ نے اب تک غور نہیں کیا ——— وہ یہ کہ صاحب طنز کہتے ہیں کہ انہوں نے کتابت پر طنز کی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ انہوں نے کاتب پر کی ہے۔"

دی بور نے کہا "بالکل غلط ——— میں نے کتابت پر کی ہے۔ شخصیت میرے پیش نظر تھی ہی نہیں۔"

اس نے کہا "تو لاشعوری طور پر ہو گئی۔"

بورِ اعظم بولے "تو اس طنز کے تابوت میں یہ آخری کیل بھی ٹھونک دی گئی۔"

دی بور نے کہا "کیا کہتے ہیں آپ؟ ——— میری طنز زندہ جاوید ہے۔"

اس نے کہا "مجھے آپ سے اتفاق ہے ——— مرنے کے بعد بھی بعض لوگ زندہ رہتے ہیں۔ اور آپ کی طنز تو جاندار ہے ابھی"۔

دی بورنے خوش ہو کر کہا "اب صرف ایک بات اور رہ گئی ——— وہ یہ کہ میری طنز آفاقی ہے یا نہیں؟"

بور اعظم اور بور دونوں نے کہا "نہیں ہے"۔

دی بورنے کہا "ہے"

بور اعظم اور بور دونوں نے کہا "نہیں"

دی بورنے پھر کہا "ہے"؟

دونوں نے پھر کہا "نہیں"

اس نے کہا "کچھ ہے ——— کچھ نہیں ——— آگے بڑھئے ———

چوتھا مکالمہ مارکسزم پر گفتگو

بور اعظم نے کہا "اب تو بھوک لگ رہی ہے ——— پہلے کھانا کھا لیا جائے"

بور۔ دی بور اور بقیہ لوگوں نے بھی اس کی تائید کی۔

کھانا کھانے کے بعد چائے اور پھل کا دور چلا ——— حقے اور سگریٹ کے بھی لمبے لمبے کش لئے گئے ——— پان سے ہونٹ بھی سرخ کئے گئے ——— اور انھیں سرخ سرخ ہونٹوں سے بور اعظم نے تقاضہ کیا کہ سب سے پہلے ان کا افسانہ سن لیا جائے۔

لیکن دی بور نے اس کی مخالفت کی اور اپنے موضوع خاص ——— مارکسزم پر گفتگو کے لئے اصرار کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چھٹا مکالمہ جو نور سے متعلق تھا شروع ہو گیا۔

بور لالا بور نے کہا "نور ——— ہر شے میں نور ہے ——— اور آج وہ بروج ظل میں داخل ہو رہا ہے"۔

بور نے کہا "میں نے آج تک بروج ظل جیسا لفظ کہیں نہیں سنا"

بور لالا بور نے کہا "تم کیا جانو ان باتوں کو"۔

بور اعظم نے کہا "جب تک کہ آپ بروج ظل کے معنی متعین نہ کریں گے ——— ہم آپ کی بات نہ سنیں گے"۔

بور لالا بور بگڑ کر بولے "تم مجھے اس پر مجبور نہیں کر سکتے"

بور اعظم نے کہا "آخر آپ اس فقرے کے معنی کیوں نہیں بتاتے؟"

بور لالا بور بولے "یہ رازانہ کی بات ہے"۔

بور نے کہا "جب یہ راز کی بات ہے تو پھر آپ اسے راز ہی رکھئے ——— زبان پر کیوں لے آتے ہیں؟ ایسے فقروں کو کیوں استعمال کرتے ہیں؟"

بور لالا بور نے کہا "تو آپ میری زبان پر پہرہ لگانا چاہتے ہیں"

دی بور بولے "نہیں ——— ہم آپ کے فلسفۂ نور کو سمجھنا چاہتے ہیں"

اس نے کہا "ہاں شیخ ——— نور کیا ہے؟ اور اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ ہر شے میں موجود ہے"

بور لالا بور نے کہا "نور ذات خداوندی ہے۔ اور وہ ہر شے میں جلوہ گر ہے"

بور اعظم بولے "کیٹس نے کہا ہے کہ Thou are nowhere but my neha یعنی خدا کو تلاش کرنا ہو تو اسے اپنے قریب ہی تلاش کرو۔ مطلب یہ کہ خدا ہر شخص کے دل کے قریب ہے ——— سوال یہ ہے کہ جب وہ اتنا قریب ہے تو انسان خدا کو چھوڑ کر نور کے پیچھے کیوں پڑے ——— آخر اس نور کو دریافت کرنے کی ضرورت ہی کیا؟ صاف صاف کیوں نہیں کہا جاتا کہ خدا ہر چیز میں موجود ہے"

دی بور نے کہا "خدا ہر چیز میں موجود ہے؟ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ خدا انسان کے پیٹ میں بھی موجود ہے ——— اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر پیٹ کے راستے جو کچھ بھی کیا جائے جائز ہے ——— کیونکہ درحقیقت یہ خدا ہی ہوتا ہے جو انسان کے اعمال کا ذمہ دار ہوتا ہے"

بور نے کہا "یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا ہر چیز میں موجود ہے تو وہ یقیناً شیطان کے اندر بھی موجود ہے جس کے ایک پیغمبر ہونے میں کوئی شک نہیں ——— کیا شیطان تو خدا کا مردود ہے ——— کیا اس سے آپ کا فلسفۂ نور غلط نہیں ثابت ہو جاتا؟"

بور لالا بور چیخے "تم سب جاہل ہو ——— نور خدا کا پرتو ہے نہ کہ خدا نہیں"

بور اعظم۔ دی بور اور بور نے مکرر بور لالا بور کی زبان درازی کے خلاف احتجاج کیا"

اس نے کہا "یا شیخ ——— یہاں سب پڑھے لکھے لوگ ہیں مگر آپ کی بات سمجھ نہیں رہے ہیں۔ درحقیقت جب انعکاس طرفین ہو رہا ہو تو لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور تخلیق ماؤف"

بور اعظم نے دریافت کیا "یہ انعکاس طرفین کیا بلا ہے؟"

بور لالا بور بولے "تم لوگ چاہتے ہو کہ میں سارا فلسفہ آج ہی سمجھا دوں۔ اگر تم واقعی سمجھنا چاہتے ہو تو جو کچھ میں کہوں اسے بے چون و چرا مان لو ——— اور کوئی سوال مت کرو؟"

دی بور نے کہا "مارکس نے کہا ہے کہ مذہب افیون ہے ——— کیا یہ افیون نہیں؟"

بورالا بوار چیخے "تم کافر ہو"

دی بور نے کہا "تم خود کیا کافر ہو"

بورالا بوار غصّہ میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "کافر کا بچہ مجھے کافر کہتا ہے۔ میں تیرا منہ توڑ دوں گا"

اس نے کہا "جانے دیجئے شیخ صاحب ——— معاف کیجئے۔ ابھی بچہ ہے سمجھتا نہیں"

دی بور نے کہا "میں شیخ صاحب اور ان کے فلسفہ کا گلا گھونٹ دوں گا"

اس نے کہا "لیکن اپنی سرپلس انرجی کیوں ضائع کر رہے ہو؟"

بورالا بوار نے کہا "یہاں شیطان بستے ہیں ——— یہاں نور کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ایسی محفل میں میرا کیا کام؟"

اس نے کہا تشریف رکھئے ——— اس وقت جو تلخی پیدا ہو گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نور بروج ظل سے نکل کر بروج ضد میں داخل ہو رہا ہے" علامہ بورنی نے کہا ہے ———"

بورالا بوار نے متعجب ہو کر کہا "نور بروج ضد میں داخل ہو رہا ہے؟ تو تمہارا خواب جھوٹا تھا ——— تم جھوٹے ہو ——— مکار ہو ——— میں اب یہاں ایک پل کے لئے بھی نہیں رک سکتا ——— لعنت ہے تم پر ——— پھٹکار خدا کی"

بورالا بوار کے منہ سے کف جاری ہو گیا اور وہ اپنا جھاڑن وغیرہ سمیٹ کر بھاگ گئے۔ اس نے انھیں واپس بلانے کے لئے ایک نیم بور کو بھیجتے ہوئے کہا "افسوس۔ نہ نور ظلی رہا نہ ضدی ——— اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم شیخ صاحب کی واپسی تک افسانہ سنیں ———"

بور اعظم یہ سنتے ہی کھڑے ہو گئے اور ایک عدد کاپی ہاتھ میں لیکر افسانہ پڑھنا شروع کر دیا ——— جس کا عنوان "آدمیت کا سہارا" تھا۔

دی بور کسمسا کر رہ گئے ——— انھیں بور اعظم نے موقع ہی نہ دیا کہ کچھ کہہ سکیں"

"جب بھور بھئی" بور اعظم نے کہنا شروع کیا "تو کامریڈ نے آنکھیں پھاڑ کر کہا "اری او کلو کی ماں ——— چائے لا ——— چائے"

چائے پینے کے لئے کامریڈ بستر مریض پر بیٹھ گئے ——— اور بیٹھتے ہی انہیں چھینک آ گئی ——— ان کی سفید سفید کاڑھی کی کاڑھنی ناک اڑ کر چائے کی پیالی میں گری اور گرگر بالائی کی طرح تیرنے لگی۔

کامریڈ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا "واری کلو کی ماں ——— تیرے ہاتھ میں جادو ہے ——— جادو ——— ایسی بڑھیا چائے تو روز کیوں نہیں پلاتی"

بور اعظم مزے لے کر افسانہ سنا رہے تھے اور جھوم رہے تھے ——— ایک موقعہ پر انہوں نے اپنے کردار کی زبان سے کہلوایا "سرمایہ دار اگر کمیونسٹ بن جائے تو اسے مزدوروں سے کہیں زیادہ فائدہ ہو ——— مگر یہ آنکھوں کا اندھا نہیں دیکھتا۔ اپنا فائدہ بھی نہیں دیکھتا"

بور اعظم نے تقریباً ایک گھنٹہ لیا افسانہ سنانے میں ——— اور اسے یوں ختم کیا کہ کامریڈ سوچ رہے تھے۔ یہ دنیا پھر بھی امن نہ پا سکی۔ چین نہ پا سکی۔ اب کیا ہوگا۔ آدمیت کا سہارا کون بنے گا ——— ہاں کون بنے گا؟"

جیسے ہی بور اعظم نے افسانہ ختم کیا۔ دی بور نے سوال کیا "آپ نے یہ افسانہ لکھا ہے یا مضمون؟"

بور اعظم نے کہا "جو کچھ سمجھ لیجئے"

دی بور نے کہا "آپ نے افسانے میں مضمون لکھا ہے"

بور نے کہا "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

دی بور نے کہا "میں کہتا ہوں کہ یہ مضمون ہے جسے افسانہ کا لباس پہنا دیا گیا ہے"

بور اعظم بولے "تو؟"

دی بور نے کہا "تو آپ مضمون کو افسانہ کیوں کہتے ہیں؟"

بور اعظم نے پوچھا "آپ کو عینک سے بھی نظر آتا ہے؟"

دی بور بولے "میری عینک؟"

بور اعظم نے کہا "جی ہاں ——— آپ کی آنکھوں پر یہ جو عینک ہے نا ——— اس سے افسانہ آپ کو مضمون نظر آتا ہے"

دی بور نے کہا "آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟"

بور نے کہا "آپ کا مذاق کون اڑا رہا ہے ——— آپ خود اپنا مذاق اڑا رہے ہیں"

دی بور نے چیخ کر کہا "آپ لوگ مذاق پر اتر آئے ہیں ——— میں مذاق کا جواب مذاق سے دینا جانتا ہوں"

بور اعظم نے کہا "تو کیجئے نا مذاق ——— آپ کو روکتا کون ہے؟"

بور نے کہا "آپ سے ڈرتا کون ہے؟"

دی بور بولے "میرا مذاق جوتا ہے"

بور اعظم نے کڑک کر کہا "میرا مذاق گھونسہ ہے"

بور نے بھڑک کر کہا "میرا مذاق تھپڑ ہے"

اس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "اور میرا مذاق صرف ایک گلاس ٹھنڈا پانی ہے"

اس نے تینوں کے ہاتھ میں پانی کا ایک ایک گلاس تھما دیا۔

پانی پینے کے بعد دی بور نے کہا "آپ نے اپنے مضمون میں کامریڈ کا مذاق اڑایا ہے۔

بور اعظم نے کہا "میں اڑاؤں گا اور ایسے ہی اڑاؤں گا ——— آپ مجھے روکنے والے کون؟"

بور نے کہا "کامریڈ کا مذاق کہاں اڑایا گیا ہے ——— یہ تو حقیقت نگاری ہے"

دی بور نے کہا "کامریڈ کا مذاق اڑایا گیا ہے ——— اڑایا گیا ہے۔

——— اڑایا گیا ہے ——— اسے ناک بھری چائے پیتے ہوئے دکھایا گیا ہے ——— بھلا یہ حقیقت ہو سکتی ہے۔

اس نے کہا "اس کا تو کہیں بھی تذکرہ نہیں کیا گیا ——— آپ نے افسانہ کو غور سے نہیں سنا ورنہ یہ غلط فہمی نہ پیدا ہوتی ——— افسانہ نگار نے کہیں نہیں لکھا کہ کامریڈ نے ناک بھری چائے پی ———"

بور اعظم بولے "جی ہاں ——— میں نے تو کہیں نہیں لکھا ——— البتہ یہ ضرور لکھا ہے کہ کامریڈ نے چائے کی چسکی لی"

اس نے کہا "بس تو معاملہ بالکل صاف ہے"

دی بور نے کہا "نہیں ——— کامریڈ کا مذاق اڑایا گیا ہے"

بور اعظم بولے "یہ تو پریا ہٹ ہے ——— ایک انگریزی فلاسفر نے کیا خوب کہا ہے ؎

Woman thy will not give upon

یعنی عورت ہمیشہ اپنی ہی بات پر اصرار کرے گی کبھی دوسروں کی بات نہیں مانے گی، خواہ وہ کتنی ہی سچی کیوں نہ ہو"

دی بور نے غضبناک ہو کر کہا "میں عورت ہوں؟"

بور اعظم نے کہا "میں آپ کو تو عورت نہیں کہہ رہا"

بور نے کہا "اگر آپ خود اپنے کو عورت سمجھ لیں تو اس میں ہمارا کیا قصور؟"

دی بور نے کہا "آپ لوگ اس قابل نہیں کہ کوئی منہ لگائے"

اس نے کہا "دیکھئے یہاں منہ لگانے کا سوال نہیں اور نہ ہی کسی عورت کا جھگڑا ہے بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ آیا اس افسانہ میں کامریڈ کا مذاق اڑایا گیا ہے یا نہیں؟"

دی بور نے کہا "میں کب سے کہہ رہا ہوں کہ اڑایا گیا ہے۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے"

اس نے کہا۔ اچھا تو پھر آپ کے پاس اس کی دلیل کیا ہے؟"

دی بور نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا "دیکھئے پہلی دلیل تو وہی ہے جسے میں بیان کر چکا ہوں ——— اور دوسری یہ کہ افسانہ میں کہا گیا ہے کہ سرمایہ دار اگر کمیونسٹ بن جائے تو اسے مزدوروں سے کہیں زیادہ فائدہ پہنچے گا"

اس نے کہا "یہ تو کوئی دلیل نہیں ہوئی ——— پہلی دلیل تو ایک قوی تر دلیل سے مسترد کی جا چکی ہے ——— دوسری دلیل بھی کوئی وزنی دلیل نہیں"

دی بور نے کہا "کیوں نہیں؟"

اس نے کہا "آپ ثابت کیجئے"

بور اعظم نے کہا "یہ کیا خاک ثابت کریں گے"

دی بور نے کہا "آپ اپنی چونچ بند رکھئے ——— نہیں تو؟"

بور اعظم نے کہا "نہیں تو؟"

بور نے کہا "یہ آپ ثبوت دے رہے ہیں؟ ——— کس چیز کا؟"

دی بور نے کہا "ثبوت؟ ——— ثبوت یہ ہے کہ سرمایہ دار کبھی کمیونسٹ نہیں بن سکتا لیکن افسانہ نگار نے لکھا ہے کہ سرمایہ دار بن سکتا ہے"

بور اعظم نے کہا "تمام کمیونسٹ سرمایہ دار ہیں بلکہ ان کے باپ ہیں"

دی بور نے کہا "یہ حقیقت کے قطعی خلاف ہے۔ آپ نے کیسے کمیونسٹ کا مذاق اڑایا ہے ———"

اس نے کہا "لیکن کامریڈ کا تو نہیں ———"

بور اعظم نے خوشی سے اچھل کر کہا "میں نہ کہتا تھا کہ یہ ثبوت کیا خاک دیں گے"

دی بور نے کہا "کامریڈ اور کمیونسٹ ایک ہیں"

بور اعظم نے کہا "غلط۔ دو ہیں"

بور نے کہا "اس کا کیا ثبوت کہ یہ دونوں ایک ہیں؟"

دی بور نے کہا "ثبوت ——— ثبوت ——— ثبوت ——— میں کوئی ثبوت نہیں دیتا۔ ایک مسلّمہ امر کے لئے کسی ثبوت کی حاجت نہیں"

بور نے کہا "کامریڈ رفیق کو کہتے ہیں۔ اور ہر شخص کسی نہ کسی کا رفیق ہو سکتا ہے لیکن کمیونسٹ ———"

بور اعظم نے مداخلت کی "اس جانور کا نام ہے جو انقلاب زندہ باد کے نعرے لگوا کر ڈاکہ ڈالتا ہے اور آپ جانتے ہیں ہر شخص ڈاکو نہیں ہو سکتا"

دی بورنے گالی دی "تم بورژوا ہو ——— عوام دشمن"

بورِ اعظم نے ڈانٹا "تم ڈاکو ہو ——— عوامی دولت کے ڈاکو"

اس نے کہا "بھائیو ——— ذرا صبر سے کام لو ——— ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے کہ کون کس کا دشمن ہے ——— بات یہاں تک ارتقا کر کے آئی ہے کہ ایک صاحب کہتے ہیں کہ افسانہ نگار نے حقیقت کو پیش کیا ہے لیکن دوسرے صاحب کو اس حقیقت سے اختلاف ہے اور وہ اسے مذاق کے نام سے تعبیر کرتے ہیں ——— اور اس کے لئے دلیلیں بھی پیش کرتے ہیں ——— ان دلیلوں میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ سرمایہ دار کمیونسٹ نہیں بن سکتا ——— میں پوچھتا ہوں کہ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟"

دی بورنے کہا "اس لئے کہ پھر طبقاتی کش مکش کس کے درمیان ہوگی؟"

بورِ اعظم نے کہا "کمیونسٹ اور مزدور کے درمیان، جیسا کہ روس میں ہو رہا ہے"

دی بورنے کہا "یہ تیری بکواس ہے"

بورِ اعظم نے کہا "میں نہیں بکتا ——— تم بکتے ہو"

بورنے کہا "میں کئی سرمایہ داروں کو جانتا ہوں جو کمیونسٹ بنگئے ہیں"

اس نے کہا "اگر یہ سچ ہے تو پھر یہ بات مان لینے میں کیا حرج ہے کہ سرمایہ دار بھی کمیونسٹ بن سکتا ہے ——— ڈاکٹر مروزوف نے بھی کہا ہے کہ کمیونسٹ تھیوری کسی سرمایہ دار کو کمیونسٹ بننے سے نہیں روکتی البتہ وہ اس کا مطالبہ ضرور کرتی ہے کہ اپنی سرپلس انرجی کا پھل پارٹی کو دیدے"

دی بورنے کہا "ایسا لکھا ہے اس نے؟"

اس نے کہا "آپ کتاب دیکھ لیجئے نا"

بورِ اعظم نے کہا "مگر میں نے تو دیکھا ہے کہ کوئی کمیونسٹ اپنی محنت کا پھل پارٹی کو نہیں دیتا ——— بلکہ پارٹی خود اسے دیتی ہے"

اس نے کہا "تو شاید ان میں سرپلس انرجی موجود نہیں"

بورنے کہا "یہ سرپلس انرجی بڑا مہمل سا فقرہ معلوم ہوتا ہے؟"

دی بورنے کہا "آپ کیا جانیں ان باتوں کو ——— چہ داند بوزنہ لذات اوری"

بورِ اعظم نے کہا "آپ انہیں بوزنہ کہتے ہیں؟"

بورنے کہا "آپ میں یہ جرأت ——— میں آپ کا منہ توڑ دوں گا"

بورِ اعظم نے کہا "لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے"

اس نے کہا "ہائیں ——— یہ کیسی تلخ اور تند باتیں ہو رہی ہیں ——— رکیے انرجی اسی کو تو کہتے ہیں"

دی بورنے کہا "مارکس نے تو اس کی کچھ اور ہی تعبیر کی ہے"

اس نے کہا "سرپلس انرجی کا ذکر مارکس نے نہیں ڈاکٹر مروزوف نے کیا ہے ——— یہ دراصل سرپلس ویلیو کی جڑ ہے جسے مارکس نے نظر انداز کر دیا تھا"

دی بورنے چڑ ان ہو کر کہا "نظر انداز کر دیا تھا؟"

اس نے کہا "اس میں کوئی شک نہیں ——— پروفیسر آبلیا میخوف نے بھی یہی بات کہی ہے کہ سرپلس انرجی کے بغیر سرپلس ویلیو کا تصور نہیں کیا جا سکتا ——— سرپلس انرجی علت ہے سرپلس ویلیو نتیجہ ——— یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں"

"میں کب کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے ——— مگر یہ بورژوا تو نہیں مانتے ———" دی بورنے بورِ اعظم اور بور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بورِ اعظم چیخے "تم پھر مجھے گالی دے رہے ہو"

بور نے گلا پھاڑ کر کہا "تم بدمعاش ہو"

دی بورنے طیش میں آکر کہا "میں تمہیں جوتا دکھاؤں گا؟"

بورِ اعظم نے پہلے سے زیادہ چیخ کر کہا "میں تمہیں گھونسہ رسید کروں گا"

بور نے تاؤ میں آکر کہا "مار سالے کو ———"

اور بورِ اعظم آستین چڑھا کر اپنا موٹا تازہ گھونسہ لیکر دی بور کی طرف خوفناک انداز میں بڑھے۔

دی بور نے اپنا جوتا سنبھالا ——— لیکن سنبھالنے سے قبل ہی بھاگ کھڑے ہوئے بورِ اعظم اور بور دونوں ان کے پیچھے دوڑے۔

اس نے دونیم بوروں کو ان کے بچانے کے لئے بھیجتے ہوئے کہا "ننگ دھڑنگ" کیونکہ "بوران کرام" ایک دوسرے کے پیچھے جا کر غائب ہو گئے تھے ——— ابھی وہ اس سانحۂ عظیم پر کف افسوس ہی مل رہا تھا کہ ایک عظیم تر سانحہ پیش آیا۔

"صاحب ——— سات روپئے بارہ آنے" پان سگریٹ والے نے اپنا مطالبہ پیش کرتے ہوئے کہا

"صاحب پندرہ روپئے چودہ آنے" ہوٹل والے نے بھی کھانے اور چائے کا بل پیش کر دیا۔

"صاحب ——— پانچ روپئے دس آنے" پھل والے نے بھی تقاضہ کر دیا۔

"صاحب ——— میرا حقہ دو روپئے کی تمباکو آئی ہے" حقہ والے نے رہتی سہتی کسر پوری کر دی۔

وہ بوکھلا گیا ——— اور اس نے بوکھلا کر کہا "کیا یہ سب چیزیں اُدھار آئی تھیں؟"

"ہاں صاحب"

"کسی نے دیا نہیں کچھ؟"

"نہیں صاحب"

"تو جاؤ ——— جا کر ان سے مانگو جنہوں نے تمہیں آرڈر دیا تھا"

"صاحب ہم آرڈر وارڈر نہیں جانتے ——— ہمارا روپیہ دیجئے یا دلوائیے ——— نہیں تو ہم آپ کو جانے نہ دیں گے ———"

عاصی ضیائی رامپوری

سیدی مولیٰ

(مجھے نہایت افسوس ہے کہ اگست ۱۹۵۲ء کے معیار کے بعد تقریباً سال بھر کی تاخیر سے اس تمثیل کی اگلی قسط ہدیۂ ناظرین کی جارہی ہے لیکن اگر یہ حضرات اس طویل مدت میں میری مصروفیتوں۔ مجبوریوں۔ اور پراگندہ فکریوں سے بالتفصیل واقف ہو جائیں تو میرا جرم سہل انگاری و غفلت غالباً بہت زیادہ سنگین نہ ثابت ہو۔

بہرحال جو کچھ اور جس وقت بھی تیار کر سکا ہوں حاضرِ خدمت ہے۔ اور اگرچہ میری دلی خواہش ہے کہ ہر ماہ اس قرض کی واجب الادا قسط ادا ہوتی رہیں لیکن اس تجربے کے بعد حتمی وعدہ کرنا میری بساط سے باہر ہے۔ البتہ اگر پند آئے تو دعا کرتے رہئے کہ مجھے اس کو مکمل کرنے کے لئے ذہنی یکسوئی اور فرصت برابر میسر آتی رہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔)

(ع۔ض)

(دوسرا عمل)

دوسرا منظر: ۔ دہلی۔ سیدی مولیٰ کی خانقاہ کا ایک حجرہ[1]۔

اس منظر کے کردار

(۱) سیدی مولیٰ ..... تحریک اسلامی کا داعی

(۲) (اختیار الدین محمد) خانخاناں ... ولیعہدِ سلطنت سیدی کا معتقد۔

(۳) قاضی جلال کاشانی ..... قاضی القضاۃ دہلی

(۴) سرکاری ہرکارہ۔

(پردہ اٹھتے پر سیدی مولیٰ کسی فکر میں ٹہل رہا ہے۔ خانخاناں اور قاضی جلال کھڑے اس کو ادب اور تعجب سے دیکھتے ہیں)

سیدی۔ (یکایک رک کر) کاش اس آرزوِ مخلوق کی آوازِ نحیف
کلمہ گو اُمرا کا دلِ دل کھول سکے!
اے دمِ عشقِ بیچ بھر کے اکڑنے والو۔
تمہیں آدابِ محبت کا بھی کچھ پاس نہیں؟ ــــ
عشق میں طاعتِ محبوب بھی شرطِ اوّل
تم نے یہ عشق تو میراث میں آباء سے لیا۔
لیک یہ شرط۔ کہ تجھی روحِ حرارت اس کی
کھو گئی سلسلۂ نسل کی شہراہوں میں
ثروت و نام وری کا کوئی بہتر مصرف
نہ ملا تم کو ستم رانی و عشرت کے سوا؟
دین کی حلقہ بگوشی کے طفیل آج تمہیں
اسی عالم میں یہ اعزاز و نعم حاصل ہیں۔
اور اُسی دیں کے تقاضوں سے تساہل! ہیہات!
جذبۂ نہی عن المنکر و امرِ معروف
کہ کبھی لفظِ "مسلماں" تھا عبارت اس سے،
ہیں تمہارے ہوس آبادِ قلوب اس سے تہی!
تم کو تفویض ہوئی تھی جو خلافت فی الارض۔
کیا یہ مفہوم ہے آج اُس کا تمہارے نزدیک
کہ خداوندِ عزیز المتکبّر نے تمہیں
کر کے بھیجا ہے نمایندۂ کبر و جبروت؟
غدر و پیماں شکنی تم سے بھی کر کے کوئی
نرم برتاؤ کا مصداق نہیں رہ سکتا۔

---

[1] یہی منظر پہلے عمل (منظر سوم) میں آچکا ہے۔ اور اس میں کردار بھی تقریباً وہی تھے جو یہاں ہیں۔ (ع۔ض)

پھر بھلا کون سنا پروانۂ خوشنودیٔ رب
تم نے پایا کہ اسی جرم کی پاداش سے تم
ہر طرح اپنے کو مامون سمجھ بیٹھے ہو؟ (وقفہ)
خیر ہشیار، کہ وہ وقت اب آپہنچا ہے
جب تمہیں ہر قدمِ جادۂ طغیاں کے لئے
ایک بے مایہ و کمزور مزاحم کے خلاف
استقامت کی زبردست ضرورت ہوگی!
(للکار کر) کشورِ ہند سنبھل جا کہ ترے سینے پر
وہی آویزشِ دیرینۂ اصلاح و فساد
حسبِ معمول سر آغاز ہوا چاہتی ہے!
یا تو اب نیّرِ اسلام کی ضو پاشی میں
حائل ایک ایک دھندلکے کو ترے مطلعے سے
جلد ہی قاطبتاً چھانٹ دیا جائے گا۔
یا اسی سعی میں یہ بندۂ مسکیں اپنی
فرد لبریزِ معاصی کی سیاہی! اپنے
خون کے آخری قطرے سے بھی دھو ڈالے گا! (وقفہ)
(خانخاناں سے) قرۃ العین! اتقیا! یہ تملق برجا ہے
کہ تمہاری پئے ہم دعوتِ اصلاحِ نفوس
خود تمہارے ہی عزیزانِ گرامی کے لئے
مایۂ طنز و تمسخر بنی ـــــ لیکن۔ فرزند!
اس بنا پر تمہیں زیبا نہیں اظہارِ قنوط۔
تم ادا کرنے اُٹھے ہو جسے، یہ ہے وہ فرض
جس میں اس سے بھی کٹھن مرحلے پیش آتے ہیں
ہم تو کیا شے ہیں، رسولانِ رفیع الدرجات
ان سے بھی سخت موانع سے ہوئے ہیں دوچار
اُن کے اُسوہ کو سمجھتے ہو اگر مشعلِ راہ
تو شدائد کو بھی انگیز ہی کرنا ہوگا
بولو تیار ہو تم اس کے لئے؟
خانخاناں۔ یا مُرشدنا!
شاہی خاں واؤدۂ خلجی کے سب افرادِ ذکور
طاعتِ نفس میں ثابت قدمی کی خاطر
جان دینا سببِ فخر و سعادت جانیں
اور میں۔ جس کا ہو بھی ان اولوالعزموں سے
مدعی ہے تپش و سوز میں ہم چشمی کا
خوفِ آفات و مصائب سے، صراطِ حق پر
گامزن ہوتے ہوئے کوئی پس و پیش کروں!
آپ کے فیضِ تقرب کی بدولت میرا
مطمحِ سعی نبی منزلِ خوشنودیٔ رب
اب تو میرے سفرِ زیست کی غایت ہی یہ ہے۔
اور تائیدِ الٰہی سے توقع ہے مجھے
کہ کوئی وسوسۂ بیم و حدیثِ ترغیب
یا کوئی مرحلۂ صعبِ سبیلِ مذکور
مجھ کو آمادگیٔ گرم روی سے نہ سہی
ایک لحظے کے لئے بھی متزلزل نہ کرے
سیدی۔ آفریں۔ نورِ نظر! شکرِ خدائے منّان
میری امیدیں غلط شخص سے وابستہ نہ تھیں۔
ہاں، مگر، یاد رہے تم کو کہ یہ قول و قرار
سیدی مولیٰ سے نہیں، ربِّ سماوات سے ہے
جس سے پیماں شکنی کر کے نہ پنپا معلوم!
خانخاناں۔ یاد ہے۔ محترمی۔ یہ مجھے کیوں یاد نہ ہو۔
قلبِ کردار اسی تخمیں نے تو مجھ کو کیا۔
اور اب ہے یہی میرے لئے معیارِ عمل
سیدی۔ ثبّت اللہُ فؤادَک، اے مرے فرزندِ عزیز۔
آؤ، پھر آج بتاؤں تمہیں منصوبۂ کار۔
میرے منہاجِ عمل کا ہے یہ پہلا اقدام۔
حرمتِ خمر اب اس ملک میں نافذ ہو جائے
(خانخاناں اور قاضی چونکتے ہیں)
ہاں! اسی اُمِّ خبائث کی بدولت امرا
خشیۃ اللہ سے محروم ہوئے جاتے ہیں؛
یہی اُن کے ملکاتِ عمل و فکر کی باگ۔
باطل اغراض و مقاصد کی طرف موڑتی ہے۔
ان کے اعصاب پہ حاوی ہے یہ شیطاں جب تک

نہیں ممکن کہ کسی نوع کا وعظ و ارشاد
اِن کو مائل بہ ہدیٰ کرنے میں کارآمد ہو

خانخاناں ۔ مفتی دانا، یہ نیت نیک، یہ فرمان بجا۔
لیکن اس کو بروئے کار بھی لانے کے لئے
کوئی تدبیر ہو ایسی ہی موثر، ورنہ
کس طرح ساغر و مینا کے اسیرانِ ازل
قدغنِ شرع کو کرلیں گے گوارا خود پر ؟

سیدی ۔ ہمت و سعی میں اخلاص اگر شامل ہو
(کہ فقط اس کا مکلف ہے بشر دُنیا میں)
نقصِ تدبیر کے باوصف، یقیں ہے مجھ کو۔
حل کے ہی رہتا ہے اِتمام من اللہ کا صلہ۔
اِک قدم جانبِ رحمان بڑھائے تو کوئی۔
فرسخوں اُس کی طرف چل کے وہ خود آتا ہے۔
میرے منصوبے میں تم پہلے معاون ہوگے۔
تمہیں سلطان سے، یہ تدبیر یہ سنوانا ہے
کہ وہ خود مجتنبِ ذوقِ مے آشامی ہوں
اور ارباب[1] توسّل کی بھی بزم میں بھی
اپنے اس شغل کے معمول سے پرہیز کریں۔
اس طرح سے اُمرا کچھ متنبّہ ہوں گے ؛
پھر، مزید اں کہ چغلگاں[2] کا سردار بزرگ
تاجِ دیں بھی مری تحریک سے اِن لوگوں میں
یہی تبلیغ بہت جلد کیا چاہتا ہے۔

قاضی ۔ (متعجبانہ) تاجِ دیں کو بھی ؟

سیدی ۔ وہی ۔

قاضی ۔ سیّدنا! حیرت ہے!
اُس بلانوشِ قدیمی کو بھی گر آپ کا فیض
دامنِ توبہ میں لے آئے تو میرے نزدیک
اِس کو اعجاز کہا جائے تو واجب ہوگا۔

سیدی ۔ خیر، جو ہو، یہ حقیقت ہے کہ خانِ موصوف
آج، بعدِ جمعہ، مجھ کو یہ بتلاتے تھے
کہ مری سعیِ ہدایت اُنہیں اِس توبہ پر
معتصم[3] رہتے چہل روز کا عرصہ گزرا؛
اور اب آمادہ ہیں وہ اِس پہ کہ ہم چشموں کو
عنقریب اِس نئی دعوت سے شناسا کردیں۔

قاضی ۔ (حیرت اور تعریف آمیز جوش سے)
آہ، اے منتعش[4] نورِ سماوی ترا قلب،
ہم سے خسرانِ مآبوں کا بھلا کیا منہ ہے
کہ ترے تزکیۂ خلق کی توصیف کریں!
اِسی لمحے مجھے عرفان ہوا ہے کہ مرا
زندگی بھر کا ریاضِ عمل و کسبِ علوم
تیری اِس ایک ہی آن مول مہم کے آگے
کچھ نہیں ہے بجز انبارِ متاعِ کاسد!
کاش منجانبِ فیاضِ ازل، تیری طرح
میں بھی اِس جوششِ حیرت سے مُوفق ہوتا!
کاش، میرا بھی لہو ولولۂ حق سے یونہی
گرم ہوکر دلِ افسردہ کو محکم کرتا!
کاش، یہ حق کے لئے جان سپاری کی لگن
بطنِ مادر ہی میں مجھ کو بھی ودیعت ہوتی!——

سیدی ۔ ٹھیریئے، محترمی، اتنا تاسف نہ کریں۔
آپ کی فطرتِ صالح پہ یہ حسرت ہے گواہ؛
اِس بنا پر میں سمجھتا ہوں اسے قابلِ قدر۔
کیا مگر اس کو مبدّل بہ حقیقت کرنا۔
آپ کے حیطۂ اِمکاں میں نہیں ہے ؟

قاضی ۔ (مایوسی سے) ۔ خدا،

---

[1] ارباب توسّل یعنی مصاحبین، درباری وغیرہ [2] چغلگاں اُمرا کا ایک طبقہ بلبن کے عہد سے بہت معزز چلا آرہا تھا [3] معتصم بمعنی مضبوطی سے قائم۔
[4] منتعش بمعنی فیض یابی ( ) یہ لفظ اِس معنی میں میں نے غالب کے اِس شعر سے اخذ کیا ہے ؎
مجھے اِنتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی ۔ دہنِ شکستِ غزل سرائی ۔ ہوسِ فسانہ خوانی

کیا ہی دلکش یہ تصور ہے! مگر اس کا جواب
اگر اثبات میں دینے پہ میں قادر ہوتا
تو خوش آئند ترا اس سے مجھے کیا شے ہوتی؟
اے ترا طالع فرخندہ و کردارِ سعید
دین و دنیا میں ترے تیں وہ دلی کا ضامن،
فوزِ دارین مبارک تجھے، لیکن مجھ سے
جامد احساس و زبوں کار کی نسبت یہ خیال
کہ تغافل میں بسر کر کے میں اک عمرِ طویل
اُس کے افسوں سے نکل آؤں گا اب، وقتِ اخیر
اک جگر پاش متسخر کے علاوہ کیا ہے؟

سعیدی ۔ نہیں، علّامِ گرامی، یہ متسخر تو نہیں۔
اس قدر تلخ تاثر نہیں شایانِ جناب۔
سال و سن پر نہیں تائیدِ الٰہی موقوف؟
اور تاریخ بھی کرتی ہے مہیا ہم کو
ایسی اَمثال، کہ تا عمر کوئی رُوحِ سعید
حاملیّت کی حمایت میں رہی حق کی رقیب،
پھر جو یکبارگی ایمائے مشیّت نے اُسے
حق پرستی کے لئے منشرحُ الصدر کیا،
اُس کے کردار کے حق میں اُسی لمحے، گویا،
پھر گیا گردشِ افلاک کا رُخ دوسری سمت۔

قاضی ۔ (مایوسانہ) مجھے تسلیم، مگر یہ بھی ہے اتنا ہی درست
کہ یہ تقلیبِ دروں حصّہ اُنہی کا ہے کہ جو
حاملیّت میں بھی "اخیار" تھے اول دن سے:
اُن کی پاکیزہ سرشتی و علوِ حوصلگی
اُن کے اسلام میں آجانے سے وہ چند ہوئی
آہ، لیکن، میں وہ ناکارہ گہر ہوں جس کو
نعمتِ دیں ملی از رُوئے وراثت، پھر بھی
مجھ میں ہمّت نہیں حق اس کا ادا کرنے کی!

سعیدی ۔ خیر، اِس پر نظری بحث ہے قبل از ہنگام
کس کو معلوم کہ کل ہی سے وہ قلّابِ قلوب
آپ کو خدمتِ دیں کے لئے مختص کر لے!

لیکن اِک تجربہ میرا بھی سماعت فرمائیں۔ ——
(خانخاناں سے، جو، توقع ہے کہ تم کو بھی ہو سرمایۂ سود:
(خانخاناں اور متوجہ ہو جاتا ہے)
شب کی آغوش میں، دن بھر کی تگ و تاز کے بعد
جب کوئی مضجع[1] آرام پہ ہو جائے دراز،
طائرِ وہم کے بازوئے سبک سیر اُسے
لے کے پرواز پہ آمادہ ہوں اُس سوئے فلک،
فوز و خسران کے احساس کی دُنیا سے دُور ——
بس یہی ٹھیک وہ ساعت ہے جب انسان اپنی
فکرِ اعمال و مکافات کو بیدار کرے:
صبح سے شام تک اُس سے جو ہوا ہو سرزد
اُس کا لے جائزہ از راہِ رضا جوئیِ حق،
اور پہنائے تخیّل میں وہ میداں لائے
جس میں وہ فردِ عمل کا، لئے، اِک اِک مثقال
داورِ واحدِ قہّار کے آگے ہوگا؛
اور کس حال میں؟ کس ہوش رُبا موقع پر؟ ——
جبکہ ابعادِ زمانی و مکانی مل جائیں:
عرصۂ حشر اِدھ خلجانِ وراء الادراک!
ابنِ آدم کے لئے مجرئہ نو کا ظہور!
لق و دق، حدِ نظر تک وہ تعب ناک سماں؛
دہشت انگیز و بلاخیز و عدیم المیعاد!
اِک طرف بارِ ادب استادہ ملائک کی صفوف؛
اِک طرف ذرّیتِ اِنس کے افرادِ جمیع ——
متحیّر، نگراں، خیرہ نگہ، سرگرداں! ——
کبھی تسعیرِ جہنّم کی صدا سینہ خراش،
کبھی اُمّیدفزا رائحۂ خلدِ بریں!
اور وہ وسط میں اجلاسِ جلالِ جبروت
جس کے آگے نہ کسی کا کوئی حامی نہ شفیع
معتبر جس کی عدالت میں رعایت نہ ستم
وزن بالقسط کے دستور پہ جس کی میزاں،

---

[1] مضجع ۔ بستر

جس کے انصاف کا آئیں قضیٰ اُدمُ تحق !
جس کا علم ازلی ستر و علن سب کو محیط
جس کی چشمِ صمدی میں یکساں[1] فقر و غنا !
ہاں وہ سوچے کہ پھر اُس طامۂ الکبریٰ میں
استغاثہ کریں خود سیدِ کونین اگر ،
(جن سے سررشتۂ الفت کا ہمیں دعویٰ ہے)
کہ الٰہی ! تری ذاتِ احدیت ہے گواہ ،
تیرے اِس فرضِ رسالت سے بہ تکمیل تمام
ہو گیا تھا میں سُبک دوش ، مگر میرے بعد
میری اِس قوم نے قرآن کو مہجور کیا !"
تو برأت کی سبیل اُس کے لئے کیا ہوگی ؟ (دستاٹا)

(باہر دستک) کون ؟ آجاؤ۔ (ہرکارہ داخل ہو کر خانخاناں کو تعظیم بجا لاتا ہے)

خانخاناں ۔ کہو

ہرکارہ ۔ (مودبانہ) : خان کا اقبال بلند !
خبر آئی ہے کہ سلطانِ اقالیم پناہ
باقشون[2] و سپہ قاہرہ کل مغرب تک
مہم راجپوتانہ سے مُراجع ہو کر
باعثِ میمنتِ قصرِ امارت ہوں گے ۔ (خفیف وقفہ)

خانخاناں ۔ آہی پائی ۔
ہرکارہ ۔ کوئی حکم ؟

خانخاناں ۔ اجازت ہے نہیں ۔ (ہرکارہ سلام کر کے اُلٹے پاؤں جاتا ہے)
(کچھ تامّل کے بعد) ۔ آخر شِ آہی گیا وقتِ بجا آرئ فرض !
ابھی اِک عہدِ کئے دیر نہ گزری تھی کہ واں
ہو گیا مرحلۂ نقد بھی فوراً درپیش !

سیدی ۔ جادۂ حق پہ اگر سالکِ مخلص کا ضمیر
جذبۂ فرض کی تحریک سے ہو گرمِ عمل ،
لابُدی ہے کہ مراحل یہ بتدریج آئیں ——
ایک پہلو سے صعوبات و شدائد اِن کے
تیغِ اخلاق کے حق میں ہیں فسّاں کی مانند
دوسرے رُخ سے یہ فُرقان ہیں ، جس کی برداشت
نقصِ کردار و ارادہ سے نہیں ہو سکتی ۔
اس میں توفیقِ الٰہی سے تعاون کے بغیر
اِک قدم بھی کبھی فرزانہ نہیں اُٹھ سکتا ۔ (خفیف وقفہ)
آؤ ، دربار گہِ صاحبِ الطافِ عمیم
طلبِ حَول و اِعانت کریں با قلبِ صمیم ۔ (دعا کو ہاتھ اٹھاتا ہے ۔ اور خان خاناں بھی)
قاضی جلال بھی سخت تذبذب اور خوف کے عالم میں ایک لمحہ متامل رہ کر دونوں کی تقلید کرتا ہے)

پردہ ۵

خیال اپنا اپنا ——— صفحہ ۵۲ سے آگے

ایک جملہ ملاحظہ ہو :—

"اس آئینہ میں آپ اس مصرع کی ہلکی سی جھلک دیکھ سکتے ہیں جسے میں نے دیکھا اور میرے ان بہترین ایام کو پکڑ سکتے ہیں جو مصر میں گذر گئے" ہمارا خیال ہے کہ ترجمہ میں اگر ذرا آزادی سے کام لیا جاتا تو کتاب کی دلکشی اور افادیت میں مزید اضافہ ہو سکتا تھا ۔

(ع ۔ م)

---

[1] یکساں کو کسر ضرورتِ شعر کے وقت یہاں متحرک پڑھا جائے گا ۔ [2] قشون ، فوجی دستے ۔

خیال اپنا اپنا

گلگونہ

مجموعہ کلام ——— تسکین قریشی

ناشر ——— مکتبہ جامعہ دہلی

۱۷۳ صفحات، مجلد، قیمت دو روپے آٹھ آنے

تسکین صاحب کا ایک شعر ہے ؎

چار ہی تنکوں کا سہی آشیاں ✦ خوبیٔ تعمیر مگر دیکھئے

آپ چاہیں تو اسے گلگونہ کا ایک اجمالی تعارف بھی تصور کر سکتے ہیں۔

تسکین صاحب تازہ واردانِ بساطِ ادب میں سے نہیں ہیں۔ پھر بھی وہ ادبی دنیا میں کچھ ایسے زیادہ مشہور نہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ شعر کہتے ہیں اپنے لئے۔ یا اپنے مخصوص احباب کے لئے۔ یا پھر اس لئے کہ انجامِ زندگی سے آشنا ہونے کی وجہ سے وہ حسرتِ نام و نشاں سے بے نیاز ہیں۔ بہرکیف تنہا شہرت ہی کسی فنکار کی عظمت کا واحد معیار نہیں۔ اور گلگونہ اس کا ایک ٹھوس ثبوت ہے۔

تسکین صاحب کی شاعری شفق کی رنگینی اور صبح کی مادرائی لطافت کے دلکش امتزاج کی حامل نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں بیک وقت رعنائی بھی ہے اور پاکیزگی بھی۔ وہ انتہائے سرشاری میں بھی شعور کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور ان کا جنون نقطۂ عروج پر بھی احساس سے بیگانہ نہیں ہوتا۔ ان کا خیال ہے کہ "وہ شاعری درحقیقت شاعری ہی نہیں جس سے زندگی ادب آموز عشق نہ ہو سکے"۔ گلگونہ کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے اس نظریہ کی بڑے خلوص کے ساتھ پیروی کی ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی اور عشق کے آداب کا ایک حسین، اعلیٰ اور حیات افروز تصور ملتا ہے۔ بہتر تو احساسات اور ناپختہ کار عشق کے مظہر جذبات سے ان کا کلام پاک ہے۔ وہ "ہوس کی تشنہ کامی" اور "محبت" کے نازک فرق سے ناآشنا نہیں۔ محبت کی رفعت پاکیزگی۔ گہرائی اور ہمہ گیری کو انہوں نے بڑے دلکش اور پُروقار انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے فلسفۂ محبت کی ایک جھلک دیکھئے ؎

عشق سے پہلے نہ مجھے تھے خوشی ہوتی ہے کیا
کیوں چمکتے ہیں ستارے چاندنی ہوتی ہے کیا

زندگی اپنی حقیقت سے تھی اب تک محروم
تم ملے ہو تو یقین دل و جاں آیا ہے

کر اور بلند مقصدِ عشق ✦ اپنے لئے ان کی جستجو کیا
ہوس کی تشنہ کامی اور شے ہے ورنہ اے تسکین
محبت کو کبھی ہم نے تو لاحاصل نہیں دیکھا

یہ تو ایمان بھی ہے صرف حقیقت ہی نہیں
جا نہ ہو تجھ سے محبت وہ محبت ہی نہیں

خود عشق ہے ہزار مرادوں کی اِک مراد
✦ ہو تو پھر کسی کی تمنا نہ کیجئے

"دستورِ حسن و عشق" اور "آدابِ زندگی" کی نازک تشریحات کے ساتھ ساتھ گلگونہ میں "زمانہ کے بدلتے ہوئے رنگوں" کا پرتو بھی نظر آتا ہے لیکن غمِ جاناں ہو یا غمِ دوراں تغزل کی لطافت اور شیرینی ہر جگہ دامنِ دل کھینچتی نظر آتی ہے۔ اور پھر براہِ راست دل کو چھونے والا ان کا مخصوص انداز بیان! "جو رنگِ تغزل میں خونِ دل کے شامل ہونے کی غمازی کرتا ہے۔ ایک مختصر انتخاب کلام پیش کیا جاتا ہے ؎

جب پڑی عشق میں کوئی افتاد ✦ روح نے دل کو دی مبارک باد
تھا وہ اِک شغلِ ابتدائے عشق ✦ اب کہاں ہم کو فرصتِ فریاد

اہلِ محفل اور جنونِ لذتِ کام و دہن
کس نے کیے رسم و راہِ میکشی ہوتی ہے کیا

ختم ہوئے نیرنگِ ناز و شوق ہے اب فسانہ ساز
میری نظر نظرِ سوال، ان کی ادا ادا جواب

مجھے عزیز ہیں خاکِ دل مگر ہے کیا
تمہیں نے آگ لگائی نہیں بجھا نہ سکے

مزاجِ دوست کرم آشنا نہیں نہ سہی
خود اپنے ذوقِ وفا پر ہے اعتبار مجھے

بدل کر بھی بدلا نہ رنگِ زمانہ ؎ بہار آتے ہی لٹ گیا آشیانہ

سرمایۂ حیاتِ وفا ہے بس ایک دن
تیرے لئے جو سب سے بچاتا رہا ہوں میں

دل بھی حجابِ دید نظر بھی حجابِ دید
یہ اور بات ہے کہ نظر آ گئے ہو تم

کچھ ایسی حالتِ بیم و رجا معلوم ہوتی ہے
محبت اب محبت کی سزا معلوم ہوتی ہے

نگاہیں ان کے دامن تک گئیں اور پھر پلٹ آئیں
محبت کی یہ پہلی التجا معلوم ہوتی ہے

یہ احساسِ وفا ظالم آشنا ہو نے نہیں دیتا
ہمیں ہر بات میں اپنی خطا معلوم ہوتی ہے

ہر تازہ غم نے روح کو بیدار کر دیا
رہ رہ کے میری آنکھ سے پردے اٹھا کئے

طرح طرح سے بھلایا مگر یہ حال ہوا
کہ ہر خیال سے پیدا ترا خیال ہوا

بقول حضرتِ تسکین ؎

رندِ عشق میں کوئی کتنا ہی سنبھلے
مگر کچھ نہ کچھ لغزشیں ہیں ضروری

"لغزش ہائے مستانہ" کی چند مثالیں دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی ؎

اب اہلِ چمن مجھ کو رو تے ہیں تسکیں
جدائی نے ہم محبت بڑھا دی

"بڑھا دی" کے ساتھ رسم کا لفظ قطعی غیر متعلق سا محسوس ہوتا ہے۔

یہ کون منزل دار فتگیٔ شوق آ گئی
یقیں ہے دل پہ دل آنکھوں پہ اعتبار مجھے

محبت جب سکونِ زندگی برباد کرتی ہے
تو لب خاموش رہتے ہیں نظر فریاد کرتی ہے

پہلے شعر میں منزل سے پہلے ہی" کی کمی محسوس ہوتی ہے اور دوسرے شعر میں "تو" زائد ہے ؎

کہاں تک حسن بھی آخر کرے برباد یاں دل کی
محبت روز اک دنیا نئی آباد کرتی ہے

شعر اپنے مفہوم کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ لیکن پہلے مصرعہ میں "برباد یاں" کرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

ہزار بزم سے بڑھکر ہے اس کی تنہائی
کہ جس کے دیدۂ و دل میں سما رہے ہو تم

وہی عظمتِ زندگی سے ہیں واقف
کہ طوفاں سے گذرا ہے جن کا سفینہ

دونوں شعروں میں "کہ" فاضل ہے۔

دنیائے آرزو میں ہیں دل سے دل کو راہیں
ہم جن کو چاہتے ہیں وہ کیوں ہمیں نہ چاہیں

محاورہ میں دل سے دل کو "راہ" آتا ہے۔

سکونِ دل کی خاطر آہ کی تھی یہ نہ سمجھے تھے
کہ یہ تو اور بھی دل کا سکوں برباد کرتی ہے

شعر خوب ہے لیکن اسے پڑھکر بیساختہ غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

گلگونہ صوری محاسن سے بھی جاذبِ نظر حد تک آراستہ ہے کتابت میں جدید رموم اوقاف کا بھی سلیقہ کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے جس سے اشعار کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مقدمہ ایک چھوڑ تین شامل ہیں ایک حضرت جگر مرادآبادی کا ایک مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر کا اور ایک پروفیسر آل احمد سرور کا مگر تینوں میں سے ایک بھی کتاب کے شایانِ شان نہیں۔ (ع۔م)

شرق اوسط میں کیا دیکھا؟

از سید ابوالحسن علی ندوی۔ ترجمہ مشیر الحق بجری آبادی۔ مکتبہ تعمیر اسلام لکھنؤ۔ ضخامت ۹۴ صفحات۔ مجلد قیمت عہ

مولانا ابوالحسن علی ندوی علمی دنیا کی ممتاز شخصیتوں میں سے ہیں۔ "شرق اوسط میں کیا دیکھا؟" آپ کی ریڈیائی تقریروں اور دوسرے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں شرق اوسط کی ہلکی سی جھلک پیش کرنے کے علاوہ ان ممالک کی مختلف علمی ادبی ثقافتی تحریکوں۔ ممتاز اداروں۔ اور شخصیتوں کا دلنشین انداز میں تعارف کرایا گیا ہے۔ عام اردو داں طبقہ ان ممالک کے حالات سے تقریباً بیگانہ ہے اس لئے یہ تعارف گو اجمالی اور سرسری ہی سہی بہرحال ایک افادی حیثیت رکھتا ہے۔

ترجمہ عموماً شگفتہ ہے۔ لیکن تقریباً لفظی اور عربیت کی جھلک لئے ہوئے۔ (ملاحظہ فرمایئے ص۵۰)

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

صفائی نوبہار

خون کی خرابی پھوڑے پھنسی۔ خارش اور داد وغیرہ کی بہترین دوا ہے۔ بچوں کی مشہور اور ہر دلعزیز دوا چھوٹے بچوں کی صحت اور قوت کا محافظ صفائی اندرونی طور پر استعمال کیجئے اور مرہم صفا بیرونی استعمال کیلئے ہے مرہم صفا معدہ کی تمام خرابیوں کیلئے۔ ایک آزمودہ اور اطمینان بخش دوا ہے۔

صفائی ۴ آونس کی شیشی ایک روپیہ۔ مرہم صفائی شیشی ۶ر ۳ آونس کی شیشی صرف ایک ڈیڑھ پیسہ

نوٹ:۔ آرڈر کے ساتھ پیشگی رقم آنی چاہئے۔ ہر قصبہ و شہر میں دواخانہ کی کل آمدنی غریب مریضوں اور طلباء پر صرف کی جاتی ہے

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

چندا بجنسیوں کے پتے:۔ کانپور چمن گنج۔ بنارس وال منڈی۔ بھوپال جمعراتی بازار۔ فیروز آباد فردوسی اسٹور۔ غازی پور ٹاؤن ہال۔ شاہ گنج مجمع الادویہ دواخانہ۔ جون پور مدرسہ قرآنیہ جامع مسجد۔ مئو اعظم گڈھ احسان بلڈنگ۔ بہرائچ چوک جمال پرساد بستی گاندھی نگر۔ شاہجہانپور محمد علی مارکیٹ۔ بکسر صدیقی دواخانہ علی گڑھ بھیالہ

آنکھوں کی روشنی

ایکسٹاڈ آئن چشمہ کرسٹل

موتیا بند (نزول الماء) پھولا۔ جالا۔ ناسور۔ رتوندہ۔ پربال۔ آشوب چشم۔ چیچک کی پھولی۔ نظر کی کمزوری۔ اور چشمہ لگانے کے پرانے عادی لوگوں کیلئے

اکسیر چشم قطعی بے ضرر اور مفید ترین لاجواب تحفہ ہے۔ آنکھوں کے آپریشن کے امیدوار۔ آپریشن کے ناکام اور لاعلاج مریض چشمہ لگانیوالوں کے چشمے اتروا دینے والے کیمیاوی حل کامل۔

اکسیر چشم کے استعمال سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کر کے قدرت کاملہ کے کرشمے ملاحظہ فرمائیں۔ پوری معلومات کے لئے کتاب آنکھوں کی روشنی مفت طلب فرمائیں۔

قیمت فی شیشی خورد	4/8/-	قیمت فی شیشی کلاں	9/-
قیمت فی شیشی قسم اعلیٰ اوسط	11/8/-	قیمت اکسٹرا قسم اعلیٰ کلاں	35/-

ملنے کا پتہ

عزیزی دواخانہ رجسٹرڈ۔ پرنسیس بلڈنگ جے جے ہسپتال، بمبئی نمبر ۳

دنیائے اسلام کا سب سے بڑا ادارہ

تاج کمپنی آف انڈیا لمیٹیڈ دہلی

فوٹو بلاک آفسٹ کے حسین طریقوں سے قرآن مجید مترجم معربی حاشیہ احادیث نبوی درس نظامی اور ہر قسم کی اسلامی کتابیں چھاپ ہی ہے دین کی اشاعت بڑے پیمانے پر کرنے کیلئے اس کمپنی کو گورنمنٹ سے

پانچ لاکھ روپے کے منظور شدہ سرمایہ سے

لمیٹیڈ کرالیا گیا ہے، ایک حصہ کی قیمت بیس ۲۰ روپے ہے۔ جو صاحب جتنے حصے چاہیں خرید سکتے ہیں اس وقت تک کافی حصے فروخت ہو چکے ہیں۔ آج مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ دین کی اشاعت کا بہترین طریقہ سے پیش کرنا ہے۔ تاج کمپنی آف انڈیا لمیٹیڈ کے پروگرام میں ہاتھ بٹائیے، اشاعت اسلام میں حصہ لیجئے اس کے علاوہ تجارتی اعتبار سے بھی کافی فائدہ ہوگا

مکمل لٹریچر مفت طلب فرمائیے

کمیشن پر حصے فروخت کرنے کے لئے ایجنٹوں کی ضرورت ہے

محمد عبدالحق فاروقی منیجنگ ڈائرکٹر

تاج کمپنی آف انڈیا لمیٹیڈ جامع مسجد دہلی

موجِ نیل

مصر کے شہرۂ آفاق ادیب، سید مصطفےٰ لطفی منفلوطی دورِ حاضر کے مصری ادباء کے سرتاج تسلیم کئے جاتے ہیں۔ آپ مشرقی رجحانات کے حامل و داعی ہیں مغرب کی تہذیب کے ہاتھوں مشرق کے اخلاق و تمدن کو لٹتے دیکھکر آپ بیحد متاثر ہوئے ہیں۔ اور آپ نے ان تاثرات کو العبرات والنظرات میں افسانوں اور افسانوی مضامین کی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ افسانے اور افسانوی مضامین اس قدر پُراثر اور دردانگیز ہیں کہ پڑھنے والے کو آنسو ضبط کرنے دشوار ہو جاتے ہیں۔ اور اس قدر دلچسپ کہ راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔

موجِ نیل اس سحر آفریں ادب کا اعجاز نما ترجمہ ہے جو قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کی مترجمانہ صلاحیتوں کا بہترین نمونہ ہے۔ ترجمہ کے متعلق ملک کے مشہور ادباء کی رائے ہے کہ ان میں مصری لطافت اور روح بدستور باقی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا خود منفلوطی نے ہی اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ ——— مجلد قیمت ڈھائی روپے

ملنے کا پتا } **مکتبۂ معیار۔ خندق اسٹریٹ میرٹھ**

بیانُ اللسان

مکمل عربی اردو ڈکشنری

تیس ہزار قدیم و جدید عربی لغات کا جامع و مستند ذخیرہ

تالیف مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی ناظم دارہ علمیہ (سابق رفیق ندوۃ المصنفین)

یہ لغت اہل علم اور ارباب ذوق کے حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اسکی بینظیر خصوصیات نے مقبول خاص و عام کر دیا ہے علماء و طلباء اور عام شائقین سب ہی اسکی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

- تقریباً تیس ہزار قدیم و جدید عربی لغات و محاورات کا جامع ذخیرہ۔
- قرآن کریم کے تمام لغات و اصطلاحات کا مجموعہ۔
- مصر و شام وغیرہ میں مستعمل جدید الفاظ کی تشریح۔ • مادّہ سے قطع نظر ہر لفظ کی اپنی اصل صورت میں انگریزی ڈکشنریوں کے طرز پر ترتیب۔
- ہر لغت سے متعلق تمام ضروری امور کی توضیح۔
- بنظر اختصار اشارات و رموز کا استعمال۔ • زبان سادہ و شگفتہ
- مشاہیر ہند و پاکستان نے اسکے محاسن کا پُرزور الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ کتاب کی عمدگی کی اس سے بڑھکر کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ دو ایڈیشن دو سال میں ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ طبع سوم۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ کاغذ سفید چکنا۔ ہر ورق رنگین۔ صفحات نو سو۔ قیمت غیر مجلد آٹھ روپے مجلد چہرمی اعلیٰ دس روپے (محصول ڈاک ۱۴ علاوہ)

ملنے کا پتہ } **مکتبۂ معیار خندق اسٹریٹ میرٹھ**

معیاری اور بے میل اسلام کا پیغامبر

ماہنامہ

تجلی

دیوبند

جو چار سال سے پابندیِ وقت کے ساتھ دین کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ مذہبی رسائل میں اسے آپ اپنی قسم کا واحد رسالہ پائیں گے۔ ٹھوس ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور کشش انگیز۔ صحیح ترعقائد پر مشتمل ——— سالانہ قیمت پانچ روپے ——— فی پرچہ ساڑھے آنے۔

اگر آپ دینی ذوق رکھتے ہوں تو سات آنے کے ٹکٹ بھیجکر نمونہ طلب فرمائیں ٹکٹ نہ بھیج سکیں تو صفحت ہی طلب فرمائیں۔ قیمت یا بلا قیمت منگانا آپ کے دینی احساس اور خودداری پر منحصر ہے۔ ہم بہرحال نمونہ بھیجیں گے۔

مکمل پتہ:۔ دفتر ماہنامہ "تجلی" دیوبند۔ ضلع سہارنپور۔ (یوپی)

معیار میں پیش کئے ہوئے دو سال کے افسانوں کا بہترین انتخاب

اُبھرتی کرنیں

مرتبہ نجم الاسلام — قیمت دو روپے آٹھ آنے

نئے تعمیری رجحانات کا افسانوی ادب میں گراں قدر اضافہ۔ اس کے مطالعہ کے بغیر آپ کا ادبی ذوق موجودہ دور کے ایک نئے بڑھتے ہوئے افسانوی رجحان سے بیگانہ رہے گا۔ "ابھرتی کرنیں" محمود فاروقی - اسعد گیلانی - پروفیسر عاصی ضیائی - ابن فرید - منظر حسین - اقبال نسیم عثمانی - احمد حسین انصاری وغیرہ کی بہترین نگارشات لئے ہوئے ہے۔ اور مرتب کے قلم سے ایک تعارف بھی شامل ہے۔ جس میں تعمیری ادب، تعمیری ادب کی تحریک اور نئے تعمیر پسند افسانوی رجحانات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مکتبۂ معیار میرٹھ کو فوری طور پر آرڈر بھیجکر طلب فرمائیں

ناشر :- مکتبۂ معیار میرٹھ

(محمد احمد ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے کمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "معیار" خندق اسٹریٹ شہر میرٹھ سے شائع کیا)

صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

جلد ۳، شمارہ ۷، اگست ۱۹۵۳ء

معیار

ترتیب دینے والے

اصغر علی عابدی

نجم الاسلام

ہیڈ آفس:- خندق اسٹریٹ میرٹھ شہر

سب آفس:- محلہ کشن گنج دہلی ۶

تعاون

سالانہ چھ روپے

پانچ روپے

تین روپے

(مضامین۔ خط و کتابت۔ ترسیل زر۔ تبادلۂ جرائد کے لئے ہیڈ آفس)

ترسیل زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب۔ فیملی لائن۔ جیکب آباد

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

ترتیب

نقش اوّل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نجم الاسلام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳

نظمیں

تاج پوشی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ افتخار اعظمی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷
عورت اور اسلام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ابو المجاہد زاہد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸
روشنی کی طرف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ انور صدیقی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۱
انتباہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سہیل احمد زیدی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۳

مضامین

برخود غلط معالج ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۴
نئے ادبی رجحانات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فضل الرحمٰن رحمانی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۷
نوح اور نوح اسکول ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ محمد عثمان رمز ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵
زبان کی زبان ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ متین طارق ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۸
ہمارا تنقیدی نقطۂ نظر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایم احمد مظاہری ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۱

غزلیں

غزل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حفیظ میرٹھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۳
" ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نازش پرتاب گڈھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۴
" ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ محسن رضا جونپوری ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۵
" ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جوہر بجنوری ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۶
" ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ راز الہ آبادی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۶
" ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ صوفی چنا وری ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۷
" ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عنوان چشتی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۷

افسانے اور خاکے

سڑک کی سازش ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ابن احمد گورکھپوری ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۸
چکرا کے رہ گیا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ منظر حسین ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۲
چاٹ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ چیخوف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵
نگار خانۂ انبار میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مترجمہ ابرار احمد اعظمی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۹

نقشِ اوّل

فکر، فن اور تنقید کی وہ بحث دوبارہ چھیڑنے کے لائق ہے جو مارچ ۵۳ء کے نقش میں شروع کی گئی تھی لیکن بحث کے تمام گوشوں کو سمیٹ لینا نہ تو اُس وقت ممکن تھا نہ اب۔ اِس وقت ہمیں مجمل طور سے انتقاد اور نقّاد کے ضمن میں کچھ عرض کرنا ہے۔

ادبی نظریات کی وضاحت کے سلسلے میں معیار تنقید اور نظریۂ تنقید کی تعیین و تشریح بنیادی طور سے اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے بغیر ادبی مسائل سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا ناممکن ہے۔ تنقیدی شعور کے بغیر ادبی مسائل کا حل ایسا ہی غلط ہے جیسے کسی راستے سے ناواقفیت اور نشیب و فراز سے بے خبر اجنبی کا اندھا دھند اس طرف کو چل پڑنا جدھر اس کا منہ اُٹھ گیا ہو۔ معیارِ نقد کی تعیین اور نظریۂ انتقاد کی تشریح سے پہلے آیئے یہ دیکھیں کہ خود تنقید کیا ہے؟ معیارِ نقد اور نظریۂ تنقید پر کچھ کہنے سے پہلے خود نفسِ تنقید کو معرضِ بحث میں لانے کا رواج اب عام ہے۔ بعض لوگ تو اس وقت تک دوسری باتوں کو کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے جب تک وہ کہنے والے کی زبان سے نفسِ تنقید کے بارے میں کچھ سُن نہ لیں۔ یہ بات غلط سے پاک نہیں مگر اس کے باوجود اپنے اندر جو افادیت رکھتی ہے، اس سے انکار بھی ممکن نہیں۔ ہر چند اس رجحان میں جو تیزی و تندی ہے اس کی زد میں کئی ایسے نقاد بھی آجاتے ہیں جن کو نہ ٹالا جا سکتا تھا اور جو تنقید پر کچھ نہ کہنے کے باوجود تنقیدی شعور سے قطعاً بیگانہ بھی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ بہت سے ایسے پُرخلوص نقادوں کا پردہ بھی یہیں فاش ہوتا ہے۔ جو کسی اصول کے پیرو نہیں اور جنہیں کوئی تنقیدی اصول مان کر دو قدم چلنے کا یارا بھی نہیں ایسے لوگوں میں نہ اعلیٰ درجہ کا تنقیدی شعور ہوتا ہے نہ خلوص کاری جو نقاد کے بنیادی اوصاف میں سے ہے۔

اُردو میں کئی ایسے نقاد شہرت پا گئے ہیں جو طبّاع اور ذہین تو ضرور ہیں اور کافی لبسیار نویس بھی لیکن ایک بااصول نقاد کی جو روش ہونی چاہئے اس کی ہوا بھی انہیں نہیں لگی ہے ان میں نہ اعلیٰ درجہ کا تنقیدی شعور ہے نہ خلوص کاری۔ وہ بے اصولی ہی کو اپنے حق میں اصول سمجھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں توازن نہیں۔ وہ نہ کوئی معیار رکھتے ہیں۔ جس پر کسی چیز کو پرکھیں نہ ان کا کوئی نظریہ ہے جس سے ان کی ذہنی صحت کا اندازہ کیا جا سکے۔ یہ لوگ تنقید کے اصلی مفہوم کو سمجھنے میں یا تو ناکام ہیں یا اس سے بیگانہ ہیں۔

جیسا کہ شروع ہی میں کہا جا چکا ہے اصول و معیار کی تعیین دراصل بعد کی بات ہے جس کے لئے ہمیں یہ جان لینا ہوگا کہ تنقید کسے کہتے ہیں؟ تنقید کی ایک عام تعریف تو یہی ہے کہ "یہ نظریات اور علوم و فنون کے باب میں قوتِ فیصلہ کے صحیح استعمال کا نام ہے"[1] مگر یہ تعریف اس وقت تک ادھوری رہے گی جب تک کہ صحیح استعمال کی وضاحت نہ ہو جائے۔ سوال یہ ہے کہ قوتِ فیصلہ کا صحیح استعمال کیا ہے؟ ہمیں سے اختلافات کے دروازے کھل جاتے ہیں مثلاً بعض لوگ قوتِ فیصلہ کے استعمال کو خود رائی اور نکتہ چینی کا نام سمجھ کر تنقید ہی کے مخالف ہو جاتے ہیں یہ لوگ صرف محاسن گنوائے جانے کے حق میں ہیں۔ نقص ان کی نظر میں ذوقی چیز ہے جس پر کسی کو قطعیت کے ساتھ فیصلہ دینے کا حق نہیں۔

چنانچہ پوپ کا ایک ایسا جملہ بہت مشہور ہے جس میں وہ نقادوں کی برائی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے "جو لوگ بالطبع بذلہ سنج ہوتے ہیں وہ اپنی خوش طبعی کے سبب پہلے شاعر بن جاتے ہیں پھر نقاد اور آخر میں نرے احمق ثابت ہوتے ہیں"۔ انتقاد کی یہ تحقیر پوپ کی رومانیت اور تنقیدی اصلاحات اور ان کے مقتضیات کے باہم تصادم کا ردِ عمل ہے۔ ڈنڈر ایلی نے بھی اسی طرح کا ایک جملہ کہا ہے کہ "نقاد وہ لوگ ہوتے ہیں جو ادب و آرٹ میں ناکام رہتے ہیں"۔ ڈیگر تنقید کو کٹ کھنی مچھلیوں کے ہیجڑے

---

[1] ۔ فنِ تنقید، پروفیسر نعیم الرحمٰن

کتر کر کھا جانے کے فعل سے تشبیہ دیتا ہے۔ فلابیر اسے ادب کے جسم پر کوڑھ سے تعبیر کرتا ہے۔ چیخوف نے بھی کہا ہے کہ نقاد وہ مکھی ہے جو گھوڑے کو ہل چلانے سے روکتی ہے۔"

عموماً ایسے سب لوگ تنقید کی اصلاحی حیثیت کے مخالف ہیں اور تعریفِ محض کو توقیرِ فیصلہ کا صحیح استعمال سمجھتے ہیں لیکن ان کی بات ہر جگہ نہیں چل سکتی۔

ہو سکتا ہے کہ کچھ نقاد واقعی کٹ کھنی مچھلی کی طرح ہوں اور ان کی تنقیدیں تخریبی ہوں اور ان سے ادب کی تعمیر میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو جیسا کہ چیخوف نے کہا لیکن سب ایسے نہیں ہیں۔ جو لوگ تعریفِ محض کو توقیرِ فیصلہ کا صحیح استعمال سمجھتے ہیں وہ تقریباً سب ہی بے مقصدیت، حد سے بڑھی ہوئی رومانیت، اجتماعیت کش، انفرادیت یا ایسی ہی چند درچند لغزشوں کا شکار ہیں۔ اس لئے ان سے نقد و انتقاد کی اصلاحی حیثیت کے بارے میں طنزیہ کلمات سن کر تعجب نہیں کرنا چاہئے۔ یہ لوگ تنقید کے بنیادی تقاضوں سے گریز کرتے ہیں۔

ہاں کچھ ایسے نقاد بھی ضرور ہیں جو اصلاح کو نشتر زنی اور نکتہ چینی قرار دیتے ہیں۔ دراصل ایسے ہی نقاد اوپر کے طنزیہ جملوں کا نشانہ بننے کے مستحق ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ محاسن سے تو سب ہی محظوظ ہوتے ہیں اور داد دیتے ہیں مگر نقائص کو ڈھونڈ نکالنا اور ان پر نشتر زنی کرنا نقاد ہی کا کام ہوتا ہے تو پھر نقاد کیوں نہ نقائص کو دور کرنے کی فکر میں ہمہ تن لگ جائے۔ یہ خیال دل کے بہلانے کو اچھا ہے لیکن اس میں جو خامیاں ہیں ان کے اثرات میں رنگ تخریب اتنا نمایاں ہے کہ ہر صاحبِ ذہن اس کو ناپسند کرے گا۔ اس طرح کی تنقید تنقیص کی تعریف میں آتی ہے۔

جو لوگ مغرب سے اندھا دھند متاثر ہیں ان کا نظریۂ تنقید مشرقی آدابِ تنقید سے پوری طرح انصاف نہیں کر پاتا۔ اس لئے ان کے یہاں عملی تنقید جھنجھلاہٹ کا ایک عمل بن جاتی ہے جس میں کمتری کا احساس کام کرتا ہوا پایا جاتا ہے کیونکہ اردو کا قدیم سرمایہ اور جدید سرمایہ کا بڑا حصہ مشرقی رنگ ہی میں رنگا ہوا ہے۔ یہاں ہمیں نظریۂ تنقید سے بحث نہیں اس لئے ہم قدیم و جدید کے مسئلے میں فی الحال نہیں الجھنا چاہتے۔ لیکن اتنا جاننا ضروری ہوگا کہ مشرق اور مغرب میں اگرچہ تنقید بحیثیت فن کا نقطۂ آغاز یونانی لٹریچر کے اثرات ہی کو قرار دیا جاتا ہے پھر بھی آگے چل کر تنقید کے مفہومات میں بنیادی طور سے اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ ارسطو کی شعریات کے بعد عربی و فارسی تنقید انتقادِ فن ہو کر رہ گئی جبکہ مغربی تنقید قضیہ نظریات کی جانچ پرکھ اور ادب کے بنیادی مقتضیات کی وضاحت کے فریضہ سے بھی عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی اس طرح تنقید دو دائروں میں بٹ گئی۔ ایک فنی تنقید اور دوسرے نظریاتی تنقید اور ان میں سے بھی ہر ایک کے دو پہلو عام ہیں یعنی نظری اور عملی۔ نظری تنقید نظریات اور فنی اصولوں کے نکھار، سنوار اور ان کی تعیین کا نام ہے جبکہ عملی تنقید نظریاتِ تنقید کا ایک عمل ہے ان کے استعمال کی ایک صورت ہے جس کے ذریعہ کسی تخلیق کی معنوی صوری افادیت اور اس کے حسن کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اور پھر فن کار کی کامیابی و ناکامی کا فیصلہ دیا جاتا ہے۔ تنقید کے یہ دو پہلو یعنی نظری اور عملی بڑی حد تک جدا جدا ہیں۔ اردو میں کم ایسے نظریاتی نقاد ہیں جن کی عملی تنقیدیں نظری طور سے بھی بلند پایہ ہوں یعنی نقاد، ادب اور مقصدِ ادب کے بارے میں اور مختلف ادبی نظریوں کے سلسلے میں بھی اتنی ذہنی صحت اور صفائی لکھتا ہو کہ عملی تنقید کی افادیت کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مشہور نقادوں نے وجدان کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ اور وجدان کی حدوں میں اصول و نظریات کا بنایا ممکن نہیں۔ کم سے کم اس وقت تک تو بلاشبہ ممکن نہیں جب تک عقل اور وجدان دونوں خیرِ مطلق اور حسنِ مطلق سے اس طرح وابستہ اور ہم آہنگ نہ ہو جائیں کہ زندگی کے اعلیٰ اخلاقی تصور سے کبھی ان میں تصادم نہ ہونے پائے۔ یہاں خیرِ مطلق اور حسنِ مطلق سے ہماری مراد نیکی اور حسن کا وہ افلاطونی تصور نہیں جو "مکالمات افلاطون" کے ایک مکالمہ ( ) میں ملتا ہے اور جس میں سقراط کی زبانی اس کی ترجمانی کرتے ہوئے افلاطون اپنے ان خیالات کو بھی پیش کرتا ہے کہ عشق کی دو قسمیں ہیں ایک ادنیٰ یعنی خواہش نفسانی اور دوسری اعلیٰ یعنی حسنِ مطلق کی محبت، اور یہ کہ سچا فن کار حسنِ حیا و حسنِ کائنات میں حسنِ مطلق کی جھلک پاتا ہے۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور اس کے دل میں سچائی اور نیکی کی تخلیق کی کوشش کرتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ روحانی ترقی کے مدارج طے کر کے حسنِ مطلق اور خیرِ مطلق کی محبت تک پہونچ جاتا ہے۔

یہ افلاطونی تصور آگے بڑھ کر مجاز و حقیقت کے اسی چکر میں پھنسا دیتا ہے جس میں متصوفانہ شاعری پھنسی ہوئی ہے۔ اس تصور کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ خیرِ مطلق اور حسنِ مطلق کی محبت آخر میں اپنے ہی وجدان کی محبت ہو کر رہ جاتی ہے اور خالق کائنات کا وہ تصور ذہنوں سے اوجھل ہو جاتا ہے جس کے لحاظ سے محبت نام ہے۔ سپردگی و اطاعت اور فرض کی تکمیل کا اور اس رہنمائی کو پوری طرح قبول کرنے کا جو اس کی طرف سے ملتی ہے۔

ایسے بھی نقاد مل سکتے ہیں جو نظری حد تک تو اچھے نقاد ثابت ہوں مگر عملی تنقید کے میدان میں اچھے نہ ہوں۔ اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں ——— اگر عملی تنقید فنی کاس سے تعلق رکھتی ہو تب بھی اور نظریاتی ہو تب بھی۔ ایک تو یہ کہ نقاد کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا معیار، فن یا نظریہ و فن کے باہمی تعلق سے ناواقفیت یا

بے اعتنائی کے سبب ناقص ہو ——— اور دوسرے یہ کہ نقاد، ناواقفیت یا بے اعتنائی نہیں بلکہ ہٹ دھرمی کے ساتھ حقائق کو استعمال کرنے کی خاطر انہیں توڑ مروڑ کے پیش کرنے کا عادی ہو۔ دونوں حالتوں میں تنقید کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً دوسری صورت میں چونکہ خلوص کی بھی کمی نظر آتی ہے اس لئے ایسے نقادوں سے کبھی سلامت طبع کے ثبوت کی امید رکھنی فضول ہے۔ ناواقفیت اور بے اعتنائی سے بھی عملی تنقید کی افادیت کو کم نقصان نہیں پہونچتا مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی درست نہ ہوگا کہ نقاد کے لئے ایک عمدہ فن کار ہونا بھی ضروری ہے۔ یا مثلاً شعر کے انتقاد سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نقاد کا شاعر ہونا ضروری ہے۔ شاعر ہونا ضروری نہیں البتہ شعر فہمی ضروری ہے۔ ادب فہمی لازم ہے۔ اور اس کے لئے ضروری نہیں کہ نقاد فن کار بھی ہو۔ غیر فن کار بھی فن کا اچھا مذاق رکھ سکتا ہے۔ کیا اپنے نقاد بالکل ہی ناپید ہیں جو خود شعر نہ کہتے ہوں مگر شعر کا اچھا مذاق رکھتے ہوں؟ یقیناً اپنے نقاد ہیں۔

اب ہمیں کچھ نظریاتی تنقید کے بارے میں عرض کرنا ہے۔ ظاہر ہے اس کا حق وہی ادا کر سکتے ہیں جو اصول و نظریہ کے اچھے نقاد ہوں اور ساتھ ہی ساتھ نظریہ اور فن کے باہمی تعلق سے پوری طرح آشنا ہوں۔ فکر و فن کے اس تعلق پر فٹنس اوّل مارچ ۱۹۵۳ء میں تھوڑی بہت جو روشنی ڈالی گئی تھی اس کے ذہن میں تازہ ہو جانے کے بعد غالباً یہ تسلیم کر لینے میں کوئی امر مانع نہ ہوگا کہ نظریاتی تنقید ہی دراصل سب سے اہم ہے۔ کیونکہ وہ تنقید جو فنی محاسن سے بحث کرتی ہے اور نظریہ و فکر کے باب میں خاموشی اختیار کرتی ہے اس کی بہ نسبت نقاد کو نظریاتی تنقید میں زیادہ غور و فکر سے کام لینا ہوتا ہے اور نہ صرف فکر کی تشریح و تنقید اس کا کام ہوتا ہے بلکہ کسی نہ کسی حد تک اسے اُن اثرات کی تلاش و تحقیق میں بھی کاوش کرنی پڑتی ہے جو فکر فن پر ڈالتا ہے۔ غالباً یہ بات یہاں بہت زیادہ تفصیل نہیں چاہتی کہ ہیئت بہت کچھ فکر سے متاثر ہوتی ہے اور اپنے اندر کسی فکر کے مخصوص مزاج کے موافق تبدیلی کر لیتی ہے۔ یہ تبدیلی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ فکر و فن آپس میں گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

قدیم مشرقی ادب میں فنی تنقید پر بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اتنی زیادہ کہ اس کے سامنے نظریاتی تنقید کا حصہ معدوم ہو چھپ کر رہ گیا۔ یہ ایک طرح کی لغزش تھی۔ اب ان کے برخلاف ایک اور لغزش عام ہے اور وہ ہے فن کی جانچ پرکھ سے قطعاً بے اعتنائی جو نتیجہ ہے نظریاتی تنقید کے غیر صالح اور تخریبی استعمال کا اور اس میں غیر مخلصانہ غلو کا۔ یہ بات ہم اوپر تشریح کے ساتھ کہہ چکے ہیں۔ دورِ جدید کے نقادوں کا ایک گروہ ہر چیز کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے اور اس کوشش میں اس کے سامنے حق ناحق، صحیح غلط، اچھے بُرے کی کوئی تمیز نہیں۔ جزو کو کل اور کل کو جزو اہم کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم ثابت کرنے کی یہ کوششیں کیا اس بات پر دلالت نہیں کرتیں کہ ان نقادوں میں خلوص مفقود ہے۔ ان کا ہر واقعہ کی ایسی مادّی و اقتصادی توجیہ کرنا جو ان کے لئے مفید ہو۔ وہ اصل انصاف کا خون کرنا ہے۔ نقادوں کا یہ گروہ صرف اسی بات کو معقول قرار دیتا ہے اور اس سے مطمئن ہوتا ہے جو اس کے خلط مبحث سے کسی نہ کسی طرح میل کھاتی ہو۔

تنقید کا مفہوم ایسے نقادوں کے ذہن میں کیا ہے؟ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ اس طرح کی ذہنیت قوت فیصلہ کے صحیح استعمال کو بالکل ناممکن بنا دیتی ہے۔ اصلی تنقید نہیں ایک جبری عمل ہے جس میں زندگی کے تمام واقعات غلط تعبیرات کی چکّی کے نیچے آکر پس جاتے ہیں اور پھر ہرگز اس قابل نہیں رہتے کہ ان سے نکالے ہوئے نتائج ادب یا ادیب کی صحیح رہنمائی کر سکیں۔

سوال یہ ہے کہ تنقید کے مفہوم کی تعیین میں یہ اختلافات پیدا ہونے کا سبب کیا ہے؟ کیا ان اختلافات کا سبب وہ اختلاف نہیں جو خود ادب کے مقصد کے بارے میں عام طور سے پایا جاتا ہے؟ اس لئے ضروری ہوا کہ معیارِ نقد کی تعیین سے پہلے ادب کے مقصد کا تعین کر لیا جائے۔

اس موقع پر خود بخود یہ سوال اٹھتا ہے کہ ادب کیا ہے؟ بلاشبہ نقدِ حیات و کائنات۔ تو پھر کیوں نہ ہم آپ سے پوچھیں کہ آپ کا نظریۂ حیات و کائنات کیا ہے اور کیوں نہ ہم آپ کو بتائیں کہ ہمارا نظریۂ حیات و کائنات کیا ہے؟

اصل میں انتقاد ایسا موضوع نہیں جس کا تعلق تھوڑی گفت اور تھوڑے وقت میں ادا ہو سکے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ آئندہ ہم اس موضوع پر معیار کا کوئی خاص نمبر پیش کر سکیں۔ اس پیش کش کے مواد کی جمع و ترتیب میں دو صورتیں ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ ایک تو یہ کہ انتقاد کے بیشتر اہم موضوعات پر شرح و بسط کے ساتھ لکھے ہوئے مقالے پیش کر دیئے جائیں جن میں تاریخ تنقید، معیارِ تنقید، تعینِ ادب اور اس کا مقصد اور اسی طرح کے موضوعات پر بھی کچھ مواد ہو اور تعمیری نقطۂ نظر سے ہو اور ساتھ ہی ساتھ عملی تنقید کی کچھ کامیاب مثالیں بھی پیش کی جائیں جن سے تعمیری ادب کے تخلیقی کارناموں پر روشنی بھی پڑ جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس تنقیدی کام کو سہولت اور تنوع کی غرض سے کچھ مخصوص کر لیا جائے۔ اس صورت میں ایسے مکاتیب مربوط انداز میں پیش کئے جا سکتے ہیں جو تعمیر پسند فن کاروں کے پاس میں تبادلۂ خیالات کے لئے ایک دوسرے کو لکھے ہیں یا دوسرے ادیبوں اور فن کاروں نے تعمیر پسند فن کاروں کو لکھے ہیں۔ یقین ہے کہ ان خطوط میں جا بجا ایسی مفید بحثیں اور ایسے تنقیدی اشارے مل جائیں گے جو ادبی مسائل پر مشتمل ہیں۔ اس طرح تعمیری ادب کی تحریک کے تقریباً تمام اہم گوشے سامنے آ جائیں گے اور عملی تنقید کی وہ کمی جو عرصہ سے محسوس کی جا رہی ہے کافی حد تک پوری ہو سکے گی۔ اس سلسلہ میں بعض احباب کو خطوط لکھے جا چکے ہیں اور بعض کو لکھے جا رہے ہیں اور بعض خصوصی احباب کسی رسمی سلسلہ جنبانی کے بغیر ہی تعاون کی توقع کر لی گئی ہے۔ امید ہے کہ تمام احباب مکاتیب کی فراہمی میں تعاون فرمائیں گے۔

مکاتیب نمبر کے علاوہ **تنقید نمبر** بھی چونکہ اپنی جگہ بہت اہم ہے اور خصوصاً ایسے لوگوں کیلئے تو **تنقید نمبر** ہی مفید ہے جو تعمیری ادب سے بہت کم واقف ہیں۔ اس لئے اس کی تیاری بھی کسی حد تک شروع کر دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں نمبر بیک وقت شائع کرنے کے لئے خوری طور سے اشاعت کے وقت کا تعین ہمارے لئے آسان نہیں۔ یہ اس وقت ہو سکے گا۔ جب ہم آپ کی توجہات اور آپ کے تعاون کو صحیح جائزہ لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ہم اپنے قلم کاروں سے اس سلسلے میں اُن کے خیال کی گذارش کرتے ہیں اور اُن کا بیش از بیش تعاون چاہتے ہیں۔

پچھلے دنوں معیار میں ایک تعارفی و تنقیدی مضمون نواب جھالنسوی کی غزل گوئی پر اجمالی نظر" شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک بات خلاف حقیقت آ گئی ہے جس کی عدم صحت کا حال ہمیں بعد کو معلوم ہوا۔ ہوا یہ کہ مقالہ نگار سے جناب ایاز جھالنسوی کے گذشتہ مجموعہ کے انتساب میں غلطی ہو گئی۔ چونکہ یہ ایک مقامی اور غیر ضروری بات تھی اس لئے ہمیں مقالہ نگار کے بیان پر اعتماد کرنا پڑا۔

ہمارا خیال تھا کہ تردیدی نوٹ سے اس سہو یا غلط بیانی کو تازہ نہ کیا جائے لیکن اس کی تردید میں ایک ایسا مناظرانہ مضمون ملا ہے کہ اسے دیکھ کر خود ہی تردید کے دو چار عمومی جملے لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مقالہ نگار اور تردید نگار دونوں ہی کا رویہ ہمارے لئے تکلیف دہ ہے۔

آخر میں ہم معیار کے اُن حساس قدر دانوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے ہر طرح معیار کو اپنانے میں فراخ حوصلگی کا ثبوت دیا ہے خصوصاً مقامی احباب کا رویہ تو اس سلسلے میں تعمیری اور صحت مند پاکیزہ لٹریچر کے روشن مستقبل کی بہت کچھ امیدیں دلاتا ہے۔ کیونکہ ہمارے سب ہی دوستوں کی کرم فرمائیاں خلوص اور پاکیزہ لٹریچر کی پیاس سے وابستہ ہیں۔

اُمید ہے کہ مقامی احباب کا یہ بطور خاص تذکرہ بیرونی احباب کے جذبۂ تعاون کے لئے زود اثر محرک ثابت ہوگا۔

افتخار اعظمی

تاج پوشی

ہے یہ شبِ تاج پوشی دعوتِ دیدارِ عام
یوں اسیرِ دام کرتے ہیں فرنگی آج کل

انتظارِ دید میں بیٹھے ہیں اربابِ نیاز
جلوہ گاہِ ناز ہے گویا بکھنگم کا محل

جو پجاری تھے بتِ افرنگ سے روٹھے ہوئے
دیرِ مغرب میں چڑھاتے ہیں چڑھاوے آج کل

بت پرستی کی وہی رسمِ کہن موجود ہے
گو نئے ہیں آج کے آذر نئے لات و ہبل

حورِ مغرب سے کہو افسوں طرازی چھوڑ دے
اب نہ دامِ سحر میں آئیں گی اقوام و ملل

ابوالمجاہد زاہد

عورت اور اسلام

اے زنِ دورِ رواں! معلوم بھی ہے کچھ تجھے؟
زینتِ بزمِ جہاں! معلوم بھی ہے کچھ تجھے؟
حضرتِ انساں کی ماں! معلوم بھی ہے کچھ تجھے؟
تیرگیٔ جاہلیّت تجھ پہ تھی چھائی ہوئی
روشنی تو ڈھونڈتی تو تھی مگر ملتی نہ تھی

کوئی کہتا تھا کہ ہے توہینِ آدم تیری ذات
کوئی کہتا تھا کہ ہے باعثِ جہنم تیری ذات
کوئی کہتا تھا کہ ہے شرِّ منظم تیری ذات
کوئی کہتا تھا کہ عورت خوبصورت ناگ ہے
کوئی کہتا تھا کہ عورت ایک "دیپک راگ" ہے

سانپ کی پھنکار کہتے تھے تری آواز کو
شیطنت کہتے تھے تیرے طمطراقِ ناز کو
زہر کہتے تھے تری ہر شوخیٔ انداز کو
کاکلِ پُرپیچ کو اک جال کہتا تھا کوئی
تیرے دلکش پیار کو اک "چال" کہتا تھا کوئی

الغرض پستی کا گہرا غار تھا تیرا مقام
بیویوں کی تھی نہ کچھ عزت نہ ماں کا احترام
بھائیوں کے ظلم کو سہتی تھیں بہنیں صبح و شام
دفن کر دیتے تھے زندہ لڑکیوں کو گور میں
تیری چیخیں کون سنتا قہقہوں کے شور میں

منزل امن و مسرت تجھ سے کوسوں دُور تھی
شام بھی بے کیف تھی اور صبح بھی بے نُور تھی
مرد کے زندانِ ظلم و جبر میں محصور تھی
زندگی تیری تھی اِک مرعوب قیدی کی طرح
بیچ دی جاتی تھی تو بھیڑ اور بکری کی طرح

پھر سماں بدلا، مٹا ظلم و ستم کا اقتدار
گلستانِ دہر میں اسلام کی آئی بہار
کُلمنا کر جاگ اٹھا تیرا بھی خوابیدہ وقار
آدمیت اور انسانیت گلے سے مل گئیں
زندگی کی نیم وا پژمُردہ کلیاں کھل گئیں

قعرِ ذلت سے نکالا دینِ قیّم نے تجھے
بامِ عزّت پر بٹھایا دینِ قیّم نے تجھے
زندگی کا حُسن بخشا دینِ قیّم نے تجھے
تو گلوں کی طرح مہکی دامنِ اسلام میں
موتیوں کی طرح چمکی مامنِ اسلام میں

رفتہ رفتہ جاہلی تہذیب تجھ پر چھا گئی
مغربی آوارگیٔ حُسن تجھ کو بھا گئی
احترامِ عفت و عصمت سے خود شرما گئی
گھر سے نکلی کوچہ و بازار کی زینت بنی
کیا ترقی ہے کہ تو عورت سے نا عورت بنی

رقص گاہوں میں انسانیت تیری لوٹی گئی
ارتقا کے نام پر عصمت تری لوٹی گئی
کارخانوں میں گئی عزت تری لوٹی گئی
ہوٹلوں میں تیرا نازِ زندگی چھینا گیا
دفتروں میں تیرا احساسِ خودی چھینا گیا

شہرت و عزت کے پردے میں ہے تو خوار و زبوں
تجھ پہ آخر چل گیا چالاک مردوں کا فسوں
یہ غلط انجامِ آزادی ہے اِک مہلک جنوں
آج تو اِک خوبصورت سا کھلونا ہی تو ہے
مرد کا اِک نرم و نازک سا بچھونا ہی تو ہے

رُت نئے فیشن میں دل کی بیقراری کی جھلک
سرخی و غازہ کی تہہ میں سوگواری کی جھلک
قہقہوں کی رنگینی میں آہ و زاری کی جھلک
اس ترقی نے چرایا تیرے ہر آرام کو
اس تمدن نے اُچھالا خوب تیرے نام کو

پھول میں معصومئ نکہت نہیں تو کچھ نہیں
حُسن میں تابانیِ سیرت نہیں تو کچھ نہیں
زن میں احساسِ نسائیت نہیں تو کچھ نہیں
اے بہارِ انجمن! تیری حیا کو کیا ہوا؟
تیری شرمائی ہوئی صبح و مسا کو کیا ہوا؟

اے زنِ دورِ رواں! اسلام کے دامن میں آ
زینتِ بزمِ جہاں! اسلام کے دامن میں آ
حضرتِ انساں کی ماں! اسلام کے دامن میں آ
کل بھی بخشی تھی تجھے اسلام ہی نے زندگی
آج بھی تیرا محافظ ہے بس اِک اسلام ہی

انور صدیقی

روشنی کی طرف

میں نے اے دوست! شفق ریز بہاروں کے لئے
گیت گائے تھے مہکتے ہوئے گلزاروں کے
اپنے تخئیل کا ویرانہ بسالوں — جن سے
گیت گاتا رہا، اب تک انھیں مہپاروں کے
میں نے چاہا تھا کہ تاریک شبستانوں کو
اپنے احساس کی شمعوں سے فروزاں کر لوں!
وہ جو بربط کہ تھے خاموش نہ جانے کب سے
دل کی ویران فضاؤں میں غزل خواں کر لوں
میں نے چاہا تھا فسردہ سے مرے ہونٹوں پر
کھِل اٹھیں رس میں نہائے ہوئے خوش رنگ کنول
میری مجروح اُمیدوں کو سہارا مِل جائے
جگمگانے لگیں خوابیدہ اُمنگوں کے محل
"سرخِ جنّت" کے تصوّر میں بنائے خاکے
پھر بھی افسردگیٔ غم کی کسک باقی تھی
مُرغزاروں میں خُتن کے مرا تخئیل پھرا
دل کے گلتے ہوئے زخموں میں مہک باقی تھی

میں نے زلفوں کی "گھنی چھاؤں" کو آباد کیا
پھر بھی ویرانیٔ دل اور بھی بڑھتی ہی گئی
انقلاباتِ سحر خیز کے نغمے گا ـــــ ئے
اپنے اذکار کی لیکن نہ کبھی صبح ہوئی

میں نے سمجھا تھا کہ ظلمت کی نہ ٹوٹے گی کمند
تا دمِ زیست اندھیروں میں یونہی بھٹکوں گا
میرے آنسو، مرے نالوں کو نہ سمجھے گا کوئی
عمر بھر یونہی حقیقت کے لئے ترسوں گا

میری ہاری ہوئی اُمیدوں کی تاریکی میں
تھرتھرانے لگی عرفاں کی معصوم کرن
ریگ زاروں میں غروب کے جو کبھی کھوئی تھی
جس سے ہستی کی شبِ تار ہوئی تھی روشن

زندگی کی مری تاریک گذرگاہوں میں
آج روشن ہوئی اِک گُل شدہ شمعوں کی قطار
مسکرانے لگی اسلام کے پرچم کے تلے
غم کی ماری ہوئی اے دوست! مری جانِ نزار

اب مری زیست کے انداز بدل جائیں گے
اب میں الحاد بھرے گیت نہیں گا سکتا
زندگی میری اُجالوں میں ہنسی آتی ہے
اب اندھیروں کی طرف میں تو نہیں جا سکتا

سہیل احمد زیدی

انتباہ

تیرے نغمے وقف ہیں حسن شبستاں کے لئے
اور گھٹتا جا رہا ہے آدمیت کا گلا
دیکھ آدم کے قدم کو دوست پھر لغزش ہوئی
کیا بچا سکتی ہے تیرے پار کی کوئی ادا؟

اک ردائے انجم و مہتاب کی تو فکر میں
کتنی لاشیں سڑ رہی ہیں آج بے گور و کفن
تو بناتا ہے تصور میں بجنت کے محل
کتنے بلبل بے گلستاں کتنے آہو بے ختن

پھول مرجھائے، چمن اجڑا، نشیمن جل گئے
کب تلک آخر بتا نظم گلستاں سے گریز
غرق ہو جائے گا تو بھی کشتیاں ڈوبیں اگر
کب تلک دریا میں رہ کر سیل طوفاں سے گریز

چھوڑ دے اب ریشمی آنچل کا پیچا چھوڑ دے
کفر سے ایماں کی جانب وقت کی رو موڑ دے
خدارا اٹھ خدارا جلد اٹھ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو
در بہ در پھرتے ہوئے انسانیت دم توڑ دے

(پروفیسر) رشید احمد صدیقی

برخود غلط معالج

(یہ کچھ دن ہوئے یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر ہوئی اور اب نظر ثانی اصلاح و اضافہ شائع کی جاتی ہے)

فارسی کی ایک کہاوت ہے کہ جب موت آنے والی ہوتی ہے تو معالج سے بیوقوفی ہو جاتی ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ علاج نہ کیجئے جب بھی موت آنی ہے عقلمندوں کا قول ہے کہ بیوقوفی اور موت دونوں کا کوئی علاج نہیں بعض معالجوں کو یہ بھی کہتے سنا گیا ہے کہ بیوقوف مریض عقلمند مریض سے جلد صحتیاب ہوتا ہے یا کم مرتا ہے اور عقلمند مریضوں کا بیان ہے کہ بیوقوف معالج عقلمند معالج سے زیادہ دن جیتا ہے!

مجھے معالج کی قابلیت اور اپنی عقل پر بہت کم بھروسہ رہا ہے اسلئے مرض میں مبتلا ہونے کا تو اکثر اتفاق ہوا ہے مرنے کا اب تک نہیں ہوا۔ مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ میں خود اتنا برخود غلط ہوں کہ معالج کے برخود غلط ہونے پر میری نظر بہت کم جاتی ہے اس لئے کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوا ہے کہ قبل اس کے کہ کوئی معالج میری جان لے میں ہی اس کی جان نہ لے لوں۔ اس بیان میں آپ سبب اور نتیجہ کا ربط دریافت کرنے کی کوشش نہ فرمائیں جو شخص جان لینے کی فکر میں ہوتا ہے وہ منطق کے چکر میں نہیں پڑتا!

میرے دل میں اکثر یہ خطرہ بھی گذرا ہے کہ آج کل جس کثرت سے دوائیں ایجاد ہوتی جا رہی ہیں اگر اسی رفتار سے مرض اور مریض نہ پیدا کئے جا سکے تو دنیا کو کتنی بڑی ہل چل کا سامنا ہوگا مثلاً کوئی نیا اسلحہ جنگ دریافت ہو جائے اور جنگ نہ چھیڑی جا سکے تو آپ نے دیکھا ہوگا جنگ کرنے کے لئے صلح کی تدابیر اختیار کرنے یا کرانے میں کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں ممکن ہے آج کل کچھ اسی قسم کی دشواریوں سے سابقہ ہوا ہو جس کی وجہ سے فیملی پلاننگ کی اسکیم تصنیف کی گئی ہو یعنی افزائش نسل کو قابو میں رکھا جائے اور یہ اس طور سے کہ والدین سے ان کا پیدائشی حق چھین لیا جائے۔ اس میں مجھے خیریت نظر نہیں آتی۔ پیدائش کا حق چھیننا آسان نہیں ہے۔ اس سے "فن برائے زندگی" براہِ راست متصادم پڑتی ہے!

حق پیدائش کے ساتھ اشتہاری معالجوں کی پرورش کا مسئلہ بھی گتھا ہوا ہے۔ شمار و اعداد کے ایک ماہر نے مجھے بتایا ہے کہ اولاد کی پیدائش اور اشتہاری ادویات کی کھپت میں ایک خاص تناسب ہے۔ اگر افزائش نسل کو روکنا مقصود ہو تو اشتہاری معالجین کی قطع نسل ضروری ہے۔ اس کے برعکس بعضوں کے اس نظریہ کو بھی اہمیت دی جاتی ہے کہ قطع نسل کا آسان وسیلہ اشتہاری دوائیں ہیں ضمناً یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ افزائش نسل کا سب سے بڑا سبب افلاس ہے غراغت میں بدکاری اور خلاکت میں نسل بڑھتی ہے۔ مفلسی سب بہار کھوتی ہو یا نہیں۔ اس میں وہ تمام خاصیتیں موجود ہوتی ہیں جو مقوی سے مقوی ادویات یا اشتعال انگیز سے اشتعال انگیز تقریروں میں نہیں ہوتی۔

اشتہاری معالجوں کا میں یوں بھی قائل ہوں۔ اس لئے کہ امراض اور ادویہ سے متعلق ان کے اشتہارات اردو افسانہ نگاری میں "حقیقت پسندی" کی تحریک ہوتے ہیں۔ ایک عرصہ سے زیادہ تر ایسے اردو افسانے میری نظر سے گذرے ہیں جن کو پڑھکر محسوس ہوا ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے یا تو اشتہاری معالجوں کے تصنیف کئے ہوئے اشتہارات پڑھے ہیں یا ان کی تیار کردہ دواؤں کا شکار ہوتے ہیں۔

اولاد کی پرورش و پرداخت کیجئے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ آزاد شہری بن جائیں گے جو اکثر آزاد شہدے کا ایک خوبصورت مترادف ہے یعنی ذمہ داری تمام تر تمھاری اور اختیارات و حقوق کلیتہً ہمارے۔ لیکن اشتہاری معالجوں کی طرف توجہ نہ کیجئے تو الکشن میں کھڑے ہو جاتے ہیں، کامیاب ہوتے ہیں۔ قوم کے معالج اور ناکامیاب ہوتے ہیں تو قوم کا مرض بن جاتے ہیں۔ مریض تو معالج کا سہارا پکڑتا ہے۔ یہ قومی معالج مریض کا سہارا پکڑتے ہیں۔ برخود غلط معالج کی سب سے ہیبت ناک اور نفرت انگیز قسم یہ ہے!

خود پیرا امراض سے اتنا سابقہ نہیں رہا جتنا معالجوں سے اس لئے کہ مرض کسی کے حصہ میں آئے معالج میرے حصہ میں آتا تھا وہ یوں کہ بچپن ہی سے مجھے سعادت نصیب رہی ہے کہ لوگ میری خدمات سے فائدہ اٹھانا میرے اور اپنے دونوں کے لئے سعادت دارین کا موجب سمجھتے تھے۔ خلاً بوڑھیوں کو جب میٹھا کھانے کی خواہش ہوتی تو وہ اپنی بزرگوں کی ارواح کو ثواب پہنچانے کے لئے بتاشے پر فاتحہ

دلانے مجھے بلاتیں۔ مجھے فاتحہ پڑھنا بالکل نہیں آتا تھا اور اس بات کو خدا کی ساری بوڑھیاں جانتی تھیں لیکن ان کو میرا جیسا سعادت مند لڑکا نہیں ملتا تھا جو ایک پیسے میں دھیلے کا بتاشا۔ دھیلے کا مٹی کا تیل تو سول خریدے اور دو چار وڑی نمک کی ایک آدھ گانٹھ ہلدی کی۔ کچھ سبزی ادھر ادھر سے مانگ لے اور تھوڑی بہت ککڑیاں راستہ سے چنتا لائے۔ کوئی اعتراض کرتا کہ جس کو فاتحہ پڑھنا نہ آتا ہو اس سے فاتحہ پڑھانے سے کیا حاصل تو وہ جواب دیتیں کہ اس سے کیا ہوتا ہے معصوم کی دعائیں ہی قبول ہو جاتی ہے معاند مدعی، وہ مجھ کو بیکڑ بتاتے اور مشیار دعائیں دیتیں اب میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ تجھ معصوم کی دعا ان ارواح کے حق میں مقبول ہوئی یا نہیں البتہ ان بوڑھیوں کی دعا میرے حق میں اس واسطے ضرور مقبول ہوئی کہ اب تک کوئی معالج میری روح نہ قبض کر سکا۔

پھر میں نے ترقی کر کے دکان کے دل میں اترنا گھر کر لیا کہ وہ مجھے پنساری کے ہاں یہ کہلا کر بھیج دیتیں کہ فلاں کو یہ تکلیف ہے کوئی دوا تجویز کر کے بھیج دی جائے۔ یہ زمانہ تھا جب بستی کے سب سے پرانے پنساری کی دکان مشکل کشائی کا سب سے بڑا ادارہ ہوتا۔ لوگ سودا خریدنے آتے تو طبی مشورہ اور دوا مفت حاصل کرتے۔ بوڑھا بنیا اس زمانے میں بستی والوں کا طبی، قانونی، مالی، خاندانی، جانی بھی طرح کا مشیر ہوتا۔ وہ بستی کے ہر خاندان کے افراد کا مزاج دان ہوتا۔ کچھ عرصہ میں کہ میں پڑھ لکھ فلاں کو فلاں تکلیف ہے۔ دوا دیو۔ پھر وہ دوائیں ایسی ہوتیں جو پنساری کی دکان پر یا دھرا دھرا کھیت میں یا گھر میں پڑی مل جاتی تھیں۔ اور میرا ذہن بھی یہاں ہے کہ پنساری کی دکان کی بیشتر دوائیں روزمرہ کی کھانے پینے کی چیزیں ہوتیں البتہ ذرا پرانی ہو کر ناقابل استعمال ہو جاتی ہوں اور سب سے تجربہ کی بات یہ ہے کہ ڈوبرے کی بات یہ تھی کہ انھیں دواؤں سے بنا بنا کر اس زمانے میں لوگ لیڈر رحیمی کوتے تھے اور عقد ثانی بھی!

مجھے یاد ہے ایک شخص نے سود الیکر اپنی کالیف بیان کرنی شروع کر دیں۔ بنئے نے ایک پڑیا میں دوا باندھ کر دیدی مریض نے قبض کی شکایات بیان کیں جن میں زیادہ تر عدالت خراجات اور کچھ قدرت باری سے تعلق رکھتی تھیں بنیا یہی بتاتا رہا کہ اس کو قبض ہی پڑیا میں موجود ہے۔ فرق صرف ترکیب استعمال یا دوا کی تیاری کا تھا یعنی دوا کو جوش دے کر پھینکو کوٹ چھان کر۔ پلا شربا بنا کر پلا دو دھونی استعمال کیا جائے۔ اور آخر میں ہمیشہ یہ کہہ دیتا کہ دیو ایک دوا ایک طرف سے پڑیا کشکول لئے ایک سادھو نما وارد ہو کے بولے ہاں بیٹا دیو ایک دوا ایک پھر رام بھی ایک ہاتھ جوڑ کر تعظیم دی اور ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر ایک ٹھیلا ان کی کشکول میں ڈالا اور جب وہ ذرا دور نکل گئے تو بولا کیوں میں

رام رام جپنا پرایا مال کتنا!

یہ قصہ اس زمانے کا ہے جب نہ معالج کی کوئی فیس تھی نہ دوا کے کچھ ایسے دام بازار گئے ہر طرح کی بیماری یا علالت کی دوائیں خرید لائے۔ اس سے بحث نہیں کہ دوا فائدہ کرتی تھی یا نہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لوگ اس پر ایمان رکھتے ہوں کہ دوا استعمال کر کے انہوں نے خدا کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ چھوڑا ہو کہ وہ ان کو اچھا کر دے اور معالج یہ سمجھتا ہو کہ جو دوا اس نے دیدی ہے وہ اگر اپنی تاثیر نہ دکھائے تو وہ دوا کو منہ دکھلانے کی جرأت نہ کرے گی۔ برخود غلط ہونے اور عقیدہ رکھنے میں کچھ یونہی سا فرق ہے!

اسی زمانہ کی بات ہے کسی کے کان میں کوئی تکلیف ہوتی تو محلہ کی بڑی بوڑھی سے لوگ رجوع کرتے۔ ان کے مطب کا وقت بات گئے ہوتا جب وہ اللہ کی عبادت اور گھر کے چھوٹے بڑوں پر حکومت کر کے سونے کی تیاری کرتیں۔ اس وقت کان کے سارے مریض جمع ہوتے۔ ایک پان کھاتیں جس میں تمباکو کے تھوکھے چنے کا خاصا بڑا ٹکڑا ہوتا۔ تھوڑی دیر اس کا اگال منہ سے براہ راست مریض کے کان میں اس طرح ڈال دیتیں جیسے وہ کان نہیں پیکدان ہو! اس دوا کی ایک خوراک کے بعد کوئی مریض دوسری بار حاضر ہوتا میں سمجھتا ہوں کہ امراض میں بھی غیرت کا جذبہ ضرور ہوتا ہے۔ جس مرض کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جائے وہ بھاگ جاتا ہو۔ شاید یہی کچھ کیچڑ کھچڑ مرض دور کرنے کی تدبیریں کرتے وقت دیکھنے والے کو محسوس ہوتا ہو!

برخود غلط معالجوں سے میرا مقصد ان کا اکثر مرد و عورت مریضوں اور حسینوں سے بھی حسینوں کا نام لیوں سے لیکر کان دانت یا اطوار و عادات کسی نہ کسی طرح دوسرے کو نکیں سے مرعوب ہونا ہے۔ معالج دونوں سے ملتے ہیں۔ میں حسینوں کو درگذر کے قابل سمجھتا ہوں اس لئے کہ وہ جس انداز پر فخر کرتے ہیں وہ یا تو خدا داد ہے نہ آبرو باختہ شاعروں یا کم ظرف عاشقوں کا دیا ہوا تمغہ ہے۔ خود ان کا حاصل کیا ہوا نہیں ہوتا۔ جس چیز کے حصول میں اپنی قابلیت یا ریاضت کا دخل نہ ہو اس پر فخر کرنا بیوقوفی کی نشانی ہے حسینوں کے سلسلہ میں عاشقوں کی قابلیت اور ریاضت پر نظر کی جائے تو وہ بھی کچھ زیادہ قابل فخر نظر نہیں آتے۔ برخود غلط معالج کا تصور سیرے نزدیک ایسے معالج کا ہے۔ جو دوسرے معالج کے مریض کو اپنی قابلیت جتائے اور اپنے مریض پر دوسرے معالج کے مجربات آزمائے۔ وہ اپنے عقل یا اپنے مطالعہ پر اتنا بھروسہ نہیں کرتا جتنا دوا کی تاثیر پر۔ اور دوا کی تاثیر پر اس لئے عقیدہ رکھتا ہے کہ کسی کو ایسا کہتے سنا ہے یا کسی پیشرو یا پیشی امام کی بیاض میں ایسا لکھا ہوا دیکھا ہے۔ برخود غلط معالج کی واضح نشانی یہ ہے کہ وہ ہر مریض کو اچھا کر دینے کا دعویٰ کرے گا اور محض اس بنا پر کہ ہر مرض کی مجرب دوائیں موجود ہیں!

بے شمار اچھے آلات، مجرب دوائیں اور علاج کے ایسے طور طریقے دریافت کر لئے گئے ہیں اور ہر روز دریافت ہوتے رہتے ہیں جن کے تصرف سے امراض کلیہ یا جزئیہ کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اور صحت کی بحالی آسان ہو گئی ہے ایسے قوانین بنا دیئے گئے ہیں اتنی سہولتیں فراہم کر دی گئی ہیں اور عام لوگوں میں اتنی سوجھ بوجھ آ گئی ہے کہ تپتے بازار اور بر خود غلط معالج کی دال اب کم گلتی ہے لیکن اس کو کیا کیجئے مدتوں ہر طرح کی غلامی میں بسر کرنے سے ہم میں ایسی کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ جو عطائیوں کی ہمت بڑھاتی رہیں گی۔ ہماری زندگی کی سرگرمیوں مثلاً مذہب، شاعری، سیاست، تجارت، تصنیف و تالیف سب میں عطائیوں کی گرم بازاری ہے۔

میں ان تمام عطائیوں یا بر خود غلط معالجوں کا ذکر نہ کروں گا جو ہماری زندگی میں دخیل ہو گئے ہیں۔ میں صرف جسمانی امراض کے ایسے معالجوں کا ذکر خیر کروں گا جو مریض کی جان پر نہیں اس کی جیب پر نظر رکھتے ہیں۔ میں ایسے معالجوں سے واقف ہوں جو لالچی یا بے ایمان نہیں ہوتے لیکن سوجھ بوجھ سے کام لینے کی ریاضت میں مبتلا ہونے سے بچتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف دوائیں مرض کو دور کر دیتی ہیں۔ ان کو نہیں معلوم کہ مرض کتنا ہی معمولی یا جانا پہچانا کیوں نہ ہو مریض میں داخل ہو کر کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ میں طبیب یا ڈاکٹر نہیں ہوں لیکن اتنا ضرور محسوس کرتا ہوں کہ جس طرح مختلف کیمیاوی اجزاء کے میل سے ایک نئی چیز پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح ہر شخص کے جسم کے اندر پہنچکر ہر مرض کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے معلمی کا میرا تجربہ یہ ہے کہ ایک ہی علم یا ایک ہی مکتبہ مختلف طلباء کے ذہن و دماغ پر مختلف طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن کیا کیجئے بر خود غلط معالج کی طرح بر خود غلط معلم اور بر خود غلط مبلغ بھی تو عام ہیں!

مدت ہوئی ایک بیمار دوست کو لیکر ایک معالج کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ مرض سخت تھا اور حالت اندیشہ ناک۔ مطب میں داخل ہوا تو انہوں نے اس غیر معمولی تپاک سے میرا خیر مقدم کیا کہ مریض کی طرف سے تو پہلے ہی سے مایوسی تھی۔ معالج کی طرف سے بھی مایوسی ہونے لگی۔ موصوف نے مریض کو اس طرح دیکھا بھالا جیسے وہ مرض انھیں کا بھیجا ہوا تھا اور تھوڑی دیر بعد اس مرض کو واپس بلا لیں گے۔ کچھ دیر تک تو اس شہر کی مصنوعات اور مقویات کا تذکرہ فرمایا۔ جہاں سے ہم آئے تھے لیکن ان میں سے کوئی چیز ہمراہ نہ لائے تھے۔ اس کے بعد فرمایا۔ فلاں رئیس بھی اس مرض میں مبتلا ہوئے تھے اور مر گئے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ مرض ہی ایسا تھا بلکہ انہوں نے ایسے شخص سے علاج کرایا جو خدا کا منکر تھا۔ جو شافی مطلق کا منکر ہو گا اس کے ہاتھ سے شفا کیسے ممکن ہے ——

ایک دن حال کہنے کے سلسلہ میں حاضر ہوا تو فرط محبت سے کھڑے ہو گئے اور بولے جناب مبارک ہو۔ رات خواب میں حضرت شیخ الرئیس تشریف لائے اور آپ کے مریض کے لئے نسخہ لکھوا گئے ہیں اب صحتیاب ہونے میں کوئی شک نہیں رہا نسخہ تیار ہونے کے لئے دیدیا گیا ہے۔ دوا کے کچھ دام نہیں البتہ مرحوم کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے پچاس روپے مرحمت ہوں۔ روپے دینے پڑے دوا استعمال کرنی پڑی۔ اور مریض جاں بحق ہو گیا۔ البتہ یہ نہیں بتا سکتا کہ ان کے پچاس روپوں کا ثواب شیخ الرئیس یا مریض مرحوم کو پہنچا یا نہیں!

میں ایسے تیر بہدف معالج سے بہت گھبراتا ہوں جو دیکھتے ہی بتا دے کہ مجھے کیا تکلیف ہے اور تکلیف بتانے سے پہلے دوا تجویز کر دے اور دوا استعمال کرنے سے پہلے مجھ میں صحتیابی کے آثار دیکھنے لگے۔ اردو شاعری میں تو میں نے ایسی کرامات دیکھی ہیں۔ طب میں یہ خرافات کہیں نظر نہ آئے میرا سابقہ ایسے معالجوں سے بھی رہا ہے جو دوا نہیں تجویز کرتے ڈاکٹر یا دیوالہ تجویز کرتے ہیں میرا خیال ہے کہ ہمارا جسم جتنے اعضائے رئیسہ یا ان کے افعال قبیحہ پر مشتمل ہے ان سب کے اسپیشلسٹ یا ماہر جدا جدا ہیں اور جب تک ان سب کی خدمت میں نذرانہ کی خطیر رقم پیش نہ کی جائے اس وقت تک معالج آپ کے مرض کی تشخیص کرے گا اور نہ کوئی دوا دے گا پھر ہر معالج کا دوا خانہ بھی جدا جدا ہے جس پر صرف اس کا کنٹرول، آپ جاں بحق ہو جائیے تو یہ نہ معلوم ہو سکے کہ کن محرمات خبیثہ کا ارتکاب کیا تھا۔ ایک معالج ہیں جو نسخہ میں دوا کے بجائے ڈاکٹر تجویز کرتے ہیں یعنی آج دانتوں کا ڈاکٹر تو کل آنکھوں کا۔ پرسوں فتق کا اور کبھی کبھی کوڑھ یا کنٹھ مالے کا۔ ورنہ کسی سینیٹوریم یا صحت گاہ کا۔ جہاں مرنے سے پہلے مریض عافیت کرتے ہیں۔ اور اپنے ڈائری افسانہ نگاروں کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔

علم نے اتنی ترقی کر لی ہے اور اس درجہ شاخ در شاخ ہو گیا ہے کہ کوئی ایک شخص اس علم کے ہر جزء سے پورے طور پر واقف نہیں ہو سکتا۔ یہی سبب ہے کہ آج کل ہمہ جہت اہل علم و فن نہیں ملتے۔ یہ صورت حال ٹھیک ہو یا نہ ہو۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ایک بات ضرور محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ ہر چیز پر بہ حیثیت مجموعی نظر نہ ہونے کے سبب سے اب کسی شخص میں وہ رچاؤ، وہ جامعیت اور وہ وزن و وقار نہیں ملتا جو اگلے لوگوں میں ملتا تھا۔ ان کا علم کیسا ہی رہا ہو ان کا طرز فکر اور ان کی نظر وسیع تھی۔ ان میں تحمل تھا۔ وہ انتظار کر سکتے تھے اور یہی سبب تھا کہ بہ حیثیت شخص دوسروں پر ان کا اثر مفید اور دیرپا ہوتا تھا۔ اس طرح سے زندگی اور زمانہ کی طرف سے لوگوں میں وہ بے اطمینانی و بیزاری نہیں آئی تھی جو آج تمام دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔

فضل الرحمٰن رحمانی

نئے ادبی رجحانات

ادب ـــــ آرٹ ـــــ ! ادیب ـــــ آرٹسٹ ـــــ !

ادب آرٹ کی وہ قسم ہے جس میں ادبی صناع زبان کے ذریعہ سے انسانی خواہشات، جذبات، تاثرات اور تجربات کو کیفیاتی رنگ میں پیش کرتا ہے۔ آرٹ زندگی کے ان عناصر کے تصور کی از سرِ نو تخلیق کو کہتے ہیں جن سے انسان کو سابقہ پڑتا ہے اور جن سے اسے دلچسپی ہے۔

ادب کسی ایک شخص کی ذاتی خواہش کے عکس کا نام ہے ـــــ آرٹ ذہنِ انسانی کا ایک فعل ہے جو خوش رنگ بھی ہوتا ہے اور بدرنگ بھی ـــــ وہ غمزدہ اور مصیبت زدہ آدمی کے اترے ہوئے چہرے کی طرح افسردہ بھی ہوتا ہے۔ اور خوش قماش آدمی کے پھول کی طرح چمکتے اور مسکراتے ہوئے چہرے کے رنگ میں بھی ـــــ جیسے کوئی مغنی ایسا راگ گا رہا ہو جو غم و اندوہ بھرے حادثات سے لبریز ہو تو سامعین میں بھی غم حلول کر جاتا ہے۔ اور اگر طبیعت میں شوخی اور کیف و مستی پیدا کرنے والا نغمہ گایا ہو تو سننے والوں میں سرور و مستی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر ایک شخص کی نفسی حالت عام دنیا کی نفسی حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سعدی کا شعر

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

اس بات کی دلالت میں پیش کیا جاتا ہے کہ آرٹ چند ضروریاتِ زندگی کے پایۂ تکمیل تک پہنچ جانے کے بعد حاصل ہو سکتا ہے۔ انسان معاشی حیوانیت کا درجہ اپنی زندگی میں پورا پورا دیدے جس سے اس کو دنیاوی غموں سے بغاوت ملے تو اس میں آرٹ پیدا ہونے کے حالات سازگار پیدا ہو جاتے ہیں ـــ یا دوسرے لفظوں میں آرٹ اس وقت تک جنم نہیں لے سکتا جب تک کہ چند معاشی و مادی ضرورتیں پوری نہ ہوں۔ لیکن مجھے یہ بات بالکل لیکن حقیقتاً اتنا اختلاف ہے جہاں زندگی اور موت کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ میں اس حد تک تو متفق ہوں کہ آرٹ اس وقت جنم لے سکتا ہے جبکہ انسان کو "سکون" حاصل ہو لیکن وہ "سکون" کیسا ہو اس میں مجھے اختلاف ہے۔ میرے خیال میں انسان کو وہ "سکون" ایسا ہے جو ذہنی "سکون" ہو۔ "سکون" صرف دنیا کا ہی نہ ہو بلکہ اس دنیا سے آگے کا بھی ہو۔ جسے "روحانی سکون" ـــــ SPIRITUAL REST کہتے ہیں اگر روحانی "سکون" میسر ہو گیا تو آرٹ اس جگہ جنم لے لیگا۔

جب انسان دنیاوی سکون حاصل کر لیتا ہے اور عالم کی رنگینیاں نظر آتی ہیں تو وہ ان کی طرف للچائی ہوئی نظریں ڈالتا ہے۔ اور ان سب کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کو اس کے دل میں بے پناہ جذبات اور ولولے انگڑائیاں لینا شروع کر دیتے ہیں۔ خوب شراب و مستی کے عالم میں جھومتا ہے۔ مگر یکایک اس کی آرزو بر آنے سے قبل رات ختم ہو جاتی ہے۔ آفتاب غروب ہو جاتا ہے۔ پانی پینے کے لئے گلاس منہ سے لگانا چاہتا ہے۔ مگر لبوں سے "TOUCH" ہونے سے قبل ہی گر جاتا ہے۔ تو الہٰ بتاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اسے سپرد خاکدان معدہ کر دے۔ وہ اسے معدے کے قابل بنا کر PASS کر دیتا ہے۔ تو ہاتھ اٹھا لیتا ہے اٹھاتے ہی زندگی کا آخری سانس نکل چکتا ہے۔ گھر سے اس امید و بیم پر نکلتا ہے کہ فلاں سے جا کر ملاقات کرے اور راہ میں کسی حادثہ کا شکار ہو کر دنیا کو آخری سلام کر جاتا ہے۔ سوچتا کیا ہے ہوتا کیا ہے ـــــ غرض وہ اس سکون کے حاصل ہوتے ہوئے بھی بعض اوقات ہی نہیں بلکہ اکثر اوقات اپنی منشا کے مطابق کام نہیں کر سکتا ـــــ ! ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ انسان اپنے سے اعلیٰ تر ہستی کے وجود کے اثبات میں سر تسلیم خم کر دینے کے لئے مجبور ہے۔

سائنس کے بے پناہ مشاہدات و تجربات نے اب ان حقائق پر سے پردہ اٹھا دیا ہے جن کو تسلیم کرنے کے لئے خصوصاً مغرب کے لوگ کسی طرح تیار نہیں تھے۔ اب حال ہی میں جب وائرلیس مکرر و دغا کے ممالک میں سریع زرد و سیاہ نمود ار ہوا تو اس میں کانوں کو "WHISPERS" سنائی دینا شروع ہو گئیں کہ کہیں قیامت تو نہیں آ گئی۔ بجلی ـــــ کی ایجاد اور ہوائی جہاز کی ایجاد نے "معراج" کی حقیقت ان پر واضح کر دی اور ان کو از خود اس حقیقت کو تسلیم کرا دیا۔ اپنے بے بس ہونے نے خدا کے وجود کو منوایا۔ پھر اس دنیا کے عقیدے کو تسلیم کرنے میں کسی کو چون و چرا کا موقعہ

نہیں۔ اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو میری نظر میں اُس سے زیادہ حقیقت کا منکر کوئی نہیں ـــــ اگر آرٹسٹ کو دونوں دنیاؤں کا "سکون" نصیب نہ ہوگا تو وہ کیا خاک آرٹ پیش کر سکے گا اور بالفرض محال پیش کر بھی سکا تو چھوٹی ہوئی سے زیادہ حیثیت حاصل نہ کر سکے گا۔

جو آرٹ دنیاوی سکون حاصل کرنے کے بعد جنم لے گا وہ چند روزہ زندگی حاصل کر کے ہی ختم ہو جائے گا اور وہی آرٹسٹ ابدی حیات حاصل کر سکے گا جو "روحانی سکون" SPIRITUAL REST نصیب ہونے والے کے پاس سے پیدا ہوگا کیونکہ اس کے قرب کی زمین زیادہ FERTILE بارآور اور زرخیز ہوگی۔ اس کے مقابلے میں جو بنجر ہوگی۔ اور اس زمین میں میسبت ہوگی۔

FERTILE زمین کے مقابلے میں ـــــ اس وقت جو آرٹ چھایا ہوا ہے وہ اس "دماغی سکون" کے حاصل ہونے کے بعد پیدا کیا گیا ہے جو ایک "دنیا پرست" کو حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا ادب خوش حال اور تونگروں کا حق میراث اور اس طبقے کے جذبات و خواہشات کا آئینہ دار، عام مخلوق سے بے تعلق اور انسانیت کے حقیقی خیالات اور جذبات سے بیگانہ رہا ہے ـــــ خیالاتِ انسانی کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ خوش حال اور منعم طبقے بھی بدلتے رہے ہیں، انسان میں ایک ایسی طاقت ہمیشہ پنہاں رہتی ہے جو اس کے قلب کے اضطرار کو حالتِ مطمئنہ کے اثرات کا پتہ دیتی ہے۔ جب تک اسے "روحانی سکون" میسر نہیں ہوتا، اس کی روح ـــــ اِدھر اُدھر سکون کی تلاش میں بھٹکتی رہتی ہے۔ چنانچہ اسی کمی کے باعث انسان اس کی زندگی کے حقیقی تقاضوں سے آگاہ ہوتا رہا جس کے ساتھ اس کی زندگی بھی مبدّل ہوتی رہی زندگی کے اس ROTATION کے تجربات کے اثرات اس کے دل و دماغ کی قوتِ فکر و عمل پر پڑتے رہے۔ اس کا اس کے ذوقِ طبع میں نمایاں فرق پیدا کرنا لازمی امر تھا ـــــ اس طرح ادب اور اس کے موضوعات انداز بیان، فن ٹیکنک اور تخلیق و بُن بدلنے لگتے ہیں ـــــ خائف اور گہری نظر سے موجودہ ادب کا مطالعہ کرنے والے اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہوں گے کہ یہ بے چینی اور مذبذبیت، تلاش و جستجو، سکون کی لہریں ان کی تحریروں میں جا بجا پائی جاتی ہیں جن کا احساس شاید ان تحریروں کے مصنفوں کو بھی نہیں ہوتا اور جوں جوں وہ یکسوئی تحمل کرنے میں کامیاب ہوتے جاتے ہیں توں توں ان کی زندگیوں میں انقلابات رونما ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان ہی کے ساتھ ادب اور آرٹ کی قدریں بھی بدلتی رہتی ہیں ـــــ آج دیکھئے کہ ادب کی نئی قدریں بھی قائم ہو رہی ہیں۔ ادب کا مفہوم بھی بدل رہا ہے۔ اس کے فرائض اور حدود تک از سرِ نو جوڑ توڑ ہو رہی ہے اور اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ادب کو معاشرہ ـــــ

اور کلچر میں وہی جگہ دی جائے جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔

ادب کو معاشرہ میں انسان نے طلسماتی حکایتوں، دیو، جن اور پری کے افسانوں اور فرضی قصوں سے اپنے جذبہ حیرت کو تسکین دینے کا ذریعہ رکھا کبھی رزمیہ اور بزمیہ واقعات سے تو کبھی گل و بلبل کے پردے میں حسن و عشق کے تذکروں سے بھوک اور جنسی میلانات کی تسلی و تشفی کی ـــــ بہر حال کچھ بھی سہی ادب کا کچھ نہ کچھ مقصد بنا پایا گیا۔ اور ادب کا مقصد متعین کرنے والا انسان کا دماغ ہی ہوتا ہے۔ جب اسے کوئی گائڈ ملتا ہے تو وہ اس کی اس راہبری کو منہ چڑا کر اپنے نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے ویسے ہی مقاصد کا تعین کر کے حظ حاصل کرتا رہتا ہے۔

آج کل ہمارا ادبی ذوق بڑی تیزی سے بدلتا جا رہا ہے۔ جدید رجحانات ابھر رہے ہیں اور صحیح مقاصد متعین کئے جا رہے ہیں۔ اب ادب کا مقصد محض وقت گذاری اور دل بہلانے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اسی شیرینی میں ایک نئی "مٹھاس" اور بھی ہے جس کو اس پر فوقیت حاصل ہے، یہ اب حسن و عشق کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیاتِ انسانی کے مسائل پر غور و فکر کرتا ہے پھر ان کا محاکمہ کر کے ان کو حل کرتا ہے ـــــ اعلیٰ معیار پر زندگی گذارنا ہر شخص فطرتاً چاہتا ہے ـــــ انسانیت ہمیشہ غلاظت اور گندگی کو اپنے اوپر سے دور کر کے خود کو پاک و صاف کرنے کے لئے بے چین ہے اب یہ ادب کا کام ہے کہ وہ انسانیت کا غمگسار اس کا ہمدم اور چارہ ساز بنے۔ اب یہ ادباء اور آرٹسٹوں کا کام ہے کہ وہ ادب کو انسانیت کا چارہ ساز بنائیں ـــــ ادب اور انسانیت جب یکجا ہو جائیں گے تو جھٹکے مسافر راہ پر جلد آسکیں گے ـــــ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس علم کو ہمارے ادیبوں نے اٹھایا ہے اور وہ بڑی حد تک کامیابی حاصل کر چکے ہیں لیکن ہمیں یہاں چند لمحات کے لئے یہ سوچ بغیر گذرنا نہیں ہے کہ یہ علم کون سے ادیبوں نے اٹھایا۔ آیا اوّل الذکر قسم کے ادباء نے یا ثانی الذکر والوں نے۔ یہ امتیاز اور یہ تمیز ہم اس وقت تک کرنے کے لئے قاصر رہیں گے جب تک کہ دونوں گروہوں کی تخلیقات و نظریات کا مطالعہ نہ کر لیں ـــــ آیئے ایک نظر ان دونوں علمبرداروں پر ڈالیں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ ہماری کسوٹی پر کون پورا اترتا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات بھی ضرور عرض کر دوں کہ جتنے مختلف نظریئے ہوں گے اتنے ٹکڑوں میں "ادب" اور "ادیب" تقسیم ہوتے ہیں۔ فی زمانہ یہ جاننا مشکل نہیں ہے کہ دنیا کے کتنے نظریات ہیں۔ اگرچہ ان کے باریک اختلافات کی بنا پر بھی بہت سے ٹکڑے ہو چکے ہیں جن پر بحث کرنا عبث ہے۔ عین الاقوامی شکل میں اب ادبی رجحانات نے اختیار کر لی ہے یا جن کے نشو و نما سے یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ سلسلہ اسی پوزیشن اور اس معیار پر پہونچ جائیں گے۔ ایسے ادبی رجحانات پر

سیر حاصل تبصرہ کرنا ہی ہمارے لئے کافی ہوگا۔

اب تک دو نظریئے ادب کے تسلیم کئے ہوئے ہیں یعنی "ادب زندگی کیلئے" اور "ادب ادب کے لئے" ادب زندگی کے لئے" اس کی تعریف ——— اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ایسا ادب جو حیاتِ انسانی کے صحیح مقاصد کو اُجاگر کرے، اس کو منزل بتائے منزل کی راہ بتائے۔ راہ تاریک ہو تو روشنی دے۔ لیکن یہاں اس پہلو سے نظر اندازی نہ کریں کہ راہبر کو کیسے سمجھیں کہ یہی اصل راہبر و خضر ہے۔ کسی کی بتائی ہوئی منزل کو کیسے مان لیں کہ یہی اصل منزل ہے کسی کے کہنے سے یہ کیسے تسلیم کرلیں کہ آگے جو راہ آنے والی ہے وہ تاریک ہے روشن نہیں ہے۔ یہ سوالات فی نفسہٖ آج کے سائنس کے اصولوں پر غور و فکر کرنے والے دماغوں میں ضرور اُبھرتے ہیں۔ آج کے دماغ دن اور رات میں فرق و امتیاز کرنے کے لئے اس وقت تک تیار نہیں ہیں جب تک کہ ان کو عملاً ——— یا عقلی دلائل سے ثبوت نہ دیئے جائیں۔ بہرحال ان سوالات میں ضرور جان ہے جن سے میں گذرنا نہیں چاہتا ہے۔ آگے کی سطور میں ان سوالات کے جوابات پیش کروں گا۔ اس وقت بالکل غیر جانبدارانہ طور پر ان بڑے ادبی گروہوں کے اصل نظریات کو پیش کرتا ہوں جنہیں خود انہوں نے اپنی زبان و قلم سے پیش کیا ہے۔ پھر اس کے بعد ان مفکرین کی آراء ان کے بارے میں پیش کروں گا جو ان کے بارے میں رکھتے ہیں ——— دوسرے نظریۂ ادب ——— برائے ادب ——— کی تعریف ——— خود اس کے الفاظ کر رہے ہیں۔ ادب میں خوشنما حسین چیزوں کے تصورات قطعبند کرکے کرکے جو نفوس پروری ادیبوں نے کی ہے یا کرائی ہے وہ اگر ان آنکھوں کو اب نہیں دکھتی ہے تو زمین کے ذرات، آسمان کی خلقت ضرور دیکھ رہی ہے یاد دیکھ چکے ہیں۔ ادب میں یہ نکھا سکیلی رنگ، وہ عیش کے سامان، ہجر و وصال کی باتیں عشق کی گھاتیں۔ عاشق و معشوق کا اضطراب و بے چینی بیان کرنا ہی اصل خدمتِ ادب مانا جاتا تھا۔ یا مانا جاتا ہے "اسی یا" کے فتک کو بھی میں رفع کر دوں میں یہ کہتا ہوں کہ آج کوئی بھی ادیب نہیں جو اپنے کو اس تخیل کا پیرو یا حامی کہتا ہو۔ لیکن مجھے اس بات پر وثوق ہے کہ ابھی ادباء کے دماغوں میں یہ تخیل غیر شعوری طور پر موجود ہے اور وہ غیر شعوری طور پر برابر کبھی نہ کبھی ان کے ادب میں آتا بھی رہتا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ یہ نظریہ جلد درگور ہو جائے اور زیادہ تر یہ سمجھتے بھی ہیں کہ یہ تخیل فنا ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہے۔ بلکہ وہ ابھی موجود ہے اور اس کے موجود ہونے کی وجہ بھی معقول موجود ہے۔ ہمارے وہ اکابر شعراء جن کے دواوین جانِ ادب اور رُوحِ ادب مانے جاتے ہیں۔ وہ الف سے لیکر ی تک اسی تخیل سے بھرے پڑے ہیں تو پھر یہ رنگ اتنی جلد کس طرح جا سکتا ہے جبکہ وہ برابر دماغ پر لگایا جاتا رہتا ہے۔ یہاں میرا یہ مقصد بھی ہرگز نہیں ہے کہ ہمارے لئے ان شعراء کے وہ دواوین بیکار ہو چکے ہیں۔ ناقابلِ مطالعہ ہیں ——— ہاں یہ ضرور مطلب ہے کہ ان کو سامنے رکھکر اسلوبِ بیان، اندازِ بیان، الفاظ و محاوروں کے اُتار چڑھاؤ ان کی میٹھک اور جڑاؤ کے لئے ضرور ان سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ لیکن ان نظریات سے کنارہ کشی اختیار کی جائے جو ان کے اشعار میں پھیلے پڑے ہیں، وہ ہمارے لئے تب بھی بیکار تھے اور اب بھی بیکار ہیں، اور نہ وہ کبھی کارآمد یا مفید ثابت ہو سکیں گے ——— بہرحال ان وجیہتوں کی بناء پر میں "یا" ——— استعمال کرتا ہوں ——— اوپر میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ ادب کی اس قسم کے حامی ادیب شاذ ہی ہیں۔ لیکن "ادب برائے زندگی" کے قائل اور ماننے والوں کی بہتات ہے۔ مگر ہر ادب ایک پارٹی یا جماعت کے ساتھ زندگی کے متعلق علیحدہ علیحدہ نظریات رکھتے ہیں اسکے لحاظ سے ان کی تقسیم بھی ہے لیکن ہم یہاں مجموعی طور پر دو ہی قسم کے ادباء پر بحث کریں گے جو اس وقت پورے سنسار پر گھنگھور گھٹاؤں کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک اپنے نظریات کی تبلیغ و اشاعت میں کوشاں ہے۔ ان میں سے ایک گروہ کا نظریہ ——— MARXISM ہے اور دوسرے کا نظریہ CAPITALISM ——— آیئے اب ہم دونوں نظریات کا مطالعہ کریں۔

سرمایہ داری

یہ بیس کروڑ میل کے رقبہ میں ——— پھیلی ہوئی دنیا یہ پچیس ہزار میل کے محیط والی دنیا جو اپنے میں کروڑوں انسان و حیوانوں کو سمائے ہوئے ہے آج اس کی چھوٹے سے جزیرے کی حیثیت سے زیادہ نہ رہی۔ کون جانتا تھا کہ اتنی طویل دنیا اتنی مختصر ہو جائے گی۔ کسے معلوم تھا کہ اپنی چہار دیواری میں بیٹھکر دنیا کی خبروں کو سن سکیں گے مگر آج ان امور پر تعجب و حیرت کرنا بیوقوفی کا فعل قرار دیا جاتا ہے ——— کون جانتا تھا کہ ایک گھنٹہ کا کام ایک منٹ میں ہو جائے گا ——— لیکن آج اس کی حقیقت سے انکار کیا جائے تو اس کی کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔ یورپ میں ٹھیک ستر ہوئیں اور اٹھارہویں صدی کے زمانے میں ایک معاشی انقلاب ——— رونما ہوتا ہے، جسے INDUSTRIAL REVOLUTION کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ——— یا مشینی دور آتا ہے۔ اس دور کا کیا نتیجہ معاشی طور پر پیدا ہوتا ہے۔ وہ ظاہر ہے کہ ایک بہت بڑا طبقہ معاشی

اعتبار سے اپاہج بنکر بیٹھ جاتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جتنے بھی دولتمند لوگ تھے۔ انہوں نے آلات و مشینیں خرید کر صنعتوں پر اپنا قبضہ جما لیا۔ مزدور طبقہ۔ (جو ہمیشہ دولتمند طبقے سے زیادہ تعداد میں ہوتا ہے) کی زندگیوں کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اس کے ہنر کو خرید لیتا ہے۔ اس کی صناعی کو خرید لیتا ہے ایک مقررہ شرح RATE پر۔ اس شرح پر جو مزدور کی مقرر کی ہوئی نہیں ہوتی بلکہ اس کی خود کی متعین و مقرر کی ہوئی ہوتی ہے۔ ——— غریب و مزدور طبقہ مجبوراً ان کے ہر ——— RATE اور شرحوں کی کمی زیادتی کو قبول کرتے رہے اور قبول کرنا ان کے لئے ضروری تھا۔ اس طرح ایک طبقہ جو پہلے سے بھی متمول اور دولتمند تھا وہ اور متمول اور سرمایہ دار ——— CAPITALIST بن گیا۔ تمام وسائل زراس کے قبضہ میں آگئے۔ تمام حدود دولت اس کی ملکیت ہو گئے۔ اور ایک طبقہ جو پہلے بھی غریب اور تہی دست و مفلس تھا۔ اس کا افلاس اور بڑھ گیا۔ اس کی غربت میں اور اضافے ہو گئے۔ پہلے وہ اپنے ہنر کے ساتھ جسم و جان کا مالک تھا۔ مگر اب اس کے جسم جان بھی اس کی ملکیت سے نکل گئے۔

اس طرح اس نظام نے جنم لیا۔ مزدوروں کے خون سے انہی جیسے انسانوں کے خون سے پرورش پائی۔ اس نظام کے علمبردار حکومت کی مداخلت اس معاملہ میں کسی بھی حیثیت سے پسند نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح بھی ہو زر و دولت کے حصول کے لئے ذرائع و وسائل اختیار کئے جائیں۔ خواہ وہ ظلم پر مبنی ہوں یا انتہائی عیاری و چالاکی سے لدے ہوئے ——— بہرحال ظاہر ہے کہ یہ نظریات کسی طرح بھی زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتے تھے۔ ان کا پنپنا اور پھر یہ امید رکھنا کہ آئندہ بھی اسی طرح عروج حاصل رہے ناممکنات میں سے تھا ——— دن اور رات جوں جوں بڑھتے تھے توں توں مزدوروں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی ——— یہاں تک کہ مزدوروں کے دماغوں میں سرمایہ داروں کے خلاف بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اور سرمایہ داری کا ردِ عمل کے طور پر ایک نظریہ جگہ لینے لگا۔ جسے ہم آج اشتراکیت یا COMMUNISM کہتے ہیں۔

اشتراکیت

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اشتراکیت سرمایہ داری CAPITALISM کا ہی ردِ عمل ہے۔ اسی کا پیدا کیا ہوا ایک نظریہ ہے۔ سب سے پہلے اس نظریہ کا بانی (ROBERT OWEN) رابرٹ اون تھا۔ جو خود بھی اگرچہ "CAPITALIST" طبقہ سے تعلق رکھتا تھا مگر اس کے دل میں انسانیت کا درد پایا جاتا تھا جس نے اسے مزدوروں کی ہمدردی کے لئے ابھارا چنانچہ اس نے مزدوروں کے ساتھ خود اپنے کارخانوں میں اشتراکیت برتی جن میں بڑی حد تک وہ کامیاب بھی ہوا لیکن کن اصولوں کے ماتحت اس نے اس کے مزدوروں کے اشتراکیت کا رویہ اختیار کیا اس کی تفصیلات کا علم زیادہ نہیں ہو سکا۔ لیکن بہرحال اس کا نام اشتراکیت کے اولین حامیوں میں ضرور لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اسی نظریئے کو فرانس میں سینٹ سائمن ——— اور فوریر ——— FOURIER نے بھی پھیلایا مگر انہوں نے جو اشتراکیت کی تبلیغ و پرچار کی وہ محض نظری حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن اس دور میں دو ایک حامیانِ اشتراکیت نے ممتاز حیثیت بھی حاصل کی جن میں خاص طور سے ——— LOUIS BLANK کی شخصیت اہم ہے۔ جس نے فرانس کے ۱۸۴۸ء کے انقلاب میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے جس کے نتیجے میں لوئی فلپس کو تخت سے بھاگنا پڑا ——— لوئیس بلانک نے جن اصولوں پر کام کیا وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ حکومت سے مزدوروں کے لئے زیادہ سے زیادہ کام فراہم کیا جائے اور اس کی شرح اجرت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرائے جائیں۔ چنانچہ اسی مقصد کی خاطر اس نے ایک کارخانہ بھی قائم کرنے کا ارادہ کیا لیکن کام کرنے کے لئے مزدوروں کی بڑی تعداد میں درخواستیں آئیں جن کی یک دم تکمیل ہونا مشکل تھا اس لئے وہ اپنے اس ارادے سے مجبوراً باز رہا ———

انہی دنوں میں مارکس اور انجلس کے دماغوں نے ایک کمیونسٹ منشور مرتب کیا ——— اور ۱۸۶۴ء میں کارل مارکس کی رہنمائی میں پہلی انٹرنیشنل کانفرنس قائم ہوئی جس کے ماتحت یورپ کے مختلف ممالک میں اشتراکی تحریک کی تنظیم اور کام شروع کر دیا گیا ——— اور ان اس پارٹی کے خلاف متعدد پارٹیاں آئیں SOCIAL DEMOCRATIC LASSALE کی پارٹی خاص طور پر اہم ہے۔ بہرحال جزئیات سے میں قطع نظر کرتا ہوں ——— یہ ضرور تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کے جنم سے یورپ کے ممالک میں تہلکہ مچ گیا۔ چنانچہ اسی پارٹی نے روس کے سرمایہ دارانہ نظام کو غالباً مارچ ۱۹۱۷ء میں زار نکولاس دوم کے تخت سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور اشتراکی گورنمنٹ قائم کی۔ اشتراکیت کی پوری THEORY جس پر کہ اشتراکیت کی ساکھ رکھی گئی ہے اب آپ کے سامنے بخوبی آچکی ہوگی کہ اس کی پوری تھیوری ECOMOMIC PROBLEM OF MAN کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اور اس کے حصول ——— کے لئے جو نظریہ اور اصول یہ تحریک رکھتی ہے وہ بھی آپ کی سمجھ میں آچکا ہے کہ تشدد اور

طبقاتی کشمکش اور تنازعات کا حل اس کے پاس روٹی ہے ——— آیئے اب ذرا اس تحریک کے نظریات و اصولوں پر بھی انہی کے حامیوں کی زبانی سن لیجئے۔

نظام انسانی میں سب سے بڑا دخل مذہب و اخلاق معاشرت و معیشت ہی کا ہے اس لئے یہاں اسی سے متعلق چند اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔

مشہور اشتراکی اخبار (PRAUDA) میں اب سے کچھ سال قبل ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کو جریدہ ترجمان اتوان نے اپنی اشاعت میں جوں کا توں شائع کیا تھا جس میں درج تھا۔

" محبت کے معاملے میں ہمارے نوجوان چند خاص اصول رکھتے ہیں اور ان سب اصولوں کی تہہ میں یہ تخیل کارفرما ہے کہ جس قدر زیادہ تم حد کو پہنچنے میں کامیاب ہو گئے یا بالفاظ دیگر جس قدر زیادہ تم حیوانیت کے قریب ہو گئے اسی قدر زیادہ تم اشتراکی ہو گئے۔ لیبر فیکلٹی کا ہر ممبر ہر طالب علم خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اس بات کو اصول متعارفہ میں شمار کرتا ہے کہ محبت کے معاملات میں جہاں تک ممکن ہو اس کو اپنے اوپر کوئی قید عائد نہیں کرنی چاہئے۔ اس طرح کے اصول متعارفہ میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ ہر لڑکی جو لیبر فیکلٹی میں داخل ہے اس پر یہ لازم ہے کہ جب اس کے نوجوان ساتھیوں سے کسی کی نذر انتخاب اس پر پڑے تو وہ بلا تامل و تحجب وہ اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دے۔"

" A.B.C. OF COMMUNISM " (مصنفہ BUHAREN PREOBRAZUENSKY

کے باب ۸۹ میں لکھا ہے۔

" اشتراکیت کے نام لیواؤں کا اولین فرض ہے کہ مارکس کے اس قول کو کہ مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے۔ عام جماعتوں کے ذہن نشین کرا دیں، اور انہیں یقین دلا دیں کہ از منہ گذشتہ میں کیا اور دور حاضرہ میں کیا متمرد اور سرکش انسانوں کے ہاتھ میں مذہب ہمیشہ ایک ایسا حربہ ہے جس کے ذریعہ دنیا میں عدم مساوات جماعتی تفرقہ اور غضب و استبداد کو روا رکھا جاتا ہے۔ اور جس کے نام سے مزدوروں کی جماعت سے سرمایہ کے دیوتا کی پوجا کرائی جاتی ہے۔ ..... مذہب اور اشتراکیت علمی اور نظری ہر دو حیثیتوں سے بالکل متضاد و متباین ہیں۔"

صفحہ ۲۵۷ پر لکھا ہے کہ۔

" جو اشتراکی اپنے مذہبی عقیدے کو بھی ساتھ ساتھ رکھتا ہے۔ اسے اشتراکیت سے کچھ واسطہ نہیں۔"

لینن اور گاندھی کا مصنف زین خلاپ میلر نے لکھا ہے کہ۔

" لینن نے بارہا اپنی تقریر و تحریر میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اشتراکین کے عوام و خواص کا نصب العین حیات ہی یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہر ممکن کوشش صرف کر دیں کہ خدا سے اس کا غلبہ و تسلط حکومت و حکومت چھن جائے کیونکہ اشتراکی نظام کا بدترین دشمن خدا کا وجود ہے۔"

"مذہب اور روس" فی نفسہ روس کی تائید میں ہی لکھی گئی ہے اس کا مصنف جیولیس۔ ایف۔ میکر نے فخریہ انداز میں لکھا ہے کہ

" بالشویک کٹر مادہ پرست اور دہریئے ہیں۔ مذہب ان کے نزدیک دور جہالت کی قلبی گمراہی کا نام ہے۔ یا ایک دریئے یا افیون ہے اور کلیسیا ان کے نزدیک اقتدار پسند جماعتوں کا ایک ڈھونگ ہے جو زبردست انسانوں کے تذلل اور تعبد کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک اشتراکیت کی تہذیب جدید میں مذہب کے لئے کوئی گنجائش نہیں ——— اور اشتراکیین اپنی جماعت کے اراکین سے ہی اس ہر یت کا اقرار نہیں لیتے بلکہ غیر اشتراکیین میں بھی ان عقائد کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ اور آنے والی نسلوں کے افراد کے نصاب تعلیم کی اس انداز سے تشکیل کرتے ہیں کہ وہ خود بخود ایسے لامذہبی معتقدات کو ذہن میں لئے ہوئے آگے بڑھیں۔"

ان ہے UNION OF GODLESS

"ان کے نزدیک زندگی صرف اسی دنیا کی ہے اس کے بعد پھر وہ کسی اخروی زندگی کے قائل نہیں۔ ان خیالات کی تشدد اشاعت کے لئے ان کی سوسائٹیاں قائم ہیں۔ جنہیں ——— UNION OF GODLESS کہا جاتا ہے یا منکرین خدا کی جماعت، ان پارٹیوں کو اشتراکی پارٹی کی پوری پوری حمایت و امداد حاصل ہے۔"

اسی جماعت کے صدر ——— YAROSLAVSKY
کی تقریر کے اقتباسات بہت سے اخبارات میں شائع ہوئے تھے جن میں اس نے اپنی انجمن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"چونکہ خدا کے خلاف پروپیگنڈہ سست پڑ گیا اس لئے خطرہ ہے کہ مذہب کا شگوفہ پھر نہ پھوٹ نکلے لہذا ضرورت ہے کہ پروپیگنڈہ انتہائی شدّ و مد سے کیا جائے۔"

(HINDUSTAN TIMES 13.4.34)
(LEADER ——— 16.4.34)

"سوسائٹی کسی ایسے نظام اخلاق کو نہیں مانتی جس کی محرک انسانی معاشرہ سے باہر کوئی مافوق الفطرت طاقت ہے اشتراکیت کے نزدیک ایسا نظام فکر و اخلاق محض فریب اور دھوکہ ہے ———" (چراغ راہ جلد ۷)

اس قسم کے اور بھی اقتباسات ——— دیئے جا سکتے ہیں مگر طوالت کی خاطر اسے چھوڑ کر اب ان حضرات مفکرین کی آراء پیش کرتا ہوں جو آپ کی نظر میں اور سب کی نظر میں اچھی عقل و ہوش، اور غور و فکر کے مالک ہیں اور تھے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے کوئی ناواقف ہے۔ انہوں نے ہر پانی میں غوطہ لگا کر دیکھا ہے۔ ہر رنگ دیکھا ہے۔ ہر جگہ کا پانی پیا ہے۔ وہ بالآخر مارکس کے نظریات و اصولوں کا، اشتراکیت کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

تیری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش یزو کجدار کی نمائش
جہان مغرب کے تبکدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہے عقل عیار کی نمائش

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جن کا جدید و قدیم کے مطالعہ میں اس وقت بڑی پوزیشن ہے۔ انہوں نے ملتان جیل کی نظربندی کے زمانے میں ایک مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ جس میں مولانا نے غیر جانبدارانہ حیثیت سے موجودہ اشتراکی حکومت کا اور اشتراکی اصول و نظریات کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے فوائد و نقصانات شمار کئے ہیں، اصل پوزیشن کو CLEAR کر کے اپنی رائے تحریر فرمائی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے روس کی آہنی دیوار گرا کے وہاں کے بسنے والوں کے قریب بیٹھکر آئے ہیں وہاں کے دردانگیز حالات کا پردہ فاش کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:۔

"یہ ہے وہ قیمت جو روٹی اور بر وقت دستگیری کے لئے اشتراکی روس کے باشندوں کو ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ کیا واقعی اس قیمت پر یہ سودا سستا ہے؟ بلاشبہ ایک فاقہ کش آدمی بسا اوقات بھوک کی شدت سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ وہ جیل کی زندگی کو اپنی مصیبت بھری آزادی پر ترجیح دینے لگتا ہے صرف اس لئے کہ وہاں کم از کم دو وقت کی روٹی، تن ڈھانکنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو جگہ تو نصیب ہو گی۔ مگر کیا اب پوری نوع انسانی کے لئے فی الواقع یہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ اسے روٹی اور آزادی دونوں میں ایک ساتھ نہیں مل سکتیں؟ کیا روٹی ملنے کی اب یہی ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ سارے روئے زمین میں ایک جیل خانہ ہو اور چند کامریڈس اس کے جیلر اور داروغہ ہوں۔"

(تفصیل کے لئے دیکھئے
"سرمایہ داری اور اشتراکیت")

یہ طے ہے کہ اشتراکیت سرتاپا مادیت محض ہے شروع سے لیکر آخر تک اس میں روحانیت و اخلاقیت کی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ یہ محض ایک اقتصادی نظریہ ہے لیکن ایسا نظریہ جو انسانی زندگی کے کل اجزاء کو اقتصادیات میں جذب کر دیتا ہے۔ اس کی ابتدا بھی پیٹ سے ہی ہوتی ہے اور انتہا بھی پیٹ پر۔ غرض اس کی بنیاد محض جذبۂ شکم پرستی اور خواہش تن پروری پر قائم ہے ——— اور دیکھا جائے تو جن اصولوں پر یہ پوری تحریک کھڑی کی گئی ہے ان کی حیثیت سے یہ کوئی عالمگیر تحریک نہیں ہے بلکہ حالات دیسی اور خاص طور سے مغرب کے نفسیاتی اور اخلاقی مزاج کا ناگزیر نتیجہ ہے بہرحال اب اس پر میں خود کوئی رائے یا تنقید ابھی نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ ہمارے بحث میں آنے والے موضوع کے نظریئے سے پوری پوری طرح آپ کو متعارف کرا دینا چاہتا ہوں۔ اور پیش کئے اقتباسات کے بعد ہمرقند و بخارا جس طرح حاصل کیا گیا ہے اس کی خونی داستان کے چند پہلوؤں کو اجاگر کرنا بھی خالی از فائدہ نہ ہو گا۔ کیونکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اشتراکیت کے اس حربہ کو استعمال ہوتے بھی دیکھنے کی تمنا آپ کے دل میں ضرور ہو گی کہ یہ اپنے روسے میدان جنگ میں کس طرح رکھتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد اشتراکیت کے بہت سے پہلوؤں کو آپ پر اچھی طرح اجاگر کرنا ہی مقصود ہے۔ کاش کہ آپ اس کے مطالعہ سے مجھے "بورژوا" کا گمان نہ کریں۔

۔ بخارا جو مسلمانوں کا خاص مرکز تھا ادھر کمیونسٹوں نے چڑھائی کرنے کا ارادہ کیا کیونکہ یہ خود بھی جانتے تھے کہ یہی وہ مقام ہے جو حقیقت میں ہمارے جانی دشمن ہے۔ چنانچہ اس کی تیاری کے لئے انہوں نے بہت سا روپیہ پیسہ خرچ کیا اور اس قسم کا پروپیگنڈا کیا کہ ہمارے ہاتھ میں حکومت آنے کے بعد ہم تمام اراضی اور دولت وغیرہ کو تم لوگوں میں مساویانہ حیثیت سے تقسیم کر دیں گے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہت سی زراعتی مشینیں کسانوں میں تقسیم کیں اور ان کو پھر کچھ پرچے چھپنے جس میں لکھا ہوتا تھا۔

"ہو وطن بھائیو! دلیر بنو! انصاف اور فوت تمہاری مدد کے لئے کھڑی ہے۔ خونی زار ملک عدم کو پہنچ چکا ہے۔ اس کے حواری اور خونخوار چیتے ملک بدر کر دیئے گئے۔ اب صرف کسانوں اور مزدوروں کی فوج ہے جو تمہاری ہر آواز پر لبیک کہنے کو ہر وقت تیار بیٹھی ہے۔ زندہ باد روس کے حریت پسند سپاہی زندہ باد۔ بخارا کی انقلابی فوج"

(صبح سمرقند صفحہ ۲۱ تا ۲۳)

اس قسم کا پروپیگنڈا کر کے ان لوگوں نے غریب کسانوں اور مزدوروں کے خیالات کو اپنی طرف مائل کیا اور جب فضاء کو ہموار کر لیا تو بڑی آب و تاب کے ساتھ بخارا پر حملہ کر دیا۔ توپوں۔ رائفلوں اور سنگینوں کی خونخوار گولیاں نکلتی تھیں اور ساری فضا میں کہرام مچا دیتی تھیں۔ ہزاروں اللہ کے نیک بندوں کی جانیں تلف ہوئیں اور بڑی تگ و دو کے بعد بخارا کا کچھ حصہ ملا۔ ابھی پورا بخارا ان کو نہیں ملا تھا۔ مسلمان ایک آہنی قسم کی دیوار کے پیچھے محفوظ تھے۔ جو انہوں نے خطرے سے بچنے کے لئے پہلے سے تیار کر رکھی تھی مسلسل دو دن تک سخت مقابلہ ہوا کئی بار تو ان لوگوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ ہر بار وہ لاکھوں کمیونسٹوں کی جانیں گئیں۔ ادھر دونوں طرف ایک دوسرے پر جنونی وار حملہ کر رہا تھا کمیونسٹ بڑے زور شور سے چیختے چلاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے انقلاب اور زندہ باد سے ساری فضا میں کہرام مچا رہے تھے اور ادھر سے تکبیر اور مولوی ایک ہاتھ میں قرآن پاک اور ایک ہاتھ میں تلوار لئے ہوئے اللہ اکبر کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ لیکن بالآخر اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے مسلمانوں میں سے گروہ کے گروہ ان سے مل گئے۔ اور اس جگہ پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔ اب سارے بخارا پر سرخ پرچم لہرا رہا تھا۔ اب وہ مزدور اور کسان جنہیں یہ کہکر اپنے ہمراہ لائے تھے کہ وہ تمام حاصل کردہ دولت کو ان میں تقسیم کریں گے اور زمین الاٹ کریں گے لیکن ان کی یہ آرزو شرمندۂ تعبیر ہو کر نکلی۔

اب سارے بخارا پر فرعونیت چھا گئی تھی ذرا کہیں بغاوت کے شعلے اٹھتے انہیں وہیں ختم کر دیا جاتا۔ اس زمانے کا مورخ لکھتا ہے۔

"کسانوں اور مزدوروں کا وہ طبقہ جو انقلابیوں کے ساتھ مل کر انقلاب لایا۔ اس بات کا خواہاں تھا کہ زمین کی تقسیم کے وہ خواب جو بالشویکیوں نے انھیں دکھلائے تھے پورے ہوں۔ لیکن یہ خیال حقیقت کا جامہ نہ پہن سکا۔" بہت سی مساعی ناکام رہیں ——— عوام ایک ایسا زرعی انقلاب دیکھنے کے لئے تڑپ رہے تھے جس میں تمام زمینوں کو غریب طبقہ میں بانٹ دیا جاتا۔ اشتراکیت کے خواب کی یہی تعبیر ان کے لئے باعث اطمینان ہو سکتی تھی۔ لیکن انقلاب کی پیچیدہ صورت حالات اور انقلابی لیڈروں کی کم فہمی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے اس خیال کو بالکل ترک کر دیا گیا۔"

(صبح سمرقند صفحہ ۳۲)

یہ حالت دیکھکر بہت سے انقلابیوں کے دلوں میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ لیکن ان میں کوئی ایسا نہیں تھا جو کہ سامنے آکر اس نظریہ کی تذلیل کرتا۔ ——— یہ محض اس لئے کہ ان کے ایمان بہت ہی ضعیف ہو چکے تھے۔ اور ان کی وہ ایمانی قوت زائل ہو چکی تھی ——— غرض روز بروز اشتراکی حکومت کے جوہر سامنے آتے گئے۔ کیونکہ یہ درحقیقت محض فریب اور دھوکہ تھا۔ ان کا مطلب اشتراکیت سے دولت وغیرہ کا اشتراک مقصود نہیں تھا۔ بلکہ اپنی جابرانہ حکومت مقصود تھا ——— کچھ ہی عرصہ میں سب مسلمانوں کے رگ و ریشہ میں لینن و مارکس کی خدائیت چھا گئی۔ چنانچہ انور پاشا جو ان سے بغاوت کر کے نکل بھاگے تھے۔ اور باقاعدگی سے ان کے خلاف ایک محاذ بھی قائم کر لیا تھا جنہوں کے ساتھ ہزہ مسلمان ہو گیا تھا جن میں ایمان کی قوت ذرہ برابر بھی باقی رہ گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایک دو مقامات بھی اشتراکیوں کے قبضہ سے نکال لئے۔ اس سلسلے میں ان کو بخارا سے کوئی ان کے کمیونسٹ دوست خط لکھتے ہیں جس کا انور پاشا جواب دیتے ہیں۔ وہ نقل کیا جاتا ہے۔

"ہمارا سلام قبول ہو۔ خدا کے فضل و کرم سے ہم خیریت سے ہیں آپ کا بے حد خلوص آپ کی عنایت کا شکریہ اپنے خط میں آپ نے تحریر کیا ہے آغاز تحریک سے آپ نے

انقلاب بخارا کے لئے تمام مساعی وقف کردی تھیں۔ اور عین اس وقت جبکہ ہم آپ کو اس خدمت کے صلے میں ایک بہت بڑا فوجی عہدہ پیش کرنے والے تھے کہ آپ غیر ذمہ دار لوگوں کے جتھے کے پیچھے چڑھ گئے اور ہمیں چھوڑ گئے۔ پھر لوٹ آئے آپ کی خطائیں معاف کردی جائیں گی۔" آپ کی ایسی نظر عنایت واقعی حیرت کن ہے لیکن ہمیں بتایئے کیا آپ لوگ ہی نہ تھے جنہوں نے روس کے بالشویکوں کی مدد سے سرزمین بخارا کو تاخت کیا۔ بیگناہ انسانوں کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ اور ان کے ہاتھوں بچا کھچا مال و متاع بھی چھین لیا؟ کیا یہ آپ ہی نہ تھے جنہوں نے ہمارے مقدس مقامات۔ مسجدیں اور مدرسے اپنے پاؤں تلے روند ڈالے اور ہمارے مفلس لوگوں کو بورژوا اور جاگیردار پکار کر ان کی زندگیاں اور جائدادیں لوٹ لیں؟ اور کیا یہ آپ ہی نہ تھے جنہوں نے اپنے دین کو ترک کیا اور بالشوزم اور کمیونزم کو قبول کیا؟ محض روٹی کے ٹکڑے کے لئے تم نے طعون روسیوں کے ہاتھوں اپنا دین و ایمان اور اپنا ضمیر فروخت کردیا تم آزادی و حریت کے پرچم لہراتے ہوئے آئے اور بخارا کی فصیلوں پر چڑھ گئے۔ اب بتاؤ وہ آزادی کہاں ہے؟ بخارا پر ادبار اور ہلاکت کی گھٹائیں چھا رہی ہیں اس حقیقت حال کو دیکھکر عثمان خدیو جو تمہاری مجلس عاملہ کا صدر اور انقلاب کی ناؤ کا ناخدا تھا منقلب ہوگیا۔ وہ اس جھوٹے جوئے کو اپنی گردن پر اٹھانے کیلئے تیار نہ تھا۔ میں جو کہ اپنی مادر وطن کا فرزند ہوں ملک کی ترقی اور مفاد کے لئے لڑتا رہا ہوں اور آئندہ بھی لڑوں گا حتیٰ کہ روسی بالشویکوں اور تمہارے جیسے غداروں سے وطن کی مقدس سرزمین کو پاک کردوں۔

بخارائے عظیم کا ایک فرزند بھی جو اپنی قوم کا صحیح بہی خواہ ہے تمہارے مکروہ خیالات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

آج ہماری آنکھیں بخارا کے ڈیڑھ لاکھ انسانوں کو شہر پناہوں کے اندر اور پہاڑوں کی وادیوں میں اپنی شمشیریں جھنکارتے اور دشمنان ملت سے نبرد آزما ہوتے دیکھ رہی ہیں۔ اے کمیونسٹو! ہم اپنے ملک کے سچے فرزندوں کے پہلو بہ پہلو لڑیں گے۔ حریت اور ترقی کیلئے ہم بھرتی کے سپاہی نہیں بلکہ صحیح معنوں میں خدام قوم ہوئے ہیں۔ ہم اپنے ملک کو عنقریب روس سے گلو خلاصی دلانے والے ہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے ہمارا مسلک اور عقیدہ سچا ہے۔ اور ہمارا نصب العین خالص ہے اطراف اور بلاد سے اس وقت مسلمان تمہارے

ہو ہو کر ہماری طرف آرہے ہیں۔ تاکہ اسلام اور مسلمانوں کو اس ملحدانہ فضاء سے نجات دلائی جائے . . . . . اگر تم اسلام کے سپاہی بننا چاہتے ہو تو ان روسیوں کو مادر وطن سے نکالنے میں ہمارا ساتھ دو۔ بس یہی ہماری خواہش ہے۔"

(صبح سمرقند صفحہ ۴۰)

یہ خط اس وقت کے کمیونسٹوں کی اور مسلمانوں کے نظریات کی پوری پوری عکاسی کرتا ہے۔ چنانچہ وجہ بخارا کو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جانے کی ہوئی وجہ یہی تھی کہ مسلمانوں کے پاس سے خدا کی وحدانیت اور اس کے خوف اور ساری قوت ایمانی زائل ہو چکی تھی۔

چنانچہ جب کمیونسٹ ملحدوں کی ایک ایک حقیقت کھلنا شروع ہوئی تو اب ان لوگوں کو بڑی فکر ہوئی اور انہوں نے فوراً ملّا اور مولویوں کو خرید نا شروع کیا اور ان سے اسلام کی تذلیل اور اشتراکیت کی تبلیغ کرائی۔ اسی طرح عورتوں کو خریدا گیا۔ انہوں نے بھی پردہ ختم کیا اور اسی قسم کی تبلیغ کرنا شروع کردی۔ چنانچہ اس زمانے کا ایک مشہور شاعر منوّر شو اپنی مشہور نظم خطاب بہ سول" میں کہتا ہے۔

تم کہتے تھے تاج نہیں گرینگے	تم کہتے تھے مسجدیں خالی نہ ہونگی
وہ گر گئے	اسلام ہمیشہ حکمراں رہیگا
تم کہتے تھے تخت نہیں ہلینگے	بمشکل !
وہ ہل گئے	(صبح سمرقند صفحہ ۸۲)
تم کہتے تھے قرآن کے الفاظ ابدی ہیں	ایک اور شاعر کہتا ہے۔
ہماری عورتیں بے پردہ ہونگی	یہاں کسی ملّا امیر نواب کیلئے کوئی جگہ
وہ بے پردہ ہوگئیں	نہیں۔

ہمیں کوئی خداوند انہیں چاہئے اور نہ اس کے کسی گماشتے کی زمین کے کسی حصّہ کو ضرورت ہے۔ (صفحہ ۵۳ ص) (صبح سمرقند صفحہ ۸۲)

یہ تو صرف بخارا کی تاریخ کا منظر تھا جس سے اشتراکیت کا حقیقی منظر سامنے آتا ہے۔ اسی قسم کا جال آج روس میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ جس کو آج ہر ایک "روس کو فردوس" سمجھے بیٹھا ہے جو اشتراکیت اور جمہوریت کا قائل ہے۔ آج سب سے زیادہ وہیں آدمی آدمی کا جانی دشمن بنا ہوا ہے۔ وہاں کی جابرانہ حکومت کی خبریں جب یہاں تک آجاتی ہیں تو ان کو سنکر دل دہل جاتے ہیں۔ وہاں انسان بالکل قفس میں مقید ہے۔ جہاں اگر کوئی ذرا اس پر نکتہ چینی کرتا ہے تو اسے گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے۔

یہ ہے وہ اشتراکیت جس کی حمایت میں ہمارے نوجوان ادیب بہہ رہے ہیں۔

محمد عثمان رمز (مشرقی پاکستان)

نوح اور نوح اسکول

یہ اگرچہ ہے کہ مجھ کو عشق کرنا آگیا
تو سمجھ لو روز جینا روز مرنا آگیا
ہم یہ کہتے ہیں کہ ٹھہر و رات ابھی گذری نہیں
وہ یہ کہتے ہیں کہ جانے دو سویرا ہوگیا
اب حیا پر وہ رنگا ہیں مجھ سے اٹھ کر مل چکیں
سر جھکا کر کہہ دیا اس نے کہ شرماتا ہوں میں
عشق ان سے کر کے غم سہنے کے قابل ہوگیا
پہلے دل ہی دل تھا اب دل جان گیا دل ہوگیا

یہ اشعار نوح صاحب کے ہیں۔ ان کا اسلوب بیان "انداز بیان" "طریقہ اظہار خیالات" اور الفاظ کی تنظیم کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔ دوسرے شعر کو پڑھتے ہی داغ صاحب کی شوخی بھی یاد آجاتی ہے۔ ان خوبیوں کے علاوہ ان کے کلام سے یہ بھی واضح ہے کہ وہ سہل ممتنع کے پرستار ہیں۔ استاد نوح الفاظ کی ترتیب ان کی بندش اور الٹ پھیر کے لحاظ سے ایک منفرد شاعرانہ شخصیت کے قائل ہیں۔ ان کے کلام کی ان خوبیوں کے انہیں پرانے نداق والے طبقہ میں ـــــ "ادب برائے ادب" کے ماننے اور اس نظریہ کو سراہنے والوں میں ـــــ ایک عام شہرت بخشی ہے۔ "ادب برائے زندگی" کے نظریہ کے ماننے والے بھی ان سے بے خبر نہیں ہیں۔ اسی کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دنیائے شعر و سخن میں ان سے کوئی ناواقف نہیں ہے۔

مگر جہاں یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ استاد نوح سے دنیائے شعر و سخن ناواقف نہیں وہیں یہ بھی ایک بھرپور سچائی ہے کہ "ادب برائے زندگی" کے روز افزوں میلان سے ان کی شاعری بالکل غیر متاثر رہی۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد دلی کے چند شعراء نے دلی کی بربادی کا جا کہ کسی نہ کسی زاویئے سے ہمارے سامنے پیش کیا۔ بالخصوص غالب نے دلی کے ویرانوں کی ایک متحرک اور بولتی ہوئی تصویر کھینچی ہے مگر میں نوح صاحب کے حلقۂ شاگردان میں تقریباً تین سال تک رہا۔ لیکن ان پر غیر منقسم ہندوستان کے حالات پھر ہندوستان اور پاکستان کے نت نئے ڈراموں کا کوئی اثر نہ دیکھا۔

دوسروں کے لئے تو یہ ایک متحیر کن رویہ ہو سکتا ہے مگر میں جہاں تک ان کی نفسیات کو ٹٹول سکا ہوں اس کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کا یہ رویہ متحیر کن نہیں بلکہ اگر وہ اس سے ہٹ کر کوئی دوسری روش اختیار کرتے تو یقیناً وہ متعجب کن ہوتا۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک دنیا کے تغیرات محل نظر ہیں اور [illegible] بے معنی ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ نہ تو نئی دنیا ہوتی ہے اور نہ نئی [illegible] ان کے یہاں نہ تو غالب کی شعوریت آرائش جمال [illegible] کن نیکوں ہے بلکہ سب کچھ اس کے برعکس ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

تغیر لفظ مہمل، انقلاب اک بحث بے معنی
نئی دنیا نہیں ہوتی نیا عالم نہیں ہوتا

زندگی ان کے یہاں بحر بیکراں نہیں بلکہ ایک چھوٹی سی کہانی ہے جس کا عنوان عشق ہے۔ اس کی ابتدا حسن اور تلاش حسن سے ہوتی ہے اور اس کا اختتام عشق اور ناکامی عشق پر ہوتا ہے۔ محبت [illegible] کہانی کا محور ہے۔ اس کی پوری شاعری اسی کی آئینہ دار ہے۔

اگر اس سے کبھی انہیں فرصت ملی تو کسی کی [illegible] شاعرانہ رویہ کسی بیاہ شادی کے موقع پر کوئی نظم کہہ دی یا پھر کسی کی سالگرہ کے موقع پر کوئی قطعہ نظم کر دیا۔ البتہ ان کی یہ قلمی خدمات [illegible] ہیں۔ جو انہیں پرانے قصیدہ گو شعراء کے زمرہ سے ممیز کرتی ہیں۔

ان مرقومۂ بالا سطروں سے یہ تو مترشح ہے کہ استاد نوح پرانے ڈگر کے چلنے والوں میں سے ہیں مگر آپ شاید اس کے اسباب تلاش کریں۔ میری سمجھ میں اس کے چار اسباب ہو سکتے ہیں۔

ان سے پہلا سبب تو یہ ہے کہ استاد نوح یوں تو ایک متمول زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ ہیں مگر والد کے جلد انتقال کر جانے کی وجہ سے انہیں مغربی تعلیم نہ مل سکی۔ ان کی سوانح حیات سے اس کا تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے بچپن میں انگریزی کی ابتدائی تعلیم شروع کر دی تھی مگر اس نمونہ کی سائنس کر بعد وہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔

اور ان کی تعلیمی استعداد محض اُردو۔ فارسی تک محدود ہو کر رہ گئی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بچپن سے لیکر اس وقت تک ان کی زندگی جس ماحول میں گذرتی رہی ہے وہ سرمایہ دارانہ طبقہ رہا جہاں اکثر و بیشتر حسن و عشق کے چرچے ہوا کرتے ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ انہوں نے استاد داغ جیسے شاعر سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ ہر لحاظ سے ان کا اتباع کیا۔ سیدھے اسی راستے پر چل پڑے جس پر داغ صاحب چل رہے تھے۔ استاد داغ نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا اثر اس لئے نہ لیا کہ وہ ان کی افتادِ طبع کے خلاف تھا۔ استاد نوح نے مروجہ نظامِ زندگی کے خلاف کوئی باغیانہ قدم اس لئے نہیں اٹھایا کہ وفادارِ رعیت کیلئے بغاوت حرام ہے ؎

وفاداری کا یہ کہنا ہے اے نوح
بغاوت سے خدا محفوظ رکھے

اور اس طرح استاد اور شاگرد کی شاہراہیں مل گئیں۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ استاد نوح نے ہر طرح کی تحریک سے اپنے کو علیحدہ رکھا۔ اور سیاست سے ہمیشہ گریز کیا۔ اس کی وجہ کوئی مقصدی اور مثالی زندگی نہیں بلکہ یہ ان کی فطرت کا عین تقاضا ہے جس سے وہ شاید مجبور رہے۔

اب سوال صرف اس کا رہ جاتا ہے کہ استاد نوح کی تخلیقات کو کس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے انہیں قومی اور ملکی فلسفوں کی روشنی میں نہیں دیکھا جا سکتا اس لئے کہ ان کا اس سے بھی کوئی دُور کا واسطہ نہیں۔

اگر ہم انہیں کسی کسوٹی پر کس کر دیکھ سکتے ہیں تو وہ اسلامی نظریۂ ادب ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ استاد نوح کو مسلمان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مگر ہمارا یہ رویہ استاد نوح کے لئے یقیناً باعثِ حیرت ہوگا۔ دوسروں کی طرح وہ بھی ہم سے یہ سوال کریں گے کہ "یہ اسلامی نظریۂ ادب کیا بلا ہے؟" میرا یہ خیال ہے کہ ان کے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ دنیا ایک دن ان کی تخلیقات کا جائزہ اس زاویۂ نظر سے لے سکے گی۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں، پرانے شعراء کی طرح وہ نہایت سنجیدگی سے یہ سمجھتے رہے کہ شاعری محض ذاتی تفریح اور تفنن کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ "ادب برائے ادب" ہونا چاہئے۔

استاد نوح کی تخلیقات کو اسلامی نظریۂ ادب کے زاویے سے دیکھنا تو محض ایک متحیر کن امکان ہے جو انہیں اور ان کے حلقہ سے ارادت کو ورطۂ حیرت میں ڈال سکتا ہے مگر اس کے علاوہ فی الحقیقت ہم انہیں جس کائنات دیکھ سکتے ہیں وہ ایک استاد فن کی حیثیت ہی ہو سکتی ہے۔

یوں تو میں نے اجمالاً چند سطریں ان کے طرزِ کلام کی بابت پہلے ہی رقم کی ہیں مگر ان کے بارے میں اگر میں یہ کہوں کہ استاد فن کی حیثیت سے کہ وہ ہندوستان پاکستان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تو شاید میرا یہ بیان مبنی بر مبالغہ نہ ہو۔ اس لئے کہ استاد داغ کے شاگردوں میں سائل۔ بیخود۔ اور احسن مارہروی تو چل بسے جو زندہ ہیں ان میں بیخود دہلوی۔ استاد نوح اور ڈاکٹر مبارک خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بیخود دہلوی اور ڈاکٹر مبارک صاحبان نے "فن" سے زیادہ "شاعری" پر زور دیا ہے۔ یا پھر ہم یہ کہیں کہ ان حضرات نے "زبان" سے زیادہ "مضامین" پر زور دیا۔

استاد داغ کے شاگردوں میں استاد نوح نے ہی "زبان" کے رنگ کو اپنایا اور اس طرح اپنایا کہ آج انہیں بجا طور پر یہ ناز ہے کہ دلّی کی زبان ان کے دم سے ہے۔ دیکھئے بیخود صاحب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کس فخریہ انداز میں وہ کہتے ہیں ؎

بیخود جو نہ ہوتے تو یہ کہنا تھا مناسب
اے نوح ترے دم سے ہے دلّی کی زباں آج

یہ استاد نوح کی ہستی ہے کہ انہوں نے اس دور میں جبکہ بہت سارے شعراء زبان کی توڑ پھوڑ میں دانستہ اور نادانستہ طور پر لگے ہوئے ہیں۔ اپنے اوپر متعدد قیود عائد کر لئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایطاء کی غلطی کو لے لیجئے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایطاءِ جلی۔ اور ایطاءِ خفی۔ بالعموم شعراء نے ایطاءِ خفی کو روا رکھا ہے اور بہت سے نئی پود کے خورد شعراء میں، ایسے ہیں کہ ایطاءِ جلی کی بھی پرواہ نہیں کرتے مگر نوح صاحب بہت ہی سختی سے احتراز کرتے ہیں۔ یا پھر یہ کہ وہ قوافی جن میں فارسی اور بھاشا دونوں کے الفاظ ہوں ان میں مطلع اس طرح کہا جائے کہ ایک مصرع میں فارسی کا قافیہ ہو تو دوسرے میں بھاشا کا۔ وہ تنافرِ لفظی سے بھی بچتے ہیں۔ اور رعایتِ لفظی کا بہت ہی خیال رکھتے ہیں۔

ہاں یہ نہیں کہ وہ قواعد و عروض کی پابندی کرتے ہیں اور فنی غلطیوں کو بچتے ہیں بلکہ وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو فنی پیچ ہی میں صرف کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ نئے قوافی اور نئی ردیفوں کی تلاش میں رہا کرتے ہیں۔ وہ طبع زاد زمینیں بھی پیدا کرتے ہیں۔ مگر جذبات کے اظہار اور وجدان کے مظاہرے کے لئے نہیں بلکہ فن کی نمائش کے لئے۔ نمونتاً مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

آزار و مصائب کا قصہ وہ کہہ نہ سکے ہم سن نہ سکے
پورا تو کہاں جزوی حصّہ وہ کہہ نہ سکے ہم سن نہ سکے
گلزارِ جہاں میں آئی خزاں پژمردہ غم ہر پتہ ہے
پھولوں کا مجھے افسوس نہیں کلیوں کا قلق البتہ ہے

ان کے کچھ اشعار جو میرے حافظہ میں محفوظ ہیں ملاحظہ فرمائیے ؎

عشق میں یہ اثرِ ہمتِ مردانہ سے ہے
جس کے دو پَر نکل آئے وہی پروانہ ہے
بھیگی ہوئی راتیں کہیں بیکار نہ جائیں
پھولوں کی طرح آپ بھی شبنم میں نہائیں
اللہ اللہ مشیت کا یہ بے لطف مذاق
اس کی حسرت ہے مجھے جو مری قسمت میں نہیں
گردِ غائب، نقشِ پا گم، بندِ آوازِ جرس
قافلے والے نہیں معلوم کس منزل میں ہیں

استاد نوح نے متعدد غزلیں ایک عجیب فنکارانہ اُپج کے ساتھ کہی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں زبان پر کتنی قدرت ہے ان سے یہ بھی خاہے کہ ان کی مثال ایک ماہر سنگ تراش کی سی ہے جو پتھر کے ایک بھدے ٹکڑے سے ایک حسین مجسمہ تیار کر لیتا ہے مگر اس میں جان نہیں ہوتی۔

مجھے استاد نوح کے یہاں روحِ شاعری کی کمی کا احساس اس لئے ہوتا ہے کہ "وہ حسن و عشق" کی دنیا کے سطحی مشاہدوں کو سادہ لفظوں میں پیش کر دیتے ہیں۔ وہ جذبات کی گہرائیوں میں نہیں ڈوبتے بلکہ اس کی اتھاہ گہرائیوں سے دامن بچا کر اپنے دماغ شاعری کا سہارا تلاش کرتے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ زمینداری ختم ہونے کے بعد بھی ان کے جذبات زندگی پر جو اثرات مرتب ہوئے ان کی شاعری میں نہیں ملتے۔

ان گذشتہ گرمی کی چھٹیوں میں عید الفطر کے بعد انھیں کی زبان سے کچھ اشعار سننے کا موقع ملا۔ جن میں غم کی ہلکی ہلکی جھلک تو نظر آئی مگر اس میں بھی وہ عمق اور گہرائی نہ ملی جو ہونی چاہئے۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں بس یہی آئی کہ فن کے قیود نے جذبات کو صحیح شکل اختیار کرنے سے روک دیا۔

مگر اس کے باوجود ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ وہ زبان جسے ولی، میر، ذوق اور داغ جیسے شعراء نے سنوارا ہے اسی وقت اپنے وجود کو قایم رکھ سکتی ہے جبکہ اس کے سنوارنے والوں کی طرف بقدرِ ضرورت توجہ کی جائے۔ اور یہ توجہ نوح صاحب کے توسل سے بھی ممکن ہے اس لئے کہ ہمارے سامنے وہ ایک زندہ مثال ہیں۔ ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ یہ شعراء اپنے اپنے ماحول اپنے اپنے زمانے اور اپنی اپنی فطرت اور تربیت فطرت کی پیداوار ہیں۔ اُن میں اور نئی پود کے شعراء میں بعد المشرقین ہی سہی مگر اُردو زبان کے بناؤ سنوار کا حق انہیں کو پہنچتا ہے۔

اگر آج کل کا مقصد پسند شاعر زبان کے معاملے میں بزعمِ خود کوئی توڑ پھوڑ، کاٹ چھانٹ اور تراش خراش کرتا ہے تو اس معاشی اور سیاسی بحرانی دور میں یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس پر کوئی گرفت تنقید نہ کی جائے مگر لوگ جب بھی سکون پائینگے تو اس پر ویسی ہی تنقیدیں کریں گے جیسی تنقیدیں وہ ان اساتذہ پر نظریات اور مقصدیت کے سلسلہ میں کرتا ہے۔

نوح اسکول جس وقت میں نوح اسکول کے افراد کے بارے میں کچھ سوچتا ہوں تو مجھے آبِ حیات کی مندرجۂ ذیل سطریں یاد آجاتی ہیں۔

"قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں۔ دیکھنا اہلِ مشاعرہ آن پہنچے۔ یہ کچھ اور لوگ ہیں . . . . (یہ) نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائینگے نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے۔"

استاد نوح کے شاگردوں کی تعداد پانچ چھ سو سے زیادہ ہی ہوگی۔ اور ان میں "ادب برائے ادب" دیا یوں کہئے کہ ادب برائے عشق و حسن، اور "ادب برائے زندگی" دونوں ہی کے ماننے والے ملتے ہیں۔ مگر معدودے چند کو چھوڑ کر باقی تمام شاگرد کوئی انفرادی شاعرانہ شخصیت نہیں رکھتے۔ وہ فی الحقیقت شاعری برائے مشاعرہ کرتے ہیں۔ اور "اہلِ مشاعرہ" کہے جانے کے لائق ہیں۔

یہ نہ تو ادب ہی کی خدمت کر رہے ہیں۔ اور نہ ہی زندگی کی اسلئے کہ یہ خالق افکار نہیں بلکہ افکار و مضامین ان تک ہو کر پہنچتے ہیں۔

متین طارق

زبان کی زبان

"ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں"

یہ ایک معمولی مصرع ہے مگر حقیقت بھی آپ ہی بتائیے آخر کس کے منہ میں زبان نہیں ہوتی۔ جانور۔ آدمی بھی زبان رکھتے ہیں البتہ بناوٹ ہیئت اور خصوصیات میں فرق ہے کچھ زبانیں لمبی ہوتی ہیں اور کچھ چھوٹی۔ بعض قینچی کی طرح چلتی ہیں اور بعض زبان ہوتے ہوئے بھی بے زبان بنی رہتی ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ اس کی جگہ اپنی زبان کاٹ کر منہ میں رکھ لی جائے اس لئے بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ بے زبانی اچھی نہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ نیازمند اپنے تجربہ کی بنا پر یہ کہنے پر مجبور رہے کہ زیادہ بولنا بھی کوئی مستحسن فعل نہیں جہاں دو بولنے سے دل کی دل میں رہ جاتی ہے۔ وہاں زیادہ بولنے سے بات کا وزن گھٹ بھی جاتا ہے۔

لیکن قطع نظر اس کے یہ دنیا ہے یہاں بہت سے لوگ ہیں جو زبان رکھتے ہوئے نہیں بولتے اور کچھ ہیں کہ ایک زبان سے دس زبانوں کا کام لیتے ہیں۔ [illegible] کا کھانا ہے کہ آدمی بولنے والا جانور ہے اگر نہ بولے گا تو حیوان ناطق کے زمرہ سے نکل کر حیوان مطلق کی صف میں آجائے گا جو انتہائی گری ہوئی [illegible] دکھاتے پیتے اٹھتے بیٹھتے ہر وقت بولتے ہیں حتیٰ کہ [illegible] میں بھی بولتے ہیں خواہ دوسروں کو اچھا لگے یا برا انھیں بولنے سے کام۔

یہ زبان بھی ایسا جائے کہ زبان بولنے کے لئے ہے اور بولنا مقصدِ زندگی ہے مگر بلا ضرورت بولنا تو ایسا ہے جیسے خواہ مخواہ چورن کھایا جائے گو اس میں لذت بھی مگر اچھے بھلے پیٹ کے لئے دعوت ابتلا بھی ہے بالکل ایسے ہی بے وقت کہ بولنا بھی دخل در معقولات سے کم نہیں ہاں بولنے کی ضرورت تک بولنا اور جب رہنے کی حد تک چپ رہنا ہی وہ چیز تلا اصول ہے جس میں نقصان کو غیر بنانے کا بھی سب سے بڑا ذریعہ ہے محبت و نفرت اس کے ادنیٰ کھیل ہیں جو کل تک بیگانے تھے وہ آپ کی شیریں زبانی سے دوست ہو جائیں گے اور جن سے دانت کاٹی تھی وہ ذرا کی ذرا میں غیروں کے غیر بن جاتے ہیں۔ دوستی دشمنی سے بدل جاتی ہے اور دشمنی دوستی سے حتیٰ کہ بھائی بھائی میں اسی زبان کے کارن جدائی ہو جاتی ہے اور برسوں کے دشمنوں میں محبت کا مضبوط رشتہ قایم ہو جاتا ہے اسی لئے میٹھی بولی کی ہمیشہ تلقین کی گئی ہے ہندی کا مشہور دوہا ہے۔

ایسی بانی بولیئے من کا آپا کھوئے
اورن کو سیتل کرے آپہو سیتل ہوئے

یعنی تمھارے منہ سے ایسے لفظ نکلنے چاہئیں جن میں غرور کا رنگ نہ ہو یہ لفظ اوروں کا بھی دل ٹھنڈا کریں اور تمھارا بھی یہ ہمیشہ کا تجربہ بھی ہے کہ جہاں زبان میں مٹھاس ہوتی ہے وہاں شکر خوروں کا جمگھٹ رہتا ہے اور جہاں تندی ترشی ہوتی ہے اس جگہ سے ہر کوئی کترا تا ہے۔ پرانی مثال چلی آتی ہے کہ "زباں شیریں ملک گیری۔ زباں ٹیڑھی ملک بانکا" جس کا مطلب صاف ہے کہ بول چال میں خندگی پیدا کر کے بلا قیمت لوگوں کو غلام بنایا جا سکتا ہے اور ترش روئی ایسی تلوار ہے جس کا گھاؤ ہمیشہ گہرا ہوتا ہے۔ یونہی کہا گیا ہے کہ تلوار کا گھاؤ بھرنا آسان ہے مگر زبان کا گھاؤ بھرنا مشکل ہے۔ مجھے بہت سے ایسے واقعات معلوم ہیں۔ جہاں درشتی اور تلخ بیانی سے ایسی خلیجیں حائل ہو گئیں جو پھر بھری نہ جا سکیں نیز اس کے برخلاف شیریں زبانی سے کام لیکر بگڑے حالات کو دم کے دم میں بدل دیا گیا ویسے بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ جو دوکاندار اپنے گاہکوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے۔ اس کی دوکان نگارخانہ بنی رہتی ہے اور اس کے مقابلے میں جو دوکاندار تیزی لاتا ہے وہ الو بنا بیٹھا رہتا ہے بہت سے گھروں میں ناپسندیدہ گفتگو کے باعث ایک دائمی چقلش رہتی ہے۔ تو تو میں میں بڑھتے بڑھتے کہیں کی کہیں پہنچ جاتی ہے۔

اس قسم کی زبان درازی کی صرف شروع ہوتی ہے اول تو زبان پھر دراز یعنی کریلا اور نیم چڑھا ایسے موقعوں پر شامتِ اعمال کے ڈر سے تو دو گیارہ ہونا پڑتا

خدا جانے کب کسی کی زبان دراز ہوا در پگڑی سنبھالنے کی نوبت آجائے۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ سب سے اچھا یہ ہے کہ سامنے سے ہٹ جائے یا پھر دوسری ترکیب یہ ہے کہ چپ رہے اور بے زبانی سے کام لے۔

بے زبانی بذاتِ خود بھی ایک فن ہے کبھی کبھی لوگ اس سے زبان کا کام لیتے ہیں وہ سنتے ہیں اور بولتے نہیں یا بولتے ہیں تو پتہ نہیں چلتا مگر اُن کا مطلب سمجھ لیا جاتا ہے اور آپ سے آپ ہر کام پورا ہو جاتا ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ بے زبانی کے لئے مجبور ہوتے ہیں وہ بولنا چاہتے ہیں مگر نہیں بول سکتے۔ کچھ کہنا چاہتے ہیں نہیں کہہ سکتے۔ زبان ترستی ہے دل بیچین ہوتا ہے مگر آخر میں یہ کہہ کر چپ ہو جانا پڑتا ہے کہ ؎

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

کیونکہ ادھر زبان کھلی اور تسلم ہوئی ؎

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

اس لئے بیچاری دبی دبائی منہ میں پڑی رہتی ہے کہ کہیں سر اٹھاتے ہی بے بھاؤ کہ نہ پڑنے لگیں۔ ہاں گستاخ لوگوں کا کچھ کہنا نہیں بقول شخصے کہ اُن کا منہ تو حضرت یزداں میں بھی بند نہیں ہوتا۔

یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ہر پیشے کی زبان الگ الگ ہوتی ہے اُس کی خصوصیات اُس کی اصطلاحات اور لب و لہجہ دوسروں سے متمیز ہوگا ایک شہری کا اندازِ گفتگو ایک فوج کے سپاہی کے مقابلے میں سیدھا سادہ ہوتا ہے چور کی بہ نسبت معمولی آدمی زیادہ بھولے پن سے بات چیت کرتا ہے ظالم کی زبان میں سختی۔ کمزوری اور بیمت کے الفاظ ہوتے ہیں اس کے مقابلے میں مظلوم کے یہاں نرمی۔ عاجزی۔ انکساری پائی جاتی ہے۔ ایک فقیر منش آدمی سادگی۔ محبت اور ملاطفت کے ساتھ گفتگو کرتا ہے لیکن ایک سلطنت کے شہنشاہ کا اندازِ بیان حمایت پر تمکنت۔ رعب دار اور شائستگی ہوتا ہے اگر کہیں اس کے خلاف ہو یعنی شہنشاہ نے اپنے لب و لہجے میں رعب کے بدلے انکساری۔ تمکنت کی جگہ عاجزی پیدا کی تو اُس کا حکم بے وزن ہوگا۔ موقع پرست زبان کی نرمی سے فائدہ اٹھا کر من مانی کرنے پر اُتر آئیں گے۔ رعایا سرکش ہو جائے گی۔ اور افسران اپنے آپ کو شتر بے مہار کی طرح آزاد سمجھیں گے۔ جس کا نتیجہ خرابی کے سوا کچھ نہیں۔

اور ایسے ہی کہیں کسی فقیر کا طرزِ سخن متکبرانہ ہو تو لوگ اُس سے اجتناب کریں گے۔ اس پر بد مزاجی و بے اعتدالی کا فتویٰ لگائیں گے۔ چنانچہ لامحالہ ایسے موقعوں پر خواہ دل چاہے نہ چاہے مگر زبان کی اُلٹ پھیر کرنی ہوتی ہے تاکہ مخاطب پر شخصیت کا سکہ بیٹھ جائے۔

زبان سے دوسروں پر اثر ڈالنا آج کل تو اچھا خاصا ہنر ہو گیا ہے حتیٰ کہ باقاعدہ بولنے چالنے اور مخاطب کو شیشے میں اُتارنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ امیر۔ فقیر۔ وزیر ہر کوئی خطابت سے کام لیکر مخاطب کا دل موہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی اپنی تقریر سے ہی بچ جائے تو بچ جائے ورنہ زبان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور ہر کسی کو رام کر لیتا ہے۔

ٹیکنک۔ پروپیگنڈا ایسوسی ایشن اس فن کے خاص مظاہرات میں سے ہیں جن کے ذریعہ نہ صرف فرد فرد کو مرعوب کرتا ہے بلکہ حکومتیں حکومتوں پر۔ اور جماعتیں جماعتوں پر ایسا اثر ڈالتی ہیں کہ نکل جانے کا موقع نہیں ملتا۔ زمین آسمان کے قلابے ملانا جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر دکھانا ان کا معمولی کام ہے کیا ذریہ کیا ڈاکٹر۔ کیا بھکاری نفسیات ترغیب سے واقف ہیں کہ جو جادو بیانی، فریب کاری کا گر نہیں جانتا وہ اپنی جگہ ناکامیاب ہے۔ اور جو ان زبانی ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان میں آتا ہے وہ سب کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ۔

"تمدن جدید کے مطابق بہترین لباس میں ملبوس ہو اور صحافت عالم پر عدگی سے گفتگو کرتی آتی ہو تو دنیا کو اُلو بنا لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے"

طلاقتِ لسانی کے اس عجیب اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس زبانی جمع خرچ میں استحکام نہیں ہوتا۔ ذرا ٹھیس لگی اور کمر جھکی اور پیروی کنندگان کا بھانڈا سر بازار پھوٹتا ہے اور حقیقت عریاں ہو کر سامنے آجاتی ہے اس وقت یہی کہتے بنتی ہے کہ جھوٹ جھوٹ ہے اور سچ سچ کھوٹے سکے آنکھوں میں دھول جھونک کر تھوڑے بہت دن چلائے جا سکتے ہیں مگر زیادہ دیر نہیں۔

استحکام و پائداری کے لئے ٹھوس باتوں کی ضرورت ہوتی ہے لوگ کہتے ہیں کہ قوانین بنانے والوں کی زبان میں پائداری کے عناصر ملتے ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں یقیناً ماضی میں فلسفیوں نے کچھ اچھی اور ٹھوس باتیں بھی کہیں مگر اوّل تو۔ ع

دُور کو سمجھا رہا ہوں اور سرِ الملتا نہیں

کچھ ایسا گلچھٹ ہے کہ عامی تو عامی خود وہ بیچارے ہی عمر بھر سر دھنتے رہے

اور اگر کبھی سر اٹھا تو آ بھی گیا تو مستقبل نے اُن کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا یعنی اُسی طبقے میں سے اُن کی باتوں کو جھٹلانے والے پیدا ہو گئے اور آج ایک ایک نظریئے کی ستر ستر قرمیں موجود ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ڈھول کا پول ہی تھا۔ البتہ اس کے مقابلے پر ایک حقیقت ضرور اٹل ہے اور ابتدائے آفرینش سے اپنی اولین صورت میں محفوظ ہے وہ ہے پیغمبروں کی زبان جس میں حرف زوال کی گنجائش نہیں۔ یہ طرز کلام خود اُن کا اپنا نہیں ہوتا بلکہ اُن کے مالک کی طرف سے عطا ہوتا ہے جس کے سامنے انسان کی گویائی عاجز نظر آتی ہے ورنہ ہو سکتا ہے کہ ابن آدم اپنی گمراہی میں نبی کی باتوں کی برابری کرنے لگے یہ میرا خیال نہیں ہے بلکہ ایسا کر بھی چکے ہیں پر منہ کی کھائی۔ اپنے مقابلے پر دوسرے ملکوں کو عجم کہنے والے لوگ بھی کون دبا گئے۔

اِس عہد میں پہنچکر دیکھا جائے تو پیغمبری خطبات متانت و سنجیدگی کا خزینہ معلوم ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ اُس وقت عقل کے اندھوں اور ہیکڑی کے پودے لمانے اِس انداز بیان کا اثر نہیں لیا لیکن اِس میں بھی کوئی شک نہیں کہ پند و نصائح کیلئے اس سے اچھا کوئی طرز نہیں ہر وہ خطیب جو عوام کو صراطِ مستقیم دکھانا چاہتا ہے یہی طرز خطاب اختیار کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حکمت و متانت گفتگو کی جان ہیں یہ ایسا طلسم ہے کہ مخالف سے مخالف بھی رام ہو جاتا ہے جہاں بڑی بڑی تدابیر سے کچھ نہیں ہوتا وہاں زبان کے ذریعہ دم کے دم میں فیصلہ ہو جاتا ہے دنیا کا ہر واقعہ۔ ہر بات اور ہر قوت اگرچہ کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور پیدا کرتی ہے لیکن اِس کا سب سے زیادہ اثر انگیز نتیجہ زبان کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے کیا عقائد، کیا اخلاق، کیا مذہب، کیا تمدن، کیا، وزمرہ کے معاملات، کیا آپس کا لین دین سب کا ٹکاؤ زبان کی بدولت ہے خدانخواستہ آج انسانی حیات سے زبان کی نعمت چھین لی جائے تو یہ دنیا یہ دنیا کی رونقیں یہ تہذیب کی رنگینیاں، یہ محفلیں یہ محفلوں کی سرمستیاں یکسیارت یہ سیاست کے مناظرے یہ ادب یہ ادب کی لامتناہی بحثیں سب کی سب کالعدم ہو جائیں اور دنیا گونگوں کی بستی بن کر رہ جائے جہاں سے حیوان مطلق کا تصور قریب تر ہے۔ حالانکہ انسان کا ایک بڑا شرف بازبان ہونا بھی ہے چنانچہ اِسی قوت کی نمود نے انسان کو بالطبع سر اٹھا کر چلنے کا موقع دیا ہے اِسی نے اِس کی قدر ضروری ہے سوچ سوچ کر کہنا اور کہہ کہہ کر غور کرنا آدمی کو صاحب الرائے بنا دیتا ہے۔ نیز ایسے آدمیوں کی کمیں بھی پوچھ نہیں ہوتی جو جذبات سے مغلوب ہو کر بات کرتے ہیں اور موقع بموقع مبالغہ آفرینی کے شکار ہو جاتے ہیں زبان کا استعمال آسان ہے لیکن اِس قسم کے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہاں زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کا اثر کچھ نہ کچھ ہوتا ہے انہیں کہنے سے مطلب ہے خواہ مناسب ہو یا نامناسب معتدل ہو یا غیر معتدل۔ نقصان ہوتا ہو یا فائدہ ایسے ہی لوگوں کے علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ۔

"وہ بالکل مطلق العنان بن جاتے ہیں اپنی زبان کو جھوٹ کے مرغزاروں میں چراتے ہیں خدا کی نشانیوں کو ہنسی مذاق بنا لیتے ہیں اور بیہودہ باتوں کی ایک دوکان لگا دیتے ہیں تاکہ خدا کی سیدھی راہ سے دنیا کو گمراہ کریں لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ کیسی ناکامیاب تجارت ہے۔" (مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۱۱)

زبان کی یہ تجارت واقعتہً بڑی خسارے کی ہے آج جو لوگ سماج کی گمنڈگیوں پر ماتم کر رہے ہیں انہیں دوسرے اسباب تنزل کے ساتھ ساتھ زبان کے نتائج کو بھی سامنے رکھنا چاہئے کیونکہ مقبول غالبؔ ؎

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا
نہ صرف دہن بلکہ ذہن بگڑا اور ذہن بگڑنے کے معنی ہیں جنون کے ہیں جس کے بعد سوائے اِنا للہ پڑھنے کے کوئی چارہ کار نہیں رہتا اِس لئے ذہن بگڑنے سے پہلے ذہن کو ٹھیک کرنا اور دہن کو پاک صاف رکھنے کے لئے زبان کی درستی ضروری ہے کیونکہ ؎

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

اگر ایک ادیب یا شاعر صالح عناصر کی ترجمانی نہیں کرتا تو وہ منصب شعر و ادب کا اہل نہیں سمجھا جاتا۔ اِسی طرح جس شخص کی زبان سے تخریب و انتشار کی پرورش ہوتی ہو وہ صرف "بھونکنا" تو کہا جا سکتا ہے مگر زبان نہیں زبان کی فضیلت تو اِس میں ہے کہ ٹوٹے دل جڑ جائیں۔ بیگانگی گھڑیاں بھی خوشی سے گدریں حتیٰ کہ انسان تختہ دار پر اُس کے چٹخارے لے یونہی کسی شاعر نے کہا ہے ؎

جو بات کہو صاف ہو ستھری ہو بھلی ہو
کڑوی نہ ہو کھٹی نہ ہو مصری کی ڈلی ہو

زبان کاٹ کر کھانے کی چیز نہیں کہ اُس کی تلخی اور مٹھاس کا پتہ چل جائے۔ مطلب یہ ہے کہ زبان کی زبان کے اثرات نہایت خوش آئند ہوں۔ تاکہ زندگی میں حلاوت بھی پیدا ہو جائے۔ اور زبان کا مفہوم بھی ادا ہو جائے۔

ایم احمد مظاہری

ہمارا تنقیدی نقطۂ نظر

ہمارا تنقیدی نقطۂ نظر کیا ہے؟ یہ اہم سوال ہے۔ تعمیری ادب کو دن بدن جو فروغ اور مقبولیت عام اس کے پیش نظر اگر آج یہ سوال ملک کے مختلف ادبی اداروں کے زیر بحث ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تعمیری ادب اگرچہ اپنے عہد طفولیت سے گذر رہا ہے لیکن اپنے تعمیری رجحانات، عوامی مسائل سے کما حقہٗ واقفیت کے باعث ملک نئے پرانے چھوٹے بڑے ترقی پسند، ترقی پسند تمام ادیبوں کی توجہات کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ موافق مخالف سبھی اس کے متعلق اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں۔

ہمارے تنقیدی نقطۂ نظر کو سمجھنے میں اکثر لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ ہم ایک نئے تنقیدی نقطۂ نظر کے حامل ہیں، ہمارا انداز تنقید ملک کے تمام نقطہ ہائے نظر سے مختلف ہے۔ ہم جن مضامین افسانوں پر تنقید کرتے ہیں یہ بات نہیں کہ اس میں کسی قسم کی رُو رعایت کی جاتی ہے یا کسی قسم کی چاپلوسی سے کام لیا جاتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ایک نقاد ایک تخلیق پر صرف فنی حیثیت سے تنقید نہیں کرتا بلکہ نقاد جن مادی رُو حالی دقائق کو تسلیم کرتا ہے کائنات کی اس لامتناہی فضا میں جن ابدی صداقتوں پر اس کا ایمان ہے اس کو بھی سامنا رکھتا ہے۔ مادی النظر میں یہ بات شاید کچھ عجیب معلوم ہو اور اس پر شبہ نہیں کہ اس پر اکثر لوگوں کے اعتراضات ہوتے رہتے ہیں لیکن صرف اعتراض کرنے سے حقائق تھوڑے ہی تبدیل ہو سکتے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ ایک نقاد کو کسی حد تک تخلیق کے ماحول اور پس منظر کو نظر انداز نہیں کرنا ہوگا۔ مگر ضروری نہیں کہ وہ تخلیق کے ان تمام تانوں بانوں اور ڈھانچوں کا بھی لحاظ کرے جن پر تخلیق کی پوری عمارت قایم ہے۔ نقاد اگر اس طرح بے جا ملاحظہ میں مبتلا ہو گیا اور حالات و واقعات کو اس نے ضرورت سے زیادہ اہمیت دی تو وہ تنقید کے فرائض صحیح انجام دینے میں قاصر رہا۔ آخر وہ اس کا لحاظ کیونکر کرے تخلیق کی شاہی دربار میں عین بادشاہ کے سامنے پڑھی گئی۔ وہ کسی گندی اور گھناؤنی تحریر پر صرف اس بوسے کو نظر کرے کہ کسی تارڈی باز جوئے باز اور زانی کے قلم سے نکلی ہے یا گو وہ اس قسم کے تصورات رکھتا ہے تو اس نازک ذمہ داری کا بار اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔ کیا ناجیز کا کھوٹ اور کھرا پن ماحول اور آب و ہوا کے اثرات کے پیش نظر جانچا جاتا ہے

اگر روپیہ کھوٹا ہے تو ہم کیا یہ بھی خیال کریں اور یہ بھی معلوم کریں کہ اس کو ٹرین میں کارڈ نے دیا ہے؟ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ روپیہ کہیں مدفون تھا تو ہم روپے کی مجبوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے ہم لے لیں؟ کیا کوئی معقول آدمی اس دیوانگی کی جرأت کر سکتا ہے؟ اگر کسی تنقید میں لکھنے والے کے حالات۔ واقعات۔ ماحول۔ پس منظر اور آب و ہوا ان تمام چیزوں کا لحاظ کیا جائے تو پھر بتایئے کہ آخر کس تخلیق پر تنقید ہو سکتی ہے۔ تب تو ہر تخلیق تنقید سے بالا قرار پاتی ہے۔ ہر شخص جو کچھ بھی لکھتا ہے ظاہر ہے کہ اس دنیا کا باشندہ ہے۔ زندگی کے دن اسی دنیا میں پورے کر رہا ہے۔ وہ سچ جھوٹ کے مکروہ لمحات ہوں یا خوشی و مسرت کے اوقات۔ نغمۂ شادی ہو یا نوحۂ غم۔ معاشی پریشانی ہو یا اقتصادی خوش حالی۔ ایک انسان ان تمام حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ کیا زندگی کا کوئی لمحہ بھی ایسا ہے جو ان حالات سے خالی ہو؟ اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں ہے تو پھر بتایئے کہ یہ کہنا کہ رائٹر کے ماحول اور دوسرے حالات سامنے رکھنا ضروری ہے کہاں تک صحیح ہے؟

پچھلے دنوں ابو صالح اصلاحی کے قلم سے غالب اور عمر خیام کے خیالات اور افکار پر سخت تنقید نکلی تھی اور حال ہی میں ایک ادیب ڈاکٹر اقبال کے خیالات اور ان کے نظریات کا تمام نظر ڈالی ہے۔ ظاہر ہے جو غالب و اقبال کو پوجتے ہیں یا عمر خیام کی رباعیات کو وحی والہام کا درجہ دیتے ہیں وہ ان تنقیدوں پر جز بز تو ضرور ہوئے ہوں گے لیکن اس وقت ہمارے مخاطب یہ لوگ نہیں کیونکہ اس قسم کے حضرات ایک اندھی تقلید میں مبتلا ہیں۔ اپنے محبوب شاعر کے خلاف ایک لفظ بھی ان کو سننا ناگوار انہیں ان تنقیدوں کے سلسلے میں جناب عاصی ضیائی صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے میں ان سے قطعی متفق نہیں ہوں۔

عاصی صاحب کا خیال ہے کہ غالب، اقبال یا عمر خیام کسی شخصیت کے اوپر تنقید کرتے وقت اس کے ماحول۔ حالات۔ مواقع مجبوریوں ان تمام باتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے اس کے بغیر تنقید کرنا اصولی غلطی ہے۔ ان خیالات کا اظہار چونکہ عاصی صاحب کی طرف سے ہوا ہے جو تحریک اسلامی کے مشہور نقاد ہیں

اور بہترین اہلِ قلم میں سے ہیں اس لئے مجھے بھی تعجب ہوا میں یہ مانتا ہوں کہ شاعر کے ماحول اور حالات کو تعلقاً نظر انداز کرنا مناسب نہ ہوگا۔ مگر ان حالات و موانعات کو اس قدر اہمیت دینا کہ ہمرے سے ان حالات پر تنقید کی ہی نہ جائے کسی طرح ٹھیک نہیں۔ اس صورت میں تو تنقید کا قلم ہمیشہ پیش کے لئے توڑ دینا ہوگا۔

ایک صحیح اور سچی بات ہمیشہ صحیح اور سچی رہی ہے اور رہے گی۔ ہم کو بھی اس کو صحیح کہنا پڑے گا۔ صحیح بات ہمیشہ صحیح کہی جائے گی چاہے وہ جس وقت یا ماحول میں کہی جائے۔ البتہ اس صحیح اور سچی بات کے کہنے کا انداز ماحول پر منحصر ہوگا۔ ماحول کا لحاظ کرتے ہوئے ہم سچی بات کئی طریقوں سے کہہ سکتے ہیں لیکن یہ کہ ہمرے سے ماحول کا لحاظ کرتے ہوئے سچی بات کو غلط کہا جائے کسی طرح مناسب نہیں۔

تنقید کے سلسلہ میں ہمیں کسی بے جا رواداری اور مداہنت کا قطعاً خیال تک نہ کرنا چاہئے۔ ہم جن ابدی اصولوں پر ایمان لائے ہیں ہماری تنقید کچھ اس سے الگ نہ ہونی چاہئے۔ ہم اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ادب کی نئی تعمیر کرنا چاہتے ہیں ہمارا یہ مستحکم ایمان ہے کہ ہم جانوروں کی طرح آزاد نہیں ہیں کہ جس طرح چاہیں اور جس کھیت میں چاہیں اتر پڑیں۔ ہمارے لئے زندگی گذارنے کے کچھ قاعدے اور ضابطے ہیں جو خالق کائنات نے اپنے برگزیدہ بندوں کے ذریعہ ہم تک پہونچائے ہیں۔ ہمارے صحیح و غلط کا معیار کسی فلسفی کی بات کسی بڑے سے بڑے ادیب کا نظریہ نہیں ہے۔ اگر کوئی ادیب خواہ وہ کسی مرتبہ اور رتبہ کا کیوں نہ ہو عریانیت اور فحاشی کی حمایت بہترین انداز میں اور اسلوب نگارش کے ساتھ کر رہا ہو تو ہم اس کی گرفت میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ ہم تو ایسے طاعون زدہ ادیبوں کو بستیوں سے نکال کر ویرانوں کی طرف جانے کے لئے مجبور کر دیں گے کہ وہ طاعون کے کیڑوں سے دوسروں کو مریض نہ بنا دیں۔

ہم جن ادبی صداقتوں پر ایمان لائے ہیں اسے زندگی کے کسی شعبہ سے خارج نہیں کر سکتے۔ جب بھی ہم وادیٔ ادب میں قدم رکھیں گے تو ان اصولوں کو سامنے رکھیں گے۔

حفیظ میرٹھی

غزل

آخرش چوٹ کھا گئی دُنیا
اپنی ہی زد میں آ گئی دنیا

آدمی نے کب آنکھ کھولی ہے
آہ جب مٹ مٹا گئی دنیا

زندگی تنگیوں سے ہے دوچار
کیا کہیں دل پہ چھا گئی دنیا

ہم ابھی جرم بھی سمجھ نہ سکے
فیصلہ بھی سُنا گئی دُنیا

رات کو رات کہہ دیا میں نے
سُنتے ہی بوکھلا گئی دُنیا

ساتھ چلنا تو خیر مشکل تھا
روکنے سے بھی کیا گئی دُنیا

ٹھوکریں دربدر کی کھا کھا کر
اُن کے قدموں میں آ گئی دُنیا

تجھ سے بھیرا تری قسم دے کر
کیا کروں بھید پا گئی دُنیا

کس نے سمجھا ہے میرے غم کو حفیظ
گدا گدا کر رُلا گئی دُنیا

نازش پرتاب گڈھی

غزل

ہے ناگوار جسے طوق و دار کا موسم
حرام اُس پہ رہے گا بہار کا موسم

ذرا تو فرق رکھا ہوتا باغبانوں نے
یہی بہار، یہی طوق و دار کا موسم

ہر ایک کان یہ سُنتا ہے فصلِ گُل آئی
ہر ایک آنکھ میں ہے اِنتظار کا موسم

غضب ہے، شاخ پہ کوئی کلی بھی کھِل نہ سکی
زمیں پہ آ بھی چکا لالہ زار کا موسم

یہ کیا ستم ہے سزائے قفس ملے اُن کو
چمن میں لانے جو اٹھیں بہار کا موسم

ہر ایک جبر ترا، جنبشوں سے کہتا ہے
بہت قریب ہے اب اختیار کا موسم

لئے حیات کی بے چینیوں کا آئینہ
سنور رہا ہے سکون و قرار کا موسم

یہ ایک دورِ خزاں ہے جو بغض و نفرت کا
اِسی کی گود سے اُبھرے گا پیار کا موسم

وہ دیکھ اُبھرنے کو ہے آفتاب اے نازش
وہ ڈھل رہا ہے شبِ انتظار کا موسم

محسن رضا۔ رضا۔ جونپوری

غزل

حیات دی ہے تو دے ربطِ باہمی مجھ کو
میں زندگی کو صدا دوں تو زندگی مجھ کو

سمجھ کے جلوہ ترا میں نے احترام کیا
جدھر جدھر سے نظر آئی روشنی مجھ کو

فضائے حسنِ تصوّر پہ چھا گئے آکر
ملی نہ راہ میں فرقت کی تیرگی مجھ کو

فروغِ حسن طلب اہلِ کارواں دیکھیں
کہ لے چلی سوئے منزل فتادگی مجھ کو

اُدھر وہ میرے گریباں پہ مسکرا اُٹھا
قبائے گل پہ اِدھر آگئی ہنسی مجھ کو

بہار میں تو قفس کی تھیں سختیاں پیہم
ملی خزاں میں نشیمن کی زندگی مجھ کو

بہارِ صبح بھی دیکھی حیاتِ شبنم نے
نہ اے رضا ملی اِک شب کی زندگی مجھ کو

چندر پرکاش جوہر بجنوری

جو کبھی حل نہ ہوئی آج بھی مشکل ہے وہی
یعنی اک سلسلۂ مرحلۂ دل ہے وہی
وہ تلاطم ہو کہ طوفاں ہو، کنارا ہو کہ موج
لے سفینے کو جو آغوش میں ساحل ہے وہی
ہم تری یاد میں جس راہ سے گذرے تھے کبھی
آج دنیا کے لئے جادۂ منزل ہے وہی
اب مرے بعد وہ ہنگامۂ فریاد کہاں
ورنہ محفل میں تری گرمیٔ محفل ہے وہی
دل کو ملتا تھا جو اکثر تری قربت میں سکوں
آج دوری میں بھی اک لطف سا حاصل ہے وہی
ڈوبنا جیسے سفینے کا کوئی بات نہ تھی
موجِ خاموش سکوتِ لبِ ساحل ہے وہی
اک حسیں خواب تھا افسانۂ غم اے جوہر
پھر وہی میں ہوں وہی عشق غمِ دل ہے وہی

راز الہ آبادی

ہر قدم پر قدم ڈگمگائیں
اور ڈھونڈیں تو منزل نہ پائیں
یک بہ یک سامنے وہ نہ آئیں
ہم انھیں پا کے خود کھو نہ جائیں
چھا گئیں سر پہ غم کی گھٹائیں
یا الٰہی برسنے نہ پائیں
آپ ہی نے رلایا تو روئے
آپ کہہ دیں تو ہم مسکرائیں
بجلیوں کا یہ منشا ہے شاید
ہم نشیمن میں رہنے نہ پائیں
اے جنوں ایسی انگڑائیاں لے
پاؤں کی بیڑیاں ٹوٹ جائیں
کون ہے راز ہمدرد اپنا
کیا سمجھ کر ہم آنسو بہائیں

صوفی چناوری

یہ عجب فطرت ہے اپنی بزم کی
شمع جلنے سے بڑھی ہے تیرگی
کیا کرے گا وہ شکایت غیر کی
جس کے اپنے بن گئے ہوں اجنبی
غم سلامت ہے تو میری زندگی
غم کے سائے میں بسر ہو جائے گی
خون کے آنسو کوئی روتا رہا
اور دنیا دیکھکر ہنستی رہی
مسکرانا کب دلیلِ عیش ہے
یوں تو میرے بھی لبوں پر ہے ہنسی
گردشِ ایام یہ کیا کر دیا
آدمی کو کھا رہا ہے آدمی
چاند تارو تم اگر اتراؤ گے
وقت سے پہلے سحر ہو جائے گی
عہدِ ماضی کو بھلانے کے لئے
مجھ کو ہے درکار صوفی بیخودی

عنوان چشتی

یہ کیا کہ جوشِ عمل ہے نہ عزمِ محکم ہے
رہِ طلب میں شعورِ طلب مقدم ہے
"نظامِ نو" میں ہی مفلوج روحِ آدم ہے
کسے بتاؤں کہ نبضِ حیات مدھم ہے
وہ اک نظر، جو محبت کا پیش خیمہ تھی
مرا نصیب کہ اب وہ نظر بھی برہم ہے
ابھی خلوصِ محبت میں ہے کمی شاید
ابھی زبان پہ شکوے ہیں آنکھ پرنم ہے
بنا نہ دے کہیں دیوانہ یہ غلط فہمی
جنوں کی شاخ غرورِ خرد ہی کیا کم ہے
غبارِ غم دلِ انساں پہ آ گیا اے دوست
اگرچہ سنگ زیادہ ہے آئینہ کم ہے
شبِ سیاہ سے عنوان کیوں ہو افسردہ
نویدِ صبح یہ تاریکیوں کا عالم ہے

ابنِ احمد گورکھپوری

سڑک کی سازش

چڑیوں کے چہچہوں سے فضا نغمہ بار ہو رہی تھی۔ مرغ بانگ دے رہا تھا۔ کائنات میں جنبش پیدا ہو چلی تھی۔ دھیرے دھیرے صبح نمودار ہو رہی تھی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا ہر شے میں تازگی کی روح پھونکتی چلی جا رہی تھی۔ نیند کے ماتے کچھ تو احساس فرض سے مغلوب ہو کر انگڑائیاں لیتے اٹھ رہے تھے۔ کچھ مست ہواؤں کی لوری پا کر خوابِ غفلت کی گہرائیوں میں اترتے جا رہے تھے کھیتوں میں فصلوں کی سرسراہٹ ایک نامعلوم خوف کا پتہ دے رہی تھی۔ برگد، پیپل اور پاکڑ کے یکجا درختوں کے پتے ہواؤں کی چوٹ کھا کر بے چینی کا اظہار کر رہے تھے۔ آسمان کے مغربی کنارے پر ڈوبتے ہوئے چاند کی پھیکی روشنی فضا کو مانگی بنا رہی تھی۔ تارے کسی آئندہ خوف سے گویا تھرا رہے تھے۔ کائنات بحیثیت مجموعی متحرک و مترنم تھی۔

صبح ایک ہی تھی کیفیات مختلف تھیں جادو ایک تھا لیکن جگانے والے کا کمال تھا کہ اثرات جدا جدا تھے۔

اسٹیشن سے خام پار کو آنے والی سڑک اگرچہ اس وسیع علاقے کی اکلوتی سڑک تھی جو کثرتِ استعمال اور قلتِ اہتمام سے نہ صرف پامال ہو چکی تھی بلکہ حکومت خود اختیاری ( ) کی قدیم روایات کی مردہ یادگار بن کے رہ گئی تھی لیکن صبح کے وقت نور میں نہائی ہوئی یہ گرد آلود سڑک بھی انتہائی پُرکشش بن گئی تھی یا کم از کم اس وقت ذوق پر گراں نہیں گزر رہی تھی کیونکہ آمد و رفت ابھی بند تھی۔ سڑک خاموش تھی۔ لیکن ظاہر ہے سڑک کی یہ خاموشی موت کی خاموشی نہ تھی بلکہ نیند کی خاموشی تھی جو صرف اس غرض سے اختیار کی جاتی ہے تاکہ نیند سے بیدار ہو کر پہلے سے زیادہ زور و قوت کے ساتھ زندگی کے ہنگامے برپا کئے جائیں۔ یہ ایک پُرفریب خاموشی تھی چنانچہ اس سڑک کی آغوش میں دو دن کی عورت سوئے ہوئے اُن طوفانوں سے کون بے خبر تھا جو صبح کی آمد کے چند ہی ساعت بعد ہر روز اٹھا کرتے تھے اور صبح کی رخصتی کے ساتھ ہی آہستہ آہستہ دب جایا کرتے تھے گویا صبح اور سڑک نے آپس میں یہ سازش کر رکھی تھی کہ وہ اپنی مشترکہ کوششوں سے اس علاقہ کو گرد، کدورت اور ملامت و نحوست سے بھر دیں گی تاکہ کوئی باعزت انسان ان کے درمیان سے ہو کر گزرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح آج نظامِ اشتراکیت اور سرمایہ داری نے آپس میں یہ سازش کر رکھی ہے کہ وہ اپنی ناپاک کوششوں سے دنیا کے امن کو غارت کر دیں گے اور کسی ذی روح کو زندگی کا حوصلہ نہیں رکھنے دیں گے۔ اُن کی سازش کا جال بھی پھیلتے پھیلتے ہمہ گیر ہوتا جا رہا تھا جس طرح آج اشتراکیت و سرمایہ داری کی سازشیں عالمگیر ہو رہی ہیں۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی حکمرانی میں سڑک کے کنارے کھڑا ہوا تیندو تا اپنی ساری قہرسامانیوں کے باوجود ہمیشہ کا پنپا کرتا تھا اور سڑک کی دوسری جانب وسیع کھیتوں میں کھڑی ہوئی پختہ فصلیں بھی کسی انجانے خوف سے تھر تھرا اٹھتی تھیں۔

یہ تاریخی سڑک اپنے مرکز سے نکلی تو تھی سیدھی لیکن درمیان میں عجیب طرح کے نشیب و فراز سے گزری تھی کہ اب اس کی راست روی اور سلامت روی پر کسی کو یقین نہ رہا تھا۔ اس حیثیت سے اس سڑک کا سفر حیاتِ انسانی کے سفر سے بڑی حد تک مشابہ تھی۔ انسان بھی اپنے مرکزِ اصلی سے چلتے وقت صراطِ مستقیم کا عامل تھا لیکن دورانِ سفر میں شاہراہِ حیات کی یکسانی و یکرنگی شاید اُسے اچھی نہ لگی چنانچہ اس نے بھی مختلف قسم کے نشیب و فراز سے گزرنا اپنے اوپر لازم کر لیا۔ سفر کی یکسانی و یکرنگی کو حیات کی گوناگونی و رنگارنگی سے بدل لیا اگرچہ اب اس سے انسانی فلاح و بہبود اور سلامتی مستقل طور پر خطرے میں پڑ گئی لیکن انسان اب بھی مطمئن ہے کہ رنگ کے لئے امن کا سودا کچھ مہنگا نہیں ——— غرض یہ سڑک نشیب و فراز سے ہوتی اس حصہ سے گذرتی تھی جو خام پار موضع کا سب سے کم آباد حصہ ہے اور جو موضع کی خاص آبادی سے میلوں فاصلے پر ہے۔ اسی مقام کی نکل آبادی تھا مولیشی خانہ اور ڈاک خانہ پر مشتمل ہے لیکن مشہور ہے تھانہ کے نام سے۔ سڑک اس مقام کو چھوتی ہوئی گذرتی ہے۔ اس کی واقعی وجہ تو مجھے واضح نہیں کہ یہ سرکاری ادارے آبادی سے اتنا دور اور سڑک سے اتنا قریب کیوں قائم کئے گئے تھے تاہم کوئی قرینِ قیاس مصلحت معلوم کر لینا دشوار نہیں۔ تھانہ کی شاندار پختہ عمارتوں سے متصل مولیشی خانہ کی کچی بوسیدہ عمارت

تھی جن کے فرق سے شاید زمین و آسمان کے فرق کی اہمیت باقی تھی تاہم اس بوسیدہ عمارت کی خاموشی میں احساسِ کمتری و ندامت سے زیادہ وقار و عزتِ نفس کا احساس نمایاں تھا اور اس سے کہیں زیادہ تناسب کے ساتھ ان مختلف النوع مکانوں کے مکینوں کی زندگیوں میں احساسِ خودی کا فرق نمایاں تھا۔ ان عمارتوں کی مختلف سطحیں واضح کر رہی تھیں کہ واقعتاً حیاتِ دنیوی نشیب و فراز کی حامل ہے۔ ہماری زندگی رنج و راحت کا مجموعہ ہے۔ پستی و بلندی سے مرکب ہے اور اونچ نیچ کا امتزاج زندگی کی اصل ہے۔ گویا اونچے مکان کے مکینوں کی خرافت فلک بوس دیواروں کی اوٹ میں چھپ گئی تھی لیکن بوسیدہ مکان میں رہنے والوں کی خرافت کو چھپانے میں کوئی مصنوعی شے کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ ان لوگوں کی شرافت نمایاں تھی۔ پھر بھی تھانہ کا مالک تھانیدار کہلاتا تھا اور مویشی خانہ کا ذمہ دار محرر مویشی، ایک داروغہ تھا۔ وہ سرِ منشی۔

اس کے علاوہ ایک اور پہلو سے بھی دونوں کا فرق نمایاں تھا۔ داروغہ اپنے جاہ و جلال کے باوجود متلون مزاج تھے لیکن منشی اپنی ہر دلعزیزی، خوش تدبیری اور حسنِ سلوک کی بنا پر سرکاری ملازم ہونے کے باوجود اس مقام پر مستقل باشندے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی عمر کا ایک معتد بہ حصہ یہاں بیت گیا تھا۔ واقعتاً وہ مجسم استقلال تھا۔ باوجود مخالف کا کوئی جھونکا اسے وہاں سے ہٹا نہ سکا حالانکہ منشی کو باوجود مخالف سے محفوظ رکھنے یا استقلال بخشنے میں اس کے عقیدہ کے مطابق اس کا خدا پوری پوری مدد کر رہا تھا لیکن اس بارے میں گذشتہ کئی داروغہ خود معاون تھے لیکن وہ دور وہ تھا جب داروغہ اور منشی کی روحیں ایک دوسرے سے قطعی مانوس تھیں۔ ان کی ذات میں کوئی اجنبیت نہ محسوس ہوتی تھی اور ظاہری فرقِ مراتب کے باوجود کوئی معنوی امتیاز نہ تھا ——— اور یہاں جبکہ پکی اور کچی عمارتیں ایک دوسرے سے گلے مل رہی تھیں اور صبح اور سڑک کی سازش ابھی کامیاب نہ ہوئی تھی۔

مرغ کی بانگ سنکر منشی نے آنکھ کھول دی۔ یک نظر پوری کائنات کا جائزہ لیا۔ اگرچہ ترنم ریز فضا سے لطف اندوز ہونے کی عمر سے وہ بہت آگے جا چکا تھا۔ تاہم ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں وہ کیفیت پیدا ہوئی جسے ایسے کیف بار ماحول میں کوئی انسانی دل محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کائنات کے خالق کی بخششوں پر اس کی روح وجد میں آگئی اور اپنے جسم کو روح سے ہم آہنگ کرنے کے لئے وہ اس کے روبرو جھک گیا اس وقت ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کائنات کا ایک جز نہیں بلکہ خود کائنات اس کا جز بن کر رہ گئی ہے۔

اس ماورائی کیف و سرور سے فارغ ہو کر منشی نے اپنے بوسیدہ مکان کے ایک گوشہ سے مرغیوں کو آزاد کیا۔ منشی نے ضرورت سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ شوق سے مجبور ہو کر اچھی نسل کے مرغ مرغیاں پال رکھی تھیں جن کی داشت میں فرصت و محنت کا معتد بہ حصہ صرف ہو جایا کرتا تھا۔ جس توجہ سے دفتری کام سرانجام پاتے اسی توجہ کے ساتھ مرغیوں کی مرہم پٹی بھی ہوتی تھی۔ ٹوٹے ہوئے چشمے کے پیچھے کمزور نگاہوں سے جب مرغیوں کی دیکھ بھال ہوتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ماہر ڈاکٹر مرض کی تشخیص کر رہا ہے۔ جانوروں کو وقت سے کھانا پانی اور مرغیوں کو باقاعدگی کے ساتھ دانے ڈالتے وقت منشی کی فرض شناسی اور رحمدلی شفقت بھوٹی پڑتی تھی۔ جو بے زبانوں یا جانوروں کے ساتھ اپنی دوستی اور محبت ثابت کرے اس سے انسان دوستی کا ثبوت مانگنا حماقت ہے چنانچہ منشی کی شخصیت ایک مہربان خوہر اور شفیق باپ کے علاوہ ایک دردمند پڑوسی کی حیثیت سے بھی نمایاں تھی البتہ اظہارِ شفقت و ہمدردی میں غریب کی غربت ہمیشہ آڑے آتی رہی ہے اور اس سے منشی کو بھی مفر نہیں تھی۔ اس پرآشوب دور میں متعدد افراد پر مشتمل ایک خاندان کی گذر اوقات صرف ساٹھ ستر روپیہ ماہوار آمدنی پر سوچتے ہوئے پسینہ چھوٹتا ہے تاہم یہ مختصر سی دنیا عزت کے ساتھ آباد تھی اور مستقبل کی سنہری امید پر جی رہی تھی کیونکہ منشی کی دنیا میں سب سے گراں قدر شے امید تھی جسے ہر قیمت پر خرید لیا جا سکتا تھا۔ امیدِ یزداں کے نزدیک زندگی تھی اور یاسیوں صوت۔ چنانچہ یزداں کی مختصر کشتی ہچکولے سے محفوظ ہوئے ہوئے منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی طوفان رفتاری یا بلاخیزی میں تو یقیناً شبہ تھا لیکن سلامت روی میں کوئی شبہ نہ تھا۔

ادھر منشی کے مرغے نے ڈربے سے آزاد ہو کر بانگ دی ادھر پڑوس میں داروغہ کا مرغا زور دار بانگ سے جواب دینے کے بعد بے تحاشہ اس پر ٹوٹ پڑا گویا بانگ نہ تھی اعلانِ جنگ تھا اور مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے روس اور امریکہ نے اپنی مختلف بولیاں یا اپنے بول بولکر میدان کارزار میں چھلانگ لگا دی ہو جنھیں دنیا کے مختلف حالات اور مصلحتیں اب تک کھل کر لڑنے سے باز رکھتی ہیں لیکن میرا یہ خیال محض مارِ ضن نکلا کیونکہ داروغہ کا مرغا تو یقیناً امریکی تھا یا اس کا نمایندہ تھا لیکن غریب منشی کا مرغا ہر گز روسی ثابت ہوا نہ اس کی نمایندگی کو کہہ سکتے زیادہ سے زیادہ یہ پاکستانی تھا جو اپنی معصومیت اور نومایدگی کی بنا پر اب بھی امریکہ کے لئے تقمۂ ترنم ثابت ہو سکتا ہے۔ داروغہ کے جہاندیدہ اور تنومند مرغے نے منشی کے مرغ کو دھر دبوچا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے داروغہ کے مرغے نے منشی غریب کو دبوچ ڈالا ہو۔ اور منشی نے مار کر داروغہ کے مرغے کو بھگا دیا بھاگتا ہوا مرغا منشی کو دیکھکر غرا رہا تھا اور یوں رک رک مڑتا تھا گویا منشی سے مقابلہ کرنے یا انتقام لینے کا ارادہ کر رہا ہو۔

بھلا فریقین کے معاملے میں تیسرے کا دخل کیونکر برداشت کیا جا سکتا تھا۔ کوئی نظریۂ عدل و انصاف اسے روا نہیں رکھ سکتا۔ منشی نے غالباً صاحب مرغ کی شخصیت کو اس موقع پر نظر انداز کرتے ہوئے بھگایا ہوگا۔ ورنہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک منشی ایک داروغہ کی ملکیت کو نقصان پہنچائے۔ کیونکہ یہ مشہور روایت ہے کہ تھانیدار کی کتیا بھی دوسروں کے لئے تھانیدار کی بیگم سے کم مرتبہ نہیں رکھتی ——— یہ تو بہرحال مرغا تھا۔ غازی مرد۔ قابل صد احترام جسے منشی جیسے ناچیز نے مار کر بھگایا تھا۔ حیرت ہے قدرت نے اس سنگدل سے اس بے زبان کا انتقام کیوں نہ لیا۔ آسمان کیوں نہ ٹوٹ پڑا۔ زمین کیوں نہ پھٹ پڑی۔ غیرت ہوئی جو یہ کچھ نہ ہوا بلکہ صرف یہ ہوا کہ داروغہ نے مرغے کو مار کھاتے دیکھ لیا۔ منشی کا ڈھیلا ان کے دل پر پڑا ان کو ایسا محسوس ہوا۔ پھر تو مرغے کا انتقام منشی سے لیا گیا۔ حیوان کا بدلہ انسان سے ——— لے لیا گیا۔ منشی مرغا بن گیا۔ داروغہ تھانیدار بلکہ علاقہ بھر کا اپاہج بن گیا اور غریب منشی کی مٹی مرغ نوازی میں پلید کی جانے لگی۔ ظالم اپنے رویئے میں آزاد تھا مظلوم اپنے اخلاق میں پابند۔ داروغہ اپنی اصلیت پر اتر آیا تھا۔ ایک غریب و بیکس انسان کی عزت ایک دو لمحہ بعد اختیار انسان کے ہاتھوں مٹ رہی تھی نہیں بلکہ ایک اخلاق سے عاری انسان دوسرے انسان کی شرافت کی پگڑی اچھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے جائز اخلاق کو تار تار کر رہا تھا۔ تم بے ایمان ہو مکار ہو۔ دغاباز۔ کہنہ احسان فراموش وغیرہ جس قدر اس کے پاس اپنی شرافت کی اسناد اور خطابات تھے زبردستی غریب منشی کے سر منڈھنے لگا حالانکہ منشی بمشکل ان میں سے کسی ایک سند کے لئے اپنے کو تیار کر سکتا تھا۔ یاس کی نوازشوں کی انتہا نہ تھی بلکہ اس انسان کے اندر بیٹھے ہوئے شیطان نے ایک غریب پڑوسی کے اس جرم کی سزا کچھ دوسری صورتوں میں بھی تجویز کیا۔ منشی ساکت و صامت کھڑا سن رہا تھا۔ اس نے اس اثنا میں اپنے لب کو جنبش تک نہ دی۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ آج وہ اپنے اندر کی ساری قوت برداشت کو یکجا کر کے اس خاص موقع پر استعمال کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ داروغہ غیظ و غضب اور غرور و تمکنت میں سر تک ڈوب رہا تھا۔

"میرے کنویں سے ہرگز پانی نہ بھرنا۔"

"اگر آج سے تمہاری مرغیاں ہمارے تھانے کی حدود میں آئیں تو گولی سے مار دیا جائے گا اور تھانہ پر کاٹ لیا جائے گا۔"

"تمہاری ٹٹی تھانے کی باؤنڈری تک پہنچتی ہے ہٹا لو ورنہ آگ لگا دی جائے گی۔"

"میرا تیس روپیہ ہے ابھی دیدو۔"

داروغہ کے منہ سے یہ کلمات خیر نکل نکل کر فضا میں بکھر رہے تھے۔ فضا پہلے سے زیادہ مکدر اور ماتمی ہوتی جا رہی تھی۔ کائنات پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ چڑیوں کے چہچہے ختم ہو چکے تھے۔ کوّے کی بے ہنگم صدا صاف سنائی دے رہی تھی جو قریب ہی نیم کے درخت پر بیٹھا چیخ رہا تھا۔ مرغے نے بے وقت بانگ دی جس سے اس کے گرد و پیش کا ماحول تھرا اٹھا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا تند و تیز ہو چلی تھی اور آہستہ آہستہ سورج کی تپش جذب کرتی جا رہی تھی۔ کھیتوں میں فصلوں کی سرسراہٹ بڑھ کر خوفناک جھکولے کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ غفلت کی نیند سونے والے بھی بستر جھوڑ چکے تھے جن کے چہروں سے کرہ قسم کی کسل مندی نمایاں تھی۔ چاند کی روشنی پھیکی ہی نہیں بلکہ غائب ہو چکی تھی۔ ستاروں کی ننھی ننھی کشتی بحر بیکراں میں ڈوب چلی تھی . . . منشی کی چھوٹی سی زندگی کو شدید ٹھیس لگی تھی۔ ان کی سبک اور سلامت رو کشتی چلتے چلتے بے رحم موج کے تھپیڑوں سے دوچار ہو گئی تھی۔ صبح اور سڑک کی سازش کا آغاز ہو چکا تھا۔ گزرتے ہوئے مسافروں کی عزت پر خاک ڈالنے کے لئے سڑک نے اپنی آغوش وا رکھی تھی۔ آمد و رفت کے جاری ہونے سے مطلع غبار آلود ہو گیا تھا ——— داروغہ وہاں سے جا چکا تھا

منشی اپنے دل میں ایک جہانِ اضطراب لئے واپس ہوا۔ اس حادثہ اور منشی کے گھر والوں میں کچھ ایسا فاصلہ نہ تھا کہ وہ ان افسوسناک باتوں سے قطعی غیر متاثر رہ جاتے بلکہ محض ایک ٹکڑی کی دیوار پیچھے یہ سب واقعات رونما ہوئے تھے۔ لہٰذا لازماً منشی کے گھر بچوں سے لیکر بڑوں تک نے اپنی لٹی ہوئی عزت اور لٹتی ہوئی دنیا کو اپنی آنکھوں دیکھا۔ زندگی بھر کی کمائی ہوئی دولت کو لٹتے دیکھکر سب کا کلیجہ پھٹ گیا۔ ان سے کئی وقت تک مارے غم کے کھانا نہ کھایا۔ انہوں نے آہ تو کی لیکن فریاد نہ کی یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا صبر زیادہ تر بیچارگی کا نتیجہ ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غم جب انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اظہار غم سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان مظلوموں کی آہ بھی بے نیازی کی آہ تھی اور کسے نہیں معلوم کہ مظلوم کی آہ اور خدا کے غضب میں بہت باریک پردہ رہ جاتا ہے۔

یہ حادثہ ان کے لئے کچھ نیا نہیں تھا نہ یہ مظالم پہلی بار ڈھائے گئے تھے بلکہ اس سے قبل بھی اس کی آہیں بھرنے کے مواقع اُن کو دیئے جا چکے تھے اور منشی اپنی آہ بے فریاد کے اثرات سوچ کر ایک بار خود ہی کانپ اٹھا اور خواہ مخواہ داروغہ پر اُسے ترس آ گیا۔

اس کے دسویں روز دوپہر کے وقت جبکہ سڑک کی سازش اپنے شباب پر تھی اس کا سینہ سورج کی سیدھی کرنوں سے چھلنی ہو رہا تھا اور مثل گرم چاند،

کے تپ رہا تھا۔ ہوا تیز و تند تھی۔ کھیت میں فصلوں کی سرسراہٹ بڑھتی ہی جا رہی تھی ایسا معلوم پڑتا تھا جیسے بے شمار آتشیں سانپ کھیت پر سے بل کھاتے گزر رہے ہوں۔

دور کہیں فضا میں گھڑگھڑاہٹ کی آواز سنائی دی جو لمحہ بہ لمحہ تھانے سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ جب آواز ایک حد تک قریب آ گئی تو کچھ مانوس معلوم ہوئی۔ ایک موٹر سائیکل جو اچانک سڑک کا سینہ روندتی ہوئی منشی کے جھونپڑے تک پہنچ آئی۔ سڑک نے بھی اس گستاخی کا بدلہ لینے کے لئے

مگر موٹر سائیکل سوار کے پیچھے چھوڑ دی جو سائیکل کی رفتار کا مقابلہ نہ کر سکنے کے باعث خرکار تھک کر بیٹھ گئی۔ موٹر خاموش ہو چکی تھی۔ سائیکل سوار ایک پنجابی جوان تھا جو شکل صورت اور وضع قطع سے فوجی دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اتر تے ہی منشی سے تھانہ میں داخلہ کا راستہ معلوم کیا۔

بعد کو معلوم ہوا کہ نئے تھانے دار تھے جو سابق تھانے دار سے فوری چارج لینے کے لئے وارد ہوئے تھے اور اپنے ہمراہ ان کی لائسنس حاضری کا پروانہ بھی لائے تھے۔ سابق تھانے دار رشوت اور دیگر انتظامی امور کی خرابی کے سلسلے میں ماخوذ تھے۔ حکم بالا کے تحت انہیں اپنے عہدہ سے سبکدوش کر کے لائن میں رکھنا مناسب سمجھا گیا تھا۔ دل نے پرسنگر کہا کہ یہ لائن حاضری کا پروانہ نہیں بلکہ خدائی لائن کی مار تھی۔ جس میں کوئی آواز نہیں۔

اسی وقت منشی کے مرغے نے ایک زوردار بانگ دی۔ لیکن ماحول کچھ ایسا اداس تھا کہ اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ حتیٰ کہ داروغہ کے مرغے نے بھی سنکر نہ دیا۔

طنز و مزاح۔ لطافت و ظرافت کا ایک درخشندہ ستارہ

پندرہ روزہ **قلت** راولپنڈی

بہ نوری آب و تاب کے ساتھ اُفق صحافت پر نمودار
ہونے والا ہے

اجراء ــــ چودہ اگست ۱۹۵۳ء

مرتب ــــ شمیم انجم۔ بی۔ اے

منظر حسین

چکرا کے رہ گیا

(یہ ایک خاص ماحول کی چیز ہے جس سے آپ چکرائیں نہیں)

جانے کیا ہوا میں سخت حیران تھا کہ یہ تبدیلی کب اور کیسے ہوئی میں نے آئینہ میں دیکھا میرے پتلے پتلے ہونٹ موٹے ہو گئے تھے۔ میرے سیدھے سادھے بال گھونگروالے ہو گئے تھے۔ میرا گندمی چہرہ سیاہ ہو گیا تھا۔ میری ستواں ناک کے دونوں نتھنے پھیل گئے تھے۔ میری چھوٹی سی ڈاڑھی صاف ہو گئی تھی لیکن میری نیم مُردہ آنکھیں کی چمک بڑھ گئی تھی اور میرے آدھے سفید آدھے پیلے دانت موتیوں کی طرح جھلملا رہے تھے۔

ہا ہا ہا ہا۔

میں نے اپنی اس ہیئت پر ہنسنا شروع کیا ہی تھا کہ اچانک مجھے کسی نے آواز دی "بیا۔ بیا"

میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو ایک شخص بالکل میرے جیسے حلیہ کا کھڑا اپنی سیاہ گول ٹوپی کو سر پر آگے پیچھے کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی جانے کیوں میں خوشی سے پھول گیا اور چلایا "ہلو۔ ہلو" ——— اور پھر جلدی سے مُڑ کر اپنا ہاتھ کھونٹی پر ڈالا تو وہاں میرے چھوٹی ٹھری کے پائے جامے کی بجائے ایک فور پس گز کی شلوار ٹنگی۔ میں نے حیران ہونا چاہا مگر باہر سے پھر آواز آئی۔

بیا ——— بیا" ——— اور اس آواز سے مسحور ہو کر میں نے اپنا میلا پائجامہ اُتار کر میں پہلی مرتبہ شلوار پہن ہی لی۔ پھر جب قمیص بدلنے کی نوبت آئی تو وہاں میری سفید قمیص کی بجائے ایک شوخ پھولدار قمیص نظر آئی جسے دیکھ کر تو میں اچھل ہی پڑا۔ مگر کوئی دوسری موجود نہ تھی اس لئے مجبوراً اسی کو پہن لیا۔ اور جب جوتا پہننے کا موقع آیا تو دیکھا۔ وہ کمبخت پشاوری چپل بن گیا تھا اور اس کا رنگ بھی ڈاک پراؤن سے ڈارک بلیک ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی شیروانی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ گھٹ کر ایک کوٹ بن گئی تھی۔ خیر اسے بھی پہنا ——— اور یہ سب پہنکر ذرا سر میں تیل لگانے کا خیال آیا تو وہاں دھوئی تلی کی جگہ ایک نہایت سیر خوشبو والا تیل ملا۔ اسے سر پر تھوپا۔ بالوں میں کنگھی کیا۔ اور پھر آئینہ کے سامنے گیا ———

میں نے دیکھا میرے سر کے بال جگمگا رہے تھے اور ——— اور ہاں کچھ عجیب سی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ مگر چہرہ بڑا ہی خشک اور وحشتناک ہو رہا تھا۔ میں نے سہم کر فوراً اپنا تیل بھرا ہاتھ چہرے پر پھیر لیا جس سے وہ بھی قدرے چمک اٹھا۔

ابھی میں بن سنور رہا تھا کہ پھر آواز آئی "بیا۔ بیا"

اور میں باہر نکل پڑا۔ باہر پہنچکر مجھے اپنے رومال کا خیال آیا۔ جو میری شیروانی میں ہوا کرتا تھا۔ میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں سے میرے بڑے سفید رومال کی بجائے ایک رنگین معطر چھوٹا سا رومال نکلا۔

میں نے سوچا چلو یہی سہی۔ اور یہ سوچ کر اسے نچلی جیب میں رکھنے ہی والا تھا کہ ساتھی کے کوٹ پر نگاہ پڑی۔ اس نے رومال کو اوپر والی جیب میں یوں لگا رکھا تھا کہ آدھا باہر سے نظر آ رہا تھا۔ میں نے بھی اسی طرح لگا لیا ——— اور پھر اپنے ساتھی سے پوچھا "کدھر چلو گے"

اس نے مجھے حیرت سے گھورا اور کہا "تم بول گیا ——— آج اُدر کو چلنا مانگتا ——— اپنا بابا ساب کا جلوس میں"

"اوہو ——— معاف کرنا مجھے یاد نہ رہا تھا ——— چلو اب جلوس نکل بھی چکا ہو گا"

اور ہم دونوں اندھیرے میں کچی ناہموار سڑکوں کو طے کر کے ایک بڑی پختہ سڑک پر پہنچے ——— دُور سے ڈھولک کی آواز آ رہی تھی اور گیس کی روشنی بھی دکھائی پڑ رہی تھی۔ ہم نے قدم تیز کر دیئے ——— روشنی اور آواز قریب ہوتی گئی ——— اور قریب، یہاں تک کہ ہم جلوس کے سر پر پہنچ گئے۔

میں نے دیکھا۔ ایک نہیں۔ تین ڈھولکیں پڑ رہی تھیں۔ جو تین آدمیوں کے گلوں میں لٹک رہی تھیں۔ ہر آدمی کے داہنے ہاتھ میں ایک پتلی چھوٹی سی لکڑی تھی۔ جسے وہ ڈھولک پر ایک خاص انداز میں مار رہا تھا ——— اور ان تینوں کا بایاں ہاتھ ٹھیک اسی وقت ڈھولک کے بائیں طرف پڑتا جبکہ ان کا دایاں ہاتھ ڈھولک کے دائیں طرف لکڑی مارتا۔ ان کے قدم یوں اٹھ رہے تھے جیسے وہ

کسی بڑے حاکم کی میت کی پریڈ کر رہے ہوں۔ ان ڈھول والوں کے ساتھ ساتھ تین ڈفالی بھی تھے۔ جو ڈھب ڈھب۔ ڈھب ڈھب کر رہے تھے۔ اور ان کے قریب ہی کچھ کالے کلوٹے مرد، کچھ کالی کلوٹی عورتیں ناچتی ہوئی چل رہی تھیں۔ ان ناچنے والوں اور ناچنے والیوں کا انداز یہ تھا کہ کبھی آگے جھکتے۔ کبھی پیچھے۔ کبھی دائیں طرف گردن جھٹکتے۔ کبھی بائیں طرف ——— اور کبھی بالکل ہی گھوم جاتے مگر دونوں ہاتھ ایک اڑتے ہوئے پرندے کی طرح برابر ہلتے رہے ——— ان کے پیچھے بہت سے بچے، جوان اور بوڑھے سیاہ فام لوگ گاتے ہوئے چلا رہے تھے اور کبھی کبھی ترنگ میں آکر سب کے سب ناچنے بھی لگتے۔

میں اس جلوس کے دیکھنے میں کچھ ایسا محو ہوا کہ مجھے اپنے ساتھی کا خیال نہ رہا لیکن جب شوق دید کسی قدر کم ہوا تو دیکھا۔ وہ بھی ناچ اور گا رہا ہے۔ اسے ایسا کرتے دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوا جیسے اس بھیڑ میں میں ہی اکیلا تماشائی ہوں۔

جلوس چلتا رہا اور لوگ آ آ کر ملتے رہے کہ اچانک ایک جگہ سے طبل کی آواز آنے لگی۔ اور ادھر ڈھولکیں اور زور سے پیٹنے لگیں۔ اور ڈفلیاں اور سخت سے ڈھب ڈھب ہونے لگیں۔ ناچ اور گانا بھی اسی مناسبت سے تیز اور جوشیلا ہو گیا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں اس کی وجہ معلوم ہو گئی۔ جلوس اس مقام پر پہنچ کر رک گیا جہاں طبل بج رہے تھے۔ یہ بابا صاحب کی درگاہ تھی۔ یہاں پہنچتے ہی طبل ٹھنڈے ہو گئے۔ ڈھولکیں اور ڈفلیاں خاموش ہو گئیں۔

اب تمام لوگ درگاہ کے احاطے میں جمع ہو گئے۔ نیم کے متبرک درخت کے نیچے مزار سے دس گز کے فاصلہ پر ایک حلقہ بنا کر۔ مجاور عورتیں۔ جو ڈھیر تھیں۔ اور کالی ہانڈیوں میں مورچھل لئے مقبرے سے نکلیں اور اس حلقہ کے بیچ میں جو جگہ خالی پڑی تھی۔ جو غالباً بابا صاحب کی خلافت کے مقام پر فائز تھی۔ ابھی وہ آکر بیٹھی ہی تھیں کہ طبل پر چوٹ پڑی۔ ڈھولکی ٹھنکی۔ ڈفلی بجی اور "لا الٰہ اللہ" کے ایک نعرے کے ساتھ گجرے والی عورت اٹھ کر کھڑی ہو گئی ——— اور اس کے بعد تمام مجاور عورتیں کھڑی ہو گئیں۔ پھر ایک عورت نے جو اگلی صف میں بیٹھی ہوئی تھی ایک گیت چھیڑا۔ جس کی تقلید تمام عورتوں نے کی۔ اس گیت کے بول ایک لفظ "تپ تا" پر ختم ہوتے

تپ تا ——— تپ تا ———
الا اللہ ——— الا اللہ ———

اور پھر جیسے یکبارگی مشین حرکت میں آگئی۔ گجرے والی عورت اور تمام مجاور عورتیں بے تحاشا ناچنے لگیں ——— ان کے ہاتھوں میں مورچھل اچھلنے اور کودنے لگے۔ ڈھولکیں، ڈفلیاں اور طبل سب ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے تھے ——— اور "تپ تا" میں مرد بھی شریک ہو گئے۔

ناچ ہوتا رہا۔ مجاور عورتیں تھک تھک کر بیٹھتی رہیں اور دوسری عورتیں ان کی جگہ لیتی رہیں۔ مرد اٹھ اٹھ کر طبل بجاتے رہے اور ناچتے رہے۔ اور بچے غل غپاڑہ مچاتے رہے کہ اچانک کسی نے میرے کندھے میں اپنی انگلیاں پیوست کر دیں۔ میں نے چونک کر دیکھا تو ایک دیونما انسان کھڑا غصہ میں دانت کٹکٹا رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر اپنے کندھے کو چھڑانے کی کوشش کی تو اس نے میری گردن پکڑ لی اور اتنے زور سے پکڑی کہ میری آنکھیں ابل پڑیں اور میری چیخ گھٹ کر اندر ہی رہ گئی۔ میں اسی حالت مرگ میں تھا کہ کسی نے چلا کر کہا "منی براس منی براس ——— مکن مکن (میرا بھائی) ——— میرا بھائی ——— مت کر ——— مت کر"

اس دیونما انسان نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ مگر گردن نہیں چھوڑی۔ چلانے والے نے آکر میری گردن چھڑائی اور بولا "یہ ہمارا چاچا تمہارے کو دشمن جانتا، بابا صاب کا ——— بولتا تم طبل نئی بجاتا، ہم گاتا نائی تم ناچتا نائی"

میں نے اپنے حواس درست کر کے دیکھا تو میرا ساتھی کھڑا تھا۔ میں نے کہا "تم بھی۔ تم تو جانتے ہو۔ مجھے نہ ناچنا آتا ہے نہ گانا"

"چاچا نے کہا "ارے خانہ خراب ——— تم ہمارا موانک بنکر بی ناچتا نا گاتا ——— تم ہمارا برادری کا نام خراب کرتا ——— ہم تمارے کو نکالنا نا مانگتا"

ساتھی نے اشارہ دیکھا کہ میں کھسک جاؤں۔ چنانچہ میں اٹھکر کھڑا ہو گیا اور سیٹی بجا کر جانے لگا کہ ایک زور کا مکہ ملا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو چاچا کی خونی نگاہیں مجھے گھور رہی تھیں۔

ساتھی نے کہا "بابا صاب کو اپنا پشت دکھاتا پڑا ——— ان کا اِزت میں فرق آتا پڑا ——— ہم بولتا، موٹر موانک بھیجو جاتا تم"

چنانچہ میں اپنا منہ مزار کی طرف کر کے الٹا چلنے لگا۔ اور چلتے چلتے ایک پتھر سے ٹکرا کر گر پڑا۔ گرنے سے مجھے کافی چوٹ آئی مگر اس وقت مجھ پر درگاہ سے بھاگنے کی دھن سوار تھی۔ اس لئے پھر اٹھا اور چلنے لگا ——— جیوں ہی میں دروازہ پر پہنچا اور پہنچکر منہ پھیرا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک کرخت آواز آئی۔ "بگرے ——— بگرے (پکڑو) ——— پکڑو" ——— اور دربانوں نے مجھے گرفتار کر لیا۔

میں حیران تھا کہ اب کیا مصیبت نازل ہونے والی ہے ——— دیکھا تو چاچا دوڑا چلا آرہا تھا ——— اور اس نے آتے ہی میری گردن دبوچی اور مجمع مزار کی طرف لے چلا۔ جو مقبرے کے اندر تھی۔

مقبرے کے اندر پہنچکر میں نے دیکھا۔ ایک سات فٹ لمبا مزار تھا۔ جو رنگین چادروں اور پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے سرہانے ایک سنگ مرمر کا کتبہ لگا ہوا تھا۔ اور اس کے اوپر ایک شامیانہ سا بنا ہوا تھا۔ جس پر سونے کا

تلے پڑھا ہوا تھا۔ فرش اور دیواریں آراستہ پیراستہ تھیں جیسے کسی بادشاہ کا محل ہو۔ دیواروں پر قل ہو اللہ۔ آیۃ الکرسی۔ درود شریف اور دوسری آیتیں لکھی ہوئی تھیں۔

میں ابھی آکر کھڑا ہی ہوا تھا اور مقبرے کی ان تمام چیزوں کا جائزہ لے رہا تھا جو میری نگاہوں کے سامنے تھیں کہ چاچا نے میری گردن زور سے دباتے ہوئے چیخ کر کہا "سالا ــــ تم بابا صاب کو سجدا نئی مارتا" ــــ اور اس نے زبردستی میرا سر مزار کے آگے جھکا دیا ــــ پھر بولا "تم بابا صاب کو چمتا نئی۔ ــــ ہم تمارا موہ توڑ دینگا" ــــ اور اس دھمکی کے ساتھ ہی میرے منہ پر ایک طمانچہ پڑا "سالا تم بابا صاب کا دشمن۔ چومتا نئی مانگتا ــــ ہم تمارے کو مار کر دفن کر دینگا" ــــ چنانچہ میں نے اپنے ہونٹ مزار پر رکھ دیئے جس سے چاچا خوش ہو گیا اور مجھے اطمینان سے کھڑا ہو جانے دیا ــــ پھر فرمایا "فاتیا مانگتا ــــ نئی ہم ــــ" اور پیشتر اس کے کہ وہ بات پوری کرے میرے ہاتھ اٹھ گئے اور میں نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا "اے بابا صاحب۔ اللہ تم پر رحمت کرے۔ لیکن تمہاری اُمت کو کبھی نہ بخشے ــــ ہائے کن جاہلوں سے پالا پڑا ہے ــــ تم نے اکا مخلوق کو اپنا مرید کیوں بنایا ــــ اور اگر بنایا ہی تھا تو انھیں پوری اسلامی تعلیم دیتے۔ ان کی صحیح تربیت کرتے اور انھیں اسلامی زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتاتے ــــ ــــ جانے کیا تم نے سکھایا پڑھایا کہ آج یہ کھیل۔ تماشے۔ ناچ۔ گانے ہو رہے ہیں ــــ خیر! اب یہ بتاؤ کہ میں یہاں سے نکلوں کیسے ــــ"

میں کافی دیر تک یوں ہی بکتا رہا کہ اچانک ساتھی کی آواز کان میں پڑی۔ وہ کہہ رہا تھا "اب جاتا پڑا ــــ ہما را بابا صاب سونا مانگتا ــــ ہم بی سوتا پڑا"

چنانچہ میں اس کے ساتھ ہو لیا ــــ میں نے چاچا کو ادھر اُدھر تلاش کیا مگر وہ جانے کدھر غائب ہو گیا تھا ــــ ورنہ ممکن تھا کہ ابھی کچھ اور پاپڑ بیلنے پڑتے ــــ لیکن جیسے ہی ہم مقبرے سے چل کر اس مقام پر پہنچے۔ جہاں قبل رکھا ہوا تھا۔ کسی نے اس زور سے طبل بجایا کہ وہ پھٹ گیا ــــ اور میں چونک کر بیدار ہوا۔

دیکھا تو میں اپنی پلنگ پر ہی دراز تھا ــــ اور میرے ہاتھ میں درد ہو رہا تھا۔ جسے میں نے پٹی پر زور سے ٹپک دیا تھا۔

چاٹ ــــــــ بقیہ صفحہ ۴۸

آنے کے بعد تو اس نے ایک لقمہ بھی نہیں کھایا"

"یہ اچھی بات نہیں ہے . . . پھر بھی بچے تم نے کچھ تو ضرور ہی کھایا ہوگا۔ مجھ سے صاف صاف بتا دو . . . "

"جی میں نے فیمہ اور آلو کے سموسے کھائے تھے . . . میں نے . . . . بیچ دیا۔ ایشیا، افریقہ . . . . "

اتنے میں آنند کا باپ بھی کلب سے یکّہ پر واپس آگیا۔ یکّہ سے اُچک کر وہ فوراً کمرے میں پہنچا جہاں آنند پڑا کراہ رہا تھا اور متعجب ہو کر پوچھا "کیا معاملہ ہے۔ ہے" ایک گھنٹہ کے بعد گھر میں خاموشی ہو گئی۔ آنند کے پیٹ میں پولیس لگی تھی اور وہ خاموشی سے بستر پر پڑا تھا۔ اس کے قریب اس کی ماں اور بہن بیٹھی تھیں۔ اور اس کی ہر خواہش کو پوری کر رہی تھیں۔

خلش اور بیچینی ختم ہو چکی تھی (درد ختم ہو چکا تھا) اور آنند مکمل سکون اور آسودگی محسوس کر رہا تھا۔

(چیخوف کے ترجمہ سے)

پ۔ حنیف

چاٹ

"مجھے کچھ نہیں چاہئے . . . . آنند نے ایک طویل خاموشی کے بعد یہ جواب اس وقت دیا جبکہ اُسے کھانے پر آواز دی گئی۔

جب اُسے چائے کے لئے بلایا گیا تو اُس نے بہت اطمینان کے ساتھ جواب دیا:

"چائے پانی، جو کچھ بھی ہے آپ اپنے لئے رکھئے۔ میری پروا مت کیجئے۔ مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں ہے۔"

یہ جواب سن کر آنند کی بڑی بہن زور زور سے قہقہہ لگا کر بے تحاشہ ہنسی ہنسنے لگی اور اُس نے کہا: "کیا تمہارا خیال ہے کہ کوئی تمہاری پروا کرتا ہے؟ تم چاہو تو کھانا پینا سب چھوڑ دو۔ ہمیں اس کا بالکل افسوس نہ ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ ہنستی ہوئی دروازہ کے پیچھے غائب ہوگئی۔ بہرکیف آنند اس کے اس طرح ہنستے ہوئے باہر چلے جانے اور حد درجہ (مبالغہ آمیز) بے پروا جواب میں بھی اپنے لئے ہمدردی کی ایک جھلک نظر آئی۔

وہ بہانہ کر رہی تھی اور یہ یقین دلانا چاہتی تھی کہ پاپا اور ماتا کو اس کے کھانے پینے کی کوئی پروا نہیں . . . . . کچھ بھی ہو انہیں اس کی پروا ضرور تھی وہ یہ جانتے ہی نہیں تھے کہ کس طرح اُسے منا کر کھانے کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے . . . . . ہنہہ! پریشان ہوا کریں . . . . . غلطی انہیں کی تھی . . . . انگریزی میں صرف ایک نمبر پانا ایسی غلطی تو نہ تھی جس کے لئے اسے دو سب کے سامنے بے عزت کرتے اور اس پر یہ بھی کہتے کہ وہ صرف سوچی لینے کے قابل ہے . . . . . سوچی دریچی کہہ جانے کی تو اسے پروا نہیں تھی۔ . . . . پھر بھی اس وقت وہ کھانا کھانے کے لئے تیار نہیں تھا۔

آنند ڈرائنگ روم میں بیٹھا ایک رسالہ پڑھ رہا تھا اور رہ رہ کر بغل کے کمرے میں جو کچھ ہو رہا تھا اُسے بھی سنتا جا رہا تھا۔ بغل کے کمرے میں اُسی کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔

"آنند کہاں ہے؟ کیا اب تک وہ پڑھ رہا ہے؟" اس نے ماتا کی کی آواز سنی۔

"وہ خفا ہے۔" نینا نے خاموشی سے جواب دیا۔

"پھر بھی ہمیں اس کے لئے کچھ باقی چھوڑ دینا (رکھنا) چاہئے۔" پاپا کی بھاری آواز سنائی پڑتی ہے۔

"میرے لئے کچھ چھوڑ دیں گے۔ ہنہہ! "ہوں" . . . . جیسے مجھے اس کی خواہش ہی تو ہے!" آنند نے بھنبھناتے ہوئے کہا: "ایک موچی کے لئے کچھ چھوڑنے (رکھنے) کی کیا ضرورت ہے۔"

"آنند! اس کے باپ کی آواز آئی ہے۔ آنند خاموش رہتا ہے۔ اس کا باپ پھر آواز دیتا ہے۔

"کیا بات (ضرورت) ہے؟" رسالہ پر اور زیادہ جھکتے ہوئے آنند بہت سکون کے ساتھ جواب دیتا ہے۔

"یہاں آؤ! بڑے خاموشی سے انگموت — . . . ."

"یہاں میں پڑھ رہا ہوں۔ ایک موچی کے لئے یہ زیبا نہیں کہ وہ دسترخوان پر بیٹھے۔"

"پاگل!"

"اچھا پاگل ہی ہوں" آنند زور سے چیخ اٹھا۔

"وہ خفا ہے۔" اس کی بہن نے زور سے کہا۔

"خاموش رہو۔ بیوقوف!" آنند جھلا کر بھنبھنایا اور اپنی بہن سے وہ زبردست نفرت کرنے لگا۔ اس کی بری طرح یہ خواہش ہوئی کہ اس سے کوئی بدلے . . . . کاش صرف وہاں اس کے باپ نہ موجود ہوتے . . . . وہ کیوں۔ خواہ مخواہ مزاحمت کر رہی تھی؟ کوئی اس سے مشورہ تو نہیں لے رہا تھا! وہ جھلا اٹھا۔ رسالہ میز پر پٹخ دیا۔ جیب میں سے ٹٹول کر ایک پنسل نکالی اور ایک تصویر کے نیچے۔ جس میں ایک جوان مرد اور ایک جوان لڑکی بیٹھے تھے حروف میں یہ لکھ دیا: "یہ نینا اور بوس۔ وہ اوّل درجہ کے بیوقوف — ہیں۔"

اس نے رسالہ کے اس صفحہ کو کھول کر میز پر رکھ دیا تاکہ ہر شخص اسے دیکھ سکے اور اٹھ کر اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ اپنی میز پہ نیلا کے کشیدہ کاری کا سامان پڑا دیکھ کر وہ آگ بگولہ ہو گیا اور اسے اٹھا کر فرش پر پھینک دیا۔ "یہ سب کر دہات میری میز پر نہیں رکھے جا سکتے۔" وہ چیخا حالانکہ اس کو سننے والا وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ آنند ہر شخص کو اپنا دشمن سمجھنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے پورا گھر دو طرف (فریق میں) منقسم ہو گیا ہے۔ ایک طرف تو تنہا وہ خود ہے اور دوسری طرف گھر کے بقیہ افراد۔ اسی لئے جب نوکرانی کمرہ میں آئی اور اسے مخاطب کیسا تو وہ اس پر فریق مخالف کی طرح جھپٹ پڑا۔

"آنند بابو!"

"نکل جا آنند بابو کی بچی!"

"آپ سے ایک صاحب ملنے آئے ہیں!"

"میں کہہ رہا ہوں تم نکل جاؤ!"

"آپ نے کھانا نہیں کھایا ہے اسی لئے خفا ہو رہے ہیں۔۔۔"

آنند جانتا تھا کہ نوکرانی کو کسی نے بھیجا تھا۔ بعد میں اسے بہت افسوس ہوا اور اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔۔۔ پھر بھی وہ بچہ نہیں تھا۔۔۔ "ہنہہ" (ہوں) ان سب کو پریشان ہونے دو!۔۔۔ لیکن وہ واقعی بھوکا تھا۔ کیا وہ باورچی خانہ میں چلا جائے؟ نہیں وہ ایسا تو نہیں کر سکتا تھا۔ باورچی نوکرانی سے ضرور بات کہہ دیتا اور وہ اس کے والدین سے کہتی اس طرح انہیں تسلی ہو جاتی۔ اور آنند کو شکست مان لینی پڑتی۔ بھوک برداشت کر جانا ہی اس کے لئے بہتر تھا۔ البتہ اگر اس کے باپ یا ماں آکر کہتے "آنند بیٹا خفا مت ہو۔۔۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ اگر تم کھانا پینا چھوڑ دو گے تو تمہارے بیمار پڑ جانے کا امکان ہے جس سے ہماری پریشانی بہت بڑھ جائے گی۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ ایسی غلطی ہو گئی اب آئندہ ایسا نہیں ہو گا" تب تو وہ راضی ہو جاتا اور فوراً دسترخوان پر پہنچ جاتا۔ کھانا تو اس کے لئے کچھ رکھا ہی تھا۔ اس دن مچھلی کے کباب بنے تھے۔۔۔ آنند کی رال ٹپکنے لگی۔ اس نے دروازہ کی طرف سے کسی کو پیروں کی چاپ سنائی دی۔ پاپا تو آنے سے رہے البتہ ماتا ضرور آسکتی تھیں اور کہتیں کہ مجھے افسوس ہے۔۔۔

لیکن ماں بھی نہیں آئی اور وہ بھوکا ہی رہا۔ ماتا کے بجائے اس کے پاپا کا خوبصورت کوسی دروازہ پر آیا۔ خاموشی سے کمرے میں آیا اور آنند کے پاس کھڑا ہو کر دم ہلانے لگا۔ کوسی کی جگہ تو پاپا کی میز کے نیچے ہے کمبخت یہاں کیسے آگیا؟ جائیے اپنے مالک کے پاس دم ہلائیے۔ اس نے تو اتنا ٹھونس لیا ہے کہ ابھی پھٹ پڑے گا۔

"جا نکل بھاگ!" آنند نے زور سے کوسی کو مارتے ہوئے کہا۔ کوسی دم دبا کر اور کان پیچھے موڑ کر باہر بھاگا۔ اور آنند بھوکا ہی رہا۔۔۔۔۔

دیر تک وہ بیٹھا اپنی حالت پر غور کرتا رہا۔ آخر کار اسے ایک ایسی ترکیب سوجھی جو گھریلو دشمنوں سے صلح و مصالحت کے قسم کی مصیبتوں سے اس کو نجات دلا سکتی تھی۔ بھٹناگر اسی محلہ میں تو رہتا تھا جس نے ایک مرتبہ اپنے بھائی کی الجبرا کی کتاب۔ شکلا کتاب والے کے ہاں فروخت کی تھی اور اپنے لئے ایک چاقو خریدا تھا۔۔۔۔

آنند اپنی پچھلے سال کی کتابیں فروخت کر سکتا تھا۔۔۔۔ اف سارا مسئلہ حل تھا۔۔۔ (ہنہہ) "ہوں" وہ سب پریشان ہو اکریں۔ آخر غلطی ان ہی کی تھی۔۔۔۔ آئندہ خود ہی بہتر طریقہ سے پیش آویں گے۔

آنند نے کتابوں کے بیگ میں سے ٹٹول کر ایک پتلی سی کتاب نکالی۔۔۔۔ "مجھے اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے لیکن بہت جلد تو نہیں۔۔۔۔ اس وقت تک وہ بھول بھی جائیں گے کہ یہ کتاب میرے پاس ہے اور مجھے ایک نئی کتاب خرید دیں گے" آنند نے غور کیا اور اسے فروخت کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ کھانے کے کمرے سے گذر کر نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ وہاں گھر کے تمام افراد بیٹھے تھے۔ شاید ان کو خیال پیدا ہو اور آنند صلح کرنا چاہتا ہے۔

کتاب کو قمیص کے نیچے چھپا کر وہ دیوار پھلانگ گیا اور بازار کی طرف چل پڑا۔ شام ہو چلی تھی۔ دوکان کے جلد ہی بند ہو جانے کا امکان تھا۔۔۔۔ اس لئے آنند ہوا کی طرح تیزی سے چل رہا تھا۔ بہت سے زیر تعمیر مکانوں سے گذر کر وہ راستہ کو مختصر کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے اس کے جوتوں میں بڑا سا سوراخ ہو گیا۔ جوتا بالکل نیا تھا اور اسے حفاظت سے استعمال کرنے کی تنبیہ کے ساتھ دیا گیا تھا۔ اگر کوئی دوسرا موقع ہوتا تو وہ جوتوں میں سوراخ ہو جانے پر بہت پریشان ہوتا ——— لیکن اس وقت تو اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ پریشانی کیسی پاپا خود ہی نیا خرید دیں گے! البتہ اس ایک موچی کی طرح ننگے پاؤں چلنے کو بھی وہ کر سکتے تھے۔۔۔۔ لیکن وہ ابھی طرح جانتا تھا کہ پاپا اسے نیا جوتا ضرور خرید دیں گے۔۔۔۔۔۔۔ یہ بات موزوں نہیں معلوم ہوتی کہ ایک وکیل کا لڑکا پھٹے ہوئے جوتے پہن کر پھرے۔۔۔۔ اونہہ پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔۔۔

آخر بازار آ گیا۔ ہر جگہ چہل قدمی اور خوشی اور حرکت تھی۔ . . . . . بالکل غل غپاڑہ . . . . لڑنا جھگڑنا۔ چلاہٹ۔ شور و غل۔ جیسے بالکل مکمل بزم شیاطین!

"گرم سموسے۔ کچوری!" ناک سے آواز نکالتے ہوئے ایک آدمی نے آواز لگائی۔ اس نے آنند کو دیکھ کر اس سے پوچھا "سموسے چاہئیں بابو جی؟"

"کس چیز کے بنے ہیں؟" آنند نے پوچھا۔

"مجھ سے لے لو بیٹے۔ اس کے تو ٹھنڈے ہیں اور میرے بالکل گرم!" ایک عورت ——— جو کھونچے لئے کھڑی تھی ——— تیزی سے بولی۔

"تھوڑی دیر میں میں کچھ سموسے خریدوں گا۔ ابھی میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

آنند یہ کہتا ہوا پرانی کتابوں کی دوکانوں کی طرف گندے راستوں اور بھیڑ سے گذرتا ہوا تیزی سے بڑھا ۔۔ جب وہ ایک دوکان پر پہنچا اس کا دل اس کا بدن گھبراہٹ سے کپکپا رہا تھا۔ دوکاندار اس انداز سے کھڑا تھا جیسے اسے کسی کے آنے کی امید تھی۔ اس کی سنجیدگی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دوکاندار ہونے کے بجائے کوئی پروفیسر ہے۔

ایک طالب علم کو آتے دیکھ کر وہ الماری سے لگ کر چھپ گیا اور ایک کتاب کو کھول کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے واقعی اس کتاب کو پڑھ رہا ہو۔

"کیا آپ کتابیں خریدتے ہیں؟"

"تم کو کیا بیچنا ہے؟"

"ایشیا۔ افریقہ۔ اور امریکہ! بالکل نیا!" ہانپتے ہوئے آنند نے کہا۔

"مراد جی بھارگو کی لکھی ہوئی؟"

"جی"

"اگر یورپ ہوتا تو میں اسی وقت خرید لیتا۔ لیکن یہ تو میرے پاس بہت ہیں۔"

دوکاندار نے آنند سے وہ کتاب لاپروائی سے لیتے ہوئے کہا۔

"یہ پرانی ایڈیشن ہے . . . . . میں تم کو اس کے دس آنے دوں گا"

اس نے کتاب کے چند ورق الٹتے ہوئے مزید کہا۔

"مجھے تو اس کو ایک روپیہ میں فروخت کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔"

آنند نے ہچکچاتے ہوئے کچھ مشتبہ لہجہ میں یہ بات کہی۔

دوکاندار نے بدن توڑتے ہوئے ایک جمائی لی اور کتاب آنند کے ہاتھ میں تھما دی۔

"اچھا پندرہ آنے ہی دے دیجئے . . . . . دیکھئے کتاب بالکل نئی ہے!"

دوکاندار نے کوئی جواب نہ دیا۔

"خیر لائیے دس آنے دیجئے؟"

دوکاندار نے دس آنے آنند کو تھمائے اور کتاب کو لاپرواہی سے ایک الماری میں پھینک کر دوبارہ جمائی لیتے ہوئے بولا "تم کو اس کے بہت اچھے دام مل رہے ہیں۔"

"میں شاید آئندہ یورپ بھی لاؤں گا۔" پیسوں کو جیب میں ڈالتے ہوئے آنند بولا۔

"لاؤ . . . . . بالکل ایسی ہی تو ہے؟ کسی دوسری کے دس آنے نہیں ملیں گے۔ اپنے سب دوستوں کو ہمارے پاس بھیج دیا کرو۔ میں دوسرے دوکانداروں سے بہتر قیمت دیتا ہوں۔"

"جی میں ضرور بھیجوں گا۔"

آنند دوکان چھوڑ کر آگے بڑھا اور کھانے کی چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ابھی وہ سموسوں کی دوکان تک پہونچا بھی نہیں تھا کہ حلوے اور لڈو اسے لالچ دینے لگے۔ اس نے تین آنے میں کچھ حلوہ اور لڈو خریدا اور اسے خوب شوق سے مزے لے کر کھایا۔ تب وہ سموسے والی کے پاس گیا۔

"یہ کس چیز کے بنے ہیں؟"

"قیمہ۔ آلو۔ اور سبزیوں کے۔"

"کیا بھاؤ؟"

"پانچ آنے میں دو۔"

"مجھے سبزیوں سے بنے سموسے تو پسند نہیں۔ ایک آلو کا اور ایک قیمہ کا سموسہ دیدو۔"

سموسے کھا چکنے کے بعد اسے پیاس محسوس ہوئی۔ بقیہ دو آنوں میں اس نے ایک گلاس لسی پی۔

جب آنند مکان پہنچا تو اس نے میز پر ٹھنڈا گوشت، کچھ روٹیاں۔ ایک گلاس دودھ اور میٹھے کباب کی تین ٹکیاں رکھی ہوئی پائیں۔ اسے میٹھے کباب بہت پسند تھے اور اس وقت وہی اس کو للچا رہے تھے پھر بھی اس کا غرور اسے کھانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ البتہ اگر اسے یہ یقین ہو جاتا کہ کسی کو یہ پتہ نہیں رہا کہ وہاں کباب کی دو ٹکیاں رکھی تھیں۔ یا تین۔ تب تو وہ ایک ضرور رکھا جاتا۔ اس بہت احتیاط سے ہر ایک میں سے تھوڑے

تھوڑے کباب نکالے اور انہیں کھا گیا۔ ایک گھونٹ دودھ بھی پیا ــــ جو بہت نفیس تھا۔ . . . لیکن نہیں! . . . . وہ دوسرا گھونٹ نہیں پی سکتا تھا۔

حلوے۔ لڈو۔ گوشت اور آلو کے سموسے۔ لسی۔ کباب۔ دودھ۔ ان سب نے مل کر اس کے پیٹ میں گڑبڑ مچا دی۔

"اوف! توبہ!" وہ تکلیف سے کسمسایا اور بار بار فرش پر تھوکے جا رہا تھا۔"

"کہاں تھے تم؟" دروازہ تک آ کر نینا نے پوچھا۔"

"تم سے کیا مطلب۔ میں تو تم سے نہیں پوچھتا کہ آپ کہاں سیر کرنے گئی تھیں۔"

نینا گذر رہی تھی کہ اس کی نظر میز پر آنند کے لئے رکھے ہوئے کھانے پڑی۔ جس میں سے بالکل کچھ کھایا نہیں گیا تھا۔

"ماتا نے تم سے یہ گوشت کھانے کے لئے کہا ہے!"

"مجھے خواہش نہیں ہے۔ میں پاگل ہوں . . . . جوتے بنانے والا ہوں . . . . تم سب تو وکیل ہو!"

"جیسی تمہاری مرضی!"

"بہت خوب! آپ بوس کے ساتھ سیر سپاٹے کے لئے جا سکتی ہیں مجھے تنہا چھوڑ دیجئے . . . ."

"بدتمیز!" وہ چیر گئی اور بکتی ہوئی باہر چلی گئی۔

آنند کھانے سے بے توجہی برت کر اپنے دشمنوں کو شکست دینا چاہتا تھا حلوے۔ لڈو۔ سموسے۔ لسی۔ کباب۔ دودھ۔ یہ سب اس کا ساتھ دینے کو تیار تھے۔

شاید وہ اس سلسلہ کو کافی عرصہ تک باقی رکھتا لیکن ایک اچانک واقعہ نے (اس کھیل کو) بالکل ختم کر کے رکھ دیا) اس کے سارے کس بل ڈھیلے کر دیئے۔

آنند کے پیٹ میں درد ہوا اور یہ درد رفتہ رفتہ بڑھتا ہی رہا۔ درد کی شدت سے وہ پیٹ کے بل بستر پر پڑا اینڈتا رہا۔ وہ اپنی حالت کو دوسروں پر ظاہر کر کے خود کو مجبور و لاچار نہیں ثابت کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر تک تکیہ میں سر ڈال کر وہ پڑا سسکتا رہا لیکن حلوے۔ سموسے اور لسی اپنا اثر دکھا (ظاہر) کر کے رہے۔ جب درد ناقابل برداشت ہو گیا تو وہ زور سے کراہا اور تکیہ پر ہاتھ سر پٹخنے لگا۔

"آہ! یہ کیسی سزا ہے!" پیر ٹیک کر وہ کبھی کبھی بک جھک کئے جا رہا تھا۔ رات ہونے تک درد کی شدت قطعی ناقابل برداشت ہو گئی۔ تب وہ چیخا۔ جسے سن کر گھر کے سب لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ سب نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس وقت صرف اس کے باپ موجود نہیں تھے جو کہ حسب معمول کلب گئے ہوئے تھے۔ ماں نے تھرما میٹر لگایا درجہ حرارت معلوم کیا، بہن بینا دوڑ کر تیل کی شیشی اٹھا لائی۔ نوکرانی دوڑتی ہوئی ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی۔ یہاں تک کہ نوسی بھی اس کو دیکھنے کے لئے آ پہنچا۔ اور اس ہنگامے میں (کرام سے گذرتا ہوا) بہت پُر مردہ چہرہ (سا کہ) ــــ ایسا چہرہ جس سے ہمدردی ٹپک رہی تھی ــــ اس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

"یہ تم نے کیا کر لیا؟" ماں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ اس کے دل کی گہرائی میں یہ خوف زور پکڑ رہا تھا کہ کہیں آنند نے زہر تو نہیں کھا لیا جیسا کہ وہ ایسے دوسرے موقعوں پر دھمکی دے چکا تھا۔

"تم نے کچھ کھا تو نہیں لیا ہے؟" آنند بتاؤ! میرے پیارے آنند جلد بتاؤ . . . .!

"ماتا! آہ! اُوو! ماتا۔ میں نے ایشیا۔ افریقہ اور امریکہ فروخت کر دیا۔"

. . . . آہ! آہ! اُف! . . . . اور ان سے کچھ سموسے خرید لئے . . . .

"کیا معاملہ ہے؟ آنند! ہے بھگوان۔ یہ تو بالکل پاگل ہوا معلوم ہو رہا ہے . . . . کس طرح بک جھک رہا ہے! جلد اس کے پتا کو بلانے کے لئے کسی کو کلب بھیجو! ہے بھگوان! ماں آنند کے اوپر جھک پڑی۔ اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا اور اس کے گال کا بوسہ لے لیا۔ اس کی بہن کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ وہ کمرے میں ادھر سے ادھر دوڑ رہی تھی۔ پھر جلدی سے کھڑکی کی طرف بڑھی وہ وہاں کھڑی ہو کر بہت بے صبری کے ساتھ ڈاکٹر کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آ گیا۔

"بتاؤ تو تمہیں کہاں تکلیف ہے بچے؟ ذرا اس طرف کھسکو!"

آنند نے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق کروٹ بدلی۔ ڈاکٹر نے آلہ لگا کر اس کی جانچ کی۔

"آج تم نے کیا کھایا تھا؟"

"ڈاکٹر صاحب آج تو اس نے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔ اسکول سے واپس

(ملاحظہ فرمایئے صفحہ ۴۲)

مترجمہ ابرار احمد اعظمی

غلّہ کے انبار میں

ظہیر پور بازار میں داخل ہوتے ہی چوراہے کے داہنی طرف جو دکان نظر آتی تھی وہ رگھو بیر کی تھی۔ وہ غلّہ فروخت کرتا تھا۔ بانس کی ٹوکریوں میں مختلف قسم کے غلّوں کا انبار ہر وقت دیکھا جا سکتا تھا۔ گیہوں۔ جو۔ چنا۔ مٹر۔ غرضیکہ ہر چیز مل جاتی تھی۔ . . . آدھی گرد اور تلن ملے ہوئے گیہوں سے لے کر نفیس یا سیمیں جیسے سفید اور سوئی جیسے چکنے چاول تک . . . . . اس کی دوکان بہت ہی تاریک اور گنجان رہتی تھی، اور چار چھ گاہک آ جاتے تو سانس لینا بھی دشوار سا ہو جاتا۔ مگر اس کے ایک ایک چیز سے اس کو محبت تھی۔ بوروں کی مہک کو وہ پسند کرتا تھا۔ اور تازہ کوٹے چھڑے چاول جب اس کی دوکان میں آتے تو ان کی سوندھی خوشبو سے وہ مست سا ہو جاتا اتوار اور جمعہ کو جب بازار لگتی تو وہ اپنی دوکان کے باہر غلّہ رکھتا۔ اور بچا کھچا کو کریوں میں رکھتے کے وہ بوند ریپور رنگا رنگ ٹیلوں کی طرح مختلف قسم کے غلّوں کا انبار لگا دیتا۔ اسی طرح اس کی دوکان ترقی کرتی رہی۔

سوکھا پڑا ہوا تھا۔ بارش بالکل نہیں ہوئی تھی۔ دھان۔ سوکھے جا رہے تھے۔ جہاں خوش قسمتی سے کوئی تالاب یا کنواں نزدیک تھا وہاں کچھ ہریالی نظر آ جاتی تھی۔ وہ بھی ان لوگوں کے کہ جن کے پاس روپیہ تھا۔ . . . . بے چارے غریب الوطن کی مصیبتوں کی فوجت اور سود پر لئے ہوئے بیج ان کی ساری امیدیں دھان کے ساتھ ہی ختم ہو رہی تھیں اور کچھ کو تو کھا گئے تھے۔ جیسے کسی کا اکلوتا جوان لڑکا مرا ہوا اور وہ بے بس ہو۔ . . . اور پھر ایک ماہ بعد جب چیت آیا تو لوگوں کے چہروں پر مردنی سی چھا گئی۔ جو کچھ پانی تھا وہ بھی ختم ہو چکا تھا اب بویا کیسے جائے، کھیت بالکل خشک تھے . . . . . لوگ خالی آنکھوں اور لڑکھڑاتے قدموں سے مسلسل ادھر اُدھر گھومتے پھرتے تھے گویا اگر ہی پڑیں گے۔

مگر پھر بھی اس کی دوکان بند نہیں ہوئی تھی۔ ادھر اُدھر گھوم کر وہ غلّہ لاتا۔ اور فروخت کرتا ہی تھا۔ البتہ بجائے ٹوکریوں کے بجائے آٹھ دس ہی نظر آتی تھیں۔

فطرت بیکار نہایت سنگدل نظر آتی تھی۔ لوگ مرنے کے قریب ہو گئے مگر بارش نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ قحط بدستور رہا۔ لیکن رگھو بیر کے کیستوں اور دوکان دونوں جگہ ان پوریٹ اینوں کا کایا پلٹ ہوتا رہا۔ اس کے پاس سرمایہ تھا اور سرمایہ وقتی طور پر تو ہر مشکل کو حل کر دیتا ہے۔ اور غلّہ تو اس کا ایک جزو ہو کے رہ گیا تھا۔ اپنے باپ کے زمانے سے ہی اس نے دوکان پر کام کیا تھا۔ یہ وہ دن تھے جب اس نے غلّہ کے بوروں سے فن کے وجہ سے ہر وقت دکان پر رہنا پڑتا تھا۔ نفرت سی تھی۔ مداری کے تماشے۔ کشتیاں۔ اور اسی قسم کی دوسری تفریحات کو وہ ترستا ہی رہ جاتا تھا۔ کبھی کبھار اپنی آدمیوں سے بھری ہوئی دوکان سے اگر ایک جھلک نظر آ جاتی تو ان کو تعریف سے دیکھنے کا شوق اور غلّہ کے انبار سے نفرت دونوں بڑھ جاتے تھے۔ مگر ایک ہی لمحہ کے لئے کیونکہ فوراً ہی اس کا باپ اور متعدد گاہک متوجہ کر لیتے تھے۔ اس کا باپ اسے ہمیشہ مفید ہی رکھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا دس برس سے زیادہ کے نوجوان کو اگر لڑاکو نہیں بنانا ہے تو ان کی اچھی طرح نگرانی کرنی چاہئے۔ اس نے اتنی سختی سے اپنے کہنے پر عمل کیا کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد نوجوان رگھو بیر کے آنکھوں کے سامنے اگر کوئی چیز رہتی تھی تو غلّہ، اگر کچھ سوچتا تو صرف غلّہ کی قیمتوں کے بارے میں، اگر کہتا تو غلّہ کی قسموں کے متعلق . . . . یہاں تک کہ اگر کبھی خواب میں بھی کچھ دیکھتا تو غلّہ ہی . . . .

اور پھر جب اس کا باپ مرا تو اس نے اتنی خوبی سے اس کی جگہ کو پُر کیا کہ کسی نے دونوں میں کوئی فرق نہیں محسوس کیا۔ بہت سے لوگ تو اب بھی سمجھتے تھے کہ مُنّا صیر اندوز پیسہ کا حساب کر رہا ہوگا۔ .

رگھو بیر کے پاس پانچ گائیں اور بھینسیں تھیں جن کا دودھ دہی مٹھا سب کچھ وہ اس کی بیوی اور تینوں لڑکے استعمال کرتے تھے وہ بالکل گول مول غبارے کی طرح پھول گئے۔ تربیہ کے گاؤں میں چند ایکڑ

زمین بھی اس کے پاس تھی اور وہ سال میں چند بار اس کی نگرانی کے لئے جایا کرتا تھا۔ مفلوک الحال لوگوں کو بھاری شرح سود پر قرض بھی دینے لگا اور اس طرح کچھ عرصہ میں متعدد مکانات کا مالک بھی ہو گیا۔ جن کے کرائے ہر ماہ سیونگ بینک میں اس کا حساب بڑھایا کرتے ——— اور اب "وہ سیٹھ" رگھو بیر ہو گیا تھا۔

اپنے لڑکوں کو اس نے اسکول میں داخل کرا دیا اور ایک ٹیوٹر بھی رکھ دیا جو روزانہ رات کو لالٹین کی مدھم روشنی میں چلا کر پڑھایا کرتا تھا۔ اس نے سیٹھانی کو سونے کے زنانی زیوروں اور بنارسی ساڑک کی ساریوں سے لاد دیا۔ اس کا مکان بھی تین منزلہ ہو گیا اور کوٹھریوں کی جگہ بڑے کمروں نے لے لی۔ ہر کمرہ گہری نیلی وارنش سے رنگ دیا گیا تھا اور دیواریں نہرے چمک دار نمبروں میں سینکڑوں دیویوں اور دیوتاؤں کی حسین تصویروں سے پٹ گئیں۔

تمام روز وہ اپنی آئرن سیف کے پاس بیٹھا رہتا اور روپیہ گنتا جاتا۔ ساتھ ہی کنکھیوں سے اپنے مددگار کو بھی دیکھتا جاتا جو غلہ تولتا ہوتا تھا۔ یہ اس کے لئے ایک سکون و فرحت دینے والی چیز ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ اگر کبھی ٹوٹتا تھا تو صرف سونے کے وقت ہی۔ . . . بظاہر کوئی وجہ نہ تھی کہ ہمیشہ ایسا نہ رہتا۔ اس کا کاروبار جاری رہتا۔ مختلف طریقوں اور مختلف جگہوں سے روپیہ آتا اور اس کے سیف کا وزن بڑھتا جاتا ——— اور پھر اس کے لڑکوں میں سے ایک اس کی شکل و صورت میں اس کی جگہ سے لے لیتا تاکہ یہ سلسلہ جاری رہ سکے ———

اور شاید ایسا ہی ہوا ہوتا اگر جنگ نہ چھڑتی۔ وہ گھر آگیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ بس اب خاتمہ ہے ——— لیکن پھر اس کی زندگی دوبھر ہو گئی۔ بیرونِ ملک سے غلہ کی درآمد رک گئی تھی اور اس کا ذخیرہ سونے میں تولا جا سکتا تھا۔ لوگ ہر وقت ہی گھیرے رہتے اور اس کے سیف کا دروازہ شاید ہی بند ہوتا ——— اس نے ایک گلی میں ایک مخفوظ مکان خریدا جو کہ گودام کے لئے تھا۔ پھر ایک۔ دوسرا اور پھر ایک۔ اور ——— اس نے چند گاؤں بھی خرید لئے تھے۔ اس نے اپنی ہیبت ناک سونے کے بار میں اور اضافہ کیا ——— اور خود اس کی دہشت بھی اس کی کمر میں مشکل ہی سے رکھتی تھی۔

جنگ نہایت بارکت ثابت ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ کنٹرول ہونے لگا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اس طرح پریشان ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کو اتنا بیچو اور اس طرح بیچو۔ کہنے کا کیا حق حاصل ہے اپنے دوستوں سے اکثر کہتا "سرکار کو ان کاروباری چیزوں سے کیا مطلب۔ سرکار تو چور بازار کے نالی وغیرہ بنا دینے کے لئے ہے اور بس"۔ اگر اتفاق سے کوئی کہہ دیتا "حکومت تو بس برباد کر رہی ہے اور کنٹرول سارا ناش کئے ڈال رہا ہے"۔ تو اس کی آنکھیں چمکنے سی لگتیں۔ چہرہ بشاش ہو جاتا اور منت اور خوشامد کی ملی جلی آواز میں کہتے "ہاں بھیا۔ تمہارے ایسے پڑھے لکھے کی تو دلیں کو ضرورت ہے۔ تم کو تو کانون بنانے والی سرکار میں جانا چاہئے"۔ اور پھر خوشی سے تھوڑا سا غلہ دے دیتا۔

بہرحال جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ سب پریشانیاں بھی عبور کی جا سکتی ہیں اور وہ اس پر بھی قابو پا سکتا ہے۔ البتہ اسے شکل تبدیل کرنی ہو گی۔ اور ہو بھی ایسا ہی۔ افسروں کو "خوش" کر کے اس نے کنٹرول قیمت پر غلہ فروخت کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ گو کہ نفع پہلے کی بہ نسبت بالکل کم ملتا تھا۔ پھر اس نے یہ اجازت لینا ہی بہتر سمجھا۔

لیکن اس کا چالاک دماغ بدستور کام کر رہا تھا۔ راتوں کو اسے نیند تک نہ آتی تھی اور کھانے میں جیسے کوئی مزا نہ رہا ہو۔ اندھیری راتوں میں جب وہ سوتا تو سوائے اس مرحلہ کے اور کچھ نہ سوچتا۔ آخر کار اس نے ایک حل نکال ہی لیا۔ اس نے سوچا "میرے پاس کھیتوں میں بھی غلہ ہے اور گودام میں بھی۔ آخر سرکار یہی نہ چاہتی ہے کہ کاغذ پر ان کا حساب ملے۔ تو ان کو ملے گا"۔ اور اس نے اس پر عمل شروع کر دیا۔

کام قدرے مشکل ضرور تھا مگر کرتا بھی تھا۔ اس نے پوشیدہ طور پر کافی غلہ جمع کر لیا۔ البتہ ان لوگوں کو جو گودام جانچتے تھے کافی روپیہ دینا پڑتا تھا۔ مگر اس کا اسے کوئی افسوس نہ تھا۔ اگر ایک نوٹ دینا پڑتا تھا تو دس ہی جاتے تھے۔ لوگ ہر قیمت پر غلہ لینے کو تو ٹوٹے پڑتے تھے۔ اور وہ قیمت کا بلا شرکتِ غیرے مالک تھا۔ اور اب وہ جب کبھی بھروسہ چتا تو یہی کہ کنٹرول والے دیکھ بھال کے لئے تھے۔ اور خوشامدانہ انداز میں کہتا "ایشور ہر کام اچھا ہی کرتے ہیں"۔ اب وہ ہفتہ میں چند آنے دان بھی کرنے لگا تھا اور کبھی کبھی پوجا بھی۔

رفتہ رفتہ جیسے تجربہ ہوتا گیا وہ ماہر ہوتا گیا۔ گودام سے نہایت "ہوشیاری" سے غلہ تولتا تھا اور پھر اس طرح دوکان کھولتا اور بند کرتا تھا کہ غلہ لینے والوں کو متعدد بار جانا پڑتا تھا اور جب وہاں روپیہ ہوتا تو یہاں غلہ نہیں اور جب یہاں کچھ غلہ ہوتا تو وہاں روپیہ ہی نہیں ہوتا۔ اس طرح وہ کافی غلہ بیچ لیتا تھا۔ جو اس کی "محنت" پر فروخت ہوتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں

اس کا ذخیرہ بہت بڑھ گیا کیونکہ اس نے کچھ افسروں کی جیبیں گرم کر کے گاؤں سے بھی غلّہ منگوایا تھا۔ اب اس کے خفیہ گودام میں غلّے سے بھرے ہوئے بوروں کی قطار چھت کو چھونے لگی ——— اس مکان کو اس نے کباڑ خانے کا نام دے رکھا تھا جس میں وہ چھوٹے بڑے اور اسی طرح کی چیزیں رکھتا ہے۔ جن کو وہ بقول اس کے کاغذ کی ملوں کو بھیجتا ہے تاکہ اس کے بچوں کا جیون بسر ہو۔ غلّے سے اتنا فائدہ کہاں تھا؟

ہمیشہ وہ جانے بیچانے لوگوں کو ہی غلّہ دیتا وہ بھی تھوڑا سا۔ البتہ دام پہلے لے لیا کرتا تھا۔ اور پھر بھی ان کو شہر میں بتلا رکھتا تھا کہ ایک آدمی کے پاس تھوڑا سا غلّہ ہے اگر وہ دے گا تو لادوں گا۔ اور کبھی کبھی اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لئے واقعی دام واپس بھی کر دیا کرتا تھا۔

ایک رات اس نے اپنی دوکان بند کر کے کچھ جیب میں رکھی اور چند قدم ہی چلا ہوگا کہ ایک شخص آکر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس شخص کے چہرے پر پریشانی بُری طرح مسلط تھی۔ منتشر بال۔ خشک ہونٹ۔ زرد سی آنکھیں۔ اس کے گردے آٹے ہوئے پیر تھرتھرا رہے تھے۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا "آہ تم نے دکان بند کر دی ——— میری قسمت . . . ." اور اس کی خالی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔

رگھو بیر عموماً لوگوں سے بڑوں پر بات کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ اور ایسے لوگوں سے تو وہ نفرت ہی کرتا تھا جو اسے صرف ایک کام کے لئے جانتے تھے۔ صرف غلّہ کیلئے وہ جھنجلا جاتا کہ لوگ کچھ اور کیوں نہیں کہتے ہیں۔ گھاس پتھر . . . .

"یہ بات کرنے کا سمے نہیں ہے" رگھو بیر نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ مگر دوسرا شخص (اجنبی) گھوم کر اس کے سامنے آگیا اور جوش و مجبوری کی ملی جلی آواز میں کہنے لگا "نہیں نہیں۔ ایسا مت کہو۔ تھوڑا سا دے دو۔ میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔ چلو . . . ." رگھو بیر ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔ وہ شخص پھر بولا۔ "میرے دو بچے کھانے کے لئے چلا رہے ہیں۔ میری بوڑھی ماں مرنے کے قریب ہے۔ فاقہ ختم ہوئے تین دن ہو چکے ہیں . . . . بھگوان کے لئے ——— کچھ دے دو۔ میں ہر طرف تلاش کر کے آرہا ہوں۔ گھر پر سب آس لگائے بیٹھے ہوں گے ——— مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر . . . . . وہ . . . . . کیا کریں گے . . . . . " یہ کہتے وہ مر کر پڑ کر بیٹھ گیا۔ شاید اب کچھ اور بولنا ناممکن تھا ———

"کتنا چاہئے؟" رگھو بیر نے بے نیازی سے پوچھا۔

"ایک سیر دے دو" ——— گھر پر چھ پیٹ بھرتے ہیں"

رگھو بیر نے ایک متنفرانہ نگاہ ڈالی اور کہا "اور رات کے اب چلے ہیں؟"

"میں اِدھر اُدھر تلاش کر رہا تھا۔ یہ آخری جگہ ہے" اس نے آہستہ سے کہا۔

"لاؤ دام نکالو" ——— اور دوسرے شخص کے ہاتھ پر ایک اٹھنی تھی۔ سفید چمک دار۔ رگھو بیر کی بھویں تن گئیں۔ اس نے کرختگی سے کہا "اتنے میں سیر بھر کیسے ملے گا؟"

"اتنا ہی اور دو تو ——— نہیں تو میں لے گا"

"مہینہ کی آخری تاریخ ہے میرے پاس یہی سب کچھ ہے"

"تب آدھ سیر لے گا۔ من ہو تو دے نہیں تو . . . . ."

"اچھا اتنا ہی دے دو" اجنبی نے جلدی سے کہا۔ اس کی آواز میں خوشی و غم کی عجیب سی آمیزش تھی۔

رگھو بیر نے اٹھنی لے لی اور کہا "لیکن ہمیں پورا کو۔ ابھی لایا۔"

یہ کہہ کر رگھو بیر تیز چلتا ہوا سامنے موڑ پر غائب ہو گیا۔ دوسرا شخص سڑک پر کھڑا تکتا رہا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا مگر یہ سوچ کر کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے نہ پوچھ سکا تھا ——— مگر اب اسے افسوس بھی ہونے لگا اور پچھتاوا بھی۔ دھیرے دھیرے ایک گھنٹہ گذر گیا۔ مگر رگھو بیر کا کہیں پتہ نہیں تھا ———

رات بھیگتی جا رہی تھی۔ ننھے ستارے وسیع آسمان پر ٹمٹما رہے تھے۔ جیسے وہ بھی بھوکے ہوں۔ آمد و رفت کم ہوتی جا رہی تھی لوگ۔ اس طرح اُجاڑ ہے تھے جیسے کہ سائے ہوں ——— سارے قصبہ پر خوفناک سا سکوت مسلط تھا ——— اور وہ شخص جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا ——— "کبھی ادھر جاتا کبھی اُدھر ———" بھگوان ——— وہ کہاں رہ گیا میں کب گھر پہنچوں گا۔ بچے آہ ——— بھوکی ماں اُف . . . . . " وہ کہہ رہا تھا۔

وہ مڑا اور جس طرف رگھو بیر گیا تھا چلنے لگا۔ تھوڑی دور جانے پر وہاں کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ رگھو بیر وہاں اس لئے گیا تھا کہ گودام کا راستہ نہ جانا جا سکے ——— اور تھوڑی دور جا کر وہ اپنی تاریک گلی میں مڑ گیا تھا ——— پھر رگھو بیر کی دوکان کی طرف گیا۔ مگر وہاں دزنی تالوں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر گھومنے کے بعد رگھو بیر کے گھر پر گیا اور آواز دی ——— اندر سے سیٹھانی نے خود ہی دروازہ کھولا اور

کہا "اتنی رات گئی، رات کو تو وقت پر گھر آجایا کرو" لیکن دروازے پر اجنبی کو دیکھ کر پیچھے ہٹ گئیں۔

"رگھو بیر نہیں ہیں کیا؟" اس نے پوچھا۔

"وہ تو ابھی آئے ہی نہیں" سیٹھانی جواب دیا "کا جانے کہاں کہاں وہ گئے۔ اتنی دیری تو کبھی نہیں ہوئی تھی ——" دونوں سیٹھ کا انتظار کرتے رہے، لیکن کب تک ——

—— صبح ہوتے ہوتے وہ بیتاب ہو گئے۔ اور سیٹھانی سے کہے بغیر نہ رہ سکی "تم نے انھیں گودام پر بھی دیکھا ہے؟"

"وہ کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

سیٹھانی کو خود ہی بتانا پڑا۔ اور کوئی جانتا ہی نہ تھا۔ وہ چل پڑے چند گلیاں طے کر کے وہ ایک بڑے مکان کے سامنے آئے۔ دروازہ اندر سے مضبوطی بند تھا۔ انھوں نے زنجیر کھٹکھٹائی —— لیکن کوئی آواز نہ آئی —— دروازہ دھکیلنے کی کوشش کی —— مگر مستحکم مکان اس قسم کی مداخلتوں سے بے نیاز تھا۔

آخر کار سامنے کا روشندان توڑ کر اندر جانا پڑا تب کہیں۔ دروازہ کھلا —— ٹوٹے ہوئے روشندان سے ہلکی سی کرن پڑتی ہوئی داخل ہوئی —— اور انھوں نے دیکھا —— ایک کونے میں ایک ٹارچ پڑی ہوئی تھی —— پاس ہی ایک اٹھنی چمک رہی تھی —— اور —— تھوڑے ہی فاصلہ پر بے ترتیب گرے ہوئے بوروں کے اندر سے ایک انسانی ہاتھ نکلا ہوا تھا ——

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

صفائی



خون کی خرابی پھوڑے پھنسی۔ خارش اور داد وغیرہ کی بہترین دوا ہے۔ **صفائی** اندرونی طور پر استعمال کیجئے اور **مرہم حنا** بیرونی استعمال کے لئے ہے

صفائی ۴ اونس کی شیشی ایک روپیہ **مرہم حنا** شیشی ۶ر

نوبہار

بچوں کی مشہور اور پسندیدہ دوا چھوٹے بچوں کی صحت اور قوت کا محافظ۔ معدہ کی تمام خرابیوں کے لئے ایک آزمودہ اور اطمینان بخش دوا ہے۔

تین اونس کی شیشی قیمت صرف ایک روپیہ۔

نوٹ ۔ آرڈر کے ساتھ پیشگی رقم آنی چاہئے۔ ہر قصبہ و شہر میں با اعتبار ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔ دواخانہ کی کل آمدنی غریب الغربا اور طلباء پر صرف کی جاتی ہے۔

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

چند ایجنسیوں کے پتے

کانپور چمن گنج۔ بنارس دال منڈی۔ بھوپال جمعراتی بازار۔ فیروز آباد خرد وسی اسٹور۔ غازی پور ٹاؤن ہال۔ شاہ گنج مسیح الملک دواخانہ۔ جونپور مدرسہ قرآنیہ جامع مسجد۔ مئو اعظم گڈھ احسان بلڈنگ۔ بہرائچ چوک جمال میر آکل۔ بستی کاندھی نگر۔ شاہجہانپور محمد علی مارکیٹ۔ کیمر صدیقی دواخانہ۔ علی گڑھ پھپھالہ۔ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی۔ ایس۔ ایم اسٹور سیوئی (ریاست پردیش) ڈاکٹر حکیم عبدالمغنی صاحب۔ سریا گنج۔ مرشد پورا بہار۔ حکیم محمد مسیح قدا توحیدی دواخانہ الہ آباد سبزی منڈی کاظمی صاحب دواخانہ کاظمی ناگپور۔ گجری بازار اقبال اسٹور۔

تگ و تاز

بھارت کے مشہور تعمیر پسند نظم نگار ابوالمجاہد زاہد کا شعری کارنامہ مینوریٹاری کی منزلوں سے گذر رہا ہے جن اصحاب نے طلب فرمایا ہے ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ اس کی تکمیل میں تھوڑا وقت اور لگ جائے گا انتظار کی زحمت گوارا فرمائیں اس تاخیر کا سبب کچھ انتظامی دشواریاں رہی ہیں جن پر ہم اب قابو پا چکے ہیں

تگ و تاز کے علاوہ چند دیگر کتب کی تیاری بھی زیر غور ہے، اور انپر

نظر ثانی ہو رہی ہے

معذرت خواہ:۔ مینجر مکتبہ "معیار" میرٹھ

اسٹینڈرڈ

سیزرس اور اُسترے

عمدگی اور پائیداری کی اعلیٰ مثال پیش کرتے ہیں۔
جس پر میرٹھ کی اس صنعت کو ناز ہے۔ قینچیوں اور
اُسترووں کی تجارت کرکے بھاری منافع حاصل کیجئے۔

ایجنسی کا شرائط نامہ خط لکھکر منگائیے

دی اسٹینڈرڈ سیزرس کمپنی میرٹھ (انڈیا)

صدق جدید

لکھنؤ

یہ ہفتہ وار دینی و اصلاحی پرچہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے کفر و الحاد کے سارے فتنوں سے مقابلہ کرنے میں شہرت رکھتا ہے! ادب زبان کی خوبیاں اس پر مستزاد۔ مولانا کی تفسیر قرآن مجید کے اجزا بھی وقتاً فوقتاً اس میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

سالانہ چندہ آٹھ روپے ششماہی چار روپے آٹھ آنے

منیجر صدق جدید۔ کچہری روڈ۔ لکھنؤ

ابھرتی کرنیں

مکتبۂ معیار کی پہلی حسین پیش کش

چھپکر آگئی ہے

شائقین جلد تر طلب فرمائیں

ناشر

مکتبۂ معیار میرٹھ

موجِ نیل

مصر کے شہرۂ آفاق ادیب سید مصطفےٰ لطفی منفلوطی۔ دورِ حاضر کے مصری ادباء کے سرتاج تسلیم کئے جاتے ہیں۔ مغرب کی تہذیب کے ہاتھوں مشرق کے اخلاق و تمدن کو لٹتے دیکھکر آپ بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ اور آپنے اِن تاثرات کو العبرات والنظرات میں افسانوں اور افسانوی مضامین کی صورت میں پیش کیا ہے۔

موجِ نیل

اِس سحر آفریں ادب کا اعجاز نما ترجمہ ہے جو قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کی مترجمانہ صلاحیتوں کا بہترین نمونہ ہے۔

کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ

قیمت ——— مجلد ——— دو روپے

بیانُ اللسان

مکمل عربی اردو ڈکشنری

تیس ہزار قدیم و جدید عربی لغات کا جامع و مستند ذخیرہ

تالیف مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی۔ ناظم ادارہ علمیہ (سابق رفیق ندوۃ المصنفین)

یہ لغت اب اہلِ علم اور اربابِ ذوق کے حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس کی بینظیر خصوصیات نے اسے مقبولِ خاص و عام کردیا ہے۔ علماء، طلباء اور عام شائقین سب ہی اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

طبع سوم

کتابت و طباعت اعلیٰ ——— کاغذ سفید چکنا۔

سرورق رنگین ——— صفحات نو سو

قیمت غیر مجلد آٹھ روپے

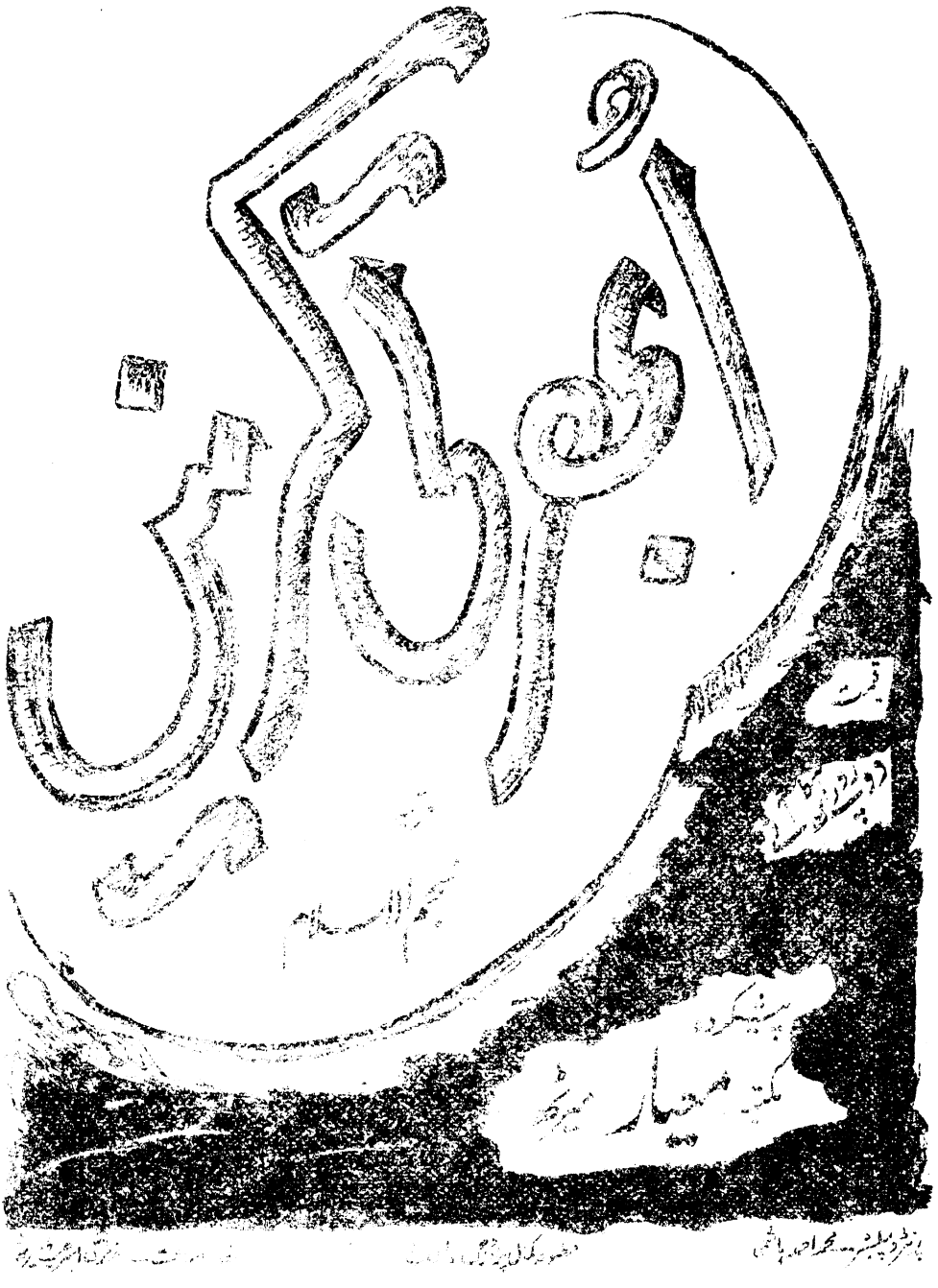
قیمت مجلد چرمی اعلیٰ دس روپے

(محصول ڈاک ۱۴ر علاوہ)

(نوٹ) ان کے علاوہ دوسری ہر قسم کی ادبی کتابیں مناسب قیمت پر طلب کی جاسکتی ہیں۔ مکتبۂ چراغِ راہ کی حسین و جمیل ادبی مطبوعات بھی ہمارے یہاں مل سکتی ہیں ——— شائقین پیشگی رقوم بھیج کر آرڈر روانہ فرمائیں۔

ملنے کا پتہ

مکتبۂ "معیار" میرٹھ


انوار
پیشکردہ
مکتبہ معیار

صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

جلد ۳، شمارہ ۹،

اکتوبر ۱۹۵۳ء

معیار

ترتیب دینے والے

اصغر علی عابدی

نجم الاسلام

ہیڈ آفس:- خندق اسٹریٹ میرٹھ شہر

سب آفس:- محلہ کشن گنج دہلی ۶

تعاون

سالانہ پانچ روپے

ششماہی تین روپے

(مضامین - خط و کتابت - ترسیلِ زر - تبادلۂ جرائد کے لئے ہیڈ آفس)

ترسیل زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب — فیملی لائن — جیکب آباد

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

ترتیب

نقشِ اوّل ——— بحمِ الاسلام

نظمیں

معمّہ بازی	ابو المجاہد زاہد	۵
ہجوم	اُمیّہ ڈبائیوی	۶
میری شاعری	سیّد رکن الدین	۸
شکایت	انور صدّیقی	۱۰
تحریک	بنتِ جرمت الاکرام	۱۱
قابلِ تسلیم	عزیز الرحمٰن نقیب	۱۲

مقالے

فرائڈ کا نظریۂ خواب	ابنِ فرید بی اے	۱۳
دو سوالات	جمیل احمد فاروقی	۲۳
بچّہ کی تربیت کا ابتدائی ماحول	نثار احمد فاروقی	۲۶
اقبال کا نظریۂ ادب	محمود الحسن شاہد	۳۳

غزلیں

محسن رضا جونپوری ،	ارشد صدّیقی	۳۷
عنوان چشتی ،	عالم صدّیقی	۳۸
جلیل فتحپوری ،	شورید کاشمیری	۳۹
سلیم الدین الدنی ،	سرور رومانی	۴۰

افسانے اور خاکے

عامل	منظر حسین	۴۱
جب میں پرائیویٹ سکرٹری تھا	عبد المجید حیرت بی۔ اے	۴۵
بھکاری	افسر سلیم	۴۸
کثیر الاشاعت ماہنامہ	منظور احمد بی۔ اے	۵۱

ادبی مسائل	ادارہ	۵۲
خیال اپنا اپنا	ادارہ	۵۵

نقشِ اوّل

تقسیم ہند سے پہلے میرٹھ میں دائرہ ادبیہ کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم تھی جس کی ہفتہ واری نشستیں فیض عام کالج ہال میں ہوا کرتی تھیں۔ میرٹھ کالج کے کئی اساتذہ طلبا اور شہر کے بیشتر وسیع الخیال ادیبوں کی بدولت کامیاب نشستیں رہتیں۔ نگارشات پڑھی جاتیں تبصرے ہوتے۔ تنقیدیں کی جاتیں اور کھلے دل کے ساتھ قبول بھی کرلی جایا کرتیں۔ یہ پہلی انجمن تھی جس کی بدولت مقامی ادیبوں کی عملی و فکری صلاحیتیں بروئے کار آگئیں اور ان میں تنقیدی رجحان پرورش پانے لگا۔

پھر تقسیم کے بعد حالات بدل گئے۔ ان لوگوں میں سے اکثر ایک ایک کرکے دوسری جگہوں کو چلے گئے جن کی بدولت دائرہ ادبیہ کی نشستیں چل رہی تھیں۔ دائرہ کی نشستوں کا سلسلہ سرد پڑ گیا تو کچھ لوگوں کی کوشش سے انجمن ترقی پسند مصنفین موضع وجود میں آگئی۔ مگر انجمن کی اس مقامی شاخ کی عمر بہت ہی تھوڑی نکلی اور جن چند لکھنے والوں کے نام سے کبھی باقاعدہ اور کبھی بے قاعدہ ادبی اجتماعات ہوئے وہ یا تو منتشر ہو گئے یا انہوں نے اپنے لئے ادب کی تعمیر کی ایک نئی راہ اختیار کرلی۔

اب صرف دفتر معیار میں ایک ماہانہ ادبی نشست ہوا کرتی ہے۔ جس میں متعلقین معیار کے علاوہ میرٹھ کے بیشتر اور نواح کے بھی چند ارباب ذوق شریک ہوتے ہیں۔

پچھلے دنوں جولائی کی ایسی ہی ایک نشست میں راقم نے تنقید پر ایک تحریر پیش کی تھی جس پر سننے والوں کی طرف سے حسب معمول اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا۔ اس مضمون میں مشرقی تنقید اور مغربی تنقید کے مختلف اور وار پیش کرکے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ اردو تنقید میں مشرقی تنقید کا رنگ کہاں کہاں ملتا ہے۔ اور مغربی تنقید کے کیا کیا اثرات اردو تک پہونچے ہیں۔ علاوہ ازیں تعمیری تنقید کی تعریف بھی کی گئی تھی۔ اور مضمون کے دوسرے حصے میں ممتاز اردو نقادوں کے نظریۂ تنقید پر الگ الگ بحث کی گئی تھی۔

ظاہر ہے کہ مضمون کے بہت سے گوشے ایسے ہو سکتے تھے جہاں اختلاف کی گنجائش تھی۔ تنقید کا میدان بہت وسیع ہے جتنا وسیع ہے اتنا ہی اس میں اختلاف کی گنجائش بھی ہے۔ اس لئے توقع تھی کہ اظہار خیال میں سننے والوں کی طرف سے اثباتی طور سے یا التشریح کچھ باتیں کہی جائیں گی لیکن خیالات و آراء کے اختلاف سے قطع نظر اس موقع پر ایک اور ہی دلچسپ بات کہی گئی جس نے راقم کے ذہن میں آج کے نقش کا مواد فراہم کردیا۔ مضمون میں غیر ارادی طور سے تنقید کی کچھ ایسی انگریزی اصطلاحات جمع ہو گئی تھیں جو اپنی جگہ تھیں تو درست لیکن عام طور سے نامانوس ضرور تھیں۔ اس لئے ایک تو عام فہم نہیں رہی تھیں دوسرے ان کے مقابلہ میں اردو مترادفات کے استعمال سے بے اعتنائی بھی بعض اردو پسند حضرات کی نظر میں قابل تنقید تھی۔ تیسری بات کا خیال اس نشست کے کئی دن بعد آیا اور اگرچہ اس وقت وہ چنداں اہم معلوم نہیں ہوئی کیونکہ نشست کا ماحول جانچا تھا مگر حقیقت میں وہ بھی بڑی اہم ہو سکتی تھی اس موقع پر نہیں تو اور کسی موقع پر وہ بات یہ تھی کہ شاید ہمارے ذہن لغوی معنوں سے ہٹ کر ٹھوس فنی اور اصطلاحی معنوں کو پہچاننے پر زور دینے کی اہمیت سے غفلت برت رہے تھے۔

چنانچہ ڈاکٹر نسیم احمد نے کہا۔ "انگریزی اصطلاحات کے ساتھ اردو اصطلاحات بھی استعمال کرنا چاہئیں"۔ یہ بات جو مشورہ کے طور پر کہی گئی تھی اس لحاظ سے جامع تھی کہ ایک طرف اگر اس میں مغربیت پسندی کی تسکین بھی اس صورت میں ہوتی تھی کہ انگریزی اصطلاحات کو بالکل ہی مقاطعہ نہیں کیا گیا تھا۔ اور دوسری طرف اردو پسندی بھی موجود تھی جبکہ سننے والوں میں دونوں ہی طرح کے لوگ موجود تھے۔ مگر جب اسی مضمون کی چند ایک اصطلاحات کے اردو مترادفات پیش کئے گئے تو بیشتر اصحاب اس بات پر متفق تھے کہ ان اصطلاحات میں عام فہمی کا وصف انگریزی اصطلاحات سے بھی کم تھا۔ یہ کیوں؟ اس کا تجزیہ ضروری ہے۔

مجموعی طور سے ہماری الجھنیں یہ تھیں۔

(۱) دونوں زبانوں کی آویزش
(۲) اصطلاحات میں عام فہمی کا فقدان
(۳) اصطلاحات کی فنی توجیہات

آج کل لسانی تنازعات کا زور اور ہماہمی جتنی شدید ہے اس سے کون واقف نہیں۔ ہند و پاک میں ہر جگہ انہی کے چرچے ہیں۔ یہ تنازعات کیونکر پیدا ہوئے ہیں اس پر ہمیں یہاں کچھ نہیں کہنا ہے۔ لوگ اب کیوں اتنی دلچسپی لینے لگے ہیں یہ بھی جانے دیجئے ہمیں تو یہ دیکھنا ہے اس وقت ان کو ختم کرنے کی جو ناکام یا کارآمد کوششیں ہو رہی ہیں وہ کیسی ہیں۔ یقیناً وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے سیاسی ڈھنگ کی ہیں۔ کہنے کو بعض لوگ انھیں سیاسی اثرات سے پاک بتاتے ہیں۔ اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو بھی ہماری بات بڑی حد تک ٹھیک بھی رہے گی۔ کیونکہ سیاسی ڈھنگ سے ہمارا مطلب اغراض و مقاصد کی طرف ہی اشارہ کرنا نہیں بلکہ طریق حصول اور طریق کار کی طرف اشارہ کرنا بھی ہے۔ لوگ جہاں اکثر سیاسی مظالم کا رونا رویا کرتے ہیں، وہاں کم ہی یہ بات دھیان میں آتی ہے کہ ہماری عادت و ستوری اور سیاسی سہاروں کی طرف دیکھنے کی ہو گئی ہے۔ اور سہارے دیکھنے والوں کی عملی قوتیں ہمیشہ کسی بالاتر قوت کے چشم و ابرو کی جنبش کا انتظار کیا کرتی ہیں۔

اسی شمارہ میں کتنی امروہوی صاحب نے ایک سوال اٹھایا ہے۔ آپ وہ سوال ملاحظہ فرمائیں اور ہماری گذارشات بھی!

اصل میں ان سطور سے مدعا یہ ہے کہ زبانوں کی آویزش کے معاملے میں ہمیں زندگی کے آفاقی نظریہ کو اپنانا چاہئے اور ایسا مقصد متعین کرنا چاہئے جس میں وسعت بھی ہو اور توازن بھی۔ اس لحاظ سے وہ جذباتی مخالفت بھی غلط ہے جو اردو کے معاملے میں بڑی توازن راہ اختیار کرنی پڑے گی خصوصاً اردو کے روادارانہ مزاج کو دیکھتے ہوئے۔

اصطلاحات میں عام فہمی نہ ہونے کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ اس وقت اس سلسلہ میں دو باتیں ہمارے ذہن میں آتی ہیں۔

(۱) اصطلاحات کا کم استعمال

(۲) علم و فن کے مخصوص اصطلاحی معنوں اور لغوی معنوں میں بُعد

اصطلاحات کے کم استعمال ہونے سے جو اجنبیت رہتی ہے بلاشبہ اس کو استعمال ہی سے دور کیا جا سکتا ہے۔ اردو کی اصطلاحات بھی استعمال ہی سے عام فہم بن سکیں گی۔

اس لحاظ سے ناقد کا مشورہ درست تھا۔

مگر دوسری بات یعنی علم و فن کے مخصوص اصطلاحی معنوں اور لغوی معنوں میں بُعد ہونے کا تعلق عام استعمال سے زیادہ نہیں بلکہ علم و فن کے اونچے معیار سے ہے۔ اس بات کے حق میں دلیل یہ دی جا سکتی ہے کہ بہت سی اصطلاحات ایسی ہوتی ہیں جو عوام و خواص سب کی زبان پر چڑھ جاتی ہیں لیکن اپنے مفہوم کے اعتبار سے ان کا مصرف بالکل غلط ہوتا ہے۔ یہ کم علمی کے سبب سے ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ جو بھی ان کا غلط استعمال کرے وہ علم سے بے بہرہ ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی علم سے بہرہ ور ہو لیکن مخصوص فن کی اصطلاحات پر اتنی گہری نظر نہ رکھتا ہو جتنا اس فن کا ماہر۔

اس نقص کو دور کرنے کی صورت یہی ہے کہ اصطلاحات کی فنی توجیہات سے واقفیت بڑی حد تک عام ہو جائے اور اگر یہ نہ ہو تو کم سے کم ہم لوگ فنی توجیہات کو لغوی معنوں کے مقابلہ میں بے چون و چرا تسلیم کر لیا کریں۔

اس ادبی اجتماع میں جس کا شروع میں تذکرہ کیا گیا تھا۔ اصطلاحات فہمی میں جو الجھنیں پیش آئی تھیں ان کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ الفاظ کے اصطلاحی معنوں سے کم لوگ واقف تھے اور وہ لغوی معانی ذہن میں بسے ہوئے تھے جو اصطلاحی معنوں سے بُعد رکھ سکتے ہیں۔

اس مخصوص نشست کے بارے میں کہی ہوئی یہ سب باتیں عمومیت سے خالی نہیں۔ اس لئے سب لوگ ان پر غور کر سکتے ہیں۔

ابوالمجاہد زاہد

مُعمّہ بازی

آپ بھی خوب ہیں واللہ جناب غازی
"خاں صاحب" کی زبانی مجھے معلوم ہوا
آپ کو بھی ہے بہت شوقِ معمّہ بازی

(ہنس کے) ہاں میں بھی معموں کو بھرا کرتا ہوں
اور "اشاروں" کی سیاست کو سمجھنے کے لئے
اکثر الفاظ کی دنیا میں رہا کرتا ہوں"

"نکہت و گل کدۂ و شمع و نئی دُنیا کے
ہر معمّے میں پہونچتے ہیں مرے "حل" چھ سات
کبھی دنیائے معمّہ پہ رہوں گا چھا کے"

"زندگی بھی تو معمّہ ہے جناب عالی"
"کبھی اس کو بھی سمجھنے کا خیال آیا ہے؟"
"کیا کبھی اس کے اشاروں پہ نظر بھی ڈالی؟"

زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
(کھانس کر اور ذرا گا کے) بقول فانی
اِک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

"خیر خیر آپ نے پھر خوب کمایا ہوگا"
"فیس ادا کر کے بہت تھوڑی سی ہر اک حل کی"
"خوب انعام کی رقموں کو بٹورا ہوگا"

"کیا کہوں شومئی قسمت سے لٹا بیٹھا ہوں"
"کوئی انعام تو پایا نہیں اب تک میں نے"
"آٹھ سو روپئے البتہ گنوا بیٹھا ہوں"

اُمید ڈبائیوی

ہجوم

تیری آنکھوں سے برستی نہیں پُرکیف شراب
ایک لغزش کے سوا کچھ بھی نہیں تیرا شباب
نئی منزل کے تجسّس میں ہے تو خانہ خراب
آج ہر دیر و کلیسا میں کہا جاتا ہے
تو نئے دور کے طوفاں میں بہا جاتا ہے

درحقیقت یہ ترا عزمِ سفر کچھ بھی نہیں
تیری آنکھیں ہیں مگر حسنِ نظر کچھ بھی نہیں
بے خبر تجھ کو حقیقت کی خبر کچھ بھی نہیں
عصمتِ مریم و سیتا کا تجھے پاس نہیں
جُرم کرتا ہے مگر جُرم کا احساس نہیں

اپنے جذبات پہ اسرارِ حقیقت کا گماں
اور اشعار پہ ہے وحیِ نبوت کا گماں
فکر و تخیل پہ معراجِ طبیعت کا گماں
تو سمجھتا ہے کہ ہے حُسن کچلنے کے لئے
پھول کھلتے ہیں گلستاں میں مسلنے کے لئے

وہ جو مزدور کی قسمت کے جگانے کو اُٹھے
وہ جو منعم کے مٹانے کو ستانے کو اُٹھے
وہ جو مفلس کے ارادوں کے بڑھانے کو اُٹھے
آستینوں میں وہی تیغ چھپائے نکلے
شکلِ انساں میں وہی ناگ کے جائے نکلے

اب وہ نکھرے ہوئے دلچسپ نظارے نہ رہے
وہ نگاہوں ہی نگاہوں میں اشارے نہ رہے
آتشِ عشق کے پُرسوز شرارے نہ رہے
روئے عصیاں پہ ہے تہذیب کی رنگین نقاب
ہے گناہوں کے لئے حُسن کا پاکیزہ شباب

جلوہ پردوں سے نکلتے ہی وہ جلوہ نہ رہا
نگہِ شوق کا بیتاب تقاضا نہ رہا
برقِ ایمن کے لئے دیدۂ موسیٰ نہ رہا

حسنِ معصوم نہیں آج کے ہر راہگذر
ایتو آلودۂ عصیاں نظر آتی ہے بہار

دیدۂ عصیاں کے جھکی جاتی ہے تقویٰ کی جبیں
رُخ گناہوں کا نظر آتا ہے کس درجہ حسیں
ہے اندھیرے پہ زمانے کو اُجالے کا یقیں

خود نظاروں کو ہے اِس وقت نگاہوں کی تلاش
جلوہ ساروں کو بھی جلوہ پناہوں کی تلاش

اب نہ وہ جوشِ غیرت ہی انسان کے پاس
ہے بشر پہنے ہوئے جسم پہ شیطاں کا لباس
ہے کسے خوفِ جزا حشر سے کس کو ہے ہراس

کامِ مخلوق کے جو آئیں وہ انداز نہیں
ہائے شاہین میں بھی قوتِ پرواز نہیں

صبح بھی شام کی تصویر ہوئی جاتی ہے
تیرگی نور کی تعدیر ہوئی جاتی ہے
نئی تخریب کی تعمیر ہوئی جاتی ہے

جو بھی ذی رُوح ہے بیجان نظر آتا ہے
پاس ساحل ہی کے طوفان نظر آتا ہے

اُف یہ اندھیر یہ ظلمت یہ تباہی تو بہ
یہ تمدّن کے اُجالے میں سیاہی تو بہ
حُسن بھی دستِ ہوس میں ہے الٰہی تو بہ

بحرِ عالم کا کسی سمت کنارا نہ ملے
ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا نہ ملے

آج افسانۂ ہستی کو ہے عنوان کی تلاش
آج ایمان کو ہے سچے مسلماں کی تلاش
آدمیت کو ہے خود اب کسی انساں کی تلاش

گلشنِ زیست کی ہر شاخ جلی جاتی ہے
ہر طرف آتشِ نمرود نظر آتی ہے

حُسن میں حُسن کشش ہے نہ ہے وہ رنگِ حیا
جذبۂ عشق میں گرمی ہے نہ وہ جوشِ وفا
اُف خدا ہی کے جو بندے ہیں وہ بنتے ہیں خدا

مال و دولت ہی کے قبضہ میں ہیں ملّت کی رسوم
جس طرف دیکھئے ہے زندہ جنازوں کا ہجوم

پروفیسر کلیم الدین احمد

میری شاعری

(ابوالمجاہد زاہد سے معذرت کے ساتھ)

(۱)

خار و خس کی زندگی میری شاعری نہیں
ہاں خرد کی بندگی میری شاعری نہیں
رو بہی، درندگی میری شاعری نہیں
حسن کی برہنگی میری شاعری نہیں

(۲)

میری شاعری میں ہیں حریت کے ولولے
میری شاعری میں ہیں دلنواز حوصلے
میری شاعری میں ہیں خیر و شر کے معرکے
میری شاعری میں ہیں اہلِ دل کے قافلے

(۳)

پستی و فتادگی میری شاعری نہیں
ہاں شکستِ خودگی میری شاعری نہیں
شوق کی فسردگی میری شاعری نہیں
قلب کی عنودگی میری شاعری نہیں

(۴)

بے خدا سیاستیں میری شاعری نہیں
امن میں لغاوتیں میری شاعری نہیں
بے تکی حکایتیں میری شاعری نہیں
ہاں فقط شکایتیں میری شاعری نہیں

(۵)

میری شاعری میں ہے زندگی کا مدّعا
میری شاعری میں ہے دردِ دل کی ہر دوا
میری شاعری میں ہے امن و صلح کی بقا
میری شاعری میں ہے ظالموں کا خوں روا

(۶)

میری شاعری نہیں دام اشتراکیت
میری شاعری نہیں حامیٔ قنوطیت
میری شاعری نہیں بے عناں حیاتیت
میری شاعری نہیں فتنۂ جدیدیت

(۷)

شیطنت کی رقص گاہ میری شاعری نہیں
جنسیت کی بارگاہ میری شاعری نہیں
فکرِ معصیت پناہ میری شاعری نہیں
ہاں جمودِ خانقاہ میری شاعری نہیں

(۸)

یہ جہانِ کاخ و کو میری شاعری نہیں
وصفِ شاہد و سبو میری شاعری نہیں
گفتگو ہی گفتگو میری شاعری نہیں
اور بتوں کی آرزو میری شاعری نہیں

(۹)

میری شاعری میں ہے سوز بھی سرور بھی
میری شاعری میں ہے غیب بھی حضور بھی
میری شاعری میں ہے حور بھی قصور بھی
میری شاعری میں ہے جلوہ گاہِ طور بھی

(۱۰)

میری شاعری نہیں چنگ و نغمہ و رباب
میری شاعری نہیں جام و شاہد و شراب
میری شاعری نہیں جذبِ معصیت مآب
میری شاعری فقط الکتاب والکتاب

(۱۱)

امنِ عام کا پیام میری شاعری میں ہے
اِک جدید صبح و شام میری شاعری میں ہے
زندگانی دوام میری شاعری میں ہے
اِک پیام اِک نظام میری شاعری میں ہے

انور صدیقی

شکایت

آپ کیوں چیں بہ جبیں ہوتے ہیں ——— ؟
میں جب اِسلام کے گاتا ہوں ترانے پیہم !
آپ بے وقت کے نغمات اِنھیں کہتے ہیں !
اور پھر کیوں نہ کہیں ———
اِن میں دوشیزہ بہاروں کی نہیں ہیں کلیاں !
اِن میں کچھ عارض و رخسار کی باتیں ہی نہیں !
اور آپ ———
عارضِ گلگوں پہ فدا
گیسوئے پُرخم پہ نثار !
اور دلدادۂ ابروئے جواں ———
آپ کے ذوق کی تسکین نہ ہوتی ہوگی !
اِس لئے چیں بہ جبیں ہوتے ہیں !
اور بے وقت کے نغمات اِنھیں کہتے ہیں !
اور پھر مجھ کو شکایت بھی نہیں ———
کیوں مرے گیت نہیں ہیں مقبول !!

———

سید حرمت الاکرام

تحریک

ہر مسرت کی روح لرزاں ہے
ہر حقیقت ہے سوگوار ابھی
ہر ترنم کے لب پہ ہیں نالے
ہر تبسم ہے اشکبار ابھی

ظلمتوں نے بٹھائے ہیں پہرے
دل پہ احساس نگاہوں پر
رقص فرما ہیں موت کے سائے
زندگی کی اداس راہوں پر

خشک ہیں رنگ و نور کے سوتے
نغمے روٹھے ہوئے ہیں سازوں سے
آرزوئیں فسردہ، دل مردہ
سینے آباد ہیں جنازوں سے

ہیں تدبر کی محفلیں بے نور
لرزہ طاری ہے نکتہ دانوں پر
سرنگوں ہیں سماج کے پرچم
بربریت کے آستانوں پر

خضر کا روپ دھار کر رہزن
چل رہے ہیں عوام کے آگے
سر بسجدہ ہے عظمتِ جمہور
سامراجی نظام کے آگے

اشک بن کر ابل رہا ہے لہو
زندگی کی حسین آنکھوں میں
بنتے جاتے ہیں زخمِ دل ناسور
چارہ گر سو رہے ہیں محلوں میں

بن کے اٹھے تھے جو مہ و خورشید
کچھ بھی ہو ان کا اب گلہ کیسا؟
کیوں نہ روشن نئے چراغ کرو
بجھتی شمعوں کا آسرا کیسا؟

قابلِ تسلیم

عزیز الرحمٰن نقیب گلبرگوی

(۱)

نبضوں سے شرارے چھوٹتے ہیں
آنکھوں میں ہیں شعلے رقصاں
ہے سوز بھری تحریر مری
تقریر میں ہے جادو پنہاں

(۲)

سیلابوں میں منجدھاروں میں
کشتی ہے مری سرگرمِ سفر
پرواہ نہیں ساحل کی مجھے
طوفاں کا نہیں کچھ خوف وخطر

(۳)

ہے کام مرا پرواز فقط
یہ شام و سحر کچھ چیز نہیں
ہے زیست مری کوئے پیہم
یہ بحر و بر کچھ چیز نہیں

(۴)

سائے میں پلا ہوں تیغوں کے
شمشیر ہی میرا جوہر ہے
تخریب سے لیکن دُور رہوں میں
تعمیر ہی میرا جوہر ہے

(۵)

ہر ایک قدم منزل کا نشاں
ہر بات مری پتھر کی لکیر
حق بات کہوں گا میں ہر دم
ہو شاہ مخاطب یا ہو فقیر

(۶)

اِنسان پہ اِنساں حاکم ہو
اِنسان بنے اِنساں کا غلام
یہ بات مسلّم ہے ساتھی
ناکام رہا ہے ایسا نظام

ابنِ فرید۔ بی۔ اے

فرائڈ کا نظریۂ خواب

فرائڈ نے خواب کی اساسیات پر جو روشنی ڈالی ہے وہ اس سے قبل دنیا کے افکار میں بالکل متعارف نہ تھی۔ صرف خال خال۔ چند عمل تنویم (HYPNOTISM) پر مشق کرنے والے اور ماہرینِ نفسیاتِ اختلال (EXPERTS OF THE PSYCHOLOGY OF INSANITY) نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ خواب معنویت رکھتے ہیں۔ فریڈرک مسمر، شارکو، مارٹن پرنس اور جینے (JANET) نے کافی حد تک اس طرف توجہ دینی شروع کر دی تھی لیکن اسی دوران میں آسٹلی کے مشہور شہر ویانا (VIENNA) میں سگمنڈ فرائڈ نے ڈاکٹر جوزف برائر (JOSEPH BREUER) کے ساتھ اختناق الرحم کی مریضاؤں پر کام کرنا شروع کر دیا۔ اس زمانہ میں چونکہ اس مرض کے لئے واحد علاج عمل تنویم (HYPNOTISM) خیال کیا جاتا تھا۔ اس لئے ان دونوں نے بھی اسے اختیار کیا۔ اور اس طریقۂ علاج کے دوران میں انہوں نے محسوس کیا کہ مریضاؤں کی علامتیں کچھ معنی رکھتی ہیں اور مریض کی زندگی اور مرض سے عمیق تعلق رکھتی ہیں۔ فرائڈ کو اس حقیقت نے کافی متاثر کیا۔ چنانچہ وہ عمل تنویم کے سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی غرض سے پیرس چلا گیا اور وہاں شارکو کی رہنمائی میں عصبی مریضوں کی کیفیات کا مطالعہ کرتا رہا۔ برائر کے بعد شارکو کے ایک فقرے نے اس کو اور بھی متاثر کیا اور اس کی تحقیقی توجہ کو بالکل نئے رخ کی طرف موڑ دیا۔ شارکو کا یقین تھا کہ

"تمام عصبی امراض میں انسان کی صنفی زندگی میں ہمیشہ کچھ فتور ہوتا ہے اور کافی جدوجہد سے اس کا پتہ بھی چل سکتا ہے۔" [1]

اسی ایک فقرہ نے اس کو مستقلاً غور و فکر میں منہمک رکھا اور آخر کار وہ عصبی مریضوں کے لئے تحلیلِ نفسی (PSYCHO - ANALYSIS) کا طریقہ علاج اور نفسیات کے لئے نیا نظریہ ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اپنی تحقیق کی ابتداء لاشعور سے کی تھی اور یہ باور کر کے تحقیق کرنا شروع کیا تھا کہ صنفی عنصر ہر جگہ موجود رہتا ہے اس لئے اس نے اپنی تحقیقات کو اسی محور سے وابستہ رکھا۔ وہ چونکہ مریضاؤں کی بھولی بسری باتوں کے سہارے سے ان کا علاج کرتا تھا اور انھیں کے ذریعہ ذہنی الجھنوں کو دور کیا کرتا تھا اس لئے خواب، اس کی توجہ کا مخصوص طور پر مرکز نہ بنے۔ اس نے اُن سے بھی کام لینا چاہا اور خوابوں کے سلسلہ میں اپنے متعینہ نظریہ کے ماتحت تحقیق شروع کر دی۔

فرائڈ کے نزدیک خواب اُن فراموش شدہ لاشعوری خواہشات کی تکمیل گاہ ہے جن کو ایک فرد کسی طرح بھی اپنی شعوری زندگی میں اظہار کا موقع نہیں دیتا۔ بیداری کی حالت میں ان پر ایک محتسب (CENSOR) مسلط رہتا ہے اور وہ کسی طرح بھی ان کو اتنا موقع فراہم ہونے نہیں دیتا کہ وہ شعور کی زندگی میں داخل ہو سکیں لیکن یہ خواہشات اتنی کمزور نہیں ہوتی ہیں کہ شعور کے اس دباؤ کی وجہ سے معدوم ہو جائیں بلکہ وہ لاشعور میں پلتی رہتی ہیں اور جب محتسب (CENSOR) نیند کی حالت میں کمزور پڑتا ہے تو وہ ایک دم سے یلغار کر دیتی ہیں اور اپنے اظہار کا خواب کی حالت میں بہترین موقع فراہم کر لیتی ہیں۔ مثلاً

"ایک سوا تین سال کی بچی پہلی مرتبہ کسی جھیل پر سیر کی غرض سے گئی۔ جب وہ اپنے والدین کے ساتھ کشتی سے اُترنے لگی تو اس نے کہا کہ وقت کتنی جلدی گذر گیا ہے۔ اور اس نے کشتی سے نہ اترنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ صبح اس نے بیان کیا کہ رات میں اسی جھیل میں سیر کر رہی تھی۔" فرائڈ

لیکن فرائڈ کو ان خوابوں سے اپنے پیشے میں مدد لینا تھی اس لئے اس نے عصبی مریضوں کے خوابوں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ مریض اختناق الرحم ہی

---

[1] ہم عصر مکاتیبِ نفسیات مصنفہ وڈورتھ صفحہ ۱۳۷۔

("CONTEMPORARY SCHOOLS OF PSYCHOLOGY" BY WOODWORTH _____ P. 137.

میں مبتلا ہوئے تھے اس لئے ان کے خوابوں میں اور ان کی زندگی کے تمام افعال میں اس کو صفی جذبہ کا کام کرتا ہوا ملا۔ وہ اپنے نظریوں کی ترتیب و تدوین اپنے مطب ہی میں کر رہا تھا اور سمجھتے ہوئے کر رہا تھا کہ صحت مند ذہنوں کو اسی وقت سمجھا جا سکتا جبکہ ان کو اختلال کے زمانہ میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ظاہر ہے کہ جو مریض صفی مرض میں مبتلا ہوگا اس کی عادات و اطوار میں جنسی عدم توازن کیوں کارفرما ہوگا۔ پھر اضطراب الرحم کے مریض عجیبی طور پر اتنے ناقص ہو جاتے ہیں کہ ان میں فراریت اور بزدلی اچھی طرح ابھر آتی ہے۔ ان کے تمام افعال خواہ وہ شعوری ہوں یا لاشعوری، بڑے ہی انفعالیت پسند ہوتے ہیں۔

چنانچہ انھیں کی روشنی میں اس نے یہ کلیہ صادر کر دیا کہ خواب ایک عمل فراریت ہے اور وہ سونے والے کو اس کی نیند کے برقرار رکھنے میں بے حد مدد دیتا ہے۔ جب کوئی خارجی مہیج (EXTERNAL STIMULUS) کسی شخص کی نیند میں مخل ہوتا ہے تو خواب کا یہ فراری عمل اُسے زائل کر کے تکمیل خواہش کی صورت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ مثلاً

"فرائڈ کو ایک بار سخت تکلیف کی وجہ سے بلٹس باندھنا پڑی۔ جس سے اُس کے درد میں تخفیف ہو گئی اور وہ سو گیا لیکن سونے کے دوران میں ہی درد شدت سے ہونے لگا۔ اور اس کے لئے سونا مشکل ہو گیا لیکن یہ مہیج (STIMULUS) تکمیل خواہش میں تبدیل ہو گیا اور وہ خواب دیکھنے لگا کہ وہ گھوڑے پر پسینے کے ساتھ سوار ہے۔"

کیا خواب واقعتاً صرف وقوع شدہ تجربات سے تعلق رکھتے ہیں؟ اور کیا وہ محض فراری عمل ہیں؟ یہ امور ہمارے لئے قابلِ غور ہیں۔ خواب یقیناً ماضی کے علاوہ مستقبل سے بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ اس مسئلہ پر ہمیں آئندہ سطور میں جائزہ لینا ہے۔ البتہ یہاں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ کیا واقعی خواب فراری ہوتے ہیں؟ فرائڈ کے نظریہ خواب کو ہی اگر دیکھا جائے تو خواب بجائے ایک فراری عمل کے فطری عمل محسوس ہوتا ہے۔ ایسے تمام خواب جو خارجی مہیج کو تکمیل خواہش میں تبدیل کر دیتے ہیں وہ درحقیقت فرار کی طرف مائل نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ سونے والے کو نیند سے بیداری کے عالم میں لانے کے لئے ایک تدریجی عمل کا فرض انجام دیتے ہیں۔ قدرت نے ہر فعل میں ایک تدریج رکھی ہے۔ دن رات میں تدریج ہے۔ روشنی اور اندھیرے میں تدریج ہے۔ دن آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے اور اپنے عروج کو پہونچتا ہے۔ اور پھر زوال کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اسی طرح رات، تاریکی اور روشنی بھی۔ اچانک اور دفعتاً ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور اگر بالفرض ہونے بھی لگے تو شاید ایک قلیل عرصہ کے اندر تمام نظم حیات درہم برہم ہو جائے۔ ماہرین طبعیات اسے اچھی طرح جانتے ہیں کہ تدریجی طریقہ صحت کے لئے کس قدر اہم ہے۔ آنکھوں ہی کا معاملہ لے لیجئے۔ اگر ایک شخص کو جلدی جلدی انتہائی تاریکی اور روشنی میں لایا جائے تو وہ اپنی بصارت کھو دے گا۔ اسی طرح اگر ایک شخص کو ایک دم سردی اور ایک دم گرمی میں لایا جائے تو شاید وہ اس عمل کے چند ایک بار دہرائے جانے کے بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔ نظام اعصاب پر یہ داخلی کیفیتیں کتنا اثر رکھتی ہیں۔ اگر اس کا اندازہ کر لیا جائے تو یہ باور کر لینا بھی زیادہ مشکل نہ ہوگا کہ ایک شخص اگر عالم خواب سے ایک دم عالم بیداری میں آجائے تو کیونکر وہ اختلالِ ذہنی سے بچ سکے گا۔ عالم خواب میں دماغ صرف داخلی فعل کر رہا ہوتا ہے اور خارجی مہیجات کے لئے ناکارہ ہوتا ہے۔ لیکن عالم بیداری میں اسے خارجی مہیجات کے لئے مستعد ہونا پڑتا ہے۔ یہ دونوں افعال بالکل مختلف نوعیت کے ہیں۔ اور ان کے لئے ذہن کو دو مختلف عمل کرنے پڑتے ہیں اس لئے اگر خواب اور بیداری کے دوران میں ہی خارجی مہیجات کو تکمیل خواہش میں تبدیل کر لینے کا عمل ہوتا ہے تو اسے فراریت پر کیونکر محمول کیا جائے۔ یہ تو ذہن کو اس اچانک فعل سے بچانے کا ایک طریقہ ہے جس سے مختل ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس خواب کے دیکھنے کے بعد ہم سوتے نہیں رہتے ہیں بلکہ جاگ ضرور پڑتے ہیں۔ اکثر اوقات میں جب ہمیں کوئی خارجی مہیج پہونچتا ہے اور ہم گرمی کی وجہ سے آگ میں جلنا۔ گرون میں چادر کے لپٹ جانے کی وجہ سے پھانسی کا دیا جانا یا گلا گھونٹ دیا جانا وغیرہ دیکھتے ہیں تو اس کے بعد ہم فوراً جاگ پڑتے ہیں۔ اور یہ جاگ پڑنا ہی اس فراریت کے دعوی کی سخت ترین تردید ہے۔

خواب اپنے اندر ابتدائی تکمیل خواہش کی خوبی ضرور رکھتے ہیں جیسا کہ سوا تین سال کی مذکورہ بچی کے خواب میں محسوس کیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ابتداً بیان کیا جا چکا ہے۔ فرائڈ تمام متبع خواہشات (REPRESSED DESIRES) کو جنسی سمجھتا ہے جنس کا عام اظہار تمام معاشروں میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ یہی وہ جذبہ ہے جس کو شعور سب سے زیادہ دبا کر رکھتا ہے۔ چنانچہ یہ انسان کی زندگی میں ابتداءً ہی سے، یعنی عہد طفولیت سے۔ لاشعور میں قوت پکڑتا رہتا ہے اور اپنے اظہار کے مختلف ذرائع اختیار کرتا ہے۔ خواب لاشعوری اظہارات کے لئے آسان ذریعہ ہے اس لئے وہ اس کے ذریعہ اظہار کرتا ہے۔ مگر معاشرہ کے

دباؤ کی وجہ سے ہر لمحہ کے اقدامات (REPRESSIONS) اُسے مسخ (FRUSTRATE) کر دیتے ہیں چنانچہ وہ تمام خوابوں میں جنس کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ایک عورت اُس سے اپنا خواب بیان کرتی ہے۔

"خواب میں میں نے اپنے جوان بیٹے کو ایک تکیس میں مرا ہوا پایا۔"

اس نے تلاش و تحقیق کے بعد جو فیصلہ یا تجزیہ کیا ہے وہ بڑا ہی عجیب ہے۔

اس زمانہ میں جب کہ اس کا لڑکا اس کے لیبل (تکیس) میں تھا۔ اس کی خاوند سے ناچاقی ہو گئی تھی۔ اس ناچاقی کی بنا پر اُس عورت نے خواہش ظاہر کی تھی کہ کاش! جو کچھ میرے بطن میں ہے مر جائے۔

حالانکہ خواب سیدھا سادہ تھا عورت نے عالم خواب میں اس خبر کا اظہار کیا تھا جس سے وہ اپنے بچے کو دوچار ہوتے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

بعض خوابوں میں تو اس نے اس غیر فطری انداز میں جنس کے لئے دوسرا نکالی ہے کہ ذہن کسی طرح بھی اس کی توجیہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اور جہاں اپنے خواب تحلیل کے لئے اُس کے سامنے آتے ہیں وہ ان کے بارے میں پہلے سے یہ رکھتا ہے کہ اس کے نظریہ کو غلط ثابت کرنے کے لئے دیکھیے کیسے جھلا کر بات صرف اتنی کی ہوتی ہے کہ اس کے نظریہ کا غلط خود ہی سر نگوں ہو جاتا ہے۔

اس طرح کا ایک خواب مثال کے طور پر درج کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے نظریہ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کتنا کوشاں رہتا تھا۔ ایک نوجوان عورت نے اس سے خواب بیان کیا۔

"آپ کو معلوم ہو گا کہ اب میری بڑی بہن کا صرف ایک ہی لڑکا چارلس رہ گیا ہے۔ جب میں اس کے پاس ہی رہا کرتی تھی تو اس کا بڑا لڑکا آٹو کو میں بے انتہا پیار کرتی تھی۔ حقیقت میں اس کی پرورش میں نے ہی کی تھی۔ میں چاہتی تو چارلس کو بھی ہوں لیکن اتنا نہیں۔ اب میں نے کل رات خواب میں اپنے سامنے چارلس کو مرا ہوا دیکھا ہے۔ اس کی نعش چھوٹے سے صندوق میں پڑی ہوئی تھی اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور چاروں طرف موم بتیاں روشن تھیں۔ قصہ مختصر، یہ منظر بالکل آٹو کی موت کی مانند تھا۔ اس خواب سے میرا دل سخت دکھی ہو گیا ہے۔ فرمائیے اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا میں اتنی بُری ہوں کہ اس کے اکلوتے بیٹے کی موت کی خواہش مند ہوں؟ کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ آٹو کی بجائے چارلس مر جاتا؟"

اس خواب کے سننے کے بعد فرائڈ اس کی زندگی میں معاشقہ تلاش کر لیتا ہے اور یہ معلومات بہم فراہم کر لیتا ہے کہ وہ پروفیسر جس سے اس نوجوان عورت کے ناجائز تعلقات تھے۔ آٹو کی موت پر موجود تھا۔ اور وہ ایک عرصہ کے بعد اس سے ملی تھی۔ وہ عورت اپنی بڑی بہن کی پسند و ناپسند کی وجہ سے اس پروفیسر سے شادی نہیں کر سکتی تھی اور یہ بات اسے اس لئے ماننا ضروری تھی کہ اس نے ہی اس کی پرورش کی تھی۔ اب فرائڈ اس خواب کی تعبیر یہ کرتا ہے۔

"اگر دوسرا بچہ بھی مر جائے تو یہ واقعہ ظہور میں آئے گا یہ پروفیسر اس کی بہن کے پاس تعزیت کرنے ضرور آئے گا۔ اور پرانے عشق کو ایک دفعہ پھر تازہ کرے گا۔ یہ خواب محض پروفیسر کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش ہے جس کو وہ دبا دینے کے لئے کافی کوشش کر رہی تھی۔ یہ خواب بے صبری کا خواب تھا۔ اُس نے اپنی بے صبری کی وجہ سے پروفیسر کو ایک دن قبل خواب میں دیکھ لیا۔"

یہاں ایک جو بات زیادہ ذہن کے خواب کی جو تعبیر کی گئی ہے وہ اچھی طرح فرائڈ کے ان نظریات پر مبنی ہے جن کا اس نے ایک خاص عینک سے دیکھ کر مرتب کیا ہے۔ اس نے اپنے مریضوں کے خوابوں کو کریدکر ان کی زندگیوں سے ایسے واقعات تلاش کئے ہیں اور ان کو خوابوں سے اس طرح مربوط کیا ہے کہ جنسی عنصر ہی نمایاں نظر آنے لگتا ہے۔ اپنے نظریہ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اور اپنے تصورات کو جانچنے کے لئے اس نے تلازمۂ اختیاری (FREE ASSOCIATION) کا طریقہ اختیار کیا۔ اس طریقہ کے مطابق جب وہ مریض کو خواب اور خواب سے متعلق یاد آنے والے تمام خیالات کو من و عن بیان کرنے کے لئے کہتا ہے تو مریض پہلی مرتبہ خیالات کا ایک دفتر بے پایاں پیش کرنا شروع کر دیتا ہے اور ماہر تحلیل نفسی ان سب خیالات کے اندر خواب کی تعبیر تلاش کیا کرتا ہے۔ اور جب وہ ان بیان کردہ خیالات کو محفوظ کرنا شروع کرتا ہے تو وہ خبر کرتا ہے کہ یہ خیالات اصل خواب سے کہیں زیادہ ہیں۔ پھر وہ ان خیالات میں سے وہ خیالات چن لیتا ہے جو کسی ایک طریقہ سے خواب کے ساتھ وابستہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس طریقہ میں ماہر تحلیل نفسی کو کوئی

لہ تعبیر خواب مصنفہ فرائڈ ("INTERPRETATION OF DREAMS" ——— BY SIGMUND FREUD)

آزادی رہتی ہے کہ وہ اپنی "پسند" اور طے شدہ معیار کے مطابق انھیں منتخب کرے۔ فرائڈ نے بھی یہی کیا۔ اضطراب الرحم کی مریضاؤں پر کام کرتے کرتے اس کے خیالات کافی جنس زدہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ اس تلازمۂ اختیاری کے ذریعہ ہر جگہ وہی تاریک گوشہ تلاش کرتا رہا جو اسے اضطراب الرحم کی مریضاؤں میں ملتا رہا۔ فرائڈ نے تحلیل کے دوران میں اپنے مریضوں کو خصوصی طور پر جنس کی طرف متوجہ کیا ہے اور اس کے مریضوں نے بھی اس کو بہکنے میں کافی مدد دی ہے۔ ذیل کے خواب سے یہ بات بڑی آسانی کے ساتھ سمجھی جا سکتی ہے۔

"میں بہار کے زمانہ میں ایک کوچہ سے گزر رہی ہوں۔ ایک عجیب قسم کا نیلیوں کا ہیٹ میرے سر پر ہے۔ اس کے درمیانی حصہ کا بھڑا اوپر سے زیادہ لمبا ہے۔ میں ہشاش بشاش ہوں۔ جب میں چند افسروں کے مجمع سے گزرتی ہوں تو اپنے آپ سے کہتی ہوں۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

فرائڈ نے ہیٹ کے اوپری حصہ اور اس کے اطراف سے مرد کی شرم گاہ کی مماثلت اخذ کر لی[1] اور تعبیر یہ کی۔

"چونکہ وہ اپنے خاوند سے ہر طرح مطمئن تھی اسلئے افسروں کا اسے کچھ خوف نہیں ہوا۔ یعنی اس کی کوئی خواہش ان سے وابستہ نہ تھی۔"

اس تعبیر و تجزیہ کو خواب سے کہاں تک تعلق ہے۔ ایک ناظر پہلی ہی نظر میں اس کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔ اور اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ فرائڈ نے اپنی بات کے حق میں کس قدر غلو سے کام لیا ہے۔ اس نے اس عورت کو تو پوری طرح جنسی پہلو سے غور کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ چنانچہ یہ تعبیر سن کر عورت کچھ عرصہ تک خاموش رہی اور پھر قدرے جھجک کر کہنے لگی کہ اس کے خاوند کے ساتھ یہی معاملہ ہے۔ اور فرائڈ نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے[2]۔ عورت کا یہ اقرار کرنا گویا فرائڈ کی بات کا پایۂ ثبوت کو پہونچنا ہے۔ لیکن اگر اس اقرار (CONFESSION) کو فرائڈ کی توجیہات سے ہٹ کر جانچا جائے تو اس کا بطلان اور کھوکھلا پن خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس خواب میں فرائڈ نے عورت کے اطمینان کو ایک جملۂ انکاری (NEGATIVE SENTENCE) سے اخذ کیا ہے۔ لیکن انسانی زندگی کے تمام تجربات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اطمینان کا اظہار ایجابی طور پر کیا جاتا ہے۔ سلبی طور پر نہیں لیکن یہاں فرائڈ نے اس کلیہ سے بغاوت کرنے میں ذرا بھی باک محسوس نہیں کیا ہے۔

تلازمۂ اختیاری (FREE ASSOCIATION) کے ذریعہ وہ ان خوابوں کو بڑی آسانی کے ساتھ حل (ANALYSE) کر لیتا ہے۔ جن کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ ان کے معاملہ میں کسی لاشعوری خیال (UNCONCIOUS IDEA) نے لاشعور (UNCONCIOUS) میں بے حد طاقت حاصل کر لی ہے۔ اس خیال کو شعور (CONCIOUS) میں لانے کے لئے کافی جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ مریض ایسے خیال کو فوراً ادا نہیں کر پاتا ہے اور ماہر تحلیلی نفسیات (PSYCHO - ANALYST) کو کافی سہارا دینا پڑتا ہے۔ وہ طرح طرح کے محرکات (STIMULI) مشورہ (SUGGESTION) کے طور پر اس کے سامنے رکھتا ہے۔ اور مریض ان کے سہارے اپنے فراموش کردہ خیالوں کو تازہ کرتا ہے۔ اس فریضہ کو ادا کرتے وقت ایک ماہر نفسیات یقینی طور پر مریض کے خیالات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ فرائڈ کے یہاں آنے والے مریض لاشعوری طور پر یہ سوچ کر آتے تھے کہ ان کی زندگی جنس سے متاثر ہے۔ مذکورۂ بالا خواب میں آپ اس چیز کو اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی خوابوں سے استنباط کر کے اس نے خوابوں کی کئی خصوصیات متعین کیں۔

(الف) خوابوں میں اختصار ہوتا ہے۔ کئی ایک شعوری تجربات مل کر ایک واقعہ بن جاتے ہیں۔ اس خواب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو وہ تمام واقعات اس میں سموئے ہوئے ملیں گے۔

---

[1] اس طرح کے خوابوں کو معرض بحث میں لاتے ہوئے میرے اندر خود بھی کراہیت پیدا ہو رہی ہے لیکن فرائڈ کے نظریات پر تنقید کرتے ہوئے ان سے کسی طرح بچا نہیں سکتا۔ اس نے اسی طرح کی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی تعبیرات کو پیش کر کے لاتعداد ذہنوں کو سموم کر دیا ہے اور گمراہ کو اتنا معصوم بنا دیا ہے کہ ایمل لڈوگ (EMIL LUDWIG) کے الفاظ میں فرائڈ کے سامنے لیبل نے شریف ترین لڑکی کو اجازت دیدی ہے کہ وہ کسی بھی اڈے سے بڑی آزادی سے جنسی موضوع پر کھل کر مباحثہ کرے۔" فرائڈ کے زہر سے آج کوئی بھی ملک پاک نہیں ہے۔ خاص طور سے ادب نے تو جیسے اس کی ترجمانی کرنے کا بیڑا اٹھا لیا ہے۔ فرائڈ کی تعبیر کو زیادہ شائستہ انداز میں پیش کرنے کے لئے میں نے اپنے الفاظ میں بیان کرنا مناسب سمجھا ہے لیکن پھر بھی تحلیل نفسی کی خباثت پوری طرح جھلک رہی ہے! اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے۔

[2] یہ فقرات میرے ہیں مفہوم فرائڈ کا ہے جو اس سے کہیں زیادہ عریاں ہے۔ ملاحظہ ہو فرائڈ کی تصنیف تعبیر خواب صفحہ ۳۴۱

(ب) تبدل خوابوں کی دوسری خصوصیت ہے بعض خیالات جو خواب میں بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں بعض اوقات تعبیر میں کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ برعکس اس کے ایسے خیالات جو خواب میں بالکل معمولی ہوتے ہیں ممکن ہے کہ تعبیر کے بعد وہ کافی اہم ثابت ہوں۔ مثلاً اس عورت کا خواب جس نے اپنے بچے کو صندوق میں مرا ہوا دیکھا یا وہ خواب جس میں مریضہ نے اپنی بہن کے دوسرے بچے کو بھی مرا ہوا دیکھا۔

(ج) منظریت خوابوں کی وہ خصوصیت ہے جو خواب دیکھنے والے کو محو کر دیتی ہے۔ ایسے خواب واقعتاً الفاظ میں بیان نہیں کئے جا سکتے۔ ان کے مناظر بڑے دل چسپ ہوتے ہیں۔

(د) ان سب میں فرائڈ کے لئے اہم خصوصیت خواب کی رمزیت (SYMBOLISATION) ہے۔ فرائڈ کے خیال کے مطابق صنفی جبلت کے علاوہ کوئی اور جبلت اتنی ممتنع نہیں ہوتی شعور میں صرف یہی ایک جبلت ایسی ہے جو ممتنع ہونے کی سب سے زیادہ خصوصیت رکھتی ہے۔ بالغ آدمیوں کے خواب زیادہ تر ممتنع صنفی خواہش سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور صنفیت کے مخصوص رموز رکھتے ہیں۔ ان امور یا مخصوص علامات سے یہ ایک حد تک ممکن ہے کہ خواب کی تعبیر دیکھنے والے کی مدد کے بغیر کی جا سکے کیونکہ لاشعور میں ایسی علامات موجود ہوتی ہیں جو بعض خاص خاص اشیاء کو ظاہر کرتی ہیں۔

ان علامات (SYMBOLS) کو فرائڈ اور اس کے تابعین نے متعین کیا ہے اور تمام کی تمام علامات کو صنفی ہی رکھا ہے۔ چنانچہ عورتوں اور مردوں سے اور ان کے اعضاء سے ایسی چیزوں کو متعلق کیا ہے جن کے بارے میں ذہن آج تک سوچ بھی نہ سکتا تھا مردوں۔ اور ان کے اعضاء کو ظاہر کرنے والی علامات طویل اور سیدھی اشیاء ہیں۔ جیسے چھڑی۔ چھاتہ۔ درخت پھول۔ سانپ مچھلی۔ وغیرہ (رحمی کرنے والی) اشیاء جیسے چاقو۔ خنجر۔ نیزہ۔ بندوق۔ پستول اور ریوالور وغیرہ عورتوں اور ان کے اعضاء کو ظاہر کرنے والی علامات ایسی ہیں جن میں سیال پن ہو جیسے نل۔ پانی کے حوض یا چشمے۔ یا اونچی نیچی ہونے والی اشیاء مثلاً لٹکانے والے لیمپ۔ پنسل۔ قلم۔ قلمدان۔ ناخن تراش ہتھوڑے۔ ہوائی جہاز وغیرہ۔ گرجے۔ مینار اور عمارتیں بھی اس میں شامل ہیں۔ ان علامات کو متعین کر کے وہ ایسے خوابوں کو حل کرتا ہے لیکن خواب حسابی کھیل تو نہیں ہوتے جنہیں ضرب جمع سے حل کیا جا سکے۔ چنانچہ رمزی خوابوں کی تحلیل میں فرائڈ کبھی بھی کامیاب نہیں رہا ہے۔

ڈاکٹر ریورز نے فرائڈ پر رمزیت کے معاملہ میں سخت تنقید کی ہے۔ اور تمام علامات کو رد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سانپ کسی طرح بھی صنفی علامت نہیں ہو سکتا[1]۔ اور اس کی تصدیق اس خواب سے ہو سکتی ہے۔

"ایک معلم آئندہ روز کے لئے سانپوں پر درس تیار کرتا ہے اور سو جاتا ہے۔ رات کو وہ خواب میں سانپ دیکھتا ہے۔"

کیا اس خواب کے بارے میں قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خواب جنسی علامت کا مظہر تھا۔ ایسے بہت سے خواب ایک شخص دیکھتا ہے جو اس کے دو چار دن قبل کے تجربات پر منحصر ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان کی تحلیل فرائڈ کے رمزیات کی روشنی میں کی جائے تو شاید ان خوابوں کو دیکھنا کوئی پسند بھی نہ کرے۔

ظاہر ہے کہ ہماری زندگی تمام ایسی چیزوں سے بھری ہوئی ہے جن سے ہمارا تعلق ہے اور جن کو ہم اس قدر استعمال کرتے ہیں کہ ان سے کسی صنفی خیال یا علامات کا وابستہ ہونا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا ایک چھڑی، کوٹ، بارہ یا ٹوپی کو ہم کبھی اس خیال سے استعمال نہیں کرتے ہیں جو فرائڈ کا مقصود ہے لیکن اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ فرائڈ کی علامات اپنے اندر کچھ بھی حقیقت رکھتی ہیں تو آخر ہم ان چیزوں کے خواب ان کی اپنی اصلی حالت میں کب دیکھیں گے؟ یہ بہت بڑا سوال ہے! ایک شے رمز کی حالت میں ہمیشہ ظاہر ہوا اور حقیقت کی شکل میں نظر نہ آئے۔ کتنی بڑی مضحکہ انگیزی ہے۔

ان رمزیاتی علامات کے بارے میں فرائڈ کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ یہ بچپن میں وراثتاً (HEREDITICALLY) پائے جاتے ہیں اور نسلاً بعد نسل چلے آنے کی وجہ سے ان علامات کے معنی لاشعوری (UNCONCIOUS) ہو گئے ہیں یعنی اب ایک فرد کا ذہن اس طرف متوجہ نہیں ہوتا کہ چھڑی سے یا نل سے کیا مراد لے رہا ہے۔ حالانکہ وہ غیر ارادی طور پر ایسا کر رہا ہوتا ہے فرائڈ کے اس دعویٰ کے مطابق یہ علامات مذہب وغیر مذہب افراد میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ لیکن اگر یہ باور کر لینا کہ ایک بچہ مکان، چھڑی، یا پانی سے صنفی خواہشات کو رمزیہ طور پر پایۂ تکمیل کو پہونچا رہا ہے انتہائی لغو ہے۔ کیونکہ اس طرح تو بچوں کا کوئی بھی خواب اس سے پاک نہیں رہے گا۔ مثلاً اس سوا تین سال والی بچی کے خواب کی خود فرائڈ ہی نے جو تعبیر کی ہے وہ غلط ٹھہرے گی کیونکہ ان صنفی علامات کے لحاظ سے تو اسے جنسی انتظار حاصل کر رہا ہونا چاہئے تھا۔ دوسرے ان کا نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے رہنا بھی قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو انسان ان ابتدائی آلات کو ہی علامات ماننا جبکہ اس نے صنفی اوزار سے

---

[1] نزاع اور خواب مصنفہ ڈاکٹر ریورز ("CONFLICT AND DREAMS" BY DR. RIVERS)

کوئی ترتیب نہیں کی تھی لیکن فرائڈ اور فرائڈیوں کی پیش کردہ فہرست کے لحاظ سے تیلی وژن تک ایک علامت ہے۔ یہاں ایک سوال اور اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ کیا یہ علامات مقامی نہیں ہوتی ہیں؟ یہ ظاہر ہے کہ ایک دیہاتی کے رموز (SYMBOLS) میں اور ایک شہری کے رموز (SYMBOLS) میں زمین آسمان کا فرق ہوگا اور اسی طرح ایک مشرقی اور مغربی کی علامات (SYMBOLS) میں بھی تین فرق ہونا چاہئے لیکن فرائڈ نے اس طرف نہ تو خود غور کیا ہے اور نہ اس کے تابعین نے۔ چنانچہ آج ہر طرف سے یہ اعتراض اٹھایا جا رہا ہے۔ تیسرے ان علامات کے بطلان کا سبب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ فرائڈ کے مقلدین نے بھی انھیں بنیادی، فطری اور وراثتی (HERIDITICAL) مان کر اپنے خوابوں کی تعبیریں کی ہے۔ انھوں نے علامات کے لئے بچپن کی زندگی کے بجائے شباب ہی میں تلاش جستجو کی ہے اور خواب کا حل پیش کر دیا ہے۔ ڈاکٹر بریل (DR. A.A. BRILL) فرائڈ کا پکا مقلد تھا اس نے اپنی کتاب "تحلیل نفسی"[1] میں ایک خواب کا تجزیہ کیا ہے۔

"ایک نوجوان عورت بیان کرتی ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں کسی غیر معروف گاؤں میں تھی۔ اور میں اپنے گھر جو لیکونو (LICONOV) یا لیکونور بے (LICONOR BAY) میں واقع ہے۔ پہنچنے کے لئے بہت بے تاب تھی لیکن وہاں نہ پہنچ سکی۔ جیسے ہی میں حرکت کرتی میرے راستے میں دیوار حائل ہو جاتی۔ گویا وہ لگی دیواروں سے بھری ہوئی تھی۔ میری ٹانگیں پتھر جیسی بھاری تھیں۔ میں صرف بہت آہستہ آہستہ چل سکتی تھی۔ گویا میں بہت نحیف اور ضعیف العمر تھی۔ پھر وہاں بہت سے چوزے دکھائی دیئے لیکن یہ منظر شہر کی آبادگی کا تھا۔ وہ چوزے میرے پیچھے دوڑے اور ان میں سب سے بڑا چوزہ مجھ سے کچھ اس طرح مخاطب ہوا میرے ساتھ تاریکی میں چلو۔"

جب میں نے اپنے خیالات کے چوزوں پر مرتکز کرنے کے لئے کہا گیا تو اس نے عرض کیا کہ میں صرف سب سے بڑے چوزے کو اچھی طرح دیکھ سکی۔ باقی تمام دھندلا دکھائی نہیں دیتے تھے۔ یہ غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔ اس کی گردن بہت لمبی تھی۔ اور اس نے مجھ سے بات کی..... گلی وہی ہے جو مدرسے میں مدرسہ جایا کرتی تھی۔

پھر اچانک اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور قہقہہ لگا کر کہنے لگی[2] "میرا مخالف صنف میں ایک رفیق تھا ہم مدرسے کے اوقات کے بعد ملا کرتے تھے اور اکثر ہی گھر آتے تھے۔ وہ بڑا دبلا پتلا تھا۔ لڑکیاں اس کی وجہ سے مجھے تنگ کیا کرتی تھیں۔ جب بھی اسے آتا دیکھتیں مجھ سے کہتیں اچھی! وہ تمہارا چوزہ، لڑکوں میں وہ اس نام سے مشہور تھا۔"

اس نے یہ بھی کہا کہ جب مدرسے کی تعطیلات ہو گئیں تو تین بار اس نے اسے پسند کیا۔ (شادی کی درخواست کی) لیکن وہ لیت ولعل کرتی رہی خواب کے زمانہ کے دوران میں وہ امید کرتی تھی کہ پھر درخواست کی جائے گی۔ حالانکہ وہ شخص کسی اور عورت کی طرف مائل معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ غریب تھا اور وہ کافی مالدار بن چکی تھی۔"

بریل نے تعبیر کی کہ وہ شادی کی از حد خواہش مند تھی۔ بلاحظہ ہو یہ تعبیر عورت کے تلازمۂ اختیاری سے کی گئی ہے۔ مثلاً تاریکی۔ اندھیری۔ شادی۔ راز وغیرہ لیکن جیسا کہ سطور بالا میں بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں اس نے علامات بچپن کے بجائے جوانی میں تلاش کی ہیں۔ دوسرے اگر بریل کی تعبیر مان بھی لی جائے تو اس خواہش کو لاشعوری (UNCONCIOUS) نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ ممتنع (REPRESSED) ضرور کہی جا سکتی ہے۔ یہ تجزیہ تو فرائڈ کے نظریۂ لاشعور پر بھی چوٹ کرتا ہے۔ اس کے دعویٰ کے مطابق تو صرف وہی لاشعوری خواہشات (UNCONCIOUS DESIRES) رمزیت (SYMBOLISM) اختیار کرتی ہیں جو کافی تنومند ہو جاتی ہیں لیکن یہاں تنومند ہونے کا سوال تو کیا پیدا ہوتا یہ خواہشات لاشعوری (UNCONCIOUS) بھی نہ بن پائیں۔

واہ مذاق آگہی!

بعض اوقات انتہائی بے معنی خوابوں کو رمزی (SYMBOLIC) بنانے کی دھن میں فرائڈ نے وہ کھینچ تان کی ہے کہ خواب اچھا خاصہ حسابی گورکھ دھندا بن گیا ہے۔ اور علاوہ ان ذہنوں کے جو اس کثرت کے مریض ہیں۔ صحت مند ذہن اس کی نکتہ رسی سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

"ایک مریض کی انجمن اس کی بیوی کے خواب میں نو دار ہوتی ہیں۔ اس کی بیوی کا خواب صرف اس قدر تھا۔ "لیوک ۱۳"

---

[1] PSYCHO-ANALYSIS BY DR. AA. BRILLS

[2] اسے یاد آگیا ہوگا کہ وہ ایک ماہر تحلیل نفسی کی محل گاہ میں ہے۔ اور تحلیل نفسی ہر خیال و خواب میں جنسیت کو پوشیدہ دیکھتی ہے۔ اسی خیال نے اس کے خواب کا رُخ موڑ دیا ہوگا۔

(LUKE , 137) جس کی تعبیر لیوک الف ۳۷ (LUKE , i , 37) ہوئی۔ جو مماثلت رکھتی ہے لیوک ۱۲-۱۳ (LUKE , XII , 7) سے جو کہ ایک قسم کے انجیر کے پیڑ کا نام ہے جو مرد کے جنسی عضو کی علامت ہے۔ اس علامت کو تلازمہ کے ذریعہ اس کے شوہر کی نامردی سے مربوط کر دیا گیا۔ چونکہ خواب دیکھنے والی انجیل[1] (BIBLE) سے کوئی تعلق نہیں رکھتی ہے اس لئے اس خواب کو دیدہ مستمار (CRYPTOMNESIA) کہا جا سکتا ہے۔[2]

اس خواب کو رمزی فرض کر کے فرائڈ نے اس میں جو معانی بھر دی ہے وہ اس کے لئے مجبور ہے لیکن یہ یقیناً ایک عجیب چیز ہے کہ مریض کوئی ہو اور مرض کی علامات کسی اور میں ہوں۔ جوزف جاسٹرو (JOSEPH JASTROW) تو خواب کے اس نتیجہ کو حماقت متصور کرتا ہے۔[3] اسی قبیل کا ایک اور خواب اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔

مریضہ بہت زور کی بارش ہوتے ہوئے خواب میں دیکھتا ہے۔ ہر جگہ پانی ہی پانی ہے۔ اندر باہر ہر طرف فرائڈ اس خواب کی تعبیر میں عجب کرتب دکھاتا ہے پانی کی فراوانی ہمارے ذہن کو OVER FLOW کی طرف لے جاتا ہے۔ ذرا سی تبدیلی سے یہ لفظ OVER FLUID کو یاد دلاتا ہے سے OVER FLUID کے بجائے SUPER FLUID بھی کہا جا سکتا ہے۔ SUPER FLUID سے ہمارا ذہن SUPER FLUOUS (فضول۔ غیر ضروری) کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اب فرائڈ کے بقول متذکرہ بالا خواب کا یہ سارا سیلاب اس لئے امنڈ پڑا تھا کہ صاحب خواب کسی چیز کے بارے میں SUPER FLUOUS یا فضول کا فتویٰ صادر کرنا چاہتا تھا۔[4]

اب یہ تعبیر حیات اچھی طرح واضح کر دیتی ہیں کہ فرائڈ نے جنس۔ رمز خواب اور لاشعور سے جو مرکب بنایا تھا۔ وہ سراسر دراز کار اور بے معنی چیز ہے۔ اس میں حقیقت سے زیادہ قیاس اور قیاس سے زیادہ ذاتی رجحان کو دخل ہے۔ شاید انھیں وجوہ کی بنا پر اس کے شاگرد رشید ینگ (C.G. JUNG) نے اس کی زندگی ہی میں اس سے بغاوت کر دی تھی۔ اور اس نے قطعی طور پر اس سے انکار کر دیا تھا کہ تمام لاشعوری افعال و خواہشات میں صنفی جذبہ پوشیدہ رہتا ہے۔ ریورز اور ہڈسن نے بھی اسے قبول نہیں کیا اور خاص طور سے اس کے ہم عصر میسکڈوگل (WILLIAM Mc DOUGALL) نے تو بڑے استدلالی انداز میں اس کے نظریات پر تنقید کی ہے۔

اس کی جنس پرستی پر شارکو اور پراٹر کے علاوہ اس کے مریضوں اور یونانی دیومالا (MYTHOLOGY) نے بھی کافی اثر کیا۔ مغربی ممالک کی غیر محتاط زندگی میں جذبۂ جنس کے اظہار کو جس قدر آزادی ہے اسی قدر وہاں کے ذہنوں پر زیادتی سے مسلط ہے۔ ان کے معاشرے میں جنس کو جو آزادی حاصل ہے اس کی وجہ سے اگر وہ شعوری اور لاشعوری طور پر اس طرح سوچتے رہیں تو کچھ عجب نہیں ہے۔ دوسرے جب ان کو ایک معالج اس کے بیان کرنے پر اکساتا ہے تو وہ کیوں نہ اس کو سائنٹفک (SCIENTIFIC) تصور کرنے لگیں۔ چنانچہ یہی ہوا اور فرائڈ کی لیبارٹری میں خوب خوب کھل کر جنسی یاوہ گوئیاں ہوئیں۔

اس جنسی یاوہ گوئی ہی نے پراٹر کو طریقۂ تحلیل نفسی سے متنفر کر دیا۔ کیونکہ اب مریضائیں اپنے خواب بیان کرتے کرتے بجائے معالج سے محبت کا اظہار کرنے لگی تھیں۔ پراٹر اس عشق بازی کے لئے تیار نہیں تھا البتہ فرائڈ نے اپنی دھن میں اسے بھی گوارا کر لیا۔ اور اس اظہار عشق کے لئے یہ تو جیہ گھڑی کہ مریضہ اس کے پیکر میں اپنے محبوب کا مشاہدہ کرتی ہے۔[5]

ظاہر ہے کہ جو معالج اس پستی کے لئے بھی تیار ہو جائے وہ اس طرح کے ناقص نظریات نہ پیش کرے گا تو کیا کرے گا۔ اگر اس کے اندر ذرا بھی جنسی توازن ہوتا تو پراٹر اور ینگ کی طرح وہ بھی بہت جلد تحلیل نفسی سے دست کش ہو جاتا۔

یونانی دیومالا کے تاثر نے اسے تمام منظری خوابوں کو مابعد النفسیاتی (META-PSYCHOLOGICAL) بنا دینے کے لئے مجبور کر دیا۔ چنانچہ اس کے یہاں نرگسی۔ ایڈیپی۔ مساکتی۔ اور سادی الجھنیں[6] تمام کی تمام یونانی دیومالا کے قصوں کو اپنے پس منظر میں لئے ہوئے ہیں۔ یونانی دیومالا کے طرز پر منظری خواب دیکھنے کے صرف وہی مریض ہو سکتے ہیں جو یونانی دیومالا کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات رکھتے ہوں۔ لیکن فرائڈ انھیں انتہائی

---

[1] فرائڈ اس کے نظریات خواب جنس" مصنفہ جوزف جاسٹرو صفحہ ۱۸۰۔ [2] انجیل میں لیوک (لوقا) کا ذکر ہے [3] خود مقالہ نگار فرائڈ کے نظریۂ تعبیر خواب پر ایک نظر۔ از پروفیسر محمد مجتبیٰ

[4] فرائڈ اس کے نظریات خواب جنس" مصنفہ جوزف جاسٹرو۔ (FREUD HIS DREAMS AND SEX THEORIES BY JOSEPH JASTROW

[5] NARCISTIC , OEDIPUS , MASOCHISTIC , AND SADISTIC COMPLEXES

حاصلوں سے متعلق کرنے میں ذرا نہیں چوکتا۔

اس مطالعہ کے دوران میں یہ بُری طرح کھٹکتا ہے کہ فرائڈ نے تمام خوابوں کو ماضی ہی سے متعلق مانا ہے۔ اس کے خیال میں نہ خوابوں کو مستقبل سے کوئی تعلق ہے اور نہ وہ مستقبل کے بارے میں کچھ بتلا سکتے ہیں لیکن تجربات یہ بتلاتے ہیں کہ خواب جس قدر ماضی سے تعلق رکھتے ہیں اُسی قدر مستقبل سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ سنہ ۱۹ء میں بعض ماہرین نے اس طرف توجہ دی۔ برطانیہ کے ایک ماہر ڈونے (DUNNE) نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنے تمام خوابوں کو خواب دیکھنے کے فوراً بعد قلمبند کرنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے دیکھا کہ ان میں سے بعض خواب آیندہ چل کر من وعن وقوع پذیر ہوئے۔ فرائڈ کے یہاں اس کے لئے ہم کو کوئی توجیہ نہیں ملتی۔ گرپ نے خواب کو دو اقسام میں منقسم کیا ہے۔[۲]

(۱) اس کا تعلق زمانۂ حال یا ماضی کے واقعات سے ہوتا ہے۔ مستقبل سے اس کا کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ زندگی کا ایسا واقعہ جو خواب میں بعینہٖ نظر آئے یا اس واقعہ کی ضد یہ سب اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۲) اس قسم کا تعلق مستقبل کے واقعات سے ہوتا ہے۔ اس کو پھر تین قسموں میں منقسم کیا گیا ہے۔

(الف)۔ الہام۔ (ORACLUM)

(ب)۔ VISIO ۔ مستقبل کے واقعے سے معمولی طور پر مطلع کرنا۔

(ج) SOMNIA ۔ جس میں تعبیر کی ضرورت پڑتی ہے۔

مستقبل کے خوابوں کے بارے میں انسانی ذہن کچھ بھی نہیں کہہ سکتا جب تک کہ وہ وقوع پذیر نہ ہو جائیں لیکن ان سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ فرعونِ مصر کا خواب جس کی تعبیر حضرت یوسفؑ نے کی۔ یا حضرت ابراہیمؑ کے خواب تجربانی حدود کے اندر نہیں آ سکتے لیکن ان کی جو حقیقت ہے اس سے زمانہ انکار نہیں کر سکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ پہلے ان کے بارے میں خاموش ہی رہنا پڑتا ہے لیکن یہ بھی درست نہ ہوگا اگر ان کی توجیہ ماضی کے تجربات کی بنیادوں پر کی جائے۔ فرائڈ نے ایسے خوابوں کو بھی ماضی کی روشنی میں حل کیا ہے اور بڑی ہی دور از کار توجیہیں کی ہیں۔

خوابوں کے ماضی سے متعلق ہونے کے بارے میں تحلیلِ نفسی کا دعویٰ تو باطل ہے ہی لیکن اس کے برخلاف طبعی نفسیات (PHYSIOLOGICAL PSYCHOLOGY) نے فرائڈ کے خوابوں کے بارے میں جو تجربات کئے ہیں انہوں نے ان سے بھی کسی طرح کا استفادہ نہیں کیا ہے۔ وہ بس اپنی ہی دھن میں سب کچھ کہتا چلا گیا ہے۔ ورنہ یہ تصور اپنے اندر ایک حد تک صداقت رکھتا ہے کہ ہم خواب میں اکثر وہ کچھ دیکھتے ہیں جس کو ہم نے ماضی قریب میں دیکھا، کہا، چاہا یا کیا۔ ہماری شعوری زندگی میں جو عمل ہوتے رہتے ہیں وہ ایک مخصوص محرک کی راہ (STIMULUS PATH) سے گذر کر ذہن تک جاتے ہیں۔ ان کے ذریعہ ذہن اُس عمل کا جواب دیتا ہے۔ لیکن جب ہم نیند کے عالم میں ہوتے ہیں تو ہمارا ذہن آرام کرنے کے باوجود اُسی طرح اپنا فعل کرتا رہتا ہے جس طرح دل۔ معدہ۔ وغیرہ کرتے رہتے ہیں۔ دماغی افعال ظاہر ہے۔ اعصابی ہی ہوں گے۔ چنانچہ یہ محرک کی راہیں (STIMULUS PATHS) اپنے انجام کردہ افعال کو دہراتی ہیں۔ اور ہم خواب دیکھتے ہیں۔ اب اس لمحہ جو بھی محرک کی راہ برسرِ عمل آئے گی ویسا ہی خواب ہم دیکھیں گے۔ اگر بیک وقت کئی ایک محرک راہیں متحرک ہو جائیں گی تو خواب پیچیدہ ہو جائے گا۔ اس طرح نہ اختصار کسی خاص قسم کا ہوگا اور نہ رمزیت محدود ہوگی بلکہ فرد کے تاثرات کے ساتھ تبدیل ہوتی رہیں گی۔ یہ محرکات یادداشت (MEMORY) تصور (IMAGERY) اور تخیل (IMAGINATION) تینوں سے متاثر ہوتے ہیں چنانچہ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے خواب ایسے بھی ہوتے ہیں جو گذرے ہوئے واقعات سے متعلق ہوتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں آنے والا جز بھی شامل ہوتا ہے خواہ وہ وقوع پذیر نہ ہو۔ مثلاً جب ہم کوئی اچھی تقریر سُن کر آتے ہیں تو اس سے متعلق خواب دیکھتے ہیں۔ یا جب ہم کسی سفر کے مشتاق ہوتے ہیں تو پیش آمدہ مناظر خواب میں دیکھ لیتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح خواب ایک طرح کے لاشعوری یادداشت کے تصوری اور تخیلی افعال ہوتے ہیں جو حسیں عملی طور پر ہونا ہی چاہئے۔ کیونکہ جس طرح سوتے وقت دل کی حرکت نہیں بند ہو سکتی اُسی طرح اُن شعبہ ہائے دماغی کی کارکردگی بھی معطل نہیں ہو سکتی۔ یہ خواب بعض وقت اپنے محرک کی راہ کے برسرِ کار آنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے ہیں بلکہ چند ایک اور ذرائع سے بھی مہیجات حاصل کرتے ہیں۔ یہ مہیجات خارجی (EXTERNAL) اور داخلی (INTERNAL) ہو سکتے ہیں۔

---

[۱] رہنمائے ذکار جدیدہ مصنفہ سی۔ ای۔ ایم۔ جوڈ۔ (" A GUIDE TO MODERN THOUGHTS " BY C.E.M. JOAD)

[۲] بحوالہ تحلیل نفسی اور تعبیر خواب مصنفہ عبدالحی جمیل علوی ایم۔ اے۔ ممبر برٹش سائیکولوجیکل سوسائٹی۔

خارجی مہیجات کے سلسلہ میں مارے اور ہلڈ برانڈ نے کافی تجربات کئے ہیں۔ مارے کے تجربات میں سے ایک تجربہ یہ ہے کہ جب نیند کے عالم میں اس کے منہ کے قریب گرم لوہا لایا گیا تو اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کے مکان کے اندر ڈاکو گھس کر مکان والوں کو نقدی پیسہ دینے پر مجبور کر رہے ہیں۔ اور طرح طرح کی اذیت پہنچا رہے ہیں۔ ایک اور تجربہ میں جب پانی کا ایک قطرہ اس کی پیشانی پر ٹپکایا گیا تو اس نے اپنے آپ کو ٹاٹلی میں سخت پسینہ کی حالت میں شراب پیتے ہوئے دیکھا۔

داخلی مہیجات کے سلسلہ میں زیادہ تجربات نہیں کئے گئے ہیں۔ البتہ ڈاکٹر محمد یوسف اپر وفیسر میڈیکل کالج لاہور کا ایک خواب ایک اچھی مثال ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں۔

"ایک دفعہ میں خواب میں مریض کو دیکھنے جاتا ہوں جو سخت پیٹ کے درد میں مبتلا ہے۔ میں اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اس کی تشخیص کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اچانک بند آچاٹ ہو جاتی ہے معلوم ہوا کہ میرے اپنے ہی پیٹ میں درد شروع ہے اور سخت بے چینی کی حالت میں پیٹ پر ہاتھ پھیر رہا ہوں۔"

اسی سلسلہ میں علامہ اقبال کا بھی ایک دلچسپ خواب قابلِ ذکر ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے علامہ سے ایک مناسب موقع پر سوال کیا۔

"تجزیۂ نفسی (PSYCHO - ANALYSIS) کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

فرمایا۔

"جنسی جذبات اور تحت الشعور پر علم النفس کی عمارت بنانے کے بعد فرائڈ جنسی جذبات پر مابعد الطبیعیات کی عمارت کھڑی کرنا چاہتا ہے۔ یہ ممکن نہیں۔" ذرا سے وقفہ کے بعد فرمایا۔

"میں نے خواب دیکھا کہ سات چور میرے مکان میں گھس آئے۔ صبح رفع حاجت کے بعد میں نے کموڈ میں نظر ڈالی تو اس میں سات مُردے تھے۔ تجزیۂ نفسی والے اس کی کیا تشریح کریں گے؟"

اور یہ حقیقت ہے کہ تحلیلِ نفسی والے اس کی کوئی توجیہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہاں بچپن، ماں اور باپ کی تشکیت موجود نہیں ہے۔

اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ خواب فرائڈ کے دعویٰ کے مطابق فراری نہیں بلکہ فطری اور طبعی (PHYSIOLOGICAL) ہوتے ہیں ان کے لئے نہ خوف اہم ہے نہ جنس، اور نہ ہی بے خوفی اور رہبانیت۔ ایک فرد اپنی شعوری زندگی میں جس جذبہ سے زیادہ متاثر ہوگا وہ اسی جذبہ سے متاثر خواب دیکھے گا۔

یہاں عالم بیداری کے خوابوں (DAY DREAMS) کے بارے میں سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ آخر وہ کیسے وقوع پذیر ہوتے ہیں؟ لیکن یہ ایسی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کے (FLUCTUATION OF IDEAS) ہوتے ہیں۔ ایک صحت مند ذہن میں یہ چند لمحات کے لئے ہوتا ہے لیکن جب احتمال ہو جاتا ہے تو یہ چند لمحات قدرے طویل عرصہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

خوابوں کی ایک نوعیت ایسی بھی ہے جسے مشوراتی خواب ——— (SUGGESTION DREAMS) کہا جا سکتا ہے۔ میرے ایک دوست نے اس سلسلہ میں بڑا دلچسپ تجربہ کیا ہے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا یہ صحیح ہے کہ خواب جنس زدہ ہوتے ہیں اور کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اگر کسی فرد کو مشورہ دے دیا جائے تو وہ خواب دیکھ لے۔

"ایک خاتون کو یہ شکایت تھی کہ ان کا شوہر کسی اور عورت کی طرف ملتفت ہو گیا ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ کسی تعویذ کے ذریعہ وہ اس عورت کا پتہ لگائیں۔ میرے دوست کو اپنے تجربہ کا اچھا موقع میسر آگیا چنانچہ انھوں نے ایک کاغذ پر یونہی سطریں نشانات اور ہندسے لکھ کر دے دیئے اور کہا کہ پوری طہارت کے ساتھ اسے تکیہ کے نیچے رکھا جائے۔ تین دن کے اندر خواب نظر آجائے گا۔ چنانچہ تیسرے دن واقعتاً ان خاتون کو خواب نظر آیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کے پلنگ کے نیچے کافی آگ جل رہی ہے لیکن ان کا پلنگ بالکل محفوظ ہے اور ان کے خاوند ان کو عطر کی ایک شیشی دے رہے ہیں۔"

اس خواب پر اگر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہاں مہیج خارجی ہے لیکن

---

[1] بحوالہ تحلیلِ نفسی اور تعبیرِ خواب"۔ مصنفہ عبدالحی جمیل علوی ایم۔ اے۔ صفحہ ۹۹۔

مارے کے صحیحات سے بالکل مختلف۔ محض ایک مشورہ نے خاتون کے اندر یقین پیدا کر دیا کہ وہ خواب دیکھیں گی اور انھوں نے خواب دیکھا۔

اسی صنف یا نوعیت کے خواب وہ بھی ہیں جن کو ان حضرات نے تجربہ کیا ہے جو "دماغیت" یعنی (MENTALISM) کے قائل ہیں[1]۔ دماغیت (MENTALISM) کے مطابق دو نفس آپس میں اتنے مربوط ہو جاتے ہیں کہ ایک نفس کے احساس اور جذبات کا اثر دوسرے نفس پر پڑنا ممکن ہو جاتا ہے۔ خواب میں ایسے بھی واقعات کا علم ہو جانا ممکن ہے جن کا اثر ایک دوسرے کے نفس پر پڑے۔ عبدالحی جمیل عثمانی نے اپنے دو مرتبہ عثمانی کا ایک خواب اس سلسلہ میں قلمبند کیا ہے جو اس نظریہ کی وضاحت کے لئے کافی معلوم ہوتا ہے۔ عثمانی نے خواب بیان کیا کہ۔

"کافی مدت گذری ہے میں نے خواب میں دیکھا کہ ڈاکو ہمارا گھر لوٹ رہے ہیں۔ تیسرے دن خبر ملی کہ بھائی صاحب (یعنی میرے والد محترم) وفات پا گئے ہیں[2]"

اس خواب میں تو خارجی مسیح کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی وہ کام کر رہا ہے۔ اور خواب نظر آ رہے ہیں۔

بہرحال ان تمام تصریحات کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فرائڈ نے خواب کے صرف ایک شعبہ کو اور وہ بھی عصبی مریضاؤں کے خوابوں کو ہی خواب کی تمام نوعیتوں پر مسلط کرنا چاہا۔ اس نے اپنی تحقیق میں صرف مریضوں اور تحلیل نفسی سے متاثر شدہ لوگوں کو ہی کو توجہ بنایا ہے۔ اس لئے صحت مند ذہنوں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ اس نے اپنے آپ پر بھی تجربے کئے ہیں۔ اور اس کو عصبی مریض نہیں کہا جا سکتا لیکن اس بات سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اور اس پر یقین رکھنے والوں نے خود کو تحلیل نفسی کا مشورہ (SUGGESTION) دے رکھا تھا۔ اس مشورہ نے ہی ان کے خواب و خیال کو اس محور پر گھما دیا اور اس نے پوری شدومد کے ساتھ مارکس کے برخلاف انسان کو شہوانی جانور بنا کر پیش کر دیا۔ اور آج خواب، شعور و لاشعور اور جنس کے تمام کو الف پر غور کئے بغیر اس کے ہر خیال کو صادق مانا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ جب تک خواب کی (کیونکہ میں خواب ہی کے موضوع پر لکھ رہا ہوں) آخر الذکر اصناف پر بھی توجہ نہ دی جائے گی۔ خواب کی تعبیر پریشان ہی رہے گی۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک غیر مادی اور مابعد الطبعی فعل کی صرف طبعی سائنس (PHYSICAL SCIENCE) کی مدد تشریح نہیں کی جا سکتی۔

---

[1] ملاحظہ ہو امریکی ادارہ دماغیت (AMERICAN INSTITUTE OF MENTALISM) کی شائع کردہ کتاب "قانون دماغیت" مصنفہ وکٹر اسکنو (THE LAW OF MENTALISM BY VICTOR SKINOV)

[2] تحلیل نفسی اور تعبیر خواب مصنفہ عبدالحی جمیل عثمانی ایم۔اے۔ صفحہ ۱۷۴ تا ۱۷۸۔

جمیل احمد فاروقی

کچھ ہیئت کے بارے میں

ترقی پسند ادب کا مستقبل

دو سوالات

رئیس امروہوی ایڈیٹر شیراز کراچی نے اپنے مکتوب مورخہ ۸ جولائی ۵۳ء میں مندرجہ ذیل مسائل پر میرے خیالات طلب فرمائے تھے۔ زیر نظر مضمون اسی کا جواب ہے ——

۱ —— اسلام پسند ادیبوں اور شاعروں نے (نام نہاد) ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی ہیئت کو اس بری طرح اپنا لیا ہے کہ ان دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ کیا یہ رجحان درست ہے ——

۲ —— ترقی پسند ادب کی تحریک مرجھا کیوں گئی؟ کم سے کم پاکستان میں عام رائے یہی ہے، ہندوستان میں اس تحریک کا مستقبل کیا ہے؟

(جمیل احمد فاروقی)

تکنیک اور ہیئت کے سلسلے میں رئیس امروہوی نے جو اشارہ کیا ہے وہ بڑا ہی دلچسپ ہے۔ بعض مخلص حضرات کو واقعی یہ شکایت ہے کہ عام طور پر اسلام پسند ادیبوں نے ترقی پسندوں کی تکنیک اور ہیئت کو اس بری طرح اپنا لیا ہے کہ تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے!

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ خود ترقی پسندوں نے جس تکنیک اور فارم کو اپنا لیا ہے وہ خود ان کا اور کیپٹل ہے یا مستعار؟ اگر اس تکنیک اور فارم کی تخلیق انھیں کے ہاتھوں سے ہوئی اور یہی اس کے واحد موجد ہیں تو بے شک اس کا اختیار ہے کہ غیر ترقی پسندوں کو استعمال کرنے دیں (حالانکہ اشتراکی اصول کے تحت یہ بھی ایک غلط سی بات ہے) اور اگر مستعار ہیں اور پچھلے فن و تکنیک کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے تو پھر انھیں معترض ہونے کا کوئی حق نہیں پہونچتا اور انھیں چپ چاپ جبیں نہ ہونا چاہئے!

تاریخ ادب کا معمولی علم رکھنے والے حضرات بھی جانتے ہیں کہ انقلاب فرانس نے نہ صرف تاریخ اور معاشیات میں زندگی کی نئی قدریں اور تصورات اجاگر کئے بلکہ ادب پر بھی انتہائی حیرت انگیز اثر پڑا۔ یوں تو مختلف ترقی پسند افکار کی علمبردار تحریکیں متاثر ہوئیں لیکن ایک زبردست تحریک وجود میں آئی جو تاریخ عالم میں (ENCYCLOPAEDIST MOVEMENT) کے نام سے مشہور ہے۔ اس دور کی دو اہم شخصیتوں ڈیدرو اور والٹائر نے اس عظیم فکری انقلاب کی داغ بیل ڈالی۔ اس لئے ترقی پسند ادیبوں کا یہ دعویٰ کہ سب سے پہلے ادب کو انقلاب کا ذریعہ بنانے کی خدمت انھیں نے انجام دی سراسر تاریخی واقعات کے خلاف ہے۔ آج بھی اس طرح کی ادبی تحریکیں انقلاب فرانس کی اسی ادبی تحریک ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی حیدرآباد کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالعلیم صدیقی نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان میں اشتراکی انقلاب کے لئے (ENCYCLOPAE DIST MOVEMENT) کے نقوش پر ایک ادبی تحریک چلائی جائے۔ اگرچہ یہ تجویز بعض مصالح کی بنا پر منظور نہ ہو سکی لیکن اس سے یہ بات ضرور مترشح ہوتی ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک اپنے طریقۂ کار اور طرز عمل میں فرانس کی ادبی تحریک سے انتہائی متاثر ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا طریقۂ کار اپنا نہیں بلکہ وہ بھی مستعار اور دوسروں کی ودیعت ہے۔

اب رہا تکنک اور فارم کا سوال۔ ترقی پسند ادیبوں نے جس فارم اور تکنک کو اپنایا ہے اُسے بھی عام طور پر ان کی اپنی اختراع سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ بھی غلط ہے۔ مختلف ممالک میں ترقی پسند جو فارم استعمال کر رہے ہیں۔ وہ فی الحقیقت ادب الاساتذہ کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

مثال کے طور پر آزاد نظموں کو لیجئے جنھیں عام طور پر لوگ ترقی پسندوں کی تخلیق سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ خیال بالکل حقیقت کے خلاف ہے معریٰ نظموں کا فارم اپنے تمام ادبی محاسن کے ساتھ شیکسپیئر کے ڈراموں اور ملٹن کی نظم "فردوس گم شدہ" (PARADISE LOST) میں موجود ہے۔ یہ صنفِ ادب انگلستان سے امریکہ آئی اور پھر بعد میں ساری دنیا میں پھیل گئی۔ ترقی پسند خوشہ چینوں نے اسے اچھا اور آسان ذریعہ اظہار سمجھکر اپنے ادب میں ایک مستقل جگہ دے دی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین منعقدہ پیرس سے بہت پہلے یہ صنفِ ادب پورے یورپ میں سندِ مقبولیت حاصل کر چکی تھی۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسندوں نے اس کو سکنڈ ہینڈ فارم کی حیثیت سے اپنایا ہے۔ اور یہ اُن کی ذاتی ملکیت نہیں جس کے وہ واحد حقدار ہوں۔

معریٰ نظموں کے بعد اب ذرا دوسرے اصنافِ شعر کا جائزہ لیجئے تو یہاں بھی ترقی پسندوں نے سوائے صوتی بلند آہنگی کسی اور چیز کا اضافہ نہیں کیا اور اگر یہ صوتی بلند آہنگی ادب کے پیچھے ادوار میں نہیں تھی تو کوئی تعجب کی بات نہیں ظاہر ہے کہ آج کی طرح ادب کبھی بھی زندگی کے ہمہ گیر مسائل کا ترجمان اور عکاس نہیں رہا۔ داخلیت اور خارجیت ہی کے حدود میں رہ کر ادب کو مختلف اصنافِ شعر و ادب میں گل افشانی کے مواقع دیئے گئے۔ پھر جس جس طرح زندگی پھیلتی گئی ادب داخلیت کے حدود کو توڑتا گیا اور خارجی حالات و مسائل کو سلجھانے میں نئی نئی کروٹیں بدلتا رہا۔

فی الحقیقت ادب سے زیادہ اپنے مقصد کی ترویج و اشاعت کا اور کون سا موثر آلۂ کار ہو سکتا ہے۔ اسی لئے مشترکہ کی ادیبوں نے نہ صرف ادب کو شدت کے ساتھ استعمال کیا بلکہ عوامی نفسیات پر گہری نظر رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ عوامی پسندیدگی اور عوامی توجہ کو کھینچنے کے لئے انھوں نے اپنی نظموں کے پرانے فارم میں صوتی بلند آہنگی پیدا کر دی جو سب سے زیادہ موثر ترین طریقہ اظہار ہے۔ اس طرح اگر کوئی تبدیلی کی جا سکتی ہے تو صرف اتنی کہ لہجہ بدل گیا۔ فارم اپنی جگہ پر وہی ہے خصوصاً اردو میں ہمیں سب سے پہلے اس طرح کی صوتی بلند آہنگی علامہ اقبال کے یہاں ملتی ہے۔ بعد میں اسی فارم میں عمومیت اور لہجہ کی کرختگی پیدا کر کے ترقی پسند حضرات اُسے اپنی اختراع اور اپنی چیز سمجھ بیٹھے۔

صرف سردار جعفری کی مجموعۂ کلام "پرواز" اگر سامنے رکھ لیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری صوتی اور لفظی اعتبار سے اقبال سے بیحد متاثر رہی ہے اور یوں بھی وہ علامہ اقبال سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ یہی حال ترقی پسند ادب کے دوسرے فنکاروں کا ہے۔ لہٰذا ترقی پسندوں کا یہ دعویٰ کہ تکنک اور فارم بھی اُن کا اپنا ہے۔ اور صرف انھیں کو اُس پر قابض رہنے کا حق حاصل ہے سراسر تاریخی واقعات کے خلاف ہے!

اس لئے اگر ہم اسلام پسند ادیبوں اور شاعروں نے اس تکنک اور فارم کو اپنایا ہے تو اس کے لئے ہم مورد الزام نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ ہمارا یہ رجحان کسی طرح بھی غلط نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات اور ہے کہ ہم جس مقصدِ عظیم کو لے کر اٹھے ہیں۔ جن اساسی تصورات و افکار پر ہمارے سارے ادب کی عمارت کھڑی کی گئی ہے اس کے لئے موجودہ اور مروجہ فارم کافی نہیں ہے۔ ورنہ جہاں تک صرف انہیں استعمال کرنے کا سوال ہے وہ کسی بھی ادبی گروہ کی میراث نہیں، ادیب تو مروجہ تکنک سے متاثر ہوتا ہی ہے اسلام پسند ادیب بھی اگر متاثر ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن یاد رکھئے جتنا وہ اندر سے بدلے گا اتنا ہی وہ باہر سے بھی بدلتا جائے گا اس لئے ہمیں اس کے ظاہر سے زیادہ اس کے باطن کو بدلنے کی فکر لاحق ہے۔ ہماری نظر میں تکنک اور فارم کی حیثیت ثانوی ہے!!

ابھی اس مسئلہ کا دوسرا پہلو باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ مروجہ فارم اور تکنک کو استعمال کرنے کے بعد ہمارے اور ترقی پسندوں کے درمیان کوئی چیز مابہ الامتیاز ہونی چاہئے یا نہیں؟ ضرور ہونی چاہئے! ہماری اور اُن کی تخلیقات کے بنیادی فرق و امتیاز کو برقرار رکھنے کے لئے اگر آپ صرف تکنک اور فارم ہی کی کسوٹی رکھتے ہیں تو یقیناً تمیز کرنا مشکل ہوگا۔ اس لئے کہ ہمارے پاس بھی وہی الفاظ۔ وہی تراکیب اور وہی لب و لہجہ ملے گا لیکن اگر کسی ادیب کی ادبی تخلیقات کی تمام صوری و معنوی محاسن کا اندازہ لگانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے موضوع۔ مواد، فکری ارتقاء اور اس کی رسائی پر بھی ایک گہری اور بسیط نظر رکھی جائے تو پھر میں یہ کہوں گا کہ آپ کو نہ صرف یہ کہ اسلامی ادب کی بنیادی خصوصیات کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ بلکہ اسلام پسند اور ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے درمیان ایک واضح خطِ امتیاز کھنچا ہوا نظر آئے گا۔ طوالت کا خوف ہے ورنہ اسلامی ادب کے مختلف نمونے پیش کر کے یہ بات زیادہ واضح طور پر پیش کی جاتی۔ بہر حال مروجہ تکنک اور فارم کو استعمال کرتے ہوئے بھی کون کہہ سکتا ہے کہ

محمود نادر قی۔ سنظر حسین۔ ابن فرید۔ نعیم صدیقی۔ عرشی بھوپالی۔ شمیم جاوید۔ ظفر عالمگیر اور انور صدیقی اپنی تخلیقات کے پرپر موڑ پر کرشن چندر۔ منٹو۔ عصمت۔

رضیہ سجاد ظہیر، فیض، اور مجروح سے مختلف نہیں ہیں۔

سب سے آخری بات جو توجہ سے دریافت کی گئی ہے یہ کہ ترقی پسند ادب کی تحریک مُرجھا کیوں گئی؟ سچ پوچھئے تو یہ تحریک اپنی اخلاقی گراوٹ۔ تضاد اور دورنگی کی نذر ہو گئی۔ پاکستان میں تو اسلامی ادب نے خارج سے حملہ بھی کیا۔ اور ہندوستان میں زیادہ تر داخلی بگاڑ ہی کا شکار رہے۔ اگر اسلامی ادب ایک مشترک پلیٹ فارم سے آگے بڑھ سکے تو یہاں بھی اس کی مکمل شکست یقینی ہے۔

تفصیل جائزہ لینے کے لئے سب سے پہلے ہمیں تقسیم ہند کے بعد کے ہنگامہ خیز واقعات کو سامنے رکھنا ہوگا جس کا ترقی پسند تحریک پر بہت ہی ناخوشگوار اثر پڑا۔ ادب پر مُردنی سی چھا گئی۔ خارجی حالات کے یکایک غیر معمولی طور پر خراب ہو جانے سے دونوں ملکوں کی ترقی پسند تحریک پر ایک گہرا جمود چھا گیا۔ پاکستان میں اسلامی ادب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے اس کی رہی سہی ساکھ بھی ختم ہو گئی۔ اس تحریک کے زوال کا دوسرا سبب جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں اس کا قولی اور عملی تضاد تھا۔ اس کے منشوروں میں عریانی فحاشی اور عملی سیاست سے کنارہ کشی کی دفعات درج کی گئیں مگر عملاً انھوں نے اپنی پرانی روش برقرار رکھی۔ منٹو، مفتی، ہاجرہ مسرور وغیرہ سماج کی عکاسی کا نقاب اوڑھ کر عریانی اور فحاشی کا پرچار کرتے رہے سنجیدہ اور خدا پرست طبقہ ادب بھی متنفر ہو گیا اور فطری طور پر صالح ادب سے قریب تر آ گیا۔

انتہا پسندی (جیسا کہ اُن کی عام خصوصیت ہے) انھیں لے ڈوبی۔ اندرونی اختلافات اور داخلی بگاڑ بڑھتا رہا۔ ان میں وہ لوگ جو کچھ "آزاد خیال" واقع ہوئے تھے اور اشتراکی عقیدے کی پابندی سے کتراتے تھے۔ انھیں برادری باہر کر دیا گیا مثلاً۔ ممتاز شیریں، اور اختر حسین رائے پوری وغیرہ صرف اس لئے نکال دیئے گئے کہ ان کے نظریات میں وسعت پیدا ہو رہی تھی۔ ان لوگوں نے اس تحریک سے نکل کر اس کے اندرونی کھوکھلے پن کو بُری طرح بے نقاب کیا جو اس تحریک کی مزید تباہی کا باعث بنی۔

ہندوستان میں مختلف مذہبی اور اصلاحی تحریکوں کی سرگرمیاں اُن کی بڑھتی ہوئی مقبولیت ——— پھر سب سے بڑھ کر اس کی اخلاقی طاقت کا دباؤ اشتراکیت اور اشتراکی ادب کے لئے ایک اور بھی مستقل خطرہ بن گیا ہے۔ رہا مستقبل کا سوال ——— نہ صرف ہندوستان میں، بلکہ سوویٹ روس کے علاوہ ساری دنیا میں اشتراکی ترقی پسند تحریک کا کوئی مستقبل نہیں کیونکہ آج کل ساری دنیا کے ادیبوں میں "مذہب" کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

صفائی

خون کی خرابی، پھوڑے پھنسی، خارش اور داد وغیرہ کی بہترین دوا ہے صفائی اندرونی طور پر استعمال کیجئے اور مرہم جنا بیرونی استعمال کیجئے ہے صفائی ۴ اونس کی شیشی ایکڑ یہ مرہم جنا فی شیشی ۶/

نوبہار

بچوں کی مشہور اور پسندیدہ دوا چھوٹے بچوں کی صحت اور قوت کا محافظ معدہ کی تمام خرابیوں کیلئے ایک آزمودہ اور اطمینان بخش دوا ہے۔

نوٹ:۔ آرڈر کے ساتھ پیشگی رقم آنی چاہیے۔ ہر قصبہ و شہر میں دیانتدار ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔ دواخانہ کی کل آمدنی غریب مریضوں اور طلباء پر صرف کی جاتی ہے۔

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

چند ایجنسیوں کے پتے ———

(۱) کانپور۔ جین گنج۔ (۲) بنارس۔ دال منڈی۔ (۳) بھوپال جمراتی بازار۔ (۴) فیروز آباد۔ فردوسی اسٹور۔ (۵) غازی پور۔ ٹاؤن ہال۔ (۶) شاہ گنج مع الہند دواخانہ۔ (۷) ٹانڈہ فیض آباد چھوٹی بازار۔ (۸) مئو اعظم گڈھ حافظ محمد مجتبےٰ۔ (۹) بہرائچ چوک جمال سہرائل۔ (۱۰) بستی۔ گاندھی نگر ——— (۱۱) شاہجہانپور۔ محمد علی مارکیٹ (۱۲) بکسر۔ صدیقی دواخانہ (۱۳) علیگڈھ پھپالہ۔ (۱۴) علیگڈھ مسلم یونیورسٹی۔ ایس۔ اے۔ اسٹور۔ (۱۵) میسوری۔ مصور دین ڈاکٹر حکیم عبدالمغنی صاحب۔ (۱۶) سرسا گنج مظفرپور بہار۔ حکیم محمد سمیع صاحب توحیدی شفاخانہ (۱۷) الہ آباد۔ سبزی منڈی۔ کامیاب دواخانہ ——— (۱۸) کاشی۔ ناگپور گھڑی بازار۔ اقبال اسٹور (۱۹) اٹاوہ۔ مشہور یونانی دواخانہ (۲۰) لکھنؤ چوراہہ۔ صبیٰ گنج ہندوستان میڈیکل اسٹور (۲۱) قیصر گنج بہرائچ۔ حکیم ابوالبرکات (۲۲) گونڈہ۔ رکاب گنج۔ شمشاد حسین۔

نثار احمد فاروقی

میرؔ کی تربیت کا ابتدائی ماحول

اور اُن کی عشقیہ شاعری

میر تقی میرؔ آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے ابتدائی ماحول۔ پرورش اور تعلیم و تربیت کا حال زیادہ مستند طور پر اُن کی خود نوشت سوانح "ذکرِ میرؔ" سے معلوم ہوتا ہے۔

ذکرِ میرؔ فارسی زبان میں اُس دور کی عام روشِ تحریر سے قدرے ہٹ کر ایک کتاب ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی مغتنم ہے میرؔ نے اگرچہ بعض مقامات پر بہت ہی مقفّیٰ فارسی استعمال کی ہے۔ مگر پھر بھی اس میں ایک حسن ہے جو قافیہ آرائی سے بدظن نہیں ہوتا۔ اگر محض ایک خود نوشت کی حیثیت سے ذکرِ میرؔ پر تبصرہ کرنا مقصود ہو تو ہم اُسے ایک کامیاب خود نوشت قرار دے سکتے ہیں۔

میرؔ نے اس کتاب کو کچھ اس ڈھنگ سے لکھا ہے کہ وہ از خود تین حصّوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ابتدائی تحریر میں اُن کے والد اور چچا سیّد امان اللہ کا ذکر ہے۔ اور پھر ان دونوں کے ملفوظات۔ اور ان کی درویشی و بزرگی کی حکایات ہیں۔ اس سلسلہ میں دو تین ایسے بزرگوں کا ذکر بھی آ گیا ہے جن سے میرؔ اپنے چچا کی معیّت میں ملے ہیں۔

دوسرا حصّہ وہ ہے جس میں اُن کی اپنی مشکلات کا تذکرہ ہے جو انھوں نے اپنے والد کی وفات کے بعد عزیزوں کی کج التفاتی اور اقارب کی بے مروّتی کے باعث اٹھائیں۔ یہ دوسرا حصّہ اتنا طویل ہے کہ آخر تک بس یہی داستان چلی گئی ہے۔ اس ضمن میں ایک حصّہ کو میرؔ کا حصّہ کہا جا سکتا ہے جس میں اُس دور کی سیاسی حالت پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

لیکن میرؔ نے اپنا ابتدائی ماحول جس رنگ میں پیش کیا ہے اور تربیت کے بارے میں جو اشارے اُن کی تحریر میں ملتے ہیں ــــ وہ حیرت انگیز بھی ہیں اور ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتے ہیں کہ جس شاعر کی تربیت ایسے حالات اور ایسے گھر میں ہوئی ہو اس کا مزاج اور ذہن کیا ہو سکتا ہے۔

صوفیا کی چند مخصوص اصطلاحات میں ایک خطرناک اصطلاح تعلیمِ عشق کی ہے۔ جو بقول ایشاں مجاز سے حقیقت کی طرف لے جاتی ہے۔ میرؔ کے والد اور چچا کی سیرت کے بیان میں اسی عشقِ مجازی و حقیقی کے فلسفہ کا بہت گہرا رنگ ملتا ہے۔

میرؔ نے اپنے والد سیّد علی متقی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"جوانِ صالح، عاشق پیشہ بود دل آگرمے داشت۔ بخطاب علی متقی امتیاز یافت۔" (ذکرِ میر ص ۵)

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"علی متقی روز و شب خدا کی یاد میں بسر کرتے تھے۔ جب کبھی استغراق کی حالت ختم ہوتی، تو فرماتے کہ بیٹا عشق کرو۔ عشق اس کارخانۂ ہستی کو چلانے والا ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو نظامِ عالم درہم و برہم ہو جاتا۔ بغیر عشق کے زندگی بیکار ہے۔ عشق میں دل کی بازی لگا دینا ہی حاصلِ حیات ہے۔ عشق ہی بناتا ہے۔ عشق ہی جلا کر کندن کر دیتا ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہے عشق کا طفیل ہے۔ آگ میں عشق کی گرمی ہے۔ پانی میں عشق کی روانی و نرمی ہے۔ خاک میں عشق کا قرار اور ہوا میں اُس کا اضطرار ہے۔ موت عشق کی مستی اور زندگی اس کی ہشیاری ہے۔ دن عشق کی بیداری اور رات اس کی نیند ہے۔ مسلمان عشق کا نور اور کافر اس کا قہر و جلال ہے۔ نیکی عشق کا قرب اور گناہ اس کے درمیان فاصلہ ہے۔ جنّت اس کا شوق اور دوزخ اس کا ذوق ہے۔ عشق کا مقام و مرتبہ بندگی

سے۔ زہد و عرفان سے۔ سچائی اور خلوص سے اشتیاق اور وجدان سے بھی بہت بلند و بالا ہے۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آسمانوں کی دن رات گردش (؟) بھی عشق کے باعث ہے یعنی وہ اپنے محبوب تک پہنچنے کی دھن میں لگاتار گردش کر رہے ہیں۔

بے عشق نبسا یہ بود، بے عشق نیا یہ زیست
پیغمبر کنعانی، عشق پسرے داشت

میر صاحب لکھتے ہیں کہ میرے والد جب کبھی پیار سے مجھے گود میں اٹھا لیتے تو میرے رنگ کو دیکھتے اور فرماتے کہ

"اے سرمایۂ جان کیسی آگ ہے جو تیرے دل میں پاتا ہوں۔
یہ کیسی جلن ہے جو تیرے سینہ میں محسوس کرتا ہوں، یہ سنکر
میں سہنتا تھا۔ وہ روتے جاتے تھے۔ (ترجمہ۔ ذکر میر)

اپنے والد میر متقی کے عشق کی ایک بڑی رنگین کہانی (ذکر میر) لکھی ہے کہ ایک مرتبہ کسی مکار درویش کے فریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے وہ پیادہ پا لاہور تک گئے۔ وہاں سے واپسی میں دہلی قیام کیا مگر چونکہ میر متقی عزلت پسند تھے اور لوگوں نے صبح سے شام تک اُن کی قیام گاہ یعنی شیخ عبدالعزیز خرّت کے بیٹے دیوان قمرالدین کے مکان پر ملاقات کا تانتا باندھ دیا۔ اس لئے ایک دن تہجد کی نماز پڑھ کر چپکے سے آگرے کی طرف کو چل کھڑے ہوئے۔ راستہ میں آگرہ سے ایک دو منزل پیچھے بیانہ میں قیام کیا۔ یہ شرفا اور سادات کی ایک مختصر سی بستی تھی۔ میر متقی ایک مسجد میں قیام فرما تھے کہ اتفاقاً ایک خوبصورت سید زادہ سر راہ نظر پڑا اور یہ اس کو دیکھکر بے قرار ہو گئے۔ اپنی فقیری کے زور سے اُسے مسخر کر کے کھینچ بلایا۔ اس لڑکے کے بے چارے کی شادی کا دن تھا۔ وہ اُن کی درویشی کا ایسا معتقد ہوا کہ شادی بھی کچھ ایسی ہی کر کرا کر بیوی کو بجلد روتی میں چھوڑ اور علی متقی کی تلاش میں جو پہلے ہی آگرے کو روانہ ہو چکے تھے۔ صحراؤں بیابان کی خاک چھانتا ہوا اُن کے گھر آن پہنچا۔

یہ سید امان اللہ تھے۔ جن کو میر چچا کہتے تھے۔ امان اللہ کی شادی کے موقع پر بیانہ میں میر متقی بھی شریک تھے۔ لوگوں نے بڑے اہرام سے انہیں شرکت کے لئے بلایا۔

"گفتند، مبارک است، اما افسوس، کہ خدائی مانع خدا پرستی است"

شادی کی مذمت میں میر کے والد نے جو کلمات سید امان اللہ سے فرمائے وہ بھی سن لیجئے۔

"اے عزیز تو نہیں جانتا کہ لفظ "داماد" "دام" اور "آد" سے مرکب ہے بکلمۂ "آد" فارسی میں نسبت کے لئے آتا ہے یعنی جس کی شادی ہوئی وہ گرفتار دام بلا ہوا میں اس دام سے برق تیز رفتار کی طرح گذر گیا ہوں۔ خیر مجھے ان باتوں سے کیا مطلب، جاؤ آدمی اس کام میں ناچار اور مجبور ہے۔ میں بھی ابتدائے جوانی میں شراب عشق سے سرشار تھا۔ مگر انجام بجز خمار کے جو ایک رنج ہے اور کچھ نہ پایا جب خدا نے مجھے اس گرفتاری سے نجات دی تو میں نے اپنے تئیں مضبوط و مستحکم بنایا۔" (ترجمہ۔ ذکر میر)

اس تعلیم ترک و تجرید کا اثر یہ ہوا کہ لڑکے کا دل اپنی بیوی کی طرف سے ہٹ گیا۔ علی متقی تو آگرہ کو چلے آئے۔ امان اللہ نے مگر جا کر پانی بھی نہیں پیا۔ دامن کو لباس نو عروس میں ہی چھوڑا اور چل کھڑے ہوئے۔ عورت بے چاری ایک مدت انتظار میں جیتی رہی۔ آخر شوق کے مرض میں گرفتار ہو کر موت کی آغوش میں جا سوئی۔

سید امان اللہ کے بھی عشق کا ایک واقعہ میر نے لکھا ہے کہ ایک دن وہ جمعہ بازار کی سیر کو گئے۔ اتفاق سے کسی روغن گر کا لڑکا نظر پڑا۔ اس کی محبت میں بے قابو اور از خود رفتہ ہو گئے۔ لیکن اس لڑکے نے مطلق التفات نہ کیا۔ مگر ان کے دل کو کسی طرح کسی پہلو قرار نہ آتا تھا اسی اضطراب اور بے چینی میں ایک ملازم کے کندھوں پر ہاتھ رکھکر چلنے لگے اور اپنے دل میں کہتے تھے کہ

"اے عزیز ایسا المناک کھیل کوئی بھی کھیلتا ہے جو تو نے کھیل کر
اپنے تئیں کوچہ و بازار میں رسوا کرایا ہے یا تو تیرے ضبط و
استقامت کا وہ عالم تھا۔ یا بے قراری و بے اختیاری کی
بھی حد گزار دی۔ تو نے جو حرکت کی ہے وہ کوئی بچہ بھی نہیں
کرتا جس راستہ پر تو چلا ہے اس پر ایک اندھا بھی نہیں
چلتا۔ دل ایسی چیز تو نہیں کہ کسی بازاری لونڈے پر نچھاور
کر دی جائے۔"

غرض امان اللہ بے قابو ہو گئے تو سوچا کہ بغیر پیر و مرشد یعنی علی متقی کی توجہ کے یہ کام آسان نہیں ہوگا۔ چنانچہ اسی بیقراری کے عالم میں میر متقی کے پاس آئے۔ میر متقی نے اُن کی صورت دیکھ کر یہ شعر پڑھا ؎

مستمند عشق می داند کہ سودا می کند ۔ دیدن اطفال تہ بازار رسوا می کند

اور پھر مرید کو حکم دیا کہ اپنے حجرہ میں جاؤ اور آٹھ دن تک باہر نہ نکلنا۔ اسی دوران میں ایک دن وہ لڑکا از خود آیا۔ اور میر متقی نے سید امان اللہ سے کہلا کر بھیجا کہ تمہارا محبوب تمہیں تلاش کر رہا ہے۔ امان اللہ بے محابا حجرہ سے باہر آئے۔ اور لڑکے کو دیکھکر باغ و بہار ہو گئے اور یگانگو درمیان میں آئی۔

"اے جوانِ رعنا میں فقیر ہوں بے مدعا دل رکھتا ہوں۔ تو مجھے اپنی محبت کا اسیر نہ سمجھنا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ دل کہاں گرفتار ہے۔ اور یہ سراپا آرزو جان کس کی تلاش میں بیقرار ہے تو ہرگز مغرور نہ ہونا۔ ایسا نہ ہو کہ پھر افسوس کرے۔ درویش لوگ اگرچہ اس آسمان کے بھی پرے اپنا مقام رکھتے ہیں لیکن انہیں بھی ایک حال میں نہیں چھوڑا جاتا۔ یعنی ہم لوگوں کا حال دیگر گوں ہوتا رہتا ہے۔"

لڑکے نے سید امان اللہ سے کہا کہ میں نے رنج اٹھا کر گنج پایا ہے۔ آپ مجھے اپنی خدمت کی سعادت سے محروم نہ کیجئے۔ اور پھر وہ لڑکا تمام عمر وہیں کا ہو رہا۔

یہ اس ماحول کی تربیت تھی۔ یہی نہیں۔ جہاں میر اپنے چچا سید امان اللہ کی درویشوں سے عقیدت اور ارادت کا حال لکھتے ہیں وہاں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی چچا کے ساتھ ان صوفیوں کی صحبت میں شریک ہوتے تھے۔ اس ضمن میں ایک فقیر احسان اللہ نامی کا حال بھی لکھا ہے جو بہت ہی گوشہ نشین تھے۔ اور اپنے گھر کا دروازہ ہر وقت بند رکھتے تھے۔ میر چند مرتبہ اپنے چچا کے ساتھ ان کے پاس گئے۔ انھوں نے میر اور امان اللہ کو جو نصائح کئے وہ خلاصتاً یہ ہیں کہ اے عزیز خدا کی معرفت کو ایک غزال وحشی سمجھو۔ اور اس دنیا کو ایک صحرائے پُر غبار۔ انسان کا جسم ایک گھوڑا ہے اور روح اس کی سوار۔ یہ غزالِ وحشی صید ہو جائے تو گھوڑے کے ضائع ہونے کا کیا افسوس ہے۔ لیکن اگر گھوڑا مر گیا اور شکار ہاتھ نہ آیا۔ تو ایسی حسرت رہے گی کہ اس سے زیادہ عذاب الیم کوئی نہ ہو۔ اور عذاب قبر بھی اسی سے عبارت ہے۔

"دنیا سے ہرگز دل نہ لگاؤ۔ اسے ایک ایسی بے شرم طوائف سمجھو کہ جب باپ چلا جاتا ہے تو بیٹے سے دل لگانے لگتی ہے۔ اہلِ سیرت اور باحیا لوگ اس کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتے۔"

(ترجمہ۔ ذکر میر)

ایک دن میر صاحب اور ان کے چچا ان ہی بزرگ ارلینی احسان اللہ کی صحبت میں بیٹھے تھے۔ کہ ایک گویّے کا ادھر سے گذر ہوا۔ انہوں نے اسے بلایا اور کچھ گانے کی فرمائش کی۔ اس نے ساز پر بھیرویں میں یہ شعر سنایا ؎

بیا کہ عمرِ عزیزم بہ جستجوئے تو رفت
ز دل نہ رفتی و جانم بہ آرزوئے تو رفت

احسان اللہ بہت محظوظ ہوئے اور اس مراثی کو ایک رات کے لئے اپنے پاس روک لیا۔ مگر اسی دن دیوان سلطنت کی نذر کی ہوئی اکثر فیاں احسان اللہ سے سرمار نے رکھی تھیں۔ یہ بزرگ تو نماز میں مصروف ہوئے اور گویّے کو موقع ہاتھ آیا وہ بازار سے ایک کوزہ میں دودھ لیکر آیا اور اس میں میعات کی آمیزش کر کے بڑے اصرار اور خوشامد سے احسان اللہ کو پینے کے لئے دیا۔ زہر نے اپنا کام کیا۔ یہ جان بر نہ ہو سکے اور وہ لڑکا سر مارنے سے اشرفیاں لیکر چلتا بنا۔

سید امان اللہ سے جو گفتگو احسان اللہ کی ہوئی ہے وہ سراسر وہابیت کے فلسفہ پر مبنی ہے[1] جہاں زندگی کو محض قنوطیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور خیال یہ ہے کہ روح جسم کے قفس میں قید ہے۔ انسان کو دنیا کے ہنگاموں سے بالکل الگ تھلگ ہو کر گوشہ نشین ہو جانا چاہئے۔ اور اس قدر کڑی ریاضت کرنی چاہئے کہ جسم فنا ہو جائے اور روح کو قید جسم سے نجات مل جائے۔

یہ فلسفہ سراسر ایک منفی رجحان ہے۔ جو اسلام کی روح سے بالکل متضاد ہے بلکہ یوں کہئے کہ اگر اسلام میں رہبانیت ہے تو یہ سراسر قنوطی ہے اسلام امید ہے تو یہ یاس ہے۔ اسلام نور ہے تو یہ ظلمت ہے۔ اس کو خدا کی خوشنودی اور نجاتِ اخروی کا باعث سمجھنا سراسر غلط ہے۔

فلسفۂ تصوف یا رہبانیت کا یہ نظریہ جو ذیل کے الفاظ میں احسان اللہ کی زبان سے میر نے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"صحبت کے لایق وہ درویش ہیں جو کسی درخت کے سائے کو بھی اپنے اوپر بار سمجھتے ہیں۔ جو عشق خداوندی میں غرق ہیں جو خونِ دل پی پی کر ریاضتِ شاقہ کرتے ہیں۔ وہ ہی آوارگانِ منزل رسیدہ تو ہیں جن کے سایہ سے آفتاب روشن ہوتا ہے وہ خاک نشین ضرور ہوتے ہیں۔ مگر ان کی منزل فلک پر ہوتی ہے۔ صحرائے عشق الٰہی کے دیوانے سر کے نیچے سخت پتھر رکھتے ہیں اور قناعت کرتے ہیں۔ پیٹ کو پتھر باندھتے ہیں اور

---

[1] اس خیال کی تائید کے لئے ہم نے ایک علیحدہ مضمون میں بحث کی ہے۔ جو انشاء اللہ آئندہ ہدیۂ خدمت ہوگا۔ ۱۲

شکایت نہیں کرتے طامع و حریص نہیں ہوتے۔ درویش کارخانۂ ہستی میں متصرف ہیں یعنی جدھر ہیں جو کچھ ہیں۔ وہ ہی وہ ہیں تم جو کچھ چاہو وہ دست برداشتہ دے سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ حاصل دو جہاں جو چیز ہو وہ بے تکلف مرحمت کر سکتے ہیں۔"

ایک دوسری ملاقات میں یہ گفتگو ہوتی ہے۔

"اے عزیز، جب سے میرے دل میں خدا کا عشق جاگزیں ہوا ہے دنیا کی کوئی چیز نظر میں نہیں آتی۔ اور کسی چیز میں دل مطلق نہیں لگتا۔

اے عزیز۔ موت بڑا مرحلہ ہے جو درپیش ہے اپنے انجام سے غافل نہ رہو۔ اپنی ذات کو دشمن کی نگاہوں سے دیکھو کہ اصل دوستی یہی ہے۔"

اس موعظہ میں یہ نکتہ بیان کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ قربِ خدا تو انسان کو دنیا میں ہی حاصل ہوتا ہے لیکن لوثِ دنیاوی کا پردہ درمیان میں حائل جب ہوتا ہے اس لئے ضبط نہیں اٹھا سکتا۔ جب یہ طلسم حیات ٹوٹتا ہے اور جانِ بدن سے جدا ہوتی ہے تو خدا کی قربت کا احساس ہوتا ہے عرفانِ نفس کو صوفیا نے عرفانِ ذاتِ خداوندی سے تعبیر کیا ہے۔

عرفانِ نفس کا جو نسخہ تجویز کیا گیا ہے وہ اسلام کے بنیادی نظریہ سے بالکل متضاد ہے۔ یعنی جسم کو آزار پہنچانا اور دنیا سے نفور رہنا۔

جس ماحول میں عشق کا یہ تصور ہو۔ اور ابتدا ہی ایسے لوگوں کی صحبت سے ہو جو زندگی سے بیزاری کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کے اثر سے اگر میر دیوانے ہو جائیں اور ایک خیالی چہرہ سے عشق کرنے لگیں۔ تمام زندگی غم واندوہ کی ترجمانی میں صرف کر دیں اور ہمیشہ تنگ حالی و تنگ دستی اور فقر و فاقہ سے دوچار رہیں۔ اور اُسے اپنی ابتدائی تربیت کے اثر سے غیر شعوری طور پر ایک وبال سمجھنے لگیں تو اس میں زبوں حالی اور معاش کی کمی کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا اس تربیت اور ماحول کا جو اس میں آنکھ کھول کر میسر آیا۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ زندگی کے تمام نظریات اور عقاید جو رفتہ رفتہ پختہ ہوتے جاتے ہیں۔ ان کا ابتدائی خاکہ اس ماحول ہی کا تیار کیا ہوا ہوتا ہے جس سے انسان شعور کی بالیدگی سے پہلے دوچار ہوتا ہے۔

احسان اللہ کی صحبتوں کے بعد میر نے اُن ملاقاتوں کا بھی ذکر کیا ہے جو بایزید نام کے ایک صوفی کے ساتھ ہوئیں۔ اُن کے ساتھ جو گفتگو ہوئی اس کا بھی تمام تر مقصد وہی ہے جو سطور ماقبل میں بیان ہوا۔

بایزید کے پاس تیسری اور آخری مرتبہ جب میر اپنے چچا صاحب کے ساتھ گئے ہیں تو وہ اپنے سینہ میں ایک سوزش محسوس کر رہے تھے اور اس قدر بے قرار تھے کہ کسی پہلو چین نہیں پڑتا تھا۔ وہ بھی نماز پڑھتے ہوئے گذر گئے۔ تو میر امان اللہ نے اُن کو خواب میں دیکھا کہ بہت خوش ہیں اور کہہ رہے ہیں میر کے سینہ میں عشق نے آگ ایسی لگا دی تھی کہ سوائے موت کے اور کوئی علاج اس کا نہ تھا۔ اب میں مسکرا رہا ہوں۔

میر متقی نے امان اللہ کو جو پند و موعظہ کی ہے وہ مختصراً یہ نظریہ ہے کہ دنیا طلبی کو چھوڑو گوشہ نشینی اختیار کرو۔ اگر معشوق حرم میں جلوہ گر ہے تو مسلمان ہونا ہنر ہے کیونکہ دل کا اصلی مقصد تو اس کا پالینا ہے خواہ کسی طرح ملے۔ لیکن اگر اس کا جلوہ دیر میں ہے تو کافر ہونا بھی عیب نہیں مقصودِ نظر وہ ہی ہے خواہ کسی سمت سے نظر آئے۔ پھر ایکبارگی یہ ارشاد ہوا۔

"دنیا کی تمام موجوداتِ صوری میں ذاتِ باری کا نفوذ ہے۔ مگر نگاہ دقیقہ شناس کا ہونا شرط ہے۔ . . . . . خدا اپنے بندوں کے ساتھ اسی طرح ہے جیسے روح جسم کے ساتھ ہوتی ہے۔ تیرا وجود بغیر اس کے نہیں اور اس کی نمود بغیر تیرے نہیں۔ یہ کائنات ظہور میں آنے سے پہلے عین ذات تھی اور نمود صوری کے بعد اللہ کی ذات عین کائنات ہے۔"

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عین اوست
اما نمی تواں کہ اشارت بدو کنند

میر صاحب ابھی بچے ہی تھے۔ کھیلنے کودنے کے دن تھے ایک دن کھیل کود میں مصروف تھے۔ والد نے پکڑ کر گود میں بٹھالیا اور یہ نصیحت فرمائی۔

"بیٹا زمانہ چلتا پھرتا ہے کسی کو فرصت نہیں دنیا اپنی تربیت سے غافل نہ رہو۔ اس راستہ میں بڑے نشیب و فراز ہیں۔ دیکھ بھال کر پھونک پھونک کر قدم رکھو۔

نشانِ پائے تو فرد حساب زندگی است
قدم شمردہ دریں کہنہ خاکداں بہ گذار

یہ کیا کھیلتے ہو۔ ؟ کیسا نازیبا کام کرتے ہو۔ اس سے تو لگاؤ جس کے خرامِ ناز پر کائنات نچھاور ہو۔ جس کی ایک ادا پر ہزاروں دل اور جانیں قربان ہوں۔ اس شاہدِ گل پر بلبل بن کر نثار ہو۔ جو سدا بہار ہے۔ فرصتِ عمر کو غنیمت سمجھو۔ اور مقصود کی تلاش کرو۔"

کہیں عشق کی تعلیم یوں دی ہے۔

"وہ رنگین پیرہن محشوق (یعنی خدا) جس رنگ میں چاہتا ہے جلوہ فرماتا ہے۔ کبھی پھول ہے۔ کبھی رنگ ہے۔ کہیں لعل ہے۔ کہیں سنگ ہے۔ کچھ لوگ پھول کو دیکھ کر ہی خوش کر لیتے ہیں۔ بعضے رنگ سے عشق کرتے ہیں۔ ایک جماعت لعل کو معتبر جانتی ہے تو دوسری پتھر کو خدا مانتی ہے۔ خبردار کہ یہ وہ منزل ہے جہاں پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں۔

..... محراب معشوق کی ابرو سے پیدا ہوئی ہے تو مے خانہ اس کی آنکھوں سے پیدا ہوا ہے ....."

تمہیں چاہئے کہ عزلت اختیار کرو۔ خلق خدا سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ کسی چیز کی طرف التفات نہ کرو۔ اللہ کی طرف نظر رکھو۔ اور کسی سے ملاقات نہ کرو ؎

دیدہ ام در علم صحبت ہائے رنگیں بے حساب
کردہ ام ایک مصرعہ "تہا نشینی انتخاب

چنانچہ اسی تعلیم کی روشنی میں میر متقی میر کی سیرت کو دیکھا جائے تو وہ حرف بحرف اسی کے مطابق معلوم ہوتی ہے اس کے مزاج کی نزاکت گوشہ نشینی سے محبت میل جول سے نفرت۔ تنک مزاجی۔ حدت بڑھی ہوئی خودداری یہ سب ان ہی حالات کے پیدا کردہ ہیں۔

محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں چند روایات[1] میر کی سیرت کے متعلق لکھی ہیں۔ اگرچہ وہ بیشتر غلط ہیں لیکن اگر انھیں صحیح بھی مان لیا جائے تو وہ ان کے باپ اور چچا کی صحبت کا ہی لازمی نتیجہ ہیں۔

قدرت ان کا مصائب و مشکلات میں مزید امتحان لینا چاہتی تھی۔ والد کی وفات سے وہ آزمائشوں میں گرفتار ہوئے اور مشکلات کا ہجوم آخر دم تک برابر رہا۔ دہلی آکر اپنے ماموں سراج الدین خاں آرزو سے وہ خوش نہ تھے۔ ادھر غالباً ۱۱۵۰ھ ہجری سے ان کی اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب ان میں ابتلاء کی کسوٹی پر کسا جا رہا تھا چنانچہ غم ان کی شاعری کا جزو لاینفک بن گیا اور شاعری کا ابتدائی خمیر اسی یاس و حرماں سے تیار ہوا۔ ان کا فلسفۂ غم دو رنگوں میں ملتا ہے۔ پہلے رنگ کو آپ عرفانِ غم یا کائنات کے سمجھنے کی ایک کوشش بھی کہہ سکتے ہیں جبکہ دوسرا رنگ اسی تعلیم عشق کی ایک کڑی ہے۔

غم روزگار اور غم جاناں دونوں ہی ان کے اپنے حالات نے پیدا کئے تھے میر کے کلام میں جو عشق کا تصور ہے وہ بھی ان کے والد اور چچا کی تعلیمات نیز ان درویشوں کی صحبت کا پیدا کردہ ہے جن کا حال ذکر میر کی ابتداء میں میر نے لکھا ہے یہ تصورِ عشق سراسر مجازی ہے۔ اس کا دامن اتنا وسیع اور کشادہ نہیں کہ عالمی اور آفاقی قدروں کو اپنے دامن میں سمو سکے۔

ایک فاضل نقاد کا خیال ہے کہ میر نے سب سے پہلے اردو شاعری کو حیات اور کائنات کی وسیع فضا سے روشناس کرایا اور اس میں داخلی آفاقی و عالمی قدروں کو سمویا۔ لیکن ہم اس خیال سے نہایت ادب کے ساتھ اختلاف کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے عشق کا پیمانہ تصورِ اخلاقی قدروں کو پنپنے نہیں دیتا۔ اور اسلام نے جو نظریۂ ارتقا کا پیش کیا ہے یہ اس کے بالکل برخلاف رجعتی ہے۔

اردو شاعری کو تصورِ عشق کے لحاظ سے آپ دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک ابتدائی دور جو غالب پر ختم ہوتا ہے۔ اور دوسرا دور اقبال سے شروع ہوتا ہے۔ غالب اور اقبال کے درمیانی عہد کو کشمکش کا زمانہ سمجھنا چاہئے۔ جبکہ قدیم و جدید عشق کے تصورات باہم دست و گریبان تھے۔ ایک جگہ چھوڑ رہا تھا۔ اور دوسرا تصور اس جگہ آرہا تھا۔ دورِ اول کا تصورِ عشق گرتے گرتے لکھنوی رنگ اختیار کر گیا تھا جس میں مجازیت اپنی تمام تر رو سیاہیوں اور بدنمائیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ خارجیت کا جتنا محسوس تخیل ہو سکتا تھا۔ وہ کنگھی چوٹی۔ انگیا۔ مسی۔ کاجل۔ جیسے Symbol اختیار کر چکا تھا۔ اخلاقی اقدار۔ جو عشق کے ارتقائی اور اعلیٰ تصور سے پیدا ہوتی ہیں وہ اس مجازی اور ادنیٰ تصور میں مل ہی نہیں سکتیں میر صاحب کی شاعری میں بھی وہ عنصر ملتا ہے جو بعد کو لکھنؤ کی تہذیب کا کفن ثابت ہوا مثلاً

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں (یا)
دل کے لونڈے دلی کے کب کا پچا گئے
اب ان سے کھائی پی ہوئی شے کیا وصول ہو

لیکن یہ رنگ اپنے پورے بدمست شباب میں نہیں ملتا۔ اگر میر لکھنؤ جانے کے بعد ۱۲۲۵ ہجری میں بھی نہ مر گئے ہوتے بلکہ ربع صدی وہاں کی عیش کوشی اور سیہ مستی کی اور دیکھ لیتے تو ان کی زندگی کے سب کئے دھرے پر پانی پھر گیا ہوتا۔

---

[1] ملاحظہ ہو میر احسنون "میر کی سیرت کے بدنما نقوش، آبِ حیات کے آئینہ میں"

جو تصورِ عشق اب ہمیں ملتا ہے وہ بھی اگرچہ اخلاقی اقدار کا حامل اور ارتقائی نہیں ہے تاہم اسے لکھنوی شاعری کے عشق سے بہت ممتاز سمجھنا چاہیئے۔ میر کے کلام میں جو Symbols ملتے ہیں وہ خارجی نہیں بلکہ زیادہ تر داخلی کیفیات کے ترجمان ہیں اور بڑے لطیف اشارے ہیں۔ (زلف و کاکل، قد و قامت اور خط و خال کی مرقع کاریوں سے اُن کا دامن بھی پاک نہیں۔ لیکن یہ اصطلاحیں ایک مخصوص نظریہ پیش کرتی ہیں)۔

کہا میں نے گل کو ہے کتنا ثبات ؛ کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
چمن میں گل نے جو کل دعویٰ جمال کیا ؛ جمالِ یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

یہ ہی بات یہ ہی خیال، میر سوز کی زبان سے سن لیجئے (جن کی شاعری لکھنوی رنگ سے متاثر تھی) دونوں تصورات میں جو زبردست فرق ہے وہ از خود واضح ہو جائے گا۔

دعویٰ کیا تھا گل نے اس رخ سے رنگ و بو کا
ماریں صبا نے دھولیں۔ شبنم نے منہ پہ تھو کا

زندگی کی بے ثباتی کا نوحہ، فلک ستمگر کی ناہنجاری کا گلہ اور ماحول کی تاریکیوں سے بیزاری اُن کی شاعری میں جا بجا ہے اور نت نئے ڈھنگ سے ہے۔ وہ زندگی کو وبالِ دوش سمجھتے ہیں۔ کشاکشِ حیات سے وہ ہی لوگ پناہ مانگتے ہیں جو زندگی کی دوڑ میں تنگ حوصلگی اور کم ہمتی و ناطاقتی کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش کی نہ اصلاح کر سکتے ہیں نہ مصائب و آلام کا کوئی مناسب حل تلاش کر سکتے ہیں بلکہ اُن کا ذہن ایسا ہو جاتا ہے کہ کسی طرح زندگی کی قید و بند سے رہائی ہو۔ اور روح کو تسکین ملے۔ چنانچہ میر صاحب کے کلام میں یاس اور قنوطیت کا جتنا عنصر ہے وہ زندگی سے بیزاری کا پتہ دیتا ہے۔

میر کی عشقیہ شاعری سے متعلق فراق گورکھ پوری کی ایک رائے کا اقتباس بے محل نہ ہوگا۔

"عشق کے المیہ کی بنیادیں تو غلط قسم کے بچپن میں ہی پڑ جاتی ہیں۔ میر کی عشقیہ شاعری میں جو مہلک عناصر ہیں (یہ اور بات ہے کہ میر نے مرکب کر اُن عناصر کو چمکا دیا ہے) اور اپنی زندگی گنوا کے موت کے عنصروں کو زندگی کے عناصر بنا دیا ہے اور جو موت کے آثار ہیں اُن کی بدشگونی اس زمانہ کی اُداس سماجی فضا اور میر کے بچپن کے حالات میں ملتی ہے۔ میر کو اپنے والد کی شخصیت سے کئی سہارے ملے لیکن کمی بھی بہت رہ گئی تھی۔ میر کی ابتدائی زندگی میں بہت سی بدنصیبیاں اور زیادتیاں بھی ہوئی رہیں۔

ناسزا دانہ زیست کرتا تھا ؛ میر کا طور یاد ہے ہم کو

یہ الفاظ محض شاعری نہیں۔ ع

مجنوں مجنوں لوگ کہیں ہیں مجنوں ہم سا کیا ہوگا

بچپن ہی سے سہارے جینے والے بالغ ہونے پر اکثر ٹوٹ کر عاشق ہوتے ہیں اور خراب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ احساس تنہائی اُن کے اندر ایک جان لیوا مرض ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ محبوب سے نہ جانے کیا کیا چاہنے لگتے ہیں۔ محبوب اُن کی شدتِ جذبات سے سہم جاتا ہے۔ اُن کی طرف کھنچتا بھی ہے اور اُن سے کتراتا بھی ہے۔ عشق اگر ایک روگ ہے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کا عشق تو تمہارا روگ یا راج روگ ہو جاتا ہے جو سدھائے نہیں سدھتا۔ ایسوں ہی کے عشق کے بارے میں کہا گیا ہے ع

عشق آخر عشق ہے تم کیا کرو ہم کیا کریں۔

اس اقتباس کے بعد میر کے ہاں تصورِ عشق کا ایک واقعہ اُن ہی کی زبان سن لیجئے۔

"چاندنی رات میں ایک چہرہ نہایت حسین و خوبصورت، کرۂ قمر سے میری طرف اشارہ کرتا دکھائی پڑتا تھا۔ میں اُسے دیکھ کر بے خود ہو جاتا تھا۔ جدھر بھی نظر ڈالتا وہ ہی رشکِ پری چہرہ نظر آتا۔ جس سمت نگاہ اٹھاتا وہ ہی غیرتِ حور صورت جلوہ گر معلوم دیتی تھی۔ گھر کے در و بام بھی میرے لئے اوراقِ تصویر بن گئے تھے۔ یعنی وہ ہی چہرہ ہر نقش و جانب سے روشنائی کرتا کبھی چودھویں رات کے چاند کی طرح مقابل۔ کبھی خلوت گزیں غائبِ دل۔ چاند پر نگاہ پڑتے ہی سینے میں ایک آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ ہر رات اس سے صحبت ہوتی۔ اور دن نکلتے ہی بغیر اس کے وحشت مچتی۔ جب صبح کی کرن پھوٹتی تو

لہ اُردو کی عشقیہ شاعری:۔ فراق گورکھپوری۔ ص ۔ ۲۰ ۔ ۱۹

میرے دل سے سرآہ نکلتی۔ تمام دن جنوں بکھیرتا اور اس کی یاد میں دل کو خون کرتا۔ حتیٰ کہ جوشِ وحشت میں پتھر ملتا اور دیوانہ وار مست کی طرح بکواس کرنا شروع کر دیا۔ لوگ مجھ سے دُور بھاگنے لگے۔ چار مہینہ تک جنوں کا یہی زور رہا۔ یہاں تک کہ موسم بہار آیا۔ اور وحشت کا داغ اور بھی ہرا ہو گیا۔ یعنی آسیب زدہ کی طرح بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے پاؤں میں بیڑی ڈال دی گئی۔ اور تنہائی میں بند کر دیا گیا۔"

(ترجمہ: ذکرِ میر۔ ص ۶۴)

اس پُورے بیان کی روشنی میں میر کا تمام دیوان دیکھ لیجئے عشق کا جتنا بھرپور زخم اُن کے دل و جگر میں ملتا ہے۔ اُردو شاعری میں کم ہی ملے گا۔ لاشعور نے عشق کے جس اثر کو قبول کر لیا تھا وہ اسے عہد شعور میں بھی نہ بھلا سکے۔ اور یہ کیفیت اُن کی شاعری کا جزوِ اعظم بن گئی ؎

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیے جن سے میرے قول کی تائید ہوتی ہے۔

ہم اُس کے بوں کو بھلا کیا چوبہار آئی ہے (۱) تم گزری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا
جو آفاعدہ پُوچھے میر بھی ایدھر کو چلا تھا (۲) تو کیسو جب چلا ہوں میں اس کا دم نکلتا تھا
گلی میں اسکی گیا سو گیا نہ بولا پھر (۳) میں میر کہ اس کو بہت پکارا آیا
عیادت دل ہے داغ جدائی کو رشکِ باغ (۴) تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا
گزرا بنائے چرخ سے نالہ بگاہ کا (۵) خانہ خراب ہو تیرا اس دل کی چاہ کا
دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں (۶) وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں
ہو گا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میر (۷) کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو
مصائب اور تھے پر دل کا جانا (۸) عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے
سیر کر میر اس چمن کی شتاب (۹) ہے خزاں بھی سراغ میں گل کے
از خویش رفتہ اکثر رہتا ہوں میر اس بن (۱۰) کہتے ہو بات کس کو وہ آپ میں کہاں ہے
نادہ تاں اٹھا چکا دیر کو میر ترک کر (۱۱) کعبے میں جا کے بیٹھ اب تیرا مگر خدا نہیں
دم نزع دشوار دی جاں اس نے (۱۲) مگر میر کو آرزو تھی کسی کی
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے (۱۳) ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا (۱۴) ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے
میرے تغیر حال پر مت جا (۱۵) اتفاقات ہیں زمانے کے

بعض کھینچے تھے داغ کھائے تھے (۱۶) دل نے صدمے بڑے اٹھائے تھے
کچھ نہ سمجھے کرے تھے یاروں نے (۱۷) کس توقع پہ دل لگائے تھے

دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

اب جہاں آفتاب ہیں ہم ہیں — یاں کبھی سرو و گل کے سائے تھے

توحید وجودی: کہ کوئی اللہ کا غیر نہیں۔ ہر شے کا عین خدا ہے۔ خود انسان کی ذات میں بھی ذاتِ باری عین ہے۔ یہ شعر اس عقیدہ کا ہے ؎

پردہ اٹھا تو لڑیاں نظریں ہماری ہم سے — مدت سے لگ رہی تھیں آنکھیں دو چار ہم سے

عشق کا تصور یوں بھی ملتا ہے ؎

کس طرح سے لیئے یاراں کہ یہ عاشق نہیں — رنگ اڑا جاتا ہے ٹک دیکھو تو چہرہ میر کا
مت کر عجب جو میر ترے غم میں مر گیا — جینے کا اس غریب کے بھی کوئی ڈھنگ تھا
دیر و حرم میں کیونکہ قدم رکھ سکوں میر — مجھ سے ادھر تو بت پھرے اُدھر خدا پھرا
اک چشمک پیالہ ہے ساقی بہار عمر — جھپکی لگی کہ دور یہ آخر ہی ہو چکا
گرچہ سردار مزوں کا ہے امیری کا حزہ — چھوڑ لذات اور سے تو فقیری کا مزہ
مُوند رکھنا چشم کا ہستی میں عین دید ہے — کچھ نہیں آتا نظر جب آنکھ کھولے ہے حباب
میرے سنگِ مزار پر فرہاد — رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد
ہم تو سمجھے تھے کہ تفسِ ہو کے مرجیسے — لے اڑی بوئے سمیر چمن تیری کیا خبر
فصلِ خزاں میں میر کی ہم نے بھی جائے گل — چھانی چمن کی خاک نہ تھا نقش پائے گل
اللہ رے عندلیب کی آوازِ دل خراش — جیسے ہی نکل گیا کہ ہمارے گلے گل
گل کی جفا بھی دیکھی، دیکھو وفائے بلبل — اک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جا بجا بل
چلتے ہیں تو دکھا دیں گے بچھوائے عندلیب — گل بن خزاں میں ایک وہ ہستی ہے مرکز ہم

مضمون نہ میر کے ماحول کی کوئی مکمل تصویر ہے۔ ان ابتدائی صحبتوں کے مسموم اثرات کی پوری تفصیل اس میں آ سکی ہے۔ اُن کی عشقیہ شاعری کے مطالعہ نے جو تاثر میرے ذہن پر چھوڑا ہے وہ مختصراً اُن حالات کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کرتا ہے جو شاعر کی حیات سے وابستہ ہیں۔

میر کی عشقیہ شاعری میں جنس بالکل مبہم ہے امرد پرستی کے جو جراثیم تھے ہیں اور ابتذال و سوقیت جو کہیں کہیں عشق کا پردہ اپنے چہرے سے اٹھا کر بے نقاب ہو جاتی ہے وہ اسی عشقِ مجازی کی جلوہ گری ہے۔

میں نے اس مضمون میں صوفیانہ ماحول مفروض پیش کیا ہے لیکن بحث صرف عشقیہ شاعری سے آخری چند سطروں میں کی ہے۔ اُردو شاعری کے جن میلانات کو میر کے کلام میں دیکھنے کی میں نے کوشش کی ہے اُن کے بارے میں ایک مفصل بحث نیز اُردو شاعری میں تصوّف کے موضوع پر ایک تفصیلی مقالہ اردو شاعری اسلامی

محمود الحسن شاہد

اقبال کا نظریۂ ادب

کائنات کی ہر شے متغیر اور ارتقا پذیر واقع ہوئی ہے خود انسان کو اگر اس اصول پر پرکھا جائے اور قدیم و جدید کا تقابلی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں میں اختلاف زمانی کے ساتھ ذہنی و فکری طور پر ایک دوسرے میں بعد پیدا ہو گیا ہے اگر ہم آج سے چھ سو برس پہلے کی دنیائے انسانی پر نظر ڈالیں تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی ہم بیک نظر اس کو سمجھنے سے اور کوئی اطمینان بخش تجزیہ اور صحیح تعبیر پیش کرنے سے بچکچاتے ہیں۔ بسا اوقات اپنے آپ کو کال کوٹھری میں گھٹتا ہوا محسوس کرتے ہیں اس لئے زندگی کا پھیلاؤ اور اس کا تنوع جتنا آج ہمارے سامنے ہے اس کے بہت سے شعبے اور راہیں پچھلے انسانوں کی نظر سے اوجھل رہی ہیں معدوم تھیں لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کرنا نہ صرف خود فریبی ہوگی بلکہ کوتاہ علمی گمراہی ہوگی کہ کائنات کے مقاصد زندگی کی بنیادی قدریں اور خمیر مائی بات ابتدائے آفرینش سے موجود ہیں حیات انسانی رزم و بزم دونوں کی قائل ہے۔ وہ نشیب و فراز۔ طاؤس و رباب۔ ریح و راحت ہو اور حرص جو و سخا۔ نور و ظلمت۔ روشنی و سیاہی۔ ان سبھی کا وصاف و قدروں کا موقع ہے۔

چونکہ انسان کو زندہ رہنا ہے۔ اس لئے اسے لوازمات زندگی کو پیش نظر رکھ کر دنیا کا تعمیر بھی کرنی ہے۔ معاشری اصولوں کا احترام اور سماجی تنظیم بھی کرنی ہے نیز فرق مراتب کے ساتھ ساتھ ذہنی سعی و عمل کے میدان بھی متعین کرنا ہے غرضکہ وہ مقصد سے بے نیاز ہو کر اپنی جد و جہد کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔ اور رہا مسئلہ مقصد کی نشان دہی کا تو انسان اپنے جد و جہد کا مرحلہ گھٹیا و بڑھیا دونوں بنا سکتا ہے اسے اختیار ہے کہ وہ لذت نفسی و استلذاذ حیوانی اپنا پیشہ بنالے پھر وہ ناجائز نفع اندوزی کے تکمیل کے اونٹ جیسی آدرگی اپنے اندر پیدا کرے۔ بالکل اسی کے بالمقابل ایک انسان کا نظریۂ خدمت انسانی و احترام آدمیت بھی ہے جس نے اس فانی و نامکمل زندگی سے ایک ابدی و دائمی زندگی کا بھاؤ کر لیا ہے وہ سمجھتا ہے کہ آنے والی زندگی لافانیت و ابدیت کی تصویر ہوگی۔

انھیں ناگفتہ الجھنوں اور پیچیدہ مسائل کو پیش نظر رکھ کر فلسفہ انسانی نے دو راہیں بنالی ہیں ایک راہ ابلیسی و انسانی انداز کی ہے دوسری ابلیسی و شیطانی۔ ان دونوں کو تاریخ کوئی نہیں بلکہ یہ دونوں فلسفے پوری طاقت سے نظام کائنات میں، وزر اول ہے جاری و ساری ہیں ان کی تحقیق اسی قدر پرانی ہے جتنی خود انسان کی تمدنی تخلیق انھیں دونوں فلسفوں کے تحت نظامات زندگی بنے قوموں نے تاریخ کی نوین کی تمدنی حقائق کو ترتیب دیا۔ اقتصادی و معاشی قوانین وضع کئے۔ قوانین اخلاق بنائے۔ ادب شعر صورت گری و فنون لطیفہ کا نقطۂ آغاز مقننین کی یہ غرضیکہ ان دونوں کے پاس جیسا خاصا مواد موجود ہے۔ بڑھنے و ترقی کرنے کے وافر جذبات انسانی کو اپیل کرنے کی طاقت شعور و ادراک پر چھا جانے کی قوت عقل و فہم کو مسخر کرنے کی سکت یہ بہت ساری صلاحیتیں ان کو حاصل ہیں البتہ نتائج کے اعتبار سے دونوں کے ثمرات مختلف اور بالکل علیحدہ ہیں۔ ایک لائحہ عمل انسانیت کو بھٹکتی ہوئی راہوں سے ہٹا کر فطرت کے قدیمی صراط مستقیم پر لا ڈالتا ہے اسے ہر بھیس پر بوجھتا اور ہر لڑکھڑاہٹ پر سہارا دیتا ہے وہ اس کے لئے زندگی کی لائن پر آفتاب ہدایت بن جاتا ہے۔ رہیں دوسری قدریں تو اگرچہ وہ سطحی اور نتائج کے اعتبار سے روح فرسا بھی ہیں مگر انھیں آج بھاری اکثریت حاصل ہے آج کا سائنس داں اسی کا پیرو ہے۔ آج کا فلسفی آج کا محقق و مقنن آج کا ادیب و شاعر الغرض پورا نظام تعلیم مقاصد و قوانین لطیفہ ضبط و ربط نظام معاشرتی سب کے سب اسی کے راگ الاپ رہے ہیں۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ فی الواقع ان دونوں عوامل و محرکات کو کائنات کی بقا اور اس کی تعمیر و تخریب میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے انھیں دونوں کے تغالب و تکاثر سے دنیائے انسانی میں حیثیت مجموعی انسان کو نفع و خسران سے پالا پڑتا ہے۔

یہاں زندگی کے دیگر شعبوں کو چھوڑ کر صرف ادب کا تجزیہ کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ ادب زندگی کی دیگر اکائیوں سے کیا ربط رکھتا ہے اس کے اثرات سے زندگی کس حد تک متاثر ہوتی ہے [illegible]

فن کار اپنے اُبھرے جذبات و تخلیقی کاوشوں کو بروئے کار لا کر ایک بلند نصب العین اور اپنے منتہائے مقصد کو پہنچ سکتا ہے۔ خود اقبال نے کس زاویۂ نگاہ سے سوچ کر ادب کو پروان چڑھایا اور اس میں آفاقیت پیدا کی۔ اسے زندگی کے مطالبات و داعیات سے کس قدر موزوں اور قریب تر کر دیا نیز ادب کے قالب میں کائنات کی رُوح دوڑا دی؟ اس وقت اسی کا جواب ہمیں دینا ہے۔

آج ادب پہلے کا سا انیس رہا اس کی تگ و تاز۔ باغ و بہار طلسم ہوشربا۔ الف لیلہ۔ داستان امیر حمزہ سے گذر کر زندگی کے جمالیاتی میدان میں آ چکی ہے۔ اب اس کے پیش نظر زندگی کی پیہم کشمکش اور اس کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ نہ بھولئے کہ ادب کے سامنے جتنا ہی اونچا مقصد ہو گا اس کی ہمہ گیری مسلّم اور ہماری نگاہوں میں محروم ہو گا۔ اگرچہ نئے ادیبوں نے ادب کو پہلے سے زیادہ کارآمد و بامقصد بنا دیا لیکن اسے وہ عالمگیر اثر کا مقام نہ سونپا جس کا نظام فطرت ہم سے متقاضی ہے جس کے لئے کائنات کی دھڑکنیں پیہم تیز اور تیز تر ہوتی جا رہی ہیں آج بھی یہ طبقہ ادب کو سطحی مقاصد ابن الوقتی کے طور پر استعمال کر رہا ہے اس کے ذریعہ وہ سماج کے اندر اخلاقی انتشار و ذہنی بوکھلاہٹ کو نشو و نما دے رہا ہے۔ زندگی کی شکست خوردہ مشنریوں کو پھر سے زرہی، رد و بدل کے ساتھ اور ترتیب کو ہیر پھیر کر پڑھے اور غلط کل پرزوں کو لا کر زندگی کے انجن میں فٹ کر رہا ہے نحش و عریاں لٹریچر اگر آج سے ۳۰ برس پہلے ادب پر ئے ادب کا لیبل لگا کر دنیائے عقل و فکر پر چھائے ہوئے تھے تو وہی آج دوسرا مارکس یعنی اصلاح و تنقید کی آڑ لیکر زندگی کے ساتھ میں گھن لگا رہا ہے۔ ترقی پسندی کی پشت پناہی لیکر جس البیسی و شیطانی فکر کو ماحول سے قریب کیا جا رہا ہے وہ تمہیدی طور پر ظاہر ہو چکا ہے۔ اقبال نے کائنات کا کھلی آنکھوں دیکھے کائنات سے مطالعہ کیا۔ ان سرحدوں سے آگے بڑھکر نہیں سوچا جہاں عقل انسانی پہنچ کر گمراہ ہو جاتی ہے۔ اس کی طاقت پرواز تھک کر بیٹھ جاتی ہے بالآخر مزید کاوش کا حوصلہ اسے ذہن و فکر میں ہار کر دیتا ہے اور وہ ایسے نتائج و کلیات اپنے بت خانۂ دماغ میں ڈھالتا ہے جسے فطرت انسانی قبول کرنے سے ہچکچاتی ہے۔ ان کا وزن واقعات و حقیقت کے پلڑے میں تقریباً الغیب سے کچھ بھی زیادہ بے وقعت نہیں۔ انھیں مفکروں و ہنرمندوں کے متعلق اقبال کہتے ہیں ؎

عشق دمتی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کا مزار

ایسے ادیبوں و مصوروں کے متعلق جو زندگی کے قدروں اس کے ابدی احساسات کی مانگوں کو پس پشت ڈال کر اس کے سامنے سطحیت کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ نیز بلند مقاصد سے اغماض کر کے اسے پھسپھسے نظام کے ڈھانچے سے قریب کرتے ہیں ؎ موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار (اقبال)

سنگ تراشی۔ فنون لطیفہ کا صحیح مصرف کیا ہے؟ اس کا جواب تلاش کرنا کچھ مشکل نہیں بلکہ معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی بھی اگر اپنے قوت فکر اور طاقت نقد و بصر کو کام میں لائے تو فوراً اسے حقیقت کا سراغ مل جائے گا فلمی گانے۔ فحش افسانے۔ عریاں ناولیں ننگی تصویریں سب بے حیا مجسمے۔ آج بازاروں میں پٹے پڑے ہیں انھیں کی مانگ۔ انھیں کی چلن ہے ہمارے پیشہ ور ادیب اپنے ذہن کو اس خدمت پر لگائے ہوئے ہیں۔ لیکن فی الواقع وہ انسانیت کے قاتل و رہزن ہیں وہ اخلاق و انسانیت کو ——— بیچ کر اپنی ہوس و خواہش نفسانی کی تکمیل میں لگے ہیں۔ انھیں اس میں ذرا بھی ندامت نہیں محسوس ہوتی کہ وہ قوم کے نوجوانوں کا مرقد تیار کر رہے ہیں مگر اس میں کچھ معذور بھی ہیں کیونکہ ان کے سامنے وہ آفاقی تصور نہیں جو کائنات انسانی کو آہستہ آہستہ آگے بڑھا کر صرف ایک طاقت، صرف ایک نظام، صرف ایک تصور حیات میں منضم کر سکے۔

اقبال کے نظریاتی ادب کا ڈھانچہ اسی بنیاد پر تعمیر ہوا اپنے اس کا مذہب فکر پوری تحقیق اور پوری جسارت سے اعلان کرتا ہے ؎

ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی کہ خود سے جب ادب دین ہوئے ہیں بیگانہ
خودی کیا ہے اس سے ادب کٹ کر کیا رہ جاتا ہے۔ ؟ اقبال جب بھی اور جہاں کہیں بھی لفظ خودی استعمال کرتا ہے اس سے مراد استواری اخلاق۔ تزکیۂ نفس تہذیب فکر تطہیر جسم اور فرائض کی انجام دہی جو کائنات کے حاکم اعلیٰ نے اس پر تخلیق آدم ہی سے عاید کر دیئے ہیں۔ موقف انسانی و مدارج آدمیت جانی بوجھی حقیقتیں ہیں۔ یہ فلسفہ و مقصد کائناتی در اصل انسان کی حیات و ممات کا بنیادی مسئلہ ہے اس سے اعراض و اغماض اصولاً نہ صرف ایک ملک بلکہ عالم انسانی کے پورے نظام میں خامی و کمزوری کا باعث بن سکتا ہے۔

اخلاقی اصول کی تربیت تعمیری ذہنیتوں کی ساخت نگری انتشار میں وحدت روحانی بےچینیوں میں سکون معاشی لوٹ کھسوٹ میں کمی دنیا کے وہ اصولی مسلمات اور فطری قوانین ہی کر سکتے ہیں جن کو نبی نوع انسان کے ایک مخصوص طبقہ نے صرف نظری ہی نہیں بلکہ عملی طور پر پیش کر کے دکھایا۔ اور

غفلت کی ماری ظلم کی ستائی۔ لاقانونیت پسند دنیا کو زندگی کا واضح و عالمگیر نظام عطا کیا۔ اس کے سادہ و ہمہ گیر اصولوں نے مشرق و مغرب کی تاریک ذہنیتوں و مقفل دماغوں کو علم و عرفان کی کنجیوں سے کھول دیا اور انسان کو روئے زمین پر چلنے پھرنے، کھانے پینے کا طریقہ سکھایا۔

یہی کائناتی نظام انسانیت کی ارتقا اس کی دوڑ دھوپ کا آخری مرحلہ و منتہائے مقصود ہے۔ اسی فکری و نظری فلسفۂ حیات کو انسانی زندگی سے قریب کرنا ایک صالح ادیب و انقلاب پسند شاعر کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ ہے اس نادر نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اقبال وہ سب سے پہلا ادیب و موجد ہے جس نے اس مرحلہ میں قدم رکھا اور صرف کامیاب ہی نہ ہوا بلکہ بعد کے لوگوں کے لئے مشعلِ راہ بھی ——————— بن گیا۔ اقبال اس لحاظ سے ضرور قدامت پرست ہے کہ اس نے آج کے ملی یا نہ طریقۂ فکر و لامذہب ادب سے بغاوت کی اور صرف اس پر قناعت نہیں کی بلکہ کھلے بندوں اس سے لڑتا رہا بالآخر اپنی جد و جہد، خداداد ذہانت اور سب سے زیادہ ناقابلِ تغیر و ہمہ گیر اصولوں کی شمشیر سے باطل کے پرخچے اڑا دیئے۔ وہ پرانے فلسفوں کو ترتیب کیا لیکن دوسرے معنوں میں وہ تجدید پسند تھا۔ وہ حسن و زیبائی کا پوجاری تھا وہ کہنہ پیکر میں نئی روح پھونکنے کا قائل تھا وہ تقلید سے دور اور فطری طور پر آزاد تھا۔ اس کا مذہب سب ہی تجدید کا مذہب ہے۔ جدد ایمانکم۔ اپنے ایمان میں ندرت پیدا کرو۔ فطرت کی دی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارو شعور و ادراک میں ذوق پرواز اور رنگینی کا مظاہرہ کرو۔ جب ہمارا صالح نوجوان فکر و عمل کا ہم رنگ ادیب اس عظیم الشان نظریہ پر اپنی ذہنی و عملی زندگی کا آغاز کرے گا تو پھر ہنر کے مقاصد تکمیل کو پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ مرحوم کا ارشاد ہے۔

جس روز دل کا رمز مغنی سمجھ گیا + سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

تجدید کردار تجدید فکر اقبال کا سب سے محبوب موضوع ہے اس نے جا بجا اسی کی تعلیم دی ہے جوش و ہوش اس کی تعلیم کے روشن پہلو ہیں کہتے ہیں

شاعر کی نوا ہو مغنی کا نفس ہو + جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں + جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

دوسری جگہ نہایت ہی واضح لفظوں میں بڑی ہی وسیع النظری خود اعتمادی کے ساتھ فنکاروں و ادیبوں کے تحقیقی مطالعہ کی دعوت دی ہے ان کے موقف۔ ان کی ذمہ داریوں، ان کے گرانبار یوں کو تقویت دیکر ان کے حوصلوں کو اکسایا ہے۔

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے — افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے — ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موج گہر سے — فرمندہ ہو فطرت تیرے اعجاز ہنر سے
اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی — کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

اقبال دنیائے شعر و ادب کا مصلح ہی نہیں بلکہ مجدد ہے۔ اس نے فطرت کی نئی نئی راہوں کا کھوج لگایا۔ ذہن و فکر کو سوچنے کا ایک نیا و بالکل ہی انوکھا و اچھوتا انداز عطا کیا۔ ادب کی ناپائیداری اور اس کی خامیوں کو تفتیش و تلخیص کر کے اس کے قالب میں بلندی و ہمہ گیری و دوامیت کا خون دوڑایا اسے زندگی کے رواں دواں مسائل کے بالکل دوش بدوش لا کھڑا کر دیا۔ یہ انمی قدروں کو نئے سانچے میں ڈھال کر اس میں دلاویزی و دل کشی پیدا کر دی۔ شعور و احساس میں منعکس ہو جانے کی صلاحیت بخشی

اقبال کا ادبی مقام اس حیثیت سے بہت اونچا ہے کہ وہ ایک اصول و نظام حق کا داعی تھا یوں تو اخلاقی نصائح۔ روحانی منزلیں تزکیۂ نفس کے رموز رومی و جامی۔ عرفی و سعدی کے یہاں بھی مل سکتے ہیں لیکن زندگی کا مکمل نسخہ صرف اقبال ہی کے پاس ہے۔ اس نے انسانی زندگی کے ہر ہر گوشہ پر قرآنی نقطۂ نظر اور قرآنی زاویۂ نگاہ سے غور کیا۔ سیاسیات و اخلاقیات۔ حاشیات و تعلقات۔ غرضکہ پوری ایک ترقی یافتہ سوسائٹی کا اس کے داعیات کو پیش نظر رکھ کر اس کا صحیح تجزیہ کیا۔ جہاں بھی کجی آئی۔ جس موڑ پر بھی جاہلیت کی آمیزش ملی۔ اسے چھانٹ کر اس کی جگہ صالح و مفید بخش اجزا کو فٹ کیا نیز اقبال نے مغرب کے فحش و عریاں و مخرب اخلاق لٹریچر تحریکوں پر بہ درست تنقید کی اور ایسا بھرپور وار کیا کہ مغرب کا جاہلی تصور اپنی خیریت منانے لگا۔ ساتھ ہی اس نے اسی نظام کو پاکرنے کی جان توڑ کوشش بھی کی جو اس کی ذہنی کاوشوں کے ایک مرتب شدہ و صالح پروگرام کی صورت میں اس کی ہزاروں صفحے کی بکھری ہوئی کتابوں میں جا بجا ملتی ہیں چنانچہ آج وہی ایک شاعر ہے جس کے نام اقبالیات سے پورا ایک فکر معرض وجود میں آچکا ہے۔

جدید عصری فلسفوں و تحریکوں میں سب سے زیادہ گمراہ کن و فساد انگیز مارکسی تصور ہے جو مختلف راستوں سے مشرق خصوصاً "اسلام" کو زیر کرنے میں لگا ہے۔ اقبال نے اس کی تاریخی نوعیت۔ اس کے بنیادی مقاصد کی حقیقی ٹوہ لگائی اور اس کی بنیادی خرابیوں اور اصولی کمزوریوں کو منظرِ عام میں لایا۔ اس لحاظ سے اس خادم انسانیت کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے۔

اقبال کا ذہنی شعور کس قدر پختہ تھا؟ اس کا اندازہ ان اشعار سے کیا جا سکتا ہے جو ——— اس نے ان ابن الوقت ادیبوں کے مارے ہوئے ادیبوں کے متعلق ایک موقع پر کہے ہیں ؎

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند — کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس — آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اگر اقبال کے یہاں ایک طرف تشخیر و سناں کی جھنکار ہے ——— تو دوسری طرف عشق و مستی کی انگمی حسن و رعنائی کی پسندیدگی بھی اسے کائنات سے ہر ہر ذرہ سے چمک ۔ واقعات کے ہر پہلو میں دلکشی ۔ زندگی کے ہر گوشے سے کشش اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے عشق کی گہرائی بے تاب اور اس کا تصور محبت بہت اونچا ہے اس نے بازاری عاشقانہ مذاق و آوارہ گرد حسن کو انسانیت کے لئے سم قاتل قرار دیا ہے

اس کے جلوہ پرست قلب سے ہر صدا سوز و آہ سے ڈوبی ہوئی ابھرتی ہے ۔ اس کے من کی نگری میں صرف ایک حسن کی جھلک ہے ۔ وہ ایک حبیب و گانہ محبوب ہے ۔ وہ پریم کا ایسا راگ الاپتا ہے جس کی لہروں میں اپنے آپ کو گم کر دیتا ہے ؎ مہ و انجم کا یہ حیرت کدہ باقی نہ رہے
تو رہے اور ترا زمزمۂ لاموجود

وہ محبت کے ساتھ سمندر میں ڈوبنے دا چھلنے ہی کی دعا کرتا ہے ۔ اس کی خواہش ہے کہ شوق کے مرحلے کبھی نہ طے ہوں کیونکہ زیست کی آخری امید اسی سے وابستہ ہے ؎ ہر نئی منزل پہ طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اقبال کا ادبی ذوق ہر پہلو سے پختگی کو پہنچا ہوا ہے ۔ دراصل اس نے ادب کی ایسی دنیا بسائی جس میں صالح و آفاقی ادیب ہی بسیرا لینے کی آرزو کر سکتا ہے ۔ اقبال کو وہ ہمہ گیریت کیسے حاصل ہوئی اس کا جواب ہمارے ملک کے ایک محقق عالم نے کیا خوب دیا ہے ۔

"اقبال کو یورپ کی یونیورسٹیوں نے بڑی بڑی ڈگریاں پیش کیں لیکن دراصل اس نے دو امیت و ابدیت کی ڈگری قرآنی یونیورسٹی سے حاصل کی"

اس لئے اگر میں کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ علامہ مرحوم کا ادبی نظریہ الٰہی فلسفہ و قرآنی ادب سے مماثل ہے ۔ اسی کی چاکری میں اسے سرمایۂ فریاد ۔ دولت پہ ویز ۔ کا سراغ ملا ۔ اس کو پا کر اس نے سب کچھ چھوڑ دیا ۔ اور آج تک اسی کی محبتوں کا دم بھرتے ہوئے دنیائے ادب و شعر میں نہایت قیمتی اور وسیع خزانہ چھوڑ گیا ———

"عالمی امن"

(ایک نئی پیش کش)

مرتبہ ادارہ معیار ——— امن کے موضوع پر نظموں کا مجموعہ ——— قیمت آٹھ آنے

امن کے موضوع پر اردو ادب میں پچھلے چند سالوں سے بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ اس کا مقصد امن کی سچی تبلیغ نہیں بلکہ اپنے اوپر سے تخریبی طاقتوں کے حمایتی ظلم کا داغ دھونا چاہتے تھے ۔ تعمیر پسند فن کاروں نے تخریب پسندوں کے اس فریب کو بھانپ لیا ۔ اور خالص تعمیری نقطۂ نظر سے تنقید کر کے اصل مرض پر انگلی رکھ دی ———

محسن رضا جونپوری

○

صبا نہ مرغ نہ قاصد یہ کام لے کے چلے
مری وفا کا مرا دل پیام لے کے چلے

یہی تھا اہلِ کرم کیا مآلِ حق و وفا
بہار صبح جو لائے تھے شام لے کے چلے

سنیں گے قصۂ دار و رسن نہ اہلِ جہاں
ہم اپنا ذوقِ فنا فی المقام لے کے چلے

کمالِ فیض کہ بیڑے سے آ لگا ساحل
ترا جو موج و تلاطم میں نام لے کے چلے

مزا تھا خضر بھی ہوتے شہید راہِ وفا
یہ کیا پڑی تھی کہ عمرِ دوام لے کے چلے

بہ ایں ملال و تفکر بہ ایں نقاہت و ضعف
ہے بار مراد جو منزل کا نام لے کے چلے

قبول حسنِ تصرف بھی اے رضا مجھ کو
نظر سے کام لے ساقی نہ جام لے کے چلے

ارشد صدیقی

○

سونے چاندی کی کھنکتی ہوئی تلواروں سے
کاٹے جاتے ہیں غریبوں کے گلے اے ساقی

اب وہ دن تو نہیں ہے کہ صنم خانوں میں
عود و عنبر کی جگہ خون جلے اے ساقی

کچھ خبر بھی ہے تجھے کتنے گراں قدر احساس؟
دب گئے ہیں غمِ دوراں کے تلے اے ساقی!

روک ان روٹھے ہوئے بادہ کشوں کو ورنہ
ابرِ رحمت کی طرح یہ بھی چلے اے ساقی

ہو جہاں ظاہر و باطن میں نمایاں تفریق
ایسے ماحول سے تنہا ہی بھلے اے ساقی

اہلِ ظرف، اہلِ نظر کتنے ہیں میخانے میں
ہم بھی دیکھیں گے ذرا شب تو ڈھلے اے ساقی

اس لئے نالاں ہے ارشد ترے میخانے سے
آستینوں میں ہیں کچھ ناگ پلے اے ساقی

عنوان چشتی

لہو بہر اشک کے قطرے میں پنہاں کون دیکھے گا
جگر کی چوٹ آنکھوں سے نمایاں کون دیکھے گا
خیالِ بوالہوس مل جائیں گے موتی بہ سانی
مجھے فکرِ سیلِ موجِ طوفاں کون دیکھے گا
غنیمت ہے کہ ہم اہلِ نظر ہیں اے چمن والو
ہمارے بعد کلیوں کو غزل خواں کون دیکھے گا
اٹھا سکتا ہوں پردوں کو مگر یہ سوچ کر چپ ہوں
ترا تاریک رخ تصویرِ انساں کون دیکھے گا
خرد مندی کو میری کاش مجھ سے چھین لے وحشت
رخِ انسانیت پر گردِ عصیاں کون دیکھے گا
ابھی تک زندگی کی کاکلِ برہم، نہیں سلجھی
اب ان کے دوش پر زلفِ پریشاں کون دیکھے گا
اگر عنواں نہ دے گی زندگی شعروں میں انگڑائی
تو پھر یہ آپ کا بیکار دیواں کون دیکھے گا

عالم صدیقی

نئی فضاؤں کی رنگینیوں پہ مت جاؤ
کہ یہ نگاہ کا ہے بس نیا نیا چاؤ
سلجھ سکے جو یہ گتھی تو اس کو سلجھاؤ
کہ تم نے خود ہی تو پیدا کیا ہے الجھاؤ
تمہاری راہ نمائی سے ہم تو بھر پائے
خدا کرے اسطے بس اب ہمیں نہ بہکاؤ!!
یہ گرم جوشی تو مجھ سے سہی نہ جائے گی
بہت ہی تیز ہے ظالم اس آگ کا تاؤ
جہاں ہیں از سرِ نو تازہ روح پھونکو گے؟
جو لاش گھر میں پڑی ہے اسے تو دفناؤ
یہ شاندار عمارت تو گرنے والی ہے
پناہ لینے کہاں جا رہے ہو، رک جاؤ
ادھر تو گرم ہے امدادِ باہمی کی خبر
قدم قدم پہ ادھر ہو رہا ہے ٹکراؤ

جلیلؔ فتحپوری

عظمتِ حُسن کا راز داں ہوگیا
عشق سرمایۂ دو جہاں ہوگیا

لذّتِ یادِ جاناں بھی کیا چیز ہے
دردِ دل بڑھکے آرامِ جاناں ہوگیا

ان کو میری وفا کا یقیں تو ہوا
یہ بھی اچھّا ہوا امتحاں ہوگیا

اِتنے سادہ طبیعت ملے راہرو
راہزن رہبرِ کارواں ہوگیا

کچھ اثر ہو چلا تھا دلِ حُسن پر
ختمِ افسانۂ غم کہاں ہوگیا

عقل رہزن بنی تھی راہِ عشق میں
بڑھکے جوشِ جنوں پاسباں ہوگیا

سجدۂ شکر کر اے جلیلؔ حزیں
تھا جو نامہرباں مہرباں ہوگیا

شوریدہ کاشمیری

پیش جاتی نہیں ہے قاتل کی
سخت ایسی ہے جاں بسمل کی

جس کو آسانیاں بھی ہوں دشوار
انتہا کیا ہے اس کی مشکل کی

پا بہ زنجیرِ حق ہے زنداں میں
حکمرانی ہے آج باطل کی

مُسکرایا جنونِ بے پروا
آئی آواز جب سلاسل کی

داغِ دل تا ابد ہو تابندہ
ہے یہ شوریدہ روشنی دل کی

سلیم الدین الدنی

رُخِ ناشاد پہ حسرت کا نشاں ہوتا ہے
دردِ جب قلبِ فسردہ میں نہاں ہوتا ہے
منزلِ عشق کے راہی کے مصائب مت پوچھ
اس کو ہر گام پہ رہزن کا گماں ہوتا ہے
گرچہ خاموش ہیں کچلے ہوئے مجبور عوام
ان کی نظروں سے تو خوننابِ عیاں ہوتا ہے
سارے ماحول میں ہلچل سی مچی ہے شاید
خندہ زن آج کوئی سوختہ جاں ہوتا ہے
لوگ کہتے ہیں بہار آئی ہے گلشن میں سلیم
ہم کو تو آج بھی احساسِ خزاں ہوتا ہے

سرور رومانی

شوق میں ناتواں رہرو بھی چلیں گے اٹھکر
خضرِ منزل ذرا منزل سے پیام آنے دے
خود بدل جائے گی رفتارِ زمانہ اک دن
اہلِ دستور کوئی اہلِ نظام آنے دے
کون کہتا ہے کہ ڈھلتا نہیں گیتی کا شباب
ڈوبنے دے ذرا خورشید کو شام آنے دے
رقص کرتے ہوئے آنکھوں سے گو ہر ڈھلکیں گے
ایک بار اُن کی زباں پر مرا نام آنے دے
عزم راسخ کی ترے داد ملے گی سرور
راہِ الفت میں صداقت کا مقام آنے دے

منظر حسین

عامل

میں نے جب اپنے اُستاد سے اجازت لیکر "عمل" کی ابتدا کی تو سب سے پہلے میرا سابقہ اپنی بیوی سے پڑا۔ اسے دورے پڑ رہے تھے لیکن کسی علاج سے فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ میری والدہ سخت پریشان تھیں میری بہن بھی حیران تھی البتہ میرا چھوٹا بھائی اس سے بالکل متاثر نہ تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "بھائی جان۔ میں بھابھی کا علاج جانتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ——"

میں نے جواب دیا "بھئی۔ آسیب معلوم ہوتا ہے —— تم اس کا علاج کیسے کرو گے؟"

چھوٹے بھائی نے کہا "بھائی جان —— آسیب نہیں ڈھکوسلا ہے۔ میں نے اپنی بیوی کا علاج ——"

میں نے کہا "ابھی —— میں ایسے علاج کا قائل نہیں —— رہا یہ معاملہ کہ آسیب ہے یا نہیں، اس کا میں ابھی پتا لگائے لیتا ہوں —— اگر میں نے جو علم حاصل کیا ہے وہ کس دن کام آئے گا ——؟"

چھوٹے بھائی نے مسکرا کر کہا "اچھا —— اگر آپ ناکام ہو گئے تو بھابھی کا علاج میں کروں گا۔"

میں نے وضو کیا۔ کپڑوں میں عطر لگایا۔ اور پھر اپنی بیوی کے پلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ لیٹی ہوئی تھی اور میری بہن اس کے سر میں تیل ڈال رہی تھی۔ قریب ہی کرسی پر والدہ بیٹھی ہوئی تھیں —— میں نے ان سے کہا۔ "آمنہ کو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

والدہ بولیں "یہ کیا لیٹی ہوئی ہے —— دیکھ لے نا —— کیا کوئی ایسی بات ہے؟"

میں نے کہا "نہیں —— میرا مطلب اپنے علم کی رو سے دیکھنا چاہتا ہوں کہ آیا آسیب ہے یا کچھ اور ——" یہ سنتے ہی آمنہ پر دورہ پڑ گیا اس کے ہاتھ پیر اینٹھنے لگے۔ اور وہ پلنگ پر اچھلنے لگی۔ بڑی مشکل سے ہم لوگوں نے اس پر قابو پایا —— لیکن میں بھی دھن کا پکا تھا۔ سر ہلانے سے اس کا دوپٹہ اٹھایا اور والدہ سے کہا کہ اسے پکڑ کر کھڑا کر دو ——

والدہ اور بہن دونوں نے مل کر اسے کھڑا کر دیا۔ اور میں نے اس کے دوپٹے سے ناپا۔ ناپنے کے بعد میں نے ایک دعا اور قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ کر تین مرتبہ دوپٹہ پر دم کیا اور اسے پھر ناپا تو ایک انگل کی کمی نظر آئی ——

خوشی سے میں چیخ پڑا۔ "دیو کا سایہ" —— ہاں ہاں دیو کا سایہ ہے۔ آمنہ پر دیو کا سایہ پڑ گیا ہے۔ آمنہ پر دیو مسلط ہے —— منحوس کمبخت —— کوئی اور نہیں ملا۔ میری بیوی ہی رہ گئی تھی۔ اچھا حرام زادے —— میں تجھے ابھی بتاتا ہوں۔ میں نے غصہ میں آمنہ کے دو تین تھپڑ رسید کئے —— اور آپ یقین کیجئے یہ تھپڑ آمنہ کے نہیں اس دیو کے لگ رہے تھے —— آمنہ بڑے زور سے چلائی اور چلا کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ یہ میری پہلی فتح تھی —— میں جانتا تھا، دیو پٹ کر اپنی چوکڑی بھول جائیگا۔

لیکن اب کیا کیا جائے —— دیو کو کیسے نکر بھگایا جائے؟ ——

میں دوڑ کر اپنے کمرے میں گیا اور "عملیات" کی ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگا۔ میری نگاہ حسب ذیل نقش پر پڑی۔

۶	۷	۲
۱	۵	۹
۸	۲	۳

۷۸۶

میں نے "یا حفیظ —— یا حفیظ —— یا رقیب" —— یا وکیل" پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا تاکہ اس دیو کے شر سے محفوظ رہوں اور جلدی سے یہ نقش لیا کر کے اس کمرے کے دروازہ پر چپکا دیا۔ جہاں آمنہ لیٹی ہوئی تھی۔

مگر مجھے فوراً ہی خیال آیا —— موکلوں کا نذرانہ اور ساعت دیکھنا تو بھول ہی گیا —— ہائے اب کیا ہو؟ جبرئیل۔ میکائیل۔ عزرائیل وغیرہ کام نہیں کریں گے اور —— شمس و نمر وغیرہ جو بھی ستارہ حاکم ہو۔ اس کے مزاج کے خلاف چلا تو بس کام ہو چکا —— تو کیا میں اس دیو سے شکست کھا جاؤں گا؟ —— ہرگز نہیں۔ میں اس مردود کو —— مردود کو —— میں

رقابت کی آگ میں بُری طرح جل رہا تھا اور کیوں نہ جلتا ——— معاملہ اپنی بیوی کا تھا۔ بھلا کوئی شریف آدمی کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ کوئی دیو اس کی بیوی سے چٹا رہے۔

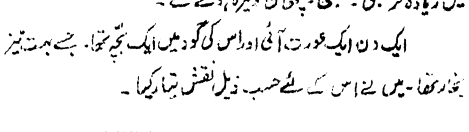
میں کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ کیا کروں؟ ——— آخر عقل نے یہ فیصلہ کیا۔ میں نے موکلوں کو سیدھا کرنے کے لئے ایک روپئے سوا پانچ آنے کی مٹھائی منگا کر نذر کی اور اُن سے گڑگڑا کر کہا "بھائیو ——— مجھے معاف کرو۔ میں تمہارا حق ادا کرنا بھول گیا تھا ——— لیکن صبح کا بھولا اگر شام کو لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ امید ہے آپ لوگ میری کوتاہی کو اس نذرانے کے بعد بھول جائیں گے۔"

اب رہ گیا ساعت کا معاملہ ——— میں نے جو حساب لگایا تو پتہ چلا کہ اس وقت عطارد حاکم ہے اور اس کی حکومت نیکی کی حکومت ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور اس کے بعد عطارد کا ——— نقش ساعت نیک میں لکھا گیا تھا۔ اس لئے دیو کا بھاگ جانا یقینی ہے ———

اور اسی رات دیو بھاگ گیا۔ آمنہ بھلی چنگی ہو گئی اور اس کے اچھے ہوجانے سے والدہ اور بہن پر میرا رعب بیٹھ گیا ——— اور ان کے ذریعہ سے پورے محلہ کی عورتوں پر ——— یہ میری شاندار کامیابی تھی ——— پر زور انداز۔

اب کیا تھا ——— محلہ کی عورتیں ہر وقت میرے گھر میں جمع رہتیں ——— اور میں موکلوں کا نذرانہ وصول کر کے تعویذ لکھتا رہتا ——— آس پاس کے کچھ مرد بھی گاہے گاہے تعویذ لے جاتے ——— ان مردوں میں زیادہ تر کنجڑے۔ بھشتی۔ پٹھان وغیرہ ہوتے تھے۔

ایک دن ایک عورت آئی اور اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ جسے بہت تیز بخار تھا۔ میں نے اس کے لئے حسب ذیل نقش تیار کیا۔



لیکن اس عورت کے پاس نذرانے کے پیسے نہیں تھے۔ وہ بے چاری بہت غریب تھی۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا ——— نذرانے کے بغیر نقش بیکار ثابت ہوگا۔ مگر اس عورت کو یوں ٹالا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

پھر کیا کروں؟

میں نے بہت غور کرنے کے بعد وہ نقش اسے نذرانے کے بغیر ہی دے دیا۔

اور یہ تاکید کر دی کہ اسے بچے کے بائیں بازو پر باندھ دے۔

دوسرے ہی دن بچہ کا بخار اتر گیا ——— مجھے سخت حیرت ہوئی۔ بھلا نذرانے کے بغیر بھی نقش میں کچھ تاثیر ہو سکتی ہے؟ ——— شاید موکل لوگ غریبوں کا کام مفت کر دیا کرتے ہیں۔ میں اس تاویل سے مطمئن ہو گیا۔

ادھر اس عورت کا حال یہ ہوا کہ وہ میری سب سے زیادہ معتقد ہو گئی اور اسی اعتقاد کی بنا پر اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اسے کوئی ایسا تعویذ دیدوں جس سے اس کا شوہر اس کے پاس واپس آ جائے ——— اس کا شوہر اسے چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔

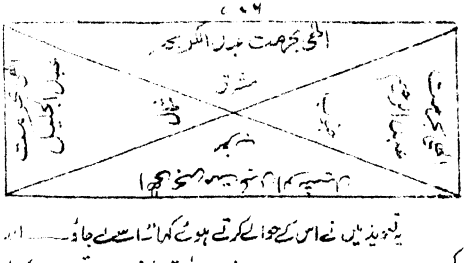
میں نے دریافت کیا "تمہارا شوہر کس دن گیا تھا؟"

عورت نے جواب دیا "جمعرات کو"

میں نے کتاب طلسمات دیکھی تو وہ مغرب کی سمت گیا ہوا ہے۔ مجھے اس عورت کا حال معلوم ہی تھا۔ کہ وہ نذرانہ دینے کی سکت نہیں رکھتی۔ پھر بھی میں نے اس سے عادتاً دریافت کیا "نذرانہ لائی ہو؟"

وہ بولی "میرے پاس تو کھانے کے لئے بھی نہیں ——— نذرانہ کہاں سے دوں؟"

میں چپ ہو گیا ——— اور تعویذ لکھنے میں مصروف ہو گیا ——— جو حسب ذیل تھا۔



یہ تعویذ میں نے اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا "اسے لے جاؤ ——— اور کسی درخت میں لٹکا دو ——— انشاء اللہ تمہارا شوہر جلد ہی تم سے آ ملے گا۔"

میں نے یہ تعویذ دینے کو تو دے دیا جسے لیکر وہ خوشی خوشی چلی گئی لیکن بعد میں خیال آیا کہ میں نے اسے ساعت بد (زحل کی ساعت) میں لکھا ہے۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ شوال کی منحوس سات تاریخ بھی ہے ——— میں گھبرا گیا۔ نہ جانے کیا اثر ہوا اس کا؟ ——— لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اب خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ایک ہفتہ بعد وہ عورت مسکراتی ہوئی آئی اور اکمرے پانچ روپے کا نوٹ تھما دیا۔ بولی "یہ نذرانہ ہے موکلوں کا۔"

میں اس کی مسکراہٹ سے ہی سمجھ گیا کہ اس کا کام ہو گیا۔۔۔ پھر بھی اپنے اطمینان کے لئے دریافت کیا "تمہارا شوہر آ گیا؟"

بولی "جی ہاں"

میں نے کہا۔ اس نذرانہ کی تو اب ضرورت نہیں۔۔۔ تمہارا کام اس کے بغیر ہی ہو گیا۔" اور دل میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ اس عورت کا کام ہو کیسے گیا۔ کیونکہ نہ تو اس نے نذرانہ دیا تھا اور نہ ہی اس کا تعویذ ٹھیک دن اور ساعت میں لکھا گیا تھا۔

اس نے کہا "کل میری مرغی چوری ہو گئی ہے۔۔۔ آپ مجھے اس کا تعویذ دیں۔۔۔ یہ نوٹ رکھ لیں۔"

میں نے کہا "پانچ روپے تو چوری کے تعویذ کے لئے بہت ہیں۔۔۔ میں مقررہ رقم سے زیادہ نہیں لیتا۔"

بولی "اسے رکھ لیجئے نا۔۔۔ پچھلے نذرانے بھی تو مجھے دینے ہیں۔"

خیر میں نے نوٹ رکھ لیا۔۔۔ لیکن مجھے اس عورت سے کچھ الجھن سی ہو گئی۔ آخر اس کے لئے موکل کام کیوں کرتے ہیں۔ ستارے ساتھ کیوں دیتے ہیں اور دن اپنی نحوست ہٹا کیوں لیتے ہیں؟ کیا صرف اس لئے کہ وہ ایک غریب عورت ہے؟۔۔۔ میں نے بغیر کچھ کہے ایک سادہ کاغذ لیا اور اس پر دو چار آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر اسے دے دیا اور کہا "اسے گھول کر پانی میں ڈال دینا۔"

جب وہ عورت تعویذ لے کر چلی گئی (جو کسی صورت میں تعویذ نہیں تھا) تو میں نے کتاب کھول کر دیکھا۔۔۔ چوری کے لئے ذیل کا نقش ہونا چاہئے تھا۔

۳۰	۴۲	۴۵	۳۰
۳۲	۲۷	۳۷	۴۳
۳۲	سارق مال مسروقہ بیارد	۴۰	۳۶
۴۱	۳۵	۳۳	۳۶

اور اس نقش کو کسی اونچی جگہ دھوپ کے رخ پر لٹکانا چاہئے تھا تاکہ چور بے قرار ہو کر چوری کا مال مالک کے گھر میں پھینک جائے۔

مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس عورت نے آ کر مجھے اطلاع دی کہ اس کی مرغی گھر میں آ گئی ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں اس کا منہ نوچ لوں۔۔۔ مجھے یاد آیا کہ اس سے شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی۔۔۔ "ہونہہ"

مرغی آ گئی ہے۔۔۔ ایک جھوٹے تعویذ سے آ گئی ہے۔"

عورت یہ خبر سن کر چلی گئی۔۔۔ اور میں یہ سوچتا رہا کہ اگر جھوٹے تعویذوں سے بھی کام چل سکتا ہے تو آخر اتنی دردسری کی ضرورت ہی کیا۔۔۔ چند لکیریں کھینچیں اور دیدیں۔ چلو قصہ ختم ہوا۔۔۔ لکیریں؟

ان کمبخت لکیروں کو تو کوئی موکل بھی نہیں ہوتا۔ حروف تہجی کے تو موکل ہوتے ہیں جو ابجد کے حساب سے نقوش میں لکھے جاتے ہیں۔۔۔ مجھے دفعتاً ان موکلوں سے نفرت ہو گئی۔ کمبخت ہر جگہ ہر چیز میں گھسے ہوئے ہیں۔۔۔ حروف میں۔۔۔ ستاروں میں۔۔۔ برج میں۔۔۔ دنوں میں۔۔۔ جدھر دیکھو چھائے ہوئے ہیں۔۔۔ کیا ان سب نے میرے خلاف سازش کر رکھی ہے یا ان لوگوں نے کلام ربانی سے بے زاری اختیار کر لی ہے کہ جس کا چاہا کام کر دیا۔ جس کا چاہا کام نہیں کیا؟

میرا غصہ جب کسی قدر ٹھنڈا ہوا تو اچانک ایک تاویل سامنے آئی۔۔۔ اس عورت کا اعتقاد بہت پختہ ہے اور جب اعتقاد پختہ ہو تو ہے تو چیز میں بھی اسی کے مطابق ظہور میں آتی ہیں۔۔۔ میں ایکبار پھر مطمئن ہو گیا۔

لیکن اسی رات آمنہ سے ایک معمولی سی بات پر جھگڑا ہو گیا اور اس پر پھر دورے پڑنے لگے۔ میں نے حسب سابق دیو کو دفع کرنے کے لئے ایک تعویذ کمرے کے دروازے پر چپکا دیا۔ مگر اب کے وہ جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے کئی تعویذ لکھے کئی تدبیریں اختیار کیں لیکن سب بے سود ثابت ہوئیں۔۔۔ آخر تنگ آ کر میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو بلا کر کہا۔

"تم کہتے تھے اپنی بھابھی کا علاج کرو گے۔۔۔ لو کر دو اب"

چھوٹے بھائی نے کہا "میرا علاج یہ ہے کہ بھابھی کو کمرے میں تنہا چھوڑ دیا جائے اور دو دن تک کھانا نہ دیا جائے۔۔۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند رہے گا۔"

اور دو دن کے بعد واقعی آمنہ کا دیو چلا گیا (اور آج تک لوٹ کر نہیں آیا) میں نے سوچا کتنی عجیب بات ہے۔ دیو تعویذوں اور گنڈوں سے تو ڈرا نہیں لیکن بھوک اور تنہائی سے ڈر کر بھاگ نکلا۔۔۔ واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ یہ خوب۔۔۔ گویا یہ تعویذوں کی ضرورت ہے اور نہ ان میں اعتقاد کی۔ سب کام یوں ہی ہو جاتا ہے۔ یوں ہی ہو جائے گا۔۔۔ واہ۔۔۔

اچانک گھر کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ باہر مجھے کوئی بلا رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا تو پٹھان کھڑا ہوا تھا جس کو اپنے زخمی بیٹے کی

تعویذ مرغ کے خون سے لکھوایا تھا اس کے بیٹے کے پیٹ میں کسی نے چھرا بھونک دیا تھا۔ پٹھان نے مجھے گھور کر دیکھا اور میں اس کی لال آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"تم چلو ——— ہمارے ساتھ ——— ہمارے بیٹے کو دیکھئے"

میں نے گھبرا کر کہا "نہیں نے آؤ گا نا سے"

پٹھان بولا "نہیں ——— تم ہمارے ساتھ چلو ———

اسے دیکھو" اور اس نے مجھے گھسیٹنا شروع کر دیا ——— میں نے سوچا آج خیریت نہیں۔ اور میرا جی چاہا کہ چیخ کر محلہ والوں کو بلاؤں لیکن خرم دامنگیر ہوئی اور پھر اپنی "غالانہ" سماکھ کا خیال آیا ——— میں مجبوراً اس کے ساتھ ہو لیا۔

پٹھان کے گھر میں بہت سے پٹھان اکٹھا تھے ——— میں نے فوراً معاملہ کو بھانپ لیا۔ لیکن میرا ہاتھ شکنجہ میں جکڑا ہوا تھا ——— میں بھاگ نہیں سکتا تھا ——— پٹھان نے میرا ایک ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا ——— میں نے ہاتھ جھٹک کر چھڑانے کی کوشش کی تو پٹھان چیخ کر بولا۔

"خنزیر کا بچہ ——— تم تار، نیز لکھتا ہے یا آدمی کا جان لیتا ہے"

میں نے رو کر کہا "اس میں میرا کوئی قصور نہیں ——— مجھے تمہارے بیٹے کے مرنے کا بہت رنج ہے ——— خدا ان سوکھوں سے سمجھے"

لیکن پٹھان غصہ سے پاگل ہو گیا۔ اور اس نے مجھے گالیاں دینا اور مارنا شروع کر دیا۔

اور میں چلانے لگا "جبرئیل ——— عزرائیل ——— اسرافیل ——— کہاں چلے گئے آؤ ——— مجھے اس ظالم کے پنجے سے چھڑاؤ" اور پھر جب جبرئیل۔ عزرائیل اور اسرافیل میری مدد کو نہیں آئے تو ناامید ہو کر میں نے جنوں کو پکارنا شروع کیا "ملک راست۔ ملک اسپیض" بھیجو تم ہی کچھ مدد کرو ——— جلد آؤ ——— میں مرا"

پھر چیخنے چلانے میں جانے کیا بات تھی جس نے دوسرے پٹھانوں کو ہنسنے پر مجبور کر دیا ——— اور ایک بوڑھا پٹھان ہنستا ہوا آگے بڑھا اور پشتو میں جانے کیا کہا کہ میرے پٹھان نے مارنا بند کر دیا ——— اور مجھ سے کہا "خنزیر کا بچہ ——— پانچ روپے نکال ——— اور بھاگ جا ——— تم ہمارا بچہ مارے گا۔ اور مرغا بھی کھائے گا ——— آئندہ ہم تمہاری گردن توڑ دے گا"

میں نے جلدی سے روپے جیب سے نکالے، جو اتفاق سے اس وقت موجود تھے۔ اور انہیں پٹھان کے ہاتھ میں دے کر بھاگا۔

——— اور بھاگ کر گھر پہنچا ———

وہ دن ہے اور آج کا دن ہے ——— قسم لے لیجئے۔ جو میں نے کسی قسم کا عمل کیا ہو ——— میں نے اس سے توبہ کر لی ہے، لیکن علم خوب ہے۔ بڑا قیمتی ہے۔ بڑی محنت سے حاصل ہوتا ہے ——— آپ اس کی قدر کیجئے۔

اسٹینڈرڈ
سیزرس ——— اور ——— اُسترے
غمدگی اور پائداری کی اعلیٰ مثال پیش کرتے ہیں
جس پر میرٹھ کی اس صنعت کو ناز ہے
قینچیوں اور اُسترں کی تجارت کرکے بھاری منافع
حاصل کیجئے
(ایجنسی کا شرائط نامہ خط لکھ کر منگائیے)
دی اسٹینڈرڈ سیزرس کمپنی میرٹھ (انڈیا)

عبدالمجید حیرت۔ بی۔ اے

جب میں پرائیویٹ سکرٹری تھا

(مارک ٹوین کی ایک نگارش پر آزاد ترجمہ کے بجائے ترجمانی اور ایجاد بندہ ہے)

میں اب کسی ممبر کونسل کا پرائیویٹ سکرٹری نہیں ہوں۔ مگر ایک زمانہ یہ پندرہ دو مہینے تک برابر اپنی پیٹھ پر لادے لادے پھرچکا ہوں۔ میں ان دنوں بہت خوش تھا کہ روزی کی طرف سے اطمینان تھا۔ کام بہت دلچسپ۔ مگر گردش تقدیر کہ بہت جلد رزق سمٹنے لگا۔ اور میرا کیا دھرا میرے ہی سامنے آنے لگا۔ آخر استعفا دیدینا ہی بہتر فیصلہ آیا۔ اور اس کی صورت یہ ہوئی۔

میرے آقا نے مجھے ایک دن بہت سویرے بلا بھیجا۔ میں اس وقت انہی کی ایک تقریر کی نوک پلک درست کر رہا تھا۔ جسے وہ مالیات کے موضوع پر فرمانے والے تھے۔ بہرحال میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ دیکھا تو تیور بگڑے ہوئے تھے۔ سانس پھول رہا تھا۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ سمجھ گیا کہ طوفان آرہا ہے اور ــــ نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے۔ بولنے کے لئے ہاتھ میں تازہ خط و طاق کا ایک پلندہ تھا۔ یہ طوفان میل کی ڈاک تھی۔ خوفناک ڈاک۔ آخر وہ بولے۔

"میں سمجھتا تھا کہ آپ میرے اعتماد کے قابل ہیں"

میں نے عرض کیا۔ "اور اس میں شک بھی کیا ہے؟"

ارشاد ہوا۔ "میں نے آپ کو ایک خط دیا تھا۔ کشمش گڑھ سے آیا ہوا۔ میرے بعض مخلص مگر دہندہ احباب کا مراسلہ۔ جس میں انہوں نے درخواست کی تھی کہ میں ان کے لئے بادام پورے میں ایک ڈاک خانہ کھلوانے کی سفارش کروں۔ میں نے یہ خط آپ کو اس لئے دیا تھا کہ اس کا جواب نہایت ہوشمندی سے دیا جائے۔ اور ایسے معقول دلائل کے ساتھ کہ یہ حضرات مطمئن ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ بادام پورے میں کسی نئے ڈاک خانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

میں نے اطمینان کا سانس کھینچا۔ اور کہا "بس اتنی سی بات۔ یہ کام تو کبھی کا ہو بھی چکا۔"

"جی ہاں ہو چکا۔ مگر آپ کا سر لیجئے سنئے۔ وہ جواب جو آپ نے اس مراسلے کا دیا ہے۔ نتھنے۔ اور گڑھ جائیے زمین میں۔"

"حضرات جلوہ موہن، پیستہ ولوزات وغیرہم، آداب ــــ آپ نے تحریر کیا ہے کہ آپ کے بادام پورے میں ایک ڈاک خانہ کھولا جائے۔ مگر یہ تحریر کیا ہے۔ شرارت ہے۔ اس سے آپ کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ اگر وہاں کسی قسم کے خطوط آئیں گے تو اتنا تو آپ بھی جانتے ہیں کہ آپ انہیں پڑھ نہ سکیں گے۔ رہے وہ خطوط جن کے ساتھ نوٹ منتھی ہوتے ہیں۔ مگر وہ ہوتے ہیں دوسرے مقامات کے لئے سو وہ وہاں تک پہنچ جائیں گے کہ آپ لوگ ان کو اچک لیں گے۔ اور پھر شامت ہم سب کی آئے گی۔ نہیں جناب نہیں۔ اپنی بستی میں ڈاک خانے کا یہ خواب تو آپ دیکھئے ہی نہیں۔ میں ہر وقت آپ سے بہتر مفاد کو سامنے رکھتا ہوں۔ اور محسوس کرتا ہوں کہ ڈاک خانہ کا یہ خیال میری دانست میں نو بتیس از بیں نیست کہ ایک شوق فضول ہے اور بس۔ بلکہ آپ کو تو ایک صاف ستھرے جیل خانے کی ضرورت ہے ــــ ایک صاف ستھرا جیل خانہ اور ایک ہفت کا دارغہ۔ یہ ہیں وہ برکات جن سے آپ کا فائدہ ہوگا اور آپ ہمیشہ شاد و آباد رہیں گے۔

میں اس معاملے میں حقیر سی حرکت کرنے والا ہوں ــــ

آپ کا مخلص ــــ خوش فہم خاں

برائے شیخ مالک و نیدار خاں، کردار خاں

(ممبر کونسل، مرکزی)

"دیکھا آپ نے یہ ہے وہ ذہانت جس سے کام لیکر آپ نے اس مراسلے کا جواب دیا۔ چنانچہ اب وہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اگر میں نے کبھی ان کے ضلع میں قدم رکھا تو وہ مجھے سولی پر لٹکا دیں گے۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا ہی کریں گے"

میں نے کہا۔ "مگر حضور والا نور۔ مجھے تو یہ گمان بھی نہ تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچے گی میں تو انہیں صرف قائل کرنا چاہتا تھا۔

"جی درست، اور قائل انہیں آپ نے کر ہی دیا۔ اس میں شک ہی کیا ہے۔
اچھا اب لیجئے دو سو نمونہ دیکھئے۔ آپ نے اپنی عرضداشت کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے کہ
"ہم ہمیشہ دعا کرتے رہیں گے یہ سو میرا بھی یہی خیال ہے کہ ضرور ——— آپ کے لئے
یہی شغل بہتر ہے۔ آپ کا صادق ۔ خوش فہم خاں
برائے ملک دیندار خاں۔ کردار خاں

انجمن طلبائے اسلام نے لکھا تھا کہ آپ ہماری ہمنوائی کیجئے۔ ورنہ غداروں کی خیر نہیں۔ یہ خط میں نے آپ کو دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ یہ مسئلہ سیاسی ہے اور بہت نازک لہٰذا پہلو بچا کر جواب دیا جائے۔ ایسا جواب کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ مگر آپ نے یہ گل کھلایا ملاحظہ ہو۔

اے انجمن نشینو ——— تم اے خود پرستو بغیر کسی بناوٹ کے ذرا وصف سنو اپنے کان دھر کے۔ مہاتما گاندھی کا انتقال ہو گیا ہے۔ سارا دیش یاس و غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ حادثۂ فاجعہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کی شام کو پیش آیا۔ اور جس طرح پیش آیا۔ بچہ بچہ جانتا ہے۔

بہرحال مہاتما دیش کے سچے بھگت۔ تھے۔ جاتی کے سچے سیوک۔ جنتا کے بے تاج بادشاہ، چنانچہ سنا گیا ہے کہ اس خبر وحشت اثر کو سن کر ملک معظم بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ پریذیڈنٹ ٹرومین کھڑے کے کھڑے اور مارشل سٹالین۔۔۔

بہرحال یہ تھا مہاتما گاندھی کا غلغلہ اور ان کے تمام کا اثر جس پر اخبارات اور ریڈیو دونوں شاہد ہیں۔

شہرت کیا ہے؟ شہرت ایک حادثہ ہے۔ سر اسحاق نیوٹن نے درخت سے گرتا ہوا ایک سیب دیکھا! معمولی واقعہ۔ ادنیٰ انکشاف جسے لاکھوں بندگان خدا پہلے بھی کر چکے تھے۔ مگر نیوٹن۔ والدین صاحب اثر تھے۔ انہوں نے اتنی سی بات کو پھیلا کر افسانہ کر دیا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ مگر عجیب و غریب قرار دے دی گئی۔ گویا ایک غزل شروع ہوئی اور سادہ لوح دنیا اسے الاپنے لگی۔ اور لیجئے صبح ہوتے ہوتے نیوٹن صاحب دنیا بھر میں مشہور ہو گئے۔

بس ان خیالات کی قدر کیجئے۔ شعر و شاعری اسی موقع کی چیز ہے۔ دنیا شاعری کے احسان کا اندازہ نہیں کر سکتی۔

ملاحظہ ہو، یہ شعر

ایک تھی رانی، گھر کی رانی، دودھ ملائی کھاتی تھی
جہاں کہیں جاتا تھا راجہ، وہ بھی پیچھے جاتی تھی

اور یہ قطعہ

تھا ایک خاندان
محتاج آب و نان
خاموش، بے زبان
صدموں سے نیم جان
کس کس کا امتحان
لیتا ہے آسمان
اللہ تیری شان
وہ بھی تھا داستان
یہ بھی ہے داستان ——— چل چل رے نوجوان

سادگی۔ سچائی کا کیسا عجیب و غریب نمونہ ہے یہ قطعہ اور لطف یہ کہ تمام "فواحشات" سے پاک۔ میرے نزدیک یہ دونوں ٹکڑے آسمان شاعری کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ جن کا اردو شاعری میں جواب نہیں یہ ہیں وہ اشعار جو ہر سمجھ کے مطابق ہیں۔ اور زندگی کے ہر حال کے موافق۔ خواہ وہ کھیت ہو یا کھلیان، ہسپتال ہو یا کھیل کا میدان۔ اور آپ کی انجمن کے لئے تو اس سے بہتر ترانہ نہیں۔

خیر تو اے اگلے وقتوں کی یادگار و خط لکھتے رہنا کیونکہ دوستانہ خط و کتابت کے سوا ذاتی اصلاح کی دوسری اور کوئی صورت نہیں۔

مکرر یہ کہ خط ضرور لکھیں۔ اور اگر آپ کے پچھلے اعلان میں کوئی خاص تاریکی رہ گئی ہو تو اسے روشن۔ یعنی اجاگر کر دینے میں بھی ہچر مچر نہ کریں ہم آپ کو ملہار گاتے سن کر یا دیکھ کر ہمیشہ خوش ہوں گے ———

آپ کا مخلص ——— خوش فہم خاں
برائے شیخ ملک دیندار خاں، کردار خاں

"لاحول ولا قوۃ"۔ یہ بکواس، یہ واہیات، یہ خرافات، رحمہ ہو گئی حد"
میں نے عرض کیا "جناب عالی! مجھے نہایت افسوس ہے کہ اس جواب میں بھی خرابی نکل آئی، حالانکہ میری نیت صرف یہ تھی کہ آئی بلا سر سے ٹل جائے"
"مگر کیا وہ ٹل گئی؟ پھر مصیبت ہمیں ختم نہیں، تباہی شروع ہوئی ہے تو کوئی تسمہ لگا کر رہ جائے۔ چنانچہ آپ کے اس آخری شاہکار سے اس کا بند و بست بھی ہو گیا، شکارپور والوں نے لکھا تھا کہ ان کے یہاں ڈاک کا موجودہ راستہ تبدیل کر دیا جائے۔ خط میں نے آپ کو ڈرتے ڈرتے دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ مطالبہ بے تکا ہے۔ اس نے دیکھتا جواب گول مول دینا۔ بلکہ ان بزرگوں کو کچھ اندھیرے ہی میں چھوڑ دینا۔ مگر اللہ رے آپ کی خوش فہمی، آپ نے لیٹا ہی

ڈبو دی۔ لیجئے سنئے۔ اپنا جواب، اور اگر آپ کا ضمیر بالکل ہی مر نہ گیا ہو تو کانوں میں روئی ٹھونس لیجئے۔ آپ لکھتے ہیں۔

برگانِ شکارپور، سلمہ اللہ تعالیٰ ——— آپ کے یہاں ڈاک کے راستے کی تبدیلی کا مسئلہ کچھ عجیب سا ہے۔ یعنی بہت نازک اور بہت پیچیدہ لیکن اگر کافی چابکدستی اور صنعت ایہام سے کام لیا جائے تو کوئی شک نہیں کہ ہم کسی نہ کسی حد تک اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ٹھیک اس مقام پر جہاں سڑک اعظم متھرا داس روڈ سے آکر ملی ہے۔ پچھلے دنوں محض اس غفلت کی بدولت کہ ریل کا پھاٹک کھلا رہ گیا تھا، ایک غریب بھینسا انجن کے نیچے آکر کچلا گیا تھا اور ایک جیل۔ ایک گاڑی کو لیکر ہوا میں اڑ گئی تھی۔ چنانچہ آپ کو یاد ہوگا کہ مقامی اخبارات میں اس پر ایک شور برپا ہو گیا تھا جس میں دو فریق تھے۔ ایک کہتا تھا کہ غالب کا سہرا بہتر ہے۔ دوسرا کہتا تھا کہ نہیں، ذوق کا سہرا بڑھا ہوا ہے۔ آخر آپ نے دیکھ لیا کہ ہندوستان تعلیم ہو کر رہا اور ہزار ہا بندگانِ خدا کا خون خیر تو آدم برسرِ مطلب کہنا یہ ہے کہ سڑک سرکاری ہے۔ اور اس پر سب کی آمد و رفت جاری۔ اس میں آدمی یا گدھا سب برابر ہیں۔ علاوہ ازیں اگر سڑک کسی خاص مقام سے گزرتی ہے اور بعض عام مقامات سے نہیں گزرتی تو اس میں سڑک کا کچھ قصور نہیں۔ بلکہ یہ قصور ہے ان بزرگوں کا جو سڑک بناتے گئے اور آنے والی نسلوں کے مفاد کو نظر انداز کر گئے۔ مگر وہ لوگ اب اس دنیا میں موجود نہیں۔ اس لئے ان کے خلاف مقدمہ تو دائر ہو نہیں سکتا۔ مگر ہاں ان کے گڑے مُردے اکھیڑ کر ان سے انتقام ضرور لیا جا سکتا ہے۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس سڑک کے کنارے ڈیڑھ اینٹ کی ایک مسجد الگ بنائی جائے اور اسلاف کے خلاف دادِ تحقیق دی جائے۔ مگر یہ حکم مسجد کے لئے ہے، سڑک کے لئے نہیں۔ رہا نئی سڑک کا سوال۔ تو وہ دلی میں گھنٹہ گھر کے سامنے ہے۔ واضح ہو کہ یہ گھنٹہ گھر بھی اب زمین کے برابر ہو چکا ہے بقول شخصے ع

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

ہمیشہ رہے نام اللہ کا) اور سڑک بنانا پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا کام ہے۔ مگران کو دکشنا چاہئے۔ اور تکلف برطرف، مجھے یہ مقدرت حاصل نہیں۔ ہاں اگر آپ ہمت افزائی فرمائیں تو مجھ سے اس نازک خدمت سے بھی گریز نہ ہوگا۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اگر یہ کام چابکدستی سے ہاتھ میں لیا جائے تو کامیابی کی بہت کچھ امید ہے۔ بہرحال میں ہر وقت آمادہ ہوں اور تیار کہ اس سلسلے میں آپ کو زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچاتا رہوں۔ بشرطیکہ آپ بھی وقتاً فوقتاً یاد دہانی فرماتے رہیں۔ اور ڈاک خانہ بھی آپ کے مراسلات خاکسار تک پہنچاتا رہے ———

آپ کا مخلص۔ خوش فہم خاں۔ برائے .....

"ملاحظہ فرمایا۔ آپ نے، پھر کیا خیال ہے جناب کا اس کے متعلق؟"

میں نے عرض کیا۔ "خیال تو کوئی خاص نہیں، مگر یہی کہ جواب تھا تو خاصا گول مول۔"

"گول مول ٹھیک ہے؟ اچھا تو آپ اسی وقت یہاں سے اپنا بستر گول کر جائیں۔ افسوس ان شکارپوریوں کے سامنے اپنی بھد اڑانا تھی۔ سو اڑ گئی۔ اور جہاں جہاں عزت و اعتبار قائم تھا۔ آپ کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہو گیا۔"

میں نے کہا۔ بندہ نواز۔ اس باب خاص کے متعلق تو میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے میرے ہی قلم سے کچھ چوک ہو گئی ہو۔ لیکن اس سانحۂ عظیم۔ اتنے شکارپوریوں کا مقابلہ یکہ و تنہا کرنا میرے لئے کچھ آسان نہ تھا۔

اس پر آقا نے کہا۔ "بس بس۔ باہر ہو جائیے باہر۔ دل نے کہا۔ میں نے اس اشارے سے یہی مطلب نکالا کہ انہیں اب میرے تاثرات کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ میں نے استعفیٰ دیدیا۔ اور آئندہ کے لئے کان پکڑا۔ ہو سکتا ہے کسی کی ممبر کونسل کا پراپوزیٹ سکرٹری بننے کا خیال بھی دل میں لایا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ ان تلخ مزاجوں کو کوئی شخص بھی خوش نہیں کر سکتا۔ یہ کیا جانیں کسی کی محنت کی داد دینا۔

افسر سلیم

بھکاری

"سارڑھے تیرہ آنے ——"

ہوٹل والے کی گرجتی ہوئی آواز کے ساتھ اس نے تیلون کی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور سیٹھ کے حوالے کر دیا۔ لیکن سیٹھ نے اُسے بقایا واپس کیا تو اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور جب وہ ہوٹل کی سیڑھیوں سے اُترنے لگا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔ اور وہ جیسے کیلوں کے لاتعداد پچھلکوں پر سے پھسلا جا رہا ہے۔ ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو اس نے فٹ پاتھ پر کسی قدر سنبھالا۔ اور اپنے بدن کا تمام بوجھ ایک پاؤں پر ڈال کر بجلی کے کھمبے کے سہارے کھڑا ہو گیا —— گویا کی شام بہت سہانی تھی۔ وہ پہلے بھی سہانی تھی اب بھی سہانی اور شاید برسوں سہانی رہے گی۔ اس کی نظروں میں ایک تاریک رات تیر رہی تھی۔ دو معصوم بھائی بہن، اور ماں کو وہ گاؤں میں چھوڑ آیا تھا کہ کام ہی سب کو شہر بلائے گا۔ چلتے وقت اس کی ماں نے اپنا آخری زیور صراف کی نذر کر کے ڈیڑھ سو روپے حاصل کئے تھے۔ اور یہی پونجی شہر میں اب تک اس کا سہارا تھی۔ گیارہ سال کی محنت کے بعد حاصل کی ہوئی مسند اس کے جیب میں پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اس سند کو بھکاریوں کے کاسہ کی طرح کئی حکام کے سامنے بڑھایا تھا مگر ملازمت کی بھیک کے لئے یہ کاسہ ہر جگہ خالی تھا۔ گاؤں واپس جانے کا کرایہ تین روپے اور کچھ آنے باقی تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اسے اس کو لوٹ جانا چاہئے۔ مگر کرایہ کی رقم بھی ہوٹلوں کی نذر ہو جائے گی —— لیکن گاؤں جا کر وہ کیا کرے گا۔ ماں کو کیا کہے گا۔ معصوم بہن کے آنسو کس طرح خشک کرے گا؟ پیٹ کی آگ کیونکر بجھائے گا ——؟ اس کے ذہن میں خیالات کی ریل دوڑ رہی تھی —— اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کا وہ بیر جو بدن کا تمام بوجھ سہارے ہوئے تھے لڑکھڑانے کے نیچے سے ٹوٹ گیا ہے۔ اور وہ منہ کے بل گرا چاہتا ہے —— اس نے بدن کا بوجھ دوسرے پیر پر لے کر پہلے کو زور سے جھٹکا دیا اور اس کے تمام بدن میں

چیونٹیاں سی دوڑ گئیں —— اس نے ایک جھرجھری سی لی ——

"کام کیوں نہیں کرتے ——؟" اس کے بالکل قریب سے آواز آئی —— "جوان ہو کر محنت سے جی کیوں چراتے ہو ——" اور اس نے منہ پھیر کر دیکھا کہ ایک موٹا تازہ وردی والا ایک بھکاری کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھ رہا ہے ——

"حضور کام ملتا کہاں ہے ——" بھکاری نے کہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "کام بہت ملتا ہے —— مگر تم کو عادت جو بھیک مانگنے کی پڑی ہے۔ حرام خوری کا چسکا ہو گیا ہے ——"

وردی والا بھکاری کو جھڑک کر چلا گیا —— اور اس نے اپنے آپ سے پوچھا —— "کام کیوں نہیں کرتے ——" پھر اس نے بازوؤں پر نظر ڈالی اور بڑبڑایا "جوان ہو کر محنت سے جی کیوں چراتے ہو" اور اسے محسوس ہوا کہ محنت کے نام سے اس کے بازو کانپ اُٹھے۔ کاغذ پر قلم چلانے کی گیارہ سال عادت، انہیں محنت کے لئے بیکار بنا چکی تھی۔ اسے اپنی تعلیم اور تعلیمی زندگی سے نفرت ہونے لگی۔ زندگی کی گیارہ بہاروں کے یوں ہی بیت جانے پر اس نے ایک سرد آہ بھری اور روقدم آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا

—— "جمہوریت —— خام و سحر —— انقلاب —— الاماں —— ایک دس سالہ اخبار فروش اس کے سامنے سے پکارتا ہوا گذرا۔ اس نے کمسن محنت کش کو غور سے دیکھا اور وہ اس کے قریب آ گیا ——

"کیا چاہئے۔ بابو جی ——"

"ایک انقلاب —— اپنی زندگی کے لئے"

"دو آنے ——" لڑکے نے جلدی سے اخبار نکالا —— مگر وہ پیسوں کی جیب میں ہاتھ ڈالے کچھ سوچتا رہا ——

"جلدی کیجئے بابو جی —— مجھے بہت سے اخبار بیچنا ہے"

نوعمر لڑکا بڑبڑایا مگر وہ سوچتا ہی رہا اور لڑکا چلا گیا ——

لڑکا چلا گیا ــــ اس نے "انقلاب" نہیں خریدا۔ اگر قریب بھی اس کی زندگی میں کوئی انقلاب خود بخود چلا آیا ــــ جیسے اس کی زندگی ایک بے جان ستارے کو چھوڑ کر تیزی سے حرکت میں آگئی اور اس کے تمام بدن میں خون دوڑنے لگا ــــ وہ لپک کر اخبار والے کے ساتھ ہولیا ــــ

"روز کتنے اخبار فروخت کر دیتے ہو ــــ"

"یہی کوئی سو دو سو ــــ"

"کس قدر کما لیتے ہو ــــ"

"کوئی دو تین روپیہ ــــ"

"اوہو ــــ!"

اور اس کے تاریک تصورات میں برق سی کوند گئی ــــ

دوسرے روز صبح اس نے چار روپے کے اخبار خریدے اور ریلوے اسٹیشن کے باہر کھڑا ہو گیا ــــ کارخانے کے ملازموں کو لے جانے والی لوکل کا وقت ہو گیا تھا ــــ اور ہزاروں آدمی ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی تھیلیاں لئے جا رہے تھے ــــ بھیک منگوں کی ٹولیاں گھوم رہی تھیں ــــ پھیلے ہوئے ہاتھ چھڑکے جا رہے تھے۔ مگر لوگوں کو ہاتھ پھیلانے کی عادت سی ہو گئی تھی ــــ

"الانصاف اور جمہوریت" کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں ــــ اور وہ ہاتھ میں اخباروں کا بنڈل لئے خاموشی سے سفید پوش بابوؤں کو دیکھ رہا تھا ــــ انہیں دیکھ کر اس کے دل میں آیا کی نامی کے جذبہ بیدار ہونے لگا تھا ــــ اس کی آواز گلے میں اٹک رہی تھی ــــ ایکا دکا دم گھٹا وار ہا تھا ــــ اچانک شام کا وردی والا اس کے ذہن میں ابھرا "اور کام کیوں نہیں کرتے" کی زبردست آواز نے اسے ایک بابو کے سامنے دھکیل دیا ــــ اس کے تمام بدن میں چیونٹیاں سی دوڑ گئیں ــــ اور "انقلاب" کی صدا سے اس نے فضا کا سینہ چیر دیا ــــ جیسے دق کا کوئی مریض بڑی دیر کی گھٹن کے بعد بہت سا بلغم تھوک دے ــــ

اس کے بعد وہ ہر بابو کے سامنے "انقلاب" بڑھا رہا تھا ــــ

اور اس کی زندگی ایک نئے موڑ پہ آکر اپنا رخ بدل رہی تھی ــــ شام کو اس کی جیب میں اپنی محنت کے کمائے ہوئے چند سکے تھے ــــ اس کے اختیار میں اس کے اپنے قہقہے تھے۔ اور تصور میں ماں کا مسکراتا ہوا چہرہ

چہرہ ناچ رہا تھا ــــ وہ لطیف رستوران کے باہر برگنزا کے پل جانیوالی بس کے انتظار میں کھڑا تھا ــــ سامنے بیروزگاری کے دفتر پر "امپلائے نیٹ آپ کیجیے" کا بورڈ لگا تھا ــــ اور اس بورڈ کے نیچے سے بہت سے نوجوان ہاتھ میں ڈگریوں کا پلندہ لئے چلے آرہے تھے ــــ اُن کی آنکھیں نم تھیں۔ چہرے اداس اور لب خاموش۔ اس نے بہت غور سے ان مرجھائے ہوئے چہروں کو دیکھا اور محسوس کیا کہ خاموش ہونٹ اچانک متحرک ہو گئے ــــ "کام ملتا کہاں ہے" ــــ اور وہ زیر لب بڑبڑایا ــــ "کام بہت ملتا ہے۔ مگر تم کو عادت جو بھیک مانگنے کی پڑی ہے۔ سرکاری دروازوں پہ جھولیاں پھیلانے کا درس جو لیتے رہے ہو ــــ ضمیر جو بھکاریوں کا سا رکھتے ہو ــــ بھکاری ــــ اور بھکاریوں کا ایک گروہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کئے گزر گیا ــــ اُس نے اِس گروہ کو نفرت بھری نظر سے دیکھا اور منہ پھیر لیا ــــ

برگنزا کے پل جانے والی بس آگئی ــــ وہ بس میں سوار ہو گیا ــــ بس کنڈکٹر اس کے قریب آیا مگر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے گزر گیا۔ وہ کچھ دیر دو آنی ہاتھ میں لئے اس کے واپس آنے کا انتظار کرتا رہا مگر دوسری بار بھی کنڈکٹر نے بے اعتنائی برتی ــــ اس نے ٹکٹ کے لئے اصرار کر دو" کی ہدایت پڑھی اور کنڈکٹر کو آواز دی مگر وہ اب کسی عورت سے باتوں میں مشغول ہو گیا تھا ــــ کچھ دیر بعد برگنزا کا پل آگیا ــــ اس نے کنڈکٹر کے کاندھے پہ ہاتھ رکھکر اسے مخاطب کیا اور کنڈکٹر اسے گھور کر دیکھنے لگا ــــ اس نے ٹکٹ کہہ کر اس کے ہاتھ پہ دو آنی رکھ دی ــــ اور کنڈکٹر کی تشکر آمیز نظریں یوں مسکرا رہی تھیں جیسے کسی فقیر کے کاسہ میں پیسہ پڑ گیا ہو ــــ اس کے ہونٹوں پر ایک نفرت آمیز ہنسی پھیل گئی ــــ "بھکاری ــــ بھکاری کہیں کا" ــــ اور وہ بس سے نیچے اتر گیا ــــ

انگریز کاری گروں کے ہاتھ کا بنایا ہوا برگنزا کا خوبصورت پل شہر کے خوفناک نالے کی گندگی چھپائے سیاہ رات میں ایک ڈراؤنی عورت کی طرح جگمگا رہا تھا ــــ روشنی قمقمیاں اس کے ملبوس پر جھلملیوں کی طرح چمک رہی تھیں ــــ اور ان قمقموں کے نیچے اس کا سایہ کبھی پھیلتا اور کبھی کم ہوتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا ــــ وہ سوچ رہا تھا کہ اس دھرتی پر کتنے بھکاری بستے ہیں۔

زرّیں کپڑوں میں ملبوس کوئی سینری کا سہ لئے ہے چلچلاتی دھوپ سے تن ڈھانکے کوئی سوکھا ہاتھ پھیلا رہا ہے ـــــ کسی کا ریشمی آنچل جھولی ہے اور کسی کی شرابی آنکھیں کشکول ـــــ قدم قدم پر بھکاری ہیں۔ قدم قدم پر فریب ـــــ اور ان فریبوں سے بچتا بچاتا اس کا ہر قدم سنبھل سنبھل کر اٹھ رہا تھا ـــــ کہ "بابو جی ـــــ آگ" کہہ کر اچانک ایک وردی والے نے ان قدموں کو ٹوک دیا ـــ اس نے جلتی ہوئی بیڑی کا آخری ٹکڑا وردی والے کے حوالے کیا۔ اور پھر بے اعتنائی سے قدم اٹھانے لگا ـــــ وردی والے کے سینہ پر پیتل کے پانچ انگریزی ہندسے (1942) بڑے فخر سے چمکے۔ مگر اس کی بے پرواہ رفتار میں کوئی فرق نہ آیا ـــــ وردی والا سینہ پر ہاتھ پھیر کر زور سے کھنکارا مگر اس بے وقت کی شہنائی پر اس نے کان نہ دھرے ـــــ وہ کچھ آگے بڑھا اور پل کی منڈیر پر کمینیاں ٹکائے شہر پر پھیلے ہوئے بتیوں کے جال میں الجھ گیا ـــــ جوں جوں رات تاریک ہوتی گئی بتیاں اور خوش نما معلوم ہونے لگیں ـــــ راستہ کا بے ہنگم ساز مدھم پڑتا گیا ـــــ اور خاموشی نے اس کے خیالات میں ہزاروں دیپ جلا دیئے ـــــ کبھی کبھار کوئی کتا بھونکا یا وردی والا زور سے کھنکارا مگر وہ سوچتا ہی رہا ـــــ سوچتا ہی رہا کہ ـــــ "روپیہ کتنی مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ کتنے ضمیر فروشوں کو صاحب۔ مزاجی۔ منشی جی اور پنڈت جی کے خطابات سے یاد کرنا ہوتا ہے۔ تب کہیں شام و سحر کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ کتنی مسکراہٹیں بک جاتی ہیں جب ایک۔ کمکشاں کی قیمت آنی ہے کتنی عرق ریزی کرنی ہوتی ہے۔ تب کہیں پیٹ کے دیوتا کو آرتی میسر آتی ہے۔ اور یہ کالج کے منچلے نوابوں کے صاحبزادے کس بے دردی سے دولت کو لٹا دیتے ہیں۔ باپ کے پسینہ کو کس بے اعتنائی سے چوراہے پر رکھے ہوئے گھڑے کے پانی کی طرح ہر کس و ناکس میں بانٹ دیتے ہیں۔ کاش انہیں کوئی سمجھائے ـــ کہ روپیہ کتنی مشکل سے حاصل ہوتا ہے ـــ"

وہ سوچ رہا تھا اور وردی والا بار بار اسے قریب سے دیکھتا ہوا گشت لگا رہا تھا ـــــ رات کی تاریکی کے ساتھ اس کے خیالات بھی پھیل رہے تھے ـــــ زندگی اور زندگی کی دشواریوں کے خطوط اس کے ذہن میں ابھر رہے تھے۔ ڈوب رہے تھے۔ بن رہے تھے بگڑ رہے تھے ـــــ اور وہ ان خطوط سے دنیا کا حسین خاکہ بنانے میں منہمک تھا ـــــ

لیکن اچانک کسی کی نرم و گرم انگلیوں نے اس خاکہ کو مٹا دیا۔ کسی کے ملائم ہاتھ اس کی پیٹھ کو چھو گئے اور وہ چونک پڑا ـــــ اس نے منہ پھیر کر دیکھا ایک جوان عورت پھٹی ہوئی ساری میں اپنے شباب کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی مگر چہرے پر تمکنت ـــــ اس کے بال الجھے ہوئے تھے مگر مانگ سیدھی ـــــ اس نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور عورت کے ہونٹ کچھ کہنے پر مائل ہوئے مگر اس وقت وردی والا جوتے پٹکارتے ہوئے آ پہنچا۔ اور غرایا ـــــ "حرام زادی اتنی رات گئے کیا لینے نکلی ہے۔ بھاگ یہاں سے ـــــ" اور وہ چلی گئی۔ وردی والا بھی بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گیا ـــــ "رات کو بھی چین نہیں لینے دیتے کمبخت ـــــ" "ہزاروں کو جیل میں ٹھونس دو" مگر باز نہیں آتے اپنی حرکتوں سے ـــــ" وہ وردی والے کو بہت دیر تک دیکھتا رہا ـــــ جب وہ دور نکل گیا تو عورت پھر اس کے پاس آئی۔

"کیا چاہئے ـــــ ؟" اس نے پوچھا ـــ

"کچھ نہیں ـــــ"

"پھر چکر کیوں کاٹ رہی ہو ـــــ"

"میرے ساتھ چلئے بابو جی ـــــ"

"کہاں ـــــ"

"تاریکی میں ـــــ"

"کیوں ـــــ ؟"

"اس لئے کہ میں بھوکی ہوں۔ مجھے روٹی چاہئے ـــــ"

"روٹی چاہئے تو پیسہ مانگو ـــــ" اس نے جان چھڑانے کے لئے ایک روپیہ کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا ـــــ

"یوں نہیں بابو جی ـــــ"

"کیوں ـــــ ؟"

"اس لئے کہ میں بھکارن نہیں ہوں ـــــ"

"بھکارن نہیں ہو ـــــ" اس نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی پوچھا۔ "پھر ؟ـــــ"

"ہاں میں بھکارن نہیں ہوں"

"میں اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرتی ہوں اور قیمت لیتی ہوں"

وہ عورت کی اس بیباک گوئی پر گھبرایا اور جلدی سے بولا ـــ

"تو پھر میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا ——"

"کیوں ——؟"

"کیونکہ میں ضمیر فروش نہیں ہوں —— پسینہ بہاتا ہوں روپیہ کماتا ہوں —— حلال کی روٹی کھاتا ہوں اس لئے حرام پر نیت نہیں رکھتا ——"

"تو پھر معاف کرو بابو جی ——" عورت چلی گئی اور وہ منہ اُسے دیکھتا رہا —— اس کے بال الجھے ہوئے تھے مگر مانگ سیدھی —— وہ دیر تک اُسے دیکھتا رہا —— پھر وہ کہیں تاریکی میں ڈوب گئی —— —— وہ بھی کچھ دیر وہاں کھڑا رہا اور پھر اُسی طرف چل پڑا۔

پل کے آخری سرے پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ایک پیپل کے تاریک سایہ میں سے وہی عورت بڑبڑاتی ہوئی نکل رہی ہے۔ "مجھے یہ معاش کہنے والا خود بد معاش ہے۔ حرام خور کہیں کا ——"

اور اس نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ پیپل کی چھاؤں میں وہی موٹا تازہ وردی والا اپنے بدن کا جوڑ جوڑ توڑ رہا ہے —— اس نے بیڑی جلانے کے بہانے دیا سلائی کھینچی —— —— اور وردی والے کے سینہ پر پانچ ہندسوں کی بجائے پانچ حروف اُبھر آئے ——

—— "بھ —— ک —— ا —— ر —— ی ——"

ایک مختصر افسانہ

ملک کا کثیر الاشاعت ماہنامہ

وہ کافی رات تک ملک کے کثیر الاشاعت ماہنامہ کی ورق گردانی کرتا رہا ——

بقیہ رات بے چینی میں کٹی اور صبح کو اس نے کمرے کی کھڑکی کھولی اور جھانکنے لگا۔ پاس کے بالاخانوں میں اس کی نگاہیں کچھ تلاش کر رہی تھیں —— ....؟

منظور احمد بی۔ اے

ادارہ

ادبی مسائل

کیفی امروہوی :۔

س :۔ ——— تحریک زبان کے سلسلہ میں آپ کا نظریہ جون ۱۹۵۳ء کے "معیار" میں نظر سے گزرا۔ مجھے اس کی موج کے انداز سے اختلاف ہے۔ آپ نے تحریک زبان کے سلسلہ میں "اسلامی ادب" کے "وسیع نقطۂ نظر" کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"لیکن آج کل یہ زبان ایک خاص طبقہ کے غلط طرزِ فکر کا نشانہ بن گئی ہے۔ ہمارے بہت سے دوستوں نے اُردو زبان کو اپنا محور بنا لیا ہے۔ اور اس کی خاطر مرمٹنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ حالانکہ سب سے زیادہ اہم سوال ان افکار و خیالات کا ہے۔ جو اُردو زبان میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر یہ افکار و خیالات صالح ہوں گے۔ ہمہ گیر ہوں گے۔ قوم، جماعت اور طبقہ کے مفاد سے آزاد ہوں گے تو خود بخود اُردو کا تحفظ بھی ہو جائے گا۔ اور دنیا اُردو سیکھنے کی طرف مائل ہو جائے گی۔"

مذکورہ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے نزدیک زیادہ اہم سوال ان افکار و خیالات کے تحفظ" کا ہے جو اُردو زبان میں پیش کئے جاتے ہیں۔" تو گویا آپ ان "صالح افکار و خیالات" کے تحفظ کے حامی ہیں۔ جن کے نقش و نگار کندہ ہیں قصرِ اُردو پر۔ اس عمارت کے نہیں جس پر وہ بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ حکومت پبلک کے قبضہ سے ایک مکان کو ناجائز طور پر نکالنا چاہئے اور وہ اسی کے بارے میں یہ کہہ کر آگے بڑھ جائیں کہ ہمیں اس مکان کی اینٹوں ستونوں۔ اور چونے کا تحفظ" کرنا چاہئے کیونکہ اگر اس کی بنیادیں مستحکم ہوں گی، اس کے ستون اور اینٹیں پائدار ہوں گی تو مکان بھی ہمارے قبضہ میں رہ سکے گا اور اس کی دیواریں بھی۔ حالانکہ اس وقت سوال مکان کے تحفظ" کا نہیں، حکومت کے ناجائز قبضہ سے "بچاؤ" کا ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ عمارت حکومت کے قبضہ میں چلی جاتی ہے تو پھر نہ ہم اس کی اینٹوں کی حفاظت کر سکتے ہیں اور نہ اس کے مزید تحفظ کیلئے کوشش۔ یہ صحیح ہے کہ "اسلامی ادب" کے ابلاغ و تبلیغ کا ذریعہ صرف زبان اُردو ہی نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ اور زبانوں میں بھی اس کی اشاعت کرنی چاہئے۔ اور یہ اپنی جگہ ایک وسیع نظریہ ہے لیکن جہاں تک نفسِ زبان کے "بچاؤ" کا تعلق ہے۔ ہمیں اتنا نظریہ گیر" نہیں ہونا چاہئے۔ اس وقت اگر اُردو کا بچاؤ نہیں کر سکے ——— تو ان "صالح افکار و خیالات" کا محفوظ رہنا بھی دشوار ترین نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ جن پر ہماری زندگی کی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔ اس وقت اُردو ہی ایسی زبان ہے۔ جس میں نہ صرف صالح ادب" بلکہ "اُردو" کا اعلیٰ ترین لٹریچر محفوظ ہے۔ جس کا دوسری زبانوں میں جلد از جلد منتقل ہو جانے کی امید رکھنا، خوش اندیشی ہے۔ دُور اندیشی یا وسعت نظری نہیں۔

جس سیلاب نے پانچ سو سال کی تہذیب و ثقافت، اخلاق و معاشرت کے خزانے بہے جا رہے ہوں۔ اس کو بہا جانے دینا (صرف اس امید پر کہ اس میں جو قیمتی موتی ہیں۔ ان کا تحفظ کر لیا جائے) اتنا سود مند نہیں ہو سکتا۔ جتنا کہ اس کو روک دینا نتائج خیز ہو سکے گا۔

توقع ہے کہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے گا۔ اور کوئی وسیع مثبت پہلو تلاش کیا جائے گا۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ہمیں اُردو کی بچاؤ کی حمایت کے سلسلہ میں ہر ممکن کوشش کرنے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہئے۔

اب خواہ وہ زبان کی خاطر کے ضمن میں ہو یا تحفظ افکار و خیالات" کے لئے ——— فقط

ادارہ :— مہربانی کرکے عابدی صاحب کی تحریر کے مدعا کو سامنے رکھئے۔ عابدی صاحب نے جون ۱۹۵۳ء کے نقشِ اوّل میں جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) زبانوں کے سلسلہ میں ہمیں وسیع النظری سے کام لینا چاہئے۔

(۲) اردو جو ایک عمدہ زبان اور اس میں ادب کا بہترین سرمایہ ہے۔ اس کے تحفظ کا وہ طریقہ درست نہیں جس میں پیوند بچار کے بجائے جذباتی عنصر کو زیادہ دخل دیا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس ہمیں ان اسباب کا کھوج لگانا چاہئے جو مخالف قوتوں میں تحریک پیدا کر رہے ہیں۔

اِن اسباب کے ضمن میں انہوں نے ایک حقیقت بیان کی ہے اور وہ یہ کہ مخالفین کی اصل دشمنی زبان سے نہیں بلکہ اس کی تہہ میں تہذیبی و نظریاتی کشمکش کارفرما ہے۔ یہ کشمکش اس غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے جو ایک مخصوص تہذیب کے بارے میں مخالفین میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لئے اصلی کام اس تہذیبی و نظریاتی کشمکش کو ختم کرنے کے لئے غلط فہمیوں کا دور کرنا ہے کیونکہ مخالفت کا اصل سبب یہی ہے۔

اِس معنی برحقیقت تجزیہ سے یہ بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ سطور زیرِ بحث کا مقصد ایک ایسے راستہ کو اختیار کرنا ہے جو خیال اور وسیلۂ اظہارِ خیال دونوں کے لئے مفید ثابت ہو۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس کا مقصد وسیلۂ اظہارِ خیال کی اہمیت کو یکسر کالعدم کر دینا ہے صحیح نہیں۔ عمارت کی مثال آپ نے ٹھیک نہیں دی۔ اصل چیز یعنی عمارت کی اساس تو نظریات و خیالات ہیں نہ کہ زبان جس کا درجہ نقش و نگار کی طرح ثانوی ہے اور پھر یہ تو فرمائیے کہ بالفرض اگر تحفظ کی کوشش ناکام رہتی ہیں کیا اس کا نتیجہ اس مایوسی کی صورت میں نکلنا چاہئے کہ اب صالح افکار و خیالات ختم ہو جائیں گے۔ اُردو کے تحفظ کو اسلام کے تحفظ کا ہم معنی سمجھنا کہاں تک درست ہے۔ ——————

محمد نجات اللہ صدیقی :——————

س :—— مارچ ۱۹۵۳ء کے معیار میں محترمی ابنِ احمد کے نظر ثانی" پر آپ کا نوٹ نظر سے گذرا۔ ہمارے لکھنے والوں پر اگر جمود طاری ہے اور آپ کی معلومات کے مطابق ہمارے اچھے فن کار بھی اس کا شکار ہو گئے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم اس جمود کے صحیح اور واقعی اسباب کا پتہ چلائیں۔ اگر ہم نے غلط اسباب کو اس کی وجہ قرار دے لیا تو ظاہر ہے کہ صورت حال کے علاج کے سلسلہ میں بھی ہماری کوششیں غلط راہ پر جا پڑیں گی۔

اپنے ادبی حلقے سے تھوڑی بہت واقفیت میں بھی رکھتا ہوں۔ میں خود کو آپ کے اس خیال سے متفق نہیں پاتا کہ کچھ دنوں سے اس کے ردِ عمل کے طور پر ہمارے ادیبوں میں ایک اور خطرناک مرض کی علامتیں نمودار ہو رہی ہیں یعنی "وہم" کی حد تک بڑھی ہوئی احتیاط۔ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں آپ کی رائے اپنے ساتھیوں کے احساس تقویٰ کے بارے میں حد سے بڑھے ہوئے حسنِ ظن اور ان کے تصورِ تقویٰ کے بارے میں مفرطانہ سوءِ ظن کی غمازی کرتی ہے۔ لیکن اگر خط و کتابت اور گفتگو کے ذریعہ اسلامی ادیبوں کی ایک معتد بہ تعداد کے بارے میں آپ نے یہ رائے قائم کی ہو تو بڑی مہربانی ہوگی کہ ان حقائق کو میرے سامنے بھی لائیں تاکہ اپنی رائے کو واپس لے سکوں۔

ابنِ احمد کی یہ تحریر مجھے پسند آئی۔ یہ بھی انسانی فکر کی ایک مہلک ٹھوکر ہے جس سے ابنِ احمد ہمیں بچانا چاہتا ہے۔ جس چیز پر اعتراض ہے وہ اس افسانے کے اوپر نوٹ میں میرے "افسانے" کا ذکر ہے .....

"افسانہ" ادیب کو قلم رکھنے کی تلقین نہیں کرتا صرف شہرت طلبی کے مہلک جذبہ پر تنبیہ کرتا ہے۔ ریاکاری میں مبتلا ہونے کے احتمال سے جد و جہد ہی سے کنارہ کش ہو جانا قرآنی فکر کے خلاف ہے۔ دراصل اس طرح کا تصور صرف کسی سادہ لوح ہی کے ذہن میں جگہ پا سکتا ہے۔ ہم اپنے ساتھیوں کے بارے میں اس طرح کی بدگمانی کیوں کریں۔

ادارہ :—— یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ ہم اپنے ساتھیوں کے بارے میں خوش گمانی سے کام لیں لیکن اگر آپ کی بات درست ہے اور فی الواقع سب کے سب ذہنی صحت کے — اس معیار کو پہونچ چکے ہیں تو پھر جمود و تعطل کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے؟ اس پر آپ نے کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ حالانکہ اس کی ضرورت تھی۔

" افسانہ" اور "نظر ثانی" فکر کی دونوں غلط انتہاؤں سے اپنے ادبی ساتھیوں کو بچانے کی کوششیں ہیں اور دونوں کامیاب۔ ان کی کامیابی خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے ساتھیوں میں سے کچھ ایسے ہوسکتے ہیں جن کے ذہن میں انتہا پسندی ہو۔

آپ کی بات خواہش کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن امر واقعہ کے لحاظ سے ایسا نہیں ہے۔

آنسہ ۔ش ۔ سلطانہ :——

س :—— تمہارا "معیار" موصول ہوا اس میں آپ نے خریداران کی ترجمانی کے لئے جو اوراق رکھے ہیں ان کو دیکھکر مجھے جرأت ہوئی کہ آپ سے کچھ سوال کروں۔ ارادہ کئی ماہ سے تھا۔ بابت ماہ جون ۵۳ء "معیار" میں متین طارق صاحب" کا مضمون عورتوں کے لئے فکر" پڑھا تھا۔ مضمون قسط وار تھا۔ مگر۔ پہلی قسط کے بعد اب تک دوسری قسط دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس درمیان میں متین طارق صاحب کے دوسرے مضامین شائع ہوتے رہے متین صاحب کی خدمت میں گذارش ہے اپنا مضمون مکمل فرمائیں۔

کافی عرصہ کے بعد میں نے افسانے دلچسپی و توجہ کے ساتھ پڑھے ورنہ آپ تو اشتراکیت کے پیچھے ایسے ہاتھ دھوکر پڑے ہیں کہ الاماں۔ انسانیت کی راہوں پر" بہترین افسانہ ہے۔ ابو خالد صاحب کے مضمون بہت اچھے ہوتے ہیں۔

ادارہ :—— متین طارق صاحب کا مضمون نومبر کے شمارے میں شائع کیا جائے گا۔ افسانوں کے بارے میں جو تاثر ظاہر کیا گیا ہے اسے وضاحت سے بیان کیا جاتا تو اچھا تھا۔ اگر افسانوں کے فکری مواد سے آپ کو کہیں اختلاف ہے تو وضاحت سے لکھئے فرمائیں۔ محض تاثر کے اظہار سے نہ افسانہ نگار فائدہ اٹھا سکتا ہے اور نہ قارئین۔ صرف اشتراکیت ہی پر تنقیدیں تو نہیں ہوتیں۔ دوسرے غلط افکار پر بھی معیار پر تنقیدیں کی جاتی ہیں۔ اس لئے ہمارے خیال میں آپ کا یہ تاثر کہ کسی مخصوص نظریہ کی مخالفت مقصود ہے درست نہیں دوسرے غلط نظریات کے ساتھ اشتراکیت پر بھی تنقید کی جائے تو وہ قابلِ اعتراض کیوں؟

خیال اپنا اپنا

شاہنامۂ اسلام (جدید) جلد اوّل

مصنف :- عامر عثمانی۔
ضخامت :- ۱۶۸ صفحات ـــــ قیمت پانچ روپے
کتابت۔ طباعت۔ کاغذ۔ جلد اور گرد پوش سب نہایت عمدہ۔
ناشر :- مکتبۂ تجلی دیوبند ضلع سہارنپور (یو پی)

اسی نام سے حفیظ جالندھری پہلے ایک تصنیف پیش کر چکے ہیں۔ جس کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی مقبولیت کی بڑی وجہ اس کا سہل انداز بیان تھا۔ زبان شوخ ہونکہ اردو میں اسلامی تاریخ اس وقت تک نہیں نہیں کی گئی تھی۔ اس لئے لوگوں نے اس کو بہت سراہا۔ حفیظ کے شاہنامے کے بعد اب اس قسم کی جو بھی تصنیف پیش کی جائے اس کو کامیابی صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب کہ نقش ثانی نقش اوّل سے بہتر ہو۔ ورنہ خود بقول عامر عثمانی صاحب کے لوگ اس طرح کی خیال آرائی کر سکتے ہیں کہ "نئے شاہنامے کے مصنف نے حفیظ کے شاہنامے کی شہرت و مقبولیت سے اپنی ناموری اور شہرت کی راہ نکالی ہے"

ہمیں عامر صاحب کی طرف سے اس قسم کی بدگمانی بالکل نہیں۔ لیکن اردو داں طبقہ کے بیشتر افراد اگر ایسا گمان کر سکتے ہیں اس کی وجہ ہمارے خیال میں یہ ہے کہ مصنف اگرچہ شعر کی تخلیق پر بڑی حد تک قادر ہیں لیکن فنی اور ادبی محاسن کے اعتبار سے ان کی کوششیں حفیظ کے شاہنامہ سے آگے نہیں بڑھ سکی ہیں۔

اس نئے شاہنامہ کی امتیازی خصوصیت جس کا عامر صاحب نے بطور خاص التزام کیا ہے۔ یہ ہے کہ اس میں آنحضور صلعم کے بعد کی تاریخ یعنی خلافت راشدہ کی تاریخ کو شعر کا جامہ پہنایا گیا ہے جبکہ حفیظ کا شاہنامہ حضورؐ کی حیات مبارکہ سے زیادہ متعلق ہے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے نئے شاہنامہ کی تصنیف و ترتیب کا جواز نکل سکتا ہے۔ لیکن نام کی یکسانی قابل گرفت ہے۔ یہ نام پہلے بھی ادبی حلقوں میں کافی تنقید و طنز کا نشانہ بنا رہا ہے۔ تنقید نادرست بھی نہیں تھی اس لئے اگر نام بدل دیا جاتا تو اچھا تھا۔ اس طرح نام پیچھے کا الزام ختم ہو جاتا اور بات صرف "الفضل للمتقدم" تک رہ جاتی۔

بہرحال اس تصنیف سے عامر صاحب ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے ضرور متعارف ہو جاتے ہیں اور اگر وہ ادبیات سے اور کسی جدید تخلیق کی امید دلا سکتا ہے۔

(ن - ا)

سہ روزہ "دعوت"

مدیر اعلیٰ :- سید اصغر علی عابدی۔
سالانہ چندہ۔ بارہ روپے ـــــ ششماہی چھ روپے
پتہ :- محلہ کشن گنج دہلی ۶

عابدی صاحب کا نام صاحبانِ معیار کے لئے جانا پہچانا ہے معیار کے قارئین عابدی صاحب کے سیاسی و علمی افکار سے واقف ہیں جو معیار کے پچھلے اداروں میں "نقش ثانی" "نقش آخر" "سحر ہونے سے پہلے" اور "یہ مسائل زمانہ" کے عنوانوں کے تحت سامنے آتے رہے ہیں۔ جو شخص ترتیب کا سلیقہ اور ادبی ذوق کے ساتھ سیاسی مسائل اور علمی موضوعات کا تجزیہ بھی کامیابی سے کر سکتا ہو وہ بلاشبہ ایک سہ روزہ کی ادارت کے لئے موزوں ترین آدمی ثابت ہو سکتا ہے ـــــ اور تعلقات سے بالکل قطع نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ "دعوت" میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو ایک سہ روزہ میں ہونی چاہئیں۔

اس وقت بھارت میں صرف دو سہ روزہ اخبار ایسے ہیں جو قابلِ ذکر ہیں۔

ایک۔ مدینہ بجنور

دوسرے، دعوت دہلی

"مدینہ" جس ڈگر پر چل رہا ہے وہ بہت پرانی اور آؤٹ آف ڈیٹ ہے۔ "دعوت" نے افکار و خیالات کی جو راہ پیش کی ہے وہ بھارت کی اُردو صحافت کے لئے نئی ہے۔ کیونکہ یہ اخبار نہ مسلم قوم پرستی کا حامی ہے نہ متحدہ قومیت کا۔ نہ گاندھیائی فلسفہ کا۔ نہ مارکسی فلسفہ کا نہ سرمایہ داری کا۔ یہ اخبار سرے سے قوم پرستی کا مخالف ہے۔ اور اس کے بجائے انسانیت، اخلاق اور خدا پرستی کی بنیادوں پر آفاقیت کا علمبردار ہے۔

"دعوت" کے خیالات بلاشبہ بلند ہیں۔ اور ہم سب کی توجہ اور غور و فکر کے مستحق ہیں۔

اب تک جو شمارے نظر سے گذرے ہیں ان میں تنوع اور اپج کا عنصر کافی ملتا ہے۔ اگر اس تنوع اور اپج کو آئندہ بھی برقرار رکھا گیا تو یقیناً "دعوت" ترتیب کے لحاظ سے بھی صحافتی حلقوں میں اچھی پوزیشن حاصل کرے گا۔

اُمید ہے کہ مدیر موصوف عنوانات اور موضوعات میں تنوع کا خاص خیال رکھیں گے۔ اور "دعوت" کو اس بے لطف یکسانی کا شکار نہ ہونے دیں گے جو علمی و دینی پرچوں میں عام طور سے پائی جاتی ہے۔

(ن ـــ ی)

معیار کے منتخب افسانوں اور خاکوں کا مجموعہ

اُبھرتی کرنیں

مرتبہ:۔ نجم الاسلام ـــــــــــــ قیمت دو روپے آٹھ آنے

موجودہ افسانہ جس راہ پر چل رہا ہے وہ کھلی ہوئی جنسیت پرستی اور مادّہ پرستی کی راہ ہے۔ تعمیر پسند اسلامی افسانہ نگاروں نے اس تخریب کی راہ سے ہٹ کر افسانہ کو پاکیزہ، صحت مند اور تعمیری افکار سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔

افسانہ میں ان جدید رجحانات کا مطالعہ کرنے کے لئے "اُبھرتی کرنیں" کا مطالعہ فرمائیے۔ مخربِ اخلاق افسانوں کے مجموعوں کے مقابلے میں اچھے افسانوں کا یہ انتخاب ایسا ہے جو گھروں میں بے تامل رکھا جا سکتا ہے اور ذہنی تعمیر کی صلاحیت رکھتا ہے اس کے علاوہ تعمیر پسند تنقید نگاروں کو بھی اس مجموعہ سے تعمیری افسانہ کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

کتاب مجلّد ہے۔ گرد پوش نہایت دیدہ زیب۔ کاغذ عمدہ۔ ضخامت سوا دو سو صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (۲/۸)

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ "معیار" میرٹھ (یو۔پی)

پرنٹر و پبلشر ـــــ محمد احمد ہاشمی　　(مطبوعہ کمال پرنٹنگ پریس دہلی)　　مقام اشاعت:۔ خندق اسٹریٹ میرٹھ

صحت منداور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

جلد ۳، شمارہ ۸،

ستمبر سنہ ۱۹۵۳ء

معیار

ترتیب دینے والے

اصغر علی عابدی

نجم الاسلام

ہیڈ آفس :- خندق اسٹریٹ میرٹھ شہر

سب آفس :- محلہ کشن گنج دہلی ۶

تعاون

سالانہ پانچ روپے

ششماہی تین روپے

(مضامین، خط و کتابت، ترسیل زر، تبادلۂ جرائد کے لئے ہیڈ آفس)

ترسیلِ زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب - فیملی لائن - جیکب آباد

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

ترتیب

نقش اوّل ۔ ادارہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نقشِ اوّل

بعض احباب نے گزشتہ دو شماروں کے معیار مضامین کو تشفی بخش نہ پاکر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ ہمارے بہی خواہ اپنے فرض سے غافل نہیں۔ جب بھی وہ ضرورت محسوس کرتے ہیں ہم تک اپنی تنقید پہنچانے میں تامل نہیں کرتے۔

اس سلسلہ میں جو خطوط موصول ہوئے ہیں۔ ان میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ "معیار" میں ایسے مضامین شائع کئے جائیں جو مقصدیت سے خالی نہ ہوں اور فن کے معیار پر بھی پورے اتریں۔ ناظرین "معیار" کا یہ مطالبہ واقعی ایک معقول مطالبہ ہے۔ آیئے اب ذرا اس پر بھی غور کرلیں کہ اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔

فی الحال ہمارے قلمکاروں کا حلقہ تین قسم کے لوگوں پر مشتمل ہے۔

۱ ـــــ وہ جو مقصدیت اور فن دونوں کو بنا ہنا اچھی طرح جانتے ہیں۔

۲ ـــــ وہ جن کی تخلیقات میں مقصدیت تو ہوتی ہے مگر فن کا نکھار نہیں ملتا۔

۳ ـــــ وہ جو فن کار تو اچھے ہیں مگر ہمارے نقطۂ نظر سے یا تو ابھی کچھ زیادہ واقف نہیں ہوئے یا پوری طرح ہمارے نصب العین سے متفق نہیں ہیں۔

متذکرۂ بالا تین قسم کے لکھنے والوں ہی کے تعاون سے مضامین کا معیار بلند کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے ہم ان قلمکاروں کو اپنا فرض یاد دلاتے ہیں جو مقصدیت اور فن دونوں کے اعلیٰ نمونے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان حضرات کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے اس لئے کہ ان لوگوں کی تخلیقات ہی ہمارے نئے لکھنے والوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیں گی۔ یہی ہمارے ادب کے صحیح تعارف کا ذریعہ بنیں گی اور انہی کی تخلیقات دوسری ادبی تحریکوں کے مستند، پختہ کار اور فضائے ادب پر چھائے ہوئے ادیبوں کے کارناموں کے مقابلہ میں بلا جھجک پیش کئے جانے کے قابل ہونگی۔ وقت آگیا ہے کہ ہمارے یہ فن کار تعمیری ادب کی نمایندگی کا فرض اس طرح ادا کریں جیسا کہ حق ہے۔

وہ قلمکار جن کا فن تو مستند ہے مگر وہ خود ابھی "معیار" کے نقطۂ نظر سے اچھی طرح واقف نہیں ہوئے ہیں۔ اور اس کو دوسرے ادبی رسالوں کی طرح کا ایک رسالہ سمجھکر لکھا ہے اپنے شہ پاروں سے نوازتے رہتے ہیں۔ ان کے متعلق ہمارے بعض احباب کچھ ایسی رائے رکھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی تخلیقات کو خواہ فنی لحاظ سے کتنی ہی عمدہ کیوں نہ ہوں مقصدیت کے فقدان کی وجہ سے "معیار" میں جگہ نہیں ملنی چاہئے۔ افسوس کہ ہم اس تجویز سے اتفاق نہیں کرسکتے۔ آخر اس میں کیا قباحت ہے کہ ہم اپنے حلقہ سے باہر کے مشاہیر ادیبوں کی وہ تخلیقات حاصل کرنے کی کوشش کریں جو

ہمارے بنیادی اصولوں کی نفی نہیں کرتیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہمارے حلقہ سے باہر کے ادیب جب ہمارے رسالہ میں اپنے مضامین کے ساتھ ہمارے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرنے والے دوسرے مضامین کا مطالعہ کریں گے تو انھیں ہماری بات کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو ہم باقی دنیائے ادب سے کٹ کر رہ جائیں گے۔

رہے وہ لوگ جن کے پاس محض مقصدیت ہی مقصدیت ہے اور جو فن کا ضروری شعور نہیں رکھتے وہ یہ خیال اپنے دلوں سے نکال دیں کہ جو کچھ بھی ہم لکھتے ہیں۔ اس کو ضرور ہی چھپنا چاہئے اس طرح کے لکھنے والے اگر اشاعت کے غم میں زیادہ نہ گھلیں اور صرف مطالعہ، مشق اور مشورے حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہو جائیں تو یہ سب کے لئے مفید ہوگا۔ گھٹیا درجہ کی اور غیر معیاری تخلیقات کو اگر شائع بھی کر دیا جائے تو اس سے ہمارے ادب کی ساکھ پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ اس مرحلہ پر جبکہ معیاری ادب اپنی ایک مستقل جگہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے ہمارے ناپختہ فن کاروں کو کچھ عرصہ تک صبر و تحمل کا شیوہ اختیار کرنا ہوگا۔

ایک مرتبہ ہم اپنے مخصوص قلمکاروں کی توجہ پھر اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور ادارہ کی جانب سے بھیجے جانے والے خطوط کا انتظار کئے بغیر اپنے بیش قیمت مضامین "معیار" کے معیار مضامین کو باقی رکھنے اور بلند کرنے کا فرض اصل میں انہیں پر عائد ہوتا ہے۔

یہ بھی ہم نے زیر نظر شمارہ کو مضامین کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ معیاری۔ متنوع اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس شمارہ سے "ادبی مسائل" کے نام سے ایک مستقل عنوان قایم کیا جا رہا ہے۔ اس میں قارئین کے ادب سے متعلق سوالات اور ادارہ کی طرف سے ان کے جوابات شائع کئے جاتے رہیں گے۔

سحر سے پہلے

تنویر احمد علوی

جن سے وابستہ تھی اُمید سحر
وہ اُجالے بھی تھے ظلمت کے نقاب
رات کی آنکھ سے آنسو نہ گرا
خودکشی کرتے رہے گر کے شہاب

کیسی تاریک تھی وہ راہِ حیات
کارواں جس میں بھٹکتا ہی رہا
اور کانٹا تھا ہر اک نقشِ قدم
جو نگاہوں میں کھٹکتا ہی رہا

اور پھر وہ ہی گراں خواب نقوش
ریت کے ذرّوں پہ جیسے اہرام
اور اندھیرے کی مسلسل دیوار
جیسے ماضی کا طلسمِ اوہام

پھر وہی خوف وہی سناٹا
بجلیاں تھیں کہ چمکتے تھے سحاب
جن سے وابستہ تھی اُمید سحر
وہ اُجالے بھی تھے ظلمت کے نقاب

کتنے جھوٹے تھے وہ تشبیریں سپنے
جن میں لہرائے تھے تاروں کے کنول
وہ تصوّر کی حسیں تر وادی
اور اُبھرتے ہوئے وہ رنگ محل

اور وہ سامنے خوشیوں کا سراب
جس کے دامن میں تھی اُمید کی ضو
جیسے بس چند قدم چند نفس
اس دھندلکے سے ہے وہ جادۂ نو

دُور افق پر وہ سنہری سی لکیر
دیکھنے کا جسے یارا بھی نہ تھا
بڑھ گئیں اور بھی ظلمت کی تہیں
اور اب کوئی سہارا بھی نہ تھا

اُمید ڈبائیوی

وہ گلیاں

وہ گلیاں جن کی رعنائی کو فطرت نے نکھارا تھا
وہ گلیاں جن کے ذرّوں میں تھی سورج کی سی تابانی
شگیبائی پہ جن گلیوں کی خود فطرت کو پیار آئے
وہ گلیاں دیکھکر جن کو یہی سمجھیں تماشائی
کہ میناؤں سے اٹھلاتی ہوئی جیسے ندی گذرے
وہ گلیاں جن کی راتوں پر بھی ہوتا تھا گماں دن کا
وہ گلیاں جو کبھی بجھو حُسن و لطافت تھیں
وہ گلیاں جن میں برساتوں میں فطرت گنگناتی تھی
وہ گلیاں جو کبھی آٹھوں پہر آباد رہتی تھیں
وہ گلیاں جو مہکتی تھیں کبھی بوئے محبت سے
وہ گلیاں جن میں سب کے سب قرابت دار رہتے تھے
وہ گلیاں جن کے دامن میں محبت نے اماں پائی
بپا اس امن جن گلیوں میں جھگڑے ہوتے رہتے تھے
وہ گلیاں جن میں رہنے والے با ایمان رہتے تھے
وہ گلیاں جن میں زردار اور بے زر سب برابر تھے
جہاں پر مسجدیں بستی تھیں اور سیتائیں رہتی تھیں
وہ جن کی پاک دامانی پہ حوروں کو بھی پیار آئے
جو مردانِ وفا کے پاک خوابوں کی تھیں تعبیریں
وہ گلیاں جن میں آکر زندگی محسوس ہوتی تھی
جہاں کے رہنے والے جب کبھی باہر سے آتے تھے
وہ گلیاں کاروانِ علم جن گلیوں سے گذرا تھا
وہ گلیاں جب غلامی کے بھیانک جن میں سائے تھے
وہ گلیاں حکمت و دانش کے جن میں دریا بہتے تھے
وہ گلیاں حل مسائل جن میں ہوتے تھے سیاست کے

وہ گلیاں جن کے جلووں کو محبت نے سنوارا تھا
وہ گلیاں ماند جن کے آگے تاروں کی درخشانی
جہاں ہر موسم نو بے کے پیغام بہار آئے
کہ دھرتی پر دھنک یا کہکشاں سچ مچ اُتر آئی
کہ پہلی پھوار جیسے آسماں سے ناچتی اُترے
وہ گلیاں رشکِ فردوسِ بریں تھا ہر مکاں جن کا
سراپا شعر و نغمہ تھیں مجسّم رنگ و نکہت تھیں
جوانی وجد کرتی تھی محبت گنگناتی تھی
ہمیشہ قید سے جو وقت کی آزاد رہتی تھیں
وہ گلیاں جو کبھی روشن تھیں خورشیدِ حقیقت سے
مساوات و اخوت کے علمبردار رہتے تھے
شرافت نے خلوص و آدمیت نے اماں پائی
بڑوں کی جھڑکیوں کو چھوٹے جن گلیوں میں سہتے تھے
جہاں حیوانیت کے دور میں انسان رہتے تھے
وہ گلیاں ساکنوں میں جن کے خودداری کے جوہر تھے
جو بھائی، باپ، شوہر کے لئے آلام سہتی تھیں
وہ جن کے ساتھ گویا مژدۂ فصلِ بہار آئے
حیا کی دیویاں معصومیت کی زندہ تصویریں
جہاں غمگین دلوں کو بھی خوشی محسوس ہوتی تھی
تو ان گلیوں کی مٹی کو بھی سینے سے لگاتے تھے
وہ گلیاں جن میں میری شاعری کا حسن نکھرا تھا
تو سب چھوٹے بڑوں نے گیت آزادی کے گائے تھے
جہاں علم و ادب شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے
وہ گلیاں معرکے سر جن میں ہوتے تھے محبت کے

جواں ٹولی میں چھڑ جاتے تھے قصّے حسن و اُلفت کے
بزرگوں کی زباں پر تذکرے ہوتے تھے اُن کے
کبڈی کھیلتی ٹولی نظر آتی تھی بچّوں کی
وطن کی وہ حسیں گلیاں بہاریں رقص کرتی تھی
کبھی ذکرِ قفس گاہے چمن کی بات چھڑتی تھی
کبھی انجامِ تقسیم وطن کی بات چھڑتی تھی
سمٹ آتے تھے جن گلیوں کے سب باشی محرم میں
اُمنڈ پڑتی تھی خلقت جن میں تقریباتِ پرچم میں
وہ گلیاں خاک نے جن کی ادیبوں کے قدم چومے
وہ گلیاں جن کے ذرّے عالموں کے وعظ پر جھومے
وہ گلیاں جن کے رہنے والے جب بھی مسکراتے تھے
تو ان گلیوں کے ذرّے بھی خوشی سے جھوم جاتے تھے
وہ گلیاں جو ہمارے ساتھ ہنستی اور روتی تھیں
ہمارے جاگنے پر جاگتیں سونے پہ سوتی تھیں
وہ گلیاں آج بھی موجود ہیں لیکن بایں عالم
گہ شوہر کے لئے بیوہ کی جیسے آنکھ ہو پُرنم
کہ جیسے شمع سے ملنے سے ہو مجبور پروانہ
کہ زنجیروں میں جیسے کوئی آزادی کا دیوانہ
وہ گلیاں کیا یہی ہیں جو گل و گلزار رہتی تھیں
وہ گلیاں کیا یہی ہیں جن میں پردہ دار رہتی تھیں
مکانوں میں مگر اب ان کے بے پردہ مکیں کیسے؟
وہ پٹّہ سر سے ڈھلکائے ہوئے ہر مہ جبیں کیسے؟
اب ان گلیوں میں کیا شرنارتھی حضرات رہتے ہیں
وطن کی یاد میں آنکھوں سے جن کی اشک بہتے ہیں
گھروں سے اپنے مجبوراً جو نانا توڑ آئے ہیں
بہ فیضِ صبحِ آزادی وطن جو چھوڑ آئے ہیں
کچھ ایسی آج ان گلیوں میں وحشت سی برستی ہے
کہ جیسے اِک کلی مدّت سے ہنسنے کو ترستی ہے
اگرچہ سارے گھمبوں میں یہاں اب بلب روشن ہیں
یہ گلیاں تو مگر تاریکیوں کا جیسے مسکن ہیں
سنوارے سے کہیں یہ بادفا گلیاں سنورتی ہیں
یہ اگلے بسنے والوں کو ابھی تک یاد کرتی ہیں
یہ آخر آج اِن گلیوں پہ کیسا خوف طاری ہے
یہ کیوں ان کے مکانوں میں بلا کی سوگواری ہے
یہ خاموشی، یہ سُوناپن، یہ سنّاٹا، یہ ویرانی
یہ گلیاں کیا وہی گلیاں ہیں یا خوابِ پریشانی
اُف ان گلیوں کے بسنے والے ان کو ساتھ لے جاتے
اگر یہ غیر ممکن تھا تو پھر خود ہی پلٹ آتے
یہ گلیاں کس قدر سہمی ہوئی معلوم ہوتی ہیں
میری آمد پہ ہنسنے کی بجائے جیسے روتی ہیں
یہ ویرانی تو ان گلیوں کی اب دیکھی نہیں جاتی
کوئی تو جانی پہچانی مجھے صورت نظر آتی
اب ان گلیوں میں مجھ کو ہمزباں تک بھی نہیں ملتا
کہاں کے اقربا اُن کا نشاں تک بھی نہیں ملتا

میں ان گلیوں میں خود کو اجنبی محسوس ہوتا ہوں
الٰہی بات کیا ہے، جاگتا ہوں یا میں سوتا ہوں

گلِ رنگیں

آلِ مظفر نگری

اے گلِ رنگیں چمن زاد و چمن پرور ہے تو
کائنات رنگ و بو کا دل کشا منظر ہے تو

ہے فضائے گلستاں معمور موجِ نور سے
تیرا جلوہ کم نہیں ہے شمع بزمِ طور سے

تیری رنگینی کا منظر جلوۂ عامِ چمن
تیرے دم سے صبحِ باغِ خلد ہے شامِ چمن

تیرا ہر اک برگِ رنگیں اس طرح ہے جلوہ زا
کوئی شہ پارہ ہو جیسے برقِ طورِ حسن کا

زندگی بخشِ گلستاں ہے تری جلوہ گری
تو فضائے باغ کو دیتا ہے ہر دم تازگی

ہے شفق کی سرخیوں میں اخترِ روشن جبیں
دامنِ رنگیں میں تیرے قطرۂ شبنم نہیں

رازِ حسن و عشق کا غماز ہے جلوہ ترا
مظہرِ خونِ شہیدِ ناز ہے جلوہ ترا

مست رکھتا ہے تجھے شاید مئے غم کا خمار
جھومتا ہے یوں سرِ شاخِ چمن جو بار بار

لے رہا ہے لطف زخمِ غمزۂ قاتل سے تو
آگہی رکھتا ہے بیشک درد کی منزل سے تو

پھر بھی نظروں میں تری اے حاملِ صد خامشی
بلبلِ شیدا کے نالے ہیں فقط اک دل لگی

ذرہ ذرہ ملتفت ہے جانبِ فریادِ عشق
عبرت آموزِ چمن ہے نالۂ برباد عشق

پتی پتی ہے زبانِ حال سے گرمِ سخن
باغ کی خاموشیاں ہیں حاملِ صد انجمن

کیوں ہے آئینِ چمن سے تجھ کو اتنی بے رخی
تو شریکِ بزم بھی ہے بزم سے بیگانہ بھی

ہے یہاں جو بھی وہ سرگرمِ سخن ہے برمحل
ایک تو ہے صرف پابندِ سکوتِ مستقل

اس سے میں واقف ہوں اے جانِ چمن جانِ بہار
پردہ دارِ رازِ ہستی ہے خموشی کا وقار

بزمِ عالم میں ہے جو ضبط و سکوں سے آشنا
کامیاب زندگی ہے وہ یہاں صبح و مسا

ہیں تحمل کے نتیجے شرحِ تقدیرِ حیات
صبر و استقلال سے ہوتی ہے تعمیرِ حیات

یہ تو سب سچ ہے مگر اے نوبہارِ زندگی
وقت پر خاموش رہنا بھی تو ہے بے دانشی

یوں تو موجِ بحر ہستی ہے اک عنوانِ خموشی
لیکن ہنگامِ تلاطم زا ہے طوفانِ خروشی

مطربِ شام و سحر کے راگ ہیں سب بے خلل
دیکھ ہر آوازِ ساز دہر کی ہے برمحل

تو بھی اک تقریر کر ایسی چمن میں صاف صاف
جس سے ہو رازِ حقیقت کا سراسر انکشاف

البتہ دارم کہ اے بیگانۂ ذوقِ سخن
شو حریفِ نالہ ہائے زار بلبلِ در چمن

جمیل وارثی خورجوی

مطالبہ

ساتھیو، "ظلمتِ افکار" گوارا نہ کرو
آؤ! یہ کبت و افلاس کی ماری دنیا
جہل و طاغوت کے نرغے میں ہے ساری دنیا
کتنے؟ بے نام "خداؤں" کا فسوں طاری ہے
آج انسان کی رگ رگ سے لہو جاری ہے
فکر و اذہان ہیں زندانیِ اوہام و جہول
تا کجا! سلسلۂ "نقضِ نظر" "عجز قبول!
رونقِ حرمتِ بازار گوارا نہ کرو
کس نے؟ آزادیِ جمہور کی زرکاری میں
روحِ اقوام کی آواز دبا رکھی ہے
ایک پاکیزہ تریں "نقد و نظر" کے بدلے
جنس و رومان کی افیون پلا رکھی ہے
طبلِ جنگ ہے پازیب کی دلکش جھنکار
زہرِ قاتل ہے یہ تہذیب و تمدن کا نکھار
زہرِ قاتل کو "بہ اصرار" گوارا نہ کرو
تم نے؟ سوچا بھی ہے انسان پریشاں کیوں ہے
قافلہ منزل و مقصد سے گریزاں کیوں ہے
ہم نے، فطرت کے تقاضوں کو دبا رکھا ہے
نفسِ امارہ کو معبود بنا رکھا ہے
خلق گردش میں ہے لیکن کوئی محور ہی نہیں
مقصدِ زیست، حقیقت کا مستحضر ہی نہیں
آؤ "اسرارِ الٰہی" کو نمایاں کر دیں
خاک کے ذرّوں کو خورشید درخشاں کر دیں

مسعود رزمی

نماز

اِس زمانہ میں ہمنشیں مجھ سے
پُوچھتا کیا ہے آہ سرِّ نماز
بندگانِ شجر حجر کو ملی
جس کے صدقے میں غیرت طناز
اس کو تو محض بندگی سمجھا
ناز کو دے دیا خطاب نیاز
دین کی اصطلاحِ نازک میں
آبتاؤں تجھے کہ کیا ہے نماز
تشنہ کامانِ عبدیت کے لئے
خود پناہی کا دلنشیں انداز
رونقِ کاروبارِ حُسن وعشق
مایۂ سوز وساز وجانِ گداز
سرنگونی کی انتہاؤں پر
سرفرازی کا نقطۂ آغاز
جلوتوں میں سنان وتیر وتفنگ
خلوتوں میں حدیثِ رازونیاز
حق وباطل کی رزمگاہوں میں
اہلِ دل نے پڑھی ہے یُوں بھی نماز

محمود عالم

اِتنی قربت اِتنا بُعد

اپنے عشرت کدۂ زلیست میں آسودہ ہو تم
اور ہم زلیست کے صحرا میں پریشاں ہیں ابھی
تم تو شادابیٔ گلشن کے "امیں" بن بیٹھے
بختِ ناشاد سے ہم دست و گریباں ہیں ابھی
وسعتیں ہیں تمھیں آزاد فضاؤں کی نصیب
اور ہم ہیں کہ اسیرِ غمِ زنداں ہیں ابھی
تم تو دامن میں گلستاں کو لئے بیٹھے ہو
اور ہم منتظرِ فصلِ بہاراں ہیں ابھی
بربطِ زلیست کا اِک "نغمۂ جاں بخش" ہو تم
ہم تو افسانۂ خوں ریز کا عنواں ہیں ابھی
محفلِ ناز میں تم اپنی ہو ارماں بہ کنار
دل میں روکے ہوئے ہم حشر کے طوفاں ہیں ابھی

افتخار اعظمی

مطالعۂ فطرت، منظر کشی اور اسلام کا ادبی نقطۂ نظر

(یہ مقالہ علی گڑھ یونیورسٹی کے فارسی لکچر تھیٹر میں ۲۶ جولائی ۱۹۵۳ء کی شام کو ادارۂ ادب اسلامی کے اجتماعِ عام میں پڑھا گیا)

انسان چونکہ فطری طور سے حسن و جمال رکھتا ہے اس لئے دنیا کی ہر قوم میں اور ہر زمانے میں جمالیاتی احساس مختلف پیرایوں اور مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا رہا ہے جلوۂ فطرت کی رنگا رنگی ہر دور میں ادیب و شاعر کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہی ہے، یہ صحیح ہے کہ جمالیاتی تحریکات ہر دور میں اور ہر ملک میں مختلف رہے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ احساس حسن و جمال انسان کے اندر فطری طور سے پہلے بھی رہا ہے اور اب بھی ہے۔ فطری مناظر سے نگاہِ ہر ادیب اور شاعر کی فطرت میں بدرجۂ اتم دلیعت کیا گیا ہے۔ وہ اور انسانوں کی بہ نسبت زیادہ حساس ہوتا ہے، بہار ستانِ ہستی کی رنگینیاں اسی اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ کتابِ فطرت کا ہر نقش اس کے لئے ایک درسِ عرفان ہے۔ کائنات کے ہر ذرّے میں وہ ابدی حسن کا ایک جلوہ دیکھتا ہے ؎

درسِ عرفاں کے لئے کچھ کم نہیں برگ و گیاہ
ذرّے ذرّے سے عیاں ہے جلوۂ پنہانِ حسن

ایک اچھا شاعر اپنے فن کے ذریعے فطرت اور اس کی رنگینیوں سے ایک گہرا لگاؤ پیدا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک کائنات کی ہر چیز ایک بولتی ہوئی تصویر ہے۔ وہ اپنے دل کی دنیا کو اس پھیلی ہوئی کائنات سے اس طرح وابستہ کرتا ہے کہ اس کی روح فطرت کی ہر اٹھتی ہوئی لہر کو محسوس کرتی ہے اور اس کے کان قدرت کی ہر صدا کو سنتے ہیں، گویا خارجی عالم اور اس کی باطنی دنیا میں ایک ایسا ربط نہاں ہوتا ہے جسے وہ ہمیشہ محسوس کرتا ہے اور اس احساس سے فائدہ اٹھاتا ہے حقیقی شاعر مظاہرِ فطرت کی صرف بیجان نقاشی نہیں کرتا ہے بلکہ اس میں اپنے جذبات کی وہ روح سمو دیتا ہے جس سے اس کے آرٹ ہی میں جان نہیں پیدا ہوتی بلکہ بیجان مناظرِ فطرت بھی ہمیں ذی روح نظر آنے لگتے ہیں۔

ہر اچھا شاعر مشاہدۂ فطرت سے وہ تجربات حاصل کرتا ہے جو اس کی شاعری کو بڑھاتے اور پھیلاتے ہیں۔ کلکِ فطرت کے ہر نقشِ رنگین کو وہ بغور پڑھتا ہے اور اس سے کوئی سبق لیتا ہے۔ اس جہانِ رنگ و بو کی ہر شے اس کے لئے ایک آلۂ کار ہے، مقصد نہیں۔ وہ فطرت سے اپنے مقاصد کی تکمیل کے سلسلے میں کام لیتا ہے۔ کائنات کی ہر شے اس کی غلام ہے، اسے حق ہے کہ وہ جیسے چاہے انھیں اپنے تصرف میں لائے۔ ایک بڑا فن کار قدرت کی رنگینیوں کو اپنے نقطۂ نظر کے ساتھ کچھ اس لطیف انداز میں سمو دیتا ہے کہ اس کا آرٹ حسن کی ایک تصویرِ جمیل بن جاتا ہے۔ وہ صرف مناظر کی تصویر ہی نہیں کھینچتا ہے بلکہ اپنے خونِ جگر کی رنگینیاں اس میں شامل کر کے اسے کچھ اور رنگین بنا دیتا ہے۔ میرا مدعا یہ ہے کہ وہ فطرت کی جلوہ کاریوں میں اپنی قلبی کیفیات اور اپنے ذہنی احساسات کو اس طرح تحلیل کر دیتا ہے کہ دونوں میں خطِ امتیاز قائم کرنا مشکل ہوتا ہے ؎

برگِ گل رنگیں ز مضمونِ من است
مصرعۂ من قطرۂ خونِ من است

مشاہدۂ فطرت یا مطالعۂ کائنات ہر دورِ شاعری میں کسی نہ کسی حیثیت سے موجود رہا ہے۔ اس مشاہدۂ فطرت کی اہمیت سے اسلامی ادب کو بھی انکار نہیں، لیکن چونکہ اس کا نقطۂ نظر دوسری ادبی تحریکوں سے مختلف ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک مطالعۂ فطرت ایک خاص مقصد

کے تحت ہونا چاہئے۔ تعمیر پسند ادیب کے لئے یہ روا نہیں کہ وہ ایک بجارحی کی طرح مظاہر فطرت کی پرستش کرے۔ کائنات کی ہر شے پر تصرف حاصل کرنا چونکہ ایک مسلمان کا مقصد ہے اس لئے یہ کسی طرح زیبا نہیں کہ ایک اسلامی شاعر فطرت کی کسی شے پر خواہ وہ حسن کا کتنا ہی اعلیٰ مرقع کیوں نہ ہو۔ اس طرح فریفتہ ہو جائے کہ اسے اپنے اعلیٰ نصب العین سے بھی یکسر غافل ہونا پڑے۔

اسلامی ادیب کو چاہئے کہ وہ مناظر فطرت کی اپنے آرٹ میں اس طرح نقش آرائی کرے کہ اس کا مقصد اس کا اصول اور اس کا طرز فکر ابھرا ہوا نظر آئے، اپنے الفاظ کے ذریعہ کائنات مدد کہ کا جب وہ وہ نقشا کھینچے تو اس طرح کہ اس کا نقطۂ نظر پوری وضاحت کے ساتھ عام نگاہوں کے سامنے آسکے۔ فطرت کا جب وہ مطالعہ کرے اور اس کی تصویر کشی اپنے آرٹ میں کرے تو مناظر کی نقاشی میں اس کے ذہنی رجحان کا عکس بھی ہمیں نظر آئے۔ جس طرح ایک عاشق مہجور جب چاند کو دیکھتا ہے تو اسے چاند میں رخ یار کا پرتو نظر آتا ہے۔ یوں ہی اسلامی شاعر کو آئینۂ فطرت میں اپنے تصور حیات کا عکس نظر آنا چاہئے۔ برسوں کے تحقیق و مطالعہ کے بعد اس کا جو طرز فکر اور طرز خیال بنا ہے۔ وہ اس کے دل کی گہرائیوں میں کچھ اس طرح نقش ہو جائے کہ جب وہ فطرت کی رعنائیاں اپنی تخلیقات میں پیش کرے تو مظاہر فطرت میں اس کے افکار اور اس کے جذبات و احساسات کی برقی لہر خود بخود دوڑ جائے۔ زندگی کی گوناگوں خصوصیات کا صرف اظہار کر دینا اسلامی ادب نہیں ہے بلکہ ان کی توجیہ کی جائے اور توجیہ کے ساتھ ساتھ اپنا تعمیری نقطۂ نظر بھی پیش کیا جائے، لیکن اس منزل تک ہمارا کارواں اسی صورت میں پہونچ سکتا ہے کہ اسلام پسند ادیب و شاعر کلی طور سے اپنے اندر اسلامی اصول زندگی کو جذب کر لیں اور ان کے تمام خیالات پر وہ ذہن سے اتر کر دل کی کیفیتیں بن جائیں۔ اس طرح مطالعۂ فطرت کرتے وقت ان کا ایک خاص نقطۂ نظر ہوگا، اور کائنات کے تمام جلوہ ہائے رنگا رنگ میں انہیں اپنے مقصد، اپنے اصول، اپنے احساسات اور اپنے جذبات کی کارفرمائیاں نظر آئیں گی۔ میں یہ کوئی ماورائی بات نہیں کہہ رہا ہوں یہ ایک حقیقت ہے کہ اچھا شاعر جب ایک خاص تصور زندگی کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے تو اس کی کیفیتیں اور اس کے احساسات خود بخود ایک خاص رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور اس طرح جب وہ آرٹسٹ کی حیثیت سے مناظر فطرت کی تصویر کشی کرتا ہے تو اس میں اس کے مخصوص جذبات کی نمود بھی ہوتی ہے اور یہ جذبات ان بیجان مناظر قدرت کو جاندار بنا دیتے ہیں، گویا وہ اس طرح کائنات کی ہر شے کو اپنے احساسات و جذبات میں شریک بنا لیتا ہے۔ اس کی نگاہ آئینۂ فطرت میں اپنے افکار کا حسن و جمال دیکھتی ہے۔ اسلامی ادب کی منزل یہی ہے کہ اس کی تخلیقات میں تمام فنی محاسن کے ساتھ ساتھ مقصد کی جیتی جاگتی تصویر ملے۔ مظاہر فطرت کی عکاسی بھی اس ڈھنگ سے کی جائے کہ ان میں تعمیر پسندانہ افکار اس طرح نظر آئیں جیسے سطح دریا پر موجوں کا ہجوم، لیکن اس منزل بلند تک پہونچنے کے لئے ضروری ہے کہ افکار اسلامی میں اسلامی ادیب کچھ اس طرح کھو جائے کہ اس کا تصور زندگی تحلیل ہو کر جزو نفس بن جائے اس طرح اس کے قلم سے جو بات نکلے گی اور اس کے دل سے جو آواز اٹھے گی اس میں سادگی، خلوص اور ہلکا سا گداز ہوگا۔ ایک واقعہ عرب کے مشہور شاعر فرزدق کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ "واقعۂ جمل" کے بعد وہ بصرہ میں حضرت علیؓ کے پاس آیا اس کے ساتھ اس کا نوجوان لڑکا بھی تھا، حضرت علیؓ نے اس سے کہا یہ میرا لڑکا ہے مصر کے شاعروں میں یہ ایک اچھا شاعر ہے آپ اس کا کلام سنیں۔ حضرت علیؓ نے کلام تو نہیں سنا البتہ یہ تلقین فرمائی کہ اسے قرآن کی تعلیم دو۔" حضرت علیؓ نے جو یہ تلقین فرمائی تو اس کا منشا یہی تھا کہ چونکہ تعلیمات قرآن اسلامی افکار کی آماجگاہ ہیں اگر شاعر ان افکار میں کھو جائے گا تو اس کی شخصیت کی تکمیل ایک مخصوص طرز پر ہوگی اس طرح جب اس کی شخصیت کا ایک خاص مزاج بن جائے گا تو اس کے اشعار میں اسلامی افکار اور اسلامی جذبات کا ظہور بڑے لطیف و سادہ انداز میں ہوگا۔ تکلف اور تصنع کا کوسوں تک نام نہ ہوگا۔

علامہ اقبال نے اس راز کو سمجھا انہوں نے برسوں کے تحقیق و مطالعہ کے بعد اسلامی افکار کو اپنے اندر جذب کیا۔ اسلام کی صداقت پر انہیں یقین کامل ہوا۔ وہ قرآن میں ڈوبے رہے اس کے حقائق کو انھوں نے جذب کیا اور اس طرح جذب کیا کہ وہ ان کی شخصیت کا جزو بن گئے ان کے احساسات اور ان کے جذبات پر ایک خاص رنگ چڑھ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے کلام میں اسلامی کیفیات بڑے بے تکلفانہ انداز میں خلوص و اثر کا رنگ لئے نظر آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کسی اور کی کہی ہوئی بات نہیں بلکہ ان کی ایک کیفیت قلبی ہے جسے خون جگر سے انھوں نے پالا ہے، مناظر فطرت کی جب وہ

نقاشی کرتے ہیں تو اُن میں اپنی کیفیات کا رنگ کچھ اس طرح حل کر دیتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ خارجی اشیا بھی ہم سے وہی باتیں کہہ رہی ہیں جو اقبال کے دل کی آواز ہے۔ فن کاری کی یہ بڑی اعلیٰ مثال ہے کہ کائنات کی خارجی اشیا کو جب پیش کیا جائے تو اپنے جذبات کی لہریں بھی اُن میں دوڑا دی جائیں۔

اقبال کی نظم مسجد قرطبہ کمال فن کا اعلیٰ ترین مرقع ہے اس میں صوت و گداز ہے اور خلوص و تاثر ہے، اتنی ہی بات نہیں بلکہ اس میں اسلامی تاریخ کی بہت سی داستانیں پنہاں ہیں لیکن شاعر عجیب شاعرانہ کمال سے اشاروں اشاروں میں تاریخ اور فلسفہ کی باتیں کہہ گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، وہ مری انداز میں عروج و زوالِ اُمم کی طرف اشارا کرتا ہوا عشق پر آتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ کائنات کی ہر شے کو زوال ہے، ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے، نہ جاہ و ثروت باقی رہ سکتی ہے، اور نہ شاہی و سلطانی کو بقا نصیب ہو سکتی ہے، زمانے کے دستِ جفا جُو سے دنیا میں کوئی چیز بھی باقی نہ رہی۔ اندلس جو اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا اُسے بھی زوال کا تماشا دیکھنا پڑا ؎

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبا کے عنفات
سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ! مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب، صیرفیِ کائنات
تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات

اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا

ان اشعار کے بعد شاعر کہتا ہے گو یہ صحیح ہے کہ زمانے کے ہاتھوں ہر چیز فنا ہوئی عظمتیں گمنامی کی خاک میں ملیں، ایوانِ شاہی کھنڈر بن گئے اور قوموں کے تہذیبی مرکز صفحۂ ہستی سے مٹ گئے لیکن پھر بھی ایک ایسی چیز ہے جو زمانے کے ہاتھوں کبھی بھی فنا نہ ہو سکی، بقا دوام اس کے لئے روزِ ازل سے خالقِ تقدیر نے لکھ دیا ہے اور وہ شے ہے عشق، یہ ایک اتھاہ سمندر ہے گھٹتا نہیں، بڑھتا ہی جاتا ہے، اس کی کشش زمین کی کشش سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ وہ جوہر ہے جو انسانیت کے نقش و نگار کو ہر دور میں بناتا اور سنوارتا رہا ہے ؎ ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات
اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں نت و بود

علامہ اقبال کا مقصود یہ ہے کہ مانا ہسپانیہ میں آج مسلمان نہیں ہیں لیکن عشق کی تصویر محبتِ اسلامیہ کا نمونہ، اور جاں نثارانِ ملت کی تہذیبی یادگار اب بھی موجود ہے اور وہ ہے مسجد قرطبہ۔ یہ مسجد چونے، گارے اور ڈائنیٹ پتھر کی ایک بے روح عمارت نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے مسلمانوں کے دینی جذبات احساسات چھپے ہوئے ہیں۔ اس نظم کے بعض حصے نقل کرنے سے میرا مدعا یہ تھا کہ ایک اسلام پسند ادیب و شاعر جب مناظرِ فطرت یا آثارِ کہن کا نقشہ کھینچتا ہے تو اس میں اپنے احساسات اور اپنے خیالات کی تجلیاں اس طرح دکھاتا ہے کہ اس کے نقشے کے پیچھے جو باتیں چھپی ہوئی ہیں اور جو احساسات پوشیدہ ہیں، وہ منظرِ عام پر آجاتے ہیں، اقبال کا تصورِ زندگی چونکہ سراسر اسلامی تھا۔ اس لئے انہوں نے مسجد قرطبہ کی جب تصویر کشی کی تو اس کے سنگ و خشت کی صورت میں جو اسلامی تہذیب اور اسلامی ثقافت ڈھلی ہوئی تھی اُسے بھی انہوں نے محسوس کیا اور اس تہذیبی روح کا تجزیہ کرنے کے بعد اسے بڑے فلسفیانہ اور فن کارانہ انداز میں پیش کیا اور یہ بتایا کہ اسلام کا تصورِ عشق اگر اب بھی ظہور میں آئے تو پھر ملت اسلامیہ میں وہی ولولہ پیدا ہو سکتا ہے جو آج سے پہلے مسجد قرطبہ جیسی چیزوں کی تعمیر کا ضامن بنا۔

سرزمین اندلس میں عبدالرحمٰن اوّل نے پہلے پہل جب کھجور کا درخت لگایا تھا اس پر ایک نظم کہی۔ اقبال نے اس نظم کا آزاد ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ یہ نظم یقیناً ایک ادبی شاہکار ہے۔ کھجور کے درخت کے ساتھ ایک عرب کو جذباتی حیثیت سے جو ربطِ خاص ہوتا ہے اُسے شاعر نے بڑے درد انگیز لہجے میں ادا کیا ہے اتنا ہی نہیں کہ اپنے جذبات کو ادا کر کے شاعر خاموش ہو گیا ہو۔ بلکہ بعد میں اس نے اسلام کے بعض بلند حقائق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ نظر صرف کھجور کے درخت کی مرقع نگاری نہیں ہے بلکہ اسے پڑھئے تو عربوں کا جوشِ عمل اور ولولۂ اسلام یاد آجاتا ہے، عرب اندلس میں اجنبی تھے اور یوں

ہی عبدالرحمٰن اوّل نے جو کھجور کا درخت وہاں لگایا تھا، وہ بھی اجنبی تھا۔ اس نکتہ میں شاعر نے کھجور کے درخت کو ایک جاندار مخلوق تصوّر کرکے کچھ اس طرح خطاب کیا ہے کہ وہ قلبی لگاؤ جو ایک عرب کو کھجور کے درخت سے ہو سکتا ہے پورے طور سے ہمارے سامنے آجاتا ہے ؎

میری آنکھوں کا نور ہے تو — میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دُور ہوں میں — میرے لئے نخلِ طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا — صحرائے عرب کی حُور ہے تو
پردیس میں ناصبور ہوں میں — پردیس میں ناصبور ہے تو
غربت کی ہوا میں بار ور ہو — ساقی ترا نم سحر ہو

اس کے بعد شاعر اسلام کی وہ بلند قدریں پیش کرتا ہے جو انسانیت کو ترقی کی منزل سے آشنا کرتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے مانا اندلس عربوں کا دیس نہیں، وہاں وہ اجنبی کی حیثیت سے آئے لیکن اسلام نے تو رنگ و نسل اور ملک و وطن کی ساری زنجیریں توڑ دی ہیں۔ بندۂ مومن کے نزدیک تو کبھی انسان ایک ہیں خواہ وہ یونان و روما کے ہوں یا ترکی و ایران کے۔ ذوقِ عمل اور جذبۂ تعمیر ہو تو انسان ہر دیس کو اپنا دیس بنا کر اُسے شاہراہِ ترقی پر لگا سکتا ہے۔ شاعر اس نظم کے دوسرے حصّے میں اپنے اسلامی احساسات پیش کرتا ہے ؎

عالم کا عجیب ہے نظارہ — دامانِ نگہ ہے پارہ پارہ
ہمّت کو شناوری مبارک — پیدا نہیں بحر کا کنارہ!
ہے سوزِ دروں سے زندگانی — اُٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
صبحِ غربت میں اور چمکا — ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے — مومن کا مقام ہر کہیں ہے

اقبال کو میں اسلامی شاعر اور صرف اسلامی شاعر مانتا ہوں۔ بلکہ یہ کہوں تو کچھ بیجا نہ ہوگا کہ وہ اُردو ادب میں اسلامی شاعری کے سب سے پہلے اور سب سے اچھے معمار ہیں۔ اُن کے کلام سے جو یہ دو نظمیں میں نے پیش کی ہیں اُن سے میری مراد صرف یہ تھی کہ منظر کشی تعمیری ادب میں ہونی چاہئے۔ لیکن ایک مخصوص طرزِ فکر کے ساتھ یعنی مناظرِ فطرت سے اپنے افکار کے پھیلانے میں کام لیا جائے۔ کائنات کی ہر شے پر تصرف و استیلا ایک مسلمان کا مقصد ہے یونہی ایک اسلام پسند شاعر کو چاہئے کہ نیچر کی گوناگوں رنگینیوں سے اپنے مخصوص فکری آرٹ کو بنانے اور سنوارنے میں کام لے فطرت کی ہر رنگینی اُس کے تعمیر پسندانہ آرٹ کے بڑھانے کا ایک ذریعہ ہے۔ قرآنی ادبیات نے بھی یہی طرزِ فکر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ سعدۂ ذاریات اور سورۂ مرسلات اس بات کی بہت اچھی دلیل ہیں کہ اپنے طرزِ خیال اور اپنے تصوّرِ حیات کو پیش کرنے میں کائنات کی ہر شے سے کام لیا جا سکتا ہے قرآن مطالعۂ فطرت کی دعوت ایک مخصوص انداز میں دیتا ہے۔ اسی طرح وہ منظر کشی کے سلسلے میں بھی ہمیں راہ دکھاتا ہے اور وہ یہ کہ ہم مناظرِ فطرت کو اس طرح بیان کریں کہ ان میں ہمارا جذبہ، ہمارا احساس اور ہمارا نقطۂ نظر کامل طریقے سے تحلیل ہو جائے۔ سورۂ مرسلات کے ابتدائی حصّے کا ذیل میں ترجمہ درج کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ قرآن نے اپنے مدعا کو ثابت کرنے میں کس طرح مناظرِ فطرت سے کام لیا ہے۔

ترجمہ: ——— قسم ہے ان ہواؤں کی، جو (پہلے) آندھی چھوڑ دی جاتی ہیں۔ پھر خاک اڑاتی ہیں اور (اسے) پھیلاتی ہیں۔ (بادلوں کو اپنے دوش پر اٹھا کر چاروں طرف) بکھیر دیتی ہیں پھر انہیں پھاڑ کر (ایک دوسرے سے) جدا کر دیتی ہیں۔ (اتنا ہی نہیں کرتیں بلکہ لوگوں کے دلوں میں اور قیامت اور یومِ حساب کا) خیال بھی ڈالتی ہیں۔ یہ اس لئے تاکہ اتمامِ حجت ہو جائے اور (لوگوں کو آنے والے دن سے) ڈرا دیا جائے۔ (یہ ہوائیں اس بات پر گواہ ہیں) کہ (تم سے قیامت کا) جو وعدہ کیا گیا ہے، وہ یقیناً ظہور میں آئے گا جب ستارے چھپ جائیں گے۔ آسمان پھٹ جائے گا۔ پہاڑ اڑنے لگیں گے۔ اور پیغمبروں کے لئے (اپنی اپنی امّت کے حساب کے لئے) وقت مقرر کر دیا جائے گا۔ (یہ سب کچھ جس دن ہوگا بس وہی قیامت کا دن ہے) یہ سارے واقعات کس دن پر ٹالے گئے ہیں؟ فیصلے کے دن پر۔ اُس دن منکرینِ قیامت کے لئے (سراسر) خرابی ہے۔ ہم نے اگلی (نافرمان) امتوں کو تباہ کیا، ایسے ہی ان پچھلی اُمتوں کو بھی ان کے پیچھے پیچھے بھیجیں گے مگناہ گاروں کے ساتھ ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔

کی نہایت کھلی ہوئی نشانیاں ہیں کبھی اپنے دوش پر گھٹائیں لئے اٹھتی ہیں اور پیاسی زمین کو سیراب کر دیتی ہیں۔ کبھی سمندر میں کشتیوں کو ساحل کی طرف بہائے لئے جاتی ہیں کبھی نسیمِ رحمت کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں، اور کبھی حاصب بنکر ریگستانوں سے اٹھتی ہیں اور بستیوں کی بستیاں ویران کر دیتی ہیں، سمندروں میں کبھی ایسا طوفان بپا کرتی ہیں کہ جہاز اُلٹ جاتے ہیں۔ اور کشتیاں غرقاب ہو جاتی ہیں۔ کبھی بادِ صرصر کی صورت میں بڑے بڑے درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ اور کبھی بارش کا وہ طوفان لاتی ہیں کہ شہر اور گاؤں ویران ہو جاتے ہیں۔ ہواؤں اور

ہواؤں اور بادلوں سے قرآن پاک نے قیامت کے لئے دلیل پیش کی ہے۔ یہ دونوں مناظرِ فطرت ظاہرہ

بادلوں کی یہ مختلف حالتیں ہیں۔ خدا کی قدرت و حکمت اور غلبۂ و نصرت کی ان میں نشانیاں پنہاں ہیں۔ اُس کے تصرّف میں یہ ساری چیزیں ہیں۔ وہی ہواؤں اور وہی بادل جو عام بندگانِ خدا کے لئے نویدِ رحمت بنکر آتے ہیں۔ بعض خاص قوموں کے لئے تباہی کا سامان لئے آتے ہیں۔ عاد و ثمود کی بستیاں ہواؤں اور بادلوں نے تباہ کیں، فرعون اپنی شر انگیزیوں کی بدولت دریائے نیل کی گہرائیوں میں گم ہو گیا۔ قومِ نوح کی بستیوں کو بادو باراں کا طوفان کھا گیا۔ ان تاریخی حقائق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خدا کی قوتِ قاہرہ کے تصرّف سے کوئی چیز باہر نہیں۔ جب دنیا میں بھلے اور بُرے کی سزا ملتی ہے تو بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس نظامِ ہستی کا کارساز دہ دن نہ لائے گا جب عدل و انصاف کا حقیقی مظاہرہ ہو سکے۔

میں نے سورۂ مرسلات سے جو یہ اقتباس پیش کیا ہے اور اُس اقتباس کی مختصر سی تشریح پیش کی ہے اُس سے میرا مدعا یہ ہے کہ مظاہرِ فطرت کی نری نقاشی کچھ مفید نہیں اُن میں کوئی تصوّرِ حیات پنہاں ہے اُسے ہمیں ڈھونڈھ نکالنا چاہئے۔ فطرت ایک حسین دیوی ہے۔ لیکن اُس کی پرستش ہمارے لئے زیبا نہیں۔ ورڈزورتھ کی طرح ہمیں نیچر کو معبود نہیں بنا لینا چاہئے بلکہ کائنات کے مشاہدے سے ہم جس آفاقی نظریہ کو ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ اُسے تمام اُصول و فروع کے ساتھ ہمیں پیش کرنا چاہئے۔ سورۂ مرسلات سے جو اقتباس پیش کیا گیا ہے اُس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کائنات کی ہر شے سے اپنے ذوق و معیار کے مطابق ہمیں کام لینا چاہئے جس طرح قرآن نے ہواؤں اور بادلوں سے قیامت پر استدلال کیا ہے یونہی ہر اسلام پسند ادیب اپنی صلاحیتوں کے مطابق مناظرِ قدرت سے اپنے طرزِ فکر کی اشاعت میں کام لے سکتا ہے۔

مناظرِ فطرت کی عکاسی اسلامی ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ میں نے اوپر یہ بات مثال سے ثابت کی کہ قرآن نے مظاہرِ کائنات کی تصویر کشی ہے لیکن اس طرح کہ اُس کا مخصوص تصوّرِ حیات تمام ادبی رعنائیوں کے ساتھ اُجاگر ہو سکے۔ اچھی منظر کشی کرنا کچھ آسان بات نہیں لیکن اس وقت تو یہ بات اور مشکل ہو جاتی ہے جب کہ مناظر کی صرف نقاشی ہی نہ کرنی ہو بلکہ اُن میں اپنا تصوّرِ حیات بھی پیش کرنا ہو۔ یہ فن کارانہ خوبی صرف فنِ شاعری میں کمال حاصل کر کے نہیں پیدا کی جا سکتی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسلام پسند شاعروں اور ادیبوں میں فنی شعور کے ساتھ ساتھ اپنے تصوّرِ حیات سے وہ شیفتگی، وہ لگاؤ اور وہ ربط پنہاں پیدا ہو جو کلام میں جذب و مستی کی کیفیت پیدا کرتا ہے، ادبی تخلیقات میں اگر قلب کی حرارت اور جذبات کا خلوص نہ ہو تو پھر اُس کی حیثیت چند کاغذی پھولوں سے زیادہ نہیں۔ میں تو اُس شاعری کو شاعری ماننے کے لئے تیار نہیں جو سوزِ دروں سے خالی ہو، وہ سوزِ دروں جو ایک عجلت بھرے دل کی گہرائیوں سے پیدا ہوتا ہے یہ بات اگر نہ ہو تو تعمیری ادب چاہے صوری اعتبار سے کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو لیکن زندگی کی رُوح سے یکسر خالی ہوگا۔ نغموں میں تو زندگی کی لہر اُسی وقت دوڑتی ہے جب اُن کی تربیت جنونِ عشق کی آغوش میں ہو ؎

نغمہ می باید جنوں پروردۂ ✦ آتشے در خونِ دل حل کردۂ

وہ شاعر جسے اپنے تصوّرِ زندگی سے گہرا لگاؤ ہے فطری طور سے اپنے تصوّر کی پرچھائیاں کائنات کے ہر منظر میں دیکھے گا۔ انھیں اپنے اعصاب سے وہ عشق ہونا چاہئے جس کی بدولت ادبی تخلیقات میں پُرخلوص سادگی اور پُرسوز اثر پیدا ہوتا ہے۔ اُصولِ حیات سے عشق کے معنی یہ ہیں کہ اسلام پسند شاعر کی نگاہیں فطرت کی تمام بوقلمونیوں میں اپنے تصورِ حیات کا عکس دیکھیں گی وہ تمام کائنات کو اپنے جذبات کے رنگ میں رنگ لیں اس بے جان فطرت میں اپنے جذبۂ دروں سے تعمیر پسند شعراء ایک نئی رُوح پھونک دیں اور کائنات کی تمام بے ربط چیزوں کو اپنے نقطۂ فکر سے ایک نئی ترتیب دیدیں۔

جذبات کا ارتقا مطالعہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ مطالعہ کو میں وسیع معنوں میں استعمال کر رہا ہوں وہ خواہ نیچر کا مطالعہ ہو۔ یا سماج کا مطالعہ، وہ جتنا وسیع ہوگا اُسی کے ساتھ ساتھ جذبات و احساسات میں بھی بلندی آئے گی۔ ایک تو سطحی جذباتیت ہے، ایک شاعر خوشی کے عالم میں ہے تو اُسے ساری کائنات پر ایک کیفیتِ نشاط چھائی ہوئی نظر آئے گی۔ اس جہانِ رنگ و بو کا ہر ذرہ ایک پیامِ مسرّت بن جائے گا یونہی اگر وہ غمگین ہے تو ہر شے اُسے اداس نظر آئے گی۔ صبحِ بہاراں بھی اُس کے لئے شامِ غم بن جائے گی، یہ سطحی جذباتیت ہے، اس کے فطری ہونے سے مجھے انکار نہیں لیکن میں اُس جذباتیت کا قائل ہوں جو فکری ٹھہراؤ سے پیدا ہوتی ہے کائنات کو ہم جب فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، تو ہمارے جذبات و احساسات بلند ہو جاتے ہیں، زندگی کا تصوّر جو پہلے سمٹا ہوا تھا وہ اور وسیع ہو جاتا ہے اور اس تصوّر کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ ہمارے جذبات کی سطحیت جاتی رہتی ہے۔ قرآن نے کائنات کے مشاہدے کی تلقین اسی لئے کی ہے کہ ہم ایک بسیط حقیقت کی تلاش کریں، وہ بسیط حقیقت جو اپنے پیچھے ایک دنیائے معانی رکھتی ہے۔

پروفیسر ظفر احمد صدیقی

فرائڈ کے نظریۂ تعبیر خواب پر ایک تنقیدی نظر

یہ مقالہ غالباً سب سے پہلے کلکتہ کے علامیکل میگزین میں شائع ہوا تھا۔ اردو میں "تہذیب" نے اس کو حال ہی میں شائع کیا ہے۔ فرائڈ کے نظریۂ تعبیر خواب پر فاضل مقالہ نگار کی یہ تنقید اتنی کاری ہے کہ اس کے بعد اس نظریہ کی فضولی ثابت ہونے میں کوئی بات مانع نہیں رہ جاتی۔

مقالہ نگار اور "تہذیب" دونوں کے شکریہ کے ساتھ یہ مقالہ "معیار" میں پیش کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

تعبیر خواب کا مسئلہ قدیم زمانہ سے انسان کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔ خواب کی تعبیر نے یکتا غیر معمولی ذہنی امتیاز کا ثبوت سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر ایک جدید ماہر نفسیات سے سگمنڈ فرائڈ اپنے نظریۂ خواب کے ذریعہ یہ علمی دنیا میں اپنی شہرت قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس کا نظریۂ خواب تحلیل نفس کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے جس نے اس کے نفسیاتی طریقۂ علاج کو ذہن انسانی کی گہرائیوں کی نفسیات میں تبدیل کر دیا۔ فرائڈ کے نزدیک۔ وہ ایک ایسی نئی دنیا ہے۔ جس کی اولین دریافت کا سہرا اس کے سر ہے۔ اکثر تحلیل نفسی کی ابتدا وہ مریض کے کسی قریبی خواب کے تجزیہ سے کرتا ہے۔ اگر تحلیل نفسی کے دوران میں تسلسل خیالات کی راہ میں کوئی "رکاوٹ" آجاتی ہے۔ تو تعبیر خواب سے اس کے دور کرنے میں مدد لی جاتی ہے۔ اگر مریض فرائڈ کے مصوصات کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے، تو اس کے خوابوں کی تعبیر سے اس شک کا ازالہ کیا جاتا ہے۔

فرائڈ تعبیر خواب کی بسیط تکنیک سے پڑھنے والے کو مرعوب کر دیتا ہے۔ اس کی دلچسپی کا راز اس کے نظریوں کی صداقت میں نہیں بلکہ اس حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ قدیم کاہنوں اور قسمت کا حال بتانے والوں کی طرح ایک پوشیدہ عالم اسرار سے واقفیت کا مدعی ہے۔ جن حقائق کے سامنے دوسرے اپنی واقفیت کے عجز کا اعتراف کرتے ہیں۔ فرائڈ ان کی شرح و تفسیر کی ہمت کرتا ہے۔ جو صداقت پر مبنی نہیں تو کم از کم دلچسپ اور موثر ضرور ہوتی ہے۔

اپنا آزاد رائی تحلیل نفسی کا وقار قائم رکھنے کے لئے وہ ہر نئے جزئیہ کے حل پیش کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ وہ ماہر نفسیات سے پہلے ایک پیشہ ور ڈاکٹر ہے جو اپنی خدمات کی بڑی بڑی فیسیں قبول کرتا ہے۔ اس کی مثال کسی ملک کے دفتر خارجہ کے اس مترجم کی سی ہے جس کا کسی پردیسی زبان سے اپنی ناواقفیت کا اعتراف کرنا اپنے منصب سے ہاتھ دھونے کا مترادف ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر مفروضات کو سائنس کے حقائق کی حیثیت سے پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اس سے بے نیاز معلوم ہوتا ہے کہ کب وہ سائنس کی ٹھوس سرزمین چھوڑ کر تخیلات کی غیر یقینی فضاؤں میں پرواز کرنے لگتا ہے۔ اس کے یہاں اکثر سائنس کے بھیس میں بہت سے غیر یقینی مفروضات اور توہمات چھپے ہوئے ملتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو تہذیب و تشکیک ایک سائنس داں کے لئے طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ وہی ایک ڈاکٹر کی شہرت کے لئے سم قاتل بن سکتی ہے۔ اسے اپنی تشخیص پر دوسرے کو یقین دلانے سے پہلے خود ایمان لانا ضروری ہوتا ہے۔

فرائڈ اپنی تشریحات میں سائنس کے اصول کفایت شعاری ( ) کا قائل نہیں۔ سائنس کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ کسی نظریہ کے سلسلہ میں اگر بعض ان دیکھی چیزوں کا وجود فرض کرنا پڑے تو ایسے مفروضوں کو اشد ضروری حد سے آگے نہ بڑھنا چاہئے۔ لیکن فرائڈ لاشعور (Unconscious) قبل شعور (Preconscious) مافوق النفس (Super Ego) ایڈی پس کمپلاس (Oedipus complex) رجحان مرگ

(Death Instinct) آزار رسانی (sadism) کلفت پسندی (Masochism)
اور اسی قسم کی بے شمار چیزوں کو فرض کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک سائنس داں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے دریافت کردہ قوانین کو نئے حقائق پر منطبق کرنے کی کوشش کرے۔ اور یہی ان قوانین کی صداقت یا عدم صداقت کا معیار ہوتا ہے۔ لیکن فرائڈ کو اگر کوئی ایسی نئی صورت حال ملتی ہے۔ جو اس کے کسی نظریہ پر پوری نہیں اترتی۔ تو وہ اس کے لئے فوراً ایک نیا استثنائی قانون گڑھ لیتا ہے۔ اس طرح وہ تمام ذہنی افعال کی توجیہ کر دیتا ہے لیکن ایسے بے شمار مفروضوں کے ذریعے سے جو خود محتاج جواز ہوتے ہیں۔ اس کے مفروضات ہیں اس دور کی یادلاتے ہیں۔ جب ماہر نفسیات ہر ذہنی فعل کے لئے ایک قوت (FACULTY) فرض کر کے سمجھتے تھے کہ وہ سائنس کے مطالبہ تشریح سے عہدہ برآ ہو گئے۔ یا ہم فرائڈ کی نفسیات کو فلاسفہ عقلیین (RATIONALIST) مثلاً افلاطون۔ لائبنز وغیرہ کے ان فلسفیانہ نظریوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو ایک انداز ہمہ گیری اور ہمہ دانی کے ساتھ ہر چیز کی تشریح کر دیتے ہیں لیکن اپنے دعوؤں کی کافی بنیاد نہیں رکھتے۔

فرائڈ کے نظریات سائنسی صداقتوں کے درجہ کو نہیں پہنچے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان پر کسی فیصلہ کن پرکھ (Cencial test) کی آزمائش نہیں۔ سائنس کی مفروضات (HYPOTHESIS) کی پرکھ کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ ہم ان کی بنا پر آئندہ نتائج کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ اگر یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی تو مفروضہ زیر بحث کی تصدیق ہو گئی۔ اگر غلط ثابت ہوئی تو اس کو مسترد کر دیا گیا لیکن فرائڈ کے یہاں اس قسم کی پرکھ اور تصدیق کا کوئی امکان نہیں۔ اس کے اصول کچھ ایسے دور رہتے ہیں کہ ان سے ہر قسم کے نتائج کی مطابقت ہو جاتی ہے۔ وہ ایسی دو دھاری تلوار کی مانند ہیں جو دو طرفہ کاٹ کرتی ہے۔ اگر ایک خاص نتیجہ ظاہر ہوتا ہے تو فرائڈ کے مفروضہ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اس کے بالکل برعکس نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ تب بھی اس کا مفروضہ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ اگر ایک شخص اپنے باپ سے کچھ تلخی یا رنجش رکھتا ہے تو یہ مفروضہ ایڈیپس کمپلکس کی تھیلی روئی تائید ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے باپ کے لئے اپنے دل میں بے پایاں محبت محسوس کرتا ہے۔ تب بھی یہ اسی حقیقت کا ثبوت ہے۔ [illegible] کہ باپ کے ساتھ یہ یگانگت (Identification) ماں کی محبت کا ایک پردہ ہے۔ اگر آپ خواب میں دیکھتے ہیں کہ آپ کسی کتے کو مار رہے ہیں۔ تو یہ اپنے بھائی یا کسی اور قریبی رشتہ دار کے ساتھ جذبۂ نفرت کا اظہار اور اس کو نقصان رسانی کی خواہش کی دبی دبی تسکین ہے۔ لیکن اگر آپ خواب میں دیکھتے ہیں کہ کتا آپ کو کاٹ رہا ہے۔ تب بھی یہ اس خواہش کی معکوس تسکین ہے ممکن ہے میرے ان دعووں کو مبالغہ آمیز التعقب پر مبنی سمجھا جائے۔ اس لئے فرائڈ کی تعبیر خواب کے چند نمونے پیش کرنا یہاں بے محل نہ ہوگا۔

۱ ــــ ایک شخص خواب میں دیکھتا ہے کہ اس کی اپنے ایک ایسے دوست سے مصالحت ہو گئی ہے جس سے وہ ایک عرصہ ہوا ترک تعلق کر چکا تھا اور جس سے مصالحت کی اب اس کے دل میں کوئی خواہش موجود نہ تھی فرائڈ اس خواب کو اس خواہش کا معکوس اظہار قرار دیتا ہے کہ شخص مذکور سے سارا تعلق بھی ختم کر دیا جائے۔

۲ ــــ ایک نوعمر لڑکا خواب دیکھتا ہے کہ اس کا باپ اس کو گھر دیر سے آنے پر سزا دے رہا ہے۔ فرائڈ کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑکا باپ سے ناراض ہے کہ وہ گھر ضرورت سے زیادہ جلد کیوں آجاتا ہے۔

۳ ــــ ایک نوجوان خواب دیکھتا ہے کہ اس کے بھائی نے کاروبار کا وہ حصہ بیچ دیا ہے جو اس نے (یعنی صاحب خواب نے) اپنے مستقبل کے لئے محفوظ رکھا تھا۔ فرائڈ اس کو جذبۂ خود آزادی پر محمول کرتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ خواب دیکھنے والا اپنے آپ کو ان زیادتیوں کی سزا دینا چاہتا ہے۔ جو اس نے اپنے بھائی کے ساتھ کی ہیں۔

۴ ــــ فرائڈ کی ایک مریضہ خواب دیکھتی ہے کہ وہ فرائڈ کے ساتھ اپنا معالجہ جاری رکھنے سے روک دی گئی ہے۔ اور فرائڈ اس سے خواب میں کہہ رہا ہے۔ "روپیہ۔ پیسہ کے معاملات میں کوئی رعایت نہیں کر سکتا۔" بظاہر اس خواب کو مریضہ کی کسی خواہش کی تسکین کا حیلہ ٹھہرانا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے کہ وہ علاج جاری رکھنے کی سخت آرزومند تھی لیکن فرائڈ اس قسم کی مشکلات کو کب مانتا ہے وہ اس خواب کے پردہ میں ایک اور خواہش کی تسکین ڈھونڈھ نکالتا ہے یعنی اپنے بھائی کو بچا ثابت کرنے کی خواہش جو اس علاج کے سخت خلاف تھا۔

۵ ــــ ایک عورت اپنی پندرہ سال کی لڑکی کو ایک تابوت میں مُردہ دیکھتی ہے۔ فرائڈ اس خواب کا سلسلہ لڑکی کی پیدائش سے پہلے زمانۂ حمل کے واقعات سے ملاتا ہے جبکہ اس کی ایک دفعہ اپنے شوہر سے لڑائی ہوئی تھی اور اس کی بنا پر اس کے اندر یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ اس کی ہونے والی لڑکی اس کے پیٹ کے اندر ہی مر کر رہ جائے۔

تعبیر خواب کے سلسلہ میں فرائڈ کو جب کوئی ایسی خواہش نہیں ملتی جس پر وہ خواب چسپاں کر سکے۔ تو وہ ایسا دوسرا حربہ استعمال کرتا ہے۔ یعنی ان خوابوں کو اپنا

نظریہ غلط ثابت کرنے کی خواہش پر مبنی قرار دیتا ہے۔ مثلاً ایک عورت کا خواب جو اپنے آپ کو اپنی ساس کے ہمراہ کسی تفریح گاہ کا سفر کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ (ظاہر ہے ساس کے ہمراہ تفریحی سفر پر جانا آخری چیز ہوگی جس کی ایک پورد و پیسہ عورت خواہش کر سکتی ہے) یا ایک وکیل کا خواب جس نے دیکھا تھا کہ وہ اپنے سارے مقدمے ہار گیا ہے۔ فرائڈ کے نزدیک یہ خواب صرف اس لئے دیکھے گئے تھے کہ خواب دیکھنے والے اس کے نظریۂ خواب کو غلط ثابت کرنا چاہتے تھے۔

فرائڈ کے تعبیر خواب کے تجربے کچھ اس قسم کے ہیں جن سے بچ کر مفر نہیں جا سکتا۔ مثلاً Distortion (واقعات کا غلط صورت میں ظاہر ہونا۔ Condensation متعدد کیفیتوں یا شخصیتوں کا ایک ہی نقش میں ظاہر ہونا Displacement کسی حالت کیفیت یا جذبہ کا اصل موضوع کی بجائے کسی دوسری چیز سے وابستہ ہو جانا Dramatization (خواب کے واقعات کا ڈرامائی واقعات کی شکل میں ظاہر ہونا Imersion (واقعات کا معکوس شکل میں نظر آنا Symbolization (خواب کے نقوش یا اشارات کا اپنے ظاہری معنی کے بجائے کسی پوشیدہ مفہوم پر دلالت کرنا یا کسی دوسری چیز کی قائم مقامی کرنا غرض اس قسم کے جربوں سے وہ ہر خواب کو کھینچ تان کر اپنے نظریوں سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی چیز کی پوشیدہ قیمت مقرر کر لی جائے۔ تو دینا کی کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے برابر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ آپ خواب میں اپنے کسی دشمن کو دیکھتے ہیں فرائڈ کی تکنیک سے وہ آپ کے بہترین دوستوں کو قائم مقام ثابت کیا جا سکتا ہے۔ آپ اپنے کسی ملاقاتی سے خواب میں تپاک کا اظہار کرتے ہیں۔ اصول معکوسیت کی رو سے یہ اس شخص سے انتہائی درشتی اور تلخی سے پیش آنے کی خواہش کا اظہار ہو سکتا ہے۔ آپ خواب میں اپنے آپ کو اپنے کسی دوست کے مکان پر دیکھتے ہیں۔ اشاریت کی مدد سے آپ کا یہ خواب دوست کی بیوی سے ناجائز خواہشات کا غماز قرار دیا جا سکتا ہے۔

ممکن ہے یہ مثالیں فرائڈ کی تعبیر خواب کی طرف سے آپ کے اعتماد کو متزلزل کر دیں لیکن آپ کہیں گے کہ تحلیل نفسی کے ان شواہد کا کیا جواب ہے۔ جن پر فرائڈ اپنی تعبیرات کو مبنی قرار دیتا ہے حقیقت یہ ہے کہ تحلیل نفسی کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں عام طور سے پھیلی ہوئی ہیں۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تحلیل نفسی کے دوران میں کسی مریض کے انکشافات عدالت کے سامنے کسی اقراری مجرم کے اعترافات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کے بعد کسی مزید ثبوت جرم کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ بعض ایسے ذرائع بھی ہو سکتے ہیں جن سے ایک بیگناہ شخص نا کردہ گناہوں کے اعتراف پر مجبور ہو جائے۔ یہ صورت حال پولیس کی تحقیقات میں بھی پیش آ سکتی ہے۔ اور تحلیل نفسی کے انکشافات میں بھی تحلیل نفسی کرنے والے کی شخصیت اور عظمت معمول کی زود اعتقادی تحلیل نفسی کا پراسرار ماحول اور طویل مدتیں غرض یہ سب چیزیں ملکر معمول کے اندر کسی قسم کے وہم یا خیالات کو جاگزیں کر سکتی ہیں۔ اور پھر ان کے انکشاف کا سہرا تحلیل نفسی کے سر بندھ سکتا ہے۔

تحلیل نفسی میں خیالات کا تسلسل جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا ہے۔ آزاد نہیں ہوتا۔ معمول فرائڈ کے نظریوں سے پہلے ہی کچھ واقف ہوتا ہے یا واقف ہو جاتا ہے۔ وہ ان نظریوں کی روشنی میں کچھ خاص انکشافات کی توقع کرنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ فرائڈ کی موجودگی اور تحلیل نفسی کا ماحول ہی معمول کے خیالات کی رو کو متعین کرنے کے لئے کافی ہے۔ ان حالات میں جنسی خیالات کا غیر معمولی اہمیت اختیار کر لینا ناگزیر ہے لیکن اگر کہیں معمول کے خیالات قاصر بھی رہتے ہیں تو فرائڈ مفروضہ رکاوٹ Resistance کو دور کرنے کے بہانے سے اپنی تحریک اور ہمت افزائی کے ذریعہ سے اس کے خیالات کا رخ جنسی رجحانات کی طرف موڑ دیتا ہے۔

یہ فرض کر لینا بھی صحیح نہیں کہ انسان کے خیالات کے درمیان صرف مقررہ اور محدود روابط اور رشتے ہی پائے جا سکتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ماحول کے اشارہ (suggestion) یا پیش نظر مقصد کے زیر اثر خیالات کے نئے راستے فوراً کے فوراً وجود میں آ سکتے ہیں۔ کیسے ہی بے ربط سے دو خیال ہوں۔ ذہن ان کے درمیان نئی کڑیاں دریافت کر کے ان کو متحد اور مربوط کر سکتا ہے۔ اس لئے تحلیل نفسی میں اگر ایک خیال کسی دوسرے خیال تک پہنچاتا ہے۔ تو یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ ان دونوں خیالوں میں پہلے سے گہرا ربط اور رشتہ موجود تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ ضروری نہیں کہ تسلسل خیالات ہمیں اس پامال جادہ کی طرف لے جائے۔ جس پر دل ہمارے خیالات کا سلسلہ چلا تھا۔ میں نے بعض طالب علموں پر تحلیل نفسی کا ایک دلچسپ تجربہ کیا۔ جس نے فرائڈ کے نظریۂ خواب اور اس کی تکنیک پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ معمول کو ایک کمرہ کی دھندلی روشنی میں آرام دہ حالت میں بٹھا دیا گیا۔ اور حسب ذیل ہدایات اس کو دے دی گئیں؟

"آپ نے خیال ہی میں ایک خواب دیکھا ہے کہ آپ اپنے کمرہ میں ایک رسی کے پھندے میں لٹکے ہوئے پھانسی پا رہے ہیں۔ اس خواب کو ذہن میں رکھ کر اپنے سلسلۂ خیالات کو بالکل آزاد چھوڑ دیجئے۔ بغیر کسی کوشش یا محنت

کے جو خیالات آپ کے ذہن میں آئیں ان کو بیان کرتے جائیے۔" معمول ایک آرٹ کے طالب علم تھے اور فرائڈ کے نظریوں سے واقف۔ ان کے خیالات کی رَو کا جنسی موضوع کی طرف جانا بالکل فطری تھا اور ان خیالات کی بنا پر یہ بھی بہت آسان تھا کہ فرائڈ کے نظریوں کو ان پر چسپاں کر دیا جائے۔

گویا تحلیل نفسی نے یہ ثابت کر دیا کہ متذکرہ بالا خواب ان کے پوشیدہ دبے ہوئے جنسی رجحانات کا اظہار تھا لیکن اب ذرا تجربے کے دوسرے پہلو پر غور کیجئے۔ خواب کا معمول سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ زیر بحث خواب ایک مصنف مسٹر کا خواب ہے جس کو فرائڈ نے اپنی کتاب "تعبیر خواب" میں نقل کیا ہے۔ ٹمیس کا تنگ گلا اس خواب کا محرک ہوا تھا۔ پھر بھی فرائڈ کی تکنیک نے اس کو دوسروں کے سر منڈھ دیا اور اس کے پردہ میں پوشیدہ جنسی معنی دریافت کر لئے۔ یہی اس کے اصول کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

اس کے علاوہ بعض طفلانہ قسم کے خوابوں کے متعلق فرائڈ خود تسلیم کرتا ہے کہ وہ کوئی جنسی اہمیت نہیں رکھتے۔ مثلاً۔

۱ ——— فرائڈ اپنا ایک خواب نقل کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پانی کے لمبے لمبے گھونٹ پیتے ہوئے دیکھتا ہے۔ جاگنے پر وہ پاتا ہے کہ اسے بہت شدید پیاس لگی ہوئی ہے۔

۲ ——— اپنی نوعمری کے زمانہ میں فرائڈ خواب دیکھا کرتا تھا کہ وہ بستر سے اٹھ چکا ہے۔ اور منہ دھونے کے برتن کے پاس کھڑا ہوا ہے۔ اس خواب کا سبب اس کی ترک اٹھنے کی خواہش تھی۔

۳ ——— قطب شمالی کی ایک مہم کا لیڈر اکثر خواب دیکھا کرتا تھا کہ وہ نہایت لذیذ اور پُرتکلف کھانے کھا رہا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ راشن ختم ہو چکا تھا۔ اور وہ بھوک کی شدید تکلیف میں مبتلا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ فرائڈ بجا طور پر ان خوابوں کو جنسی اہمیت سے پاک اور دوسرے اسباب پر مبنی تسلیم کرتا ہے۔ لیکن میرا دعویٰ ہے کہ اگر فرائڈ یا قطبی مہم کے لیڈر کی ان خوابوں کے ذریعے تحلیل نفسی کی جاتی تو ان خوابوں کو بھی پوشیدہ جنسی معنی کا حامل ثابت کیا جا سکتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ فرائڈ کے تجزیۂ خواب کے اصول کچھ ایسے پُرفریب ہیں کہ اُن کے مدد سے آپ ہر خواب میں جنسی رجحانات دریافت کر سکتے ہیں اور کسی کا خواب لے کر اس کو کسی دوسرے کے سر منڈھ سکتے ہیں۔

اگر انصاف اور غیر جانبداری سے کام لیا جائے تو بہت سے خواب بھی فرائڈ کے اصول تعبیر ہا پورا پورا ساتھ نہیں دیتے۔

مثال کے طور پر مارے کے خود مائد کردہ خوابوں کو لیجئے۔

۱ ——— وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ اٹلی میں ہے۔ اس کا جسم پسینہ میں تر ہے اور وہ اٹلی کی صاف شراب پی رہا ہے۔ درحقیقت اس کی پیشانی پر پانی کا قطرہ سوتے میں ڈال دیا گیا تھا۔

۲ ——— وہ خواب میں بادل کی گرج، گرمی اور ایک بحری طوفان دیکھتا ہے حقیقت میں ایک شمع کی روشنی سرخ کاغذ میں سے چھنتی ہوئی اس کے چہرہ پر ڈالی گئی تھی۔

اکثر جسمانی کیفیتیں ہمارے خوابوں کو وجود بخشتی ہیں۔ ایک شخص جو دل کے مرض میں مبتلا ہے۔ خواب میں بہت بھیانک حالات میں اپنی موت واقع ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ پھیپھڑوں کی بیماری میں مبتلا شخص اپنا دم گھٹتے ہوئے دیکھتا ہے۔ انتوں کا مریض اکثر خواب میں دانت گرتے ہوئے دیکھنے کا باعث ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ناخوشگوار یا فکرمندانہ خوابوں کا سوال ہے۔ سارا وید اور فلورنس عالم کی تحقیقات کے موجب ہمارے ۵۸ فیصدی خواب ناخوشگوار ہوتے ہیں۔ فرائڈ ان کو بھی کھینچ تان سے کسی خواہش کی درپردہ تسکین ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ عملی خواب کو کبھی سیدھے سادے اظہار پر قدر نہیں سمجھتا وہ ہمیشہ خواب پر کسی کجراہی یا حقیقت کی پردہ پوشی کا فسیہ کرتا ہے۔ لیکن جب خاص قسم کے مثلاً۔ طفلانہ خوابوں کو وہ حقیقت کا براہِ راست اظہار مان لیتا ہے۔ تو ناخوشگوار یا فکرمندانہ خوابوں میں یہی اصول تسلیم کرنے میں کون سی دشواری مانع ہے۔

حقیقت میں عالم خواب کو اگر عالم بیداری کے قوانین سے مبنی دی طور پر مختلف نہ فرض کیا جائے تو اس کی زیادہ آسان اور بہتر توجیہ ہو سکتی ہے۔ عالم بیداری میں کبھی ہماری خواہشات ہمارے تخیل کو پرواز عطا کرتی ہیں کبھی ہمارے خوب اور اندیشے ہمارے تخیلات کو صورت بخشتے ہیں۔ ایک ماں دور کسی بچے کے رونے کی آواز سنتی ہے۔ اور اس کو اپنے بچے کی آواز سمجھ کر بے چین ہو جاتی ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ بچے سے نفرت یا اس کو تکلیف میں دیکھنے کی خواہش ہی اس کے اس وہم کا باعث ہو۔ شدید محبت یا واقعی خطرہ کا امکان بھی تو اس کو وہم اور اندیشوں میں مبتلا کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک ماں خواب میں اپنے دودھ پیتا دودھ بچہ کو سخت بیمار دیکھتی ہے تو اس کی یہی تعبیر کیوں کی جائے کہ وہ اس کی موت کی خواہشمند ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کئی روز سے اس کا خط نہ آیا ہو، اور وہ محبت کی وجہ سے اس کی صحت کی طرف سے فکرمند ہو۔ اور اس کا خواب اس فکر کا براہِ راست عکس ہو۔

اس سلسلہ میں اسٹرمپل اور ڈونٹ کی رائے بہت حد تک قرینِ صحت معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے اکثر خوابوں کی تشریح عام قریب نظر (ILLUSION) کے اصول پر کی جاسکتی ہے۔ کچھ خارجی مفروضی یا محرکات جن کی صاحب خواب تک رسائی ہو سکے۔ جسمانی احساسات اور ان سے پیدا ہونے والے تصورات اور ان کے روابط۔ گزشتہ روز کی دلچسپیاں یا مہمات۔ دو ایک روز پہلے کے نقوش اور ان کے ساتھ غالب جذبات کی مختلف تناسب میں آمیزشیں یہ تمام چیزیں خواب کے متنوع اور پیچیدہ احوال کی تشریح کے لئے کافی ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ فرائڈ کا مفروضہ ہی واحد مفروضہ نہیں جس کے ذریعہ سے خواب کی تشریح کی جاسکے۔ نہ وہ دوسرے مفروضوں کے مقابلہ میں زیادہ قابل اطمینان ہے۔ فرائڈ کا نظریۂ اشاریت اس کی تعبیر خواب کا ایک، اور بہت کمزور پہلو ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ کچھ مقررہ اشکال (SYMBOLS) ہیں۔ جو ہمیشہ خواب میں مقررہ معنی رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر بادشاہ اور ملکہ والدین کو ظاہر کرتے ہیں۔ چور، ڈاکو، سانپ وغیرہ سے بھائی مراد ہوتے ہیں۔ مکان یا کمرہ عورت کی قائم مقامی کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ لیکن یہاں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اگلی خواب کبھی سیدھا اور سچا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ فرائڈ اس اعتراض کے وزن کو تسلیم کرتا ہے۔ جب، وہ ایک موقع پر خوابی اشاریت کے بارے میں لکھتا ہے "ایک شخص نہیں جانتا کہ خواب کا کوئی خاص نقش یا تصور کوئی اشاری معنی رکھتا ہے، یا اپنے ظاہری مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس اعتراف کے ساتھ نظریۂ اشاریت کی ساری بنیاد درہم برہم ہو جاتی ہے۔ اور کسی اشارہ میں کوئی یقینی مفہوم باقی نہیں رہتا۔

شاید معتقدین فرائڈ کہیں کہ خود صاحب خواب اپنی خوابی تصویروں کے اشاروں کو پہچانتا ہے۔ اس دلیل کی تردید کے لئے یہ یاد دلانا کافی ہوگا کہ فرائڈ کے نزدیک اشارات ہمارے لاشعور کی زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کو ہمارا نفس بیدار نہیں سمجھتا۔ اس لئے بیداری کی حالت میں کسی شخص کا اپنے خواب کے کسی اشارہ کے معنی کو بیان کرنا۔ اتنا ہی قابلِ شک ہے جتنی اس کے متعلق فرائڈ کی تفسیر۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے کی تحریک (Suggestion) سے بھی بعض اوقات ہمارے معصوم خیالات اشاری مفہوم اخذ کر لیتے ہیں۔ انسانی ذہن ایک بہت ہی نازک اور حساس چیز ہے۔ اس کی ایک عجیب خصوصیت ہے کہ آپ اس میں جو چیز بھی تلاش کریں گے وہ آپ کو مل جائے گی۔ یہی مشاہدہ باطن میں ضرورت سے زیادہ اشاریت کے خطرہ ہے مثال کے طور پر اگر آپ اپنے کسی گہرے دوست کے متعلق اپنی بیوفائی کا ثبوت اپنے ذہن میں تلاش کرنے لگیں تو آپ کو اس کے شواہد مل لگیں گے۔ اگر آپ اپنے دبے ہوئے جنسی الجھاؤ (COMPLEXES) کو ڈھونڈنا شروع کریں۔ تو آپ کی یہی تلاش آپ کے ذہن میں ایسے الجھاؤ پیدا کر دے گی جو پہلے نہ تھے۔ یہی حال اشارات کا ہے۔ فرض کیجئے۔ آپ کسی خاتون سے کسی سنجیدہ فلسفیانہ مسئلہ پر گفتگو کر رہے ہیں۔ اسی دوران میں کوئی آپ کو فرائڈ کے اشارات SYMBOLS یاد دلا دیتا ہے۔ اب ان کی روشنی میں جب آپ اپنی گفتگو پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو اپنے معصوم الفاظ بھی اشارات سے لبریز نظر آئیں گے۔

اب میں اپنے مضمون کو فرائڈ کی ایک دلچسپ تعبیر خواب پر ختم کروں گا جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ کس طرح وہ اپنے ذہن میں عقل سلیم اور مناسبت کی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔ ایک شخص خواب دیکھتا ہے کہ بڑے زور کا مینہ برس رہا ہے۔ سب جگہ پانی بھرا ہوا ہے۔ اندر بھی پانی ہے اور باہر بھی پانی۔ اب فرائڈ اس خواب کے اسرار کی یوں پردہ کشائی کرتا ہے۔ پانی کی زیادتی سے ہمارا ذہن (overflow) کی طرف جاتا ہے۔ ذرا سی تبدیلی سے یہ لفظ (Overfluid) کو یاد دلاتا ہے۔ (overfluid) کی بجائے (superfluid) بھی کہا جا سکتا ہے (superfluid) سے ہمارا ذہن (superfluid) (فضول غیر ضروری) کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اب فرائڈ کے بقول متذکرہ بالا خواب کا یہ سارا ریلا اس لئے امنڈا تھا کہ صاحب خواب کسی چیز کے متعلق (superfluous) یا فضول کا فتویٰ دینا چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے اس تعبیر پر آپ کے لب بھی نیم وا ہو گئے۔ اور غالباً یہی فرائڈ کی تعبیر خواب کی بہترین تنقید ہوگی۔

ابوخالد۔ایم۔اے۔

خاندانی منصوبہ بندی پر ایک نظر

اعداد آبادی کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن پر ہمارے ملک کے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں ادھر چند سال سے بڑی توجہ صرف کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں اب تک جو کچھ کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مرکزی حکومت نے بہ منصوبہ بندی کمیشن بنایا تھا اس نے معاشی منصوبہ بندی کے ساتھ انسانی پیداوار کی منصوبہ بندی کو بھی اپنے حدود عمل میں شامل کر لیا کیونکہ خیال یہ تھا کہ معاشی ناہمواری اور مشکلات پر تا بو پایا ہی نہیں جا سکتا اگر انسانی پیداوار کو متوازن کرنے اور حدود میں رکھنے کی مناسب صورت نہ نکل سکی۔

یہی تصورات تھے جن کے ماتحت مرکزی حکومت نے ضبط ولادت کی تبلیغ کے لئے بعض غیر ملکی ماہرین کی خدمات حاصل کیں اور صوبجاتی حکومتوں کے تعاون سے ایسے توسیعی خطبات Extention Lectures کا انتظام کیا گیا جن کے ذریعہ عوام وخواص کو ضبط ولادت کی ضرورت منافع اور طریقوں سے آگاہ و باخبر کیا جا سکے۔ ان ہی اغراض کے ماتحت اور منصوبہ بندی کمیشن کی سفارشات پر عمل درآمد کی خاطر ابھی چند دن ہوئے ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی ہے۔ اس کمیٹی کا نام ہے۔ Family Planning Research and Programme Committee

خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق تحقیقات اور لائحہ عمل مرتب کرنے والی کمیٹی۔ اس کے ارکان کی فہرست بہت طویل ہے اور غالب تعداد ماہرین صحت اور ڈاکٹروں کی ہے یا پھر محکمہ حفظان صحت کے اصحاب ہیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کمیٹی کے تشکیل کی غرض ایک متعین لائحہ عمل کے مطابق مرکزی منصوبہ بندی کمیشن کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانا ہے۔

سرکاری طور پر اس سلسلے میں جو کچھ کیا جا رہا ہے اس کی ایک اہم کڑی حیدرآباد میں ایک شفاخانے کا قیام بھی ہے۔ اس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ آپریشن کے ذریعہ اعضائے تناسل کو بیکار یا خارج کر دیا جائے۔ اس سلسلے سے حکومت کی خصوصی دلچسپی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ صدر آباد کے وزیر اعظم اور ان کی اہلیہ محترمہ نے بنفس نفیس اس کی افتتاحی تقریب میں شرکت فرمائی۔ البتہ اس باب میں اخباری اطلاعات خاموش ہیں کہ یہ شرکت عملی تھی یا محض زبانی ہمت افزائی تک محدود رہی۔ ایک زمانہ تھا کہ ڈاکٹر کرنل اشرف مرحوم نے وہاں ایک فاتی شفاخانہ قائم کر رکھا تھا جس میں حیدرآباد کے وہ جاگیردار داخل ہوا کرتے تھے جو ساری متاع مردانگی گیاہی کی نذر کر دینے کے بعد اس فکر میں مبتلا ہوتے کہ جنسی حیثیت سے میمونیت کی قلمکاری کے ذریعہ شہوانی خاطر اس کی تلافی کر سکیں۔ اس سے قطع نظر کہ خود ڈاکٹر صاحب کے بیان کے مطابق یہ اعادہ شباب بالعموم بڑے پیمانے پر جنسی بے اعتدالیوں کا اور نتیجہ میں مرگ عاجل کا پیش خیمہ ثابت ہوا کرتا تھا۔ بعض لوگ سوچ رہے ہونگے کہ ضبط ولادت کا جدید شفاخانہ عدم سرمایہ داری کے بندر کے عذود منتقل کرنے والے ادارے کے تضاد کے طور پر معرض وجود میں آیا ہے اور یہ بھی ایک دلیل اس بات کی ہے کہ پرولتاری کاروان اس سرزمین پر اپنی منزل سے قریب تر ہو چکا ہے ؎

وہ دیکھ سامنے ہے نشیب و فراز شوق
بڑھ اور دو قدم کہ یہ ایمن وہ طور ہے

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ ان کوششوں کا جو اس ضمن میں سرکاری سطح پر کی گئیں غیر سرکاری طور پر بھی افراد اور جماعتوں نے اس سمت میں سوچا اور عمل کیا۔ بمبئی میں ایک ادارہ خاندانی منصوبہ بندی ایسوسی ایشن کے نام سے قائم کیا گیا ہے اس کی صدر شری متی راؤ ہیں۔ دہلی کی ایک لیڈی ڈاکٹر ستیاوتی دیوی نے مذکورہ بالا عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی یہ خاتون تولیدی صلاحیت بڑھانے اور بیکار کرنے کی ماہر خصوصی ہیں ان کی تصنیف کا انگریزی کے علاوہ ہندی اور اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے اور بڑے پیمانے پر اس کی اشاعت کی جا رہی ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کا عنوان ایک اصطلاحی فریب ہے۔ (ضیاع العنادین) اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس کا تخیل معاشی ناہمواری پر قابو پانے کے ضمن میں پیدا ہوا ہے اور وہ منطقی اور فکری خلا ہے جس نے اس ساری تگ و دو کو مہمل اور مضحکہ انگیز بنا کر رکھ دیا ہے۔

جنسی وظائف کے بارے میں سائنٹیفک نقطۂ نظر کی اصلاح کی یقیناً ضرورت ہے لیکن اضافۂ آبادی کے سلسلے میں جن اندیشہ ہائے دور و دراز کا اظہار کیا جاتا ہے وہ قطعاً بے بنیاد ہیں۔ معاشی ناہمواری اور آلات غذا کا علاج اس میں ہے کہ اس مسئلے کو صحیح زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے۔ جب تک ایسا نہ کیا جائے گا مسئلہ حل نہ ہوگا اور سعی ناکام جاری رہے گی۔

جنسی وظائف کے بارے میں سائنٹیفک نقطۂ نظر کی اصلاح خارج از بحث ہے اس لئے کہ جلب منفعت اور مفاد پرستانہ اغراض کی خاطر جو شہوانی ماحول بالارادہ پیدا کیا جا رہا ہے اور عوام کی اکثریت کو پہنچنے کے لئے ان کو شہوانی حیوان بنا کر رکھ دینے کی جو جدوجہد وسیع پیمانے پر جاری ہے اس کے ہوتے ہوئے ضبط ولادت کی تبلیغ کے ذریعہ جنسی اعمال میں توازن و اعتدال کی توقع کسی فاتر العقل ہی کو ہو سکتی ہے۔ اباحت مطلقہ اور تبرج کے موجودہ ماحول میں ضبط ولادت کی ترویج زنا کاری کے لئے مزید سہولتیں تو بہم پہونچا سکتی ہے یہ سلامتی روی۔ اعتدال اور میانہ کو داری کی پروردش نہیں کر سکتی۔

خیال یہ ہے کہ آبادی بڑی سرعت سے بڑھ رہی ہے اگر اس کو فوری طور پر نہ روکا گیا تو عموماً ساری دنیا اور خصوصاً ہمارے ملک میں ایسی ناقابل علاج غذائی قلت رونما ہو جائے گی کہ اس پر قابو پانا اور یہاں کی بیشتر آبادی کو فاقہ کشی کی موت سے بچانا محال ہو جائے گا۔ اس لئے فائدہ یہی ہے کہ وہ ساعت بلانے سے پہلے اس زائد آبادی پر اس دنیا کے دروازے بند کر دیئے جائیں جو نعوذ باللہ خالق کائنات کی غیر متوازن تخلیقی پالیسی کے نتیجے میں پہلے سے صفحۂ ارض پر قابض انسانوں کے رزق کا بٹوارہ کرنے کی دھمکی دے رہی ہے۔

مرچشمۂ شاید گرفتن بہ بیل

مالتھس و نظریۂ آبادی جس پر ان اعتراضوں کی بنیاد ہے عرصہ ہوا خود مغربی ممالک میں پادر ہوا ثابت ہو چکا ہے۔ مالتھس کے معاصرین نے ہی اس کی غلطی عالم آشکارا کر دی تھی اور ثابت کر دیا تھا کہ آبادی جیسا کہ مالتھس کا خیال ہے، اضافہ میں نہیں بڑھتی بلکہ اعداد و ترتیبی کے لحاظ سے اضافہ ہوتا ہے اور انسانی نسل کی افزائش کے مقابلے میں انسانی ضروریات زندگی کی تکمیل کے ذرائع کی افزائش بہرحال اور بلاشبہ سریع السیر ہے۔

ملت غذا کے مسئلہ کو بالکل غلط زاویۂ نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ غذائی اجناس کی نایابی و گرانی اضافۂ آبادی کا نتیجہ نہیں اور اضافۂ آبادی کا حل ضبط ولادت ہو بھی تو اس پر عمل محالات میں سے ہے۔ آج کل کے اخلاقی ماحول میں ایک فیصدی بھی یہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کی ترویج کی بعض عملی تدابیر سے زنا کاری کے لئے مزید سہولتیں بہم پہونچیں گی اور ہوس پیشہ اصحاب جن کے توسن شہوت کے لئے تنگ، حالی و خالص لگام کے بجائے معمہ کا کام کرتے ہیں اس اقدام کا بڑی خندہ پیشانی سے استقبال کریں گے۔ اب تک سماج کا ڈر اور رسوائی کا خوف کسی نہ کسی درجہ میں بداطواری کی راہ روک لیا کرتا تھا اب زنان جری تو عوامی خدمت اور ملکی ضرورت کے عنوان سے ضبط ولادت کے شفاخانے میں داخل ہونے والی اور وہاں سے زنا پیشہ گی کے امکانات کی پوری صلاحیت اور افتتاح راز کے خلاف دائمی تحفظ سے مسلح ہو کر باہر آنے والی خواتین کے اتحاد سے مجلس نشاط برپا کریں گے۔ رہا قلت غذا کا اندیشہ تو اس کے لئے حافظ کا یہ شعر بالکل کفایت کرے گا۔

ہنگام تنگ دستی در عیش کوش و مستی
کاین کیمیائے ہستی قارون کند گدا را

یہ دعویٰ ہی مہمل ہے غلط ہے کہ جتنے انسان اس دنیا میں جنم لیتے ہیں ان کے تغذیہ کا سامان یہاں موجود نہیں ہے۔ زمین نے سینے میں خالق کائنات نے وہ لامحدود خزانہ ودیعت کیا ہے کہ رہتی دنیا تک وجود میں آنے والوں اور روئے زمین پر بسنے والوں کے لئے کفایت کر سکتا ہے ابھی کچھ دن ہوئے ایک انگریزی روزنامہ کے مضامین میں R. G. Hainsworth کا ایک مقالہ زمین کے آفرینہ کا سامان بہم پہونچا سکتی ہے۔ How many people can earth feed کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ مقالہ نگار نے روئے زمین کے مختلف حصوں کی پیداواری صلاحیت، زمین کے اقسام، آبپاشی کی سہولیت اور اضافۂ آبادی کی موجودہ اور آئندہ شرح سے بحث کرنے کے بعد نتیجۂ گفتگو کے طور پر آخر میں لکھا۔

دو اندکورہ بالا تخمینے کے پیش نظر یہ ظاہر ہے کہ پوری دنیا بحیثیت مجموعی طور پر موجودہ آبادی سے کہیں زیادہ کے تغذیہ کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اضافۂ آبادی کا مسئلہ زمین کے محدود ذرائع کے مقابل نہیں ہے بلکہ ان مختلف فطری و صنعتی موانع کے مقابل قدم جمائے ہوئے ہے جو ان ذرائع تک رسائی کی راہ میں حائل ہیں۔ . . . . . .

سر دست مختلف مفروضات (PRESUMPTIONS) کا تجزیہ کرنے کے بعد جن کی بنا پر ہم دنیا کی استعداد اضافہ آبادی کا ایک اندازہ کر سکتے ہیں اور غذا پیدا کرنے کی اپنی موجودہ صلاحیت اور طریق پیداوار کو ترقی یافتہ شکل دینے کے امکانات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اچھی طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ ہم موجودہ آبادی سے تین گنا زیادہ آبادی کو معقول انسان کے ساتھ غذا بہم پہنچا سکیں گے اور خیال یہ ہے کہ اضافہ آبادی کی موجودہ شرح اگر قائم رہے تو اغلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا تعداد تک پہنچنے میں ایک صدی لگے گی۔"

فی الحقیقت معاملہ یہ ہے کہ انسان نے اپنی ہوس، ہرزہ کاری اور تسخیر کائنات کا حوصلہ نہ رکھنے کے باعث اپنے ابنائے جنس پر رزق کا دروازہ بند کر رکھا ہے۔ قلت غذا کا مسئلہ کچھ نہیں مگر یہ کہ تلاش رزق اور اس کے لئے نئی راہیں نکالنے اور حاصل شدہ رزق کی منصفانہ تقسیم سے گریز اور ہمدردانہ انسانی نقطۂ نظر سے فقدان نے سارے انسانیت کے لئے اسباب حیرانی مہیا کر دیئے ہیں۔ اس کا معمولی ثبوت یہ ہے کہ دنیا کے بعض حصوں میں غذائی اجناس کا ذخیرہ وہاں کی آبادی کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے اور مصنوعی مطالبہ پیدا کرنے کے لئے سمندروں میں پھینک دیا جاتا ہے اور کہیں فاقہ کشی کے نتیجے میں اموات کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور اس سے زیادہ غمناک صورت حال یہ ہے کہ جہاں غلہ کی افراط ہے وہاں بھی شکم سیر انسانوں کے پہلو بہ پہلو ننگ و گرسنہ کی مخلوق ایڑیاں رگڑ رہی ہے۔ ایک ہی مملکت میں بسنے والوں میں آسودگی کے تبسم سے روشن چہرے بھی ہیں اور فاقہ کی ظلمت میں لڑکھڑاتے ہوئے سائے بھی۔

اس وقت بھی دنیا کی ساری آبادی اور ذخیرۂ اجناس کا جائزہ لیا جائے اور سائنٹفک تحقیقات کے نتیجہ میں افزائش غذا کے امکانات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ یقینی ثابت ہوگا کہ ان فاقہ کشی اور قحط کا شکار ہونے والے لاکھوں بے کس انسانوں کا خون اس کی ظالم اور بیدرد انسانیت پر ہے۔ پھر ہر ملک میں چور بازاری، ذخیرہ اندوزی اور نفع خوری کے براہ راست نتیجہ کے طور پر جو کچھ غذائی قلت پائی جاتی ہے اس کو بھی بآسانی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

عرصہ ہوا امریکہ کے ایک ماہر نباتات نے اپنے ایک مقالے میں ثابت کیا تھا کہ دنیا میں پائے جانے والے بے شمار اور لاتعداد نباتات میں سے صرف ایک انتہائی محدود تعداد کا علم اب تک انسان کو حاصل ہو سکا ہے۔ اور اس محدود تعداد سے بھی فائدہ بخش اور پر منفعت استعمالوں کی جانب قطعاً توجہ نہیں کی جا سکی ہے۔ اس نے مثالوں سے ثابت کیا تھا کہ نباتات کے غذائی اور غیر غذائی اجزاء کو سائنٹفک آلات کی مدد سے علیحدہ کر کے ان کو کام میں لایا جا سکتا ہے اور اس طرح ان نباتات سے اتنی مقدار میں غذا اور اتنی زیادہ دولت پیدا کی جا سکتی ہے جس کا اندازہ و قیاس مشکل ہے۔ اسی قسم کا ایک مقالہ اس وقت بھی میرے پیش نظر ہے۔ مقالہ نگار کا نام Dr. C.E.D. WINSLOW ہے۔ اس نے ضبط ولادت کو قلت غذا کا علاج قرار دینے والوں کا ذکر کرتے ہوئے طنز آمیز انداز میں لکھا ہے:

"کچھ لوگ افلاس اور قلت غذا کے خیال سے اس قدر خائف ہیں۔ کہ ان کے نزدیک موجودہ صورت حال کا واحد علاج شرح پیدائش کو سختی سے روک دینے کے سوا کچھ نہیں اور ادھر کچھ دنوں سے یہ استدلال متعدد بار ہمارے سامنے آیا کیا ہے کہ دنیا کی آبادی جنگ سے پہلے کے مقابلے میں دس فی صدی بڑھ گئی ہے اور دنیا کی آمدنی فی فرد جنگ کے پہلے کی سطح سے پانچ تا دس فیصدی نیچے آگئی ہے۔"

اس نے ان خطوں کی بھی نشان دہی کی ہے جہاں اونچی شرح پیدائش ایک مستقل خطرہ بنی ہوئی ہے یہ خطے سیلون، مصر، فارموسا، جاپان، جاوا، ہندوستان، کوریا، لاطینی امریکہ Micronecian Islands فلپائن، Puetro - Rico ترکی اور مشرق قریب ہیں۔"

اس کے اندازے کے مطابق دنیا کی آبادی ہر دس سال میں دو لاکھ کی شرح سے بڑھ رہی ہے اور یہ بات کچھ لوگوں کے نزدیک انسانی نسل کے واسطے عظیم ترین خطرہ ہے۔" وہ سوال کرتا ہے کہ شرح پیدائش سے متعلق اندیشوں کے پیش نظر وہ لوگ جو صحت عامہ کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں انسانیت کی واقعی خدمت کر رہے ہیں یا عائلی مطالبات میں اضافہ کر کے اندیشوں کو حقیقت بنانے میں مصروف ہیں؟ پھر اس سوال کا جواب وہ خود دیتا ہے:

"ہر نوجوان جو اس عمر کو پہونچنے سے پہلے مرتا ہے جب وہ اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں سے پیداوار میں اضافہ کرنے میں معاون ہو سکتا اس کی موت نہ صرف شخصی حالات اور خاندانی اہمیت کی بنا پر موجب رنج و اندوہ ہے بلکہ ایک مستقل اور ناقابل تلافی اور محسوس قومی خسارہ بھی ہے۔ یقیناً ایک بہترین معاشی اصول یہ ہے کہ غذا کو ان لوگوں پر صرف کیا جائے جو نہ محض غذا کو خرچ کریں بلکہ آگے چل کر پیداوار میں اضافے کا ذریعہ بھی ثابت ہوں۔ معیار صحت بلند کرنا سوسائٹی کے لئے موجب نقصان نہیں بلکہ پیداواری قابلیت رکھنے والے افراد کی تعداد میں اضافے کا وسیلہ ہے۔"

وہ اس رائے کی تردید کرتا ہے کہ دنیا کا غذائی ذخیرہ متعین ہے اور اس کے

بارے میں جو تخمینہ کیا جاتا ہے وہ قطعی و آخری ہے۔ وہ کہتا ہے "دنیا کا موثر غذائی ذخیرہ متعین اور غیر متغیر و جامد نہیں اور یہ ایسی مقدار بھی نہیں جس کا تعین کسی آہنی پُراسرار قانون کے ذریعہ ہوا ہو۔ جیسا کہ بعض ماہرین عمرانیات کی بحث سے مترشح ہوتا ہے"

آخر میں اس نے پیداوار میں اضافے کے امکانات سے مفصل بحث کی ہے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"پیداوار میں اضافے کے بہت سے طریقے جدید علوم زراعت نے دریافت کئے ہیں۔ مثلاً دریاؤں کے کنارے کی زمین کے کٹ کر دریا میں گرنے کو روک دینا (EROSION) ریگستانی رقبہ جات کی آب پاشی (FERTILISER) کا ترقی یافتہ استعمال اور غذائی اجناس کے مختلف نئے اقسام کی کاشت، دو دریافت وغیرہ"

اس کا خیال ہے کہ ان جدید طریقوں میں سے صرف تین کے استعمال سے کم از کم ۳۰ فیصدی اضافہ فی ایکڑ پیداوار میں صرف دس سال کے اندر ہو سکتا ہے۔

"یہ بہت خاص طور پر نوٹ کرنے کی بات ہے کہ وہ علاقے جو بہت زیادہ زراعتی ترقی کے لئے امید افزا ہیں عین وہ علاقے ہیں جو قابل علاج امراض کی زد میں ہیں اس سلسلہ میں سب سے نمایاں مثال افریقہ کی ہے جہاں ۴ پلے ملین مربع میل زمین بیکار پڑی ہے۔ اور اس صورت حال کی ذمہ داری داء النوم (SLEEPING SICKNESS) پر ہے"

"بہت سے علاقوں کے لئے جو اپنے حدود میں ضروری غذائی ذخیرہ نہیں بہم پہونچا سکتے۔ دوسرے عملی امکانات ہیں۔ مثلاً معدنی اور قدرتی پیداوار کی مبادلات، لکڑی اور مقامی صنعتوں کے ذریعہ فراہم شدہ سامان کے بتادلے میں زراعتی علاقوں سے غذائی اجناس کی بہم رسانی"

حاصل کلام یہ کہ۔

ا ـــــ اضافۂ آبادی کے مسئلہ کو قلت غذا کی مشکل سے کوئی علاقہ نہیں، بڑھتی ہوئی آبادی اور چڑھتی ہوئی شرح پیدائش کے باوجود اس مشکل پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

(ا) جدید زراعتی علوم کی دریافت۔ سائنٹفک آلات کے استعمال اور حفظان صحت کے ذریعہ پیداواری صلاحیت رکھنے والے افراد کی تعداد میں اضافے کے ذریعہ۔

(ب) ساری دنیا کے مجموعی ذخیرہ اجناس کا جائزہ لیکر اسکے مناسب منصفانہ اور انسانی ہمدردی کی بنیاد پر تقسیم کا انتظام کر کے۔

(ج) چور بازاری۔ ذخیرہ اندوزی اور نفع خوری کا قلع قمع کر کے جو محض اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ قانونی بندشوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اخلاق بلند کیا جائے اور خدا و آخرت کی باز پرس کا تصور ذہن میں اور ان دونوں باتوں کا یقین دل میں راسخ کیا جائے۔

۲ ـــــ دنیا کا معاشی ذخیرہ نہ متعین ہے اور نہ غیر متغیر و جامد اس لئے معاشی ناہمواری کا ضبط ولادت یا معاشی اصطلاح میں خاندانی منصوبہ بندی سے کوئی تعلق نہیں۔ معاشی ناہمواری کا علاج اضافہ پیداوار کی پُرعزم اور سائنٹفک جد و جہد اور پیچیدہ معاشی تطبیق میں ہے۔

۳ ـــــ خاندانی منصوبہ بندی یا ضبط ولادت کا مسئلہ دراصل حفظان صحت اور عیاشانہ نقطۂ نظر کی اصلاح کا مسئلہ ہے، مگر اس پہلو سے بھی کسی کامیابی کی توقع نہیں۔

(ا) اس غیر اخلاقی ماحول کی وجہ سے جس کی مستقل پرورش سرمایہ دارانہ نفع خوری کی ذہنیت کے ساتھ کی جا رہی ہے۔ جب تک سینما اور دوسرے تجارتی ذرائع سے جنسی محرکات کے ابھارنے کی نفع اندوزی جد و جہد کو روکا نہ جائے ضبط ولادت کی تبلیغ ایک بے نتیجہ اور ناکام سعی ہوگی۔

(ب) ضبط ولادت کے طریقوں کی ترویج سے موجودہ عیاشانہ ماحول میں زناکاری کے لئے مزید سہولتیں بہم پہونچیں گی اور صحت کا معیار بلند ہونے کے بجائے دن بدن گرتا چلا جائے گا۔

۴ ـــــ خاندانی منصوبہ بندی موجودہ حالات میں عائلی زندگی کے تحفظ کے بجائے اس کے انتشار و اختلال کا باعث بن جائے گا اور سب سے آخر میں یہ کہ WINSLOW ـــــ بالکل سچ لکھا ہے کہ

"اضافۂ غذا کے پروگرام میں محدود کر نیوالا عامل، زیادہ غذا پیدا کرنے کی جسمانی صلاحیت کے بجائے اقوام کی صلاحیت کے بارے میں یہ اہم سوال ہے کہ آیا وہ پیچیدہ معاشی تطبیق پر کتنی قدرت رکھتے ہیں تاکہ کافی پیداوار اور مناسب تقسیم ممکن ہو سکے۔"

میں ان الفاظ پر صرف اس قدر اضافہ ضروری سمجھتا ہوں کہ کوئی معاشی تطبیق اور مناسب تقسیم وجود میں نہیں آسکتی جب تک اس کی پشت پر ایک صحیح زاویۂ نگاہ اور صالح نظام فکر نہ ہو جو سارے مسائل میں مسئولیت آخرت کی جواب دہی۔ ایک خالق کے تصور اور انسانی نقطۂ نظر کی جڑیں انسانی ذہن و دماغ میں دور تک پھیلا دینے کی قدرت رکھتا ہو اس لئے فی الحقیقت

مسعود جاوید۔ بی ایس سی (عثمانیہ)

اُردو شاعری میں عورت

معاش اور جنس ایسے مسئلے ہیں جن کے صحیح حل پر کسی صحت مند معاشرے کی تخلیق اور ارتقاء کا انحصار ہے مگر صدیوں سے معاشی مسئلے کی طرح انسان کا جنسی مسئلہ بھی لاینحل ہے۔ آج تک کوئی دیرپا اور موزوں حل قابلِ استعمال مدت کے لئے کسی معاشرے کی اساس نہ بن سکا۔ معاشرے میں عورت اور مرد کی حیثیتوں کا تعین نہ ہوسکے۔ دونوں صنفوں میں سے کسی کو بھی حقیقی آسودگی نصیب نہ ہوسکی۔ عورت کی حیاتیاتی اور نفسیاتی ساخت مرد سے مختلف ہے، عورت کی صنفی خصوصیات انسانیت کی بقا کے لئے ناگزیر ہیں۔ مگر وجہ کچھ بھی ہو مرد نے عورت کی ان صنفی خصوصیات کو کمزوری پر محمول کیا۔ اسے اپنی طرح انسان سمجھنے کی بجائے صرف جنسی تسکین کا سامان بنائے رکھا۔ جدید ترین معاشرے میں بھی عورت کی صنفی خصوصیات کو کمزوری سمجھا جاتا ہے۔ نقطۂ نظر میں صرف اس قدر تبدیلی ہوئی ہے کہ اب عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کو انسانیت سے بعید فعل سمجھا جارہا ہے مگر نقطۂ نظر میں اس تغیر کی بنیاد بھی وہی عورت کی کمزوری کا تصور ہے!

برصغیر ہند و پاک کی تاریخ میں بھی عورت کی داستان۔ داستانِ مظلومیت ہے۔ رامائن اور مہابھارت کے دور سے لے کر آج تک عورت کو کبھی حقیقی حیثیت نصیب نہ ہوسکی۔ سیتا کا اغوا، رادھا کا معاشقہ دیوداسیوں سے اپسراؤں کے تصور کی تکمیل۔ ستی کا رواج۔ قدیم ہندوستان میں عورت کی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ کم و بیش یہی حالت مسلمانوں کی آمد تک رہی۔ اسلام نے معاشرے میں عورت کو منصفانہ مقام عطا کیا ہے۔ اور اسے مرد کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اصول بھی دیئے ہیں مگر اسلام کی یہ روح ہندوستان میں کم از کم روحِ عصر نہ بن سکی۔ کچھ سطحی سے تغیرات ہوکر رہ گئے۔ اور عورت کی مظلومانہ حیثیت جوں کی توں برقرار رہی۔

اُردو کے قدیم ادب میں عورت کے آنسو نہیں چھلکتے مگر اس کے باوجود یہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے وہ اس طرح کہ تلوار کے ساتھ ساتھ قلم پر بھی مرد کا قبضہ چلا آرہا ہے، اس لئے مرد نے جو بھی ادب پیدا کیا اپنے نقطۂ نظر سے پیدا کیا۔ اس میں عورت کے نقطۂ نظر کو بہت کم دخل حاصل ہے۔ ان ادیبوں کی فکر شہری فضا میں محصور تھی۔ ان میں سے اکثر درباروں سے منسلک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں مشاہدے کی وسعت نہیں ہے۔ شہروں میں عورتیں حرم سراؤں کی زینت تھیں۔ شرافت کا معیار یہی تھا کہ عورت گھر سے باہر قدم نہ نکالے۔ اس لئے ادیب کے ذہن میں شریف عورتوں کے خدوخال جذبات اور امنگوں کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ ان حالات میں طوائف کا وجود شاعروں کے لئے سب کچھ تھا۔ اسی لئے متقدمین کے شعری ادب میں جو زیادہ تر غزل پر مشتمل ہے، شہر کے شوخ سادہ لڑکوں کے سبزۂ خط اور شاہد بازاری کے خط و خال دکھائی دیتے ہیں۔

البتہ اُردو کی قدیم مثنویاں اپنے دور کی زیادہ آئینہ دار ہیں ان میں زندگی کی حرکت اور معاشرے کے تغیرات بہت واضح ہیں۔ میر حسن کی "سحر البیان" میں ایک شاہزادی کا معاشقہ بیان کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس مثنوی کے تانے بانے جنوں اور پریوں جیسے غیر فطری کرداروں سے بنے گئے ہیں مگر اس کے باوجود اس کے نسوانی کردار "بدر منیر" اور "نجم النساء" اپنے دور کی امیرانہ زندگی کی کسی حد تک صحیح عکاسی پیش کرتی ہیں۔ شہزادی بدر منیر اپنی سہیلی نجم النساء کے ساتھ ماں باپ سے علیحدہ ایک پُرشکوہ محل میں رہتی ہے۔ جہاں وہ کھل کھیلنے کے پورے مواقع حاصل ہیں۔ اتفاقاً اسی محل میں شہزادہ بے نظیر وارد ہوتا ہے۔ بدر منیر سے اس کی دوستی ہوجاتی ہے۔ اور یہ دوستی چند دنوں کی جدائی کے بعد شادی پر منتج ہوجاتی ہے۔ نجم النساء کے کردار میں بدر منیر سے زیادہ حرکت و حرارت پائی جاتی ہے۔ وہ بدر منیر سے کہیں زیادہ جہاندیدہ ہے۔ جب بدر منیر بے نظیر سے بے تکلف ہونے میں

کچھ شرم اور جھجک محسوس کرتی ہے تو وہ بدر منیر کو اس طرح ترغیب دلاتی ہے

مجھے چھو چلے تو خوش آتے نہیں — ترے ناز بے جا یہ بھاتے نہیں
مری سمت ٹک دیکھ تو ہائے ہائے — مثل ہے کہ من بھائے منڈیا ہلائے
کیا ہے اگر تو نے گھائل اسے — تو مت چھوڑ اب نیم بسمل اسے
ٹک اک حذا اٹھانہ مذکانی کا تو — مزا دیکھ اپنی جوانی کا تو
مئے عیش کا جام اب نوش کر — غم دین و دنیا فراموش کر
یہ حسن و جوانی یہ جوش و خروش — عنقور ست ایزد تو ساغر بنوش
کہاں یہ جوانی۔ کہاں یہ بہار — یہ جوبن کا عالم بھی ہے یادگار
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں — گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
سبھی یوں تو دنیا کے ہیں کاروبار — ولے حاصل عمر ہے وصل یار

ان اشعار سے نہ صرف بدر منیر اور نجم النساء کے کرداروں پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اس زمانے کی امیرانہ زندگی میں حسن انتشار کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بدر منیر ایک حسین، نازک، یاروفا، عیش کوش اور شباب کی آگ میں تپتی ہوئی دوشیزہ ہے اور نجم النساء ایک وفادار۔ ایثار پیشہ اور چالاک دوشیزہ کی دایہ۔ اب لکھنو میں انیسویں صدی میں ہندوستانی معاشرے کی رفتار انحطاط پذیر ہو گئی تھی۔ اس پستی نے عورت کی مظلومیت میں کئی گنا اضافہ کر دیا اور وہ ایک آلہ بربط بنکر رہ گئی تھی غم روزگار اس قدر بڑھ گیا تھا کہ عورت پورے اہتمام کے ساتھ وہ کانیں سجانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ محل سراؤں کی زندگی بھی کھوکھلی ہو چکی تھی۔ اوسط طبقہ جو کسی تبدیلی کو دیر سے قبول کرتا ہے اس انحطاط کی جانگسل روح کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ انہیں حالات نے غالب کو یہ کہنے پر مجبور کیا تھا

لے تازہ بازدان بساط ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوس نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

شاعر اب کچھ زندگی سے قریب تر ہونے لگے تھے۔ اگرچہ غالب کے ہاں بھی ——

آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست
دود شمع کشتہ ہے شاید خط رخسار دوست

قسم کے اشعار ملتے ہیں۔ لیکن ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جس میں قطعی طور پر صنف نازک کا بانکپن جھلکتا ہے۔

مثلاً

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے
گل فشانی ہائے ناز جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
خاک میں ناموس پیمان محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے

غالب نے اس مرثیہ نما غزل میں اپنے محبوب کو جس طرح پیش کیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک باوفا اور ناموس پر جان دینے والی عورت ہے —— ہم جنس نہیں۔

اس دور کی عورت کی نفسیات اور کردار کا بہترین تجزیہ مرزا شوق کی مثنویوں میں پایا جاتا ہے۔ شوق کی مثنوی "زہر عشق" ایک اوسط گھرانے کی شریف دوشیزہ —— اس وقت کی مروجہ قدروں پر شریف —— کی المناک داستان ہے۔ یہ کسی دو رخلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوٹھے پر سے ایک نوجوان کو دیکھتی ہے اور اس پر پہلی ہی نظر میں بری طرح عاشق ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اسے محبت کرنے کی آزادی حاصل نہیں تھی۔ وہ وہ چوری چھپے محبت کرتی ہے۔ درگاہ جانے کا بہانہ کر کے اپنے محبوب سے جا ملتی ہے مگر جب راز فاش ہو جاتا ہے تو اس کے والدین اسے بنارس بھیج دینے کی تیاری کرتے ہیں۔ "زہر عشق" کی یہ لڑکی اپنے خاندان کے جھوٹے ناموس کو بچانے کے لئے زہر کھا کر ہمیشہ کے لئے سو رہتی ہے —— اگرچہ اسے احساس ہے کہ خودکشی کی مرتکب ہو کر وہ عقبیٰ خراب کر رہی ہے مگر حالات اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ زہر کھانے سے پہلے اپنے محبوب کو جو وصیت کرتی ہے اس میں ایک مشرقی دوشیزہ کے دل کی دھڑکنیں پورے سوز و گداز کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ وہ مر رہی ہے لیکن اسے ڈر ہے کہ مرنے کے بعد محبوب کی بے اختیاری کہیں اسے رسوا نہ کر دے۔

میرے مرنے کی جب خبر پانا — یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
جمع ہو لیں سب اقربا جس دم — رکھنا اس وقت تم وہاں پہ قدم
کہے دیتی ہوں جی نہ گھبرانا تم — ساتھ تابوت کے نہ رونا تم

ہوگئے تم اگرچہ سودائی دُور پہنچے گی اس کی رسوائی

آکے رولینا میری قبر کے پاس تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس
آنسو چپکے سے دو بہا لینا قبر میری گلے لگا لینا
اگر آجائے کچھ طبیعت پر پڑھنا قرآن میری تربت پر
غنچۂ دل مرا کھلا جاتا پھول تربت پہ دو چڑھا جانا

اپنی آخری تمنا کا اظہار اس طرح کرتی ہے۔

پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو آج دل کھول کر گلے مل لو
خوب سا آج دیکھ بھال تو تم دل کی سب حسرتیں نکال لو تم
آؤ اچھی طرح سے کر لو پیار کہ نکل جائے کچھ تو دل کا بخار
حشر تک ہوگی پھر یہ بات کہاں ہم کہاں، تم کہاں، یہ رات کہاں

زہر عشق کے مطالعہ سے ایک وفا شعار، مخلص، نیک طینت، جذبات محبت سے مملو، ناموس کے لئے مرنے والی، مگر بے بس دوشیزہ کا حسین پیکر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔

اسی زمانہ میں بعض شعراء نے مرثیہ میں فرار کی راہیں تلاش کیں انہوں نے واقعۂ کربلا کی شخصیتوں کو موضوعِ سخن بنایا۔ مرثیہ میں کردار نگاری۔ تمام دوسرے اصناف سخن سے کہیں زیادہ اچھی ہے۔ اگرچہ اس کردار نگاری کا پس منظر، جذبۂ عقیدت مندی ہے مگر اس کے باوجود مرثیہ کے کردار غیر فطری نہیں معلوم ہوتے، مرثیہ میں کئی ایک نسوانی کردار ملتے ہیں مثلاً شہر بانو، زینب، سکینہ وغیرہ، چونکہ مرثیہ گو ہندوستانی تھے۔ وہ عرب کی طرز معاشرت سے بیگانہ تھے اس لئے انہوں نے ان کرداروں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ٹھیٹ لکھنؤ کے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر جہاں تک عورت کی نفسیات کا تعلق ہے اسے کامیابی کے ساتھ نباہا گیا ہے۔ انیس نے زینب کی تصویر اس طرح پیش کی ہے ؎

نیزے کے نیچے جا کے پکاری وہ سوگوار
سیدتری امو بھری صورت کے میں نثار
ماتھے پہ گلے پہ چل گئی بھیا چھری کی دھار
بھولے بہن کو اے اسد حق کی یادگار
صدقے گئی لٹائے گھر و عدہ گاہ میں
جنبش لبوں کو ہے ابھی ذکر الٰہ میں

بھیا سلام کرتی ہے، خواہر جواب دو
چلا رہی ہے دختر حیدر جواب دو
سوکھی زباں سے بہر پیمبر جواب دو
کیونکر جیے گی زینب مضطر جواب دو
جز مرگ درد ہجر کا چارہ نہیں کوئی
میرا تو اب جہاں میں سہارا نہیں کوئی
بھیا میں اب کہاں سے تمہیں لاؤں کیا کروں
کیا کہہ کے اپنے دل کو میں سمجھاؤں کیا کروں
کس کی دہائی دوں کو چلاؤں کیا کروں
بستی پرائی ہے میں کدھر جاؤں کیا کروں
دنیا تمام اجڑ گئی ویرانہ ہو گیا
بیٹھوں کہاں کہ گھر تو عزا خانہ ہو گیا

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی معاشرے میں غیر معمولی تغیرات ظہور پذیر ہوئے۔ ماضی، سیاسی، اور معاشرتی تبدیلیوں نے ہندوستانی ذہن پر نہ مٹنے والے نقوش ابھارے۔ ان اثرات اور مغربی تصورات کے امتزاج سے ایک جدید معاشرے کی داغ بیل پڑی۔ زندگی کی ان لہروں سے ادب کی دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا۔ ادیبوں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ عورت کی اصلاح کے بغیر زندگی کو خوشگوار نہیں بنایا جا سکتا۔ اس احساس کا ردِ عمل حالی کی شاعری میں سب سے پہلے دیکھا جا سکتا ہے۔ حالی نے

"اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، دنیا کی عزت تم سے ہے"

کا جو نعرہ بلند کیا تھا وہ آنے والے ادیبوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوا۔ غزل بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اب اس کا موضوع جیتی جاگتی ہنستی بولتی، سجل، چنچل، دوشیزاؤں کا سراپا ہے۔ سبزۂ خط کی حکمرانی اور طوائف کے نخروں سے غزل آہستہ آہستہ پاک ہوتی گئی۔ حالی کے بعد حسرت۔ اصغر۔ فانی۔ جگر اور فراق کی غزلیں اور تطہیر کی اچھی مثالیں ہیں۔ جدید اور نوخیز غزل گو شعراء میں حفیظ۔ ماہر۔ عدم۔ خیال۔ ناصر کاظمی۔ باقی صدیقی وغیرہ نے اپنے اشعار میں جو دل کش مورتیں تراشی ہیں ان میں سے بیشتر زندہ حقیقتیں ہیں۔ ان میں وہ دوشیزاؤں کے رخسار کی شفق، زلفوں کی خوشبو۔ حیا۔ شوخی، شرارت، اور ان کی صنفی جاذبیت کا عکس جمیل پایا جاتا ہے۔

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا
(اصغر)

کیا مرے حال پہ سچ مچ انہیں غم تھا قاصد
تو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی
(اصغر)

راہِ جنوں آسان ہوئی ہے
زلف و رخ کے سائے سائے
(جگر)

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی
(فراق)

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
(فیض)

چھپا کے چہرہ بکھیرے ہوئے گیسوؤں کو
جہانِ شوق میں وہ فتنہ گر اندھیرا ہے
(نسیم صدیقی)

اُن کی زلفیں بکھری ہوں گی
اے لوگو، یہ رات نہیں ہے
(کوثر نیازی)

غزل پھر بھی ایک محدود صنفِ سخن ہے اس میں وہ ہمہ گیری اور وضاحت کی گنجائش نہیں جو نظم میں پائی جاتی ہے۔ نظم میں عورت کی تصویر زیادہ واضح اور پُرکشش ہے۔ اردو نظم کو عورت کے موضوع کے اعتبار سے دو واضح مکاتیب میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصہ میں عورت کا جسم اپنی پوری صنفی جاذبیت کے ساتھ جلوہ گر ہے اور دوسرے حصہ میں عورت کی حرماں نصیبی، محرومی اور اس کے نازک احساسات کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ پہلے رجحان کے نمائندہ شاعر جوش ملیح آبادی اور اختر شیرانی ہیں۔ جوش نے حسین اور جوان جسموں کے ایک ایک زاویہ اور ایک ایک خط کو جاندار کشتی کے ساتھ شعر کا موضوع بنایا ہے۔ جوش کی تراشیدہ دوشیزائیں، حسین، مست شباب، صحت مند اور مثالی مرمریں پیکر معلوم ہوتی ہیں۔ ایسے مثالی پیکر جو اس دنیائے آب و گل میں پائی جانے والی دوشیزاؤں سے کہیں زیادہ حسین معلوم ہوتی ہیں اور جو قاری میں جنسی ہیجان پیدا کر سکتی ہیں۔ اس عمل میں کوئی مقصدیت نہیں سموئی گئی ہے، اسلئے سطحیت بہت جلد اُبھر آتی ہے۔

اختر شیرانی کی جذباتی رومانیت اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ انہوں نے غالباً سب سے پہلے بیباکی کے ساتھ اپنی محبوبہ کا نام لیکر شاعری کی ہے۔ اختر شیرانی کی محبوبیں ——— جسے وہ کبھی سلمیٰ، کبھی عذرا اور کبھی ریحانہ کے نام سے یاد کرتے ہیں ——— تخیلی اجزاء بھی پائے جاتے ہیں مگر یہ اجزاء اُن کی دیکھتی ہوئی اُمنگوں کے غماز ہیں۔ اُن کی محبت میں جنسی اجزاء کے ساتھ ساتھ محبت برائے محبت کی کسک بھی پائی جاتی ہے۔ ان کی عورت حسن و معصومیت کی تتلی ہے جو دنیا کے ہنگاموں کے لئے نہیں بلکہ محبت کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے، اسی لئے وہ اپنی سلمیٰ کے ساتھ شفق کے اُس پار کسی نامعلوم پُرسکون جزیرے میں زندگی بسر کرنے کے آرزومند نظر آتے ہیں۔

جہاں شام و سحر نیلی گھٹائیں گھر کے آتی ہیں
افق کی گود میں نیلم کی پریاں مسکراتی ہیں
فضاؤں میں بہاریں ہی بہاریں لہلہاتی ہیں
جہاں فطرت مچلتی ہے لچکتے آبشاروں میں
مری سلمیٰ مجھے لے چل تو ان رنگیں بہاروں میں

اکبر، اقبال اور عظمت اللہ خاں دوسرے رجحان کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں، یہ یکسر جذباتی سے زیادہ فکری ہے۔ اکبر نے مغرب زدہ اور نئی تہذیب کی دلدادہ خواتین پر بھرپور طنز کیا ہے ان کی شاعری بڑی حد تک سطحی ہے۔ اقبال نے عورت کی عکاسی نہیں کی بلکہ معاشرے میں اُس کے مناسب مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ عورت کی موجودہ حیثیت سے مطمئن نہیں ہیں ؎

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ تراشِ آذرانہ، نہ ادائے کافرانہ

وہ مانتے ہیں کہ ——— "وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ" ——— مگر ———

جو ہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود

عظمت اللہ خاں کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے عورت کی فطرت اور جذبات کے ایک ایک پہلو کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے عورت کے نقطۂ نظر سے عورت کو پیش کیا ہے۔ غالباً اردو میں یہ پہلی کامیاب کوشش ہے۔ ان کے سُریلے بولوں سے عورت کی جو تصویر مرتب ہوتی ہے وہ عورت کی بے بسی کی تصویر ہے۔ "مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا" اردو کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم میں پیت کی آگ میں جھلسی ہوئی نیک طینت لڑکی کے وفا شعارانہ احساسات کو انتہائی کامیابی کے ساتھ سمویا گیا ہے۔ یہ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے۔

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا — مرے جی کو یہ آگ لگا سی گئی
مجھے عیش یہاں کوئی پل نہ ملا — مرے جی کو یہ آگ جلا سی گئی

اس کے بعد وہ اپنی محرومی اور بے بسی کی داستان بیان کرتی ہے آخر میں کہتی ہے۔

مرا آخری وقت ہے آن لگا — کوئی اور تمہاری ہے پیاری دلہن
مجھے اب بھی تمہارا ہی دھیان بسا — نہ بنی پہ رہی ہوں تمہاری دلہن
مجھے جیتے جی پریت کا پھل یہ ملا — مرے تن کو یہ آگ لگا ہی گئی
مجھے پیار کی ریت کا پھل یہ ملا — مرے تن کو یہ آگ جلا ہی گئی

عظمت اللہ خاں کی اس نظم کے بعد ہی گیت کا تذکرہ زیادہ مناسب ہوگا۔ ہندی شاعری کے زیر اثر اردو میں گیت لکھے جاتے رہے۔ گیتوں میں صنف نازک کے احساسات کو انہیں کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ عام طور پر ان گیتوں میں کوئی برہ کی ماری۔ اپنی بے بسی کا اظہار اپنی سہیلی سے کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے یا پھر پپیہوں، بادلوں اور ہواؤں کے ذریعہ اپنے پیتم تک من کا سندیسہ بھیجنے کی کوشش کرتی ہے۔

جس رجحان کی بنیاد حالی نے رکھی تھی اور جسے اکبر۔ اقبال اور عظمت اللہ خاں نے اپنایا۔ وہ مختلف شکلوں میں، مختلف نقاط نظر کے پس منظر کے ساتھ کم و بیش جدید شعراء میں پایا جاتا ہے۔ جدید شعراء کی نظموں میں محبت کے جذبہ کے ساتھ ساتھ عورت کے مقام کو بلند کرنے کی آرزو ——— بلندی اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ——— بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ ان نظموں میں عورت کی بے بسی کا مرثیہ بھی ہے۔ مرد کے دوش بدوش چلنے کی دعوت بھی ہے اور یہ احساس بھی کہ عورت کی اصلاح کے بغیر کل قومی کو نہیں سنوارا جا سکتا۔ فیض۔ ن۔ م۔ راشد۔ مجاز۔ احسان دانش۔ شاد عارفی۔ نعیم صدیقی وغیرہ کی تخلیقات اسی رجحان کی حامل ہیں۔ ان شعراء میں سے بعض کا نقطۂ نظر اسلامی ہے ——— اقبال کی طرح ——— بعض کا مارکسی اور بعض یہ چاہتے ہیں کہ ہماری عورت مغربی عورت کے نقش قدم پر چلے یعنی توے سے نکل کر چولھے میں جا پڑے۔ ایسی نظموں کی تعداد زیادہ ہے جس میں عورت کے متعلق کوئی واضح نقطۂ نظر نہیں ملتا۔ صرف اس قدر محسوس ہوتا ہے کہ انہیں عورت کی موجودہ مظلومانہ حیثیت پر ترس آتا ہے۔ مگر وہ یہ نہیں بتاتے کہ عورت کن راہوں پر چل کر حقیقی مقام حاصل کر سکتی ہے۔ اس منصب کو مصلحین و مبلغین کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ غالباً وہ اسے شعر کا موضوع بھی نہیں سمجھتے۔ فیض کے ان اشعار کو دیکھئے۔

یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بیکار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ، حسن کی مایوس پکار
چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

اس نظم میں عورت کی مظلومیت تو ظاہر ہے مگر یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ شاعر اس بے بس دن کی آمد کا مژدہ سنا کر دلاسا دے رہا ہے فیض کا نقطۂ نظر کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ ان کا نقطۂ نظر مارکسی ہے۔ وہ اس نظم میں عورت کو اشتراکیت کی آمد کا مژدہ سنا رہے ہیں۔ وہ اشتراکیت جہاں عورت سب کچھ ہے۔ مگر عورت نہیں ہے۔

فیض نے یہ عکاسی خوب کی ہے۔

اس بام سے نکلے گا ترے حسن کا خورشید
اس کنج سے پھوٹے گی کرن رنگ حنا کی
اس در سے بہے گا تری رفتار کا سیماب
اس راہ پہ پھولے گی شفق تیری قبا کی

شعر کی تصویریں انتہائی دلنواز۔ جاندار اور ہمارے معاشرے میں عورت کی پسماندگی کی ترجمان ہیں۔ "اندیشے" بلاشبہ ایک حسن کارانہ تخلیق ہے۔

اس کی خلوت میں شفق، اس کے شبستاں میں سحر
اس کے رشتوں کے تو ذرّے بھی ہیں الماس و گہر
اس کی نظروں میں نہاں سطوت زر و سیمبر
اس کے لمحوں کی غلامی میں ہیں ناہید و قمر
وادیاں اس کی، فضا اس کی، ہوائیں اس کی
ایسے آہو کو گرفتار کروں یا نہ کروں

وہ اس قدر معصوم، بھولی بھالی اور زمانہ کے نشیب و فراز سے بیگانہ ہے کہ اسے محبت کے خارزار میں کھینچتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔ ممکن ہے وہ محبت کی راہ کی سختیاں برداشت نہ کر سکے۔

مجاز نے اپنا نقطۂ نظر اس طرح پیش کیا ہے۔

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزمالیتی تو اچھا تھا
اگر خلوت میں تو نے سر اٹھایا بھی تو کیا حاصل
بھری محفل میں آ کر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

یہ اشعار فنی اعتبار سے خاصے بلند ہیں مگر کسی واضح ایجابی نقطۂ نظر کے حامل نہیں۔ ذہنی مرعوبیت کی تخلیق ہیں۔ ان اشعار میں مغربی عورت کو سامنے رکھتے ہوئے آزادانہ اختلاط کی برائیوں سے بے خبر ہو کر پردہ دری کی دعوت دی گئی ہے۔ حالانکہ مشرقی عورت کی پسماندگی کا یہ علاج نہیں۔

نعیم صدیقی کا نقطۂ نظر ادب میں وہی ہے جو حالی اور اقبال کا تھا۔ عورت کے متعلق انہوں نے اپنے خیالات کو اس طرح ادا کیا ہے۔

بہت ہی اونچی ہے ماں کی منزل،
جو عورتیں ماں بنی ہیں اب تک،
وہ مدتوں تک ——— ۔
ہزار اکساہٹوں سے ٹوٹتی،
ہوس کے حملوں کو روکتی ہیں!
وہ اپنی عصمت کے آبگینے،
وہ پاک جذبات کے خزینے،
نگاہوں کے داؤں سے بچا کر،
گناہوں کی چھاؤں سے بچا کر،
کبھی کبھی تو کئی برس کی پہاڑ سی رات کاٹتی ہیں!
وہ ڈرتی ہیں اپنی پاسبانی، نظر بچا ایک بوسہ دے کر،
نگاہ میں کوئی راز کھل کر نگاہ سے پھر چھلک نہ جائے،
کہیں وہ عورت پنے کی خوشبو فضا کے اندر مہک نہ جائے
کبھی بھی رومانوی طریقے سے سرکا آنچل ڈھلک نہ جائے
سمیٹتی ہیں وہ اپنا دامن کہ خار و رہ سے اٹک نہ جائے
کسی دوراہے پہ کاروانِ جذبۂ جنوں کا بھٹک نہ جائے
جو آگ تخلیق کی چھپی ہے، بدن کے اندر بھڑک نہ جائے
بھرے پیالے کو تھامتی ہیں، کہیں پیالہ چھلک نہ جائے
بہار آنے سے پہلے غنچہ کوئی اچانک چٹک نہ جائے

(چڑھتا)

اس ٹکڑے میں عورت کے متعلق ایک واضح، محتاط اور صحت مند نقطۂ نظر ملتا ہے۔

برصغیر ہند کی تقسیم سے جہاں اور بہت سی آفتیں آئیں ان میں سب سے زیادہ جانگداز مصیبت مجبور اور بے دست و پا عورتوں کی جدائی، قتل، عصمت دری اور اغوا ہے۔ ادب اس تدر المناک حادثے کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ شعری ادب میں اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مختار صدیقی کی مختصر نظم "بازیافتہ" انتہائی کامیاب تصویر ہے۔

اچھا خاصا، سبک سا نقشہ — چہرہ پیلا، لباس سادہ
ماحول سے جیسے تھک چکی ہو — تنہا تنہا، بلا ارادہ
آنکھیں جو کبھی رسیلی ہونگیں — اب ان کی اداسیوں کی تہ میں
کیا کیا نہ تھے جانگسل فسانے — ہم آپ تو بے سنے ہی سہیں
طوفاں میں جو ناؤ کھو گئی تھی — پھر آن لگی ہے اس کنارے
یوں تو ہے خدا کا شکر لازم — لیکن کسے ناخدا پکارے

اسی طرح بلراج کومل کی نظم "اکیلی" ایک ننھی بچھڑی ہوئی لڑکی کے دردانگیز جذبات کی سچی پیش کش ہے۔ اس ہلکی پھلکی نظم میں فسادات کی ساری مصیبتیں سمٹ کر آگئی ہیں۔ فسادات کے موضوع پر اس سے بہتر شاید ہی کوئی نظم لکھی گئی ہو۔

اجنبی اپنے قدموں کو روکو ذرا

. . . . . .

سنتے جاؤ یہ اشکوں بھری داستاں
آج دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں
میری امّی نہیں میرے ابّا نہیں
میری آپا نہیں، میرے ننھے سے معصوم بھیّا نہیں
میری عصمت کی کرمیں نہیں،
وہ گھروندا نہیں جن کے سایہ تلے
لوریوں کے ترنم کو سنتی رہی،
پھولوں پہ ہنستی رہی،
گیت گاتی رہی،
مسکراتی رہی

. . . . . .

میری نظروں کے سمے ہوئے آئینے
میری امّی کے، ابّا کے، آپا کے اور میرے ننھے سے معصوم بھیّا کے خون میں شرابور ہیں،
آج میری نگاہوں کی ویرانیاں چند مجروح یادوں سے آباد ہیں۔
آج میری اشکوں کے سوکھے کنول میرے اشکوں کے پانی سے شاداب ہیں۔
آج میری تڑپتی ہوئی سسکیاں ایک سازِ شکستہ کی فریاد ہیں۔
اور کچھ بھی نہیں

بھوک مٹتی نہیں
تن پہ کپڑا نہیں
آس معدوم ہے

آج دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں ، آج دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں

مختار صدیقی اور بلراج کومل کی نظمیں ایسی ہیں کہ کسی مکتب فکر کا آدمی بھی اسے سراہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس جائزہ سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ عروس شعر کی دلآویزی صنفِ نازک کی مرہونِ منت ہے۔ قدیم شعری ادب میں عورت صرف محبوبہ کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ مگر جدید ادب میں اس کی مختلف حیثیتیں ملتی ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض شعراء نے معاشرے کے گھناؤنے پن کو ظاہر کرنے کے نیک ارادہ کا سہارا لے کر عورت کو سرِ بازار ننگا کیا ہے اور خود بھی ننگے ہو گئے۔ مگر ایسے شاعروں کی بھی کمی نہیں جنھوں نے معاشرے کے ناسوروں کو نشتر لگانے میں عورت سے خاصی مدد لی ہے۔ وہ اس طرح کہ ہیرے کی سنگدلی کا احساس، برگ گل کی نزاکت کے تصور سے شدید تر ہو جاتا ہے۔

بہ ایں ہمہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو کا شعری ادب مجموعی طور پر جنسیت کے دھندلکوں میں گھرا ہوا ہے حالانکہ عورت صرف جنس نہیں انسان بھی ہے۔ اس کی زندگی میں بھی اتنا ہی تنوع ہے جتنا کہ مرد کی زندگی میں۔ اس کی فطرت کے بھی بیسیوں پہلو ہیں جو مختلف ماحول میں، مختلف روپ اختیار کرتے ہیں۔ مگر ایسا ہو نہ سکا، ہمارے معاشرے میں معاشی اور نتیجتاً جنسی انتشار کے سبب، ناگزیر تھا۔ اس لئے اردو ادب عورت کی صحیح نمائندگی نہ کر سکا۔ ادب میں عورت کے دل کی دھڑکنیں اسی وقت سنائی دیں گی جب معاشرے کی بنیادیں صحت مند قدروں پر استوار ہوں اور عورت کو اس کا منصفانہ مقام حاصل ہو جائے۔

رضا علی وحشت

غزل

جفائے یار سے کہتی ہے یہ وفا میری
کہ دیکھنا ہے رہے بات تیری یا میری

بنی یہ شکل دمِ عرضِ مدّعا میری
کہ ٹپکی پڑتی تھی آنکھوں سے التجا میری

بھلا سکے نہ فریبِ سخن طرازیٔ غیر
اگرچہ یاد انھیں آتی رہی وفا میری

مرے لبوں پہ لگی تھی اگرچہ مُہرِ سکوت
مری نگاہ سے ثابت ہوئی خطا میری

تری نگہ نے ندی داد حسرتِ دل کی
ہلاکِ شانِ تغافل رہی وفا میری

تری نظر ہی کرے کشفِ مدّعا تو کرے
کروں بیانِ تمنّا مجال کیا میری

وہ جوشِ موسمِ گل تجھکو یاد ہے وحشت
بندھی ہوئی تھی گلستاں میں جب ہوا میری

شفیق جون پوری

○

غرورِ دولتِ شبنم پہ کیا وقتِ خراب آیا
کہ اِک تارا نہ باقی رہ گیا جب آفتاب آیا

سحر مایوس پہونچی، باغباں ناکامیاب آیا
چمن والو بہار آئی کہ گلشن پر عذاب آیا

وہی سعیِ عمل کا وقت تھا جب لُطفِ خواب آیا
کھلی ہے آنکھ جب اپنی کہ سر پر آفتاب آیا

لٹائیں گے زرِ گل کیا چمن والے کہ اے مالی
غریبوں کی جوانی بن کے پھولوں پر شباب آیا

بہت ناآشنا ہے امن کے مفہوم سے دُنیا
دکھادیں گے جو اپنی زندگی میں انقلاب آیا

چمن کی تیرگی پر شام سے آنسو بہاتی تھی
سحر ہونے لگی تو دیدۂ نرگس میں خواب آیا

گرے شاخوں سے مرجھا کر تو ہونٹوں کی ہنسی بھولی
اڑی بے بال و پر شبنم تو پھولوں کو حجاب آیا

وہ کیا جانے کہ کیفِ زندگی کیا چیز ہوتا ہے
ازل سے جس کے حصّے میں دلِ بے اضطراب آیا

تجھے اے بوالہوس معلوم بھی ہے قدر بربادی
یہ دُنیا جاگ اٹھی ہے جب کوئی خانہ خراب آیا

قفس ہی سے دھواں اٹھا نہ گلچیں ہی پہ آنچ آئی
گری بجلی تو میرے ہی نشیمن پر عتاب آیا

زمانے کو خدا سمجھے وہ دیوانہ ہی کہلایا
جو لیکر بزمِ ہستی میں نگاہِ انتخاب آیا

وہی بیکس کے نالے ہیں وہی مظلوم کی آہیں
غریبوں ہی کی بربادی ہوئی جب انقلاب آیا

گئی تو بھول کر بھی پھر نہ سوئے گلستاں آئی
نہ جانے کیوں چمن سے نکہتِ گل کو حجاب آیا

جمود و بے حسی میں کھو گئی تھی ذہن کی ندرت
جو میں آیا تو دنیا میں شعورِ انقلاب آیا

تلاطم ہی سے اکثر زندگی بیدار ہوتی ہے
سمندر جھوم اٹھا موجوں میں جس دم اضطراب آیا

اُسی دن سے شفیق ادبار کے آثار ظاہر ہیں
مری محفل میں جب سے جام و طاؤس و رباب آیا

ابوالمجاہد زاہد

○

راہ نہیں کچھ ایسی مشکل، ہمت ہار نہ گھبرا اے دل
دور نہیں کچھ ایسی منزل، شرط ہے لیکن جذبہ کامل

راہ میں سیل نور کے اے دل کیا ہوگی تاریکی حائل ؟
باطل ہی کی ہار ہوئی ہے جب بھی آیا حق کے مقابل

یار کی محفل سے کیوں جائیں اور کہے وحشی کیوں کہلائیں
بت اپنے کو لاکھ سجائیں، یار کی محفل یار کی محفل

آج کے ساقی ہیں وہ ساقی، پیاس نہیں بجھتی خود جن کی
لیکن حل کرنے بیٹھے ہیں تشنگیٔ رنداں کے مسائل

جتنے بھی ارباب چمن ہیں اپنی اپنی دھن میں مگن ہیں
کون گلوں کے آنسو پوچھے، کون سنے فریاد عنادل

جمہوریت کے متوالو، آنکھیں کھولو، دیکھو بھالو
لیلیٰ بھی موجود ہے اس میں یا ہے فقط محمل ہی محمل

سجدے میں ہے یار کے در پر تیرا بھی سر میرا بھی سر
سوز یقین و عشق سے خالی، تیرا بھی دل میرا بھی دل

عیش و مسرت کے دیوانے میرے مراتب تو کیا جانے ؟
عزم مرا پروردۂ طوفاں، ذوق ترا پروردۂ ساحل

میری جانِ تمنا کوثر ! سوچا کرتا ہوں میں اکثر
میری راہ جنوں میں بڑھ کر، ہو تو نہ جاؤ گی تم حائل ؟

یاس کی تاریکی میں زاہد روشن ہیں یوں کچھ امیدیں
جیسے ابر آلود فلک پر چند ستارے جھلمل جھلمل

حفیظ میرٹھی

جائیے ہو کے بے قرار کہاں
سب ہیں غمگین غمگسار کہاں

اب کے پھولوں میں وہ مہک ہی نہیں
لُٹ گئی عصمتِ بہار کہاں

دَیر کے پاس یا حرم کے قریب
ہم کریں تیرا انتظار کہاں

ہر گھڑی لب پہ ذکرِ یار تو ہے
دل میں ہر دم خیالِ یار کہاں

ایک انداز پر رہے قائم
زندگی اِتنی وضعدار کہاں

ہائے اس دورِ خود نمائی میں
پردہ داری بھی پردہ دار کہاں

درد ہی چین سے نہیں رہتا
دل میں گنجائشِ قرار کہاں

سہہ سکے بارِ آشیانہ کا
شاخِ گل اتنی پائدار کہاں

متین طارق

بیخودی میں خودی کی بات نہ کر
ایسی دیوانگی کی بات نہ کر
دوستی سب سے نبھ نہیں سکتی
ہر کہیں دوستی کی بات نہ کر
دام میں آ کے عیش و عشرت کے
یوں ہنسی دِلّگی کی بات نہ کر
موت کی راہ تکنے والوں سے
ساقیا زندگی کی بات نہ کر
منزل سوز عشق میں طارق
ہم سے آسودگی کی بات نہ کر

احمد پرویز

درد خود اپنا انتخابی ہے
جانے پھر کیوں یہ اضطرابی ہے
جلوے جلوے میں کون ہے پنہاں
پردے پردے میں بے حجابی ہے
ہمنوا ہوں گے بام و در اِک دن
میرا پیغام "الکتابی" ہے
کون گذرا، پھر ان مراحل سے
آج! ہر نقش آفتابی ہے
"صبح نو"؟ کس نے کہہ دیا پرویز!
شام غم کی یہ "سرخ تابی" ہے

اقبال نسیم عثمانی

انسانیت کی راہوں پر

کمہار کے چاک کی طرح موسموں کا پہیہ بھی گھوم رہا تھا۔ وہ گھومتا رہا۔ موسم بدلتے رہے۔ آگ برساتی ہوئی گرمیاں بھی آئیں۔ اور برکھا لٹاتی ہوئی برساتیں بھی۔ اور پھر آخر سردیوں نے بھی کسی قرض خواہ پٹھان کی طرح اپنا چھٹا چکر لگایا۔ اور سارا ملک جیسے ایک دم ٹھنڈیا گیا۔ جوان دہانوں میں ٹھنڈی ٹھنڈی سسکاریاں سکڑیں اور کافی ہاؤس کی اوگھتی ہوئی عمارتیں کچھ اس طرح چونک اٹھیں جیسے سردیوں نے اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے انہیں کے چہروں پر نے مارے ہوں۔ اور پھر یکایک تمام کافی ہاؤس جاگ اٹھے۔ اور ٹی اسٹال بھی انگڑائیاں لینے لگے۔ یہاں۔ وہاں۔ اِدھر اُدھر کتنی ہی مسکراتی ہوئی جوانیاں گرم گرم بھاپ کی طرح اڑی پھر رہی تھیں۔

میں بھی لپک کر ایک جاگتے ہوئے ٹی اسٹال کی گود میں جا بیٹھا اور دیر تک وہ گرم گرم بھاپ دیکھتا رہا۔ سونگھتا رہا کہ سامنے دیوار سے لگا ہوا بوڑھا کلاک پورے دس بار کھانسا اور میں چونک اٹھا۔

اوہ! دس بج گئے ہیں۔ مگر اجمل کا اب تک کہیں پتہ نہیں۔ کیا وہ آج بھی نہ آئے گا۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے ایک بار پھر گرے ہوئے پردوں کے اس پار جھانکا۔ جہاں دودھیا روشنی میں کچھ مل گئے سے چہرے بھاری بھاری قہقہوں کے پٹاخے چھوڑ رہے تھے۔ اور ان پٹاخوں کے اس پار چوراہے کے قریب دن بھر کے تھکے ہوئے بازاری ہنگامے" کبھی جیسے ان آوازوں سے اپنی کچی نیند میں چونک کر کروٹ بدلی۔ اور پھر سو گئے۔ نظریں بھی کچھ ٹھٹکیں اور پھر بے پاؤں ان کلبلاتے ہوئے ہنگاموں کے قریب سے گذر گئیں۔

سامنے ہی تیسرے کھمبے کے نیچے کہیں قریب ہی سے ایک دم اجمل ابھر آیا جو لمبی لمبی ڈگیں بھرتا ہوا ٹی اسٹال کی طرف آ رہا تھا۔ میرے قریب آ کر بولا "معاف کرنا۔ فرید! ذرا کچھ دیر ہو گئی" اور میں مسکرایا۔

ایک دم بھرا آیا ——— اور ہماری ٹھنڈی میز بھی کچھ گرم گرم بھاپ اگلنے لگی۔ اور پھر جیسے بوڑھے کلاک کے گلے میں پھندا لگ گیا ——— وہ ایک بار پھر زور سے کھانسا۔ اور میں چائے کا ایک گرم بیٹھا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے بولا۔ ساڑھے دس بج گئے ہیں یار ——— مگر اجمل حسب معمول اب بھی کچھ سوچ رہا تھا اور مجھے محسوس ہوا جیسے اس سوچ کے پیچھے زندگی کی کوئی بہت بڑی ٹریجڈی سر دے دے مار رہی ہو۔ آخر آج مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں اجمل کو جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

"میں تمہیں دو ماہ سے جانتا ہوں اجمل! مگر آج بھی جیسے اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ تم ایک اجمل ہو۔ جو دو ماہ پہلے ہمارے پڑوسی بن گئے تھے"

"بہت کچھ جان لیا ہے تم نے" ——— اجمل دھیرے سے مسکرایا۔ مگر اس مسکراہٹ میں بھی کسی ناپتے ہوئے مسافر کی تھکن موجود تھی ———

میں تڑپ اٹھا۔ اور پھر کچھ خفیف سا ہوتے ہوئے بولا۔

"مگر میں تمہارے بارے میں کچھ اس سے زیادہ جاننا چاہتا ہوں اجمل!"

وہ پھر مسکرایا ——— "ٹھیک ہے۔ لیکن ان ہنگاموں میں۔ ستاٹوں کا مفہوم کیسے سمجھا جا سکتا ہے دوست! ۔ میں ایک ستاٹا ہوں۔ بھیانک ستاٹا۔ ڈر ہے کہ اسے سمجھنے کی کوشش کرنے والے کہیں سمجھے ہوئے چراغ کا دھواں بن کر نہ رہ جائیں" وہ یہ کہہ کر پھر خاموش ہو گیا اور کچھ دیر دور خلاؤں میں گھورتا رہا ——— میں نے ڈرتے ڈرتے آواز دی۔

"کیا سوچ رہے ہو اجمل؟"

"کچھ نہیں۔ فرید بابو"

"نہیں کچھ تو ہے" ——— اور وہ گرم گرم سانس کا بھبکارہ چھوڑتے ہوئے بولا۔

"کچھ بھی نہیں بابو ———" اپنی کہانی کے ٹوٹے پھوٹے جوڑوں کو جوڑ رہا ہوں۔ اور نہیں سمجھتا کہ اس کہانی کا کون سا ٹکڑا تمہارے کام آ سکے گا"

وہ پھر سکوت کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ مگر میں ساحل سے ہی

موجوں کا پیچ و تاب دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی چونکا جیسے پانی نے اچھال کر اسے خود بخود سطح پر لا ڈالا ہو۔ اور پھر مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ جیون کی یہی ہستی کھیلتی زندگی کسی مٹیلے بچہ کی طرح مچل کر روٹھ جائے تو اسے کیسے منایا جاتا ہے۔ فرید بابو!"

وہ پوچھ رہا تھا لیکن میں بوکھلا کر رہ گیا۔

میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے اجمل! میں نے بے سمجھے بوجھے ایک بھونڈا سا جواب دیا۔ "تمہارے تو کیا میری بھی سمجھ میں نہیں آتا ہے بابو۔ کہ اس روٹھی ہوئی پہاڑ سی زندگی کا اب کیا بنے گا ——— ویسے تم دیکھ ہی رہے ہو کہ آج اس سوئی سی زندگی کے بھیانک اندھیروں میں چاروں طرف ابابیلیں منڈلا رہی ہیں۔ کالی۔ کالی۔ بدصورت ابابیلیں۔ لیکن بابو! کبھی اس میں جگنو چمکا کرتے تھے۔ وہ پھر خاموش ہو گیا جیسے جگنو والی بات کی اُلجھی ہوئی گتھی میں کھویا ہوا ہو۔ اور پھر اڈھیڑ بن میں پڑ رہا ہو ——— اور مجھے اس کے اس معصوم تجسس پر ترس سا آ گیا۔ کچھ دیر ہم یوں ہی گم سم بیٹھے رہے۔ آخر اجمل نے پھر سکوت توڑا۔

"ہاں تو چھ سال پہلے اس زندگی میں جگنو چمکا کرتے تھے اور میں یہ چمکتے ہوئے جگنو دامن میں چھپائے زندگی کے کتنے ہی موڑوں سے اچھلتا۔ کودتا گذر گیا ——— میرے والد فوتی کے ایک مشہور ٹھیکیدار تھے ——— ان کے انتقال کے بعد ان کا تمام کاروبار مجھے ہی سنبھالنا پڑا۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ گھر بلو کام دھندے کے لئے ایک چھوٹا دو۔ دو۔ مامائیں۔ ایک بھونڈی دوسری چھمیا۔ جوان جہان ——— چوڑی چکلی ——— جیسے چکی کے پاٹ۔ جیسے کوارٹروں کی جوڑی ——— ڈیوڑھی پر کلوا دادا۔ بیچوں بیچ بانس کی کھٹیا پر آتی جاتی پالتی مارے حقہ کی گڑگڑاہٹ میں بوڑھی کھانسی کی خرخراہٹ گھلتے رہتے۔ پھر ڈیوٹی کے ایسے پکے کہ مجال تھا جو چوہے کا بچہ بھی بغیر اجازت گھر میں گھس جائے۔ ادھر گھر میں بوڑھی والدہ۔ ان سب پر حکم چلاتیں۔ بھونڈی اور چھمیا لگ لپٹ کر گھنٹوں میں سارا کام کاج نبٹا دیتیں۔ اماں کو "مسرو" کا چوڑی دار پاجامہ۔ گھیر دار کلیوں کا کرتہ بہت پسند تھا۔ چنانچہ میلے۔ کچیلے غرارہ میں لپٹی ہوئی چھمیا کو بھی وہ چوڑی دار پاجامہ کے روا پتی خواہ سمجھا کرتی تھیں ——— اور میں ان کا یہ مولویانہ لیکچر سنکر مسکرا دیتا۔ وہ ایک دم غراتیں ——— ہنستا کیا ہے اجمل! میں اپنی دلمن کو بھی یہ دانتے نیٹنوں جیسے گھگرے کبھی نہ پہننے دوں گی۔ جس سے بھلی مانس شریف زادیاں بھی موئی رنڈیاں سی آتی ہیں"۔ اور مجھے اجمل کی اس لڑکپنی پر ہنسی سی آ گئی۔ سامنے بیرا چائے کا بل لئے کھڑا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور دو روپے کے پورے ایکیسو اٹھائیس پیسوں سے اس کی طشتری لبالب بھر دی۔ کہانی پھر بکائی میکس کی طرف دوڑی اور اجمل نے کہنا شروع کیا۔

ایک دن خلاف معمول اماں کو میں نے کچھ اداس سا پایا۔ ایک دم ماتھا ٹھنکا۔ اللہ خیر کرے۔ آج کیا معاملہ ہے۔ قریب آتے ہوئے لڑیاتے ہوئے پوچھا۔ کیا بات ہے اماں! کچھ نہیں بیٹا! سوچ رہی ہوں۔ خدا بخشے تیرے باپ کو تیرے بیاہ کا کتنا چاؤ تھا لیکن ابھی سہرے کے پھول بھی نہ کھلے تھے کہ وہ خدا کو پیارے ہو گئے۔ میرے بھی پکے پان ہیں بیٹا! آج مری کل دوسرا دن۔ چاہتی ہوں کہ اپنے چاند کے لئے کوئی چاند سی دلمن بیاہ لاؤں"۔ میں مسکرایا۔ اماں! تم نے بھلا فکر کیا ابھی تو تمہیں اپنے پوتوں کے سہرے گوندھنے ہیں"۔ وہ بھی مسکرا دیں۔ اور پھر ایک پیار بھرا تھپڑ جماتے ہوئے بولیں۔ بس زیادہ باتیں نہ بنا۔ اب مجھے جلد ہی تیری شادی کرنی ہے۔ انسپکٹر انسپکٹر صاحب سے بات طے ہو گئی ہے۔ بڑی چاند سی لڑکی ہے ان کی۔ اور پھر اماں نے ہزاروں پر پانی پھیر کر بڑی دھوم دھام سے میری شادی رچائی۔ انسپکٹر صاحب کی لڑکی سکہ واقعی چاند سی لڑکی تھی۔ حسین و نازک جیسے ریڑ کی گڑیا۔ جیسے موم کی مریم۔

اور پھر اپنے اخلاق و عادات سے اس نے تمام گھر والوں کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔ اماں۔ ہزاروں جان سے اس پر واری جاتیں۔ اور میں یہ سب کچھ دیکھتا اور پھولا نہ سماتا۔ مجھے اس سے ایک غیر معمولی محبت ہو چکی تھی۔ چنانچہ اکثر اسے پیار سے روحی کہا کرتا اور وہ مسکرا دیتی۔ اور مجھے محسوس ہوتا جیسے پانی میں ڈوبے ہوئے تمام کنول کھل اٹھے ہوں۔ اسی طرح ہنستے اور مسکراتے پورا ایک سال گذر گیا خوشی اور مسرتوں کا ایک سال۔ اور پھر یکایک وہی ابھرے ابھرے پھول ایک دم پانی میں بیٹھ گئے۔ ملک میں انقلاب آیا۔ دیش کا بٹوارہ ہوا اور بہت سے مضبوط اور توانا دل بند پانی پر تھی ہوئی کائی کی طرح پھٹنے لگے۔ پھوڑوں نے پک کر مواد اگلا اور ملک میں چاروں طرف گندگیاں پھیل گئیں۔ دھیرے دھیرے یہ گندگیاں اڑتی رہیں۔ پھیلتی رہیں۔ اور کتنے ہی پاک و صاف چہرے ان کی نجاستوں سے بھر گئے۔ پھر کچھ سند بھڑتے ہوئے گندے اور غلیظ چیتڑ سے ہوا پا کر ایک دم بھڑکے اور جیسے ساری دنی میں آگ لگ گئی ہو۔ انسانیت جلتی رہی۔ لیکن انسانوں کی اس بھری دنیا میں کوئی بھی شریف ان پر ایک بوند پانی

نہ ٹپکا سکا۔ کلواداد اور تاا اور کانپتا ہوا میرے پاس آیا۔ سی۔ سی۔ سرکار! بلوائی۔ وہ خون سے گھگیا رہا تھا۔ آپ بھاگ جائیے۔ سرکار۔ خدا کے لئے جلد بھاگ جائیے۔ اس نے مشکل جملہ پورا کیا۔ اور میں نے ایک دم اماں کی طرف دیکھا۔ پھر روحی پر نظر ڈالی۔ وہ دونوں سجدہ میں پڑی دعا مانگ رہی تھیں بلوائی۔ بالکل قریب آچکے تھے۔ مجھے اپنی اور سارے خاندان کی موت سامنے ہی نظر آرہی تھی۔ پھر بھی اللہ کا نام لیکر۔ اماں کو گود میں اٹھایا۔ روحی کا ہاتھ پکڑا۔ اور حویلی کے پچھلے دروازہ سے بھاگ جانا چاہا۔ لیکن اس گیٹ پر بھی بلوائیوں کا قبضہ تھا۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ گھبرا کر پیچھے کی طرف لوٹنا ہی چاہا تھا کہ سر پر تابڑ توڑ لاٹھیاں برسیں۔ اور سر پھٹتے ہی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ جیسے کوئی دم میں میری جگمگاتی دنیا تاریک ہوا چاہتی ہو۔ ٹمٹماتے ہوئے جگنو تھک تھک کر گر رہے تھے لیکن ابابیلیں ویسی ہی منڈلاتی رہیں۔ اماں کی بوڑھی آنکھوں اور روحی کی جوان پیشانی پر خون کانپ اٹھا۔ میں نے گھبرا کر دونوں کو سینہ سے لگانا چاہا۔ کہ سامنے ہی ایک خنجر بکف آدم خور نے روحی کو بھوکے کتے کی طرح گھورا۔ شکاری باز کی طرح جھپٹا۔ اور جھپاک سے اپنے خونخوار پنجوں میں دبا بھاگا۔ روحی چلائی اور میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ قریب ہی سے ایک دوسرا ہاتھ ابھرا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے۔ بوڑھی اماں ایک دل دوز چیخ کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گئیں۔ میں تڑپ کر ان پر جھکا کہ کوئی نوک دار چیز کمر کو چھیدتی ہوئی سینہ کے پار نکل گئی۔ میں ذبح کئے جانور کی طرح زمین پر تڑپتا رہا۔ اور کوئی میری تڑپ نہ دیکھ سکا۔ ماں کی مامتا ہمیشہ کے لئے سو چکی تھی۔ مگر ان سوئی ہوئی مٹھی بھر ہڈیوں کے سرہانے شیطانیت اپنا ننگا ناچ ناچتی رہی۔

یہ کہتے کہتے اجمل آبدیدہ ہو گیا۔ اور جیسے پانی کی سطح پر بہتے ہوئے بجھے بجھے چراغ پھر پانی میں ڈوب گئے۔ میں بھی رونے لگا۔ اجمل بھی روتا رہا اور کچھ دیر دم توڑتی ہوئی انسانیت کا رونا رو کر اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"فرید بابو! میں کچھ دیر زمین پر تڑپتا رہا۔ اور پھر نہ جانے کب بیہوش ہو گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں، ہاں جب ہوش آیا تو میں سرکاری ہسپتال میں درد سے کراہ رہا تھا۔ کہ یکایک ماؤف دماغ کی سطح پر سینما کے پردہ کی طرح اس رات کے ہولناک مناظر ابھر آئے۔ اور میں چیخنا رہا۔ اماں! اماں! مجھ سے بولو تمہیں تمہاری مامتا کا واسطہ۔ روحی! دیکھو میں تمہارا اجمل ہوں۔ مجھ سے نہ روٹھو۔ مگر مجھ سے کوئی بھی نہ بولا۔ شاید میرے مقدر کی طرح یہ بھی مجھ سے روٹھ چکے تھے۔ اور پھر کچھ دن بعد جسم کے تمام زخم بھر گئے لیکن دل کا ناسور اب بھی ہرا تھا۔ مہینوں تمام دلی کی خاک چھانتا پھرا۔ ایک ایک در سے دیوانہ وار روحی کا پتہ پوچھا۔ مگر وہ لاپتا تھی۔ اب میرا گھر تھا اور نہ کوئی گھر والے۔ کئی بار گھبرا کر خودکشی کرنی چاہی۔ مگر روحی کے معصوم تصور نے جیسے ہاتھ تھام لیا۔ "میں ابھی زندہ ہوں میرے سرتاج"۔ اور ایک دم بجھتے ہوئے چراغ کی لو پھر کچھ ابھر آئی جس کی مدھم اور پھیکی روشنیوں کے اس پار کوئی متحرک سایہ پکارتا رہا۔ مگر میں اس کے پاس تک نہ جا سکا۔ ہاں البتہ ان زندہ لاشوں کو کیمپ میں ضرور پہونچا دیا گیا۔ جو زندگی اور موت کے دوراہے پر پڑی ہوئی اب بھی جئے جانے کا الزام سہہ رہی تھیں۔ اور پھر یہاں سے یہ تمام زندہ لاشیں کسی بیوپاری کے کچے مال کی طرح اسپیشلوں میں بھر بھر کر پاکستان پہونچا دی گئیں۔ بدلہ میں اُدھر سے بھی کچھ ایسا ہی کچا پکا مال آرہا تھا۔ جو دساوری ہوتے ہوئے بھی دیش میں نہ کھپ سکا۔ شاید وہاں بھی بھارت کی طرح آدمیوں کا بازار مندا تھا۔ ویسے ہندو پاک دونوں زراعتی ملک ہیں۔ جہاں غلوں سے زیادہ آدمی اُگتے ہیں۔ اور برسات سے پکی فصل کی طرح کاٹ دیئے جاتے ہیں اور پھر بھوکے آدم خور آدمی ہی انھیں کھاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے۔ یہ کہہ کر اجمل ایک دم خاموش ہو گیا۔ اور مجھے یہ محسوس ہوا جیسے میرے گلے میں کچھ بھاری بھاری کھٹی کھٹی ڈکاریں پھنسی رہ گئی ہوں گھبرا کر آنکھیں ملیں۔ چپکے چپکے گلا سہلایا۔ اور اجمل کی طرف کنکھی باندھے دیکھتا رہا۔ کچھ تو تنفس کے بعد وہ پھر بولا۔ "فرید بابو! آخر ہم بھارت سے پاکستان آگئے۔ اور ہمیں تعجب ہوگا کہ انسانوں کے اس پاک دیش میں بھی بھارت کی طرح آدمیوں کی فصل کٹ رہی تھی۔ مگر یہاں کاٹنے والے ہاتھ بدلے ہوئے تھے۔ اور آدم خوروں کے چہرے بھی۔ میں اب تک آدمی تھا صرف آدمی لیکن انتقام کے بھڑکتے ہوئے جذبات کہہ رہے تھے۔ اجمل! تو بھی آدم خور بن جا۔ اور شاید کچھ دن بعد میں آدمی نہ رہ سکا۔ لاہور کے جس محلہ میں اور بھارت کے اجڑے ہوئے میرے کچھ ساتھی آباد تھے۔ وہاں چرن سنگھ نام کا ایک ہندو بھی معہ اپنے بیوی اور بچوں کے رہتا تھا۔ اس کے چھوٹے سے خاندان میں کتنے افراد تھے یہ تو یاد نہیں۔ ہاں

البتہ ان کی ایک جوان لڑکی پریتما اب تک یاد ہے۔ بالکل روحی جیسی۔ گول سا مُنہ بڑی سی آنکھیں۔ لمبے لمبے سیاہ بال۔ کھلا کھلا رنگ، جیسے کالی بدلیوں سے چاند جھانک رہا ہو۔ میں نے اسے دیکھا اور دیکھتے ہی روحی یاد آ گئی۔ اور پھر اس یاد کے ساتھ ساتھ ایک دم بہت سے کالے کالے بچھو میرے جسم کو کاٹنے لگے اور میں تڑپ گیا۔ میں نے روحی کو بھلانا چاہا مگر پریتما بار بار میرے سامنے آ کر روحی کی یاد دلا دیتی۔ اور جی چاہتا کہ روحی کی اس معصوم یاد کو اٹھا کر کہیں دور بھاگ جاؤں۔ مگر پھر سوچتا یہ پاپ ہے اجمل! اور یہ سوچتے سوچتے دفعتاً کوئی دماغ کو جھنجھوڑ ڈالتا۔ یہ تو پاپ نہیں بلکہ بھارت میں کئے ہوئے پاپ کا انتقام ہے۔ وہ آدم خور تیری ماں کو کھا گئے۔ تیری بیوی کو اٹھا بھاگے۔ تو بھی پریتما کو ہتیا لے، اب تو کمر درد نہیں ہے تیرے ہاتھوں میں جان ہے اور تیرے سینہ میں ارمان بھی۔ اور میں گھبرا کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا اور بڑبڑاتا نہیں۔ میں یہ کبھی نہیں کروں گا۔ ہر آدمی آدم خور ہی نہیں بن جاتا۔

اور پھر میں نے وہ مکان ہی چھوڑ دیا جہاں میرے ارادے ڈگمگا رہے تھے۔

اب میں پریتما سے تقریباً ایک میل دور تھا۔ سوچا تھا اس طرح شاید میں اس کو بھلا سکوں لیکن یہاں بھی ناکامیاب رہا۔ اور اس کی یاد یہاں بھی میرا پیچھا کرتی رہی۔ اس یاد کے پیچھے کچھ کوئی چلاتا رہتا۔ یہ دل! ڈرپوک! وہی کہیں طاؤ اور میں نے محسوس کیا جیسے واقعی میں بزدل بنا رہا ہوں۔ اپنے تقسیم شدہ اس دیش میں بھی جہاں میں حاکم تھا اور پریتما محکوم۔ اس بزدلی کے لعنتوں نے پھر ایک دن مجھے بہادر بنا دیا۔ چنانچہ بہادروں کی طرح اکڑتا ہوا میں پریتما کی طرف چل پڑا۔ چلتے چلتے خیال آیا۔ اگر پریتما کو اٹھانے میں کوئی مزاحم ہوا تو! کسی نے چپکے سے جواب دیا۔ تو کیا؟ اسے مار ڈالنا۔ اسے کھا جانا۔ تو باش تو آدم خور ہے۔ آدم خور۔ اور پھر تیرے کچھ دوسرے آدم خور بھائی بھی تو اسی محلہ میں رہتے ہیں۔ وہ تیری ضرور مدد کریں گے۔ مجھے جیسے اطمینان ہو گیا۔ اور جب اس محلہ میں پہونچا تو رات ہو گئی تھی۔ چاروں طرف ایک پھیکا پھیکا سناٹا اونگھ رہا تھا۔ سامنے ہی سرکاری نل پر جو نظر گئی تو دیکھا پریتما مٹی کی گاگری بھرے ہزاروں تمناؤں کو دھاتی چلی آ رہی ہے۔ سوچنے لگا۔

تو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔ اور یہ خیال آتے ہی میرے بھاری بھاری بازوؤں کی مچھلیاں ابھر آئیں۔ خاندانی شرافت کچھ جھجک کر آڑے آئی۔ مگر میں سب کو دھکیلتا ہوا پریتما کے پاس پہونچا۔ اور اسے جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دیکر خاموش رہنے کی ہدایت کی اور واقعی وہ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح خاموش کھڑی رہی۔ بہادری نے کمر تھپکی اور میں نے پریتما کو گود میں اٹھا کر تانگہ میں لا پٹخا اور ایک دم سناٹے کے نیم جان مریض نے سہمی بھیانک قہقہے اگل ڈالے۔ جو خون کی گھنٹیوں کی طرح اب بھی میرے کانوں میں بج رہے تھے۔ وہ بجتے رہے۔ تانگہ چلتا رہا کہ یکایک ان ٹھن ٹھناتی ہوئی گھنٹیوں نے الغاؤں کی صورت بدلی۔ اور میں نے دیکھا کہ کتنے ہی متحرک سائے میرے چاروں طرف چلا رہے تھے۔ بزدل! یہ بہادری نہیں۔ بزدلی ہے۔ شیر مردہ جانوروں کو اپنا شکار نہیں بناتے۔ بہادر کمزوروں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ اجمل! تو اسے انتقام سمجھتا ہے یہ انتقام نہیں بلکہ تیری شکست کا اعتراف ہے۔ انتقام ان سے لے جنہوں نے تجھے یتیم بنایا۔ انتقام ان سے لے جو تیری روحی کو آج تک نہ لوٹا سکے۔ مگر نہیں تو وہاں نہیں جا سکتا۔ تو ان سے بدلہ نہیں لے سکتا۔ کیونکہ وہ طاقتور ہیں اور تو صرف کمزوروں پر ہاتھ اٹھانا جانتا ہے۔

فرید بابو! پھر دیر تک یہ آوازیں اسی طرح گونجتی رہیں اور میں نہ سننے کی کوشش کے باوجود سب کچھ سنتا رہا۔ تانگہ اب بھی چل رہا تھا۔ ڈامر کی سڑک پر ان متحرک سایوں کو کچلتا ہوا کہ یکایک ایک کچلا ہوا سایہ تڑپ کر میری طرف بڑھا۔ اور مجھے یہ محسوس ہوا جیسے کسی نے زناٹے کا طمانچہ مار دیا ہو۔ اب بادل چھٹ چکے تھے۔ اور ان کی اوٹ میں چھپا ہوا چاند ٹھنڈی ٹھنڈی روشنیاں برسا رہا تھا۔ میں تانگہ سے اترا۔ اس کا خیر لا۔ اور کچھ دیر بعد وہیں پہونچ گیا۔ جہاں سے چلا تھا۔ پریتما اب بھی رو رہی تھی۔ کانپ رہی تھی۔ میں نے اسے چمکارتے ہوئے تانگہ سے اتار دیا اور وہ سہمے ہوئے شکار کی طرح مڑ مڑ کر اپنے شکارکی طرف دیکھتی رہی۔ آگے بڑھتی رہی۔ پھر ایک دروازہ پر پہونچکر آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ قریب ہی پھر کوئی چلایا۔ اجمل! مار دیا گیا۔ مگر مجھے یہ محسوس ہوا۔ جیسے اس بار میں سرخرو بہت بڑی جیت ہو۔ یہ کہہ کر اجمل خاموش ہو گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے بجھے بجھے دیوں میں ایک اطمینان مسکرا رہا تھا۔

ابنِ فرید۔ بی۔ اے

کوئی اُمید کوئی تمنّا

سینٹ کنٹربری (St. Canterbury) کے آہنی جسم میں اُتر کر میں نے اپنے شانوں پر سے سامان اتار کر فرش پر پٹخ دیا۔ جہاز کے اس وسطی عرشہ پر بڑی قنوطی انگیز تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ دیواروں میں کافی فاصلہ پر لگے ہوئے برقی قمقموں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی رو رہی تھی اور اندھیرا اور بھی بھیانک ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میرے شانے اپنا پورا وجود سامان اتنی دور تک لے کر چلنے کی وجہ سے دکھنے لگے تھے۔ اور میرے لئے وہاں کی گھٹی ہوئی فضا میں سانس لینا تک دوبھر ہو رہا تھا۔ دوسرے فوجی اپنے لئے نشستیں بنانے کے لئے جلدی جلدی اِدھر اُدھر پرتھوں پر سامان پھینک رہے تھے۔ ایک عجیب ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ میرا دل الجھ رہا تھا۔ وسطی عرشہ بڑا مُکدر محسوس ہو رہا تھا۔ جہاز اسی وقت چلنے والا نہیں تھا۔ یہ ایک اور کوفت تھی۔ تاریکی میں وہ کسی نامعلوم وقت میں ساحل کو خیرباد کہے گا۔ تب جا کر کہیں ہمیں اُوپر کے عرشہ پر جانا نصیب ہوگا۔ اس وقت تک ہمیں گھٹے گھٹے رہنا پڑے گا۔ حبس اور تاریکی اور یاس، یاس اور تشنج۔ اور ایسی ہی نہ معلوم کتنی کیفیتیں مجھ پر طاری ہو رہی تھیں۔ میں نے اپنی بے چارگی کو دور کرنے کے لئے اپنے کندھوں کو چند ایک بار سہلایا اور پھر اپنے سامان کی طرف متوجہ ہوا لیکن اس سے قبل کہ میں اپنی مدد آپ کروں۔ سینٹ کنٹربری میں میرا ساتھی ملک آن پہنچا اور آتے ہی اس نے میرا سامان اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"ظفری۔ جلدی کرو۔ ورنہ کوئی اور قبضہ کرے گا۔"

اور میں بغیر کچھ غور کئے اس کے ساتھ ہو لیا۔ کیسا قبضہ اور کیسی جگہ کی یہ اس وقت اس کی وضاحت چاہنے کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ تاریکی۔ یاسیت اور تشنج کی ملی جلی کیفیت میں جکڑا ہوا میں بالکل مجبوس اور مجبور سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ملک نے ایک اوپری برتھ پر میرا بستر پھینک دیا اور سب سے نچلی برتھ کے پاس سامان رکھ دیا۔ اور میں یہ سب کچھ اس طرح دیکھتا رہا جیسے میں کچھ بھی مشاہدہ نہیں کر رہا تھا۔

"ظفری، تمہارے لئے یہ اوپری برتھ بڑی مناسب رہے گی۔ تم وہاں روشنی کی وجہ سے پڑھ بھی سکو گے۔"

اور میں نے پہلی بار روشنی کی طرف پُرامید ہو کر دیکھا۔ یہاں یاس اور قنوطیت میں بھی مجھے اتنی روشنی مل سکتی تھی کہ میں اپنے نہ معلوم کب کے پرانے پرچوں کا مطالعہ کر سکتا تھا۔ اور اس وقت کو جو سمندری سفر میں الجھن اور اضطراب میں گزرنے والا تھا کسی قدر دوسرے مصرف میں استعمال کر سکتا تھا میں نے برتھ پر چڑھ کر اپنا بستر لگانا شروع کر دیا اور ایک اضمحلالی انداز میں کچھ نہ کچھ سوچنے لگا۔ مجھے یاد نہیں میں کیا سوچ رہا تھا البتہ اتنا احساس ضرور باقی رہ گیا تھا کہ دھوپ کے بچھوؤں اور ڈائروں کی طرح چند خیالات اور تاثرات ضرور میرے اندر رکھ ٹیس لے رہے تھے۔ اور میں کس قدر اُکتا رہا تھا۔ چند جھنجھلاہٹیں مجھ پر طاری ہو رہی تھیں اور میں اپنی بھوؤں کو سکیڑ کر پیشانی پر متعدد شکنیں پیدا کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ غیر ارادی طور پر کچھ کر رہے تھے اور میں اس میں مصروف تھا۔

"ظفری آؤ۔ لو، چائے پی لو۔"

ملک نے مجھ کو آواز دی اور میں نے اپنی برتھ کو نادرست چھوڑ کر اتر آیا۔ اور اس سے مگ (MUG) لے کر پھیکی اور بدمزا چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ حلق کے نیچے اتارنے لگا۔ میری نظریں تمام گرد و پیش سے بے نیازانہ نہ معلوم کیا دیکھ رہی تھیں اور میں عجیب بددلی کے ساتھ سوچتا چلا جا رہا تھا۔

"ایک مصیبت ہے، اس حبس اور گرمی میں یہ رات کیسے کٹے گی۔"

ملک نے کہا۔ میرے تفکر کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"کمبخت جہاز بھی جانے کب چلے گا۔" وہ بڑبڑائے جا رہا تھا۔

"ہاں شاید پچھلے پہر سے پہلے ہم ہالائی عرشہ پر نہ جا سکیں۔" میں نے کھوئے کھوئے انداز میں اس کو مطمئن کرنا چاہا۔ لیکن میرا چہرہ خود ایک بے اطمینانی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"اس عرصہ تک اس بھٹی میں کیسے رہا جا سکے گا" وہ عجب بے زار سا نظر آ رہا تھا۔

میری چاء ختم ہو چکی تھی اور میں ملک کے روتے بسورتے ہوئے جملوں سے اپنے ذہن کو اور زیادہ کوفت میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے میں پھر اپنی برتھ پر چڑھ گیا اور اپنا سامان درست کرنے لگا۔

"ملک، اپنا بستر درست کر لو، اب سونے کا وقت ہو رہا ہے"

"اچھا" اس کا لہجہ بڑا بے کسی کا تھا۔

میرے سرہانے دیوار میں لگا ہوا بلب ٹمٹما رہا تھا اور اس کی زرد روشنی دم توڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ درمیانی عرشہ کی تاریکی اس میں مل کر اور بھی حزن پیدا کر رہی تھی۔ اور یہ حزن مجھ میں غمگینی کو اس قدر ابھار رہا تھا کہ میں بھی ملک کی طرح جیسے رو دینے کے لئے مجبور ہوا جا رہا تھا۔ اس روشنی میں جیسے ایک رُوکھا پن سا تھا، ایک بے کیفی سی تھی۔ بالکل مُردہ مردہ سی، بے جان سی۔ میں چند لمحے تک اس کمزور روشنی کے منبع کو گھورتا رہا۔ اس پر ایک بھی پروانہ نہیں تھا۔ کوئی ادنیٰ سا بھونڈا سا کیڑا بھی اس کے شیشے سے چمٹا ہوا نہیں تھا اور آخر وہ کیوں آتا۔ اس کے لئے کوئی پابندی اور مجبوری تو نہ تھی۔ اور یہ روشنی تو ان خوبیوں کو اپنی برتھوں میں ٹٹول ٹٹول کر گھس رہنے کے لئے بڑی ہلکی سی دھند میں سہارا دینے کے لئے لگائی گئی تھی۔ یہ تو اُن جانوروں کے لئے لگائی گئی تھی جنہیں مجبوراً اپنی جانیں بچینی پڑی تھیں۔ اور ان جانوروں میں سے میں بھی ایک تھا۔ اور اس ٹمٹماتی ہوئی روشنی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔

چند لفظوں ماضی اس عرصہ میں میرے تصور میں تازہ ہو گئے۔ وہ منظر کتنا پُرکشش ہوتا تھا جب شام کے وقت گاؤں کے کچے مکانوں سے دھواں اُٹھ اُٹھ کر فضا میں تیرنے لگتا تھا اور دُور تک پھیلتا بڑھتا چلا جاتا تھا۔ اور اُفق پر ڈوبتے ہوئے سورج کی شفق دُور تک پھیلتی ہوتی تھی۔ پھر اُس ہلکی سُرخی میں چراگاہوں سے واپس آنے والے جانوروں کی گھنٹیوں کی گونج پیدا ہوتی رہتی تھی۔ ان کے قدموں سے اٹھتی ہوئی گرد بڑی ہی پیاری سی دھند میں تبدیل ہو جاتی تھی جو اُن ڈوبتی ہوئی کرنوں کی سرخی سے رنگین بھی ہو جاتی تھی۔ میں ایسے وقت چراگاہوں کی طرف بھاگ جایا کرتا تھا اور سب سے آخر میں آنے والے ریوڑ کے ساتھ واپس آیا کرتا تھا۔ میری جیبیں کچی پکی جھڑبیریوں اور جنگلی کرونداں سے بھری ہوئی تھیں۔ پھر جب میں گاؤں میں داخل ہوتا تھا اور جانور اپنے کھونٹوں پر باندھ دیئے جایا کرتے تھے تو مجھ پر والد کا خون طاری ہوتے لگتا تھا۔ میرا دل اس انوکھی چہل قدمی سے انتہائی مسرت محسوس کر رہا ہوتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ پیش آنے والی خفگی ڈنک کی طرح چبھتی رہتی تھی۔ سورج ڈوب چکا ہوتا تھا۔ چمپئی روشنی تاریکی میں تبدیل ہو چکی ہوتی تھی اور تاریکی کا ڈھیر پڑ چکی تھی۔ تب میں چوروں کی طرح پیچھوں کے بل مکان میں داخل ہوتا تھا اور اچانک والد صاحب سے ٹھ بھیڑ ہو جاتی تھی۔ ان کی آنکھوں سے ناپسندیدگی کا اظہار ہو رہا تھا اور وہ مجھ سے ترش لہجہ میں پوچھتے تھے۔

"کہاں تھے تم"؟۔ میں اس وقت بالکل گم صُم ہو جاتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا جواب دوں۔ اس لئے خاموشی کے ساتھ ان کے سامنے سے ہٹ جایا کرتا تھا۔

اور جب ہم کھانا کھا کر اپنے بستروں میں گھس جایا کرتے تھے تو والد صاحب اپنی لالٹین میری سے کوئی ضخیم سی کتاب نکال لایا کرتے تھے اور لالٹین کی زرد روشنی میں پڑھتے رہتے تھے۔ ان کا یہ مطالعہ کافی دیر تک جاری رہتا تھا۔ ہمیں اس کی بالکل خبر نہ تھی کہ وہ کب تک پڑھتے رہتے تھے۔ ہاں وہ خوابیں جو اس وقت میرے اندر پیدا ہو جاتی تھی وہ اب تک ذہن میں تازہ ہے۔ میں بڑے اشتیاق سے اُن کو مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ اور آپ ہی آپ تمنا کرنے لگتا تھا کہ کاش میں بھی ان موٹی موٹی کتابوں کا مطالعہ کر سکتا۔ لیکن یہ تمنا صرف اُن موٹی موٹی کتابوں کے لئے ہوتی تھی۔ اپنی درسی کتابوں کو تو بس دفن کر دینے ہی کو دل چاہتا تھا۔ جن کے تصور ہی سے چاروں طرف چھوٹی بڑی، لال۔ پیلی آنکھیں رقص کرنے لگتی تھی۔ اور ہم ان ابتدائی کتابوں کو اس طرح کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ کر اسکول سے بھاگ آتے تھے جیسے نعمت خانے کی طرف بڑھتے ہوئے [illegible]

میری یہ حرکتیں [illegible] ہی اس بے کیفی میں مسکرا رہا تھا۔ اگر اس اشتیاق ہی کی وجہ سے [illegible] والد صاحب کا سُرور بایا کرتا تھا اور وہ بڑی اچھی اچھی کہانیاں اور نظمیں سنایا کرتے تھے۔ وہ نظم کتنی پیاری تھی جس میں ایک چھوٹی سی لڑکی کا تذکرہ تھا جو میدانِ جنگ میں زخمیوں کو پانی پلاتے ہوئے ماری گئی تھی۔ وہ نظم تو مجھے اتنی پسند تھی کہ جب والد صاحب مجھ سے خوش ہوتے تھے تو پوچھتے "کہو آج کیا سنو گے"؟ اور میں اسی نظم کا تقاضہ کر دیا کرتا تھا۔ مجھے رات کا وقت خاص طور سے بہت پسند تھا۔ اُس وقت تاریکی بھی بھلی معلوم ہوتی تھی اور لالٹین کی زرد روشنی تو میری نیند میں گھل مل کر بڑا لطف دیتی تھی۔

مگر اس زرد روشنی میں بڑی بے کیفی تھی۔ درمیانی عرشہ کی گرمی سے

طبیعت الجھ رہی تھی اور نیند سے تو بالکل محروم ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے اُردو کا ایک پرانا رسالہ نکالا اور اُسی مدھم روشنی میں اُس سے اپنے آپ کو بہلانے لگا۔ اُس وقت مجھے الفاظ کتنے دور دور سے محسوس ہو رہے تھے، اور جیسے ان کے کوئی معنی مطلب ہی نہ تھے۔ بڑی دیر تک میں یونہی ورق الٹتا رہا۔ اور پھر رسالہ بند کر کے رکھ دیا اور برتھ پر کروٹیں بدلتے بدلتے سو گیا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے برتھ بہت ہی خفیف سے جھکولے لے رہی ہے۔ بس اتنے ہلکے کہ صرف ان کا احساس ہی ہو سکے۔ میں بڑی دیر تک برتھ میں لیٹا ہی لیٹا ان جھکولوں کا احساس کرتا رہا لیکن میں گھٹن جو میں سینٹ کنٹربری میں داخل ہوتے ہی محسوس کرنے لگا تھا میرے اندر پھر وجود کرنے لگی۔ میں نے نیچے جھانک کر ملاک کی برتھ کا جائزہ لیا۔ وہ اُٹھ کر جا چکا تھا۔ شاید بالائی عرشہ پر۔ وسطی عرشہ کی تاریکی صبح ہونے کے باوجود دور نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی وہ زرد اداس روشنی گل ہوئی تھی۔ اس تاریکی کو چھ بیس گھنٹے مسلط رہنا تھا اور اُس روشنی کو بھی مسلسل جلتے رہنا تھا۔ اور میں ان دونوں سے متنفر ہو چکا تھا۔ اس لئے میں بھی بالائی عرشہ پر چلا آیا۔ جہاز مشرقی دنیا کے چوڑے دہانے میں آہستہ آہستہ حرکت کر رہا تھا۔ دریا کا پانی کافی ٹیلا سا تھا۔ اور اُس میں جہاز کی حرکت سے بڑی بڑی لہریں اُٹھ کر دستی مشینوں اور ڈونگوں کو جھنجھوڑے دے رہی تھیں لیکن ان کے ماجھیوں پر ذرا بھی خوف ہراس طاری نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جہاز کو دیکھ کر چیخ رہے تھے اور اشارے کر رہے تھے اور جہاز کے کناروں پر جھکے ہوئے فوجی ان کو بڑے اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ پیچھے چھوٹتے ہوئے خشکی کے حصّہ پر وہ بڑی حسرت بھری نظر ڈال رہے تھے۔ مجھے بھی یہ منظر کچھ خوش کن نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ اِس لئے میں بے دلی کے ساتھ اِدھر اُدھر چکر لگانے لگا اور یہ چاہنے لگا کہ ملاک کو تلاش کر لوں۔

مجھے پاس ہی سے دواؤں کی سی کیمیائی بُو محسوس ہوئی اور میں نے ناگواری کے ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"ہلو ——— ؟"

"ظفری ؟ ۔ کیا تم بھی اسی جہاز سے چل رہے ہو"

"ہاں ! اور تم بھی ؟"

"ہاں۔ ہاں"

لیکن ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ کہاں جا رہے ہو۔ کیونکہ ہمیں خود بھی معلوم نہیں تھا۔ البتہ اس اتفاقی ملاقات سے کچھ طبیعت کا رد کھاپن ضرور کم ہو گیا۔ اس لئے میں نے اُس سے کینٹین چلنے کا مطالبہ کیا۔ فوجی چار پر اس سے بڑھ کر تفریح کی جگہ کیا ہو سکتی ہے اس لئے ہم دونوں کینٹین کے کیبن کی طرف مڑ گئے۔ ملک ۔ کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑا ہوا جائے پی رہا تھا۔ اور ہمیں دیکھتے ہی وہ فرطِ مسرت سے چیخ اٹھا۔

"ہلو ——— لزا تم بھی موجود ہو ؟"

"ہاں میری کور بھی چل رہی ہے۔" لزا نے ایک سرسری سا جواب دیا۔

اور پھر ہم لوگ چائے پینے میں مشغول ہو گئے۔

اب ہم سینٹ کنٹربری میں تین افراد جمع ہو گئے تھے جو ایک دوسرے سے زیادہ مانوس تھے۔

جہاز دریا کے پانی کو عبور کر چکا تھا اور سمندر کے کاہی رنگ کے پانی میں نرم رو تیز رفتاری سے چلنے لگا تھا ہمارے لئے تفریح کے واسطے صرف تین جگہیں تھیں۔ ایک کینٹین، دوسرے تفریحی کمرہ اور تیسرے عرشہ جہاں سمندر کی ٹھنڈی نمکین ہوا میں بھیگتے ہم پہروں کیپ فانی کے ساتھ متحرک پانی کو دیکھ سکتے تھے سمندر کا گہرا نیلا پانی تا حدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ صرف مختلف منازل سے گزرتے ہوئے اس کے مختلف رنگوں کا تجربہ ہو رہا تھا اور سینٹ کنٹربری کے چلنے سے شور میں اور بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ہم جنگلے کے کنارے کھڑے ہوئے پانی کو بے مقصد گھورا کرتے تھے۔ اُسے بغور دیکھا کرتے تھے جیسے ہم اُس میں کچھ تلاش کر رہے ہوں یا شاید یہ بھی نہیں بلکہ ہمیں کوئی کام نہیں تھا۔ وسطی عرشہ کا جلیس اُس کی تاریکی اور زرد اداس روشنی کی طرح وہاں ٹکنے نہیں دیتی تھی۔ اس لئے ہم بالائی عرشہ پر رہتے تھے۔ اور وقت یونہی گذار رہے تھے۔ شاید کوئی اشد ضرورت ہی نہیں اپنی برتھ تک جانے کی ہو دن کو آفتاب کی تمازت کے باوجود ٹھنڈی لیکن ہلکی ہوا کو چھوڑنے کے لئے ہم تیار نہ تھے۔ ہمارے چہروں کی کھال اس تمازت سے جھلس چکی تھی اور وہ کھال کی پپڑیاں تازہ کھال کیلئے اپنی جگہ چھوڑ رہی تھیں لیکن پھر بھی یہ ہمارے لئے احتیاط اور تشویش کی بات نہ تھی۔

پہلا دن میں نے عرشہ ہی پر کاٹ دیا۔ صرف کھانا کھانے میں MESS میں گیا اور بس۔ پھر آہستہ آہستہ شام آنی شروع ہو گئی۔ مگر یہاں چمپئی گرد اور دھند کہاں تھی جو دور تک میں بے پایاں فرحت بھر دیتی تھی۔ صرف دور پانی کے کناروں پر ایک زردی سی نظر آتی رہی اور کچھ عرصہ کے بعد وہ بھی فنا ہو گئی۔ تاریکی چاروں طرف چھا گئی۔ بالائی عرشہ پر کسی طرح کی بھی کوئی روشنی نہ کی گئی۔ تمام Lights Posts میں سے برقی قمقمے نکال لئے گئے تھے اور

دشمن کے خطرہ کی وجہ سے سگرٹ تک نہیں جلائے جا سکتے تھے۔ اس [illegible] نے مجھ پر اکتاہٹ مسلط کر دی اور میں جنگلے کے قریب ٹہلتا رہا۔ ملک نہ معلوم کہاں تھا۔ اور لزا بھی شاید اپنی کوئر میں ہو۔ مجھے زینہ کے نزدیک کوئی سایہ سا محسوس ہوا۔ شاید کوئی کھڑا ہو۔

"کون ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"میں ہوں۔ آجاؤ!"

"کون لزا۔؟"

"ہاں۔ ہاں۔ آؤ۔"

ہم دونوں جنگلے کے قریب چلے گئے۔ یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی کہ تاریکی کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ دکھلائی نہیں دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی ہم دونوں تاریکی میں دیکھنے لگے۔ دوسرے فوجی بھی ہماری ہی طرح اکتائے ہوئے پاس سے گذر رہے تھے۔ لزا جنگلے پر لٹک کر جہاز کے زیریں ترین حصہ کو دیکھنے لگی۔

"ذرا نیچے دیکھو۔"

"کیا ہے؟" میں نے نیچے جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"دیکھتے ہو پانی کیسا چمک رہا ہے؟"

"جیسے بہت سے جگنو تیر رہے ہوں۔"

کھاری پانی کے شور رانی ذرات بے انتہا گرمی کی وجہ سے چمکنے لگے تھے۔ ہم انھیں بڑی دیر تک گھورتے رہے۔ اور یونہی وقت گذرتا رہا۔

"لزا! تمہیں اپنا گھر نہیں یاد آتا؟"

"اور اگر یاد بھی آئے تو کیا ہو سکتا ہے؟"

کوئی ہم دونوں کے درمیان ہمارے شانوں کو تھپک کر کھڑا ہو گیا۔

"اوہ! ملک۔"

"چلو چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ میں تم کو کب سے تلاش کر رہا ہوں۔ لیزا تم بھی چلو۔"

وہ ساری رات میں نے [illegible] آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔ برابر گھر کی اور اعزا کی یاد آتی رہی۔ [illegible] انھیں اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ میں اپنی معاش کا کوئی حل چاہتا تھا۔ لزا بھی یہی چاہتی تھی۔ ملک بھی اس وجہ سے ہمارے ساتھ تھا اور ہم محض اتنے سے مقصد کے لئے استعماری طاقتوں کو انتقام بخشنے کے لئے اپنی جانیں بیچ چکے تھے۔ ہمارا مقصد کتنا محدود تھا اور ضروریات کو کس قدر ناقابل حصول بنا کر ہمیں مجبور کر دیا گیا تھا۔ میں یہی سوچ سوچ کر مضطرب ہوتا رہا۔

ہر وقت ایک جھنجھلاہٹ اور تشنج میں میں بالائی عرشہ پر گھوما کرتا تھا۔ پھر خدا خدا کر کے ایک صبح چند جزیرے نظر آگئے اور جہاز کے تمام فوجیوں میں ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ہم لوگ ایک عجیب طمانیت سی مسرت کے ساتھ انہیں دیکھتے رہے اور ساحل پر اترنے کی جلدی جلدی تیاریاں شروع کر دیں۔ میں نے اپنی میلی کثیف وردی اتار کر صاف وردی پہن لی۔ لزا اور ملک بھی وردی پہنکر آگئے تھے ــــ لزا کی وردی پر بنی ہوئی احمریں صلیب (RED CROSS) ان کتابوں کی یاد دلا رہی تھی جو فوجی ہسپتال میں لزا ہماری وقت گذارے کے لئے لایا کرتی تھی۔

شاید وہ آخری دن تھا جب ہم عرشہ پر یکجا کھڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ جلد ہی ہمیں اپنے نامعلوم مآل پر پہونچنا تھا۔ اور اپنے فرض کو ادا کرنا تھا۔ لیکن اس وقت ہم گذرے ہوئے دن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب ہم اس طرح یکجا کھڑے ہوئے تھے اور ہمارے چہروں پر خوف و ہراس طاری تھا۔ لزا کی وردی وہ نہیں تھی۔ اس کے ہاتھوں سے دواؤں کی بو آرہی تھی اور ملک کی پیشانی پر شکن پڑے ہوئے تھے۔ وہ ریزر کے بلیڈ کے ٹکڑے بھی کھلے ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ میں پرانے رسالہ کے چند بوسیدہ اوراق تھے اور قمیص کی بڑی جیب میں چند ایک اور پرانے پرچے ٹھنسے ہوئے تھے۔ ملک کا ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا اور دوسرا ہاتھ [illegible] ہوئے تھا جس میں وہ سگرٹ پکڑے ہوئے تھا لیکن [illegible] ہم دونوں کی نگاہیں دور بحری سرنگ Sea Mine پر نشانہ لگائے ہوئے تھے۔ ہمارے دل دھڑک رہے تھے اور ہم ٹکٹکی لگائے ہوئے اس طرف دیکھ رہے تھے۔

"اللہ حفیظ ــ!" میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے غیر ارادی طور پر کہہ دیا۔ شاید میرا لاشعور ابھی زندگی کا متمنی تھا۔ مگر ملک نے ایک پُرزور قہقہہ لگایا۔

"ظفری۔ ہماری محافظ ٹرپھانوں کی یہ بندوقیں ہیں۔" اس کے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

"لزا نے بڑے تعجب کے ساتھ ملک کی طرف دیکھا اور پھر ٹرپھانوں کی گولیوں کی آواز میں محو ہو گئی لیکن ملک کے اس تمسخر نے مجھے اس منظر سے متنفر کر دیا اور میں وہاں سے چلا آیا۔

جہاز ساحل سے لگ چکا تھا اور سمندری علالت جو ایک حد تک ہر ایک کو لاحق ہو گئی تھی ایک اختتام کو پہونچتی ہوئی محسوس ہوئی۔ البتہ میں ضرور ایک اور اضطراب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اور وہ تھا محاذ پر پہونچکر لاشوں کو

رونا تا۔ ان کے ڈھیر لگانا۔ اور خود بھی ایک وقت انھیں لاشوں میں شریک ہو جانا! مجھے ساحل کے آجانے سے کوئی خوشی نہ تھی۔ پھر ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور جدا ہو گئے۔

میرے ذہن میں اس سفر کے اثرات اب بھی باقی تھے اور اس عرصہ کا پیدا شدہ قنوطیت مجھ میں اب بھی جاگزیں تھا۔ میرا اپنا تضاد تھا۔ میں ایک چیز سے نفرت کرتے ہوئے بھی اس سے دست کش نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی اس کی وجہ سے مجھے اس یاس کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اسی دوران میں ایک غیر فطری زخم کی وجہ سے میرا بازو بیکار ہو چکا تھا اور مجھے محاذ پر سے واپس آکر مرکزی ہسپتال میں داخل ہونا تھا۔

مختلف دواؤں کی ملی جلی بو میں میں اپنے ہاتھ کو سہارا دیئے ہوئے مرکزی فوجی ہسپتال کے دواخانہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک نرس میرے سامنے سے گذر کر کاؤنٹر تک گئی اور کسی مریض کے بارے میں کمپاؤنڈر سے گفتگو کرنے لگی۔ مجھے اس کی آواز کچھ جانی پہچانی سی محسوس ہوئی لیکن میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ مجھے کیا غرض ——— جیسے میرے ذہن نے میری قنوطی کیفیت کو سہارا دیکر کلبیت کو ابھارنا چاہا۔ اور میں نے پاس کے وارڈوں سے آنیوالی کراہوں میں اپنی یاس پروری کو آزاد چھوڑ دیا۔

"نظفری؟ ———"

میں نے گھوم کر دیکھا۔ یہ تو لزا تھی۔ اس کے گال پچک گئے تھے۔ اس کی تازگی اس سے رخصت ہو گئی تھی جیسے کارواں کے گذر جانے کے بعد گرد کارواں بھٹک رہی ہو۔

"اوہ لزا۔ تمہاری صورت تو اتنی بدل چکی ہے کہ میں پہچان بھی نہ سکا۔" میں نے خفیف ہو کر کہا۔

مگر وہ خاموش رہی۔ وہ سمجھتی تھی اسے کچھ کہنا نہیں ہے۔ اس کی صورت تو بدلنی ہی چاہئے تھی۔ اس کے معاش کے مسئلہ کا حل اس کی صورت ہی تو تھی وہ اس سے لے لی گئی اور معاش کا ذریعہ فراہم کر دیا گیا۔ یہ کتنا بڑا انصاف ہے۔

"ملک بھی یہیں ہے۔" اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"کیسا ہے وہ؟ ———"

"چلو آؤ مل لو۔" اس نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا

میں اس کے ساتھ ہو لیا اور مریضوں سے بھرے ہوئے وارڈوں کے درمیان سے گذرنے لگا۔ ایک عجیب کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ نہ امید افزا اور نہ اطمینان بخش۔ کچھ عجب متجسسانہ سی نوعیت۔

"وہ ہے ملک۔" لزا نے ایک وارڈ میں داخل ہوتے ہوئے ایک مریض کی طرف اشارہ کیا۔ میں تیزی کے ساتھ اس تک گیا۔

"ملک ——— ؟"

اس نے بڑی کوششوں سے آنکھیں کھولیں۔

"میرے لئے دعا کرنا نظفری ———" اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے انتہائی تاسف میں اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا۔ اور اس کے پاس سے اٹھکر چلا آیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اس ملک کا پیکر رقص کر رہا تھا جس نے اس وقت میرا تمسخر اڑایا تھا، جب بحری سرنگ سے تمام جہازی خوف زدہ تھے۔ اور خود اس کا دل بھی امید و بیم کے درمیان جھکولے کھا رہا تھا۔

نجم الاسلام

ادبی مسائل

(یہاں صرف جناب م صدیقی کے کچھ سوالات کے جواب ادارہ کی جانب سے دیئے جا رہے ہیں۔ مگر یہ صفحات قارئین کے خیالات کی ترجمانی کے لئے کھلے رہیں گے۔)

م۔ صدیقی ۔۔ بدایوں

س: ۔۔۔ ماہر نے رئیس امروہوی کے سوالات کے جواب میں لکھا ہے کہ تذکرۂ معشوق کے بغیر شاعری رُوکھی پھیکی رہ جاتی ہے۔ میں ایک عرصہ سے سوچتا رہا ہوں کہ ماہر کہاں تک حق بجانب ہیں لیکن خود کو مطمئن نہ کر سکا۔ آپ اس داعیہ پر کچھ روشنی ڈالیں۔

ج: ۔۔۔ ماہر اور رئیس امروہوی کے سوالات و جوابات ہماری نظر سے نہیں گزرے۔ اس لئے پوری طرح آپ کی بات کو سمجھنا محال ہے۔ البتہ اتنا تو ہم کہہ سکتے ہیں عشق کا جذبہ اعلیٰ انسانی جذبات میں سے ہے۔ اس لئے جب تک وہ اپنی فطری حدود سے تجاوز نہیں کرتا تخریبی نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہ بات اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ عشق ایک بلند و اعلیٰ اخلاقی محور سے وابستہ و پابستہ ہو۔

سُننے میں یہ بھی آیا رشید احمد صدیقی سے ایک مرتبہ کسی طالب علم نے پوچھا کہ اچھا مضمون لکھنا کیسے آئے، انھوں نے جواب دیا کہ "اچھے ادیبوں جاؤ اچھا مضمون لکھنا آ جائے گا۔ بعینہٖ یہاں بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کردار۔ شخصیت، تصور کائنات اور مقصد زندگی کے لحاظ جتنا بلند اور صحت مند تصور کا ۔۔۔ حامل ہوگا۔ اتنا ہی بلند وہ تصور عشق پیش کر سکتا ہے اور اس کی شاعری اتنی ہی کامیاب بھی ہو سکتی ہے۔

غالباً ماہر صاحب نے بھی تصور عشق کے بارے میں ایسی ہی کوئی بات کہی ہوگی کیونکہ "فاران" کے مطالعہ سے ماہر صاحب کے نئے رجحانات ذہنی جو کچھ سامنے آئے ہیں ان کا تقاضا بھی یہ ہے کہ آدمی ایک ایسا تصور عشق رکھے جو اعلیٰ اخلاقی معیار پر پورا اُترے اور مریضانہ جنسی پرستی کے بجائے زندگی کی صحت مند قدروں کا احترام لئے ہوئے ہو۔

رہا شاعری کا رُوکھا پھیکا چپٹا ہونا تو یہ بات ہی جدا ہے۔ اور یہ تسلیم کرنے سے پہلے کہ تذکرۂ معشوق کے بغیر شاعری رُوکھی پھیکی رہ جاتی ہے ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا ہوگا کہ ماہر القادری، رئیس امروہوی، اور آپ کی ہماری نظر میں شاعری کا مقصد کیا ہے۔ اور اچھی شاعری کو کیا کیا تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ ورنہ اس کے بغیر برسوں بھی اگر بحث چلتی رہے تو آخر میں نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔

س: ۔۔۔ نجی خطوط کو شائع کرنا آپ کی نظر میں کیسا ہے؟ تعمیری ادب میں ان کی افادیت کیا ہے؟ اور کیا واقعی سجاد ظہیر کی "نقوش زنداں" "غبار خاطر" سے زیادہ وقیع ہے؟ جیسا معیار کے صفحات میں ایک مضمون میں ثابت کیا گیا ہے۔

ج: ۔۔۔ خطوط کا حسن ان کے بے تکلف انداز بیان میں پوشیدہ ہے۔ بہت سی باتیں اور بہت سے جذبات اظہار

کے لئے بڑا گھریلو ماحول اور بڑا دوستانہ فضا چاہتے ہیں۔ اظہار جذبات کے ایسے سربمہر موقعوں پر خطوط کے انداز سے زیادہ تحریر کا کوئی انداز موزوں نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جہاں تک تعبیری ادب کا تعلق ہے اس میں خطوط کی اہمیت ہرگز اس معیار سے کسی طرح کم نہیں جو ہر اچھے ادب میں خطوط کو حاصل ہونا چاہئے۔ اب رہے وہ خط جو نجی ہوتے ہیں اور اشاعت کی غرض سے نہیں لکھے جاتے یا وہ خط جو اشاعت کی نیت سے لکھے جاتے ہیں یا اس نیت سے اگر نہیں بھی لکھے جاتے تو کم سے کم ان میں رکھ رکھاؤ اور تکلف ویسا ہی ہوتا ہے۔

یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ دونوں طرح کے خطوط میں فرق صرف بے تکلفی کا ہے۔ اب اگر کوئی اشاعت کی نیت کے باوصف بے تکلفی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا فن ہے۔ دونوں طرح کے خطوط میں آمد اور آورد کا فرق تو رہے گا لیکن کوئی جس حد تک بھی بے تکلفی پیدا کرنے میں کامیاب رہتا ہے اسی قدر اسے کامیاب تسلیم کرنے میں کوئی جھجک بھی نہیں ہونی چاہئے۔ اور پھر ہمیں یہ بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اب سنجیدگی اور بے تکلفی کے پیمانے کچھ اضافی سے سمجھے جا رہے ہیں۔ جو لوگ زیادہ سنجیدہ رہتے ہیں ممکن ہے وہ ایک ہلکے سے تبسم کو بھی بڑی بے تکلفی سمجھیں۔ مگر اس دنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں جو قہقہے مار کر بھی اپنے کو اس وقت تک بے تکلف محسوس نہیں کرتے جب تک کہ دوستوں کو دو چار فرمائشی قسم کی گالیاں نہ سنا لیں یا گذری ہوئی شب کے ایک دو کارنامے نہ کہہ ڈالیں۔ ایسے بازاری یا حد سے زیادہ سنجیدہ لوگ کم ضرور ہیں مگر ناپید نہیں ــــ

"غبارِ خاطر" آورد ہے مگر اس کا مصنف اپنے فنی محاسن کے لحاظ سے سراہے جانے کے قابل ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ تعریف ہے جو محمد کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔

"نقوشِ زنداں" میں آمد زیادہ ہے آورد کم ہے کہیں کہیں حد سے زیادہ بے تکلفی کھٹکتی بھی ہے اور حد سے زیادہ تو ہر چیز ہی بری ہوتی ہے۔ ایک بے تکلفی ہی کیا مگر ان خطوط میں جو مجموعی فضا ہے وہ بالکل گھریلو ہے۔ درحقیقت خطوط کا سب سے بڑا حسن ہے بھی یہی۔ اب یہ بات کہ ان خطوط کی افادیت کیا ہے تو یہ بات خط لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کے افکار و خیالات اور تجربات، علم کی پختگی، صحت مندی اور بلندی پر منحصر ہے۔ اس کا تعلق خطوط نگاری کے فنی محاسن سے نہیں۔

ان مجموعوں کے ساتھ "مکاتیبِ زنداں" کا تذکرہ یہاں موزوں ہوگا جس میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب کے خطوط ہیں۔ یہ خطوط آمد تو ہیں، ان مصنفوں نے اشاعت کی غرض سے نہیں لکھے گئے۔ مگر آورد سے کم بھی نہیں کیونکہ ان میں جن دقیق علمی مسائل کا تذکرہ ہے وہ نہ تو خطوط لکھنے انداز نگارش سے میل کھاتے ہیں نہ کھا سکتے ہیں۔ گھریلو باتیں بھی اکثر فطری سنجیدگی کے انداز میں کہی گئی ہیں۔ یہ اپنا اپنا مزاج ہے۔ اپنی اپنی گھریلو روایات ہیں۔ کوئی مخاطب کو صدیق مکرم کہتا ہے۔ کوئی جان اور پیاری لکھتا ہے۔ کوئی نام لیکر پکارتا ہے۔ اور کوئی محترمہ کر کر۔ اس لئے "مکاتیبِ زنداں" کی سنجیدگی کو ہمیں لکھنے والوں کے گھریلو ماحول کے پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ اسی طرح ہم "مکاتیبِ زنداں" کی صحیح ادبی قدر و قیمت کا تعین کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ "مکاتیبِ زنداں" میں صرف کہیں کہیں بے تکلف گھریلو ماحول کا احساس ہوتا ہے مگر یہ تھوڑا احساس بھی ایک اچھے ماحول میں پڑھنے والوں کو پہنچا دینے کی قوت رکھتا ہے۔ اس لئے مجموعی طور سے اگرچہ مکاتیبِ زنداں کے خطوط انداز نگارش کے لحاظ سے زیادہ بے تکلفی نہیں رکھتے لیکن جس قدر بھی رکھتے ہیں وہ قابلِ تعریف ہے۔

امید ہے کہ چند سطریں آپ کو "غبارِ خاطر" اور "نقوشِ زنداں" کے موازنہ میں کسی حد تک ضرور مدد دیں گی ــــ

ل۔م۔شاہد

ایک روٹی، دو بھوکے

کسی سیٹھ نے ایک روٹی کا ٹکڑا سڑک پر پھینکا، دو کتے روٹی کے ٹکڑے کی طرف لپکے۔ اور دونوں آپس میں جھگڑنے لگے۔ سراج اور انور یہ دیکھ کر ایک دوسرے کی طرف تکنے لگے۔ سراج حساس واقع ہوا تھا اس نے اس واقعہ کا کافی اثر لیا۔ جب دونوں گھر واپس آئے تو انور بولا "کیوں بھئی اتنی سنجیدگی تو کبھی تمہارے چہرے پر نظر نہیں آئی؟"

"آج جانے طبیعت کو کیا ہو گیا ہے ——— ؟" کہہ کر سراج چارپائی پر لیٹ گیا۔

سراج اور انور بی۔اے پاس تھے۔ اور بیروزگاری کے شکار۔ روزانہ دونوں صبح کے وقت ملازمت کی تلاش میں نکل پڑتے اور شام کو تھکے ماندے گھر واپس آجاتے۔

انور ایک آرٹسٹ تھا۔ اکثر وہ اخباروں میں اپنی تصویریں دیا کرتا تھا اور کچھ پیسے اخباروں کی طرف سے اسے مل جایا کرتے تھے۔ اور دونوں ان پیسوں سے کسی نہ کسی طرح گذر کر لیا کرتے تھے۔ سراج کی انگریزی اچھی تھی۔ وہ اکثر غریب خرچ کے لئے کسی کی درخواست لکھ دیا کرتا تھا۔

"آج تمہاری جیب بھاری لگتی ہے انور؟" سراج چارپائی پر بیٹھ کر بولا۔ انور مسکرایا لیکن مسکراہٹ میں ایک اُداسی تھی ——— وہ بولا ——— "آج میں نے سینما کے ایک پوسٹر پر تصویر بنائی تھی معاوضہ ایک روپیہ ملا ——— اب یہ بتاؤ تم کہاں رہے؟" انور کو روٹ لیکر بولا۔

"کیا بتاؤں کہاں رہا، بس تمام دن مارا مارا پھرتا رہا۔ ایک سیٹھ کورٹ میں ملا تھا۔ لیکن کمبخت میرے لباس ہی کو دیکھ کر بھڑک گیا ——— ورنہ آج پانچ روپے کہیں نہیں گئے تھے۔ تقریباً شام کو سرجو پونڈاڑی کی دوکان پر ایک شخص ملا۔ اسے انگریزی میں خط لکھوانا تھا ———"

"کتنے پیسے ملے؟" انور بولا ———

"خط کے کیا ملیں گے۔ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ آخر دو چار سطروں کا کیا لیتا؟"

"کیا دو چار سطروں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی؟"

"ایک غریب گریجویٹ کی دو چار سطروں کی کوئی قیمت نہیں۔ اگر میں امیر ہوتا .... خیر چھوڑو ان باتوں کو بھئی مجھے بھوک لگی ہے۔ ڈبل روٹی اور چائے منگواؤ ———" سراج بولا۔ انور نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر سراج کی طرف بڑھا دیا اور بولا ——— "جاؤ، ہوٹل سے لے آؤ۔ میں بہت تھک گیا ہوں..."

سراج بھاگ کر ڈبل روٹی اور چائے لے آیا ——— اور تھوڑی دیر بعد دونوں چادر تان کر سو گئے۔

"آج عجیب حادثہ پیش آیا ———" سراج بولا ———

انور سنبھل کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور بولا "کیا ہوا ———؟"

"میں سینما کے پاس گھوم رہا تھا۔ کہ ایک جوان لڑکی پکچر دیکھ کر باہر نکلی۔ اور وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی ——— میں ایک طرف کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ شاید کسی ٹیکسی کے انتظار میں تھی لیکن کوئی ٹیکسی نہیں آئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے پاس آئی اور بولی ———

"کیا آپ مجھے میرے گھر تک پہنچا دیں گے۔

میں یہ سنکر حیرانی سے اسے تکنے لگا۔

آپ کو ...."

"جی ہاں۔ بات یہ ہے کہ میرا دل بہت کمزور ہے۔ رات کی تاریکی میں مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں کبھی بھی تنہا رات کو گھر سے نہیں نکلی۔ آج اتفاق سے سینما چلی آئی ہو چکا کہ فلم کے بعد ٹیکسی ضرور ملے گی لیکن افسوس ٹیکسی نہ مل سکی ——"

میں چپ تھا۔

"کیا آپ نہیں پہنچا دیں گے؟"

"ایک روپیہ لوں گا ——"

"ایک روپیہ" ——— وہ متعجب ہو کر بولی۔

"تم بھی عجیب ہو۔ اس میں روپیہ مانگنے کی کیا بات تھی ——" انور بولا۔

"بات یہ تھی کہ وہ ایک دولت مند لڑکی تھی —— اور تم جانتے ہو کہ میں اکثر امیروں کے ساتھ مذاق کر بیٹھتا ہوں۔ خیر سنو۔ وہ لڑکی چند منٹوں تک مجھے دیکھتی رہی ..... پھر بولی ——"

اچھا دوں گی ——"

میں چلنے لگا۔ سڑک پر خاموشی تھی۔

"آپ غریب نظر آتے ہیں؟" وہ بولی۔

"جی ہاں۔ غریب ہوں۔ لیکن بے ضمیر ہوں۔"

"کیا مطلب ——؟"

"آپ کے پاس دولت ہے۔ دماغ نہیں۔ آپ نہیں سمجھیں گی؟"

"وہ چپ ہو گئی۔ چلتے چلتے وہ ایک بنگلے میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد میرے پاس ایک روپیہ تھا۔" یہ کہہ کر سراج نے جیب سے سگریٹ کا ڈبہ نکالا ——

"خوب آدمی ہو تم بھی ——" انور مسکرا کر بولا۔

"لڑکی بھی حسین"

"تم نے دل دے دیا ——؟"

اب دل دینے کا رواج اٹھ چکا ہے انور ——" سراج سگریٹ سلگا کر بولا۔

ایک دن! ——————

"بلیک اینڈ وائٹ کمپنی میں ایک کلرک کی جگہ خالی ہے ضرورت مند اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر عرضیاں ارسال کریں یا خود منیجر صاحب سے ملیں ——"

یہ اعلان پڑھ کر انور اچھل پڑا۔

دوسرے دن وہ بلیک اینڈ وائٹ کمپنی کے منیجر صاحب سے ملا۔ اسے ایک خوبصورت کمرہ میں بیٹھنے کو کہا گیا۔ لیکن اس سے پہلے سراج اس کمرہ میں موجود تھا۔

"ارے تم یہاں ——؟" سراج حیرانی سے بولا۔

"اور تم ....؟"

"ہاں میں بھی ....."

اور دونوں کھسیانے ہو کر ایک دوسرے کو تکنے لگے۔

عبدالاحد معظم آبادی

شاعر کا جواب

ہم کس اُمید پر راستے طے کریں ؟
کس شمع کی روشنی راستے کی بھیانک تاریکی کو دُور کرے گی۔
چمن سے نکلتے ہوئے کالے کالے دھوئیں کے مرغولے کیسے بند ہو سکتے ہیں۔
یہ چمکتا ہوا چاند۔ یہ مہکتے ہوئے پھول اور یہ دھڑکتا ہوا دل۔
چاند کا سمان سے نور کے پھول برسائے۔ لیکن میرے پاس آنکھیں کہاں۔
یہ پھول کا دامن چاک چاک ہو جائے۔ لیکن ان میں خوشبو کہاں۔
عالی شان محلوں۔ خوبصورت بنگلوں اور دیدہ زیب کوٹھیوں میں صرف محنت بستی ہے۔
اُن کے اندر پل رہی ہوئی روشنیں صرف دھوکا ہیں۔
گھر۔ راستہ۔ ان میں شانتی کہاں۔
صبح کی معصوم اور کنواری کرنوں کی دوشیزگی کو ن چھین لے گیا۔
آسمان پر امنڈتے ہوئے بادل اور کھیتوں میں دور تک پھیلے ہوئے مٹی کے تودوں میں وہ دل کشی کہاں۔
ہری بھری کھیتیاں آج جنتا کے لئے نہیں۔ ان کے لئے ہیں جن کے پاس گنگا جمنی سکے ہیں۔
طاغوتی قوتیں تمام رس راگنیاں چھین لے گئیں۔
فضا رسیلے گانوں سے خالی ہے۔
راہ گیر ہانپتے ہوئے راستہ چلتے ہیں۔
شاعر اپنا کلام کس کو سنائے۔
اپنے دل سے پوچھو۔ شاعر نواز دنیا کب کی مر چکی۔
چاند کی کشش چاندی کے چمکتے ہوئے سکوں نے چھین لی۔

اور

شاعر اس دنیا میں اکیلا آنسو بہانے کے لئے رہ گیا ہے۔

(بنگالی نظم کا ترجمہ)

خیال اپنا اپنا

بھارت کی نئی تعمیر اور ہم

مصنف : مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی۔
قیمت : چھ آنے ۶ر ضخامت ۶۴ صفحات
ناشر : مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور۔ یو۔پی۔

یہ مختصر کتابچہ ایک طویل خطبہ ہے جو معلومات، خیال انگیزی اور فکری توانائی کے لحاظ سے ایک اچھی تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ کتابچہ میں بھارت کی عام اخلاقی و معاشرتی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے مستقبل میں تعمیر ملک کے امکانات اور اس کے طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انداز تنقید سلجھا ہوا ہے مصنف کی تحریر میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مسئلہ کے ہر ہر گوشہ پر اٹھ سکنے والے امکانی سوالات کا پیشگی حل روانی کے ساتھ بیان کرتا چلا جاتا ہے اور غلط فہمیاں یا الجھنیں بڑی آسانی کے ساتھ ساتھ رفع ہوتی چلی جاتی ہیں۔

بھارت کی اصلاح و تعمیر کی موجودہ کوششوں پر تعمیری تنقید کرنے کے بعد مصنف نے آخر میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے وہ ہر طرح غور و فکر کے لائق ہے۔ بھارت کے فکری طبقہ کو اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔

کتاب کے درمیانی حصہ میں ایک آدھ جگہ بیان کی تشنگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ مثلاً اخلاقی نقطۂ نظر کا جائزہ لیتے ہوئے خوشی کمال اور فرض برائے فرض کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے وہ لوگ تو اشارۃً بھی سمجھ سکتے ہیں جن کے مطالعہ سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابچہ اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر گذرا ہے لیکن جنہوں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا ہے (اور بھارت کی نئی تعمیر اور ہم کے مخاطبوں میں ایسے لوگوں کی تعداد بھی کافی ہے) وہ اس حصہ کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ علاوہ ازیں یہاں وہ خیال انگیزی بھی کچھ مجروح نظر آتی ہے۔ جو اس کتابچہ کے دوسرے حصوں میں قابل تعریف حد تک پھیلائی ہوئی ہے۔ اس تھوڑی سی گنجوک کے علاوہ کتابچہ ہر طرح مطالعہ اور غور و فکر کے لائق ہے۔

(ن۔ا)

اسلامی نظام معیشت

مصنف : مولانا صدرالدین اصلاحی
قیمت : ۸ر آنے ، ضخامت : ۶۰ صفحات
ناشر : مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور۔

"اسلامی نظام معیشت" کے مصنف اس سے پہلے کئی مفید کتابیں پیش کر چکے ہیں۔ جن میں چند پر معیار کے صفحات میں تبصرہ بھی کیا جا چکا ہے۔ اس نئی پیش کش میں مصنف نے وقت کے ایسے مسئلے کو چھیڑا جسے سب سے زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ فکر و استدلال کا انداز یہ ہے کہ پہلے انسانی زندگی کے دو مختلف تصورات پیش کئے گئے ہیں اس کے بعد معیشت کے مسئلہ کا اخلاقی نقطۂ نظر سے ایک جائزہ لیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ جن لوگوں کا تصور حیات مادہ پرستانہ ہے ان کا نظام معیشت کیونکر جارحانہ خود غرضی کے گرد گھومتا ہے۔ اور اعلیٰ اخلاقی بنیادوں پر نظام معیشت کی تعمیر کے بارے میں اسلام کا کیا نقطۂ نظر ہے۔ آخر میں اسلامی نظام معیشت کے عملی نفاذ پر بھی کچھ باتیں کہی گئی ہیں۔

ان تمام اہم مباحث پر مصنف نے بخوبی روشنی ڈالی ہے اور ہر بات کو وزنی دلیلوں کی ترازو میں تول کر کہا ہے۔

یقین ہے کہ اس کے پڑھنے والے نظام معیشت کا ایک صحیح تصور قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہم قارئین سے اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف فکری لحاظ ہی سے ایک کتابیں

رہنمائی کا حق ادا کرتی ہیں بلکہ اُردو کی جو اہم خدمت ان سے ادا ہوئی ہے وہ بھی اپنی جگہ حد درجہ قابلِ تعریف ہے۔

آخر میں ایک بات یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ اس قسم کی کتابوں میں جس قدر بھی عمومیت کو برقرار رکھا جائے اچھا ہوتا ہے۔ جب خطبہ کی شکل میں ایسی باتیں کہی جاتی ہیں تو اس وقت ضرورتاً شروع میں کہی جانے والی باتیں بعد میں اور بعد میں کہی جانے والی باتیں شروع میں کہہ دی جاتی ہیں لیکن کتاب کی صورت میں تصنیفی ترتیب کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً "اسلامی نظام معیشت" میں جارحانہ خود غرضی پر کئی کلام کرتے ہوئے مصنف نے اپنی ایک حیثیت پہلے ہی سے متعین کر کے مادی تصور کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ مادی تصور کی خامیاں سامنے آجانے کے بعد ایک بہتر حیثیت کے تعین کی ضرورت تھی۔ ویسے اسلامی نظام معیشت کی افادی حیثیت اپنی جگہ قابلِ تعریف ہے۔

(ن۔ا)

افسانہ نمبر ماہنامہ "افکار" کراچی

ماہنامہ "افکار" کراچی کا یہ افسانہ نمبر ایسے افسانوں پر مشتمل ہے جو اشتراکی انقلاب اور اشتراکی رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔ اب تک ترقی پسند ماہناموں کے جتنے بھی افسانہ نمبر نکلے ہیں ہمارے خیال میں یہ ان سب میں اس حیثیت سے امتیاز رکھتا ہے کہ اس میں دورنگی کی جھلک تقریباً معدوم سی ہے۔ اور چاہے آپ اسے پروپگنڈا کہئے یا فنی محاسن سے محرومی مگر واقعہ یہ ہے کہ جس خندہ سے مارکسی خیالات کو اس نمبر کے افسانوں میں پیش کیا گیا ہے دوسرے خاص نمبروں میں ایسا کم ہی ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ افسانے ان لوگوں نے کم لکھے ہیں جنہیں ترقی پسند ادیبوں میں مارکسی خیالات پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ فن پر بھی قابلِ تعریف حد تک دسترس حاصل ہے لہٰذا ان لوگوں نے زیادہ لکھے ہیں جو یا تو فن سے نظریات کے مقابلہ میں کم ہی واقف ہیں یا دونوں ہی سے ناواقف۔ اس لئے بعض افسانے اس نمبر میں فنی لحاظ سے کسی قدر کامیاب بھی ہیں مگر اکثر قابلِ تنقید ہیں۔

اسی فکری خام کاری کے باوصف یہ افسانہ نمبر کم سے کم ان سب بیہودگیوں سے کافی حد تک پاک ہے جو افسانہ کو جنسی اشتہارات کا پلندہ بنا کر خود نام نہاد ترقی پسندوں کے ایک بڑے طبقہ کی طرف سے کی جاتی رہی ہیں۔ اس لحاظ سے ادارہ کی کوشش کامیاب کہی جاسکتی ہے۔ سرورق کافی آرٹسٹک ہے۔

(ن۔ا)

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

صفائی

خون کی خرابی پھوڑے پھنسی خارش اور داد وغیرہ کی بہترین دوا ہے۔ **صفائی** اندرونی طور پر استعمال کیجئے۔ اور **مرہم حنا** بیرونی استعمال کے لئے ہے

صفائی کہ اونس کی شیشی ایکروپیہ **مرہم حنائی** شیشی ۶

نوبہار

بچوں کی مشہور اور پسندیدہ دوا، چھوٹے بچوں کی صحت اور قوت کا محافظ معدہ کی تمام خرابیوں کے لئے ایک آزمودہ اور اطمینان بخش دوا ہے۔

تین اونس کی شیشی قیمت صرف ایکروپیہ

نوٹ:۔ آرڈر کے ساتھ پیشگی رقم آنی چاہئے ہر قصبہ و شہر میں دیانتدار ایجنٹوں کی ضرورت ہے دواخانہ کی کل آمدنی غریب طلبا پر صرف کی جاتی ہے۔

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

چند ایجنسیوں کے پتے

کانپور جین گنج۔ بنارس دال منڈی۔ بھوپال جمراتی بازار۔ فیروزآباد فردوسی اسٹور۔ غازی پور ٹاؤن ہال۔ شاہ گنج۔ میسرز مدرسہ قرآنیہ جامع مسجد۔ معظم گڈھ احسان بلڈنگ۔ بہرائچ چوک جمال بہرائچ۔ بستی گاندھی نگر۔ شاہجہانپور محمد علی مارکیٹ۔ بکسر صدیقی دواخانہ۔ علی گڈھ پھپھالہ۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی۔ ایس۔ اے اسٹور۔ سیدونی (مدھیہ پردیش) ڈاکٹر حکیم عبدالمغنی صاحب۔ سریا گنج۔ مظفر پور (بہار) حکیم محمد سمیع صاحب توحیدی دواخانہ الہ آباد۔ بمبئی منڈی کامیاب دواخانہ۔ کامٹی ناگپور۔ گجری بازار اقبال اسٹور

تگ و تاز

بھارت کے مشہور تعمیر پسند نظم نگار ابوالمجاہد زاہد کا شعری کارنامہ ہنوز تیاری کی منزلوں سے گذر رہا ہے جن اصحاب نے طلب فرمایا ہے ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ اس کی تکمیل میں تھوڑا وقت اور لگ جائے گا۔ انتظار کی زحمت گوارا فرمائیں اس تاخیر کا سبب کچھ انتظامی دشواریاں رہی ہیں جن پر ہم اب قابو پا چکے ہیں تگ و تاز کے علاوہ چند دیگر کتب کی تیاری بھی زیر غور ہے۔ اور ان پر نظر ثانی ہو رہی ہے ——

معذرت خواہ

منیجر مکتبہ "معیار" میرٹھ

بیان اللسان

مکمل عربی اردو ڈکشنری

تیس ہزار قدیم و جدید عربی لغات کا جامع و مستند ذخیرہ

تالیف: مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی ۔ ناظم ادارہ علمیہ (سابق رفیق ندوۃ المصنفین) ——

یہ لغت اب اہلِ علم اور اربابِ ذوق کے حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ۔ اس کی بینظیر خصوصیات نے اسے مقبول خاص و عام کر دیا ہے ۔ علماء ۔ طلباء ۔ اور عام شائقین سب ہی اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں ——

طبع سوم: ۔ کتابت و طباعت اعلیٰ —— کاغذ سفید چکنا —— سرورق رنگین —— صفحات نو سو ۔

قیمت: ۔ غیر مجلد آٹھ روپے —— قیمت:۔ مجلد چرمی اعلیٰ دس روپے —— محصول ڈاک علاوہ ۔

موجِ نیل

مصر کے شہرۂ آفاق ادیب سید مصطفےٰ لطفی منفلوطی ۔ دورِ حاضرہ کے مصری ادباء کے سرتاج تسلیم کئے جاتے ہیں مغرب کی تہذیب کے ہاتھوں مشرق کے اخلاق و تمدن کو لٹتے دیکھکر آپ بے حد متاثر ہوئے ہیں ۔ اور آپ نے ان تاثرات کو العبرات و النظرات میں افسانوں اور افسانوی مضامین کی صورت میں پیش کیا ہے ——

موجِ نیل اس سحر آفریں ادب کا اعجاز نما ترجمہ ہے جو قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کی مترجمانہ صلاحیتوں کا بہترین نمونہ ہے ——

کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ —— قیمت —— مجلد —— دو روپے ۔

نوٹ: —— ان کے علاوہ دوسری ہر قسم کی ادبی کتابیں مناسب قیمت پر طلب کی جاسکتی ہیں ——

—— مکتبۂ چراغِ راہ کی حسین و جمیل ادبی مطبوعات بھی ہمارے یہاں مل سکتی ہیں ——

—— شائقین پیشگی رقوم بھیجکر آرڈر روانہ فرمائیں :—

ملنے کا پتہ

مکتبۂ "معیار" میرٹھ

معیار میں پیش کئے ہوئے دو سال کے

افسانوں

کا

بہترین انتخاب

اُبھرتی کرنیں

مرتبہ :— نجم الاسلام

نئے تعمیری رجحانات کے افسانوی ادب میں گراں قدر اضافہ، افسانوں کا یہ مجموعہ موجودہ دور کے ایک نئے بڑھتے ہوئے افسانوی رجحان کا آئینہ دار ہے اور تعمیر پسند افسانہ نگاروں کی بہترین نگارشات لئے ہوئے ہے

قیمت دو روپے آٹھ آنے

مکتبۂ معیار میرٹھ کو فوری طور پر آرڈر بھیجکر طلب فرمائیں قیمت دو روپے آٹھ آنے

ناشر :— مکتبۂ "معیار" میرٹھ

محمد احمد ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے کمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "معیار" خندق اسٹریٹ شہر میرٹھ سے شائع کیا

صحت منداور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

معیار

میرٹھ

نومبر ۱۹۵۳ء

جلد ۳، شمارہ ۱۰

ترتیب دینے والے

اصغر علی عابدی

نجم الاسلام

جملہ خط وکتابت، ترسیلِ زر اور تبادلہ جرائد کیلئے

ہیڈ آفس :—— خندق اسٹریٹ، میرٹھ شہر

سب آفس

محلہ کشن گنج، دہلی ۶

ترسیلِ زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب فیملی لائن، جیکب آباد

زرِ تعاون

سالانہ —— پانچ روپے

ششماہی —— تین روپے

فی پرچہ —— آٹھ آنے (۸؍)

ترتیب

نقشِ اوّل ——— نجم الاسلام ۲

نظمیں

کائنات	تنویر احمد علوی	۵
فرار	ابو المجاہد زاہد	۶
عصرِ حاضر	انور صدیقی	۷
نظر عارفانہ قدم فازیانہ	عزیز اقبال گلبرگوی	۸
چراغ جل اٹھے	منظر اعظمی	۹
درد	الم مظفر نگری	۱۰
سائل اور شب خیز	حسن مثنیٰ انور	۱۱

مقالے

اُردو شاعری میں رمزیت و اشاریت	نثار احمد فاروقی	۱۳
فلسفۂ قنوطیت	محمد عثمان رمز	۱۶
عورتوں کیلئے لمحۂ فکر	متین طارق	۲۲

افسانے

غروب	اسعد گیلانی	۲۸
یہ جہاں اور ہے	ابن فرید بی۔اے	۳۱
محبت کا ایک اور رُوپ	ابو الخطیب	۴۰
زرد پتیماں	ستیہ پال آنند	۴۳

ادبی مسائل — حفیظ میرٹھی ۴۷

خیال اپنا اپنا — ن۔ل ۵۱

نقشِ اوّل

تنقید نمبر قارئین کو یاد ہوگا کہ معیار کے اگست ۵۳ء کے شمارے میں نقشِ اوّل کے آخری حصّہ میں تنقید نمبر کی اشاعت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی تھی۔

"کوشش کی جارہی ہے کہ آیندہ ہم تنقید کے موضوع پر "معیار" کا کوئی خاص نمبر (تنقید نمبر) پیش کرسکیں۔ اس پیش کش کے مواد کی جمع و ترتیب میں دو صورتیں ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ ایک تو یہ کہ انتقاد کے مبشتر اہم موضوعات پر شرح و بسط کے ساتھ لکھے ہوئے مقالات پیش کردیئے جائیں جن میں تاریخ تنقید، معیارِ تنقید کی تعین۔ اہم ادبی مسائل۔ اور اسی طرح کے موضوعات پر بھی کچھ مواد ہو۔ اور تعمیری نقطہ نظر سے ہو ــــــ اور ساتھ ہی ساتھ عملی تنقید کی کچھ کامیاب مثالیں بھی پیش کردی جائیں۔ جن سے تعمیری ادب کے تخلیقی کارناموں پر روشنی پڑ جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس تنقیدی کام کو تنوّع کی غرض سے کچھ مخصوص کرلیا جائے۔ اس صورت میں ایسے مکاتیب مربوط انداز میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔ جو تعمیر پسند فن کاروں نے آپس میں تبادلۂ خیالات کے لئے ایک دوسرے کو لکھے ہیں یا دوسرے ادیبوں اور فن کاروں نے تعمیر پسند فن کاروں کو لکھے ہیں یقین ہے کہ ان خطوط میں جابجا ایسی مفید بحثیں اور ایسے تنقیدی اشارے مل جائیں گے جو ادبی مسائل پر مشتمل ہیں۔ اس طرح تعمیری ادب کی تحریک کے تمام گوشے سامنے آجائیں گے، اور عملی تنقید کی وہ کمی جو عرصہ سے محسوس کی جارہی ہے کافی حد تک پوری ہوسکے گی۔"

مقامِ شکر ہے کہ ہماری ان سطور پر ہمارے معاونین نے بیش از بیش توجہ دی اور اس سلسلے میں کئی صائب مشورے دیئے۔ لکھنے والوں نے بھی لگاؤ اور فراغت و فرصت کے لحاظ سے ہاتھ بٹانے کا وعدہ کیا۔

تنقید نمبر کی ترتیب میں راقم کی رائے شروع ہی سے یہ تھی کہ مختلف مکاتیب فکر کے ذمہ دار حضرات سے تنقیدی نظریات کی نمایندگی کا حق ادا کرایا جائے اور اس معاملہ میں اختلاف رائے کو دخل نہ دیا جائے تاکہ کما حقہٗ ترجمانی اور نمایندگی ہوسکے۔ البتہ الگ الگ مقالے میں پورے مواد کا جائزہ لیتے ہوئے جزیات سے لیکر کلیات تک سب پر نشتر بھی اور تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ اس کے علاوہ مقالات کے موضوعات کے انتخاب میں بھی اس کا لحاظ رکھا جائے۔ اسی خیال کے تحت تیاری کا آغاز کرتے ہوئے تقریباً ہر نقطۂ نظر کے نقادوں سے اپنے خیالات و نظریات کے اظہار کی درخواست کی گئی۔

ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ ان حضرات میں سے اکثر و بیشتر کی نجی و ذاتی مجلسوں میں تعمیری ادب گفتگو کا موضوع بن چکا ہے۔ اور مخالفت و موافقت کے زبانی مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔ تنقید نمبر میں ان مظاہروں کو تحریری صورت دینے کا مناسب موقع مل سکتا تھا اور ساتھ ہی ہمیں بھی کچھ اپنے بارے میں کہنے کا موقع مل جاتا لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک ان حضرات میں سے کچھ کے تعاون اور خیر خواہی کے قابلِ احترام جذبہ کے علاوہ ہمیں امید نہیں کہ افہام و تفہیم کی وہ بہتر صورتیں پیدا ہوسکیں گی جن کی توقع آغازِ کار میں کی گئی تھی۔ اس پر ہمیں بیحد افسوس ہے۔

تنقید اور عناد میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک طرف اگر خلوص اور خیر خواہی کارفرما ہوتی ہے تو دوسری طرف اس کے بالکل برعکس۔ کتنا اچھا ہوتا اگر افہام و تفہیم کے اس موقع سے گرم جوشی کے ساتھ فائدہ اٹھایا جاسکتا۔

اس کے علاوہ جو کچھ سوچا گیا تھا اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ اور بحمداللہ توقع ہے کہ کامیابی حاصل کریں گی۔ اس وقت تک جن ضروری موضوعات پر اظہارِ خیال کے مواقع نکلے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) تنقید، اس کی تعریف اور تاریخی ارتقاء۔
(۲) مغربی اور عربی تنقید کا مطالعہ۔
(۳) ارسطو کی "شعریات" پر ایک نظر۔
(۴) ادب اور اخلاق، نقادوں کے نقطۂ نظر سے۔
(۵) ادب اور نفسیات۔
(۶) ترقی پسند افسانہ کا سیاسی رول۔
(۷) تعمیری ادب اور جنسیت۔
(۸) اسلامی ادب کیا ہے۔
(۹) جدید اُردو ادب میں اخلاقی رجحانات۔
(۱۰) اقبال کا نظریۂ تنقید۔
(۱۱) سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" پر ایک تنقیدی نظر۔
(۱۲) عربی شاعری کا سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی پس منظر۔
(۱۳) اُردو کے نقادوں پر ایک تعمیری تنقید۔
(۱۴) تعمیر پسند شعراء اور تعمیر پسند شاعر۔
(۱۵) تعمیر پسند نقاد۔
(۱۶) اُردو غزل میں جدید رجحانات۔

علاوہ اس کے تنقید کے فنی لوازم، اور نقاد کے فرائض پر بھی اگر کوئی اتنا اچھا مقالہ مل گیا جتنا ہم چاہتے ہیں تو پیش کیا جائے گا۔ شائد اُوپر کے موضوعات میں سے سب پر مقالے پیش نہ کئے جاسکیں لیکن بڑی حد تک ہماری خواہش پوری ہو ہی جائے گی۔ انشاء اللہ۔

اِس کے بعد کچھ تنقیدی اِشاروں پر مشتمل خطوط بھی پیش کئے جانے ہیں۔ جیسا کہ مکاتیب نمبر کی تشریح میں عرض کیا جا چکا ہے۔

خدا کرے کہ صفحات کی گنجائش کفایت کر جائے ورنہ کوتاہیِ داماں کا شکوہ کئے بغیر چارہ نہ ہوگا ——— اور ظاہر ہے کہ اس شکوہ کی بیشتر ذمہ داری اس اُردو داں حلقہ پر ہی آئے گی جس کا دل و دماغ تو بہت کشادہ ہے مگر جیب کا منہ بہت تنگ ہے۔

مجھے تو اِس دَور میں تنقید پر کسی کتاب کا شائع کرنا بھی ناشرین کے نقطۂ نظر سے ہمت کا کام معلوم ہوتا ہے۔ کجا کہ کسی اوسط درجہ کی مالی حالت کے رسالہ کے اربابِ کار کا کسی ٹھوس فنی علمی اور تحقیقی موضوع پر رسالہ کا نمبر شائع کرنے کیلئے تیار ہو جانا جس میں علم و ادب کی خدمت کی مواقع تو بہت مل جاتے ہیں لیکن اکثر اصل سرمایہ تک کی واپسی بھی دشوار ہو جاتی ہے۔

ادارہ کی جانب سے مجھے معیار کے اربابِ نظم کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ انہوں نے ایک ضخیم نمبر کی تیاری کیلئے اپنے آپ کو تیار کر لیا۔ اب یہ ہمارے معاونین کا فرض ہے کہ وہ اپنے تعاون سے اُن کے عزم و ہمت کو مجروح نہ ہونے دیں۔

نجم الاسلام

تنویر احمد علوی۔ ایم۔ اے

کائنات

یہ نجمیات کے جھرمٹ یہ کواکب کے گروہ
کائناتی یہ جزیرے یہ سماوی اجرام
اور یہ ثابت و سیّار و شہابِ ثاقب
اُن کا یہ سلسلۂ لامتناہی یہ نظام

یہ فضائیں یہ دھندلکے یہ ہیولے یہ سحاب
کہکشاں زار کی افشاں یہ سوادِ گردوں
ہر گھڑی پھیلتا بڑھتا ہوا تاروں کا غبار
یہ طلسماتِ عجائب یہ نقوشِ افسوں

مادّے کا یہ تلاطم یہ ہجومِ اشکال
اس کے پردے میں جو مضمر ہے وہ غایت کیا ہے
نور و ظلمت میں ہے باہم یہ کشاکش کیسی
ابتداء اس کی کہاں سے ہے نہایت کیا ہے

یہ فقط حسنِ تصوّر کا ہے اِک عکسِ جمیل
یا کسی ٹھوس حقیقت پہ بنا ہے اِس کی
کوئی اس ساری خدائی کا خدا ہے کہ نہیں
جس کے ہاتھوں میں فنا اور بقا ہے اس کی

علم و حکمت کو یہاں راہنمائی دے کر
فکرِ انساں کی رسائی ہے کہاں تک ممکن؟
مادّیت کی کشاکش کا سہارا لیکر
زیست کی عقدہ کشائی ہے کہاں تک ممکن؟

ابوالمجاہد زاہد

فرار

پسند آئی مجھے بات اِک مفکّر کی
خدا کرے کہ تری بھی سمجھ میں آجائے
یہی ہے "کشف" ترا آج کے زمانے میں
کہ تو حقیقتِ توحید ہی کو پا جائے

ستیزہ کار ہیں تاریکیاں اُجالوں سے
گماں کے پنجۂ بیداد میں حقیقت ہے
تو اِس فضا میں اگر نامِ حق بلند کرے
مرے عزیز! یہ تیری بڑی "کرامت" ہے

بہت ہی خوب ہے یہ "وجد و حال" کی دُنیا
بہت ہی "سامعہ پرور" ہے "بزمِ قوّالی"
مرے عزیز! مگر تُو نے یہ بھی سوچا ہے
یہ بیخودی ہے کہ ہے بیخودی کی نقّالی؟

بُجھا رہا ہے جو ایمان کے چراغوں کو
وہ "بھوت" تیرے "فتیلوں" سے جل نہیں سکتا
سوارِ ذہنیتوں پر ہے آج جو "آسیب"
وہ تیری "چلّہ کشی" سے تو ٹل نہیں سکتا

جو برق تابِ عزائم کو مضمحل کر دے
اُسے حیات کا پیغام میں نہیں کہتا
سبق پڑھائے جو انساں کو ترکِ دُنیا کا
اُسے "تصوّفِ اسلام" میں نہیں کہتا

یہ "جوگیانہ طریقے" یہ "راہبانہ شعار"
یہ زندگی سے ہے اے بے خبر! گریز و فرار

انور صدیقی

عصرِ حاضر

عصرِ حاضر! تری چھاتی سے اُبلتا ہوا خوں،
شاہراہوں میں، گلی کوچوں میں ہر سمت رواں،
ریگ زاروں پہ بھی لہراتی ہے مناک فضا،
خون میں ڈوبی ہوئی غم انگیز!
آہ یہ خون، تعفن، یہ بساند،
زندگی سوزشِ ربار فضا ——— !!

عصرِ حاضر! تری خونبار، نگاہِ نمناک،
جس نے دیکھا ہے ہر سمت یہاں رقصِ شرر،
کتنے معصوم طرب زاروں کے جھلسے ہوئے جسم،
کتنے شہروں کی اُجڑی ہوئی مانگ،
ایٹمی بم کا تبہ کار، ستم ریز دھواں
ابنِ آدم کے سرِ راہ تڑپتے لاشے،
آج بھی ہیں وہی دلدوز فسانے، وہی خونیں قصے
وہی انسان پہ انساں کی خدائی کا جنوں،
"سرخ جنت" کے پجاری، وہی ڈالر کے حریص!
ہاں مگر ——— اب تجھے اِک بار پلٹنا ہوگا،
تیرہ سو سال کے بعد ——— !!
تیری آنکھوں میں جھلکتے ہوئے آنسو کی قسم!
دیکھ وہ قافلۂ نور و ضیا،
ایک سیلاب کی مانند بڑھا آتا ہے،
نشر کرتا ہوا پھر "گنبدِ خضرا" کا پیام ———
یعنی پھر ایک خدا، ایک جہاں، ایک نظام!!

(ادارۂ ادب اسلامی الہ آباد میں پڑھی گئی)

عزیز اقبال۔ گلبرگوی

نظرِ عارفانہ، قدمِ غازیانہ

ہماری جرأتوں کا پوچھنا کیا؟

ردائیں ظلمتوں کی چار سُو ہیں
تھپیڑے کوہ پیکر روبرو ہیں
ہوائیں سنسناتی آرہی ہیں
گھٹائیں بادلوں کی چھارہی ہیں
گرج سے بادلوں کی ننھے تارے
فلک پر سہمے ہیں دہشت کے مارے
اکیلا ماہ گھٹتا ہے سسک کر
کبھی بادل بھی روتا ہے بلک کر
سفینہ کا شکستہ بادباں ہے
تلاطم سامنے ساحل نہاں ہے
مگر کشتی کو کھیتے جا رہے ہیں
تسلّی دل کو دیتے جا رہے ہیں

ہماری جرأتوں کا پوچھنا کیا؟

لہ کوئی مرحلہ ہو، کوئی معرکہ ہو ؎ نظرِ عارفانہ، قدمِ غازیانہ (حفیظ میرٹھی)

منظر اعظمی

چراغ جل اٹھے

(پہلا ورق)

[illegible] ہیں وہی ہارے وہی — ٹمٹماتے رقص میں ہیں شرارے وہی
ہیں وہی سوداں، غریباں نظارے وہی — اور آکاش میں چاند تارے وہی
ہیں وہی عیش و عشرت کے مارے وہی

عرصۂ حشر عالم بنا الاماں — آہ یہ زندگی کی فضا الاماں
لٹ گئی عورتوں کی حیا الاماں — بن گئے راہزن، رہنما الاماں
آدمی، آدمی کا خدا الاماں

کتنے فاقہ زدہ چہرے بے رنگ ہیں — کتنے شیدائی بربط و چنگ ہیں
کتنے انساں یہاں زیست سے تنگ ہیں — کتنے احساس آلودۂ زنگ ہیں
رہنما مطمئن، راہرو دنگ ہیں

ظلم کے راج میں عدل چلتا نہیں — جنگ کی گود میں امن پلتا نہیں
آندھیوں میں کبھی دیپ جلتا نہیں — مہرِ اسلام جب تک نکلتا نہیں
رنگ باطل بھی اپنا بدلتا نہیں

(دوسرا ورق)

آدمی مقصدِ زندگی پا گیا — بھولا بھٹکا ہوا راہ پر آ گیا
روحِ افسردہ پر نور سا چھا گیا — سوزِ ایماں سے ہر سینہ گرما گیا
چہرۂ شیطنت غم سے مرجھا گیا

چشمۂ انصاف کے ہر طرف ہیں رواں — کلیاں ایمان کی ہیں تبسم کناں
امن کی زندگی ہو گئی جاوداں — فصلِ گل آ گئی اور سج گئے گلستاں
آدمی، آدمیت کے ہیں پاسباں

"حکمتِ ابنیائی" فلاحِ جہاں — ہے پیامِ خدائی میں امن و اماں
منتشر ہو گئیں ظلم کی دھجیاں — جگمگانے لگے آشتی کے نشاں
جسم بھی مطمئن، روح بھی شادماں

بادۂ عشق کے جام سب نے پیئے — چاک دامانِ ہستی کے سب نے سیئے
اہلِ ظلمت بہت غل مچایا کئے — قبل اٹھے رہگذاروں کے لیکن دیئے

آلِ مظفر نگری

درد

درد کیا ہے بربطِ صبحِ طرب کا ساز و سوز
شام کے گیسوئے برہم کا سوادِ جانفروز

خواب میں ہوتی ہیں جس دم صبح کی بیداریاں
مطلعِ خورشید آتا ہے نظر ظلمت نشاں

کند ہو جاتا ہے سورج کی کرن کا نیشتر
جم کے رہ جاتا ہے خونِ نبضِ شفق میں سر بسر

گھیر لیتا ہے فضاؤں کو طلسمِ خامشی
ہر طرف چھایا ہوا ہوتا ہے ابرِ بیخودی

دفعتہً نجمِ سحر کو نیند آ جاتی ہے یوں
جیسے سو جاتی ہے چنگاری بآغوشِ سکوں

دور رہ جاتا ہے منزل سے سحر کا قافلا
گم فضائے چرخ میں ہوتی ہے آوازِ درا

درد تب لیتا ہے آکر جوش میں انگڑائیاں
ذرّے ذرّے کو بنا دیتا ہے مشرق آشیاں

ٹوٹ جاتا ہے یکایک خود طلسمِ خامشی
کھلنے لگتے ہیں جہاں میں سب پہ اسرارِ خودی

جنبشِ موج ہو کہ دے کے درسِ اضطراب
ناچتا ہے اوس کے قطروں میں حسنِ آفتاب

شوقِ بلبل میں لگا کر آگ سورج کی کرن
پھول کو دیتی ہے پھر ترغیبِ چاکِ پیرہن

میکدہ ہوتا ہے یا خمیازۂ ساحل کا جوش
مستیٔ ساقی کہ موجِ جلوۂ بادہ فروش

پھیل جاتا ہے فضا میں نغمۂ دیرِ مغاں
گونج اٹھتی ہے حرم کے صحن میں بانگِ اذاں

بجنے لگتا ہے زمین سے آسماں تک سازِ درد
گونجتی ہے عرصۂ کونین میں آوازِ درد

کتنے جلوے ہیں ابھی تاروں میں جو روشن نہیں
کتنے لالے ہیں ابھی جو زینتِ گلشن نہیں

کتنے گوہر بطنِ قازم میں ابھی پوشیدہ ہیں
کتنے قلزم ہیں جو قطروں میں ابھی خوابیدہ ہیں

دور ہیں لاکھوں ابھی خاموش جلوہ گاہ میں
سینکڑوں موسیٰ عراں گامزن ہیں راہ میں

بن رہا ہے یوسفستاں عرصۂ غیب وجود
ہیں بہت یعقوب ابھی بیگانۂ بزمِ شہود

حسن کے جلوے ہیں لاکھوں بے نیازِ دید ابھی
داغ کی صورت نہفتہ ہیں بہت خورشید ابھی

درد ان کو ایک دن پردے سے باہر لائے گا
گوشے گوشے میں جہاں کے انقلاب آجائے گا

حسن مثنیٰ انور

سائل اور شب خیز

سائل:-

شب سکوت افزا ہے اے شب زندہ دار!
کوئی نغمہ روح پرور چھیڑ دے
زندگی ہو پارۂ دل کی طرح
ایسا کوئی ساز بہتر چھیڑ دے
تجھ میں پنہاں زندگی کا سوز و ساز
تیری راہوں میں ستاروں کا ہجوم
بجلیاں مضمر تری آواز میں
تیرے قدموں پہ ستاروں کا ہجوم
تو نے سیکھا ہے کہاں رمز حیات
ہے کہاں ملتی کتاب زندگی!
آ ہمیں دیوار زنداں توڑ کر
کس طرح کھولا ہے باب زندگی!
کاروان زندگی کے راز دار!
کاروان عمر میں لے چل مجھے
قید ہستی سے بہت اکتا گیا
کر رہی ہے زندگی بے کل مجھے
بخش دے کچھ زندگانی کے صفات
گرمئ گفتار مجھ کو بخش دے
پھونک ڈالوں میں غلامی کا جہاں
آگ کا پندار مجھ کو بخش دے

جواب شب خیز:-

سائل مسکیں! تری آواز میں
شان دین مصطفےٰ ملتی نہیں
گلشن دل میں ہے افرنگی مہک
بوئے سوز مرتضےٰ ملتی نہیں
گردش ایام کے ہمراہ ہے
عہد صدیقی و عثمانی نہیں
ہیبت فاروق اعظم کیا ہوئی
تیرے دل میں نور ایماں نہیں
دی گئی تجھ کو کتاب خشک و تر
اور تو ناواقف اسرار ہے
آہ اے ناداں خیالوں میں ترے
آج شرع احمدی بیکار ہے!
خود فراموشی نے اندھا کر دیا
دل کا آئینہ بھی زنگ آلود ہے
سربلندی، ہمت عالی تری
کفر کی درگاہ میں مسجود ہے
کھو چکا ہاتھوں سے تو آئین حیات
ساز ہستی اس لئے خاموش ہے
تو نے کھو دی لذت جام الست
زندگی سرگرم ناؤ نوش ہے

کھا گیا تجھ کو کلیسا کا فریب
اور تو اے بے خبر سوتا رہا
حق شناسی کی نگاہیں چھین کر
کیف باطل میں تجھے کھوتا رہا
کیا بتاؤں تجھ کو رازِ زندگی
تیری دنیا اور تھی اب اور ہے
کر سکا تو نور و ظلمت میں نہ فرق
تیری جو رفتار ہے بے طور ہے
دیکھ اب آئینہ، گفتار میں
اپنے ماضی کی خیالی صورتیں
اے خلیلِ بت شکن کے نورِ عین
توڑ دے ساری بھیانک مورتیں
کعبۂ دل کا نگہباں بن کے تو
بوذر و سلماں کا لے سوزِ حیات
گرمیٔ عشق بلالی چاہیے
پھر کھلیں گے رازہائے کائنات
موج زن ہو جائے تیرے گرد و پیش
ایک بحرِ بیکراں زندگی
عشق کے دریائے بے ساحل میں پھر
تو بنے روحِ رواں زندگی
زندگی ہے ایک برقِ تیز رو
زندگی شمشیر کی اک دھار ہے
شعلۂ جوالہ ہے یہ زندگی
زندگی ثابت نہیں سیار ہے
زندگی کا کارواں ہے تیز گام
کوئی روکے لاکھ رک سکتا نہیں
قصرِ شاہی ہو کہ تاجِ خسروان
زندہ ہے انساں تو جھک سکتا نہیں
دامنِ شب سے نکلتی ہے سحر
زندگی کے واسطے غم چاہیے
حسن و رنگ و بوئے گل کے واسطے
گریۂ شبنم کا عالم چاہیے

عیش و عشرت زندگی کا ہے جمود
اور روحِ زندگی، گرمِ سفر
شانِ ہستی چاند میں تاروں میں ہے
جو نظر آتے نہیں وقتِ سحر
دن کے ہنگاموں میں گم ہے زندگی
زندگی راتوں کے سناٹے میں ہے
ہر قدم پر جوششِ تعمیرِ حیات
دشتِ ناہموار کے کانٹے میں ہے
عشق سے ہے زندگی کا سوز و ساز
عشق ہی سے زندگی ہے زندگی
عشق سے کھلتے ہیں اسرارِ حیات
رات دن کی زندگی ہے زندگی
غم بہارِ گلستانِ عشق ہے
عشق آئینہ ہے سوز و ساز کا
زندگانی ہے فضائے عشق میں
گر سلیقہ ہے تجھے پرواز کا
عشق ہے محمود ہے نقشِ خودی
عشق ہے گویا کتابِ زندگی
عشق ہے سرمایۂ لطفِ حیات
عشق ہے لبریز بابِ زندگی
گرمیٔ گفتار سوزِ عشق ہے
اور سوزِ عشق ہے جانِ حیات
دیکھ غافل زندگی فانی نہیں
اصل میں ہے زندگی بعد الممات
ٹوٹ جائے گا غلامی کا فسوں
عشق [illegible] زندگی [illegible] کر
[illegible]
غیر فانی [illegible]

نثار احمد فاروقی

اُردو شاعری میں رمزیت و اشاریت

اُردو شاعری کے عشقیہ عناصر تصوّف کی پیداوار ہیں۔ اور تصوّف کے نقش و نگار میں یونانی فلسفہ کے روغن کی چمک دمک ہے۔ چونکہ تصوّف کے نظریات خالص اسلامی اور تعمیری نظریات نہیں کہے جاسکتے۔ اِس لئے اُردو شاعری کی اقدار بھی صحت مند زندگی کا شعور اپنے اندر نہیں رکھتیں۔

میں یہاں عشقیہ و غزلیہ شاعری کے چند مخصوص اشاروں (SYMBOLS) سے بحث کروں گا۔ جن کی بادی النظر میں کبھی کوئی اہمیت محسوس نہیں کی گئی۔ لیکن انہوں نے ذہنوں کی تخریب میں اور اسلامی نظریات کو کمزور کرنے میں لاشعوری طور سے زبردست کام کیا ہے۔

عشقیہ شاعری میں کفر شعراء کی ایک مخصوص اصطلاح ہے جس کا مجرّد مفہوم انکار کرنا۔ اخراج کرنا۔ ناشکری و نافرمانی کرنا یا جھٹلانا ہے لیکن اسلامی اصطلاح میں غیر اللہ پر ایمان لانا، اور ایاکَ نستعین کی تکذیب کرنا۔ اللہ کے فرمان کو ٹھکرانا۔ سرکشی و بغاوت کرنا مراد ہوتا ہے۔ گویا اسلام کے معنی سپرد کرنا۔ سونپ دینا۔ تسلیم کرنا۔ متوجہ ہونا۔ مان لینا ہیں۔ تو کفر اس کے بالکل منفی ہوا۔ شعراء نے اِس سے کافی استفادہ کیا ہے۔ دراصل انہوں نے نظریہ قائم کیا ہے کہ اسلام محض ایک اضافی حالت (RELATIVE TERM) ہے اور کفر ایک بسیط حقیقت، جسے کچھ قید و رسم نے ایمان بنا دیا ہے۔ اِن قیود کو توڑنا جوشِ عشق اور شوقِ وصال کی وہ منزل ہے جس پر پہنچے بغیر، محبوب تک رسائی دشوار ہے ؎

اے شیخ، وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا (اصغر)

ایمان و کفر کی کشمکش کے درمیان عاشق اپنی راہ و منزل متعین کرتا ہے۔ وہ اِن کے بین بین چل کر محض وصالِ محبوب کو اپنا مقصد بناتا ہے۔ کفر کی وسعت یہ ہے کہ وہاں ہر مستی و بیخبری کی وجہ جواز پائی جاتی ہے۔ ہر بے راہ روی کی ایک تاویل کی جاسکتی ہے۔ اِس لئے "کفر" آزاد مزاج طالبِ محبوب کو ایمان کی قیود سے زیادہ پیارا ہے۔ جہاں پر لغزش پر بازپرس کی جاتی ہے۔

منزلِ کفر سے گذر کر شاعر کو نفسِ مطمئنہ حاصل ہو جاتا ہے اور یہ ایمان و کفر سے ماورا ایک ایسی منزل ہے جہاں شیخ و برہمن دونو ہی بدگمان نظر آتے ہیں ؎

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

اِسی کفر نے معشوق کی گلی کو طائف کے لئے دیر و حرم سے زیادہ محبوب، مقدس اور مسکون و مامنیت کی جگہ بنا دیا ہے۔ وہ کعبہ و بت خانہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے ؎

کیسا قبلہ، کس کا کعبہ، کون سا حرم ہے، کیا احرام
کوچہ کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

عشق کے میدانِ آزمایش میں کود پڑنے کے بعد کفر کی تمام علامات بھی امتیازِ عاشقی سمجھی جاتی ہیں۔ اور قشقہ و صندل و زنّار سے عشق کو آراستہ کیا جاتا ہے ؎

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو، اُن نے تو
قشقہ کھینچا۔ دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

اِس منزل پر پہنچ کر کعبہ بھی ایک بے وقعت سی شے ہو جاتی۔ اور دل کا مرتبہ کعبہ سے بڑھ جاتا ہے۔ ہزار کعبے اگر ڈھا دیئے جائیں تو پھر تعمیر ہو سکتے ہیں لیکن ایک دل میں اگر ٹھیس لگی۔ آگئی تو وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ کعبہ کا تو یہ حال ہے۔

رہابت خانہ وہ جلوہ گاہِ معشوق ہے۔ وہاں آئینۂ سنگ میں تصویرِ جمال نظر آتی ہے۔ اور بتوں کی خاموشی اُن کا ناز، عاشق کا نیاز اُدھر کا تغافل۔ اِدھر کا اضطراب واشتیاق سازِ عشق کو سوز و گداز کے نغموں سے بھر دیتا ہے۔

اِس کفر نے شیخ کی پگڑی اچھالی ہے، اُردو کا کون سا شاعر ایسا ہے جس نے شیخ کو کلمۂ خیر سے یاد کیا ہے۔ اُس کی بزرگی و پارسائی کا اعتراف ہے، اُس کی ریشِ مقدس کا احترام ہے۔ اُس کے زہد و عبادت کی ستائش سائی ہے لیکن یاں ہمہ وہ اِس لئے مطعون ہے کہ بت خانہ ترک کر کے حرم پر رجحان ہوا ہے۔ نماز پڑھتا ہے۔ شراب طہور کے "دلدادہ" نامعتبر مطمئن ہو جاتا ہے۔ حور و غلمان کے خیالی پیکر سے دل بہلاتا ہے۔ اور جنت کی خواہش میں مگن ہے۔ سجدے پر سجدے کئے جاتا ہے۔ بت خانے میں کیوں نہیں آتا۔ زیر کی طرح کس لئے نہیں جاتا۔ شراب ناب کیوں نہیں پیتا۔ اور عاشق کی طرح گریبان چاک ہو کر صحرا صحرا کی خاک کیوں نہیں چھانتا۔ کس لئے تسبیح چھوڑ کر زنار نہیں باندھتا۔ اُسے تلقین کی جاتی ہے کہ ؎

زنار باندھ، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہم وار دیکھ کر

زاہد کو "مناجاتی" "ارخشک" کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ اُس کی ہیئت کذائی کا خوب خوب خاکہ اڑایا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا ناصح کا مسخر و تضحیک اور محتسب کی تذلیل و تحقیر!

روزِ محشر کی کچھ اہمیت ہے تو اتنی کہ ع
اس بت کی ابتدائے جوانی مراد ہے

اس دن معشوق کا دامن شاعر کے ہاتھ میں ہوگا اور اس کی جفاکاریوں کا بدلہ بھی چکایا جائے گا۔ بہشت بھی تب ہی کوئی وقیع شے ہو سکتی ہے کہ وہاں یار کا وصال نصیب ہو۔ ورنہ محض حوروں کی آنکھیں کی لاگ ہی بہشت کے عزیز رکھنے کا سبب نہیں۔

اِس کے علاوہ اُردو شاعری کی تمام تر اشاریت ایک ایسے رجحان کی پیداکردہ ہے جو اسلام کے علی الرغم ہے۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ یہ بات محض رمزیت و اشاریت تک محدود ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں ان ہی الفاظ نے عشق کا تصور پیدا کیا ہے۔ دل کی انجمن کو ان ہی گھروں سے چراغاں کیا گیا ہے۔ لیکن کیا ہمیں اتنا عرض کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ جس طرح اپنے مجازی و اصطلاحی معنوں میں یہ اشاریت ایک بیّن و وسیع مفہوم، ایک والہانہ ادائے ہوئے ایک مخصوص رجحان کی ترجمانی کرتی رہی ہے کیا اسی طرح اس کو مثبت نہیں بنایا جا سکتا تھا۔؟

بوالعجبی یہ کہ معرفت و سلوک کے فائدہ کی لذت انہی کفریہ مضامین سے ہے۔ ہمہ اوست کے جلوے بت خانہ میں نظر آتے ہیں۔ اور شراب عرفان و آگہی کے غم میکدہ میں سنڈھائے جاتے ہیں۔ جہاں پیرِ مغاں کے علم سے سجادہ کو آلودہ مے کرنا بھی عین ایمان ہے۔

یہ اشاریت کتنی بھی بیّن ہو لیکن وہ غیر محسوس کام جو اقدارِ حیات کے بگاڑنے میں ان کے پس منظر کے رجحانات نے کیا ہے وہ پورا ہوا ہے۔ دہریت و اشتراکیت اسی رمزیت کے سہارے اُردو میں داخل ہوئی ہے کتنی حیرت افزا بات ہے کہ جس شاعری کا دامن گلہائے تصوف سے رنگا رنگ ہو، ہمہ اوست سے بسا ہوا ہو، معرفت و درویشی کی شراب سے سرشار ہو، عشق و محبت کے تصور سے پیراستہ ہو۔ اس کا ردِ عمل یہ ہو کہ تمام رجحانات ایک دم منقلب ہو جائیں۔ اور پھر وہی معشوق جو کل تک غیر پر مہربان تھا جس کی محفل ناز تک رسائی عرشِ اعظم پر پہنچ جانے سے بھی کچھ کم نہ تھی۔ اور اسی سے خدا کا وصال بھی مراد ہوتا تھا وہ نئے اشتراکی رجحان نے بیسوا، طوائف، رقاصہ اور رنڈی کے مفہوم سے بسا دیا۔ کیونکہ خدا کا تصور فنا ہو رہا تھا اور الحاد کے نقوش ذہن پر اُبھر رہے تھے۔

آج کا ترقی پسند شاعر رنڈی، بل، دہواں، مزدور، کسان، ہل، درانتی، ہتوڑا، گیہوں کی بالی، دھان کے کھیت اور بھوک و عریانی کو شاعری کا جزوِ اعظم بنائے ہوئے ہے۔ نئی شاعری اِن ہی (SYMBOLS) سے مملو ہے معرفت و تصوف کے مضامین نے کسی مرتبۂ بلند پر پہنچانے کے بجائے دہریت کے غار میں ڈھکیل دیا۔

اب سوال صرف "غمِ جاناں" "غمِ فراق" "غمِ عشق" اور "غمِ حیات" کا نہیں۔ اب معاشی مسئلہ کا غم ہے۔ روزگار کا غم ہے بنتِ حوا کی عصمت کے سربازار فروخت ہونے کا غم ہے۔ اب وصالِ یار کی

فکر نہیں۔ جنت و دوزخ کی تشویش نہیں۔ یوم نشور کا پتہ نہیں۔!

سرمایہ داری کو جنم دینے اور جنم دے کر ان کا گلہ گھونٹنے کا مسئلہ ہے مزدور کی اصلاح اور ملوں کی تعمیر کا سوال ہے۔ ترقی پسند(؟) شاعر علوں کی چمنی کے دھوئیں کو اب اتنی اہمیت دیتا ہے۔ جتنی ماضی کی شاعری میں "دود چراغ محفل" یا "لالۂ دل" کو حاصل تھی۔!

حدیث شاعری نے سرتاسر غم روزگار کو اپنایا ہے۔ غم عشق بھی ہے لیکن عشق کا تصور الحاد کی آمیزش سے خالص مجازی اور جنسی ہو گیا ہے۔ معاش کے بعد سب سے بڑا سوال جنس کا ہی ہے۔

ایک حدیث نبوی ہے۔ خداوند جل وعلیٰ نے مخلوقات کے تین طبقہ تخلیق فرمائے۔ ملائکہ ۔ انسان اور ۔۔ حیوان۔

پھر ان کے درجات کی تخصیص و تعیین اس طرح فرمائی کہ دو متضاد جذبے عقل اور شہوت پیدا کئے اور ان دونوں جذبوں کو مخلوقات کے ان تین طبقوں میں اس اعتبار سے تقسیم کر دیا کہ ملائکہ کو صرف عقل میں سے حصہ دیا گیا۔ چنانچہ وہ گناہ کرنے پر قادر نہیں۔ اور معصوم ہیں۔

حیوانوں کو فقط شہوت دی گئی۔ لہٰذا ان سے ان کے عمل کی بازپرس بھی نہیں کی جائے گی۔ وہ معذور ہیں۔

لیکن انسان کو عقل اور شہوت دونوں سے بحصۂ مساوی بہرہ ور فرمایا گیا۔ اور ساتھ ہی ارشاد ہوا اگر تمہاری عقل تمہاری شہوت پر غالب آگئی تو تمہارا درجہ ملائکہ سے بھی بلند و بالا ہے لیکن اگر تمہاری شہوت نے عقل پر فتح حاصل کر لی تو بہائم سے بھی بدتر مانے جاؤ گے۔

مجازی عشق کا جذبہ جو جنس سے میل کھاتا ہے۔ دراصل یہ ہی شہوت ہے جو خالصتاً حیوانوں کو ملی ہے اور انسان کو عقل کے ساتھ توازن قایم رکھنے کے لئے ودیعت کی گئی ہے۔

انسان کی اس آخری کمزوری سے نئے رجحانات کے علمبردار مادیوں نے فائدہ اٹھا کر اپنی تحریک کو عوامی بنایا ہے۔

اردو شاعری کی تدریجی تاریخ اور اس کے ارتقاء پر غور کیجئے کہ معرفت و سلوک کے مضامین کس طرح حقیقت سے مجاز کی طرف منتقل ہوئے اور اس راہ سے ہو کر دہریت۔ الحاد۔ بیدینی اور فسق و فجور کے سانچوں میں ڈھل گئے۔! اب رقیب اور اصول تنقید کیا ہو۔ اور اس کا تعین کس طرح ہو سکتا ہے۔

عدو کو گالیاں نہیں دی جاتیں۔ سماج کو کوسا جاتا ہے۔ یہاں افسانوی ادب سے بحث نہیں ہے۔ ورنہ اس سماج دشمنی کی سیکڑوں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ بلحضاً یہ سمجھ لیجئے کہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی جنسی جذبہ کے زیر اثر باہمی محبت کرتے ہیں اور وہ محبت گناہ و بے حیائی کی مختلف منزلوں سے گذر کر شادی کی منزل پر پہنچتی ہے۔ تو والدین حاجب و حائل ہوتے ہیں۔ یا قانون مانع ہوتا ہے۔ اور افسانہ نگار فوراً سماج کو ظالم۔ بے رحم بے درد۔ اور نہ جانے کیا کیا کہنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کو سوسائٹی کے قانون کو اندھی تقلید سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ مقصد کے اعتبار سے بات یہاں ہی پہنچتی ہے کہ کئی تہذیب کے دور میں جو مرد جس عورت سے چاہے اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کرے اور سماج اور قانون یا سوسائٹی کے ذمہ دار افراد اس سے قطعاً کوئی باز پرس نہ کریں۔ بالفاظ دیگر گناہ کرنے کی مکمل آزادی ہو!

میں اس طرح اسلامی ادب سے ہمدردی رکھنے والے بھائیوں کو اس ذمہ داری کا احساس دلانا چاہتا ہوں کہ اس دور میں جبکہ انہوں نے اچھا، صالح، صحت مند اور تعمیری ادب پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ یہ سوچ لیں کہ انھیں اردو شاعری کے پورے قالب کو بدلنا ہے۔ رجحانات کے پورے ڈھانچے کو تبدیل کر دینا ہے۔ ورنہ یہ نئی روایات زندگی پر اس طرح چھا جائیں گی جس طرح اٹھارویں صدی کے زوال آمادہ دور میں فاقہ مستی و بے خبری پورے معاشرہ پر مسلط ہو گئی تھی۔

ان قدروں کا بدل دینا کوئی آسان کام نہیں۔

سب سے پہلے ہمیں تنقید کے سالم نظریئے بنانے ہیں۔ اور ان میں ادب کی ہر صنف کو اس کا واقعی مقام دینا ہے۔ یہ بھی تعین کرنا ہے کہ کلاسکی ادب کا ان اصولوں کے پیش نظر کیا درجہ ہونا چاہئے۔ اور ہم اردو کے ادب شعری کو کس انداز میں پرکھ سکیں گے۔ یہ کام بھی بجائے خود ایک مکمل تحریک کی صورت چاہتا ہے۔ اردو شاعری میں جن جہات افروز اقدار کی کمی ہے ان کو نہ صرف پیدا کرنا بلکہ عوامی بنانا ہے۔ وہ جس طرح نئے ادبی نئے انتشار رجحانات کی گذرگاہوں کو شاعر و متصوف نے صاف کیا اور انہیں پنپنے کا موقع دیا۔ اسی طرح موجودہ تخریبی رجحانات انسان کو زندگی

محمد عثمان رمز

فلسفۂ قنوطیت

یہ دنیا کیا ہے؟ یہ وسیع ترین کائنات کیا ہے؟ فکرِ انسانی نے اس کا جواب ہمیشہ دینے کی کوشش کی ہے۔

قدیم مصری تہذیب جب اپنے شباب پر تھی تو اس وقت کے مفکرین کا خیال تھا کہ دنیا ایک صندوق کے مشابہ ہے۔ یہ زمین ــــ جس پر ہم رہتے ہیں۔ اس صندوق کی سطح ہے۔ اور یہ آسمان جس پر چاند تارے چمکتے ہیں۔ اس کا ڈھکن ہے۔ سورج، چاند اور ستاروں کو خداؤں نے ڈوریوں کی مدد سے آویزاں کر رکھا ہے۔ دوسروں نے کہا صرف ستاروں کو خداؤں نے آویزاں کر رکھا ہے۔

اس طرح کے اظہار خیالات دیکھنے ہی سے خرافاتی (MYTHO-LOGICAL) معلوم ہوتے ہیں۔ فلسفۂ قنوطیت کا اس سے کوئی تعلق نہیں اسی طرح اس کا تعلق یونانی مفکرین (تھیلیز، اینکزیمنڈر اور اینکزیمنز) کے مخصوص فلسفۂ مادۂ (HYLOZOISM) سے بھی نہیں۔

قنوطیت پسند مفکرین دنیا کو ایک مخصوص نظر سے دیکھتے ہیں۔ جس کا پرتو برہمنیت اور بدھ مت میں ملتا ہے۔ آیئے ان کا ایک مختصر جائزہ لیں۔

جب ہندوستان تہذیب اپنے نقطۂ عروج کی سمت بڑھنے لگی تو برہمن مفکرین نے یہ بتایا کہ اس کائنات کے پس پردہ ایک مقتدر اور اعلیٰ ہستی کارفرما ہے۔ اس کا نام برہما ہے اور کائنات ایک سراب (مایا) ہے جھاؤں یعنی مایا جو پرسن اپنشد کا یہ ایک کھلا ہوا درس ہے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ کائنات پر ایک سنہری چادر پڑی ہوئی ہے جو اپنی چمک سے کمزور ارادے والے انسان کو اپنی طرف لبھا لیتی ہے اور وہ تلاشِ حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے۔ اپنشد کے مطابق اس فریب سے بچنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ انسان اپنی محدود روح کو برہما کی لامحدود روح میں حلول کر دے۔

مایا کا تصور شنکر کے فلسفہ میں اور گہرا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ ان دونوں میں بس منطق کا فرق ہے۔ شنکر نے مایا فلاسفی کو منطقی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کا یہ کہنا ہے کہ اگر ہم دنیا کو اپنے حواس کی مدد سے دیکھیں تو دنیا حقیقی (REAL) ہے۔ مگر اسی کو اگر ہم مافوق الحواس (TRANSCEDENTAL) نظریہ کی تحت دیکھیں تو وہ ایک چھاؤں سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

چونکہ ہمارے آلات حواس (SENSE-ORGANS) ہمیں دھوکا ہی دیتے رہتے ہیں لہٰذا یہ علم کا ابتدائی اور غیر اعتباری درجہ ہے۔ اس پر ہمیں بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔ مافوق الحواس نظریہ ہی علم اور گیان کا صحیح ذریعہ ہے۔ اور اس کی رو سے دنیا مایا ہے۔ ــــ حقیقت برہما اور برہما حقیقت ہے۔

شنکر سے صدیوں پہلے بدھ نے برہمنیت کی ایک شاخ تراش لی۔ اس نے براہِ راست یہ تو نہیں کہا کہ دنیا مایا یا چھاؤں ہے۔ مگر اس نے مادہ پرستوں کی طرح کبھی یہ بھی نہیں کہا کہ دنیا مادی ہے۔

اس کا یہ کہنا تھا کہ انسان کی حقیقی زندگی نروان کے بعد شروع ہوتی ہے۔ نروان سے پہلے انسان بار بار جنم لیتا ہے۔ جنم لینے کا سلسلہ اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک انسان مادی مفاد میں الجھا رہے۔ وہ دنیا کے پیچھے جتنا ہی دوڑتا ہے اتنا ہی نروان سے دور ہوتا جاتا ہے۔ اتنا ہی اس کا کرم اسے پیچھے ڈھکیلتا جاتا ہے اسی قدر وہ رنج و غم، حزن و الم اور مصائب دنیا کا شکار ہوتا جاتا ہے۔

برہمنیت کے بالکل برعکس بدھ اپنے فلسفہ کی ابتدا دنیا سے کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کے چار سچے نقاط کا نظریہ پیش کرنا بیجا نہ ہوگا۔

سب سے پہلی سچائی یہ ہے کہ دنیا رنج و غم سے بھری ہے۔ دوسری

تیسری یہ ہے کہ انسان اپنے اندر رنج و غم سے نجات اور خوشی و اقتدار حاصل کرنے کی تشنگی محسوس کرتا ہے تیسری سچائی خواہشات کا ختم ہونا ہے چوتھی سچائی نروان حاصل کرنے کے آٹھ اصول ہیں۔

بدھ مت برہمنیت کی مخالفت میں پیدا ہوا۔ برہمنوں نے انسانی معاشرہ کو غیر مساوی طور طریق پر تقسیم کر رکھا تھا۔ غریب شودروں اور دوسرے نچلے طبقوں کے لئے ان زمین و آسمان کے مابین کہیں جگہ ہی نہ تھی۔ نہ تو وہ مندروں میں قدم رکھ سکتے تھے۔ نہ ہی گیان دھیان کا تصور کر سکتے تھے۔ ریاست اور حکومت بھی ان سے بے غرض اور بے نیاز تھی بلکہ ان کے مظالم بھی انہیں غریبوں پر ٹوٹتے تھے۔

اس ردِ عمل کا ردِ عمل یہ ہوا کہ عوام کے اندر ایک عجیب احساس کمتری، بیچارگی اور ناداری کا پیدا ہوا اور وہ ہمیشہ مصیبتوں میں گھرے رہے۔

بدھ نے اپنی آنکھیں انہیں عوام میں کھولیں۔ یہ عوام روندے ہوئے عوام ــــ کچلے ہوئے عوام ــــ اسے متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے۔

اس نے معاشرہ کا یہ رنگ دیکھتے ہوئے دُنیا کو رنج و غم کی بستی سمجھ لیا اور پھر اس کے لئے فلسفیانہ تاویلات نکالیں۔ اس کا بنیادی اعلان یہی رہا کہ دنیا رنج و غم کا گہوارہ ہے۔ یہ رہنے کی جگہ نہیں۔ انسان کو اس سے جلد از جلد نجات حاصل کرنی چاہئے۔ اور نجات حاصل کرنے کی سب سے پہلی شرط اس نے یہ بتائی کہ انسان اپنی خواہشات کا خون کر ڈالے۔ ورنہ یہ خواہشات اسے بھٹکا کر بُرے کرم کی طرف لے جائیں گی اور اس طرح وہ بھٹکتا رہے گا۔ اور بار بار جنم لیتا رہے گا۔

خواہشات کا خاتمہ کرنے اور اس پر قابو پانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان دنیا چھوڑ دے۔ اور تپسیہ کے ذریعہ گیان کی روشنی حاصل کرے۔ اس نے خود بھی سب کو چھوڑ کر برسوں جنگلوں کی خاک چھانی اور "گیان" حاصل کیا۔

کچھ لوگ بدھ مت کو ایک عملی تحریک ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ جذبہ یا تو "حسن ظن" پر مبنی ہے یا غلط فہمی پر۔ اس لئے کہ بدھ مت میں زندگی کے بہت سارے شعبے ایسے ہیں جو نہ صرف ادھورے ہیں بلکہ جنہیں بدھ نے سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ مثلاً معاشی، سیاسی اور معاشرتی وغیرہ۔ اس کے سامنے صرف ایک شے تھی جسے ہم رُوحانی ورزش کہہ سکتے ہیں۔

اب میں ایک بار پھر اس مضمون کے افتتاحیہ سوالات کی طرف لوٹتا ہوں۔ یہ دنیا کیا ہے؟ یہ وسیع ترین کائنات کیا ہے؟

کوئی مفکر اگر ان کے جواب میں یہ بات کہتا ہے کہ دُنیا چھاؤں ہے۔ کائنات مایا ہے یا یہ وسیع ترین دنیا گہوارۂ رنج و غم ہے تو قنوطیت اس جواب کا لازمی نتیجہ ہے۔

اگر قنوطیت کی بنیاد انسان کی پریشان حالی اور اس کی بربادی پر ہوتی ہے تو بیسویں صدی قنوطیت پسندی کے لئے موزوں ترین صدی ہوتی اس لئے کہ انسان آج جس بحرانی دَور سے گزر رہا ہے شاید اس سے پہلے اس کی تاریخ میں ایسا مقام کبھی بھی نہیں آیا تھا۔

آج وہ ایک ٹکڑا روٹی کے لئے آہنی کٹہروں میں محبوس ہے۔ آج وہ ایک دانہ گندم کے لئے سنہری جال میں پھڑپھڑا رہا ہے۔ آج وہ اپنے تن من کی آزادی کے لئے قید خانوں میں گھولنسا جا رہا ہے ان سے بھی زیادہ پریشان کن اور خوفناک واقعات اسکے مستقبل کے دروازہ پر منہ کھولے کھڑے ہیں۔ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے تصوراتی دہما کے ابھی سے انسان کو لرزہ براندام کئے دے رہے ہیں ــــ تہذیب اور تمدن کے چمکیلے کنگورے زمین پر ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ غرض یہ کہ انسانیت کے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔

لہٰذا یہ کہنا غلطی سے خالی نہیں کہ انسان کی بربادی اور اس کی پریشان حالی قنوطیت کا باعث ہیں۔ بدھ نے بھی جب یہ کہا کہ دنیا رنج و غم کا گہوارہ ہے تو اس سے صرف اتنا ہی کچھ مراد نہیں لیا بلکہ اس نے یہ بھی کہا کہ دنیا کے پیچھے دوڑنا چھوڑ دیا جائے ــــ دنیا ترک کر دی جائے۔ خواہشات کو مردہ کر ڈالا جائے۔ ورنہ نروان حاصل کرنا ناممکن ہے۔

مذکورۂ بالا سطروں سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قنوطیت کی بنیاد یا تو اس پر ہے کہ دنیا مایا ہے یا پھر یہ کہ دنیا رہنے کی جگہ نہیں۔ یہ دوسرا طریق بیان (کمزوریوں اور خامیوں کے لحاظ سے) کسی طرح بھی پہلے بیان سے کم نہیں۔

بیسویں صدی کے مادہ پرست مفکر نہ صرف یہ کہ اس نظریہ کی تردید کر دیتے ہیں بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا کی مادی حقیقت ہی سب کچھ ہے۔ مادّہ ہی اوّل اور مادّہ ہی آخر (؟)

یہاں پر مجھے کسی نظریہ کی تنقید مقصود نہیں، مجھے آپ سے جو کچھ عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مادّی نظریۂ عالم اسی طرح ایک نقطۂ انتہا ہے۔ جس طرح برہمنیت اور بدھ مت نے دوسرے منتہا کا رخ کیا۔ فلسفۂ قنوطیت کے جائزہ کو پورا کرنے کے لئے دوسرے ادوارِ فکر و نظر اور آدرش کا ذکر لازمی ہے۔ شاپن ہاور اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

ہیگل نے اپنی ساری زندگی اس کوشش میں ختم کی کہ دینائے فکر و نظر کو وہ یہ سمجھا سکے کہ وہ اصولِ وجود (PRINCIPLES OF BEING) اور اصولِ تخیل (PRINCIPLES OF THOUGHT) اصل میں ایک ہیں۔ لیکن شاپن ہاور نے (کانٹ کی طرح) دونوں کو متفاوت سمجھتے ہوئے تصورِ عقل (REASON) کی نفی کی۔ اور یہ بتایا کہ اصل وجود خواہش (WILL) ہے۔ یہ خواہش اندھی ہوتے ہوئے بھی وجود کے لئے ایک زور دار آلۂ سعی و کوشش ہے۔ یہی خواہش جو اہمیت کے لحاظ سے عام فہم خواہش سے کم اور قوت (FORCE) سے زیادہ ہے، وہ بنیادی حقیقت ہے جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا؟

جب ایک آرٹسٹ کوئی ازلی شاہکار پیش کرتا ہے تو یہی خواہش اسے ایک عکس (عکس حقیقت) سمجھتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے لذت و سرور حاصل کرتی ہے۔ آرٹسٹ اور آرٹ نواز دونوں (اسی خواہش کے ذریعہ) ایک لمحاتی سکون پاتے ہیں۔ لہٰذا ابدی سکون و راحت کا مسئلہ پھر بھی لاینحل رہ جاتا ہے۔

شاپن ہاور کے مطابق ازلی سکون اسی وقت میسر ہو سکتا ہے جبکہ انسان مجاہدۂ نفس اور ایثارِ نفس کی طرف رجوع کرے۔ اس کا خیال ہے دنیا میں ہر مسرت دوسری مسرت کا پیش خیمہ ہے۔ تلاش مسرت کا لازمی نتیجہ تلاش مسرت ہی پر ختم ہوگا۔ لہٰذا دنیا سے چھٹکارا پانے کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ انسان خواہش زندگی (WILL TO LIVE) ہی کو ختم کر ڈالے؟

یہاں پر میں اتنا عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ نظریہ نیا نہیں۔ اسی کو بدھ نے پیش کیا اور اسی کو مختلف پیرائے بیان کے ساتھ افلاطون نے اپنے مکالمہ فیڈو (PHAEDO) میں بہ زبان سقراط ادا کیا ــــــ "فلسفہ موت کا ہر سل ہے"۔ اور اسی کو کو عیسائی مفکرین تقریباً دس صدیوں تک پیش کرتے رہے۔

ان عیسائی مفکرین کا یہ خیال تھا کہ انسان پیدائشی گنہگار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ گناہ جو حضرت آدم سے فضا رجنت میں پہلی بار سرزد ہوا تھا سینہ بہ سینہ انسان میں چلا آرہا ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی زور کیوں نہ مارے مگر وہ اپنے گناہوں کی بخشش کا سامان نہیں کر سکتا۔ یہیں سے عیسائیوں کے اندر مایوسی اور قنوطیت پیدا ہوئی اور انہیں صدیوں غرقاب کئے رہی۔

"مگر اس کا کوئی حل بھی ہونا چاہئے ورنہ سب کے سب جہنم میں جائیں"۔ یہ ایک خیال تھا جو عیسائی مفکرین کو پریشان کرتا رہا۔ لہٰذا انھوں نے نعوذ باللہ یہ کہا کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بیٹے نے سولی پر چڑھکر سب کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ اور ہم ٹھہر کر غور کریں۔

مولانا مودودی اس نظریہ کی بابت تفہیم میں یوں رقمطراز ہیں۔

"یہ انسان کے اپنے خود ساختہ گمراہ کن نظریات میں سے ایک بڑا گمراہ کن نظریہ ہے۔ کیونکہ ایک مرتبہ جو شخص گنہگارانہ زندگی میں مبتلا ہو گیا اس کو یہ نظریہ ہمیشہ کے لئے مایوس کر دیتا ہے۔ اور اگر اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کے بعد وہ سابق کی تلافی اور آئندہ کی اصلاح کرنا چاہئے تو یہ اس سے کہتا ہے کہ تیرے بچنے کی اب کوئی امید نہیں۔ جو کچھ تو کر چکا ہے اس کے نتائج بہرحال تیری جان کے لاگو رہیں گے"۔

قرآن حکیم ایسے نظریہ کی سختی سے تردید کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی توبہ قبول کر کے صاف صاف اس کو ظاہر کر دیا ہے کہ نسل آدم پر حضرت آدم کے گناہ کا کوئی داغ نہیں رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اوصاف حمیدہ کا ذکر کرتے ہوئے جب اپنی ذات کو "توبہ کا قبول کرنے والا" بتایا ہے تو اس سے بھی یہی ظاہر ہے کہ جزا و سزا اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر وہ کسی کو جزا دے گا تو یہ بھی اس کی حکمت سے وابستہ ہوگا اور اگر سزا دے گا تو وہ بھی اس کی حکمت سے منسلک ہوگا۔ اس لئے کہ اس کے نظام میں بے اصولی یا بداصولی کو دخل نہیں۔

بہ الفاظ دیگر عیسائیوں کا یہ کہنا کہ حضرت عیسیٰ نے سولی پر چڑھکر سارے انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا بالکل غلط ہے۔

اس لئے کہ گنہگاروں کا معاف کرنا صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار کی بات ہے۔

اِن عیسائی مفکرین کے بعد کچھ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اٹلی کے مشہور شاعر لیوپارڈی (LEOPARDY) کا ذکر کروں۔ یہ بھی بہت بڑا قنوطیت پسند شاعر ہے۔ اس کا بھی یہی کہنا ہے کہ دنیا فریب ہی فریب ہے۔ محبت اس کے نزدیک ایک حسین فریب ہے۔ آزادی دھوکا ہے۔ ترقی چھاؤں ہے۔

وہ صرف موت کی جانب اپنے ہاتھوں کو بڑھاتا ہے۔ اجل کی دیوی کے لئے اپنی آغوش کھول دیتا ہے اس لئے کہ یہی ایک ایسا مداوا ہے جس سے وہ فریب گیتی سے بچ سکتا ہے۔ اس کا یہ کہنا ہے کہ دنیا میں راحت و سکون کہیں نہیں۔ انسان قدرت (NATURE) کے مظالم سہتے سہتے آخر شکر گہری نیند سو جاتا ہے مگر اسے ایک لمحے کے لئے بھی سکون میسّر نہیں ہوتا۔

اِس کا یہ خیال ہے کہ انسان روز ہزاروں بار مرتا ہے ہزاروں بار جیتا ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک رہتا ہے جب تک کہ وہ ابدی نیند نہ سو جائے۔

اس کا انداز بیان اس سلسلے میں بہت ہی ڈراؤنا اور پُرخوف ہوتا ہے۔

مگر لیوپارڈی کوئی اکیلا شاعر نہیں۔ جرمنی میں ہینے (HEINE) اور لیناؤ (LENAU) انگلینڈ میں بائیرن (BYRON) فرانس میں چیتو بریانڈ (CHATSAUBRIAND) مشہور قنوطیت پسند شاعر گذرے ہیں۔ ہندوستان کا تو پوچھنا ہی کیا۔ یہاں اُردو کے متعدد شعراء قنوطیت پسند نظر آتے ہیں۔

اب آیئے دیکھیں اُردو ادب میں قنوطیت پسندی کس دروازہ سے داخل ہوئی۔

اِس سلسلہ میں جو بات ہمیں پیش نظر رکھنی چاہئے وہ یہ ہے کہ اُردو نہ تو فاتح مغلوں کی زبان ہے اور نہ ہی مفتوح ہندوستانیوں کی۔ بلکہ سوسائٹی کو آپس کی افہام و تفہیم کے لئے ایک ایسی زبان کی ضرورت تھی جو نہ تو خالصتاً فارسی ہو اور نہ ہی ٹھیٹ سنسکرت لہٰذا بھاشا، فارسی، اور عربی کے ملاپ سے اُردو کا ڈھانچہ تیار کیا گیا۔

مگر اُردو کو جس طبقہ نے بڑھکر اپنایا وہ صوفیا کا تھا ان میں سے بیشتر فارس اور بغداد کے متوطن تھے اور ان اسلامی فلسفیوں کے ساتھ آئے جو یونانی اور ہندوستانی تراجم کے بعد ان کو ملے تھے۔ ان میں سے بیشتر غزالی اور ابن العربی سے متاثر ہوئے۔

اِن صوفیا کے لئے ہندوستان کی فضا بہت ہی سازگار تھی۔ جب انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ دنیا "جلوۂ حقیقی" کا پرتو ہے یہ فنا ہو جانیوالی ہے تو ہندوستانیوں کو جیسے بھولا ہوا سبق یاد آ گیا۔ وہ ان صوفیا کے کشف و کرامات سے بھی بہت ہی زیادہ متاثر ہوئے۔ تاثر کا یہ عالم رہا کہ بڑے بڑے سادھوؤں کے گڑھ ایک ایک دن میں "ایمان" لے آئے۔ اور ان کے درسِ مساوات پر نچلے طبقوں نے گروہ در گروہ لبیک کہا۔

بہرحال معاملہ بہت کچھ آسانی کے ساتھ چل نکلا۔ کچھ صوفیا نے رعایت برتی کچھ نومسلموں نے ہندوستانی رنگ و روغن چڑھایا اور زندگی گذرنے لگی۔

جو خاصانِ صوفیا میں داخل ہوئے انہیں وہی "موتو قبل ان تموتو" کا درس ملنے لگا۔ اور وہ یوگیوں کی طرح چلہ کشی کرنے لگے۔ اور ان حالات میں جب وہ شاعری کرکے نفسیاتی سکون حاصل کرنا چاہتے تو لازماً وہی مضامین ان کے پردۂ ذہن پر اُبھرتے جس میں انہوں نے اپنی زندگی رنگ رکھی تھی۔

مثال کے لئے اشعار کی کمی نہیں۔ اگر اُردو کے ابتدائی دور سے لیکر شاہ اکبر ابوالعلائی اور شاہ عبدالعلیم آسی کے دواوین دیکھے جائیں اور ولی سے لیکر داغ اور امیر تک کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو بے شمار ایسے اشعار ملیں گے جن میں درسِ فنا ملے گا۔ دنیا کی بے ثباتی ملے گی اور رنج و الم کا ذکر ملے گا۔ نمونتہً کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

مت جا تو دنیا کی پہ اس کی
عالم تو خیال کا چمن ہے (درد)

یہ تو ہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا (میر)

عالم مگر فریب کے اندر فریب ہے
ہر تشنہ غرقِ آب ہے موجِ سراب میں (قلق)

سیرِ جہاں سے ہم کو خبر ہے بھی اور نہیں
اِک واہمہ سا پیشِ نظر ہے بھی اور نہیں (مصحفی)

غالب کے اشعار اس سلسلہ میں اپنے اندازِ بیان کے لحاظ سے ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں صورتِ اشیاء مرے آگے

نظیرؔ کا ایک شعر اس مضمون کو یوں ادا کرتا ہے ؎

یہ جو اہرخانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب
اہلِ صورت کا ہے دریا اہلِ معنی کا سراب

"فنا" کا مضمون بھی دیکھئے ؎

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ بھی وطن کس کا ہے (نامعلوم)

دنیا میں رنج ہی رنج اور غم ہی غم ہیں ملاحظہ فرمائیے ؎

شادی کی اور غم کی ہے دنیا میں ایک شکل
گل کو شگفتہ دل کہو تم یا شکستہ دل (میرؔ)
غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں (غالبؔ)

عدم میں رہتے تو شاد رہتے انہیں بھی فکرِ ستم نہ ہوتا
جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا (مومنؔ)

اجل سے پیار اور مرمر کے جینے کا نقشہ بھی دیکھئے ؎

تو کہاں ہے اے اجل اے نامرادوں کی مراد
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے (فانیؔ)
ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا (فانیؔ)

"تموتو قبل ان تموتو" کی بھی ایک جھلک ملاحظہ ہو ؎

محتاجِ اجل کیوں ہے خود اپنی قضا ہو جا
غیرت ہے تو مرنے سے پہلے ہی فنا ہو جا (فانیؔ)

"یہ موتو قبل ان تموتو" شاپن ہاور کے اس تصور کی بدلی ہوئی تصویر ہے جہاں وہ یہ کہتا ہے کہ ہمیں خواہشِ زندگی (WILL TO LIVE) بھی ختم کر دینا چاہئے۔

مضمون طویل ہو جائے گا ورنہ یہاں کچھ اور بھی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ اب میں اس تنقید کی طرف آتا ہوں جسے اس موقع کیلئے اٹھا رکھا تھا۔ دنیا کو مایا۔ چھاؤں اور گمراہ رنج و غم کہنے والے ماورا سے باتیں کرتے ہیں اور اسے مادۂ اوّل اور مادۂ آخر تا نیوالی ایک گہری گھاٹی سے تعبیر کر رہے ہیں جہاں دلدل اور کیچڑ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لہٰذا دنیا کو فریب ہی فریب، سراب ہی سراب اور مایا ہی مایا کہنا من گڑھت فلسفوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

پھر یہ کہ اس دنیا کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ دنیا عرب کے مصلحِ انسانیت کے مطابق آخرت کی کھیتی ہے۔ "یعنی انسان کے لئے جو اس دنیا میں "خلیفہ" اور "نائب" بنا کر بھیجا گیا ہے۔ یہ دنیا امتحان گاہ و مقصدِ حیات ہے۔ اگر وہ خلق کائنات کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی گذارتا ہے تو اس کی آخرت سنورتی ہے اور اگر وہ اس سے تجاوز، سرکشی اور بغاوت کرتا ہے تو اس کی عاقبت خراب ہوتی ہے۔

یہ نظریۂ کائنات دوسرے فلسفیانہ عقائد و تصورات سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی روح "عملِ صالح" میں مضمر ہے۔ یہ نہ تو برہمنیت، بدھ مت اور تصوّف و رہبانیت کی طرح ترکِ عزلت کا درس دیتا ہے اور نہ ہی عملی جدّ و جہد کو اس دنیا تک محدود کرتا ہے۔ اس لئے کہ ترکِ عزلت کا درس دینے کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہم معاشی۔ معیشی۔ سماجی۔ تمدنی اور تہذیبی ذمہ داریوں کا خون کرتے ہیں۔ اور عملی جدّ و جہد کو دنیا تک محدود کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اخلاقی قدروں کو چیلنج کرتے ہیں۔ اسے یوں سمجھئے کہ ایک ظالم حکمراں ایک مظلوم داعیِ حق کو قید خانے میں ٹھونستا ہے۔ اب یہ بتائیے کہ دنیا کی کونسی وہ عدالت ہوگی جو ظالم حکمران کو اس کے ظلم کی سزا دے گی اور مظلوم داعیِ حق کو اس کے جذبۂ حق پرستی کی جزا دے گی؟ اگر دنیا میں کوئی ایسی عدالت نہیں اور سارے معاملات دنیا ہی تک ہیں تو پھر کیا آپ نیکی اور بدی کو بے ثمر تسلیم کر لیں گے؟ شاید ہرگز نہیں ——!! اس کے لئے تو ایک قائمِ مطلق اور ایک

بے لوث عدالت کی ضرورت ہے۔ اور یہی ہے تصورِ آخرت۔

ہاں تو وہ نظریہ جو دنیا کو آخرت کی کھیتی بتاتا ہے انسانوں[1] کو جنگلوں اور غاروں کی طرف نہیں لے جاتا۔ بلکہ ان روز و شب کے ہنگاموں میں اسے ایک ضابطۂ حیات دے کر کھڑا کر دیتا ہے اور اس کے اوپر یہ ذمہ داری عائد کر دیتا ہے کہ وہ خود اپنی آخرت کی کھیتی تیار کرے اور دوسروں کو اس کی ترغیب دلائے۔

دوسری صورت میں یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے سامنے باطل قوتیں مقابلے کو آئیں اس پر طرح طرح کے مظالم کریں اسے طرح طرح سے ڈرائیں۔ طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں اور اسے مایوسی کے گڑھے میں دھکیل دینے کی کوشش کریں مگر اللہ تعالیٰ کا ایسی صورت حال کے لئے یہ فرمانا ہے کہ "تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو[2]" اس کی رحمت سے بے آس نہ ہو۔ اور اس کی عنایات سے ناامید نہ ہو۔

الغرض اسلام قنوطیت کی کاٹ جڑ سے کرتا ہے اور انسان کے قلب میں رجائیت کی ایسی کرنیں پیدا کرتا ہے جو مشکل سے مشکل مرحلۂ زندگی میں بھی انسانی دلوں کو بجھنے نہیں دیتیں۔

ماہنامہ "معیار" کی مجلد فائلیں

سنہ ۱۹۵۱ء و سنہ ۱۹۵۲ء

ناظرین کی سہولت کیلئے مکتبہ معیار نے معیار کی سنہ ۱۹۵۱ء اور سنہ ۱۹۵۲ء کی فائلیں تیار کرالی ہیں۔ جو ریکارڈ میں رکھنے کے لئے نہایت موزوں ہیں۔

ایک مجلد فائیل کی قیمت ساڑھے تین روپے ہو گی۔

اخراجات و مصارف ڈاک بذمہ خریدار

تجارتی اغراض کے لئے زیادہ تعداد میں منگانے پر 25% فیصدی کمیشن دیا جائے گا

منیجر مکتبۂ "معیار" میرٹھ

---

[1] لا تقنطوا من رحمۃ اللہ

[2] ادباء اور شعراء اس سے مستثنیٰ ہیں۔

میتن طارق

عورتوں کیلئے لمحۂ فکر

پچھلے[1] واقعات کی روشنی میں یہ بات توصاف ہو گئی ہے کہ آج کی عورت آہستہ آہستہ اپنا پرانا چولا اُتار کر اُس کی جگہ نیا لباس زیب تن کر رہی ہے۔ مگر جدت و قدامت کی اِس کشمکش میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورتوں کا یہ اقدام اتفاقی ہے یا اس سے پہلے بھی کبھی یہ مسئلہ زیرِ بحث آچکا ہے جہاں تک تعلق ہے تو وہ یہ کہ نہ صرف زیرِ بحث آیا بلکہ زیرِ عمل بھی آچکا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ گزشتہ دور میں اِس قسم کے خیالات مخصوص خطّوں میں رونما ہوئے اور آج سائنس کی بین الاقوامیت نے اُس کو عالمگیر بنا دیا ہے چنانچہ مسائل تو وہی ہیں البتہ اشکال بدل گئی ہیں، جیسے کھانے پینے کی ضروریات، رہن سہن کے تقاضے تو ابتدائے آفرینش سے اپنی جگہ جُوں کے تُوں ہیں۔ لیکن جیسے جیسے تمدّنِ انسانی نے ارتقائی منازل طے کیں ویسے ہی ویسے اُن میں تبدیلی و آرائش پیدا ہوتی گئی اِسی طرح عورت و مرد کے تعلقات و وابستگی میں تو آغاز سے اب تک کوئی فرق نہیں آیا مگر اِس نئے دور نے جہاں ہر چیز کو دیدہ زیب بنایا ہے وہاں عورت کے جذبۂ خود پسندی کو بھی اُبھارا جس کا نتیجہ ہے کہ اب وہ نہ صرف بن سنور کر رہنا چاہتی ہے بلکہ شمع انجمن بننے کی ہوس اُسے تیتری کی طرح کشاں کشاں ایک جگہ سے دوسری جگہ لئے پھرتی ہے۔

تاریخ کے اس مقام سے اگر ہم ماضی پر نظر ڈالیں تو مورخ ہمیں بتائے گا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ایسا تو ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ تھپڑ اور دھات کے دور سے قطع نظر تاریخ انسانی کا وہ زمانہ جب تہذیب اپنے عروج پر تھی ہر ہنر کو خاطر خواہ اُبھرنے کے مواقع حاصل تھے۔ قدیم طرزِ فکر چھوڑ کر لوگوں نے نئے نئے اسلوب اختیار کئے۔ ادب، فلسفہ اور فنونِ لطیفہ میں نئی نئی موشگافیوں سے کام لیا گیا۔ زندگی کے ہر میدان میں نئی ہمّت اور نئے ولولوں کے ساتھ دوڑ دھوپ ہوئی تو خود بخود عورت کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔ قدیم یونان و روم کی تہذیبوں نے کشادہ دلی کے ساتھ اِس پر غور کیا۔ عورت کے وجود سے انکار کی گنجائش نہ تھی سوال صرف یہ تھا کہ ریاست کی ترقی کے لئے عورت کو کہاں تک ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ پوری توجہ کی مستحق تھی چنانچہ عورت کے اِس حق کو ٹھکرایا نہیں گیا۔ اُسے اسٹیٹ سے وابستگی کی اجازت دی گئی۔ جس کے لئے اُس نے اپنے آپ کو تیار کیا۔ بناؤ سنگار ہوا۔ زینت و زیبائش کا اہتمام کیا۔ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھا۔ حتیٰ کہ امارت و عیش پرستی اور بے محابگی حد سے گذر گئی۔ پانی کو سر سے اُترتا دیکھ کر اُس وقت کارُومانی فلاسفر کا سُن آنے والے خطرے سے لوگوں کو آگاہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ

اے روما کے رہنے والو!

آزادی نسواں کی یہ تحریک جو بخوشی اختیار کی گئی تھی اب خود مختاری اور انانیت کی آخری حدوں پر پہنچ گئی ہے۔ اب ہماری خواتین کی خواہش ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک سونے میں لدی ہوئی خوشنما قرمزی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تیوہاروں کے دن اور تمام دوسرے دنوں میں شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں بلا روک ٹوک سیر کریں اور خوشنما گاڑیوں پر سوار ہو کر سیر کو نکلیں مردوں کی طرح ووٹ دیں۔ رومانیو! یاد رکھو۔ اِن بیماریوں نے متمدن اور ترقی یافتہ ملکوں کا ستیاناس کر ڈالا ہے۔ ڈرو کہ وہ روز بد تم پر آنیوالا ہے۔

(انیسویں صدی کی انسائیکلو پیڈیا)

---

[1] اس مقالہ کی پہلی قسط معیار ماہ جون ۱۹۵۳ء میں شائع ہو چکی ہے۔

یہ پیشین گوئی جن ہولناک حالات کے ساتھ پوری ہوئی یہ تو تاریخ کے صفحات ہی بتا سکتے ہیں لیکن یہاں بحث صرف طبقہ نسواں سے ہے۔ چنانچہ اس عیش پرستی اور حسن فروشی کا جب ردِّ عمل شروع ہوا تو عورت کو اپنی ہستی برقرار رکھنی دشوار ہو گئی۔ اُس کو ہلاکت سے ہولناک عذاب میں مبتلا ہونا پڑا۔ مار پیٹ اور زدوکوب تو ایک معمولی بات تھی۔ ستونوں سے باندھ کر نیچے آگ روشن کر دینے میں بھی تامل نہیں کیا گیا۔ جس کی سوزش سے ان کا گوشت گل گل کر گرتا تھا اور ایسی بُری حالت سے اُن کی جان نکلتی تھی کہ الامان والحفیظ۔

یہ ردِّ عمل تاریخ عمرانی کے طالب علم کے لئے کوئی عجیب نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ مدنی سیرت و اخلاق نقطۂ عروج پر تھے لیکن رفتہ رفتہ دولت کی بہتات نے اُن کو عشرت پسندی کا خوگر بنایا اور عشرت کی افراط نے جنسی آوارگی کا ماحول پیدا کر دیا۔ عورت مرد کے باہم کھلے بندوں اختلاط۔ گندہ خصلتوں کمینہ عادتوں اور باہمی خصومتوں نے پرورش پائی۔ انجام کار دیکھتے دیکھتے ایک عظیم الشان سلطنت ذلت و تباہی کے غار میں اوندھی جا گری یوں بات ٹالنے کو ہم اور عوامل کو بھی تباہی کے اسباب میں گن سکتے ہیں۔ مگر یہ بھی ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ملک و ریاست کے داخلی انحطاط میں عورت پرستی کو بڑا دخل ہے۔ خصوصاً جبکہ اِس دور کے ریویو آف ریویوز کی پندرہ بیس جلد میں تحریری ثبوت بھی موجود ہیں۔ تو پھر انکار کی گنجائش نہیں۔

ریاست کی تباہی کے بعد غصے جلے ہوئے لوگوں کا عورتوں سے بدظن ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔ اس وقت یہ کہا جا سکتا ہے کہ انتقامی حالات میں شدت برتی گئی ہے لیکن اُسی کے ساتھ ساتھ سوچنے والوں کے لئے یہی حالات اس بات کا بھی پختہ ثبوت ہیں کہ تعیش و حسن پرستی کی وبا بھی انتہائی شدید ہوگی۔ کیونکہ بہرحال یہ جو کچھ بھی ہوا سب گزرے ہوئے اعمال کے نتائج تھے جس میں بازاری اوباشوں سے لیکر مزدور کسان۔ جاگیردار چیزیں بیچنے والا تاجر۔ اسٹیٹ کا ممبر حتیٰ کہ کلیسا کے مقدس راہب تک ملوث تھے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ کچھ واقعات معروف ڈھنگ سے سامنے آگئے ہیں۔ اور بعض واقعات سنگین دیواروں سے آگے نہ بڑھ سکے۔

بہرحال اِس انتہائی بے حیائی۔ شدید غلو اور شہوت پرستی کا ردِّ عمل بھی شروع ہوا۔ جذباتی تعلق کے جو نتائج نکل سکتے تھے وہ بھی کھل کر سامنے آگئے۔ جہاں تک اُمنگ و ترقی کا معاملہ تھا وہ اپنی جگہ درست تھا لیکن قدرت اور قدرت کے قانون کے دائرے سے باہر قدم نکالنے سے نہ صرف منزلِ زندگی تباہ ہوئی بلکہ عام مشاغلِ حیات میں بھی اُلجھاؤ پیدا ہو گیا۔ اوّل تو مرد کے فرائض کا بار بیچاری عورت کے سر ڈالنا ہی ایک ناواجب فعل تھا پھر اُس کو منزلی فرائض سے سبکدوش کر دینا عین اس کی فطرت کے خلاف تھا چنانچہ یہ دیکھ ہی لیا گیا کہ اس اقدام سے عورت کی شخصیت ہی کو صدمہ نہیں پہنچا بلکہ خانگی شیرینی میں بھی تلخی پیدا ہو گئی اور آج بعینہٖ انہیں حالات میں یہ تو آسان ہو گیا ہے کہ بسے بسائے گھر برباد ہو جائیں۔ مجرّد مرد اور عورت بنا شادی کئے ایک دوسرے کی شخصیت مسخ کرتے رہیں۔ مال و دولت سے محروم عورتیں بسر اوقات کیلئے کسی کے ساتھ ہمبستری کے خواب دیکھیں۔ آزاد اختلاط سے ہلاک امراض پیدا ہو ہو کر تمدن و معاشرت میں عظیم الشان خلل واقع ہو۔ تنگ دستی و پریشان روزگاری کی بدولت ناگوار حادثات رونما ہوں لیکن یہ بعید از قیاس ہے کہ فطرت کی حد بندیوں سے تجاوز کرنے کے بعد سکون و اطمینان کا سانس لیا جا سکے۔ محبت۔ شفقت۔ پاکی پاکیزگی عفت مآبی عصمت شعاری جو سرمایۂ جان و ایمان ہیں۔ قایم رہ سکیں اور اِس کے فقدان کا سب سے بڑا سبب یہی آزادیِ نسواں کی تحریک ہے۔ اِس تحریک نے پہلے پہل انیسویں صدی کی ابتدا میں یورپ میں جنم لیا۔ دراصل یورپ کا یہ اقدام کلیسا کے استبدادی حالات نیز پرانے عقائد و خیالات کے خلاف ایک بغاوت تھی لیکن چونکہ اِس کی بنیاد تدبر اور صالح اندازِ فکر پر نہیں بلکہ خالص جذباتی تھی اس لئے آغاز ہی سے قدم قدم پر اس میں تذبذب کا پہلو غالب رہا۔ نیز اسی کمزوری کے باعث مخالف موافق محاذ بھی قایم ہوئے اور ایک دوسرے کی پگڑی اُچھالتے رہے۔ لیکن اب آثار و نتائج کے اظہار کے بعد تو گھریلو اور داخلی زندگی کو عورت کے لئے موجب راحت و برکت بتانے والوں کو دشمن نسواں اور تنگ نظر کہنے والے بھی بادل نخواستہ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ

"آج عورت کی حالت کیا ہے۔ وہ ہر طرح محرومی اور مصیبت کی دنیا میں زندگی بسر کرتی ہے۔ یہاں تک کہ دستکاری کے عالم میں بھی اُسے پوری گنجائش اپنے کسب معاش کی نہیں ملتی کیونکہ مرد نے اس میدان کے بھی ہر گوشہ پر قبضہ کر لیا ہے یہاں تک کہ سلائی

اور کشیدہ کاری کی صنعت جو محض عورتوں کو زیبا تھی وہ بھی مرد کے قابو میں ہے۔ اور عورت کو دیکھئے تو وہ کشمکش زندگی میں مبتلا ہو کر سخت سے سخت محنت کے کاموں میں مصروف ہوتی ہے جو اُس کی قوت سے باہر ہیں۔ پھر اس موقع پر یہ سوال ہوتا ہے کہ جب یہ بھی نہ ہو تو پھر آخر مال و دولت سے محروم عورتوں کی زندگی بسر کرنے کے مصادر اور کیا ہیں؟ یا تحض اگر وہ حسین ہوں تو اُن کا حسن و جمال بیشک غریب عورتوں کے بسر اوقات کا واحد ذریعہ کھلے بندوں یا چھپے ڈھکے صرف ہمبستری کے کام آنا؟ اسی بدقسمتی نے عورتوں کو اس طرح کے تمدن اور شہر کی غلامی میں گرفتار کیا۔ جس سے نجات پانے اور مقابلہ کرنے کے بارے میں وہ اب تک کچھ بھی غور نہیں کر سکی اور آیا عورتوں کی اس قسمت میں ہم کو کچھ بھی انصاف کا شائبہ نظر آسکتا ہے"!

ہم نے عورتوں کے سب سے بڑے وکیل، اور پُرجوش ممبر فیلسوف فوریہ کے الفاظ بے کم و کاست نقل کر دیئے ہیں تاکہ اخلاقی انحطاط کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ نیز تحریک نسواں کے حامی اس بات پر غور کر سکیں کہ خارجی زندگی کے میدان کارزار میں شامل کرنے کی انہیں کہاں تک صلاح دی جا سکتی ہے۔ وحشی سے وحشی قبائل میں "پاکدامنی" ایک جوہر ہے۔ جس کی حفاظت کرنا جان دیکر بھی فرض ہوتا ہے لیکن یہاں اُس کے خلاف عورتیں نفسانی خواہشوں کی لونڈی بنی ہوئی ہیں۔ نوعمر طلباء دلالہات پر شہوت پرستی کا بھوکا سوار ہے۔ نیز جہاں اس تحریک کے ذرا بھی قدم پہنچے ہیں وہاں برائیوں کا چشمہ پھوٹ پڑا ہے۔ ملک کے ملک گندگی کے سنڈاس بنے ہوئے ہیں۔

یہ سب کیفیت آوارہ مزاج لوگوں کی پیدا کردہ ہے جن کا منشا ہی شہوانی جذبات کی اشاعت اور بردہ فروشی کے خیالات کو عام کرنا ہے۔ لیکن اس قسم کی نقالی اور گمراہ خیالات کی پیروی سے سوائے نقصان کے کچھ ہاتھ نہیں آسکتا۔ اندھی تقلید انسان کو کبھی بھی منزل مقصود تک نہیں لے جاتی۔ غیر مردوں کا اختلاط آگ اور پھونس کو یا ہمدگر کرنے کے مصداق ہے عورت کی زندگی غیر محرم کے ساتھ رہ کر بے داغ نہیں گذر سکتی۔ مخرب اخلاق حرکات زلف برہم کے اشارات اور حدیث سوز مشتاقی سے سوسائٹی کو سوائے اضمحلال کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

لہٰذا اس منزل میں ہمیں نفسیات انسانی کا گہرا مطالعہ کرنا ہوگا۔ اور سماجی و داخلی حالات کو سامنے رکھکر یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ کون سے اصول ہیں جن سے سوسائٹی کی پست حالت درست ہوتی ہے وہ کون سے محرکات ہیں جن سے خوش حالی کا دامن وابستہ ہے وہ کون سے جذبات ہیں جن کی سینہ کاوی سے راحتوں کے چشمے پھوٹتے ہیں وہ کونسا شعور ہے جو نسل انسانی کی افزائش میں معاون بنتا ہے وہ کیا احساس ہے جو عورت کو نرشتہ خصلت بننے پر مجبور کرتا ہے۔

اس کھوج کے بعد ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہماری تمام تر کوششیں ہر طرف سے ہٹ کر انہیں محرکات اور اخلاقی قدروں کے اُبھارنے میں صرف ہوں اگر ہم کلڑی چیرنے اور کپڑا پھاڑنے کا کام بھی کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ سوچتے ہیں کہ اسے زیادہ سے زیادہ نفع بخش کس طرح بنایا جا سکتا ہے تو پھر مسئلہ نسواں کو کس طرح خامکاری و طوائف بازی کے حوالے کر دیا جائے۔ بلند کرداری، عفت مآبی ہمیشہ سے اعلیٰ جوہر شمار ہوتے ہیں۔ سماجی نظم عورت مرد کے صالح اجتماع کا مرہون منت ہے۔ رضاعت و تربیت اطفال وہ زندہ و متحرک حقیقتیں ہیں جن سے کسی وقت بھی روگردانی ناممکن ہے۔ ماں کا مرتبہ بنا کسی شک و شبہ کے سب کے نزدیک مستند ہے دنیا میں ہزاروں تمدن قایم ہوئے لیکن عورت کو اس مقام سے ہٹانے کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی چونکہ اس کی دستاربندی خود فطرت نے کی ہے اس لئے عورت کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ ماں ہو اور اپنے بچوں کی تربیت میں لگی رہے تاکہ معاشرتی نظام تمدن بھی نشو و نما پائے۔

پھر خلقتاً عورت مجسم رحمت ہوتی ہے اس میں نرم دلی اور مامتا کی جھلک کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ حیا۔ ایثار۔ قربانی اور وفا کے پُرخلوص جذبات پر اس کا خمیر تیار ہوا ہے پھر بھلا وہ خارجی نامساعد حالات کے مقابل ٹھہر سکتی ہے یہاں بعض مواقع صبر و استقامت کے آتے ہیں۔ کبھی سنگدل وہابی کشمکش سے واسطہ پڑتا ہے کیا ایک رقیق القلب ماں جو بچے کے بلکنے کی آواز پر ہی مضطرب و بے چین ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں گذر بسر کر سکتی ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مخصوص دور میں عورت نے اپنے فرائض منصبی کے علاوہ معاشرتی ذمہ داریاں سنبھالی ہوں لیکن اوّل تو اُن کی تعداد بہت کم ہے اور اُن کا میدان عمل محدود ہے دوسرے یہ بھی ضروری نہیں کہ یہ اسوہ کا کام ہی دے کیونکہ حالات کی رفتار ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وقت خود ہمیں دیکھتا ہے اور کبھی ہم اُسے آگے بڑھاتے ہیں آج کے ماحول میں ریاست کی مہر ماں دوکان پر سودا تولتی ہوئی عورت، ٹینس کے میدان میں دوسروں سے بے محابا مذاق کرتی ہوئی بیوی جو ان لڑکوں سے کورٹ شپ کرتی ہوئی کنواری لڑکیاں اور پروفیسروں

کی بغل میں شغل چائے خوری کرتی ہوئی بہنیں سب کی سب ہی اپنے طبعی فرائض سے آنکھیں چرا کر نیا سماج بنانے میں منہمک ہیں۔ لیکن کیا انفعال و افسوس کے ان مناظر کو برضا و رغبت برداشت کرنے کیلئے غیرت بھی تیار ہے یقیناً پست سے پست کردار کا انسان بھی اس پر آمادہ نہیں کہ وہ اپنی ماں بہنوں کو چشم ہوس کا تحفہ بنائے نہ خود عام طور سے عورتیں ہی اس بات کے لئے تیار رہیں کہ وہ مردوں کی جنسی بھوک مٹانے کے لئے لاوارث مال کی طرح بازار میں پڑی رہیں۔

یہاں ان عورتوں کا ذکر نہیں جو دنیا میں زندہ ہی اس لئے ہیں کہ ہمہ وقت قندکوزہ بنی رہیں اور ان کے شائقین کا جمگھٹ شکر خوروں کی طرح ہر چہار طرف اکٹھا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ بیک وقت سب کے لئے دعوتِ نظارہ اور ہر ناظر کے لئے آسودگی کا سامان نہ ہر عورت کے بس کا نہ اس کی فطرت کے مطابق۔ چنانچہ یہاں ذکر ان عزت پسند خواتین کا ہے جن کی زندگی سادگی و پاکیزگی کی ضامن ہے دوسرے کی آغوش کا تصور بھی جن کی طبیعت پر شرمندگی کا باعث ہوتا ہے۔ فریب نفس سے انسان بہک سکتا ہے لیکن جب اس کے لئے اس قسم کے مواقع فراہم ہوں اور کارکردگی کے بعد کسی قسم کی پاداش کا خوف نہ ہو مگر عصمت و عفت کو ایمان کا درجہ دینے والے گھروں میں موتی کی اس آب کی حفاظت تن من دھن ہر چیز قربان کر کے کی جاتی ہے ایسی جگہ بے حجابی۔ بے شرمی اور خرافاتی طرز تکلم ایک گرمی ہوئی بات ہے خصوصاً مشرقی عورت کے لئے تو طرۂ امتیاز ہی یہ خصوصیات ہیں۔

عورت سماج کا خصوصی رکن ہے لیکن ایسا رکن جو مرد کے ساتھ رہ کر تسکین کا سامان فراہم کرتی ہیں گو دنیا میں دلبستگی کے اور بھی اسلوب ہیں سیر و تفریح۔ کھیل تماشے، دلچسپ مشغلے مگر قدرت نے جو جاذبیت عورت میں رکھی ہے اس کا ملنا دوسری جگہ محال ہے تنہائی کی زندگی کو میسر انجمن بنا دینا کرب و درد کے عالم کو رنگینی سے بدل دینا ناقہ و عسرت کا ہنس ہنس کر غم غلط کر دینا عائلی زندگی کے ذریعہ انسانیت کی خدمت کرنا۔ رضاعتی فرائض انجام دینا تمدن و معاشرتی خطوط میں رنگ بھرنا اسی کا کام ہے۔

یہ باتیں صرف صورت کی بازی گری سے پیدا نہیں ہوتیں حالات کے بہاؤ کے ساتھ بہنے، ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اپنا رخ بدل لینے میں استحکام کہاں! اعمال و اشغال میں جب اس قسم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو ٹھیک وہی وقت ہوتا ہے جب ہر شے کی حقیقت مرجاتی ہے اور صورت پرستی۔ نمایش پسندی ہر دو جذبے مجہول انفرادیت سے گذر کر زندگی کے اصل مقصد سے بے تعلق کر دیتے ہیں اور آخر کار ظاہری روپ کا بے تکا شوق اس کو لے ڈوبتا ہے۔

چنانچہ تحریک نسواں کے دو قرن گذر جانے کے بعد اگر ہم یہ دیکھیں کہ یہ ذات گرامی جس نے مردوں کی عقل پر پردہ ڈال کر باہر قدم نکالا تھا وہ اب کہاں ہے نیز گھر سے دفتر۔ بازار۔ فوجی بارگوں کا چکر کاٹ کر سکون کی موجوں نے اس کے قلب تپاں کو شاداب کیا یا نہیں اولاد کی لعنت کو اپنے سے دور کر کے اس کی مامتا کی کوکھ نے کہاں تک تسکین پائی۔ اس کی فطری صلاحیتیں کتنی کتابیں تصنیف کر سکیں اس کی خداداد قابلیت اس سے کتنے شعر کہلوا سکی۔ کتنی قانونی گتھیاں سلجھا سکی کتنی ایجادوں کو منظر عام پر لا سکی کتنی جنگوں کو جیت سکی۔ فنون لطیفہ میں کیا اضافات ہوئے۔ فلسفہ کی عمارتوں کو نئے سرے سے مرتب کیا گیا اگر ان سب باتوں کا جواب نفی میں ہے تو حقیقت کی نزاکتوں حالی ظاہر ہے اور بالفرض اگر اثبات میں ہی ہے تو پھر یہ بات بھی کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ اس تعمیری پروگرام کے سلسلے میں عورت کی نیند اور دن کا آرام رخصت ہو چکا ہے کسب معاش کی فکر نے اسے مسلسل جفاکشی کے چکر میں پھنسا دیا ہے ایک کام سے فارغ ہو کر وہ تمام روز کی تلاش میں دوسری جگہ "اوور ٹائم" کیلئے جاتی ہے اور رات کو ہوٹل کے زیر سایہ غیر محتاط زندگی گذارنے پر مجبور ہوتی ہے مٹھائی کے ڈبوں اور پھولوں کی کوکریوں کی مانند وہ مینا بازار میں جا کر ایک سے دوسرے کے ہاتھ نیلام ہوتی ہے۔ جس سے روز بروز اس کا وقار گرتا جاتا ہے۔ چنانچہ ان مناظر کو قریب سے دیکھنے والوں نے کہا ہے کہ۔

> اگر بدقسمتی سے تم کو کسی دن یورپ و امریکہ کے ان عظیم الشان کارخانوں کی سیر کرنے کا موقع ملے تو ان کے اندر سب سے پہلے جو چیز تمہارے پیش نگاہ ہوگی وہ اس نازک لطیف جنس کی بڑی جماعت ہوگی جو سخت سے سخت جسمانی ریاضتوں اور جفاکشی کے کاموں میں مصروف نظر آئے گی۔ کچھ عورتیں بھٹکتے ہوئے انجن کے چولھوں کے سامنے کوئلا جھونک رہی ہوں گی جن کے دلفریب چہرے

آگ کی گرمی اور کوئلہ اور دھوئیں کی رنگت سے جم جانے سے سیاہ پڑ گئے ہوں گے اور ایسی ناگوار و تلخ زندگی کی آفتوں نے ان کی پیشانیوں پر یہ جملہ لکھ دیا ہوگا۔ جس کا مفہوم تمھارے صفحۂ خیال سے ابدالآباد تک بھی محو نہیں ہوگا کہ

"مرد عورت کو جس طرح گرفتارِ بلا
کر سکتا ہے یہ اُس کی انتہائی حد ہے"
(مسلمان عورت)

آثار و نتائج کا یہ وہ حسرت ناک انجام ہے جو ہمارے قریبی ملکوں پر بری طرح چھایا ہوا ہے یونہی ہم نے بنا کسی اضافے کے من و عن سامنے رکھ دیا ہے جس سے اِس تحریک کے پورے خد و خال سامنے آجائیں اب اس کے بعد ہم وہ اعتدال پسندانہ پہلو پیش کرتے ہیں جو ایک طرف تو عورت کو جائز حقوق عطا کر کے مناسب فرائض کا ذمہ دار بناتا ہے دوسری طرف ایک صالح تمدن کا ضامن بھی ہے اور جو اسلام کے تعلق سے ہم تک پہنچا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اسلام سے قبل عورت گری پڑی زندگی گذار رہی تھی گھر باہر کہیں اُس کی عزت نہ تھی اُس کے منہ پر اُہنسی قفل لگے ہوئے تھے ہنسنا، بولنا، بات کرنا۔ اُس کے لئے جرم تھا۔ مارنا پیٹنا۔ حتیٰ کہ اُسے جوئے کے داؤ پر لگا دینا معمولی بات تھی جس طرح کالے کوّے کی سیاہی سات سمندروں میں بھی دھوئی جائے تو جوں کی توں رہتی ہے۔ اِس طرح عورت کی ذات خطا و قصور کی پُتلی تھی۔ منو جی کا قول تھا کہ عورت دغدغ کا کندہ ہے۔ عربوں کا کہنا تھا کہ عورت مرد کا کمزور پہلو ہے۔ چینی مرد سمجھتے تھے کہ دیوتاؤں نے عورت کو ہمارا غلام بنایا ہے۔ علمی تجربات نے ثابت کیا تھا کہ عورت نسبتاً کمزور اور سخت اور خوفناک موقعوں پر ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔ اِس لئے کسی عزت کے لائق نہیں جہاں تک ہو سکے اس کو دبا کر رکھا جائے۔ لیکن یہ اسلام ہے جس نے فاتقوا اللہ فی النساء کہہ کر مردوں کو مجبور کر دیا کہ وہ عورت کے معاملے میں اللہ سے ڈریں اس کے حقوق پامال نہ کریں اُسے مصیبت میں نہ ڈالیں پریشان نہ کریں مار پیٹ کر اپنا اثر نہ جمائیں۔

شارع علیہ السلام کا حکم ہے کہ

"جو تم کھاؤ وہ اُسے کھلاؤ۔ جو تم پہنو وہ اُسے پہناؤ نیز
اُس کے رخسار پر نہ مارو"

ایک اور جگہ اِرشاد فرمایا۔

"زیادہ کامل الایمان وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے
ہوں اور بیوی سے اُس کا برتاؤ نہایت نرم ہو"

اِن احکامات کا نتیجہ تھا کہ یک لخت عورت کا مثل میل صاف ہو گیا وہ اجلی نکھری زندگی کی حقدار ہو گئی۔ اُس کی عزت بڑھ گئی اور گھر کی ملکہ کہلانے لگی۔ نیز نکاح طلاق اور وراثت میں اُس کا حق قائم ہو گیا اب کوئی اُس کے ساتھ جانوروں کا سا برتاؤ نہ کر سکتا تھا۔ غرض وہ مرد کی آنکھ کی پتلی۔ خاندان کے دل کی ٹھنڈک گھرانے کی عزت اور عائلی فرائض کو پوری طرح انجام دینے والی ہو گئی۔ لیکن اِس طرح مردوں کو تنبیہ کے ساتھ ساتھ اسلام نے عورتوں سے بھی مطالبہ کیا کہ وہ اطاعت شعار ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ مردوں کی غیر موجودگی میں اُن چیزوں کی حفاظت کریں جن کی حفاظت اللہ کرانا چاہتا ہے۔ نیز صاف صاف الفاظ میں اُن کا دائرۂ عمل بھی معین کر دیا ہے کہ

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ
الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى (الاحزاب)

ترجمہ۔ اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ ٹھیری رہو اور پچھلی جاہلیت کے سے تبرّج کا ارتکاب نہ کرو۔

اِس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عورت کا گھر میں ٹھہرنا بمقابلے خارجی مصائب کے موجب وقار و برکت ہے جیسا کہ تجربات نے واضح بھی کر دیا کہ خارجی زندگی تعلقاتِ زوجیت کو توڑنے والی صبر و سکون مٹانے والی اور معاشرت کو تباہ کرنے والی ہے۔ اِسی لئے اِسلام جو ایک حکیمانہ دین ہے عورت کو گھر میں ٹھیرنے کا مشورہ دیتا ہے تاکہ ایک طرف تو اُس کا وقار بڑھ جائے اور دوسری طرف اُس کی عصمت کی حفاظت بھی ہو سکے۔ یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر میں وہ مشورہ بھی گوش گذار کر دوں جو آزادیٔ نسواں کے بعد روز انہ بڑھتی ہوئی دراز دستیوں کی روک تھام کے سلسلے میں مس مارگریٹ کے اپنی بہنوں کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ فرماتی ہیں۔

"زنا بالجبر کا مسئلہ یوں بھی بہت بڑا ہے مگر ایک حد تک
عورتیں خود ہی اس کا باعث ہیں وہ غیر مردوں کو اپنے

ساتھ شراب خانوں میں لے جاتی ہیں اور حالات قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔"

وہ آزادانہ رات کی تاریکی میں گھومنے کی شوقین ہوتی ہیں اس حال میں انہیں چاہئے کہ اپنے ساتھ ٹارچ رکھیں۔ جہاں انہیں تاریکی نظر آئے ٹارچ روشن کر دیں۔ اگر بدقسمتی سے تاریکی کے دوران میں ان پر کوئی بدنیتی سے حملہ کرے تو جہاں تک ممکن ہو دوڑ کر روشنی تک پہنچنے کی کوشش کریں اور اس درمیان میں شور بھی مچائیں۔ اگر اس کے باوجود وہ اپنی خواہش سے باز نہ آئے اور عورت کو اپنی گرفت میں لے لے تو اس کا دل باتوں میں بہلائیں اور جھوٹی محبت کے اظہار سے کسی اور وقت ملنے کا وعدہ کر کے اُسے بیوقوف بنائیں اس لئے کہ ایسے آدمی اکثر چاپلوس ہوا کرتے ہیں اور بھولے بھی۔

لیکن ان تمام صورتوں میں سے اگر کوئی صورت بھی کام نہ آسکے اور عورت کو مجبوراً مرد کی خواہش پوری کرنی پڑے تو عورت کو چاہئے کہ وہ نزدیک کے ہسپتال میں جا کر علاج کرائے تاکہ حمل کی صورت نہ ہو سکے۔ (الانصاف)

اس کو تو جانے دیجئے کہ یہ بیان عورتوں کو کس طرح ملزم قرار دیتا ہے یہاں صرف یہ دیکھنا ہے کہ بے خدا تہذیب کے پرستاروں کا مشورہ کہاں تک حق بجانب ہے۔ اور اسے قبول بھی کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ یعنی عورت پیکر حسن و جمال اور مکمل دعوت نظارہ بنکر پُر نمائش بازار میں آئے۔ لیکن جب شائقین متوجہ ہوں تو وہ اُن سے رُوگردانی کرے ہوئے اتفاق سے اگر افسونِ شہوت کام بھی کر جائے تو اسپتال سے رجوع کیا جائے تاکہ زناشوئی کے بعد بھی مستقبل تابناک اور ضمیر دیدہ دلیر رہے۔

کسی تبصرے کے بغیر یہاں یہ اندازہ لگا لینا بہت آسان ہے کہ انسان کی عقل افراط و تفریط سے بھرپور ہے وہ ہمیشہ ظاہری پہلو پر جان دیتا ہے۔ اپنی ناقص عقل کے باعث مجازی نقش و نگار کو عروس حقیقت جانتا ہے۔ مگر اس کے مقابلے میں اللہ کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے۔ کیونکہ وہ انسان کی فطری کمزوری سے بھی واقف ہے اور ازل سے ابد تک اُس کی نگاہ کے سامنے ہے۔ اسی لئے یہ سنہری مشورہ دیا جاتا ہے کہ

"تم باوقار طریقے سے اپنے گھروں میں رہو۔ پچھلی جاہلیت کے سے بناؤ سنگار کر کے ہر محفل میں نہ جاؤ۔"

اب رہا سمجھنے سمجھانے کا سوال سو وہ اپنا ہے۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ جس نظام تمدن کی بنیادیں ریت پر ہوتی ہیں وہ آخر ایک نہ ایک دن بیٹھ ہی جاتی ہیں اس لئے ع

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

اسعد گیلانی

غروب

"لڑکو۔ آج اپنے امی ابا سے جاکر کہہ دینا کہ منشی انوار علی مر گیا ہے۔"

یہ دردانگیز الفاظ تھے جن سے دیہاتی پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر نے تمام لڑکوں کو اپنے گرد جمع کرکے اپنی الوداعی تقریر کی ابتدا کی۔

آج وہ تیس سال کی ملازمت کے بعد اپنے ہی گاؤں کے اسکول سے ریٹائر ہو رہا تھا۔ ارد گرد کے چھ سات گاؤں کے تقریباً ڈیڑھ سو لڑکے اس اسکول میں پڑھتے تھے۔ جن لڑکوں کے سامنے وہ ریٹائر ہو رہا تھا۔ ان کے باپ بھی اسی اسکول میں اس سے پڑھتے رہے تھے۔ وہ گرد و پیش میں منشی جی کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی مار کے چرچے لڑکوں کی زبانوں پر تھے۔ اور ان کے باپوں کی زبان پر بھی۔

"ابے نورے کے بچے۔ لانا تو ذرا ببول کی ٹہنی ——"

وہ دانت پیستے اور اپنے مہندی سے رنگے ہوئے سرخ سر کو ہلاتے ہوئے کہتا۔ اور اس آواز کے ساتھ ہی اس کے سامنے کھڑا ہوا ملزم لڑکا خوف سے کانپنے لگتا۔

جب ایک نوکیلی خاردار اور لچکیلی ٹہنی آجاتی۔ تو پھر اس کا غصہ تضحیک کا پہلو اختیار کر لیتا۔ کیوں بے فاختہ کے بچے۔ کوّے کی دُم۔ دو چار تازہ تازہ ٹہنیاں کھائے بغیر تجھ سے بیٹھا نہیں جاتا" اور یہ کہہ کر ایک تیز تڑاٹے کی شائیں کے ساتھ ٹہنی بچے کی پیٹھ پر پڑتی۔ اور ایک المناک چیخ بچے کے منہ سے نکل جاتی۔ جو کسی نہ کسی ماں کا دل دہلا جاتی۔

"ابھی تو تیری گرد بھی نہیں جھاڑی گئی۔ ذرا مرغا تو بن اِدھر آکر"

اور بچہ مرغا بن جاتا۔ اس کے ساتھی بعض خوف سے دیکھتے۔ بعض زیر لب مسکراتے۔ اور بعض زور زور سے سبق یاد کرنے لگ جاتے۔ جب کبھی کوئی لڑکا مرغا بنتا۔ تو بچوں کے سبق یا پہاڑے یاد کرنے کی گونج سے سارا مدرسہ گونج اٹھتا۔ اور گونج میں وہ فاختہ کا بچہ پٹتا رہتا۔

سسکتے ہونٹوں نیلے ہاتھوں اور آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ لڑکا اپنی جگہ واپس آجاتا۔ جیسے کسی قاتل کو صرف کوڑوں کی سزا دیکر چھوڑ دیا گیا ہو۔

منشی جی کا بیمار ہو جانا لڑکوں کے لئے رحمت کا دن ہوتا تھا اور وہ بیمار کم ہی ہوتے تھے۔ لڑکے دعائیں کیا کرتے کہ منشی کو موت آئے۔ منشی تبدیل ہو جائے۔ منشی کی بیوی بیمار ہو جائے۔ یا منشی کی بھینس بھاگ جائے۔ تاکہ انہیں آزادی کا سانس لینے کا کچھ موقع ملے۔ اس کی شکل ہی ان کے لئے عزرائیل کی قائم مقام تھی۔

یہی دعا کرتے کرتے لڑکے بڑے ہو گئے تھے۔ دُور دُور چلے گئے تھے۔ اور اب ان کے لڑکے ان کی جگہ اسکول میں آگئے تھے۔ پہلی نسل کی دعا آج دوسری نسل کے دور میں آکر قبول ہو رہی تھی۔ اور وہ ریٹائر ہو رہا تھا۔

صبح سے ہی لڑکوں میں یہ خبر گرم تھی۔ اس کے درست نکلنے پر مونگ پھلی اور گولیاں کھانے کی بازیاں لگ چکی تھیں۔

لیکن جب گھنٹی بجنے سے کچھ قبل ایک نائب مدرس نے یہ اعلان کیا کہ تمام لڑکے برآمدے میں جمع ہو جائیں۔ تو ایک بار سب کے دل دھڑک گئے۔ کچھ خوف سے کچھ حسرت سے اور کچھ ایک بے معنی پریشانی سے۔ گول دائرے کی شکل میں لڑکے ہیڈ ماسٹر کی چارپائی کے گرد جمع ہوئے تو اس نے کہا۔

"لڑکو۔ آج اپنے امی ابا سے جاکر کہہ دینا کہ منشی انوار علی مر گیا ہے"

اس جملے میں لڑکوں کے لئے بڑی مسرت ہو سکتی تھی چاہئے

تھا کہ وہ چیخ چیخ کر قہقہے لگاتے یہ ان کی دعاؤں کی قبولیت کا اعلان تھا۔ اس جملے میں ایک حقیقت کو بڑے ہی مضحکہ خیز انداز میں بیان کیا گیا تھا لیکن وہاں مضحکہ یا مذاق کا نام تک نہ تھا۔ کہنے والے کے ہونٹ صرف مسکراہٹ کے لئے کھلے تھے۔ جیسے کسی لاش کے ہونٹ مسکراہٹ کے لئے کھول دیئے جائیں۔ اس مسکراہٹ میں درد و غم اور آنسوؤں کا سیل تھا۔ لڑکے بھی بھول گئے کہ اس وقت کیلئے انہوں نے کتنی بازیاں لگائی تھیں۔ اور کتنی دعائیں کی تھیں۔ اور یہ اعلان ان کے لئے مسرت کا اعلان تھا۔ اس کی بجائے وہاں موت کا سا سناٹا تھا۔

آج میں تمہارے اسکول کی زندگی میں سے مر رہا ہوں۔ تمہیں مارنے کے لئے منشی انوار علی کبھی چھڑی لیکر نہ آئے گا۔ آج سے میں اپنے گھر کی قبر میں دفن ہو رہا ہوں۔ تم سب کہتے ہوگے کہ اچھا ہے منشی انوار علی دفعان ہو رہا ہے۔ تم کو حق ہے خوب جی کھول کر ہنسو اور قہقہے لگاؤ۔ اور گلی کے آس پاس جب کبھی تمہارا مجھ سے سامنا ہو۔ تو مجھے سلام بھی نہ کرو۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ایک تلخ گھونٹ نگلنے کے لئے رک گیا۔ اور اپنی گاڑھے کی گہرے نیل والی سفید چادر سے چہرہ رگڑ کر صاف کیا۔ پھر اس نے کہا۔ "جانے سے پہلے تمہیں بڈھے خبطی کی چند اور باتیں بھی سننی ہوں گی۔ لیکن مطمئن رہو کہ میں پھر تمہارے کان کھانے نہ آؤں گا۔

سنو بچو۔ تم ہی میرے اعمال ہو۔ اگر تم اچھے ہو گئے تو لوگ کہیں گے منشی انوار علی نے لڑکوں کو سونا بنا دیا۔ اور اگر تم بُرے ہوئے تو تمہارے بُرے کرتوتوں میں سے بھی مجھے حصہ ملتا رہیگا۔ تمہاری شکل میں میں نے دنیا کے کھیت میں گویا درخت بو دیئے ہیں۔ اگر تم دنیا والوں کو میٹھے پھل اور سایہ فراہم کرو گے تو لوگ تمہاری تعریف بھی کریں گے۔ حفاظت بھی کریں گے۔ اور اپنی محنت کے پانی سے سینچیں گے۔ اور اگر تم نے کانٹے دیئے اور زہریلے پھل اُگلے۔ تو لوگ تم کو گالیاں بھی دیں گے۔ اکھاڑ پھینکنے کی فکر بھی کریں گے اور تمہاری پرورش کے سارے راستے بند کریں گے۔ اس لئے تم کوشش کرو کہ دنیا میں کانٹے اور بدمزہ پودے نہ بنو۔ بلکہ گھنی جڑ والے پھل دار اور گھنے درخت بنو۔"

پھر اس نے اپنی بوسیدہ پگڑی کے پھٹے ہوئے پلو سے اپنی نم آلود آنکھوں کو دبا کر خشک کیا۔ اور کہا۔ "مجھ سے ناراض بھی ہو گئے۔ میں نے اکثر تم کو مارا پیٹا۔ اور جھڑکا ڈانٹا ہے۔ تم یقین کرو کہ یہ صرف اس غرض کے لئے تھی جس غرض کے لئے تم اپنے صحن میں لگے ہوئے گلاب کے پودے کو چھانٹتے رہتے ہو۔ تاکہ وہ بڑے اور اچھے پھول پیدا کرے۔ ورنہ مجھے تم سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ تمہیں شرارتیں کرتے دیکھ کر میرا دل اتنا ہی کڑھتا تھا جتنا کوئی کانٹا تمہارے پاؤں میں چبھ جائے تو تمہیں دکھ ہوتا ہے۔ میں تم کو دنیا کے کانٹے نہیں بلکہ پھول بنانا چاہتا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر اذیت ناک جھریاں ابھر آئیں۔ اور اس نے کہا۔ "لڑکو۔ ایک چیز ہے جس کی میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ میں نے تم سے بارہا ذاتی کام لئے ہیں۔ تم نے پن چکی سے میرے لئے آٹا بھی پسوایا ہے میرے مویشیوں کے لئے چارہ اور گھاس بھی فراہم کی ہے۔ میرے لئے گنے اور تازہ گڑ۔ میرا اور بچوں کا بھی بارہا لائے ہو۔ یہ سب کام میں نے کبھی خوشی سے جان بوجھ کر شوقیہ طور پر تم سے نہیں لئے۔ ہاں خدا کی قسم تم سفید داڑھی کا اعتبار کرو۔ کبھی شوقیہ نہیں لئے۔ تم نہیں جانتے ہو۔ کہ محکمہ تعلیم نے اپنے ملازموں اور قوم کے معماروں کو کتنی کس مپرسی میں ڈال رکھا ہے!" یہ کہتے ہوئے سب لڑکوں نے حیرت سے محسوس کیا کہ منشی جی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ وہ کوئی بڑی ہی دردناک بات کہہ رہے تھے۔ اتنی ہی دردناک جس کا دکھ کئی تھپیوں کی مار سے بھی زیادہ تھا

"لڑکو تمہارے استادوں کی مثال ہما کی ہے۔ جو جس شخص کے سر پر بیٹھے اسے بادشاہ بنا دیتا ہے۔ [illegible] کی غذا ہڈیاں ہیں۔ تم نے اپنے مدرسے کے ہال میں [illegible] یہ مصرع لکھا ہوا دیکھا ہوگا ع

یہ مکتب ہی حقیقت میں ہما کا آشیانہ ہے

وہ ہما جس کے سائے تلے سے گزر کر انسان بادشاہ اور وزیر اور بڑے بڑے اونچے مناصب تک پہنچتے ہیں۔ وہ مدرسے کا استاد ہی ہوتا ہے۔ لیکن وہ خود خستہ حال ہوتا ہے۔ اس خستہ حالی نے مجھے تمہاری اور تمہارے ماں باپ کی خیانت کا بارہا مرتکب کیا۔ تمہارے اسکول کے وقت کو اپنے کام میں

لگا کر میں نے تمہاری خیانت کی اور تم جو میرے پاس تعلیم کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ ان کو دوسرے کاموں میں لگا کر میں نے تمہارے امی ابا کی خیانت کی۔ میں اس کے لئے تم سے معافی چاہتا ہوں۔ تم معصوم ہو ضرور معاف کر دو گے۔ میرے بس میں یہ نہیں ہے۔ کہ وہ کچھ تمہیں لوٹا سکوں۔ جو تم سے لیا ہے جس طرح تمہارے بس میں نہیں ہے۔ کہ وہ علم تجھے لوٹا سکو۔ جو تم نے مجھ سے حاصل کیا ہے۔ اسلئے میری درخواست ہے کہ تم میرے لئے دعا کرو۔ میری حالت اس مردے کی سی ہے جس کا مالدار بیٹا آخرت کی پکڑ سے بچانے کے لئے اسے ایک کوڑی کی امداد بھی نہیں کر سکتا۔ صرف اس کے لئے دعا ہی کر سکتا ہے۔"

منشی جی نے حسرت سے دم لیا اور پھر کہا۔

"میرے بچو۔ ایک بات اور سنتے جاؤ۔ تم زندگی کے ایک سرے سے ابھر رہے ہو۔ اور میں دوسرے سرے پر غروب ہو رہا ہوں۔ تمہارے لئے آگے سب کچھ نیا ہی نیا ہے اور میرے لئے پیچھے سب کچھ پرانا ہی پرانا ہے۔ اس زمانے میں سے تم بھی گزرو گے جس میں سے میں گزر آیا ہوں۔ میں جب اتنا لمبا سفر کر کے اب تھک چکا ہوں۔ تو یقین کرو کہ پچھتاوے گا بوجھ جو بھاری ہے میری کمر پر لدا ہوا ہے۔ جو میرے سفر کی لمبائی اور تکان کی زیادتی کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا ہے۔ تم کو میں نصیحت کرتا ہوں کہ اس خوفناک سفر میں قدم پھونک پھونک کر رکھنا۔ یہاں اگر خدا کے ڈر کا توشہ ساتھ نہ ہوا۔ تو جوں جوں تم تھکتے جاؤ گے۔ تمہاری پیٹھ پر تمہاری غلطیوں کا بوجھ بڑھتا جائے گا۔ اور ایک دن یہ تمہیں کسی گہرے کھڈ میں لے گرے گا۔ یہ بھی یاد رکھو۔ کہ جو کچھ آگے چلا جاتا ہے۔ وہ پیچھے پلٹ کر نہیں آ سکتا۔ جس طرح میں جب چلا جاؤں گا۔ تو تمہیں پڑھانے کے لئے دوبارہ نہ آؤں گا۔ اور پڑھانے کے دوران میں جو جو کوتاہیاں میں نے کی ہیں۔ ان کی مستقل ذمہ داری مجھ پر رہے گی۔ اس طرح تم بھی جب یہاں سے آگے بڑھ جاؤ گے۔ تو پلٹ کر اپنی خامیاں پوری کرنے کبھی مدرسے میں نہ آ سکو گے اسلئے کوشش کرو کہ تمہیں اپنی خامیوں اور غلطیوں پر بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔"

"اب میں تم سے رخصت ہو رہا ہوں۔ اپنے امی ابا سے جا کر کہہ دینا کہ ہمارا منشی انوار علی آج مر گیا ہے۔ لیکن تم مجھے بھول نہ جانا۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھے بھول نہ سکو گے۔ اس لئے کہ بے خبر انسان کو ماضی کے زخم بھی حال کے پھولوں سے اچھے معلوم ہوا کرتے ہیں۔ ماضی کی چوٹوں میں درد نہیں ہوا کرتا۔ اچھا خدا حافظ ——"

لڑکے خاموشی سے اٹھے۔ چھٹی کے باوجود ان کے گلوں میں شور و غل سو گیا تھا۔ بھیگی ہوئی آواز میں سلام کہہ کر سارے لڑکے ایک ایک کر کے اسکول سے نکل گئے۔

منشی حسرت سے انہیں دیکھتا رہا۔ جیسے وہ چرواہا۔ جس نے اپنا سارا ریوڑ کسی کے ہاتھ فروخت کر دیا ہو۔ اور اب اسے اپنے ہاتھ کا عصا ایک بے معنی لکڑی محسوس ہوتا ہو۔

ابنِ فرید۔ بی۔ اے

یہ جہاں اور ہے

صبح کی نقرئی دھند کو چیرتی ہوئی سورج کی کرنیں مشرقی دریچہ سے کمرے میں داخل ہونے لگیں اور باہر گھورے پر مرغ نے بڑی استغنا کے ساتھ پروں کو پھڑ پھڑا کر بانگ دی اور مرغیاں کڑکڑاتی ہوئی بھاگنے لگیں اور ان کے پروں کا شور گونجنے لگا۔ چند چڑیاں شیشم کے خمیدہ درخت پر سے چہچہاتی ہوئی اڑ گئیں اور درخت کا سایہ کانپنے لگا۔ اس نے کمبل سرکا کر اپنی آنکھوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ جھپکاتے ہوئے دروازہ میں سے صحن کے اس طرف کی حد پر باورچی خانہ کا جائزہ لیا۔ رفعت آپا باورچی خانہ میں شاید کبھی کی پہونچ چکی تھیں۔ اُن کا چھالیٹن، کا سفید سوٹ سورج کی ابتدائی کرنوں میں اس طرح چمک رہا تھا جیسے بادل کے کسی سفید ٹکڑے کے پیچھے سے سورج طلوع ہو رہا ہے۔ اُسے رفعت آپا پر وہی طفلانہ پیار آیا جس کے تحت وہ ان کو پہروں پریشان کیا کرتا تھا اور رفعت آپا بجائے چراغ پا ہونے کے اُسے بڑے تحمل کے ساتھ سمجھایا کرتی تھیں اور تب وہ بڑی شوخی کے ساتھ سب کچھ سنا کرتا تھا اور پھر یکایک اس کا دل چاہنے لگتا تھا کہ وہ پھر اُن کو چھیڑے مگر بڑا ضبط کئے وہ یوں سب باتیں سنتا چلا جاتا تھا جیسے وہ ایک مادر الم آغوش میں آنکھیں بند کئے لوریاں سن رہا ہو۔ اُسے اُس وقت پھر اپنا بچپن یاد آنے لگا اور اس کے دل نے اُسے بُری طرح مجبور کیا کہ وہ رفعت آپا کے سامنے اُسی بارہ تیرہ سال کے لڑکے کی طرح جا کھڑا ہو۔

اُس نے چپکے سے کمبل کو ایک طرف ہٹا دیا اور سلیپروں کو پیر میں ڈالتا ہوا آہستہ آہستہ باورچی خانہ تک گیا۔ رفعت آپا کچھ تیار کرنے میں اس قدر منہمک تھیں کہ وہ اپنے گرد و پیش سے بیخبر ہو چکی تھیں۔ اور کھانا پکانے کی کتاب اپنے پیچھے رکھ کر جیسے بھول سی گئی تھیں۔ اُس نے بڑی کاریگری سے کتاب اس طرح اٹھالی کہ اُن کو خبر نہ ہوئی اور خود دیوار کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ پھر رفعت آپا کو اس کتاب کی ضرورت ہوئی اور انہوں نے اُسے تلاش کیا مگر وہ وہاں کہاں تھی۔

"ارے کیا ہوئی کتاب؟" جیسے انہوں نے اپنے آپ سے تعجب کے ساتھ پوچھا۔ مگر وہاں اس کے جواب کی کس کو پڑی تھی۔

انہوں نے چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔ اور اپنی یادداشت کی کوتاہی کے خیال سے نعمت خانہ پر تلاش کرنے چلی گئیں جس پر سے ابھی ابھی وہ مرتبان کا مرتبان لائی تھیں۔ ان کے جاتے ہی اس نے مرتبان پر ہاتھ صرف کرنا شروع کر دیا۔

"آپا۔ یہ رہی آپ کی کتاب، وہاں آپ کہاں تلاش کر رہی ہیں؟"

اس نے بڑی شوخی کے ساتھ مرتبان خالی کر دینا چاہا۔

مگر رفعت آپا نے اپنی مخصوص سنجیدہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور اُسے پھر وہی دن یاد آنے لگے جب وہ انہیں چھیڑ کر لطف اٹھایا کرتا تھا۔ اس وقت اُسے رفعت آپا کی منوّر آنکھوں میں اپنا قرب نظر آ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ رفعت آپا کی آغوش میں اپنا سر رکھ دے اور کہے، میری اچھی آپا بیری پیاری ماں! حالانکہ وہ جانتا تھا وہ اس کی ماں نہ تھی بہن تھی۔ لیکن وہ اُسے ہمیشہ ماں ہی محسوس ہوئیں۔

"شکیل تم بڑے کاہل ہو، تم کو صبح کی تازگی اور فطرت بھی پسند نہیں؟"

"لیجئے یہ اپنا مرتبان" اس نے خالی مرتبان رفعت آپا کی طرف بڑھایا کہ شاید ان کی بات کا رخ بدل جائے اور اس کی خجالت ابھرنے نہ پائے۔ مگر رفعت آپا جیسے جان گئی تھیں کہ وہ نا سور کہاں سے رِستا ہے۔

"خیر، ہم بغیر مرتبہ ہی کے ناشتہ کر لیں گے۔ مگر تمہاری یہ شہرت پسند نہیں آئے گی۔ تم اپنی اس عادت کو جلد از جلد بدل ڈالو۔" رفعت آپا

نے اسی تحمل کے ساتھ کہا۔

اور اس نے کچھ سیٹیوں کے انداز میں اپنے ہاتھوں کو صاف کیا اور اکتائے ہوئے انداز میں [illegible] ہوا۔ "اوہ، آپا گاڑی کا وقت ہو رہا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ باقر بھائی کو لینے۔ وہ اسی گاڑی سے آتے ہونگے۔"

اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس نے مرتبہ کو میٹھا سمجھ کر کھایا ہو مگر وہ عجیب سا میٹھا سا ہو اور منہ کا ٹیسٹ بدمزہ ہو گیا ہو۔ اس نے کمرہ میں آکر الماری کندھوں پر ڈال لیا اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اسٹیشن کیلئے روانہ ہو گیا۔ آپا نا شتہ لگانے لئے جا رہی تھیں مگر وہ اس وقت اس کی کوئی احتیاج نہیں محسوس کر رہا تھا۔ اس نے آپا کی طرف دیکھا اور پھر کندھوں کو سکیڑتا ہوا چلا گیا۔

کچے راستے کے دونوں طرف پھیلے ہوئے سبز کھیتوں پر شبنم کے خستی قطرے آبریزوں کی طرح اب بھی جگمگا رہے تھے اور کسان اپنے مضبوط تھلتی ہاتھوں سے ان کے درمیان سے گھاس کے پودوں کو چُن رہے تھے۔ گیہوں کے یہ نوخیز پودے یوں لہرا رہے تھے جیسے مخمل کی چادروں میں ایک ہوا کا جھونکا داخل ہو اور پھر نیچے ہی نیچے دور تک بھاگتا چلا جائے۔ اُس کی نظریں اور اُس کے احساسات جیسے ان سبز ٹکڑوں میں کھوئے جا رہے تھے۔ لیکن اُسے نہ معلوم کیوں تعجب سا ہو رہا تھا کہ وہاں نہ کوئی جوانی کی کمان کھنچ کر چھوٹ رہی تھی اور نہ کوئی ناکمل انگڑائی ٹوٹ رہی تھی جن کی تلاش میں کتنے ہی حریص تصورات سرگرداں رہتے ہیں۔ وہاں اُسے محنت کے سوا کچھ بھی دکھلائی نہیں پڑ رہا تھا۔ ہاں البتہ کچھ رکیک اور غلیظ فقرے ضرور فضا میں گونج اُٹھتے تھے۔ اُس نے سوچا شاید یہی وہ رومان ہو جو کھیتوں کو بساتا ہو اور اجاڑتا ہو۔

وہ اسٹیشن کے پاس پہونچ چکا تھا۔ اس کا جانا پہچانا اسٹیشن جس تک وہ کئی بار بے فکری کے ساتھ آیا تھا اور علاوہ سفر کے بارے میں اس نے کبھی اس کے گرد و پیش کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اُسے اُس وقت وہ اسٹیشن بڑا چھوٹا سا نظر آ رہا تھا۔ وہ دو کوٹھریوں کا اسٹیشن اُسے اردلیوں کے کوارٹروں کا جیسا معلوم ہو رہا تھا اور اس کے پلیٹ فارم کے گرد نیل کی جھاڑیوں اور تار کی باڑوں نے اور بھی تصنع پیدا کر دیا تھا جیسے وہ بالکل اس دیہات کا نہ تھا بلکہ کہیں اور سے لاکر وہاں رکھ دیا گیا ہو اور استعمال کیا جا رہا ہو۔ اس کے آس پاس چند ایک نیم اور شیشم کے درخت تھے جن کے بارے میں اس کو یقین سا ہو رہا تھا کہ ان کے سایہ میں کوئی دیہاتی حسینہ ڈرتی جھینپتی اور سمٹتی ہوئی اٹھکر کسی سینہ تان کر اترنے والے جوان کا انتظار نہ کرتی ہوگی۔ البتہ شاید یہ ضرور ہو کہ دوپہر کے وقت جانور جگالی کرنے کے لئے ان کے نیچے جمع ہو جاتے ہوں یا کوئی دیہاتی پٹواری اپنی گھوڑی کو اُن میں سے کسی ایک کے تنے کے ساتھ باندھکر اپنے آنے والے حضور کا انتظار کیا کرتا ہو۔ یا پھر شاید کبھی رات کے چھٹے مسافروں کے کام آجاتے ہوں۔ اس کے علاوہ اس کو ان پیڑوں میں کوئی کیف نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڑی دیر تک اکتاہٹ کے ساتھ پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہا اور گاڑی کا انتظار کرتا رہا۔

جب انجن کا دھواں پٹری کی دور دراز حد سے ابھرنا شروع ہوا تو وہ تمام خیالات کو اپنے ذہن سے رخصت کر کے باقر بھائی کا انتظار کرنے لگا اور دہندلائے ہوئے افق سے جس قدر گاڑی نزدیک آتی گئی اُسے یوں محسوس ہونے لگا کہ سفر اپنے اختتام کو پہونچ رہا ہے اور جب گاڑی پلیٹ فارم پر آکر ٹھہر گئی تو انجن سے نکلتی ہوئی بھاپ کی آواز اُسے پُرتکان سانس محسوس ہونے لگی اور وہ عجلت کے ساتھ باقر بھائی کو تلاش کرنے لگا جو ایک ڈبہ سے اپنے لفنیس و نازک پلاسٹک بیگ کے ساتھ اس طرح اتر رہے تھے کہ جیسے اسٹیشن کے باہر اُن شیشموں کے نیچے ہزاروں رومان جمائی لیتے ہوئے ایک ادا کے ساتھ جاگ اٹھیں گے۔ اُسے اُس وقت وہ اتنے وجیہ نظر آ رہے تھے کہ وہ اُن سے ایک پُرفخر مسرت کے ساتھ لپٹ گیا اور بڑے تپاک کے ساتھ ان کا سامان اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دونوں اسٹیشن سے نکل کر پیدل گھر کی طرف چلنے لگے اور باقر بھائی بڑی شگفتہ مزاجی اور اپنائیت کے ساتھ اُس کی گفتگو میں دلچسپی لیتے رہے جیسے وہ اس تھکی ہاری دُنیا سے بلند اڑ کر ہلکی ہلکی فضا میں پرواز کر رہے ہیں۔ اور کھیتوں کے درمیان کچی سڑک پر سے گذرتے ہوئے وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ اس سے پہلے وہاں نہیں تھا اور اب ان دونوں کا وجود وہاں کے لئے بڑی قدر و منزلت کا باعث تھا۔ جیسے اگر وہ دونوں اس راستہ سے نہ گذرتے تو وہ راستہ ویرانی و بے التفاتی میں گرداڑایا کرتا اور اُس پر سے گذرتے ہوئے دیہاتی محنت کش مُسٹر مُٹ کر کسی خوش پوش کی طرف نہ دیکھتے اور اُن میں سے بعض بعض جھک جھک کر

لجیانہ انداز میں سلام نہ کرتے اور اپنے چہروں پر تذلیلی پسماندگی نہ پیدا کرتے وہ باقر بھائی سے گفتگو کرتے ہوئے اور پیچھے راستہ پر سے گزرتے ہوئے بڑی وارفتگی محسوس کر رہا تھا۔ اُس وقت اس کا دماغ اپنے گرد و پیش کے متعلق سوچنے کے لئے تیار نہ تھا وہ تو باقر بھائی کے تذکروں میں کھویا گیا تھا۔ اور ان کے تخلیقی تذکرے اُس کو مسحور کئے ہوئے تھے۔

باقر بھائی کو پا کر وہ یہ سوچ رہا تھا کہ جیسے وہ ایک بیش بہا موتی ڈھونڈ لایا ہے اور اس کے تمام گھر والے اُن کو پا کر خوشی سے دیوانے ہو جائیں گے۔ اور واقعی جب وہ دونوں مکان میں داخل ہوئے تو تمام لوگ مسکرا اٹھے خوشیوں سے پھول اٹھے اور باقر بھائی تمام لوگوں کو اپنی طرف متمرکز دیکھ کر اور بھی مانوس ہو گئے اور بیگانگت اور شگفتہ مزاجی کے ساتھ پیش آنے لگے۔

"شکیل۔ باقر بھائی کو بھیجو غسل خانہ میں پانی رکھ دیا گیا ہے۔ منہ ہاتھ دھو لیں۔"

اس نے اس غیر متوقع جملہ سے اس لمحہ محسوس کیا کہ اس وقت "کوئی" اس مجمع میں موجود نہیں تھا۔ اور وہ رفعت آپا تھیں۔ اُس نے قدرے استفہامی انداز میں باقر بھائی کی طرف دیکھا اور باقر بھائی کا چہرہ ایک مخصوص مسکراہٹ سے جگمگا رہا تھا۔ وہ سب کو چھوڑتے ہوئے اپنی جرکن ( ) کی زنجیر کھول کر اتارتے ہوئے غسل خانے کی طرف چلے گئے اور اس کے تخیل و تصور میں اُن تمام ناولوں کی تمہیدیں رقص کرنے لگیں جو مختصر تعطیلوں میں اس کی حرزِ جان ہوتی تھیں۔ اس نے اپنے اندر ایک نامانوس تحریک محسوس کی اور باقر بھائی کے لئے چھٹیوں کے بیکار دن گذارنے کے لئے پروگرام بنانے لگا۔

اور غسل خانے سے دھیمی دھیمی سیٹیاں اٹھ اٹھ کر زنان خانہ میں گونجنے لگیں۔ اور وہ تو شہ خانہ سے دو خوبصورت چھڑیاں چہل قدمی کیلئے نکال لایا اور ان پر جمی ہوئی گرد و دھن سے بھیگے ہوئے کپڑے سے صاف کرتا رہا۔

اس بار خلاف معمول موسم سرما کی چھٹیاں بڑی بامعنی محسوس ہو رہی تھیں۔ اور باقر بھائی کی ہنس مکھ اور ملنسار طبیعت نے اور بھی کیف پیدا کر دیا تھا۔ شام کے وقت جب سورج کی آخری کرنیں سنہری پڑنے لگتی تھیں اور جانور چرا گاہوں سے باڑوں کی طرف جاتے ہوئے اپنی گھنٹیوں کی گونجتی ہوئی موسیقی بکھیرتے ہوئے واپس ہونے لگتے تھے اور دیہاتی عورتیں اور بچے سبز گھاس کے ڈھیروں کو لکڑیوں سے پیٹ پیٹ کر مٹی جھاڑ رہے تھے اور دور تک بے کاشت زمین میں جھاڑ و کی سفید سفید پھولوں پر سرخی مائل عکس نظروں کو مسحور کرنے لگتا تھا تو وہ دونوں ندی کے کنارے کنارے ٹہلتے ہوئے دور تک چلے جاتے تھے اور پھر کہیں بیٹھ کر یا کسی کھیت کی مینڈ پر بیٹھ کر ہنسی خوشی گپیاں کیا کرتے تھے اور کبھی تو اتنا وقت گذر جاتا تھا کہ سورج ڈوب چکتا تھا۔ نیچے کی شفق سیاہ ہو جاتی تھی اور جھینگروں اور مینڈکوں کی آوازیں بلند ہو جاتی تھی مگر پھر بھی وہ وقت کا اندازہ اس وقت تک نہ کر سکتا تھا جب تک کہ رفعت آپا کا سامنا نہ ہو جاتا اور اس کی لاپرواہی پر وہ اُسے جھڑک نہ دیا کرتی تھیں۔ مگر وہ کیا کرتا۔ باقر بھائی بات ہی کچھ اس طرح شروع کرتے کہ جواب دینے کے بعد بھی اس میں یہ تجسس برقرار رہتا کہ آخر انہوں نے سوال کس لئے کیا تھا۔ اور اکثر جب تنہائی میں وہ غور کرتا تو وہ کچھ بھی نہ پاتا کہ باقر بھائی کے سوال اتنے پُراسرار کیوں ہوتے ہیں اور ان میں ایک فیر معمولی بلندی کیوں ہوتی ہے یا اُسے ایسی بلندی سی کیوں محسوس ہوتی ہے۔ اس نے پہروں تجزیہ کیا اور اپنے تصور میں ان لمحات کو دوبارہ جاگ کر کیا جو اس کو محسوس طور پر متاثر کر گئے تھے۔

شام کو ٹہلتے ہوئے جب وہ ایک ٹیلے پر منظر لطف اندوز ہونے کے لئے بیٹھ گئے اور اپنے بادامی اینگلو عربی پر چھڑی کو ٹکا کر دور دیکھتے دیکھتے محو ہو گئے اور وہ قاز کے ایک اڑتے ہوئے غول پر لطیف سی شکاری نظریں ڈال رہا تھا تو اُن کا بڑا عجب سا فقرہ اُس کے کانوں سے ٹکرایا۔

"شکیل۔ دیکھو وہ اس بھول کے پاس یہ سوچ کی کرنیں کیا غضب ڈھا رہی ہیں۔"

"کہاں؟" اس نے بے انتہا استعجاب کے ساتھ اس مخصوص سمت دیکھا۔

"دیکھا تم نے؟" باقر بھائی کی انگلی اب بھی اس سمت اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بے انتہا کوشش کی کہ باقر بھائی کا سا احساس جمال اس کے اندر بھی پیدا ہو سکے مگر وہ بالآخر ناکام ہی رہا اور اس نے دیکھا کہ وہاں ایک دیہاتی عورت گھاس اکٹھا کر رہی تھی اس نے

اپنے اندر بڑی تشنج سا محسوس کیا۔ بس؟ ——— وہ اور کچھ بھی نہ دیکھ سکا؟ ——— اور اس نے اپنی خجالت مٹانے کے لئے کہہ دیا "ہاں بڑا دلکش منظر ہے"۔

پھر اسی طرح ایک دن جب وہ سرکنڈوں کے جھنڈ میں نیتر کا شکار کر رہے تھے تو باقر بھائی نے ایک دم نشانہ صحیح کرتے کرتے بندوق کو دستہ کے سہارے زمین پر کھڑی کر دیا اور برجس کی جیب سے سگرٹ کیس نکالتے ہوئے اس سے سوال کر بیٹھے۔

"رفو کیوں۔ یہ رفو اتنی الگ الگ سی کیوں رہتی ہے؟"

وہ بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ کیا جواب دے؟ کیا رفعت آپا بالکل بداخلاق ہی ہیں؟ اور ساتھ ہی ساتھ اُسے یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ کہیں یہ اس کی طرف سے باقر بھائی کے لئے ناگوار خاطر نہ ہو کہ اس کے گھر والوں میں سے ایک فرد ان کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا۔ اور اس نے بڑے مفاہمتی انداز میں کہا۔

"نہیں وہ کچھ تنہائی پسند سی ہیں۔ اور کوئی خاص بات نہیں"۔

لیکن یہ گفتگو میں اس کے اندر عجب مازگشت سی مچاتی رہی وہ کبھی خود کو عجب کھویا کھویا سا محسوس کرنے لگتا اور باقر بھائی اُسے غیر معمولی بلند سے محسوس ہوتے۔ مگر وہ تحسین کرتا کہ جب کبھی رفعت آپا ناشتہ تیار کر رہی ہوتیں اور باقر بھائی صبح کے وقت دیا سلائی پاس نہ ہونے کی وجہ سے باورچی خانہ سگرٹ جلانے چلے جاتے اور پھر وہیں بیٹھ کر تصفیہ آگ تاپنے لگتے اور سگرٹ کے کش چھوڑنے لگتے تو رفعت آپا گلشن کو آواز دیتیں، وہ آجاتی۔ اس کو سب کچھ سپرد کر دیتیں اور خود اٹھ کر چلی آتیں۔ اور باقر بھائی جب ادھیڑ عمر گلشن کو نکتے نکتے تھک جاتے تو انتہائی تھکن کے ساتھ جمائی لیتے اور غسل خانہ میں چلے جاتے۔ اور زنان خانہ میں سیٹی کی تیز آواز گونجنے لگتی۔ اور کبھی وہ محسوس کرتا کہ یہ سیٹی میاں جان کے مطالعہ میں خلل انداز ہوتی اور ان کے ماتھے پر شکنیں پڑ جاتیں مگر وہ حقہ کا ایک زوردار کش لیتے اور پھر دیر تک کھانستے رہتے۔

یونہی چھٹیوں کا ہفتہ گذر چکا تھا اور باقر بھائی کے معلوم کتنے پُر اسرار سوالات اس کے لئے گتھیاں بن چکے تھے اور وہ ہر بار احساس کمتری سے غرق عرق ہو چکا تھا کہ ایک روز باقر بھائی نے ناشتہ پر بڑی عجب سی شکایت کی

"چچی جان۔ اتنے دنوں سے آپ کے یہاں پڑا ہوا ہوں لیکن کسی ناشتہ پر بھی میری چھوٹی موٹی دعوت تک نہ کی گئی؟ ——"

"رفو ان کی بھی شکایت دُور کر دو" امّی جان نے ہنس کر کہا۔

اور دوسرے دن ناشتہ پر پراٹھے اور حلوے اور چند ایک اور چیزیں آگئیں۔ اور باقر بھائی نے ایک ایک چیز کو چکھ چکھ کر بڑی بڑی تعریفیں کیں۔ یہاں تک کہ رفعت آپا چائے دانی سے چائے لے کر باورچی خانہ چلی گئیں اور وہاں سے گلشن کے ہاتھ بھیجدی۔ پھر باقر بھائی خاموش ہو گئے۔ انہوں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور اُٹھ گئے۔ شاید انہوں نے کچھ ناگواری محسوس کی ہو گی۔ اس لئے اس وقت پھر اپنے اندر ایک تشنج محسوس کیا۔ رفعت آپا کی یہ حرکت اس کے لئے بے حد خجالت کا باعث ہو رہی تھی۔ وہ دن بھر باقر بھائی کے ساتھ ٹہلتا رہا۔ امرودوں اور شفتالوؤں کے چمنوں میں پھرتا رہا۔ مگر وہ مخصوص گھٹن اس سے رخصت نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ دوپہر کو جب وہ وقت گذاری کے لئے ان کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا تو اس وقت بھی اپنا دماغ حاضر نہ کر سکا اور معلوم کتنی بار مات کھائی۔ اور اگر عین اس وقت باقر بھائی کے نام خط نہ آگیا ہوتا تو یہ کیفیت معلوم کب تک قائم رہتی۔

باقر بھائی نے لفافہ کو ہاتھ میں لیا دو تین بار پلٹا جیب سے سگرٹ کیس نکالا۔ ایک سگرٹ سلگایا اور دیا سلائی کی تیلی بجھا کر اُسی بڑے اسٹائل سے لفافہ کھولا۔ اور اپنے چہرے کے نقوش کو خط سے متاثر کرتے ہوئے پڑھنے لگے۔ اور پھر ایک دم مسکرا کر بول پڑے۔

"سنا شکیل! ——— شام کی گاڑی سے نجمہ آرہی ہے"

"آپا؟"

"چلو آج کی چہل قدمی اسٹیشن کی طرف ——!"

"کوئی مضائقہ نہیں"

"مگر ہاں۔ اس کے ساتھ کچھ سامان بھی تو ہو گا"

"اس کے لئے میں کسی اہلکار سے کہہ دوں گا۔ انتظام ہو جائیگا"

شام کے وقت جب وہ دونوں ٹہلتے ہوئے اسٹیشن تک گئے اور وہاں انہیں گاڑی کا انتظار کرنا پڑا تو باقر بھائی پلیٹ فارم ہی پر ادھر ادھر ٹہلنے لگے اور وہ اخلاقاً ان کے ساتھ چہل قدمی

کرتا رہا۔ باقر بھائی چاروں طرف وسعتوں میں کچھ تلاش کرتے رہے اور پھر سکوت توڑا۔

"بھئی یہ تمہارا اسٹیشن بھی بڑی پرکشش جگہ ہے۔ میں نے آج ہی محسوس کیا۔"

اس کے ذہن میں اپنے پچھلے تاثرات جاگ اٹھے۔ مگر وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کون سی بات سچ ہے اور پھر اس نے غیر مشروط طور پر باقر بھائی کے سامنے اپنے آپ کو سرنگوں کر دیا۔ اور سوچا ممکن ہے ایسا ہی ہو۔

"ہاں ہے تو ——"

"دیکھو یہ شیشم کے پیڑ اور یہ ان سے ہٹ کر جاتی ہوئی پگڈنڈی کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔"

"جی ہاں! سادگی اور فطرت میں بڑی جاذبیت ہوتی ہے۔"

یونہی ہلکی پھلکی گفتگو میں وقت گذر گیا اور گاڑی آ گئی۔ سکنڈ کلاس کے ڈبہ سے نجمہ باجی اتر پڑیں اور باقر بھائی نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ان سے ہاتھ ملایا اور اس نے بھی اخلاقاً باقر بھائی کی تقلید کی۔

"نجمہ ہم پیدل ہی چلیں گے۔"

"مگر میرے ساتھ تو ——"

"ہاں۔ وہ اہلکار لے آئے گا۔"

اور نجمہ باجی ایک لسیط مسکراہٹ کے ساتھ ان کے ساتھ چلنے لگیں۔ ان کا لٹکتا ہوا آنچل اس طرح لہرا رہا تھا جیسے دور ختم ہوتے افق میں ہزاروں کارواں اس کے اڑتے ہوئے پرچم کے سہارے آگے بڑھتے چلے آ رہے ہوں۔ اور اکثر پاس سے گذرتی ہوئی گھسیارنیں اور چرواہیاں اپنے سروں پر ٹوکھے سمیٹ کر استعجاب سے ٹھوڑیوں پر انگلیاں رکھ کر نجمہ باجی کو گھورنے لگتیں اور قدرے ہٹ کر آہستہ آہستہ چلنے لگتیں جیسے انہوں نے اس قسم کی کوئی چیز اپنی زندگی میں نہ دیکھی ہو۔

باقر بھائی اور نجمہ باجی بعض وقت اس قدر تیزی سے چلنے لگتے تھے کہ وہ پیچھے رہ جاتا تھا اور اسے لپک کر ان کا ساتھ لینا پڑتا تھا۔ مگر جب وہ ان کے پاس آ جاتا تھا تو اس کو محسوس ہوتا تھا کہ اس کا پیچھے رہ جانا ہی بہتر تھا۔ کیونکہ ان دونوں کی گفتگو خود ان دونوں ہی کی ذات تک محدود تھی اور ان کے درمیان پہونچ کر جیسے خود کو دخل در معقولات کرتا ہوا باور کرنے لگتا تھا۔

ان تینوں کے پہونچنے پر پھر ایک بار زنان خانہ میں چہل پہل ہو گئی۔ گلشن اور دوسری باندیوں نے بڑھ کر نجمہ باجی کو سلام کیا۔ امی جان نے اور رفعت آپا نے گلہ لگایا لیکن نجمہ باجی نے اس تپاک میں کوئی جذب و کشش نہ محسوس کی ان کی مسکراہٹ جو شاید ان کے خون سے سرخ ہونٹوں کا ایک جز تھی سب کے سروں پر سے گذرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ رفعت آپا سے انہوں نے ضرور قدرے زیادہ بے تکلفی کا اظہار کیا مگر وہ بھی ایک مخصوص بلندی پر سے۔

لیکن نجمہ باجی کے آنے سے دیوان خانہ میں ضرور بے حد رونق ہو گئی تھی۔ شطرنج اور تاش کھیلتے ہوئے ان کا وجود اور بھی نمایاں معلوم ہونے لگا تھا۔ وہ بعض اوقات کوئی چال چلتے چلتے اپنے ناخنوں کو دیکھنے لگتیں۔ بالوں کو درست کرنے لگتیں یا اپنا آنچل سنوارنے لگتیں اور عین اس وقت بازی بگڑ جاتی اور وہ تعجب نسوانی استعجاب کے ساتھ چیخ اٹھتیں۔

"اوہ۔ باقر! یہ چال نہیں ہوگی۔ پھر سے چلو۔"

اور پھر باقر بھائی ایک پُرزور قہقہہ لگاتے اور کھیل پھر سے شروع ہو جاتا۔ اور وہ کہتے "عورت بھی کبھی جیتی ہے؟"

مگر اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ شام کی چہل قدمی کے وقت وہ ان دونوں کے ساتھ جانے کے بعد بھی اکیلا رہ جایا کرتا تھا۔ کبھی باقر بھائی کہیں اسے ٹھہرا جاتے اور نجمہ باجی کو ندی کے دامن میں اتار لے جاتے اور کنارے تیرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو چھڑی سے مار کر ڈرا نہیں پکڑا دیتے۔ کبھی جنگلی حصہ میں بڑھ جاتے اور وہ ندی کی لکڑیوں کے خوشنما ڈنڈے بین لاتے اور کبھی اسی طرح وہ دور میدان میں کہیں ٹھہر جاتے اور کچھ دیکھنے لگتے اور وہ سوچتا رہ جاتا کہ ان کی زندگی کس طرح کترا کر اس کے پاس سے گذر گئی ہے۔ جیسے وہ اس کی طرف آتے آتے ایک خم کھا کر دور ہو گئی ہو۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس کے ماحول کی زندگی ان بھوری بھوری جھونپڑیوں سے کترا کر گذر گئی ہے جو اس کی حویلی کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اور پھر وہ اپنے اندر یہ احتیاج محسوس کرنے لگتا

کر وہ بڑھکر اس محیط تک پہونچ جائے۔ اور یہ تمنا اور یہ تصور جس قدر اس کے اندر جلا پا رہا تھا اُسی قدر اس کے اندر باقر بھائی اور نجمہ باجی کی عزت اور محبت پیدا ہوتی جاتی تھی۔ اور وہ اس کے لئے منزلِ مقصود بنتے جاتے تھے۔

مگر جب یہ زندگیاں رفعت آپا کی کسوٹی پر کسی جاتیں تو وہ بُری طرح کشمکش و تذبذب میں پڑ جاتا۔ اُسے وہی رفعت آپا جن سے اُس کو بے انتہا انسیت تھی محض دیہات میں پلی بڑھی ہوئی محدود معلومات والی لڑکی نظر آنے لگتیں اور ان کی وہ عقلی گہرائی جو نجمہ باجی کو خاموش کر دیتی تھی صرف کتابی معلومات تک محدود معلوم ہوتی۔ مگر نجمہ باجی کی خاموشی جہاں ایک طرف اس کے اندر یہ خون پیدا کر دیتی کہ کہیں اس کے اپنے گھر میں ان کی دل شکنی نہ ہو وہیں اس کے اندر اس پیدائشی "کیوں؟" کو اور واضح کر دیتی اور وہ اس "کیوں؟" کا حل تلاش کرنے کے لئے بیچین ہو جاتا۔

ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ اب باقر بھائی کو صبح باورچی خانہ سگرٹ جلانے نہیں جانا پڑتا تھا۔ اور جب وہ غسل خانہ سے منہ ہاتھ دھو کر نکلتے تھے تو نجمہ باجی کے کمرے کی طرف سے ضرور گذرتے تھے۔ اور نجمہ باجی کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوتا تھا وہ سنگھار میز پر بیٹھی ہوئی ڈریسنگ کر رہی ہوتی تھیں۔ باقر بھائی ان کی سنگھار میز پر سے کنگھا اٹھا کر ان کے پیچھے کھڑے ہو جایا کرتے تھے اور بڑی توجہ سے آئینہ پر نظر جما کر اپنے بالوں کو یوں درست کیا کرتے تھے کہ اُن کو نصف گھنٹہ سے زیادہ لگ جایا کرتا تھا۔ اور ناشتہ میاں جان کے سامنے کب کا لگ جاتا تھا۔ اور پھر ان کی پکار پڑتی تھی۔ اور اس تمام عرصہ میں نجمہ باجی بھی آرائش کر رہی ہوتی تھیں۔

ان تمام دنوں کے اندر جہاں اس کو باقر بھائی اور نجمہ باجی سے بے تکلفی سے باتیں کرنے کا شاذ و نادر ہی موقعہ ملا تھا وہاں ان کی محبت اور عظمت اپنے اندر رکھتے ہوئے اُسے رفعت آپا کی طرف ایک بار پھر متوجہ ہونا پڑا تھا۔ وہ ایک بار پھر چاہ رہا تھا کہ کوئی خلوص کے ساتھ اس کی طرف توجہ کرے اور وہ تعطیل کے مختصر عرصہ کو مختلف عقدوں کے حل کرنے میں نہ صرف کر سکے جو روز بروز اس کے گرد و پیش ابھرتے چلے آ رہے تھے۔ مگر ان نئے مہمانوں نے حویلی کی فکر و توجہ کا محور ہی بدل دیا تھا۔ رفعت آپا اب بھی اُسے ٹوکتی تھیں مگر وہ اُس میں اپنی بچپن کی شوخیوں کو زندہ ہوتا ہوا نہیں محسوس کرتا تھا بلکہ جیسے اس کے سامنے کوئی بہت بڑی سِل رکھ دی جاتی تھی اور اُس سے کہا جاتا کہ اُس کو اُٹھا کر راستے سے الگ رکھ دے۔ مگر وہ فیصلہ کرنے کا شعور ہی کب رکھتا تھا کہ وہ سِل تھی یا اس کی منزل کے لئے ایک زینہ۔ ہاں یہ ضرور تھا۔ اس شے کا تعارف اُس سے اس طرح ہی کرایا جاتا تھا کہ وہ سِل تھی۔ مگر وہ ابھی یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھا وہ بھی باقر بھائی اور نجمہ باجی کے قدم میں قدم ملانا چاہتا تھا۔

اس شام جب وہ چہل قدمی سے واپس آیا تو میاں جان کے کتب خانہ سے ایک ادبی تحقیقی جریدہ کی جلد نکال لایا اور رفعت آپا کے پاس بیٹھکر اوراق الٹنے پلٹنے لگا۔ اس کی طبیعت بُری طرح اُلجھ رہی تھی۔ اُس شام اُسے نجمہ باجی اور باقر بھائی کا شفتالو کے چمن میں کافی دیر تک انتظار کرنا پڑا تھا اور وہ دونوں کچے پھلوں کو توڑتے ہوئے چمن کے اس کونے سے اس کونے تک ٹہل رہے تھے اور وہ اکتاہٹ محسوس کر رہا تھا یہاں تک کہ وہ گھبرا کر انہیں چھوڑ کر چلا آیا۔ اور یہ پہلا موقع تھا۔ جب اس نے ظاہری اخلاق اور وضع داری کا پاس نہ کیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ دونوں بھی اس کو تلاش کرتے ہوئے وہیں آ گئے۔

"شکیل، معاف کرنا تم بلاوجہ ہمارے واسطے پریشانی اٹھانی پڑی"، نجمہ باجی نے بڑے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی معاف کرنا۔ اگر میری وجہ سے تم کو کوئی تکلیف ہوئی ہو" باقر بھائی نے بھی معذرت کی۔

یہ دونوں معذرتیں اتنی کم مدت میں پیش کی گئیں کہ اُسے اُن کے درمیان اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اور بالآخر اُسے ایک چھوٹے سے ہی فقرے پر اکتفا کرنی پڑی۔

"نہیں کوئی بات نہیں۔ میری اکتاہٹ آپ کی وجہ سے نہ تھی"۔

اور باقر بھائی اُس کے پاس آ کر بیٹھ گئے اور نجمہ باجی بھی وہیں بیٹھ گئیں۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟ ——" باقر بھائی نے جریدہ کی جلد اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"اس وقت اس میں تمہارا دل کیا لگتا ہوگا؟" باقر بھائی نے موقع بھانپتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ ——"

"اور کیا؟ ــــ یہ موٹو تو افسانہ و ناول دیکھنے کا تھا۔"
نجمہ باجی بیچ میں بول اٹھیں۔
"ارے! ــــ تم کو ادب میں کیا دخل؟ ــــ" باقر بھائی نے نجمہ باجی سے تمسخرانہ انداز میں کہا۔
"کیوں؟۔ کیا آپ کو میرے مطالعہ پر شک ہے؟"
"شک کی بات ہی ہے۔ تم کو یہ چیزیں دیکھنے کا کہاں وقت ملتا ہوگا۔"

اور اس نے محسوس کیا کہ بات پھر ان دونوں ہی تک محدود ہوگئی ہے۔ اور وہ رفعت آپا وہاں میز، کرسی، پلنگ، تپائی وغیرہ کی طرح کی کوئی چیزیں ہیں۔ بات بڑی دیر تک ادب پر ہوتی رہی اور فن اور تکنیک اور بیباک افسانہ نگاروں کے تذکروں تک پہونچ گئی۔ اور اس لمحے اسے اپنی وہ افسانوں کی کتابیں جن کو وہ بورڈنگ ہاؤس میں ہی مقفل چھوڑ آیا تھا اور رفعت آپا کے ڈر کی وجہ سے گھر نہیں لایا تھا بڑی سادہ سی اور بے خطا سی محسوس ہونے لگیں۔ جیسے انہیں جو کچھ بھی جذبات کو بے طرح تحریک دینے والے پلاٹ ڈھالے گئے تھے وہ عین فطرت تھے۔ وہی سماج تھے۔ وہی ماحول تھے، وہی زندگی تھے۔ مگر معاً بیچ میں رفعت آپا بول اٹھیں۔
"نجمہ، تمہارے منظور نظر ادب کا میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے۔ لیکن اس تذکرے کے دوران میں میں تمہارے چہرے کا ضرور مطالعہ کرتی رہی ہوں۔ اگر کہو تو میں اپنا تاثر بھی ظاہر کردوں۔"
"ضرور، ضرور، آپا ہم کو تو بڑی خوشی ہوگی اگر آپ ہماری گفتگو میں دلچسپی لیں گی۔" نجمہ باجی نے فرط مسرت میں کہا۔
"تمہیں ان افسانوں کے جن کی تم تعریف کرتی رہی ہو۔ جب بھی پلاٹ بیان کئے ہیں تو تمہارے چہرے پر میں نے حیا کی سرخی سی محسوس کی ہے لیکن فیصلہ تم خود کرو کہ تمہاری یہ حیا فطری ہے یا وہ افسانے؟ ــــ"

پھر ایک دم سکوت چھا گیا اور فن اور تکنیک کا وہ تذکرہ منقطع ہو کر رہ گیا۔ اسے اپنی وہ کتابیں پھر مجرم نظر آنے لگیں اور باقر بھائی اور نجمہ باجی کے لئے جو عظمت و محبت اس کے اندر تھی عقدہ بن گئی۔

چند دنوں کے بعد باقر بھائی کے گھر سے میاں جان اور امی جان کے نام خط آگیا اور نجمہ باجی واپس جانے کی تیاریاں کرنے لگیں۔ چھٹیوں کے بھی بہت تھوڑے سے ہی دن رہ گئے تھے۔ حویلی میں کچھ خفیہ تذکرے ہونے لگے۔ اور نجمہ باجی تصویر سے باہر ہی محسوس کی جانے لگیں۔ اور باقر بھائی نے غسل خانہ سے منہ دھو کر ان کے کمرے کی طرف جانے کے بجائے سیدھے اپنے کمرے کی طرف جانا شروع کردیا۔ اور پھر اسی اثناء میں نجمہ باجی کے نام بھی ان کے کالج سے دعوت نامہ آگیا۔ ان کو ریڈ کراس کے امدادی کنسرٹ میں حصہ لینا تھا۔ انہوں نے دعوت نامہ ملتے ہی رفعت آپا کی موجودگی میں باقر بھائی کو اور اس کو بھی شرکت کی دعوت دیدی۔
"نجمہ۔ کیا واقعی تمہارا کالج اس کنسرٹ سے ریڈ کراس کی مدد کرے گا؟"
"اور کیا آپ محض مذاق سمجھتی ہیں۔" نجمہ باجی نے رفعت آپا کو تمسخر کے ساتھ جو اٹپٹا لیکن اس میں تضحیک نہ تھی۔
"نہیں۔ میرا یہ مطلب تو نہیں ہے۔ میں تو یہ جاننا چاہتی تھی کہ کیا واقعی اس طرح کوئی امدادی کام کیا جاسکتا ہے؟"
"جی ہاں۔ ابھی پچھلے ہی سال ہم نے پانچ ہزار دیئے تھے۔"
"مگر کیا یہ رقم کسی اور طرح جمع نہیں کی جاسکتی تھی۔"
"آپا۔ آپ شہر کی ذہنیتوں کا اندازہ نہیں کرسکتیں۔ وہاں کے لئے اس سے موثر کوئی ذریعہ نہیں ہے۔"
"ہوسکتا ہے، ــــ" رفعت آپا نے ایک گہری سانس لیکر کہا اور پھر چند لمحوں کے لئے خاموش ہوگئیں۔ اور پھر انہوں نے اپنے فقروں میں تمسخر کا کہنا شروع کیا۔ "نجمہ انسان روز بروز کتنا گرتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر خاص کر جنسی معاملات میں! ــــ آج وہ اگر کوئی امداد بھی کرتا ہے تو جو رقم اپنی جیب سے نکالتا ہے اس کے بدلے اپنے نفس کی تسکین کا سامان ضرور خرید لیتا ہے۔ رقص و سرود میں خرچ کر کے وہ کسی طرح کی کوئی امداد نہیں کرتا ہے بلکہ تم ایسی کم سوچنے والی لڑکیوں سے پورے پورے دام وصول کرلیتا ہے اور تم سوچتی ہو کہ یہ تمام سامعین کتنے بلند اور عظیم ہیں کہ ایک بھلے کام میں بے دریغ خرچ کر رہے ہیں۔" ــــ

اس نے دیکھا نجمہ باجی بری طرح مضطرب تھیں۔ جیسے وہ رفعت آپا کے جملوں پر سوچ رہی تھیں اور سوچ کر بے چین ہوتی جارہی تھیں۔ اور ان کی یہ کیفیت اس حد تک بڑھتی چلی گئی کہ وہ اٹھ کر چلی گئیں۔ باقر بھائی نے ایک طویل جمائی لے کر سگرٹ نکالا اور سلگا کر اس کے

مرغولوں میں کھو گئے اور نجمہ باجی کو اٹھ کر جاتے ہوئے دیکھ کر مسکرائے اور ان کے تعاقب میں دھوئیں کا کثیف لچھا چھوڑ دیا۔ جیسے ان کے کانوں میں ان دنوں حویلی کا گرما گرم موضوعِ گفتگو گونج رہا تھا۔ مگر رفعت آپا جیسے نجمہ باجی کے یوں چلے جانے پر متاسف سی ہوگئیں تھیں اور وہ خود اُس زندگی کے بارے میں غور کرنے لگا تھا جو اُس کے پاس سے گزر کر اور نم کھا کر گذر گئی تھی۔

پھر وہ مسلسل سوچتا رہا غور کرتا رہا۔ اُس کے اندر رفعت آپا کے لئے وہ معصوم پیار پھر جاگ اٹھا تھا۔ اور وہ ان کی تادیب پر اُن کو چھیڑنے کے لئے پھر تیار ہو گیا تھا۔ مگر یہ تو اُس وقت ہوتا جب وہ سوچنا چھوڑ دیتا۔ اور یہاں یہ کیفیت تھی کہ لمحہ لمحہ دو زندگیوں کا موازنہ کر رہا تھا۔ اور ان دونوں میں متعدد رزن دیکھ کر وہ کسی اور محفوظ حصار کی تلاش میں سرگرداں تھا جس کا کسی قدر کھوج وہ رفعت آپا کی باتوں پر کچھ لمحہ سکون سے سوچنے کے بعد پا رہا تھا۔

اسی اثنار میں نجمہ آپا واپس چلی گئیں۔ باقر بھائی دوبارہ صبح اٹھکر باورچی خانہ سگرٹ جلانے جانے لگے۔ اور غسل خانے میں تیز سیٹی کا شور پیدا کرنے لگے اور اُسے ایک بار پھر موقع مل گیا کہ وہ ان کے ساتھ شام کی چہل قدمیوں میں ساعتوں پر ساعتیں گذار سکے اور وہ سب کچھ بھول کر جو ایک بلبل کی طرح اس کے اندر بسیرا ہو گیا تھا اُسی احساس جمال کو پرورش دینے لگے جس کے لئے باقر بھائی کے متجسس فقرے ایک مہمیز کا کام دیا کرتے تھے۔ وہ ایک بار پھر منظروں کے حسن میں کھو جانے لگا۔ قاز کی قطاروں کو لچائی نظروں سے دیکھنے لگا اور گاہے گاہے رفعت آپا کی جھڑکیوں سے بھی دوچار ہونے لگا لیکن وہ سب باتیں اتنی تیزی سے اپنا اثر کھو چکی تھیں۔ جن پر وہ کچھ دن پہلے بہیم غور کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اور پھر یہ اس قدر محو ہو گئیں کہ وہ احساس کمتری اچھی طرح اس کے اندر ابھرنے لگا جو ایک عرصہ ہوا مردہ ہو چکا تھا۔

زنان خانہ میں کچھ مخصوص تذکرے بڑے زور شور سے ہونے لگے۔ اور باقر بھائی اور ان کا خاندان بات بات میں گفتگو کا موضوع بن جایا کرتے۔ اور وہ محسوس کرنے لگا کہ باقر بھائی کے ہونٹوں پر قدرے فاتحانہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ اور رفعت آپا کا اُن سے الگ الگ رہنا ان کے لئے کسی شکایت یا تجسس کا باعث نہ بن سکا۔ پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ اب باقر بھائی شام کی چہل قدمی کی طرف زیادہ توجہ دینے کے بجائے شکار کے لئے سرگرداں ہو گئے تھے۔ مگر رفعت آپا کے چہرے پر روز بروز سنجیدگی بڑھتی چلی جاتی تھی اور ان کا رنگ ان کی کسی مخفی فکر کی وجہ سے دھیما پڑتا جا رہا تھا۔

اور یکایک ایک دن حویلی میں کھلبلی مچ گئی۔ ماندیوں اور مہریوں کی زبانیں ہر اس ذرہ استعجاب سے تھرتھرانے لگیں۔ یہ کتنی انوکھی بات تھی کتنی بے حیائی کی بات تھی۔ بڑی بٹیا نے منہ پھٹ جواب دیدیا تھا۔ انہوں نے رشتہ ہی سے انکار کر دیا تھا۔ حویلی کی تاریخ میں شاید یہ پہلا واقعہ تھا اور شاید حجاب اور برادری میں بھی۔ رانی بیگم کو جیسے اختلاج سا ہو گیا تھا۔ اُن کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اُن کو ہوش نہیں رہا تھا۔ اور سرکار تو جیسے بس ایک دم بے حد و حساب بوڑھے ہو گئے تھے۔ پھر ہونے والے نئے سرکار کے تو جیسے تیور ہی بدل گئے تھے۔ انہوں نے شام کو چہل قدمی کے لئے جانا بند کر دیا تھا۔ غسل خانہ میں وہ بڑی خاموشی کے ساتھ منہ دھوتے تھے۔ اور صبح کا سگرٹ پینا انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ اور یہ ساری کیفیت دیکھ کر وہ بڑا منغض ہو گیا تھا۔ اُس کو سب سے زیادہ غم اس بات کا تھا کہ باقر بھائی پر خود اس کے اپنے گھر میں مشکوک گفتگوئیں ہونے لگی تھیں۔ اور یہ نہ اُس کے لئے قابل برداشت تھا اور نہ باقر بھائی کے لئے۔

یہ ناگوار خاطر بڑھتے بڑھتے اس کے لئے واقعی ناقابل برداشت ہو گئی۔ اور اس روز جب باقر بھائی شام کی گاڑی سے واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے وہ صبح کے وقت سلیپروں کو گھسیٹتا ہوا باورچی خانہ میں چلا گیا۔ اور بے تکان رفعت آپا پر برس پڑا۔

"آپا، آپ کی ڈرامائیت ہمیں بالکل زیب نہیں دیتی ہے۔"

"کیا؟ — کیا بات ہے شکیل؟ —"

انتہائی غصہ میں اس کا گلا رندھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے اور چہرہ تمتما اٹھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ اینٹھ رہے تھے اور وہ بری طرح کشمکش محسوس کر رہا تھا۔ اس سے کچھ کہا نہ گیا اور وہ خاموشی سے رفعت آپا کو گھورتا رہا۔

رفعت آپا کے سنجیدہ چہرے پر اور بھی برد باری چھا گئی۔ اور ان کا دھیما پڑتا ہوا رنگ اور بھی دھندلا گیا۔ انہوں نے بڑے تحمل کے ساتھ اُس کے غصہ کو برداشت کرنا چاہا اور اس کی خلش کو مٹانا چاہا

جسے شاید وہ بھانپ گئی تھیں۔

"شکیل۔ آج صبح ہی صبح تم کیوں پریشان سے ہو گئے ہو؟۔ کیا ہو گیا ہے تم کو؟"

"کیا آپ نے نجمہ باجی کی وجہ سے رشتہ سے انکار کیا ہے؟۔"

اس نے اپنے اندر کھولتے ہوئے لاوے کو ایک دم اُگل دیا۔

رفعت آپا کے اندر کا بخار جیسے ایک دم پھوٹ پڑا۔ انہوں نے گھٹنوں میں اپنا سر دبا لیا۔ اور رونے لگیں۔ ان کی سسکیوں سے ان کے شانے بُری طرح کانپ رہے تھے اور وہ مبہوط سا کھڑا اُن کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کیا کرے۔؟۔ ایک طرف اس کا اپنا غصہ اور دوسری طرف رفعت آپا کی آنکھوں سے بہتا ہوا سیلِ بے پناہ۔ اُس لمحہ اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ رفعت آپا بیحد بزرگ نہیں ہیں۔ ابھی ان کو بھی دلاسے۔ تسلی اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔

"آپا؟۔۔۔۔۔"

"شکیل۔ کیا تم مجھ کو بھی اِن ہی لوگوں کی صف میں شمار کرتے ہو۔ کیا تم میرے لئے بھی یہی سوچتے ہو کہ میں محض چند رکیک جذبات اور کھنکتے سکّوں کے لئے خود کو بیچ دوں۔ تم میں سے کسی کو بھی مجھ سے ہمدردی نہیں"۔۔۔۔۔

اور عین اس وقت پھر اس کے تصوّر میں متعدد ناولوں اور افسانوں کے پلاٹ رقص کرنے لگے اور وہ رفعت آپا کے اِن فقروں کو بحث میں بیکار نمود بار کرنے لگا۔ اِسلئے اُس نے رفعت آپا کو چونکانا چاہا۔

"مگر آپا۔ اس قربانی سے پہلے آیندہ زندگی پر بھی تو غور کیجئے؟۔"

"کیسی قربانی؟۔۔۔ کیسا غور!۔۔۔۔۔ تم کہہ کیا رہے ہو شکیل؟۔۔۔۔۔"

"میں چاہتا ہوں آپ ایک بار پھر سنجیدگی سے غور کریں"

"تو کیا تم سمجھتے ہو میں نے یہ محض کھیل کھیلا ہے؟۔"

"وہ خاموش رہا۔ شاید وہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ یہی کچھ سمجھا تھا۔

"لیکن میں جانتی ہوں کہ جس شخص کے لئے زندگی زیبِ آرائش اور بہو ولعب جیسی معمولی چیز ہے وہ کیونکر کسی اور کی زندگی کو سہارا دے سکے گا"

وہ وہاں سے چلا آیا۔ اس کے دماغ میں مختلف خیالات ٹیڑھے، ترچھے، تکونے اُبھرتے رہے اور ڈوبتے رہے اور وہ سوچتا رہا، اور شام کی گاڑی سے باقر بھائی کو وہ رخصت کر آیا، مگر اب اس کے دل میں کوئی غبار نہیں تھا۔ اور اس زندگی کا خم جو اس سے کترا کر گذر گئی تھی ایک ایسی بدرو معلوم ہونے لگا جو متعفن غلاظتوں سے اَٹی ہوئی ہو۔ اور وہ انتہائی سعی و کوشش کرنے لگا کہ اس کا ذہن اس کی عکاسی سے مجتنب ہو جائے۔

ماہنامہ "اذان" سرینگر

سنہ ۱۳۷۱ھ سے باضابطہ طور پر شائع ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ ربیع الاوّل سنہ ۱۳۷۳ھ میں سالنامہ پیش کرنے والا ہے

ضخامت ۱۰۸ صفحے قیمت ایکروپیہ صرف

مستقل خریداروں کو یہ سالنامہ سالانہ چندہ میں ہی دیا جائیگا۔

سالانہ چندہ صرف تین روپے

آج ہی اپنا آرڈر بک کرائیے۔ اور سالانہ چندہ مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ فرمائیے

منیجر ماہنامہ "اذان" شاہ محلہ۔ سرینگر کشمیر

ابوالخطیب

محبت کا ایک اور روپ

بشیرا دودھ والے کی دوکان کے سامنے علی ظہیر صاحب کا بوڑھا کھیلا کتا بالو لکڑی کی تپائی کے نیچے منہ ڈالے آنکھیں بند کئے اونگھ رہا تھا۔ مکھیاں آس پاس سے بھنبھناتی ہوئی آئیں اور اس کے بدن کے ان حصوں پر بیٹھ گئیں جن پر شیرے اور بالائی کی سوکھی پپڑی جمی ہوئی تھی۔ بالو کے بھورے بھورے ریشمی بال کیچڑ اور دھول میں چکٹے کے باوجود ڈوبتے سورج کی زرد کرنوں میں بھٹے کے سنہری بالوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کے لمبے لمبے کانوں پر بھی مکھیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ جب کبھی وہ گردن ہلا کر منہ اوپر اٹھاتا تو مکھیاں تھوڑی دیر کے لئے اس کے سر کے اوپر بھنبھنانے لگتیں۔ پھر اس کے جسم کے کسی اور حصے پر بیٹھ جاتیں۔ بالو اس حصے پر بھی اپنا منہ مارتا لیکن اس کے بالوں کے گھنے جنگل میں کچھ پتہ نہ چلتا۔ کبھی کبھی جب تکلیف زیادہ بڑھ جاتی تو وہ گردن کو جھٹکا دے کر بڑے درد بھرے انداز میں چیخ اٹھتا۔ "قیاؤں"

اس کے آس پاس اور سامنے دودھ کے چھوٹے بڑے کٹورے بکھرے پڑے تھے جو اس کے سامنے تھے ان کی پیندی میں سے بچی کھچی بالائی اور دودھ کی پپڑی چاٹی جا چکی تھی جو اس کی پہنچ سے ذرا دور تھے وہ اسی طرح کیچڑ میں اوندھے پڑے ہوئے تھے بالو کے پیچھے گندی نالی بھی بہہ رہی تھی جس میں اس کی دم جیل کی ہنٹر کی طرح لٹک رہی تھی۔

جب مکھیاں اسے زیادہ ستانے لگتیں تو وہ اس بھیگے ہنٹر کو نالی میں سے اٹھا کر اپنی پیٹھ پر زور سے مار کر چھینٹیں اڑاتا۔ مکھیاں اڑ کر پھر ادھر ادھر بھنبھنانے لگتیں۔ بالو پھر زمین پر منہ ڈال کر آنکھیں بند کر کے اپنے زخمی پنجے کو احتیاط سے دبا لیتا مگر آنکھ جھپکتے ہی مکھیاں پھر آتیں اور اس کے زخمی پیر تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگتیں جسے وہ ننھے منّوں کی طرح اپنی چھاتی سے لگائے پڑا تھا۔ مکھیوں کا کچھ جب اونگھتے ہوئے بالو کے زخمی پیر کے قریب پہنچ جاتا تو وہ اپنی آنکھ کھولتا اور غصہ سے لمبی لمبی سانسیں لیتا۔ لیکن مکھیاں نہ اڑتیں پھر جب وہ گردن کو آسمان کی طرف اٹھا کر فریاد کے انداز سے زور زور سے ہلاتا تو وہ بھنبھناتی ہوئی اڑ جاتیں۔ جب وہ پھر گردن جھکا کر اونگھنے لگتا تو دوبارہ اس کے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوتیں۔ بالو گھبرا کر اپنے پچھلے دونوں پنجوں پر کھڑا ہو جاتا اور اس طرح دبی آواز سی درد و کرب سے بھری "قیاؤں" "قیاؤں" کرنے لگتا، جیسے کوئی جاندار آگ میں جل رہا ہو اور یہ آواز اس کے بدن کے جلنے اور اس کے چیخنے کے ملاپ سے پیدا ہو رہی ہو۔

سورج برابر ڈھل رہا تھا۔ بالو کے سنہری بال جو دھوپ میں چمک رہے تھے اب آہستہ آہستہ گہرے بھورے رنگ میں تبدیل ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ڈھلتے سورج کی زرد کرنیں اس کی بوڑھی پیٹھ پر سے کھیلتی کودتی اپنے گھر جا رہی تھیں۔ ہوا جو دوپہر سے شریر بچوں کی طرح محلے کے کوڑے کرکٹ کو ادھر ادھر پھینکتی پھر رہی تھی اب کچھ دیر کے لئے کہیں جا کر خاموش بیٹھ گئی تھی گلی کے دوکاندار اپنے ٹاٹ کے پردوں کو باندھنا شروع کر چکے تھے تاکہ شام کے لئے دوکانوں کو پھر سے سجائیں۔ کچھ لوگ اپنی دوکانوں کے سامنے میلے پانی سے چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ جب پانی کے کچھ ٹھنڈے چھینٹے بالو کی پیٹھ اور منہ پر پڑے تو اسے کچھ ہوش آیا۔ چونک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اور دم ہلا کر پیٹھ پر سے پانی کو چاٹنے لگا۔

شام ہوئی تو بالو خود بخود اور پیچھے پرٹ کر بیٹھ گیا تاکہ دودھ کے خریداروں کو کچھ تکلیف نہ ہو۔

بشیرا جو ساری دوپہر گدی پر بیٹھا اونگتا رہا تھا۔ قریب کی کھوٹ کھوٹ سنتے ہی آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اور جلدی سے اٹھ کر اندر دکان میں گیا۔ بکھرا ہوا سامان ایک طرف

کیا اور تختے پر جھاڑو دینے لگا۔ جھاڑو کی چھپ چھپ کی آواز سن کر بالو نے اپنی گردن اٹھائی اور زمین پر اپنی دُم زور زور مارنے لگا۔ جیسے وہ دھرتی کو تھپتھپا رہا ہو تاکہ تجربت کا جذبہ اس میں بھی بیدار ہو جائے۔

جھاڑو دے کر بشیر ابرتن اٹھانے جھکا تو اس کی نظر بالو پر پڑی یکایک اس کے غصے کا پارہ چڑھ گیا۔ اور وہ اندر سے ایک موٹا سا چیلا لاکر دوکان کے نیچے اترا اور بالو کو مار بھگانے کے لئے چیلا تانا لیکن جیسے ہی بالو کی محبت بھری نگاہوں کے اس کے دیکھتے انگارے چار ہوئے تو ایک دم وہ سرد پڑ کر بجھ گئے اور اس کا اٹھا ہوا تو انا ہاتھ ڈھیلا ہو کر نیچے گر گیا ——— بالو اسی طرح زبان نکالے دھرتی کو اپنی دُم سے تھپتھپا رہا تھا۔

بشیر نے اپنے ماتھے کو مسل کر چیلا بھٹی میں رکھا اور بڑبڑایا ——— "الو کے پٹھے ——— بابو بنے پھرتے ہیں ———

پانی کو تو پال لیا اور جب بڑھاپے کی اس پر مصیبت پڑی تو کوٹھی سے باہر پھینک دیا ——— مطلبی ——— کمین کہیں کے ———

اپنے کو پڑھا لکھا کہتے ہیں کہ"

جب جھنجھلاہٹ کچھ کم ہوئی تو بشیر پھر جھاڑو دینے لگا ——— بالو رہ گیروں کی آہٹ سے بار بار چونک پڑتا اور انہیں دیر تک تکتا رہتا۔ بشیر اگدی سے نیچے اترا اس نے بھٹی پر سے کڑھائی اٹھائی اور دوسری کڑھائی میں بچا کھچا دودھ انڈیلنے لگا تو بالو نے پھر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ لیکن بشیر اکام میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اس کی بالو پر نظر بھی نہ پڑی۔ بالو دونوں پنجوں پر کھڑا ہو کر دُم ہلاتے ہوئے آنکھیں پھاڑ رہا تھا۔ کڑھائی میں کھرچن کافی جمع ہو چکی تھی۔ بشیر اپنے ہونٹ چاٹنے لگا اور پھر تھوک دیا کیونکہ آنچ کے تیز ہونے سے وہ جلی کسیلی ہو چکی تھی جھنجھلا کر اس نے کھرپی میں بھر کر اسے پھینکنا چاہا مگر اسے کچھ خیال آگیا۔ اندر گیا۔ ٹوٹا سکورا لیا اور کھرچن اس میں بھری اور اس کٹورے کو بالو کے سامنے رکھ دیا۔ کھرچن کو دیکھتے ہی کتے میں بیٹھے ہوئے سارے کتے اور پلے اس کی طرف دوڑ پڑے۔ بالو اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ جیسے وہ اس سیلاب کو مقابلے سے روکنا چاہتا ہو۔ اس کے نتھنے پھول گئے۔ بال بھی بچھو کے ڈنک کی طرح تن گئے۔ جبڑے کی کھال جو سوکھے پتے کی طرح لٹکی پڑی تھی کچھ سکڑ کر تنی اور کچھ کتے دوڑ دوڑ کر رک گئے۔ اور دانت نکال کر سیٹیاتے ہوئے غرّانے لگے۔ بالو ایک ہوشیار ریچھ کی طرح اپنے دونوں پنجوں پر یونہی کھڑا رہا۔ پلّے اس پنچایت کو دور ہٹ کر دیکھنے لگے۔

بشیر ابجو دوکان کے اندر برتنوں کو باٹی میں ڈالے دھو رہا تھا۔ کتوں کی بھیڑ کو دیکھتے ہی باہر آیا۔ اور جلدی سے حسب عادت جھٹی کی طرف مڑا۔ چیلا نکالا اور گھما کر اسی موٹے تازے کتے کو مارا جو سب سے آگے تھا۔

"قیاؤں۔ قیاؤں" ——— یکایک اک شور اٹھا کتے پلے سب دُم دبا کر بھاگے۔ بالو کو اطمینان ہوا اور اس نے شکر گزاری کے انداز میں بشیر اکو دیکھ کر کھرچن چاٹنی شروع کر دی۔

پلے پھر ڈرتے سہمتے اور دُمیں ہلاتے بالو کی طرف بڑھنے لگے۔ آہٹ پاتے ہی بالو نے غرّا کر دیکھا۔ وہ ٹھٹھک گئے اور اپنی گردنیں جھکا کر ننھی ننھی دُمیں ہلانے لگے۔ بالو نے بھی اپنی گردن جھکا لی وہ پھر بڑھے لیکن اس مرتبہ اس نے کچھ نہ کہا۔ سب کے سب اپنی دُمیں ہلاتے اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے اور کھرچن کو چاٹنے میں مصروف ہو گئے۔

شام کا اندھکار بڑھتا جا رہا تھا۔ آسمان کے غربی کنارے پر بانتی چادریوں پھیلی پڑی تھی جیسے کسی دوشیزہ کی شال کریل کے پیڑوں میں الجھ کر رہ گئی ہو۔ ہوا بھی ٹھنڈی ٹھنڈی چل رہی تھی علی ظہیر صاحب بنگلے سے چھڑی گھماتے اپنے نئے بلڈاگ کی زنجیر تھامے تفریح کے لئے نکلے جا رہے تھے۔ بشیر اکڑھائی میں دودھ انڈیل رہا تھا۔ صاحب کو دیکھتے ہی ٹھٹھکا جیسے اسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔ پھر ہاتھ روک کر بے اختیار چلّانے لگا۔ "بابو جی اپنے کتے کی خبر تو لو"

صاحب اس آواز پر ٹھہرے۔ مڑ کر پیچھے دیکھا۔ بشیر اکا ہاتھ ابھی تک جھنڈی کی طرح ہل رہا تھا کچھ دیر وہیں کھڑے کھڑے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ انہیں کچھ غصہ سا آنے لگا۔ ماتھے پر بل پڑ گئے۔ منہ پھیر لیا اور بغیر کچھ کہے بلڈاگ کو چلنے کا اشارہ کیا۔

بشیر اس انسانیت کش بے اعتنائی پر پہلے تو ایک پھیکی سی ہنسی ہنسا۔ جیسے وہ انہیں ذلیل اور اس دنیا کو ذلت کی ایک پوٹ سمجھ رہا ہو پھر کچھ سوچ کر موٹی سی گالی دیکر کہنے لگا "مسہ اکتے کو رکھ کر بھی بفا (وفا) نہ سیکھ سکا۔ کھد گرتے ——— اللہ تجھے سمجھے کمین" ———

غصے سے بشیر اکے منہ میں جھاگ بھر گئے۔ آخر اس نے سر جھکا کر تھوکا جب اس کا جی ذرا ہلکا ہوا تو اس نے جھک کر پھر بالو کو دیکھا جو خوف منہ اٹھائے اس کی طرف دیکھ کر کچھ سمجھنا چاہ رہا تھا۔ بشیر اادر جھکا۔ بالو

کچھ سنبھلا بشیر نے اسی طرح جھکے جھکے علی ظہیر کی طرف اشارہ کیا۔ بالو نے اس کی انگلی کی مدد سے اس طرف دیکھا پہچان گیا۔ اٹھا اور لپک کر تین ہی ٹانگوں سے ان کی طرف دوڑنے لگا۔

سڑک کشادہ تھی اور آمد و رفت بڑھتی جا رہی تھی رنگ برنگی کاریں بجلی کی طرح چمک کر ادھر ادھر سے نکل رہی تھیں لیکن بالو اپنی تین ہی ٹانگوں سے سائیکلوں اور کاروں سے بچتا ہوا علی ظہیر کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔

کھ ——— کار کے پہیوں میں یکایک بریک لگ جانے سے ایک آواز پیدا ہوئی۔ بوڑھی دردناک آواز ——— جس میں محبت۔ چاہت۔ وفا۔ ارمان بھی کچھ تھا ——— یہ بالو کی آخری آواز تھی جو پہیوں کے رگڑنے کے ساتھ ملکر ایک گیت بن گئی۔ شاید اس بے حس۔ بیوفا دنیا کو خواب غفلت سے جگانے کے لئے اسے ٹوکنے کے لئے کہ وہ کدھر جا رہی ہے۔

بھونک۔ بھونک کار بالو کو کچل کر کچھ آگے کھڑی ہو گئی ——— ڈرائیور نے کار میں سے جھانک کر دیکھا۔

"کتا" ——— کار پھر چل دی۔

بالو کے منہ سے لال لال گاڑھا خون بہہ رہا تھا۔ محبت بھری وفا کی منتظر آنکھیں چیخ رہی تھیں۔ گردن زمین پر اس طرح پڑی تھی جیسے وہ اب بھی کچھ سوچ رہا ہو۔ اس نے اس پاس انسانوں کا ہجوم دیکھا۔ علی ظہیر دور افق میں دھبے کی طرح چھوٹے سے چھوٹے ہوتے جا رہے تھے۔

بشیر نے کچھ سوچ کر افق میں غائب ہوتے ہوئے دھبے کو دیکھا اور اپنی گدڑی سے اٹھا کر اس نے بھٹی سے جلتا ہوا انگارا اور تیزی سے بھیڑ کو چیرتے ہوئے بالو کی طرف بڑھا۔ بالو نے اسے دیکھا لیکن بشیر نے اس مرتبہ نگاہیں نہ ملائیں بلکہ آنکھیں میچ کر پوری طاقت سے اس کے منہ پر جلتا چیلا مارا۔ لوگوں نے روکا تو دوسرا ہاتھ اس کے زیادہ زور سے اس کی سوکھی کوکھ پر مارا۔ لوگ جب بہت زیادہ بگڑے تو اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ لوگوں میں ظلم کے خلاف نفرت ہے لیکن اسے اس پر بڑا غصہ آیا کہ لوگ آخر اسے پکڑ کیوں نہیں لیتے صرف دیکھ اور کہہ رہے ہیں اس خیال کے آتے ہی اسے پھر غصہ آیا اور غصہ کے طور پر تیسرا ہاتھ اس کی پچھلی ٹانگوں پر مارا

بالو کی آنکھیں اور دانت باہر نکل آئے خون جم کر ایک آئینے کے ٹوٹے ٹکڑے کی مانند ہو گیا جس میں اس کی ڈراؤنی صورت اپنا پورا عکس ڈال رہی تھی۔ مرحوم ہوتا تھا کہ وہ خود اپنے خون جگر کے آئینے میں اپنی صورت دیکھتے دیکھتے سو گیا ہے۔

بشیر اک منہ سے اس کی لمبی لمبی سانس کے ساتھ اس وقت جھاگ بھی اڑ رہے تھے۔ اس نے پھر بالو کی لاش کی طرف ایک نگاہ ڈال کر کہا۔

"سسرے جب تیرا کوئی پلو یا ہی نہیں تو تو جی کر کیا کریگا"

اس کہنے کے بعد لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ بشیر اروتا ہوا واپس اپنی دوکان کی طرف جا رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ دل کی آواز کے ساتھ ایک آواز اور دھیرے دھیرے اٹھ رہی تھی جو اسے بتا رہی تھی کہ محبت کا یہ اظہار دنیا کو وہ نہ دے سکے گا۔ جس کی ضرورت سچے ہے۔ ضمیر کی اس آواز نے بشیر کو پھر بیچارہ بدحواسی میں مبتلا کر دیا۔ اس نے اس حالت میں آسمان کی طرف دیکھا اور گھگھیا کے رو دیا۔

سیتہ پال آنند

زود پشیماں

جہاز زورسے چیخا جیسے وہ بھی سمندر میں ہندوستان سے بچھڑنے پر غمگین ہو۔ اور ساحل سے جہاز کے ڈیک تک بنا ہوا رستہ ہٹا لیا گیا۔ بوڑھے سائنسداں نے ڈیک پر کھڑے ہو کر ایک نظر دور افق تک سمندر کی جانب اور ایک نظر ساحل پر کھڑے ہوئے ہجوم کی جانب ڈالی جو اپنے عزیز و اقارب کو رخصت کرنے آئے تھے۔ لاتعداد ہلتے ہوئے سرخ سپید۔ سبز۔ نیلے۔ پیلے اور خاکی رومالوں سے اس کی نظر ہٹ کر کچھ فاصلے پر ایک طرف کھڑے ہوئے اپنے نوجوان ساتھی اور شاگرد دوائر کی اونچی ٹوپی پر پڑی۔ جو کسی مسئلے پر زور زور سے ہاتھ ہلا کر اپنے دوست مہندر سے بحث کر رہا تھا۔ بوڑھے سائنسداں کو اپنے ان دونوں شاگردوں پر ناز تھا لیکن وہ اکمار اور مہندر نے شاید اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ وہ یورپ کے دورہ پر جانے والے اپنے بوڑھے استاد کو رومال ہلا کر الوداع کہیں اسی لئے تو وہ اپنی باتوں میں محو کھڑے جہاز کے چلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

جہاز کو حرکت ہوئی اور آہستہ آہستہ ساحل سے دور ہوتا گیا۔ بوڑھا اسی طرح ڈیک پر کھڑا ہو کر ساحل پر نظر جمائے دیکھتا رہا۔ وہ چند منٹ اسی طرح کھڑا رہا۔ اب دور سے ساحل کے پاس کھڑے ہوئے جہاز بڑے بڑے آبی سائے نظر آتے تھے۔

بوڑھا ایک لخت مڑا۔ اور غیر ارادی طور پر وہ اپنے پاس کھڑی ہوئی ایک بوڑھی عورت سے ٹکرا گیا۔ اُسے اس عورت کی موجودگی کا بالکل احساس نہ تھا۔

"معاف کیجئے گا۔ میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو بالکل اکیلا محسوس کر رہا تھا۔"

عورت مسکرائی۔ اور اس کی آنکھوں کے بیرونی کونوں کی جھریاں اور نمایاں ہو گئیں۔

"مجھے آپ کی ذہنی کیفیات کا احساس ہے!"

"شکریہ!"

"آپ شاید ایک غیر معین عرصہ کے لئے اپنے بیوی بچوں اور عزیز و اقارب کو چھوڑ کر آ رہے ہوں گے؟"

اب بوڑھا مسکرایا۔ "جی نہیں۔ میں نے اتنے زیادہ آدمیوں کو الوداع نہیں کہا۔"

"پھر.....؟"

"میں صرف ایک آدمی کو ساحل پر چھوڑ کر آ رہا ہوں۔"

"درست..... اور وہ آپ کو بہت زیادہ عزیز ہو گا؟"

"بجا ہے....."

"آپ کی بیوی!"

"جی نہیں ـــــ!"

"بیٹا؟"

"وہ بھی نہیں ـــ"

"کوئی اور زیادہ عزیز رشتہ دار؟"

بوڑھے نے ایک لمبی سانس لی۔ "میں نے تمام عمر شادی نہیں کی۔"

ـــــ بوڑھی عورت نے ہوا سے اڑتا ہوا اپنا ساڑھی کا پلو ٹھیک طرح جما کر سر پر رکھ لیا۔ اور پھر ڈیک پر پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ بوڑھا سائنسداں بھی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

عورت نے اپنا پوپلا منہ کھولا۔ ایک ہلکی سی چاپ کی آواز پیدا ہوئی۔ اور وہ بولی۔

"اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔ تو ہم چند منٹ باتیں کریں؟"

"بخوشی! میں بھی یہی بات کہنے والا تھا۔"

بوڑھی عورت ہنس پڑی۔ اور اس کے منہ کے دو چار دانت

اپنے وجود کی پہیلی کھانے لگے۔

" شادی کے بغیر آپ کی زندگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

" جی ہاں کہیئے!"

" میرا مطلب ہے شادی کے بغیر آپ کی زندگی نامکمل رہی ہوگی"

" آپ شاید سطحی طور پر زندگی کو دیکھ رہی ہیں۔ میری زندگی ایک لحاظ سے بالکل غیر مکمل رہی ۔ ۔ ۔"

" تو آپ نے مان لیا نا کہ آپ کی زندگی کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جو کسی حد تک غیر مکمل رہا"

بوڑھے نے اپنا پوپلا منہ کھولا۔ اور مسکرا دیا۔ " آپ شاید نفسیات کی طالبہ ہیں کیا۔ ماہر رہی ہیں!"

" کچھ عرصہ۔ لیکن یہ علم ذہنی اور اخلاقی طور پر بہت خطرناک ہے اس لئے میں نے چھوڑ دیا"

"خطرناک؟"

" جی ہاں۔ اس لئے کہ یہ انسان کو ننگا کر دیتا ہے"

" ذرا وضاحت سے"

" کیونکہ آپ مجھ سے چھپا کر کچھ بھی تو نہیں سوچ سکتے"

" بجا فرماتی ہیں آپ۔ لیکن ہم اصل موضوع سے کچھ بھٹک گئے ہیں"

" جی ہاں۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ گفتگو ہلکے پھلکے مسائل پر ہو۔ آپ اپنی زندگی کی بابت کچھ بتا رہے تھے"

" ہاں تو ۔ ۔ ۔" بوڑھے نے کچھ دیر سوچا " لیکن زندگی کے دوسرے رخ نے مجھے اصل زندگی میں کوئی خاص جگہ نہ پائی۔ بس ذرا سی قسم کی چند چیزیں تھیں جن سے شروع شروع میں تو میں معمولی طور پر متاثر ہوا لیکن جلد ہی بھول گیا۔ دراصل میں زندگی اور علم کے باقی مسائل میں اس قدر مشغول رہا ہوں کہ مجھے ان دوسری باتوں کا خیال ہی نہ پیدا ہو سکا"

" یہ دوسری باتیں ۔ ۔ ۔ ۔؟"

" جی ہاں۔ زندگی کے باقی ماندہ معمولی مسئلے"

" مثلاً عورت۔ یہی منشا ہے نا آپ کا؟"

۔۔۔ بوڑھا پھر مسکرایا۔ اور اس کے پوپلے منہ سے ہنسی کی ایک ہلکی سی آواز نکلی۔

" مان لیجئے کہ یہی!"

" تو پھر آپ مایوس ہو گئے۔ کہ آپ کو تمام زندگی ایسا کوئی نہ ملا، جسے آپ اپنا سکیں"

" آپ بہت تیز ہیں۔ لیکن آپ شاید ایک لمبی رومانی یا تلخ داستان سننے پر مصر ہیں۔ ایسی داستان جس میں عہد ماضی کی تلخ و شیریں یادوں کی شراب ہو۔ کچھ گلے ہوں، کچھ شکوے ہوں"

۔۔۔ بوڑھی عورت کچھ دیر خلا میں دیکھتی رہی پھر یکایک بولی۔

" لیکن گفتگو کا اصل لطف تو تب ہے۔ اگر آپ مجھے بھی سمجھ لیں۔ آپ نے میری بابت تو کچھ پوچھا ہی نہیں"

" اس لئے کہ میں جانتا ہوں"

" آپ کا اندازہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے"

" ممکن ہے۔ مگر سو فیصدی نہیں"

" تو پھر؟"

" آپ ایک خاتون ہیں!"

" یہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں"

" آپ کے شوہر ہیں!"

" اور؟"

" بال بچے۔ ایک کنبہ، ایک مکان، گرہست کا پورا بوجھ۔ لیکن آپ بہت جلد اپنے گھریلو عہدے سے ریٹائر ہونے والی ہیں۔ یا ہو چکی ہیں۔ آپ کے بیٹے۔ بہوئیں ۔ ۔ ۔ ۔"

عورت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور اس کے دو چار دانت پھر نمایاں ہو گئے۔

" بالکل غلط سمجھے آپ!"

" تو؟"

" میں نے بھی تمام عمر شادی نہیں کی"

بوڑھے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ لیکن بند ہوتے وقت اس میں سے چاپ کی آواز پیدا نہ ہو سکی۔ چند لمحے مکمل سکوت رہا پھر بوڑھے نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی عورت کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔

" زندگی کے متعلق آپ کے نظریات ۔ ۔ ۔ ۔"

"... آپ سے اختلاف ضرور رکھتے ہیں لیکن ..."

"جی ہاں" بوڑھا بات کاٹ کر مسکرایا "احساسِ تنہائی آپ کو بھی پریشان کرتا رہا۔"

"یوں سمجھئے کہ اس احساس نے مجھے دوسروں سے نفرت کرنا سکھا دیا۔ نفرت اس لئے کہ ابتدائے جوانی میں میرا جذبۂ محبت اس قدر تیز تھا کہ اس کا ثانی کوئی نہ ملا۔ یا یوں سمجھئے کہ میرا ہم خیال کوئی نہ مل سکا۔"

"اور آپ کا جذبۂ محبت۔ نفرت میں تبدیل ہو گیا لیکن آپ نے یہ نہ سوچا کہ اس میں قصور کس کا ہے۔ آپ کا یا آپ کے مدمقابل کا؟"

"مدمقابل" عورت نے بھویں سکیڑ لیں۔ اور اس کی آنکھوں کے بیرونی گوشوں کی جھریاں نمایاں ہو گئیں۔ "مدمقابل تھا ہی نہیں سوائے ایک کے۔ لیکن میری طبیعت میں ایک ایسا ہیولا تھا جسے کوئی سمجھ ہی نہ سکا۔ میرا مدمقابل مجھے تعلیم یافتہ اور حساس ہونے کی وجہ سے برابر کا رتبہ دیتا رہا۔ لیکن میرے اندر کی عورت نے شاید پیدا ہوتے ہی میرے کانوں میں یہ پھونک دیا تھا کہ عورت فطرتاً کمزور اور محتاج ہے۔ مرد زور آور اور حاکم ہے۔ میں مرد کو بحیثیت زور آور اور حاکم مرد کے دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن مجھے اس بات کا احساس نہ تھا۔ کہ میری حیثیت، میری تعلیم، میری تربیت، میرا ماحول مجھے مرد کے حصول سے باز رکھیں گے۔ جو کلاوا دھوبی، رامو چمار یا راتو بھٹیارے کی طرح حاکم طبیعت کا تو ہو لیکن ساتھ ہی میرے مدمقابل کی طرح اعلیٰ خاندان، اعلیٰ تعلیم و تربیت۔ اچھا تہذیب یافتہ بھی ہو۔ میں اس بات کو جانتی تھی۔ کہ کائنات میں میرا وجود کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اور نہ ہی میری انفرادی زندگی کا مسئلہ کسی دوسرے کے لئے قابلِ غور ہے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ میرا مدمقابل بھی اس بات کو نہ سمجھ سکا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے ذاتی مسائل میں دخل دینے کی جرأت کر رہا ہوں۔ لیکن میں اس بات کا قطعاً قائل نہیں ہوں کہ آپ کی طرح کوئی دوسرا بھی نفسیاتی طور پر آپ کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اور پھر آپ نے ابھی ابھی تو کہا تھا۔ کہ یہ علم ذہنی اور اخلاقی طور پر بیحد خطرناک ہے۔ معاف کیجئے گا۔ اگر آپ دو نفسیات کے ماہر رشتۂ ازدواج میں بندھ جاتے۔ تو آپ ہی کے قول کے مطابق ہر لمحہ ایک دوسرے کو ننگا کرتے رہتے۔"

عورت نے گردن موڑ کر کچھ عجلت سی نظروں سے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اور خاموش رہی۔

بوڑھا پھر بولا "مجھے شک ہے کہ آپ نے اپنے مدمقابل کو بتایا بھی نہیں ہوگا۔ کہ آپ اس کی طبیعت کو کس رخ پر کچلتی ہوئی پروان دیکھنا چاہتی ہیں۔ آپ ہمیشہ یہ خواہش کرتی رہیں کہ وہ آپ کی نفسیاتی طور پر آپ کی نفسیات کو سمجھے اور دیکھے ...."

عورت حد سے زیادہ سنجیدہ ہو گئی۔ "آپ بجا کہتے ہیں لیکن اس سلسلہ میں میرا بہت معمولی سا قصور ہے۔ میں نے ہر ممکن طریقہ سے کوشش کی کہ اپنے آپ کو اس پر واضح کرنے کی کوشش کروں لیکن زندگی سے متعلقہ مسائل پر جب بھی کوئی بات چھڑتی۔ وہ میری طرف خاموش نگاہوں سے دیکھکر زیرِ لب مسکراتا رہتا۔ میں بحث کرتی۔ جھگڑتی۔ لڑ پڑتی۔ اور اٹھکر چلی آتی ..."

بوڑھا کرسی سے اٹھکر ٹہلنے لگا۔ "تو آپ کو اعتراف کرنا چاہئے کہ آپ کا مدمقابل تو سر سے پاؤں تک آپ کو سمجھتا تھا۔ مگر آپ نفسیات میں بالکل ناکام رہیں۔ اور اسے نہ سمجھ سکیں۔"

عورت تڑپ اٹھی لیکن کچھ سوچ کر پھر بھنچ کر بیٹھ گئی۔ "آپ بجا فرماتے ہیں .... میں اسے بالکل نہ سمجھ سکی ..... میں زندگی میں بہت ناکام رہی ہوں .... بہت ناکام ..." عورت کی سسکیاں سنائی دیں۔ عہدِ ماضی کی یاد نے شاید اسے رلا دیا تھا۔

بوڑھا اور بھی سنجیدہ ہو گیا۔ "مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ یہ ہے کہ میں آپ کے اس نظریہ کو قبول نہیں کرتا۔ جس میں آپ خود کو حق بجانب سمجھتی ہیں۔ مرد قدرتاً اور فطرتاً زور آور اور حاکم نہیں ہے۔ یہ انسانوں اور ہماری سوسائٹیوں کے خود ساختہ قوانین ہیں۔ عورت کے پیدا ہوتے ہی اس کے شعور میں یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ وہ کمزور ہے۔ ماتحت ہے۔ محتاج ہے۔ مرد کے بغیر اس کا چارہ نہیں۔ مرد طاقتور ہے۔ شفیق ہے۔ عورت کے لئے دیوتا اور قابلِ پرستش ہے۔ یہ خود غرض مردوں کے بنائے ہوئے اصول و ضوابط ہیں۔ آپ نے بھی اگر اپنی زندگی برباد گنوائی، تو صرف اسی نظریہ کے تحت ... مجھے افسوس ہے

کہ آپ نے اتنا پڑھ لکھ کر بھی کچھ فائدہ نہ اٹھایا۔ اور... اور..."

عورت بالکل رونے پر آ گئی تھی۔ اس کی سسکیاں تیز اور بلند ہوتی جا رہی تھیں۔

"میں زندگی بھر ناکام رہی ہوں.... ناکام....."

اس نے پھر دہرایا۔

بوڑھا یکایک ٹہلتے ٹہلتے ٹھہر گیا۔ جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ہو۔ پھر بولا۔

"کون تھا آپ کا مدِ مقابل؟"

عورت نے سر اٹھایا۔ کچھ سوچا۔ پھر بوڑھے کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اسے شاید اپنے ذاتی حالات اس قدر کرید کرید کر پوچھے جانے پر کوفت ہو رہی تھی۔ مگر اتنی باتوں کے بعد پیدا شدہ دوستانہ ماحول کو وہ توڑنہ سکی۔ اور اس نے جواب دیا۔

"الہ آباد یونیورسٹی کا ایک پروفیسر!"

بوڑھے کی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھل گئیں۔ "کب؟"

"آج سے تیس برس پہلے۔"

بوڑھا زیرِ لب مسکرایا۔ پھر آہستہ سے ہنسا۔

"کیا اب آپ محسوس کرتی ہیں کہ تمام عمر آپ کے نظریات غلط رہے؟"

"اب اور صرف آپ سے گفتگو کے بعد۔ اصل مجھے قائل کرنے والا کوئی ملا ہی نہیں۔ جو مجھے یہ احساس کرا سکے۔ کہ میں غلط رو ہوں۔"

بوڑھا پھر مسکرایا۔ اس نے عہدِ ماضی کی یاد میں کھوئی ہوئی بوڑھی عورت کا ہاتھ پکڑا۔ اور کہا۔

"چلئے۔ نیچے چلیں، ڈیک پر سردی بڑھ گئی ہے۔ کل باتیں ہوں گی۔ آپ کا کیبن نمبر کیا ہے؟"

"پچاس"

"اوہ خوشی کی بات ہے۔ میرا نمبر اکاون ہے۔"

وہ دونوں جہاز کے اندرونی حصے کی جانب بڑھنے لگے۔

بوڑھے سائنسداں نے اپنی کیبن میں پہنچکر اپنی نوٹ بک نکالی۔ اور موٹے حروف میں دو فقرے لکھے۔

"عورت کی یادداشت کتنی کمزور ہوتی ہے۔"

"عورت آخر عورت ہے۔"

"چند ہفتوں کے بعد لندن کے روزنامہ ڈیلی ٹیلی گراف میں سوشل نیوز کے کالم میں مندرجہ ذیل خبر شائع ہوئی۔

"کل صبح سول کورٹ میں ہندوستان سے ایٹمی رلیسرچ کمیشن کے ساتھ آئے ہوئے مشہور پینسٹھ سالہ سائنسداں مسٹر بھٹناگر نے ہندوستانی خاتون مس رودا سے جو بین الاقوامی کانفرنس میں بطور ڈیلی گیٹ آئی ہوئی تھیں شادی کر لی۔ دلہن کی عمر پچپن برس ہے۔

لندن کے تمام سرکردہ اصحاب اس مبارک تقریب میں شریک ہوئے۔ مسٹر اور مسز بھٹناگر اگلے ہفتہ یورپ کے دورہ پر روانہ ہونے والے ہیں۔"

ادبی مسائل

(ذیل کا مکتوب معیار ماہ ستمبر ۵۳ء کے نقش اوّل سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا گیا ہے یہ نقش رکن ادارہ معیار جناب حنیف فائر میرٹھی نے لکھا تھا۔ اس مکتوب کا جواب بھی انہی کے قلم سے ہے۔ ۔ "معیار" ——————)

ابن فرید صدیقی ۔ رامپور۔

آپ کا نقش اوّل (ستمبر) اس ماہ یہاں خاص طور سے تنقید کا محور رہا ہے۔ آپنے معیار کی جس پالیسی کا اعلان اس میں کیا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے آپ پر ذمہ داری ادب اسلامی سے باہر کے ادیبوں کے ساتھ مصالحت کر لینے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ آپ نے تحریر کیا ہے کہ آخر اس میں کیا قباحت ہے کہ ہم اپنے حلقے سے باہر کے مشاہیر ادیبوں کی وہ تخلیقات حاصل کرنے کی کوشش کریں جو ہمارے بنیادی اصولوں کی نفی نہیں کرتیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اصل قباحت تو اسی میں ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ کس بنیاد پر ان کی تخلیقات کو گوارہ کریں گے؟ کیا صرف اس بنا پر کہ وہ مشہور ادیب ہیں یا صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے بنیادی اصولوں کی نفی نہیں کی ہے۔ اگر آپ اتنا ہی کافی سمجھتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ شاید پھر اس وقت کوئی ادیب بھی ایسا نہ رہ جائے گا جو ہمارے پلیٹ فارم سے خود کو پیش نہ کر سکے۔ سعادت حسن منٹو سے لیکر ستیا ذطیرا اور سردار جعفری تک سب ہی رفیق محفل ہو جائیں گے۔ شدید سے شدید مخالفین تک کے دیوانوں اور محبوبوں کو دیکھ جائیے کوئی نہ کوئی ایسی بات آپ کو ایسی ضرور مل جائے گی جس سے آپ اتفاق کریں گے کیونکہ باطل کبھی بھی حق کا سہارا لئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ مثال کے طور پر آپ سرمایہ داری اور اشتراکیت ہی کو لے لیجئے۔ کیا ان میں آپ کو خیر کے ایسے اجزا نہ مل جائیں گے جن سے آپ اتفاق کریں؟ یقیناً ضرور مل جائیں گے۔ مگر کیا ہم ایک جز پر اتفاق کر سکتے ہیں؟ شاید آپ بھی کہیں گے کہ نہیں۔ بس اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ محض کسی کی شہرت یا بازار ادب میں قبولیت کی وجہ سے ادب اسلامی میں نمائندگی کا درجہ دیدیں۔ میں بار بار نمائندگی کا لفظ استعمال کر رہا ہوں شاید یہ آپ کو کھٹک رہا ہو۔ اس لئے میں یہ لکھ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ادارہ ادب اسلامی کے ترجمان میں جگہ پانے کے معنی ادارۂ ادب اسلامی کی نمائندگی کرنے کے ہیں۔ اپنے حلقے سے باہر کے ادیبوں کی شرکت اور تعاون کا میں مخالف نہیں ہوں۔ لیکن میں اس تعاون کو صرف اسی حد تک مناسب سمجھتا ہوں کہ اس ادیب کی سیرت کا ایک مخصوص معیار ہو اور اپنی سیرت اور کردار سے ہمارے اصولوں کی نفی نہ کرتا ہو (نہ کہ اپنی تحریروں سے) یا پھر وہ اپنے اندر ہماری طرف بیش قدمی کا رجحان رکھتا ہو۔ اس کے بغیر تمام ادب اور تمام ادیب فی الحال ہمارے کام کے نہیں ہیں۔ جب ادب کی تاریخ صالح نقطۂ نظر سے مدوّن کی جائے گی تو آرزو ادب کے تمام ادیبوں کو ہم یقیناً حاطہ کریں گے اور کسی اہم ادیب کو نظر انداز نہ کریں گے۔ اس وقت اس کے ادب پاروں سے بھی ہم استفادہ کریں گے۔ لیکن موجودہ صورت میں ہمیں ایک تحریک کو پروان چڑھانا ہے ایک صالح نظریہ ادب کی اشاعت کرنی ہے اس کے واضح خطوط پیش کرنے ہیں اور اس کے لئے ہمیں ایسی ہی چیزیں منظر عام پر لانی ہیں جن سے ہمیں کم از کم نظری طور پر ضرور اتفاق ہو وہ صرف ہمارے اصولوں کی نفی ہی نہ کریں بلکہ اس کی طرف اشارہ بھی کریں۔ اتنی نہ کرنے سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کی مراد جانبداری سے ہے۔ لیکن ایسے ادب کی اہمیت تحریک کے ابتدائی دور میں میں مضحکہ انگیز سمجھتا ہوں۔ ضرورت تو اس وقت اس چیز کی ہے کہ ہم لوگوں کو جھنجھوڑیں اور چونکائیں نہ کہ زحمت تلاش کر کے انہیں مطمئن کر دیں۔ اور اسی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ اگر مشاہیر کے تعاون نہ کرنے سے ایک جریدہ چل نہیں سکتا تو بہتر یہ ہے کہ وہ نہ چلے بجائے اس کے کہ وہ ان کے ادب پر چھائے ہوئے ہونے سے مرعوب ہو کر مصالحت کرے۔

ادارہ :-

آپ کی پہلی بات کے جواب میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ معیار کی جس پالیسی کا اعلان ستمبر ۱۹۵۳ء کے نقش اوّل میں کیا گیا ہے وہ کوئی نئی پالیسی نہیں ہے۔ ایسا تو اب تک ہوتا ہی رہا ہے نقش میں صرف اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور یہ پالیسی وہی ہے جس کو ہمارے قارئین اور آپ بھی سراہتے رہے ہیں۔ اس لئے یہ بات کہ "نئی پالیسی" میں باہر کے ادیبوں سے مصافحت کرنے اور کسپڑ ڈال دینے کا اندازہ پایا جاتا ہے یکسر نادرست ہے۔

اب کچھ دیگر سوالات کے بارے میں سنئے۔ آپ نے پوچھا کہ ہم کس بنیاد پر دوسرے ادیبوں کی تخلیقات گوارا کریں گے؟ . . . . . اس کا جواب یہ ہے کہ نہ صرف اس بنیاد پر کہ وہ کسی مشہور ادیب کی تخلیق ہیں ورنہ محض اس وجہ سے کہ ان میں ہمارے بنیادی اصولوں کی نفی نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ تخلیق بیک وقت دونوں خصوصیات کی حامل ہیں ایک ادیب خواہ کتنا ہی مشہور اور مقبول ہو لیکن اس کی تخلیق ہمارے بنیادی اصولوں کی نفی کرتی ہے تو اسے معیار میں جگہ نہیں ملنی چاہئے۔ اسی طرح کسی غیر معروف ادیب کی ایسی تخلیق جو ہمارے بنیادی اصولوں کی نفی تو نہ کرتی ہو لیکن مقصدیت سے بالکل خالی ہو اسے معیار میں شائع نہ ہونا چاہئے۔ اِلّا یہ کہ کوئی خاص مجبوری ہی درپیش آجائے۔

سعادت حسن منٹو سے لیکر سجاد ظہیر اور سردار جعفری تک کے رونق محفل ہو جانے کے اندیشہ سے آپ کو زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہئے یہ ایک طرح کا احساس کہتری ہے۔ اصل میں اس مسئلہ کے دو پہلو ہیں ایک یہ کہ ہو سکتا ہے کہ ایک لکھنے والا ہمارے نصب العین کو مضحکہ خیز سمجھتا ہو۔ لیکن اسے اپنی ساکھ پر اعتماد نہ ہو اور وہ اپنی شہرت کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے ہمارے پرچوں میں بھی چھپنے کی کوشش کرے اور اس کوشش میں کامیاب ہو جانے پر سوچے کہ دیکھا کیسا بیوقوف بنایا۔ بیشک اس قسم کے لکھنے والوں کے لئے معیار میں قطعاً کوئی جگہ نہیں ہونی چاہئے جس قلمکار کے خلاف ہمیں ایسا ثبوت بہم پہنچ جائے گا ہم کسی حال میں بھی اس کو برداشت نہیں کریں گے۔

سعادت حسن منٹو، سجاد ظہیر اور سردار جعفری کی قبیل کے لکھنے والوں کا کیس اس سے ذرا مختلف ہے یہ سب لوگ ادب میں اپنا اپنا مقام بنا چکے ہیں ملک کے اچھے اچھے رسالے ان کی تخلیقات کے منتظر ہی نہیں بلکہ طالب ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں رونق محفل "معیار" بننے کی دوسری وہ آخر کیوں مول لیں گے اور بالفرض اگر وہ اپنی کوئی ایسی تخلیق ارسال کرتے ہیں جس سے ہمارے نصب العین پر زد نہ پڑتی ہو تو میں نہیں سمجھتا کہ اس کی اشاعت سے ہمارا پرچہ نجاست آلودیا اشتراکیت زدہ ہو جائے گا۔ جن افکار و نظریات کی ترویج و اشاعت کے لئے ہم جدوجہد کر رہے ہیں انہیں ہم نے اگر بے سوچے سمجھے نہیں اپنایا ہے، ہم ان کی پشت پر ناقابل تردید دلائل کی طاقت رکھتے ہیں اور انہیں خوش اسلوبی اور سلیقہ سے پیش کرنے کی صلاحیت بھی ہم میں موجود ہے تو پھر یہ ڈر اور خوف کیوں ہے جب ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہمارا مسلک حق ہے اور ہمیں اس کو باطل پر غالب کرنا ہے تو یہ خول میں سکڑنے اور ترک موالات کی پالیسی کیا معنیٰ رکھتی ہے۔ ہمارے ادیبوں کو اتنا جری ہونا چاہئے کہ وہ غیروں کی بھری محفل میں بلا جھجک اپنا پیغام پیش کر سکیں۔ یہ کہ اگر غیروں میں سے ایک آدھ ہماری انجمن میں آکر مؤدب بیٹھ جائے تو ہم اُسے دیکھ دیکھ ہما کریں۔

اپنے اسی مکتوب گرامی میں آپ نے ایک جگہ فرمایا ہے "مثال کے طور پر آپ سرمایہ داری اور اشتراکیت ہی کو لیجئے گا کیا ان میں آپ کو خیر کے ایسے اجزا نہ مل جائیں گے جن سے آپ اتفاق کریں۔ یقیناً ضرور مل جائیں گے مگر کیا آپ ایک جز پر اکتفا کر سکتے ہیں؟ شاید آپ بھی کہیں کہ نہیں!" جی نہیں میں یہ کیسے کہہ دوں جبکہ میں جانتا ہوں کہ ہر ادبی تخلیق میں جز پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے وہ ایک مستقل نظام حیات کی حیثیت نہیں رکھتی۔ کیا ہمارے رسائل نے امریکنوں کی ان تحریروں کو شائع نہیں کیا ہے۔ جن میں اشتراکیت کی کلیت پسندی پر تنقید کی گئی ہے اور اسی طرح کیا ہم نے ان تبصروں کو منظر عام پر لانے سے گریز کیا ہے جو اشتراکیوں کی طرف سے سرمایہ دار ممالک کی بے لگام انفرادیت اور اخلاقی انحطاط پر کئے گئے ہیں۔

بلاشبہ معیار کا مقصد صالح تعمیری اور اسلامی ادب کی ترویج و اشاعت کرنا ہے مگر اس ماہنامہ کی حیثیت ادارہ ادب اسلامی کے آرگن کی نہیں ہے معیار کے مخصوص مزاج سے مناسبت رکھنے والی تمام نگارشات کو اس میں جگہ پانے کا حق ہے خواہ وہ ادارہ ادب اسلامی سے منسلک ادیبوں کی طرف سے موصول ہوئی ہوں یا انجمن تعمیر پسند مصنفین کے لکھنے والوں کی طرف سے یا ان کے علاوہ دوسری انجمنوں سے متعلق فن کاروں کی طرف

سے بھیجی گئی ہوں یا وہ ایسے قلمکاروں کی ارسال کردہ ہوں جو کسی بھی ادبی انجمن کے رکن نہیں ہیں۔ "معیار" کا اصل کام اسلامی ادب کو متعارف کرانا اور اسے رائج اور مقبول بنانا ہے۔ ظاہر ہے کہ مقصد ادارہ ادب اسلامی کے آرگن بننے سے اچھی طرح پورا نہیں ہوسکتا ایسا کرنے سے اس رسالہ کا معیار معنا مین کافی پست ہو جائے گا۔ چونکہ معیار کے ادارہ ادب اسلامی کا آرگن بننے کا معنی یہ ہوں گے کہ اس میں تقریباً سب کچھ وہی شائع ہو جو ادارہ ادب اسلامی کی مختلف شاخوں کی طرف سے بھیجا جائے۔ اس کے علاوہ ادارہ کے کمزور سے کمزور لکھنے والے کی بھی یہ خواہش ہوگی کہ "معیار" جب ادارہ ادب اسلامی کا آرگن ہے تو اس کی تخلیقات کو بھی اس میں وقتاً فوقتاً جگہ ملتی رہنی چاہئے۔ پھر یہ ناممکن ہوگا کہ اس قسم کی خواہشات کا لحاظ نہ کیا جائے۔ اس طرح "ادارہ ادب اسلامی" کی نمایندگی تو ضرور ہو جائے گی مگر اسلامی ادب کا دقار قائم نہیں ہو سکے گا۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ اپنے حلقہ سے باہر کے ادیبوں کی شرکت اور تعاون کے مخالف نہیں ہیں مگر اس کے ساتھ ہی جو شرائط آپ نے تحریر کی ہیں وہ مزید غور و فکر کی محتاج ہیں۔ آپ اس کو ضروری خیال کرتے ہیں کہ "معیار" میں صرف ان لکھنے والوں کی نگارشات شائع ہوں جو سیرت کا ایک مخصوص معیار رکھتے ہوں۔ بالفاظ دیگر ہمارے حلقہ سے باہر کا کوئی ادیب اگر "معیار" سے قلمی تعاون کرنا چاہے تو اسے اپنے مضمون کے ساتھ چال چلن کا سارٹیفکیٹ بھی ارسال کرنا چاہئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں خدانخواستہ ادیبوں اور شاعروں کے لئے سیرت کردار کو غیر ضروری قرار دیتا ہوں عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ فی الحال ہم اپنے قلمی معاونین کے ساتھ جو کچھ معاملہ کریں وہ ان کی نگارشات کو سامنے رکھ کر کریں اگر ان کی فکر صالح اور فن پختہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کی تخلیقات کی اشاعت اس وقت تک ملتوی رکھیں جب تک کہ ہمیں ان کے سیرت و کردار کی طرف سے اطمینان نہ ہو جائے۔

ہماری ادبی تحریک کا یہی تو مقصد ہے کہ ہم ایک ایسا ذہنی انقلاب برپا کریں جس سے رائج الوقت غلط افکار و احساسات پر اذکار و احساسات غالب آجائیں جن کے صحیح ہونے میں ہمیں کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہ بات اگر ٹھیک ہے تو ہمارے پرچوں کو ایسے ادیبوں کی تخلیقات کا غیر مشروط طور پر خیر مقدم کرنا چاہئے جو اس مقصد میں ہم سے متفق ہوں اور اس مبارک جد و جہد میں ہمارا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں۔ پہلے ہی قدم پر سیرت و کردار کی تعمیر کا مطالبہ کرنے کے بجائے ہمیں چاہئے کہ ہم انہیں اس وقت تک آگے بڑھنے دیں جب تک ان کے نئے ادبی کارناموں کا وزن ان کی اپنی شخصیت سے زیادہ یا کم از کم اس کے برابر ہو جائے۔ اس مقام تک پہنچتے پہنچتے اکثر ادیبوں کی سیرت و کردار کی خامیاں خود ہی دور ہو جائیں گی۔ اور جو رہ جائیں گے ان کو ٹھیک کرنا زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ چونکہ یہ خیال اب عام ہوتا جا رہا ہے کہ فن کار کے پیغام اور زندگی کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہونا چاہئے، مختلف نہیں البتہ اس چیز پر ہر وقت نظر رکھنا ضروری ہے کہ کوئی گھناؤنے کردار کا فن کار محض اپنے فن اور ادبی سرگرمیوں کی بدولت ہمارے کیمپ میں غیر معمولی مقام نہ حاصل کر لے اس سے ہماری تحریک کی نیک نامی اور وقار پر حرف آنے کا قوی اندیشہ ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہمیں صالح نظریۂ ادب کے واضح خطوط پیش کرنے ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ "معیار" کا ہر شمارہ ایسا مترادف مضامین سے پر ہو جن میں صالح ادب کے واضح خطوط پیش کئے گئے ہوں۔ اول تو ہر ماہ اس قسم کے مضامین اتنی تعداد میں ملنا مشکل ہے۔ دوسرے یہ کہ طریق کار اتنی بڑی خوراک دینے کے مترادف ہے [illegible] ہمارے ساتھی اس وقت اس میدان میں پیش پیش ہیں ان کو چاہئے کہ وہ کتنے ٹیڑھے ترچھے راستوں سے گزر کر اس منزل تک پہنچے ہیں۔ انہوں نے اسلامی لٹریچر کا کتنا مطالعہ کیا ہے کس قدر سوچا ہے کتنی کتابیں کی ہیں۔ اب اگر ہم یہ توقع کریں کہ ہمارے حلقہ سے باہر کے لوگ "معیار" کے دو چار شماروں کے مطالعہ سے ہمارے نقطۂ نظر کو پوری طرح سمجھ جائیں اور اپنی تخلیقات میں ہمارے اصولوں کی طرف اشارہ کرنے لگیں گے تو ایسی توقع کرنا قبل از وقت ہوگا۔ ہمیں موجودہ ماحول کی ادبی فضاء کا پوری طرح جائزہ لیکر اپنے کام کو اس طرح آگے بڑھانا ہے کہ جن لوگوں کو ہم اپنے نقطۂ نظر سے روشناس کرانا چاہتے ہیں انہیں اتنی اجنبیت کا احساس نہ ہو کہ وہ متوحش ہو جائیں یا ہمارے ادب پاروں کو پڑھکر ان کا حق الجھنے لگے۔ ہمیں لوگوں کو جھنجھوڑنا اور چونکانا ضرور چاہئے مگر اس طرح نہیں کہ یہ جھنجھوڑنا اور چونکانا جھنجھوڑنا اور بدکانا بن جائے۔

یہ کون کہتا ہے کہ مشاہیر کے تعاون کے بغیر "معیار" نہیں چل سکتا ہمیں چھوڑیئے خود مشاہیر کو "معیار" کا اس درجہ احتیاج نہیں

خیال کرسکتے ہم جوان کے مضامین کو اپنے اس پرچہ میں جگہ دیتے ہیں اس کا یہ مطلب نکالنا غلط ہے کہ اُن لوگوں کے ادب پر چھائے ہوئے ہونے سے مرعوب ہوکر مصالحت کی جارہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسا ہم ایک سوچے سمجھے ہوئے طریق کار کے مطابق کرتے ہیں اگر ہم ایسا نہ کریں تو پرچہ تو ہر مہینہ نکلتا ہی رہے گا مگر ہمارے حلقہ سے باہر کے ادیبوں کی اس سے دلچسپی رفتہ رفتہ بالکل ختم ہوجائے گی۔ آپ نفسیات کے طالب علم رہ چکے ہیں اسلئے مجھے امید ہے کہ اس اندازہ سے اتفاق کریں گے اور اب تو اندازہ کا بھی سوال باقی نہیں رہتا۔ خود تجربات اس کے شاہد ہیں۔ تعمیری اور اسلامی ادب کو خوش اسلوبی سے پیش کرنے اور اُسے مقبول بنانے کے سلسلہ میں جتنے اچھے نتائج نوعمر معیار کی کوششوں کے نکلے ہیں ویسے دوسرے رسائل و جرائد کی کوششوں کے نہیں نکلے۔ ہمارے حلقہ سے باہر کے ادیب ہمارے پیش کئے ہوئے نظریۂ ادب پر غور کرنے لگے ہیں اُن میں سے بہت سے صاف دل، دوماغ اور صالح فطرت رکھنے والے جو پہلے ہم سے بہت دور تھے رفتہ رفتہ ہمارے قریب آتے جارہے ہیں اور کچھ تو ہم سے بھی دو قدم آگے معلوم ہوتے ہیں۔ آج سے سال دو سال پہلے اگر معیار اُن کی اِس قسم کی تخلیقات کو گوارا نہ کرتا جس قسم کی تخلیقات پر آپ نے احتجاج کرنا ضروری خیال کیا ہے تو ہمیں اُن سے ربط قایم کرنے اور انہیں ہمارے نقطۂ نظر کو سمجھنے کا موقع شاید ہی ملتا۔

اِن واقعات کی روشنی میں یہ مشورہ دینا کہاں تک مناسب ہوگا کہ ہماری حرکت سے تو ہمارا جمود ہی بہتر ہے۔

چند جدید ڈاکٹری کتابیں

رسالہ ٹیرامائی سین اس میں زمانہ جدید کی حیرت انگیز دوا کے بارے میں مکمل معلومات درج ہیں۔ قیمت ۸ر

رسالہ افیون یہ کتاب آر۔ این۔ چوپڑہ کی دیسی دواؤں قیمت ۸ر سے ماخوذ ہے۔

شفاء الامراض ڈاکٹری اس میں انگریزی حروف تہجی کے مطابق ڈاکٹری تجربات اور پیٹنٹ ادویات درج کی گئی ہیں۔ قیمت تین حصے مکمل تین روپے

قرطاس مجربات اس میں عام امراض کا علاج اور جدید ادویات اور دستور علاج پر خوب بحث کی گئی ہے۔ یہ نہایت اہم اور ضروری کتاب ہے قیمت مجلد چار روپے۔ غیر مجلد تین روپے

جدید امراض النساء کہ اس کتاب میں زنانہ صنوتناسل کی تشریح عورتوں کے عام امراض اور ان کا علاج ڈاکٹری اور جدید ترین ادویات و اصطلاحات اور ڈاکٹری رموز درج کئے گئے ہیں۔

قیمت مجلد ملیحہ غیر مجلد چار روپے

جدید عملی اشراب یہ ایک بالکل نئی کتاب ہے۔ اس میں انجکشن کی تعریف۔ انجکشن لگانے کی تربیت (متعدد تصاویر کے ذریعہ) اور تمام جدید ترین ادویات کا مفصل بیان اور عام امراض اور ان کا علاج بذریعہ انجکشن درج کیا گیا ہے۔ اس سے بہتر اُردو میں ابھی تک کوئی کتاب نہیں شائع ہوئی۔ قیمت مجلد ۵ھ، مجلد پانچ روپے۔ ۵ھ

پاکٹ انجکشن تھیراپی

ملنے کا پتہ

کامیاب انسٹی ٹیوٹ آف میڈیسن میرٹھ شہر

خیال اپنا اپنا

ماہنامہ "معمار" لکھنؤ

ادارہ :- آغا جلال محشر، عبدالودود صدیقی
سالانہ :- زرِ تعاون پانچ روپے - فی پرچہ آٹھ آنے

یہ ماہنامہ حال ہی میں لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اب تک دو شمارے ہم تک پہونچے ہیں خصوصیت اس کی یہ ہے کہ تازہ نگارشات پیش کرنے کے بجائے ہند وستان اور پاکستان کے معیاری رسائل سے انتخاب پیش کرتا ہے۔

اُردو ڈائجسٹ ماہناموں اور دوماہی رسالوں کا اجراء اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ——— SELECTED STUDY کا رجحان نسبتاً بڑھ رہا ہے۔

"معمار" کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے انتخاب میں ہر ایک ادبی نقطۂ نظر کی نمایندگی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ خصوصیت بالکل مناسب ہے۔ بالخصوص اُن لوگوں کے لئے جن کی معلومات کا دائرہ صرف اپنی پسند کی چیزوں تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور باہر کی دنیا کا انہیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ کم سے کم ہمیں تو تعمیری ادب کے معاملے میں اس کا کافی تکلیف دہ تجربہ ہے کہ بہت سے لوگ اختلافِ خیال کی وجہ سے تعمیری ادب کو سمجھنے کی کوشش پر اپنے آپ کو آمادہ ہی نہیں کر پاتے۔ ایسے لوگوں کے لئے "معمار" مفید خدمت انجام دے سکتا ہے۔

اداریہ میں ایک ایسے خط کا اقتباس بھی درج ہے جس میں کسی تعمیر پسند ناظر نے اختلافِ رائے کا اظہار کیا اور معمار کے اجراء کی افادیت کو تسلیم نہیں کیا۔ اس پر فاضل مدیر کو ذرا غصہ آگیا ہے لیکن ہمارے خیال میں نہ تو کسی تعمیر پسند ناظر کو "معمار" کے اجراء پر چیں بہ جبیں ہونے کی ضرورت ہے۔ اور نہ فاضل مدیر ہی کو جھنجلاہٹ زیب دیتی ہے۔

معمار کا ٹائٹل انتہائی غیر فن کارانہ ہے۔ یہ رسالہ کو اس مقصد سے کوسوں دُور لے جاتا ہے جس کے لئے رسالہ نکالا گیا ہے معلوم ہوتا ہے۔ معمار ادبی رسالہ نہیں بلکہ معماروں اور مزدوروں کی کسی انجمن کا رسالہ ہے جس کا بیشتر حصہ انجمن کی رُوداد وں اور چندوں کی رقوم کی تفصیل پر مشتمل ہوگا۔

اس کے علاوہ ایک مستقل عنوان "خزینوں سے خزانوں تک" بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ جہاں تک ہمیں علم ہے خزینہ اور خزانہ مختلف اللفظ و متحد المعنی کی تعریف میں آتے ہیں۔ اِس لئے یہاں ان کا اس طرح استعمال کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟ اِن چند باتوں سے قطع نظر ترتیب، انتخاب، کتابت، طباعت وغیرہ سب اچھی ہے۔ (ن - ا)

"درست اُردو"

مؤلف :- پروفیسر عاصی ضیائی - ایم - اے -
قیمت :- عہ ——— ضخامت ؟ صفحات
ملنے کا پتہ :- مکتبہ فروغ اُردو بازار کھٹیکان سیالکوٹ۔

یہ کتاب جس مقصد کیلئے لکھی گئی ہے کم سے کم آج کے زمانے میں تو وہ بہت ہی زیادہ توجہ کا محتاج ہے۔ اُردو میں یُوں تو دوسری زبانوں کے اثرات قبول کرنے کی صلاحیت پہلے ہی سے موجود ہے لیکن اثرات کی قبولیت بھی کچھ قواعد کی پابند ضرور رہی ہے اور اساتذہ نے الفاظ اور جملوں کی تراکیب کی موزونیت کو مجروح ہونے سے بچائے رکھا ہے۔ اب وہ لوگ ہی کم ہوتے جاتے ہیں۔ اور حال یہ ہے کہ اچھے اچھے نئے لکھنے والے بھی جملوں کی تراکیب اور بعض الفاظ کے استعمال میں ایسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں جن سے زبان کا حُسن ختم ہو جاتا ہے۔

عاصی صاحب میں زبان کی صحت کا خاص ذوق معلوم ہوتا ہے۔ "دُرست اُردو" میں اگرچہ انہوں نے زیادہ تر اہلِ پنجاب کی غلطیوں کو پیشِ نظر رکھا ہے لیکن اس کی افادیت سب کے لئے عام ہے۔ خود تبصرہ نگار کو اس کتاب کے مطالعہ سے کئی مفید باتیں معلوم ہوئیں ———

معیار کی
ایک خصوصی پیشکش کا اعلان
جنوری ۱۹۵۴ء میں

تنقید نمبر ——— شائع کیا جا رہا ہے

جس میں فن تنقید پر فنی، تاریخی، نظری حیثیتوں سے تازہ ترین مواد پیش کیا جا رہا ہے

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں

(۱) چونکہ وہ نمبر کافی ضخیم ہوگا اسلئے محدود تعداد میں ضرورت کے مطابق طبع کرایا جائے گا۔ اگر زیادہ کاپیاں مطلوب ہوں تو پہلے ہی مطلع کیا جائے

(۲) یہ نمبر رجسٹرڈ پوسٹ سے بھیجا جائے گا۔ قیمت پیشگی ادا کرنی ہوگی۔ (جس کا اعلان بعد میں کیا جائے گا) وی۔ پی صرف اس صورت میں کیا جائے گا جب پچھلے حسابات بالکل صاف ہوں اور چوتھائی رقم پیشگی روانہ کردی جائے۔ رجسٹری کا خرچہ خریداروں اور ایجنٹوں کو ادا کرنا ہوگا۔

(۳) خریداروں سے اس نمبر کی قیمت وصول نہیں کی جائے گی۔

(۴) چونکہ پاکستان میں کسٹم کی پابندیوں کی وجہ سے ایجنسیوں کے ذریعہ پرچہ نہیں جا سکے گا، اسلئے انفرادی خریداری قبول کرنی ہوگی۔ اس کی صورت یہ ہے کہ پانچ روپے احمد نور صاحب فیملی لائن جیکب آباد" کو ارسال کر کے ہمیں دفتر "معیار" میرٹھ کے پتہ پر اطلاعی خط لکھدیا جائے۔ رجسٹری سے منگانے کیلئے مزید چھ آنے ادا کرنے ہوں گے۔

انشاء اللہ یہ نمبر تعمیری ادب کی تاریخ میں ایک اضافہ کہا جا سکے گا ———

منیجر ماہنامہ "معیار" میرٹھ

علمی تحقیقی اور ادبی کتابیں

بیان اللسان	عربی اردو ڈکشنری	قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی	قیمت مجلد دس روپے
تدبر قرآن	مولانا امین احسن اصلاحی		ڈھائی روپے
خطبات	مولانا ابو الاعلیٰ مودودی		سوا دو روپے
پردہ	" " "		تین روپے آٹھ آنہ
حقیقت نفاق	مولانا صدر الدین اصلاحی		ایکروپیہ آٹھ آنے
اساس دین کی تعمیر	" "		دو روپیہ آٹھ آنہ
مسلمانان ہند کا لائحہ عمل	مولانا ابو الیث اصلاحی		تین روپیہ آٹھ آنہ
کلام عربی حصہ اول	قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی		ایکروپیہ
کلام عربی حصہ دوم	" " "		ایکروپیہ چار آنہ
تجدید تصوف وسلوک	مولانا عبد الباری		پانچ روپے
حقوق الزوجین	مولانا ابو الاعلیٰ مودودی		ایکروپیہ آٹھ آنہ
اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں	سید اصغر علی عابدی		تین روپے
اشتراکیت اور اسلام	مظہر الدین صدیقی		چار روپے آٹھ آنہ
سود	مولانا ابو الاعلیٰ مودودی		دو روپے بارہ آنہ
نقش حیات	مولانا حسین احمد مدنی		
ابھرتی کرنیں	(افسانے)	مرتبہ:- نجم الاسلام	دو روپے آٹھ آنے
عالمی امن	(نظمیں)	ادارہ معیار	آٹھ آنے
شوہر کا روگ	(ناول)	نسیم انہونوی	ایکروپیہ چار آنہ
شگفتہ	(ناول)	"	تین روپے
کوثر نسیم	(مجموعہ کلام)	الم مظفر نگری	چار روپے
صحیفہ ندرت	(مجموعہ کلام)	ندرت میرٹھی	چار روپے آٹھ آنہ
لوح وقلم	(")	ندرت میرٹھی	پانچ روپے
مکمل فائنل معیار سنہ ۱۹۵۱ء	(مجلد)		تین روپے چار آنے
سنہ ۱۹۵۲ء	(مجلد)		تین روپے چار آنے

ان کتابوں کے علاوہ دیگر علمی وادبی کتابیں اور دینی کتب، قرآن شریف اور سیپارے وغیرہ بھی مل سکتے ہیں،

مکتبہ "علم وادب" شاہ پیر گیٹ میرٹھ (یو، پی)

دواخانہ طبیہ کالج اعتماد و گارنٹی کا نشان مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

دماغین

دماغی محنت کرنے والوں مثلاً وکلا، پروفیسران خصوصاً طلبا کیلئے بہترین تحفہ ہے



فواکہین

تازہ پھلوں کا رس اور قیمتی اجزاء کا بیش بہا مرکب ہے

دماغی انحطاط کمزوری دردسر اور بیخوابی کیلئے مفید ہے۔ ایک پونڈ کا بازاری قیمت روپے ہائی بلڈ پریشر اختلاج قلب اور عدہ کی جملہ تکالیف کیلئے اکسیر ہے ۱۲ تولہ کی شیشی صرف روپے

دواخانہ کی کل آمدنی غریب مریضوں اور مستحق طلباء پر صرف ہوتی ہے

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

چند ایجنسیوں _____ کے پتے

(۱) کانپور چمن گنج (۲) بنارس۔ وال منڈی (۳) بھوپال جمراتی بازار (۴) فیروزآباد فیروز بک اسٹور (۵) غازی پور۔ ٹاؤن ہال۔ (۶) شاہجہانپور گنج مسیح الہند دواخانہ (۷) ٹانڈہ فیض آباد چھولی بازار (۸) مئو اعظم گڑھ حافظ محمد مجتبےٰ (۹) ایچ۔ چوک جمال مہراٹل (۱۰) بستی گانڈھ نگر (۱۱) شاہجہانپور محمد علی مارکیٹ۔ (۱۲) جکسہ۔ صدیقی دواخانہ (۱۳) علیگڑھ پھپھالہ۔ (۱۴) علیگڑھ مسلم یونیورسٹی۔ ایس۔ اے۔ اسٹور (۱۵) سیونی۔ مدھیہ پردیش۔ ڈاکٹر حکیم عبدالمغنی صاحب۔ (۱۶) سرپا گنج مظفرپور۔ بہار۔ حکیم محمد سمیع صاحب توحیدی شفاخانہ۔ (۱۷) الہ آباد۔ نہری منڈی۔ کامیاب دواخانہ۔ (۱۸) کاشی۔ ناگپور۔ گجری بازار اقبال اسٹور (۱۹) اٹاوہ مشہور یونانی دواخانہ (۲۰) لکھنؤ۔ چوراہہ عیسیٰ گنج ہندستان میڈیکل اسٹور۔ (۲۱) قیصر گنج بہرائچ حکیم ابوالبرکات (۲۳) گونڈہ۔ گنج شمشاد حسین

ہر شہر اور ہر قصبہ میں دیانت دار ایجنٹوں اور اسٹاکسٹوں کی ضرورت ہے

معیار کے منتخب افسانوں اور خاکوں کا مجموعہ

اُبھرتی کرنیں

مرتبہ :۔ نجم الاسلام _____ قیمت :۔ دو روپے آٹھ آنے

موجودہ افسانہ جس راہ پر چل رہا ہے وہ کھلی ہوئی جنسیت پرستی اور مادہ پرستی کی راہ ہے۔ تعمیر پسند اسلامی افسانہ نگاروں نے اس تخریب کی راہ سے ہٹ کر افسانہ کو پاکیزہ صحت مند اور تعمیری اندازِ فکر سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے

افسانہ میں ان جدید رجحانات کا مطالعہ کرنے کیلئے اُبھرتی کرنیں کا مطالعہ فرمایئے۔ مخرب اخلاق افسانوں کے مجموعوں کے مقابلہ میں اچھے افسانوں کا یہ انتخاب ایسا ہے جو گھروں میں بے تامل رکھا جا سکتا ہے اور ذہنی تعمیر کی صلاحیت رکھتا ہے اس کے علاوہ تعمیر پسند تنقید نگاروں کو بھی اس مجموعہ سے تعمیری افسانہ کو سمجھنے میں مدد ملے گی

کتاب مجلد ہے۔ گرد پوش۔ نہایت دیدہ زیب۔ کاغذ عمدہ۔ طباعت صاف۔ سوا سو صفحات _____ قیمت دو روپے آٹھ آنے (۲/۸)

ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ "معیار" میرٹھ (یوپی)

ہندوستان میں تعمیر پسند اردو مطبوعات کے اہم مرکز

مکتبۂ "معیار" کی ایک نئی پیش کش

عالمی امن

امن کے موضوع پر نظموں کا مجموعہ

مرتبہ :- ادارہ معیار ——— قیمت :- آٹھ آنے

امن کے موضوع پر اردو ادب میں پچھلے چند سالوں سے بہت کچھ لکھا جا رہا ہے
مگر افسوس ہے کہ اس کا مقصد امن کی بینی نہیں بلکہ اپنے اوپر سے نظریاتی طاقتوں کے

حمائتی ظلم کا داغ دھونا چاہتے تھے

تعمیر پسند فن کاروں نے تخریب پسندوں کے اس فریب کو بھانپ لیا۔ اور خالص تعمیری
نقطۂ نظر سے تنقید کر کے اصل مرض پر انگلی رکھدی

عالمی امن میں ان فن کاروں کی بہترین نگارشات شامل ہیں

مکتبۂ "معیار" میرٹھ

مشتہرین تجارتی اداروں کیلئے

معیار کے ضخیم **تنقید نمبر**

سے فائدہ اٹھانے کا

زرّیں موقعہ

معیار کے تنقید نمبر میں مشتہرین اشتہار دے کر اپنی تجارت کو خاطر خواہ کامیاب بنا سکتے ہیں

اشتہارات کا اُجرت نامہ طلب فرمائیں

منیجر ماہنامہ "معیار" میرٹھ

اِسٹینڈرڈ

سیزرس — اور — اُسترے

عُمدگی اور پائداری کی اعلیٰ مثال پیش کرتے ہیں جس پر میرٹھ کی اِس صنعت کو ناز ہے، قینچیوں اور اُسترں کی تجارت کرکے بھاری منافع حاصل کیجئے

ایجنسی کا شرائط نامہ خط لکھکر منگائیے

دی اسٹینڈرڈ سیزرس کمپنی میرٹھ (انڈیا)

پروپرائٹر و پبلشر:- محمد احمد ہاشمی　(مطبوعہ کمال پرنٹنگ پریس دہلی)　مقام اشاعت:- خندق اسٹریٹ میرٹھ

صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

معیار میرٹھ

دسمبر ۱۹۵۳ء

جلد ۳، شمارہ ۱۱

مدیر:- نجم الاسلام

جملہ خط و کتابت، ترسیلِ زر اور بادلۂ جرائد کیلئے:-

دارالاشاعت ماہنامہ معیار۔ خندق اسٹریٹ میرٹھ (یو، پی)

زرِ تعاون

سالانہ پانچ روپے ——— مع سالنامہ

قیمت فی پرچہ ——— آٹھ آنے

سالنامہ کی قیمت ——— ڈیڑھ روپیہ

ترسیلِ زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب

فیملی لائن۔ جیکب آباد

معیار کا سالنامہ

تنقید نمبر

جنوری ۱۹۵۴ء کے آخری ہفتہ میں شائع ہو رہا ہے

ترتیب

نقشِ اوّل ——— نجم الاسلام

تنقیدی مقالہ

تصوّف کا نظریۂ فنا و عدم — نثار احمد فاروقی — ۵

نظمیں

اے زہرہ جبیں ناز — ابو المجاہد زاہد — ۹
میرا گیت — ابو الاسرار رمزی — ۱۱
اُٹھو ساتھیو — احمد پرویز — ۱۳
میرے ارادے — بشیر اشرف مائیگانوی — ۱۴

مضامین

اپنی اپنی عینک — متین طارق — ۱۵
روپیہ اور ہماری سوسائٹی — سلطان احمد قریشی (دہلی) — ۱۹
آپ کس قسم کے آدمی ہیں؟ — عبد الوہاب سلیم نیلوری — ۲۱
عنوان — چہ ضرور؟ — ابنِ ضیاء ایم۔ اے — ۲۴

غزلیں

حفیظ میرٹھی — ۲۶
عبد المجید حیرت ۔ مائل خیر آبادی — ۲۷
شبنم سبحانی ۔ خورشید حنفیتانی — ۲۸
شبنم رومانی ۔ انور صدیقی — ۲۹
مستفیض عنصر ۔ عنوان چشتی — ۳۰
منظر اعظمی ۔ محمد نیاز نیاز — ۳۱

افسانے اور خاکے وغیرہ

ایک عظیم خاتون گذر گئی — عاصی ضیائی رامپوری — ۳۳
داغ داغ اُجالے — ابنِ فرید بی۔ اے — ۳۸
دو راہیں — اقبال احمد انصاری — ۴۴
رہبر — مقبت الحسن رضوی — ۴۷
کون؟ — امین الدین گورکھپوری — ۵۱
انتظار — " — ۵۲
شاعر تمہارے گیت — طاہرہ سعید شمع — ۵۳

خیال اپنا اپنا

نور — ن۔ ع — ۵۴
ساحل — ن۔ ع — ۵۴

نقشِ اوّل

اِس اشاعت میں ابنِ فرید صاحب کا ایک افسانہ "داغ داغ اجالے" پیش کیا جا رہا ہے۔ آپ اسے بغور مطالعہ فرمائیں اور ہمیں اس کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ ہونے کا موقع دیں۔

یہ افسانہ پچھلے دنوں ادارہ ادب اسلامی میرٹھ کی ایک نشست میں پیش کیا گیا۔ صاحبِ افسانہ خود موجود نہیں تھے۔ اِس لئے مجھی کو اِسے پیش کرنا پڑا۔ اور اس پر جو کچھ اظہارِ خیال کیا گیا اور سننے والوں کو جس طرح کی تشنگی اس میں محسوس ہوئی اس کی وضاحت کا فرض بھی مجھی پر عائد ہوا۔

افسانہ نگار نے اس تخلیق میں ایک ایسی عیسائی لڑکی کے کردار کی عکاسی ہے جس نے گھریلو زندگی پر فرنچ کلب اور بال روم کی زندگی کو ترجیح دی لیکن جس آسودگی کی خاطر اس نے ایسا کیا تھا وہ نہیں ملی اور برابر ایک خلش اسے ستاتی رہی۔ پھر اس کی ازدواجی زندگی بھی شروع ہو گئی۔ اور خانگی ذمہ داریوں اور دفتر اور بال روم کی دلچسپیوں میں تصادم ہونے لگا۔ روز بروز اس کی خلش بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ بیمار پڑ گئی۔ اس کی ماں تیمارداری کے لئے یا اس کے پاس آ گئی۔ صحت بحال ہونے پر یہ عیسائی لڑکی اپنے میکے چلی جاتی ہے۔ یہاں اس کو اپنے بچپن کا زمانہ یاد آ جاتا ہے کہ کس طرح اس کی ماں اس کی ذات سے دلچسپی لیتی تھی۔ بالخصوص کتھیڈرل کے گھڑیال پر اس کی نظر پڑتے ہی اس کے ذہن میں وہ تمام ماحول تازہ ہو جاتا ہے۔ جہاں اس نے اپنی عمر کا ایک حصّہ گذارا تھا۔

تب اچانک وہ گھریلو زندگی کو اپنانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔

اِس افسانہ کے فنی تقاضوں کو پورا کرنے میں افسانہ نگار نے کہاں تک کامیابی حاصل کی؟ اس پر گفتگو میں کئی لوگوں نے حصّہ لیا۔

اوّل اوّل تو وہی پرانی قسم کی تنقید ہوتی رہی۔ اس کی زبان درست نہیں؟ فلاں ترکیب نادرست ہے۔ فلاں لفظ کا استعمال بے محل ہے۔ اس لفظی تنقید سے فارغ ہوئے تو فنی محاسن کا تذکرہ آیا۔

آنند جی نے جن کا شمار ہندی کے بہت اچھے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے اور جنہوں نے اس نشست میں خود بھی نو بھارت ٹائمز کے ایک کُل ہند انعامی مقابلہ میں اوّل آئی ہوئی اپنی ایک کہانی پیش کی۔ کہانی کے بارے میں کہا کہ کہانی زندگی کے کسی ایک واقعہ کو پیش کیا کرتی ہے نہ کہ پوری زندگی گویا اس کے بہت بڑے حصّہ کو۔ اس افسانہ میں بچپن سے جوانی تک کے بہت سے واقعات سمیٹ دیئے گئے ہیں۔ جس سے تاثر میں شدّت پیدا ہونے نہیں پاتی۔

یہاں ضرورت تھی کہ ناول اور افسانہ کے فرق کو واضح کر دیا جاتا۔ یہ کام آنند جی نے کسی حد تک کیا۔ آگے چل کر گفتگو اس بات پر آ گئی کہ افسانہ نگار نے افسانہ کی تخلیق میں کیا باتیں پیش نظر رکھی ہے اور کس طرح افسانہ لکھا ہے۔ یہاں آ کر بات اُلجھ گئی۔ پھر کہا گیا کہ کتھیڈرل کا علامتی نشان اور اسی طرح کی دوسری وہ چیزیں جو ذہنی انقلاب کا سبب بنیں اور جنہوں نے افسانہ کے مرکزی کردار کو متاثر کیا۔ اتنی واضح اور اثر انگیز نہیں محسوس ہوتیں جتنا فی الواقع انہیں ہونا چاہئے۔

میرے خیال میں ان آخری دو باتوں کی وضاحت کا موقع اب بھی نکل سکتا ہے۔ اس افسانہ کے انداز تخلیق پر غور کرنے سے پہلے ہمیں مختصر افسانوں کی عام ٹیکنک پر تحلیلی نظر ڈالنی ہوگی۔

اسٹیونسن نے ایک موقعہ پر مختصر افسانوں کی ٹکنیک پر روشنی ڈالتے ہوئے تخلیقی عمل کے تین طریقوں کا ذکر کیا ہے۔

اوّل یہ کہ پلاٹ پہلے سوچ لیا جائے اور اس کی مناسبت سے افسانے کے جملہ لوازمات چُن لئے جائیں اور موزوں کردار ڈھال لئے جائیں۔

دوسرا یہ کہ افسانہ نگار نے کوئی خاص ماحول یا کوئی خاص فضا ذہن میں رکھکر حسبِ حال واقعات اور کردار فراہم کرے۔

تیسرا یہ کہ ذہن میں کوئی مخصوص کردار ہو اور اس کی سیرت کے کسی گوشہ کی عکاسی مقصود ہو تو ایسی صورت میں واقعات، پلاٹ کی ترتیب، ماحول

اور فضا سب کا انتخاب اس کردار کی مناسبت سے عمل میں لایا جائے۔

اِس تجزیہ سے کسے اِنکار ہو سکتا ہے؟ تخلیقی عمل کی ان تینوں صورتوں میں سے "داغ داغ اجالے" کس صورت میں تخلیق ہوا؟ اس کا صحیح اندازہ ہر وہ شخص بآسانی لگا سکتا ہے جو اِن دو باتوں کا خیال رکھے۔

(۱) افسانہ نگار کا رجحانِ طبع کیا ہے؟ اس کے صحیح جائزہ کے لئے ہماری نظر سے افسانہ نگار کے دوسرے بیشتر افسانوں کا گذرنا ضروری ہے۔ آیا افسانہ نگار پلاٹ پر زور دیتا ہے یا نہیں۔ اس کے یہاں جذبات نگاری زیادہ ہے اور اسلوب بیانیہ ہے یا واقعات کی ترتیب سے مختلف کرداروں کے اہم گوشے اجاگر کرتا ہے۔ وہ ابہام پسند ہے یا نہیں ہے۔ اِن سب باتوں سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ماحول کی عکاسی پر زیادہ زور دیتا ہے۔ پلاٹ عمدہ سوچتا ہے یا موزوں کردار انتخاب کرنے کا ملکہ رکھتا ہے تمام اجزاء میں توازن رکھ سکتا ہے۔ ——— یا نہیں۔

(۲) اس نے افسانہ میں کس چیز کا خاص طور سے اہتمام کرنے کی کوشش کی ہے ہر اچھے افسانہ میں افسانے کے تمام اجزاء میں توازن کا پایا جانا ضروری ہے۔ اگر کہیں توازن نہیں تو کچھ لیجئے ہمیں افسانہ میں جھول رہ گیا۔

میرا خیال ہے اس تشریح کے بعد مجھے "داغ داغ اجالے" پر کسی تشریحی فقرہ کا اضافہ کرنے کے بجائے بات کو صرف تحلیل و تجزیہ اور SPECULATION تک ہی رکھنا چاہئے۔ حکم و تشریح کا حصہ آپ خود بھی پورا کر سکتے ہیں۔

اس تمام بحث کے بعد اب اگر اُوپر کی باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے عمومی طور پر کچھ عرض کرو یا جائے تو افادیت سے خالی نہ ہوگا۔

ماحول کی عکاسی مقصود ہو یا واقعات پیشِ نظر ہوں، کردار سے پلاٹ کی طرف ذہن منتقل ہو یا پلاٹ سے کردار کی طرف ——— ایک بات کا التزام ہمارے افسانہ نگاروں کے لئے بہت ہی ضروری ہے۔ یعنی افسانہ کے مواد کو فراہم کرتے وقت ذہنی صحت کا مظاہرہ اور چابکدستی ہو سکتا ہے ہمارا موضوع بہت بلند ہو افسانہ کی فضا بڑی دلکش اور خیال انگیز ہو۔ واقعات کی ترتیب میں چابکدستی سے کام لیا گیا ہو۔ مگر یہ چابکدستی سراہے جانے کے قابل صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ افسانہ کے مواد سے افسانہ کے مقصد کو مدد مل سکے اور ذہنی صحت کا اعلیٰ معیار قائم ہو سکے۔

علامات کا استعمال فنی چابکدستی چاہتا ہے لیکن اگر یہ بات حاصل نہ ہوئی تو علامات افسانہ کو مبہم بھی بنا سکتی ہیں اور افسانہ کے مواد کو غلط راہ بھی دے سکتی ہیں۔ کہی تو گئی ہو کھیت کی بات اور سُنی لوگوں نے کھلیان کی تو آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ ذہنی صحت مندی کی نشوونما کا عظیم مقصد اس افسانہ سے کیونکر پورا ہو سکتا ہے۔

"داغ داغ اُجالے" آپ کی نظر میں کیسا بھی کیوں نہ ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابنِ فرید صاحب نے چند افسانے بہت کامیاب پیش کئے ہیں! اور اب ان سے افسانوں کے مجموعہ کا اعلان کیا جانا چاہئے۔

کچھ سال نامہ کے بارے میں

نومبر میں اعلان کیا ہی جا چکا ہے کہ جنوری ۵۴ء کا شمارہ ایک سال نامہ کی صورت میں پیش کیا جائے گا۔ یعنی تنقید نمبر۔ اس میں تنقید پر تازہ ترین مواد پیش کر کے تعمیر پسند نقطہ نظر کی اتنی وضاحت کر دی جائے گی کہ پھر کسی کو تعمیر پسند ادب اور اس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں دشواری نہیں رہے گی۔ یہ تو کبھی بھی کسی تخلیقی کام کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنے موضوع پر حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہے لیکن اگر کوئی تخلیق وضاحت کا حق بڑی حد تک ادا کر دیتی ہے تو یہ بھی کچھ کم بات نہیں!

اس نمبر کی تیاری میں جو لکھنے والے بھی حصہ لے رہے ہیں اور پوری توجہ سے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ ذاتی طور سے اور ادارہ کے سب رفیقوں کی طرف سے ہم ان حضرات کے ہمیشہ سپاس گزار رہیں۔

اُمید ہے کہ بہت سی مالی اور انتظامی دشواریوں کے باوجود جنوری کے آخر تک "تنقید نمبر" نکالنے میں ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ اِنشاء اللہ۔

نثار احمد فاروقی

تصوّف کا نظریۂ فنا و عدم

فنا یا عدم کو منزل وصول الی اللہ کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ ہم تصوّف کے تمام تر نظریات سے یکسر اخراف و انکار کریں لیکن "فنا" کی اصطلاح کے بارے میں ایک وضاحت کر دینا ضروری ہے۔

اختلاف محض طریق کار۔ اور اندازِ تاویل سے ہے۔ فنا کا ایک مقصد تو وہ ہے جو اسلام کے صحت مند نظریات سے مطابق میل نہیں کھاتا۔ یعنی دنیا سے کنارہ کش ہو کر جسم کو آزار پہنچانا۔ اور دوسرا خیال ہے کہ "غیر اللہ" کے خیال سے دل کو پاک صاف رکھنا۔ اس نظریہ کی تعریف یوں بھی کی جا سکتی تھی کہ دنیاوی زندگی کے تمام معاملات کاروبار۔ لین دین۔ رہن سہن۔ شادی و غم، خور و خواب وغیرہ میں رضائے خداوندی کا جویا و متلاشی رہنا اپنی ہر حرکت کو اس طرح ناپنا تولنا کہ اس میں اطاعت و عبودیت سے سرمو اخراف کا شائبہ تک نہ پایا جائے لیکن یہ صرف ہمارا استنباط ہے۔ ورنہ یہ اصطلاح بہت بلیغ ہے۔ اور اس کا مفہوم و مقصد ہمارے متعینہ مفہوم سے بالکل تباین ہے۔

غالب کا ایک مشہور شعر ہے ؎

میں عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

اکثر شارحین اس کو مہمل اور بے معنی کہہ کر خاموش ہو گئے ہیں۔ حضرت اثر لکھنوی نے اپنی کتاب "مرقعۂ غالب" میں اس شعر کے معنی یہ لکھے ہیں۔

"عدم ایک اضافی کلمہ ہے۔ وجود کا مقابل یا نفیٔ وجود یعنی جو چیز پردۂ عدم میں ہے اس کے وجود میں آنے کا امکان ہے۔ اسی طرح جو چیز موجود ہے اس کا معدوم ہو جانا ممکن ہے حاصل یہ ہوا کہ ہستی و عدم دونوں اعتباری ہیں۔ عدم سے پرے (باہر) ہو جانے کے بعد اس تقابل تضاد و تعین ہستی و عدم سے نجات ہو گئی۔ (اس اضافیت و نسبت سے نسبت) کا خاتمہ ہو گیا۔ اب نہ مجھ پر عدم کا حکم لگایا جا سکتا ہے نہ وجود کا۔ ہر قید و بند سے آزاد ہو گیا۔

عنقا ایک فرضی طائر ہے جو معدوم محض ہے مگر بربنائے تصورِ ذہنی موجود سمجھا جاتا ہے۔ بقول میر ؎

آوازہ ہی جہاں میں ہمارا سُنا کرو
عنقا کی طرح زیست ہے اپنی بنام یاں

غالب کہتے ہیں کہ مجھے فنائے کامل "حاصل" ہو گئی ہے۔ ایسی فنا جو ماورائے عدم ہے جس کو ہستی سے کوئی علاقہ نہیں۔ جس میں ہستی کی طرف مراجعت کا کوئی امکان نہیں۔ جب تک عدم کی اضافی منزل میں تھا۔ (ایسے عدم میں جس میں ہستی سے یکسر روپوش قبول کرنے کی صلاحیت تھی) اس وقت بھی بفیضِ عشق میری آہ میں اتنی تاثیر تھی کہ بارہا بالِ عنقا کو جلا دیا۔ اس کو ہستی کی طرف پرواز کرنے سے محروم کر دیا۔ اب اس منزل میں ہوں، جو ہستی و عدم کے اطلاق سے بری ہے۔ یعنی فنا فی اللہ ہو گیا۔ یہ مرتبہ جب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ ذاتِ مطلق سے دوری کا احساس انتہائی شدید ہو کہ اس کے ماتحت منزلِ عدم میں بھی آہ کی جائے تو ہستی کی طرف رجعت کے تصور کو یک لخت فنا کر دے۔ اسی کو بالِ عنقا جلنے سے استعارہ کیا ہے۔ فنا ماورائے فنا یا فنا فی الذات۔ جزو کا کل سے قطرہ کا دریا سے واصل ہو جانا یہی تصوّف ہے اور یہی شاعرانہ تفلسف ہے۔

(مرقعۂ غالب۔ ص ۲۱۰)

اس شعر کے بارے میں حضرت اثر لکھنوی سے میری خط و کتابت ہوئی۔ میرے اعتراضات۔ نقائص و مطالب شعری پر یہ تھے۔

(۱) اگر اس شعر کے مجازی معنی لئے جائیں۔ یعنی یہ کہ میں چونکہ اب محبت میں بالکل ہی فنا ہو گیا ہوں۔ اور عدم کے اطلاق اور تعریف کے دائرہ میں بھی نہیں آتا، اس لئے میری آہوں کے اثر کا ہدف بھی کوئی نہیں۔ جب تک عدم محض (موجودہ منزل) سے ماتحت عدم (اضافی) کی منزل میں بھی تھا تو میری آہ میں اتنی تاثیر تھی کہ عنقا کے بال و پر جل جایا کرتے تھے۔ چونکہ اس اضافی حالت

میں میرا ہم منزل ایک عنقا ہی تھا اس لئے آہوں کا اثر بھی لا ابالی اسی پر ہوتا تھا۔ اور جب اس منزل سے بھی ماورا آگیا تو اب اثر کہاں ؟"

(۲) متصوفانہ مطلب اخذ کیا جائے تو نہ صرف شعر میں بعض ترکیب۔ استعارے، اور الفاظ کے حشو کا احتمال ہے بلکہ شعر بدنما بھی معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً "ورنہ غافل یار ہا" کا ٹکڑا محض مہمل رہ جاتا ہے۔ جو اپنا کوئی مفہوم (نثر میں) نہیں ادا کرتا۔

(۳) "فنا" کی تعریف اگر کی جائے تو وہ یہ ہوگی کہ "فنا" تدریجی اول ہے معرفت کی راہ میں۔ اور تدریجی دوم (قدم بہ معنی منزل) تجلّیٔ ذات ہے۔ چنانچہ اکابر صوفیا کی کتابوں میں اس کی تصریح بھی ملتی ہے۔

حضرت اثر لکھنوی نے "فنا" کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے مکتوبات میں علامہ علی الہجویری علیہ الرحمتہ کی کتاب "کشف المحجوب" کے چند اقتباسات نقل فرمائے۔ اور وہ یہ ہیں۔

"میری کل ہوا و ہوس کے گم ہو جانے سے میری فنا کی ہوس بھی فنا ہو گئی۔ (یہ محبّت اور حرص کبھی کبھی کمر بشارت باندھ کر میرے دل سے جاتی رہی) اب جملہ امور میں میری دلی خواہش صرف تیری محبّت رہ گئی ہے۔ یعنی جب آدمی اپنے اوصافِ بشریت سے فنا ہو جاتا ہے۔ (شہوات و لذات کو ترک کر دیتا ہے) تو وہ پھر بقا کے معنی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ جب بندہ اپنی صفتوں کے وجود کی حالت میں صفتوں کی آفتوں سے خالی ہو جاتا ہے تو وہ اپنی مراد کی فنا کے ساتھ اپنے مقصود کی بقا میں باقی ہو جاتا ہے۔ قرب و بُعد کچھ نہیں رہتا۔"

ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"کشف المحجوب تصوّف پر ایسی مستند اور معیاری کتاب ہے کہ اکثر مغربی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے (علامہ علی الہجویری نے) یونانیوں (سوفسطائیوں) کے فلسفۂ الٰہیات کی سخت مذمّت کی ہے اور مردود قرار دیا ہے کشف المحجوب میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو شعارِ اسلام کے خلاف ہو۔ کتاب میں فنا و بقا پر سیر حاصل بحث ہے۔ چند اقتباسات حاضر ہیں۔

فنا اور بقا کے علم کا تا عدہ اخلاص اور وحدانیت پر ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ کثیر و زندقہ ہے جو فنا کو خدا کی ذات میں فنا ہو جانا یا بقا کو خدا کی ذات میں مٹی ہو کر باقی رہنا جانتا ہے وہ غلطی پر ہے۔ . . . . . .

حادث قدیم، اور قدیم حادث نہیں ہو سکتا۔ ہماری بقا بھی ہماری صفت ہے اور ہماری فنا بھی ہماری صفت ہے۔ فنا سے مراد غیر کے ذکر کی فنا ہے اور بقا سے مراد خدا کے ذکر کی بقا ہے۔ جو اپنی مراد سے فانی ہے وہ خدا کی مراد سے باقی ہے۔ جب سرتاج انبیاء ہمارے رسول کریم صلعم کو منزل تمکین و جمال (معراج) میں بھی قاب قوسین او ادنیٰ کا احساس رہا تو کسی اور کا ذکر کیا۔"

ذات مطلق سے کامل اتحاد۔ (موکش یا نروان) ہندو فلسفہ ہے تصوّف سے (اسلامی تصوّف سے) اُسے کوئی علاقہ نہیں۔ وہ نظریۂ شہود ہے جس نے تصوّف میں تفرقہ ڈالا۔ اور جس کے بانی حضرت شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی رح) ہیں جن کا انتقال ۱۰۳۴ ہجری میں ہوا۔ حضرت علامہ ہجویری کا وصال ۴۵۶ یا ۴۶۴ ہجری میں ہوا۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ تصوّف کے دلق پارسائی میں رخنے پڑتے گئے یہ بحث طویل ہے اور خط میں تفصیل کی گنجائش نہیں۔

تصوّف میں مسئلہ وحدت الوجود کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے والے شیخ الاکبر حضرت محی الدین ابن العربی ہیں۔ یہ اندلس کے رہنے والے تھے ان کا مکّہ معظمہ کو ہجرت کرنے کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔

یہ غرناطہ کے ایک امیر کبیر کی لڑکی پر جس کا نام ناظم تھا عاشق ہو گئے۔ فریفتگی کا یہ عالم تھا کہ جوشِ سرور و مستی میں اُس کے حسن کی تعریف میں عشقیہ اشعار برسرِ کوچہ و بازار پڑھتے پھرتے تھے۔ لوگوں نے ملامت کی کہ ایک باعفت اور نامنکحنہ لڑکی کو بدنام کرتے ہو۔ انہوں نے فرمایا کہ عشق گناہ نہیں۔ اور عشق کے سوا مجھے اس لڑکی سے کوئی سروکار نہیں لوگ اُن کی جان کے درپے ہو گئے اور مجبوراً ترکِ وطن کرنا پڑا۔ مکہ معظمہ پہنچکر انہوں نے اپنی مشہور عالم کتابیں خصوصاً الحکم اور فتوحاتِ مکیّہ تصنیف کیں۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ڈانٹے کی ——— DIVINE COMEDY کے اکثر مقامات فتوحاتِ مکیّہ سے مستفاد ہیں۔"

میں نے فنا کے سلسلہ میں زیادہ استدلال حضرت خواجہ محمد معصوم کے مکتوبات سے ہی کیا ہے۔ خواجہ محمد معصوم علیہ الرحمتہ حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمتہ کے فرزند ثالث تھے۔ انہوں نے اپنے درج ذیل مکتوبات میں فنا کی مجمل یا مفصل تعریف کی ہے۔

(م = مکتوب ۔ ص = صفحہ)

م ۶ ص ۸ ۔ م ۱۲ ص ۱۹ ۔ م ۵۹ ص ۱۰۹ ۔ م ۷۸ ص ۱۲۷ ۔ م ۹۰ ص ۱۴۰ ۔
م ۹۲ ص ۱۶۳ ۔ م ۱۰۷ ص ۱۸۷ ۔ م ۱۲۷ ص ۲۰۱ ۔ م ۱۳۱ ص ۲۰۵ ۔

م ۱۵۰ ص ۲۲۲۔ م ۱۵۳ ص ۲۲۴۔ م ۱۵۶ ص ۲۲۸۔ م ۱۷۱ ص ۲۴۴۔
م ۱۷۰ ص ۲۴۷۔ م ۱۷۷ ص ۹۴۹۔ م ۱۸۵ ص ۲۷۱۔ م ۱۹۸ ص ۲۸۲۔
م ۲۰۳ ص ۲۸۵۔ م ۲۱۶ ص ۲۹۶۔ م ۲۳۲ ص ۳۲۲۔

چند مکتوبات کا مفہوم یا متن بھی پیش کرتا ہوں۔

مکتوب ۱۵۰ میں شیخ محمد شریف کابلی کو تحریر فرمایا ہے۔

"..... از ہستی موہوم بہ تمام منخلع گردیدہ بوجود موہوب متحقق بود و بدام نیستی صید ہستی نمایند۔ ظہور ہستی و توابع آں بے کمال نیستی میسر نیست۔ و تخلق بالاخلاق محبوب بے فنا از منتسبات ممکن۔ و نہ کمالات دیگر تو ق آں بسیار لیکن ہمہ مشروط بایں فنا اند۔

ہیچ کس را تا نہ گردد او فنا
نیست رہ در بارگاہِ کبریا
پس فنا قدم اول است در راہِ قدم"

یعنی یہ ہستی ایک واہمہ ہے، جسے نیستی کے دام میں گرفتار کر لینا چاہیئے۔ اور بقا بھی جب ہی ممکن ہے کہ ہستی موہوم کی فنا ہو۔ ذات و صفات بشریت کی فنا۔ باری تعالیٰ کی صفات اور ذات کا قیام ہے لیکن پہلی منزل یہ فنا ہے۔ اس کے بعد اللہ کے دربار میں رسائی کا راستہ کشادہ ہو جاتا ہے۔

مکتوب (۱۹۷) بنام آغا رشید میں فرماتے ہیں۔

"زوال علم ماعدا شرط تحقیق دریں راہ است۔ علم حصولی اشیا با شد یا علم حضوری کہ عبارت از نفس حاضر است تا سد حجت نقوش باطن از نقوش علمیہ اشیاء پاک و مصفا نشود ظہور انوار قدم صورت نہ بندد۔ و تا نفس حاضر بر پاست راہے باں حریم ندارد۔"

یعنی نفس کو جس کی صفات شہوت۔ غرور و تکبر۔ حسد۔ بغض وغیرہ ہیں مغلوب کر لیا جائے۔ اور غیر اللہ کے خیال کو ہرگز مخمور نہ ہونے دیا جائے۔ جب تک باطن خیال غیر سے بالکل صاف نہ ہوگا۔ اللہ کی ذات کی تجلیات منعکس نہ ہوں گی۔

اسی طرح میر کرک عطاء اللہ کو لکھتے ہیں۔ (مکتوب نمبر ۱۸۵)

"..... تا او پیدا است طالب او پیدا است و در طلب او بے قرار چوں او پدید آید۔ عاشق بے چارہ رخت ہستی از میان برگشدہ چہ ذات ممکن عدم است کہ بواسطہ انعکاس کمالات وجودی نمود بے بود پیدا کردہ است۔ و با ایں نمود تخیلی خود را کامل و خیر خیال نمودہ۔ و بنیاد دراز بریں بے بنیاد نہادہ۔ و چوں بر سابقہ کرم کمالات انعکاسی باصل عاید گردد۔ و امانات باہل امانات شود و عارف روبہ صحرائے عدم آرد و از ہستی موہوم منخلع گردد۔ ایں زماں بہ فنائے حقیقی مشرف شود۔"

آغا رشید کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ ذکر قلبی اس قدر کرے کہ وہ قلب کی صفت بن جائے۔ جس طرح سمع صفت سامعہ کی اور بصر صفت باصرہ کی۔۔۔ اور ذکر کے وقت غفلت ظاہر" حضور باطن میں سرایت نہ کرے جب حضوری کی یہ کیفیت غالب آجائے گی تو نفس حاضر درمیان سے اٹھ جائے گا۔ اور پھر خدا وند کریم جلوہ فرمائے گا۔

در اصل "فنا" نفس حاضر کی فنا ہے۔ ایک حدیث نبوی سے بھی اس کا استدلال ہوتا ہے کہ انسان کو نفس پر قابو پانا اور اسے مغلوب کرنا چاہیئے۔ ترجمہ یہ ہے کہ خداوند کریم نے مخلوقات کے تین قبیلے تخلیق فرمائے۔ انسان۔ حیوان اور ملائکہ اور دو متضاد صفات بھی پیدا کیں۔ عقل اور شہوت۔ ان دو صفات کی تقسیم ان تین طبقوں میں اس طرح فرمائی کہ ملائکہ کو صرف عقل میں سے حصہ دیا گیا۔ وہ گناہ کرنے پر قادر ہی نہیں۔ حیوانوں کو محض شہوت دی گئی وہ گناہ سے بچنا نہیں جانتے۔ اس لئے ان کے مواخذہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب رہا ابن آدم اسے عقل اور شہوت دونوں میں سے برحصہ مساوی بہرہ ور فرمایا اور حکم دیا کہ تم میں سے جس کی عقل اس کی شہوت مغلوب کرے گی وہ درجہ میں ملائکہ سے اعلیٰ و افضل ہے۔ اور جس کی شہوت نے اس کی عقل پر قابو پالیا وہ بہائم سے بھی گیا گذرا ہوگا۔

فلسفہ کی موشگافیوں میں سے اگر تصوف کے اس نظریہ کو یعنی فنا کو نکال کر دیکھا جائے تو درحقیقت یہ تزکیۂ باطن کا ایک بہترین اور تجربہ علاج ہو سکتا ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں کے مومنہ ایک خط میں حضرت خواجہ محمد معصوم علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ۔

"..... باید کہ باشند جل شانہ و از ماسوائے او معرض۔ و سعی نمایند کہ دوام حضوری و آگاہی مع اللہ سبحانہ پیدا شود بحدے کہ ماسوائے او ہرگز مخطور نہ بود۔ بہ نوعے کہ اگر بہ تکلف خواہند کہ یاد ماسوا نمایند بہ یاد نیاید۔

بعد ازاں ایں وصف حضور را میسر از خود نفی نماید
تا حضور مطلوب خود بخود میسر آید۔ و نفس عارف
درمیاں نماند این ست خلاصۂ سیر و سلوک "

میر شمس الدین علی خلخالی کو لکھا ہے۔

" . . . . مادام کہ بہ لوث عدم ملوث لیاقت قرب آنحضرت ندارد۔ بلکہ تارائحہ از عدم بہ حقیقت او آمیختہ است۔ ازیں دولت قلیل النصیب است "

اب غالب کے شعر کا مطلب اس پوری تفصیل کی روشنی میں یہ نکلے گا۔

" میں حضوریٔ باطن کی اس منزل میں آ گیا ہوں جہاں ذاتِ باری کی تجلیات کا قرب اور انعکاس محسوس کر رہا ہوں۔ اب وہاں کسی ہستی کا موہوم رشحہ ہستی کا وہم بھی کیا جا سکے یا جو فنا الوقت ہست نہیں لیکن اس کے وجود میں آنے کا امکان باقی ہے) کا میرے دل میں گذر بھی نہیں ہو سکتا۔ جب میں منزلِ عشق کی پہلی راہ (فنا) میں تھا تو عنقا کے بال و پر بھی سوخت کر دیئے تھے۔ یاد محبوب میں اس قدر محو ہو کر آیا ہوں کہ مجھ پر ہستی کے توہمات بھی باقی نہ رہتے تھے۔ اور اب تو عدم سے گذر کر ما و ما (یعنی تجلیٔ ذات کی حدود) میں آ گیا ہوں "

فنا کے بارے میں یہ نظریات ٹھیک خاکہ پیش کرتے ہیں لیکن فلسفہ کا شور اور آمیزش اس میں نہیں ہے۔

ذکر کی "فنا" وہ ہی ہو سکتی ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں خدا کی اطاعت کو مقدم کر لیا جائے اور کسی بھی منزل میں طاغوت و شیاطین کی پیروی یا ہم خیالی نہ ہو۔ اور یہ ہی بات مستنبط ہو سکتی ہے "یہ نوع کہ اگر بہ تکلف خواہند کہ یاد ہوا نمایند بہ یاد نیایند" سے ہندو فلسفہ سے فلاطینیت اور مندرجۂ بالا نظریات میں مبہم سا فرق و امتیاز سہی لیکن یہ بھی مقصد سے بہت دور کی بات ہو جاتی ہے۔

اسلام دین کے ہاتھ پاؤں شل کرنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ وہ ہر عمل درس حیات اور طریقۂ زندگی سکھانے کے لئے آیا تھا خدا کی عبودیت کا احساس دلانے کو پیدا ہوا تھا۔ اس میں ایک MOVEMENT ایک اجتہادی شان تھی۔ جو اس فلسفہ نے فنا کر دی۔

بالخصوص اسی "فنا" کی عملی تفسیر ترکِ دنیا اور مجاہدہ و جلا کشی تو قطعاً اسلامی شعار نہیں ہے۔ لا رہبانیۃ فی الاسلام کا مقصد یہی ہے کہ تمہیں خدا کو زندگی سے بیزار ہو کر نہ ڈھونڈو بلکہ اسی کشاکش اور حیات کے ہنگاموں میں اس کی تلاش کرو۔

تمہارے باہمی تعلقات۔ معاشی۔ معاشرتی۔ سیاسی۔ تہذیبی تمدنی۔ معاملات اللہ کی رسی میں بندھے ہوئے ہونے چاہئیں۔ اس کے سوا کسی کی بندگی یا اطاعت کا خیال تمہیں مغلوب و مرعوب نہ کرے۔

مقصد دراصل صرف نظریۂ فنا کی مختصر وضاحت کرنا تھا۔ لیکن جہاں اختلاف کی گنجائش تھی میں نے اسے بھی صاف کر دیا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ تصوف میں بہت سے نظریات ایسے ہیں جو فی الحقیقت اسلام نے تزکیہ و جلائے باطن کے لئے تعلیم فرمائے تھے۔ لیکن ان کا کوئی تعلق نکات و رموز اور موشگافیوں سے نہ تھا۔ جیسا کہ اس فنا کی تعریف سے آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

عموماً ایک حدیث "وحدت الوجود" کے نظریہ کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے کہ بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب تلاش کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے اعضا و جوارح بن جاتا ہوں۔ میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں۔ وہ مجھ سے دیکھتا ہے۔ میں اس کے کان بن جاتا ہوں۔ وہ مجھ سے سنتا ہے۔

یہ حدیث فی الحقیقت ایک مومن کی صحیح تعریف پیش کرتی ہے۔ جس کے پیشِ نظر قرآن و سنت کی اطاعت و تقلید و فرماں پزیری کا خیال ہو۔

ضمناً ایک بات عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ "فنا" مطلق حاصل نہیں ہوتی۔ اکثر صوفیا رہے جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی ذات اور اس کی صفات۔ خدا کی ذات و صفات میں مدغم نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ ذات و صفات بشریت کی نفی سے اثباتِ حق ہوتا ہے۔

حیات ایک حرکتِ پیہم ہے۔ اور وہ بقول بعض ایک نامعلوم نقطہ سے دوسرے نامعلوم نقطہ تک رواں ہے۔ اس کی کوئی منزل معلوم نہیں ہے۔ اقبال نے اسی کو ان الفاظ میں کہا ہے ؎

تو اے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں ہر دم رواں ہے پیہم رواں ہے زندگی

اور غالب نے ایک جہدِ مسلسل سے تعبیر کیا ہے ؎

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا ہستی آزادی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

موج ہر چند دریا میں ہے لیکن جب تک دریا میں روانی ہے۔ وہ زنجیر نہ کر موجوں کو ہستی کی قید میں جکڑے ہوئے ہے اور موجیں اس

ابوالمجاہد زاہد

اے زہرہ جبیں ناچ

اے زہرہ جبیں ناچ، مری زہرہ جبیں ناچ
لینن کی قسم آج تو دیوانہ بنا دے
ہاں میری نگاہوں سے نگاہوں کو ملا کر
ریشم سے یہ گیسو مرے شانوں پہ بچھا دے

لے دیکھ ـــــ کہ لایا ہوں نئی قسم کے بندے
کل ریشمی ساڑھی بھی تری نذر کروں گا
بیوی مری بیمار ہے ـــــ اچھا ہے کہ مر جائے
اب میں تری زلفوں ہی کے سائے میں جیوں گا

ہاں جام اٹھا جام ـــــ کہ کرتا ہے اشارے
یہ ابر، یہ بل کھاتی پھواروں کا ترنم
کس ناز سے رہ رہ کے چمکتی ہے یہ بجلی
جیسے ترے ترشے ہوئے ہونٹوں پہ تبسم

یہ ترے مدھر گیت، یہ پائل کی چھما چھم
ہے ان کی بدولت ہی مری گرمیٔ افکار
یہ سیب سے رخسار، یہ بادام سی آنکھیں
پاتے ہیں توانائی انہیں سے مرے اشعار

یہ تیرا خم و پیچ ـــــ ترے رقص کے انداز
جیسے کسی مفلس کے تڑپنے کی ہو تصویر
لینن کی قسم یہ ترے گیسوئے پریشاں
جیسے کسی مزدور کی الجھی ہوئی تقدیر

کم ظرف ہیں دیتے ہیں "طوائف" کے جو طعنے
لائے جو ترے پاس کھنکتے ہوئے سکّے

اے زہرہ جبیں! اصل میں مزدور ہے تو بھی
خدمت کو ہر اُس شخص کی مجبور ہے تو بھی

غربت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مری جاں!
ممکن ہے کہ مل جائے مجھے بھی کوئی "عہدہ"

میں "سرخ سویرے" کی دمک دیکھ رہا ہوں
اُمید کی ہلکی سی چمک دیکھ رہا ہوں.

تعمیر پسندوں کا ادب کوئی ادب ہے
بہلانے کو اُن کے مگر اے جانِ تمنّا

زردار کے ایجنٹ ہیں، مذہب کے طرفدار
کہہ لیتا ہوں میں بھی کبھی کچھ "لعنت" کے اشعار

مزدوروں کے جلسے کے لئے نظم ہے کہنی
اسٹالن و لینن کی قسم، جام کی سوگند

وہ نظم مورچے کو جو شاہیں سے لڑا دے
اے زہرہ جبیں! پگھلی ہوئی آگ پلا دے

مہکی ہوئی سانسیں مری سانسوں میں سمو دے
جی بھر کے مجھے آج تو مستی میں ڈبو دے

ابوالاسرار رمزی اٹاوی

میرا گیت

(۱)

نہ شہیدِ عشقِ مجاز ہوں، نہ غمِ صنم کا شکار ہوں
نہ حریمِ حسن کی گرد ہوں، نہ کسی کے در کا غبار ہوں
نہ رہینِ جام و سبو ہوں میں، نہ خراب و مست خمار ہوں
مرا ملک شعر و سخنوری
غمِ حسن و عشق سے ہے بری
کہ ازل سے مجھ کو عطا ہوا ہے مذاق شعر و پیمبری

(۲)

گل و خار سے مجھے کیا غرض، نہ میں برق ہوں نہ شرار ہوں
نہ دھواں چراغِ مزار کا، نہ میں بیکسی کا مزار ہوں
نہ خزاں نے مجھ کو چھوا کبھی، نہ میں آشنائے بہار ہوں
مرا ملک شعر و سخنوری
غمِ حسن و عشق سے ہے بری
کہ ازل سے مجھ کو عطا ہوا ہے مذاق شعر و پیمبری

(۳)

نہ دیار میں مرے مہ جبیں، نہ حسین عربدہ آفریں
نہ صنم کدے نہ الم کدے، نہ ہجوم لالۂ و یاسمیں
نہ ہیں منتشر مرے دوش پر وہ کسی کے گیسوئے عنبریں
مرا ملک شعر و سخنوری
غمِ حسن و عشق سے ہے بری
کہ ازل سے مجھ کو عطا ہوا ہے مذاق شعر و پیمبری

(۴)

نہ خیالِ بزم سرور ہے نہ دماغ بربط و چنگ و دف
نہ مغنیہ کی تلاش ہے، نہ سرود و رقص سے ہے شغف
نہ کسی کے مقتلِ ناز میں ہوں میں سربسجدہ و دل بکف
مرا ملک شعر و سخنوری
غمِ حسن و عشق سے ہے بری
کہ ازل سے مجھ کو عطا ہوا ہے مذاق شعر و پیمبری

(۵)

میں کہاں سے لاؤں جنوں سری حدیثِ رحم و فغاں گری
نہ سرشکِ گفتِ نظر مجھے نہ غمِ تبسّمِ سرسری
نہ میں دلدہی سے فگار ہوں نہ میں واقفِ رہِ دلبری
مرا ملک شعر و سخنوری
غمِ حسن و عشق سے ہے بری
کہ ازل سے مجھ کو عطا ہوا ہے مذاق شعر و پیمبری

احمد پرویز

اُٹھو ساتھیو

زمانے کے تیور بتاتے ہیں ساتھی
جہاں میں نیا دور آکر رہے گا

لہو ابنِ آدم کا جو بہہ چلا ہے — یقیں ہے، وہ رنگ اپنا لاکر رہے گا
یہ جھوٹے خدا، امن کے ہیں پیامی؟ — زمانہ انہیں آزما کر رہے گا

زمانے کے تیور بتاتے ہیں ساتھی

کمالِ بنی نوعِ انساں کی خاطر — یہ بے چین ہیں پستیوں کے مسافر؟
زمانے کو بہکائیں گے کیا یہ ساحر — نشاں آپ اپنے وہ پاکر رہے گا

زمانے کے تیور بتاتے ہیں ساتھی

یہ انساں پہ انسان کی حاکمیت؟ — نئے نعروں میں پرانی حماقت
بڑی دور بیں ہیں زمانے کی نظریں — یہ اہلِ نظر کو جگا کر رہے گا

زمانے کے تیور بتاتے ہیں ساتھی

"یہ سرخ و سفید" آمریت کے ایواں — نیا دور ان کو مٹا کر رہے گا
اُٹھو ساتھیو! وقت للکارتا ہے — زمانے میں حق فتح پاکر رہے گا

زمانے کے تیور بتاتے ہیں ساتھی
جہاں میں نیا دور آکر رہے گا

بشیر افرمالیگانوی

میرے ارادے

جواں ارادے جواں اُمنگیں، جواں سا راجہاں بنا دُوں
چمن کی اِن سُوکھی پتّیوں کو میں رشکِ صد گلستاں بنا دُوں
چمن کے خاروں کو خونِ دل سے میں رنگ دُوں گُل فشاں بنا دُوں
بہار کو پھر خزاں نہ لوٹے بہار کو جاوِداں بنا دُوں
"سرودِ نغمہ" کی مَست لے سے کلی کلی کو جواں بنا دُوں
بہار کو گُلفروش کر دوں چمن کو رشکِ جناں بنا دُوں
زمانہ محرومِ عیش و عشرت نہ رہنے پائے نہ رہنے پائے
بُجھے بُجھے دل اُداس چہرے جو ہیں انہیں شادماں بنا دُوں
جو آشنائے ستم ہیں اب تک جو آشنائے کرم نہیں ہیں
بنا کے مہر و وفا کا خُوگر انہیں میں ہمدردِ جاں بنا دُوں
قدم قدم پر مچل رہا ہے نیا تمدّن نیا زمانہ
حیات للکارتی ہے مجھ کو حیات کو جاوداں بنا دُوں
اگر میں چاہُوں تو اسے اپنی فضا میں اِک آگ سی لگا دُوں
میری نوا میں شرر ہے پنہاں، میں ان کو برقِ تپاں بنا دُوں
اسیرِ گنجِ قفس رہُوں کیوں قفس میں گھُٹ گھُٹ کے میں مروں کیوں
میں توڑ کر تیلیاں قفس کی چمن میں اِک آشیاں بنا دُوں
اثرؔ اگر چھیڑ دوں ربابِ دلِ شکستہ کے تار کو میں
فضائے عالم بھی جھوم اُٹھے جہاں کو رشکِ جناں بنا دوں

متین طارق

اپنی اپنی عینک

چھوٹی بڑی۔ لال۔ پیلی۔ نیلی عینکیں ہر قسم کی ہوتی ہیں جن سے دیکھنے کا کام لیا جاتا ہے۔ مگر یہ ہے پرانی بات۔ فی زمانہ تو دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ دکھانے کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے جس سے دُور کی سُوجھنے کے علاوہ شخصیت میں بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔ شاید ایسے ہی موقع کے لئے کہا ہے کہ ؎

چشم پر چشمہ چڑھایا تاکہ سُوجھے دُور کی
ختم ہے انسانیت صورت بنی لنگور کی

یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ شعر کس کا ہے مگر ترقی معکوس کے اس فلسفہ پر شاعر ہے مبارکباد کا مستحق کیونکہ جس نظریہ کو بیچارا ڈارون عمر بھر لوگوں کو نہ سمجھا سکا اس کو نہ صرف بتا دیا بلکہ تصویر کھینچ دی۔ اب کوئی مانے یا نہ مانے حضرت انسان کے بندر رہونے میں کوئی شک نہیں۔ رہا یہ سوال کہ وہ اس منزل سے یہاں تک کیسے پہونچا۔ یعنی بندر سے آدمی کس طرح بنا ایک الگ بات ہے جس کے لئے انسائیکلو پیڈیا خیالستان کی چھان بین کرنی ہوگی۔

واللہ کیا سماں تھا وہ جب یہ افضل الاخلائق انسان بندر کے رُوپ میں شاخ در شاخ مارا مارا پھرتا تھا دن میں گھومنا رات کو سونا اس کا واحد مشغلہ تھا۔ حُسن اتفاق سے اگلے پیر کسی طرح شدید زخمی ہوئے تو حضرت نے پچھلے پیروں پر چلنا شروع کر دیا بعد میں جس کی ایسی عادت پڑی کہ اچھے ہونے کے بعد بھی یہی دستور رہا نیز روزانہ کی گردش سے وہ مضبوط اور لمبے بھی ہو گئے اور اگلے پیر کام میں نہ آنے کے باعث کمزور اور چھوٹے ہو گئے۔ چہرے کے سڈول ہونے کے بارے میں بھی کچھ ایسی ہی روایات ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس نئی تبدیلی کے بعد پانی میں عکس دیکھا۔ بھونڈے خط و خال سے کچھ ایسی رقت طاری ہوئی کہ بیساختہ پیروں سے چہرے کو گھسنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس طرح گھستے گھستے انسان کی شکل نکل آئی جو منجھائی کی تکلیف گوارا نہ کر سکے وہ بے چارے بندر کے بندر رہ گئے۔

اس سلسلے میں ایک دوسری روایت بھی ہے جو اگرچہ ضعیف ہے مگر دل چسپی سے خالی نہیں۔ سنا ہے کہ بندروں کو گنے چوسنے کا بہت شوق ہے کثرت استعمال نے اُن میں کھجلی کا روگ پیدا کر دیا چنانچہ کھجاتے کھجاتے بدن کے بال سب جھڑ گئے۔ اور ناک بھی درست ہو گئی۔

اس میں شبہات زیادہ ہیں لیکن دلیل کے لئے صرف یہ مثال کافی ہے کہ اس سے پہلے ترقی کرتے کرتے چوہا بھی تو آخر ہاتھی بن چکا ہے اگر بندر آدمی بن گیا تو کیا تعجب کی بات ہے۔ البتہ حیرت کی بات یہ ہو سکتی ہے کہ اتنی ترقی کرنے کے بعد بھی کچھ لوگ اِس بندر بٹا آدمی (بندر بٹا ۱ آدمی) کے وجود مقدس کو نرا بندر ہی سمجھتے ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ جس طرح چوڑے کی اینٹ ہمیشہ چوڑے کی اینٹ ہی رہتی ہے چاہے نالے میں لگے یا چوبارے میں اسی طرح اِنسان باوجود انتہائی ترقی کے بہرحال بندر کی جنسیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا اِسی لئے اس کو اپنے معاملات میں بندروں کی تقلید کرنی چاہئے۔ تاکہ توارث قائم رہے۔ بندر ننگے رہتے ہیں اِس لئے انسان کو بھی ننگا رہنا چاہئے۔ اُن میں شرم و حیا کا وجود نہیں اِس لئے انسان کو بھی یہ صفات طاق میں رکھنا چاہئیں۔ انہیں اپنے مرتبہ کا پتہ نہیں اِنسان کو بھی ماں بیٹی بہن بھائی کا فرق اٹھا دینا چاہئے۔ یعنی اِس کے معنی یہ ہیں کہ ننگے رہو بندر ننگا پیدا ہوا ہے۔ جنسی بھوک سرِ عام پوری کرو کیونکہ فطری تقاضا ہے عریانیت کو رواج دو کیونکہ آبا و اجداد کی ریت ہے، ویسے بھی اصل مبارک ہے بمقابلے مصنوعی کے۔ جو لوگ کپڑے پہنتے ہیں وہ کفرانِ نعمت کے مرتکب ہیں۔ جو بدن کو ڈھکتے ہیں وہ جاہل و احمق ہیں۔ جواز دواجی تعلقات میں اصول کے پابند ہیں وہ اندھے بھی ہیں اور نا سمجھ بھی۔ اندھے تو اِس لئے کہ گرد و پیش کے حالات کی خبر نہیں رکھتے اور نا سمجھ یوں کہ دوسروں کے کہنے پر چلتے ہیں۔ جو جس نے کہہ دیا یقین کر لیا غضب خدا کا اتنی بات نہیں سمجھتے کہ بدن قدرت

نے عطا کیا ہے۔ کھال کو اس کا محافظ بنایا ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ فطری صحت و خوبصورتی پر نمائش کی چادر ہی ڈالی جائے حالانکہ ع

"تن عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس"

حقیقت یہ ہے کہ جانوروں کے جذبات کو جانور ہی سمجھ سکتے ہیں مظلوم بندر چلا رہے تھے کہ ہماری فطری صلاحیتیں ختم ہو رہی ہیں۔ اچھے خاصے جنگل جنگل پھرنے والوں کو اصول کا پابند بنایا جا رہا ہے۔ آزادی کی کوئی نہیں سنتا۔ کوئی خبر نہیں لیتا۔ فرائڈ نے آگے بڑھکر سرپرستی کا فرض انجام دیا۔ اس نے کہا کہ فکر نہ کرو ابھی تمہاری اولاد اتنی نافرمان نہیں ہوئی کہ اپنے آباؤ اجداد کے طور طریق بھلا بیٹھے، آج جبکہ "موجود الا المادہ" کے ہر طرف مظاہرے ہیں رب النفس کی خوشنودی عین ایمان ہے۔ بیچ کے اوپر جھوٹ کی سواری بڑھ رہی ہے۔ تو پھر ہم بھی کیوں اپنے آباؤ اجداد کی ریت اختیار نہ کریں۔ لہٰذا آج سے وہی نہیں خاں۔ بدمستی و رہنگامے ہوں گے تاکہ عورت مرد سینہ تانے آنکھ ملائے مینا بازار کی حلاوتوں سے لطف اندوز ہوں۔ جلنے والے جلتے ہیں تو جلیں اور مرتے ہیں تو مریں ہمیں کیا؟

چنانچہ اب پھر انسان بندر کی طرف لوٹ رہا ہے۔ عریانیت۔ نفرت۔ تعصب، اپنا پیٹ اپنی فکر نہ کھانا نہ کھانے دینا بقول شخصیکہ جس طرح بندروں کے بیچ میں گڑ کی بھیلی رکھدی جائے تو سر پھٹول لازمی ہے اسی طرح انسانوں میں بات بات پر لڑنا ایک دوسرے کو خونی نظروں سے دیکھنا۔ قیس خاں۔ آپا دھاپی۔ پرانی عادتیں عود کر آئی ہیں۔ بندر کے متعلق ہلدی کی گرہ لیکر بنیاری بن بیٹھنے کی مثال پہلے سے سنتے آرہے ہیں۔ آج بھی اس کے مظاہرے گھر، بازار دفتر ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں۔ جس کو ذرا سا بھی اختیار کہیں حاصل ہے وہ اپنے سے نیچے درجے والے کو پنساری بنا بھبکیاں دیتا ہے۔ شیر بنکر غراتا ہے۔ ہو ہتیا ہے۔ خدا کھلوا کر پرستش کراتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ خوب آنکھوں میں دھول جھونکی دن دھاڑے، تو بنایا اور اپنا کام نکالا۔

اگر آپ دنیا میں ہر پھر کر کسی انگریز، کسی جرمن، کسی امریکن، روسی، ہندوستانی کو دیکھیں گے تو پتا چل جائے گا کہ یوں چاہے یہ تو میں رنگ ڈھنگ میں مختلف ہوں مگر اس معاملے میں سب ایک ہیں۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ نچلا طبقہ بھی ہر ملک میں خادم کی طرح جی حضور، جو حکم سرکار کا، خواہ بیجا ہی ہو مگر معنی ہی وفاداری کے یہ ہوئے تو وہ بے چارا کیا کرے اس لئے ہمہ وقت کورنش بجا لانے کے لئے تیار رہتا ہے۔ جس کا معاوضہ صرف اتنا ہے کہ سرکار کی ابرو میں خم نہ پڑے کیونکہ کہیں خم پڑ گیا تو خواہ مخواہ راندۂ درگاہ ہونا پڑے گا۔

نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ روزی ختم ہو جائے گی۔ گالیاں رہیں سو مفت میں۔ اس لئے گردن جھکائے سنتے رہو یا دُم دبا کر دو گیارہ ہو جاؤ۔

دُم کی بات چیت شروع ہو گئی ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ بندر سے آدمی بننے کے سارے واقعہ میں اگر کوئی بات سب سے زیادہ تعجب خیز ہے تو وہ یہی کہ بندر دُم رکھتے ہیں مگر انسان لنڈورا ہے اور اسے ہی بھلا قرار دیتا ہے، بات بنانے کو تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ لنڈورا ہونے میں ہلکا پن ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ دُم گئی تو کہاں؟ بڑی چھان بین کے بعد اس سلسلے میں یہ روایت ہاتھ لگی ہے کہ جنگل میں بڑھئی چیرائی کا کام کر رہا تھا اس کی عدم موجودگی میں بندر حسب عادت وہاں پہنچے اور لگے دست عمل دراز کرنے حسن اتفاق سے تختوں کے بیچ کی کھونٹی نکل گئی اور دُم جو تختوں کے بیچ میں تھی دبی کی دبی رہ گئی۔ کھینچا تانی میں صرف جان بچ سکی۔ دُم تختوں کی نذر ہو گئی لیکن اس بات کو سُن کر آپ پہلے پیچھے کی بحث میں پڑ جائیں گے اور پھر وہی چکر کہ انڈا پہلے آیا یا مرغی ایک نہ ختم ہونے والی بحث چھڑ جائے گی۔ اس لئے قطع نظر اس سے کہ بندر پہلے تھا یا انسان آپ صرف یہ یاد رکھئے کہ بندر کی کسی طرح دُم کٹ گئی اور انسان لنڈورا ہو گیا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

دُم سب جانور رکھتے ہیں بندر بھی رکھتے ہیں بس آدمی نہیں رکھتے۔ روا جاً تو اور بات ہے ورنہ دُم کے دُم چھلے سے کچھ فیض بھی نہیں کیونکہ ویسے بھی وہ بارہ برس نلکی میں رہنے کے بعد بھی ٹیڑھی ہی رہتی ہے چنانچہ اس کے ٹیڑھے پن کی بات اتنی مشہور ہو گئی ہے کہ اب جس آدمی کی عادتیں کسی اچھی جگہ رہ کر بھی نہیں سنورتیں اُسے کتے کی دُم کا خطاب دیا جاتا ہے لہٰذا اگر کسی کو ایسی ہی دُم کی تمنا ہے تو وہ کوئی عجیب عمل کر کے خطاب لے سکتا ہے۔

سر، کنور، مہاراج یہ سب خطاب ہی تو ہیں جو سفید فام آقا کی طرف سے تقسیم ہوتے تھے اُن کے جانے کے بعد خطاب بانٹنے کا قاعدہ ختم ہو گیا شاید اسی وجہ سے دُم بھی غائب ہو گئی۔ اب کتے کی دُم کسی کو نہیں کہا جاتا کیونکہ فی زمانہ کتے انسان سے زیادہ مہذب بہترین دوست اور بڑے وفادار جانور ثابت ہوئے ہیں جبکہ ان کے مقابلے میں انسان غیر مہذب دوستی کے لئے ناقابل اور وفا کے بدلے جفا جو خود پرست اور خود غرض ہے۔ آج ایک کتا پانی میں پرچھائیں دیکھکر بھی ٹکڑے کی ہوس میں دوسرے کتے پر حملہ مشکل سے کرتا ہے لیکن یہ حضرت اشرف المخلوق منہ تو منہ پیٹ سے بھی آگ اگلنے کو بیتاب ہیں۔ اسی لئے کتوں کے واسطے نرم نرم بھونوں، دودھ، مکھن اور سیر کے لئے موٹر کا انتظام کیا جاتا ہے اور انسان کو کسی طرح مار کر اُس کے مال و متاع

اور جائداد ہر چیز پر قبضہ کرنے کی اسکیمیں تیار ہو رہی ہیں۔ جس میں کامیابی کا سو فیصدی یقین ہے۔

ثبوت کے لئے یہ تاریخی حکایت یاد رکھئے کہ ایک سرائے میں چند آدمی وارد ہوئے۔ شام کے کھانے پر کھچڑی تھی۔ حسب قاعدہ گھی کھچڑی کے بیچ میں رکھا گیا اتفاق سے اُن میں تھے ایک سید صاحب انہوں نے گھی اپنی طرف لانے کے لئے کھچڑی میں ایک انگلی اپنی طرف کھینچی اور فخریہ کہا کہ ہمارے خاندان میں ایک بادشاہ ہوا ہے دوسرے اونچی مونچھوں والے صاحب پٹھان تھے وہ "بادشاہ" کے لفظ کو گویا اپنی ہتک سمجھے اور فوراً دو انگلیاں کھینچ کر طنطنے سے بولے کہ ہمارے خاندان میں دو بادشاہ ہوئے ہیں اب بے چارے تیسرے جی جو گردن نیچی کئے کن انکھیوں سے گھی کے بہاؤ کو دیکھ رہے تھے آخر چپ نہ رہ سکے اور ساری کھچڑی میں ہاتھ گھما کر بولے کہ بھائی ہمارے زمانے میں تو ہمیشہ غدر ہی رہا ہے اور غدر کا کیا نتیجہ رہا یہ آپ سمجھ گئے ہوں گے بتانے کی ضرورت نہیں کہ کس طرح ساری کھچڑی بن گھی سُن گیا اور پانچوں تر ہو گئیں۔ اگرچہ بعد میں سر کھڑا ہی میں والی بات بھی مشہور ہے۔ بہرحال روٹی کی مینک سے دیکھنے والوں کا خیال ہے کہ اگر کہیں غدر ہو جائے تو یقیناً دن پھریں گے اپنا راج ہو گا۔ اپنا کاج، نہ کوئی بڑا ہو گا نہ چھوٹا سب کو حکومت کے جھنڈے سے روٹی ملے گی۔ یار لوگ مزے اڑائیں گے۔ رہا کام کا معاملہ سو سب سے بڑا کام تو لڑنا بھڑنا ہو گا۔ یعنی مرو مارو۔ گھر بستی۔ بازار جہاں موقع ملے چین سے نہ بیٹھو کیونکہ حرکت میں برکت ہے۔ جتنی حرکت ہو گی اتنی برکت۔ جیسے فٹ بال جیسے جیسے گھتے کھاتی ہے۔ آگے بڑھتی ہے۔ جتنی آگے بڑھتی ہے اُتنی گرمی زیادہ ہوتی ہے۔ اور گرمی زندگی کی نشانی ہے اسی لئے ہر کام مردہ آگ کا شعلہ ہونا چاہیئے۔ جس کا مقصد زیست جلانا، پھونکنا، برباد کرنا ہو جیسے بند رچیزوں کو برباد کرتے ہیں چاہے اُن کے کام کی ہو یا نہ ہو انہیں اس پر دانت تیز کرنا اور بخیہ اُدھیڑنا حتیٰ کہ نائی کا اُسترا مل جائے تو ناک بھی صاف کر لینا لیکن یہ اُسی وقت ہوتا ہے جب جذبۂ تقلید زندہ ہو۔ کہا گیا ہے کہ بندر سب سے بڑا نقال ہے۔ کھانے پینے چلنے پھرنے ناچنے گانے حتیٰ کہ سگریٹ پینے تک کی نقل اُتار سکتا ہے مگر انسان نقل کرنے میں اُس سے بھی ایک قدم آگے ہے عورت مرد، بچے۔ بوڑھے سب نقل کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بندر تقلید کے بعد بھی بندر رہتا ہے۔ مگر یہ حضرت نقالی کے بعد کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ ڈھونڈا جائے تو نقل کا ہر ٹائپ یہاں مل جائے گا۔ رہن سہن کھیتی باڑی تجارت ریاست۔ مذہب ہر کام اب اصل کی نقل ہے۔ دودھ کی نقل سفید پانی۔ آٹے کی نقل بُرادہ، بندر کی نقل آدمی، اور پنچایت کی نقل جمہوریت۔ گویا نقل کا ایک کاروبار ہے جو پورے سماج پر مسلط ہے جو ذرا اس سے انحراف کرتا ہے وہ غیر مقلد شمار ہوتا ہے۔

اس لئے فرد فرد کی نقل کرتا ہے، قوم قوم کی، اور ملک ملک کی۔ مثلاً پہلے کسی نے سُن پایا تھا کہ بندر پاخانہ کرنے کے بعد پانی سے صفائی نہیں کرتے چنانچہ یہاں جذبۂ تقلید نے سہارا دیا اور حضرت انسان نے بھی کھڑے ہو کر پیشاب کرنے اور پاٹ سے اُٹھکر ٹب میں بیٹھنے کو اپنا دستور بنا لیا۔ یا اگر انگلستان کا ایک فرد انجکشن کی برکتوں سے عورت ہو گیا تو اب ساری دُنیا بیچین ہے کہ کسی طرح وہ اپنی ڈائری سے یہ سرگذشت اخبارات میں شائع کر دے تاکہ عورت بننے کی تمنا رکھنے والوں کے لئے اس منزل کی نشان دہی ہو سکے۔ نیز اگر یورپ میں گدھوں گھوڑوں کی طرح عورتوں کی نمائش لگائی گئی تو ہندوستان میں مس انڈیا کا انتخاب بھی بعینہٖ اسی رنگ ڈھنگ سے عمل میں آیا۔ کثرت آبادی سے تنگ آکر اگر ایک ملک نے برتھ کنٹرول کو رواج دیا تو دوسرے ملک نے بھی اس کو رحمتِ عام سمجھکر اپنا لیا۔ بعض مغربی خدا ناشناس ڈکٹیٹروں نے اگر خروجی ضروریات کو متقدم جان کر عورت کو گھر سے باہر کام پر لگایا تو مشرقی رہنما بھی ترقی ملک وقوم کے لئے اسی نسخہ کے استعمال پر مُصر ہیں۔ کیا کسی ادیب نے لفظ طبع کے لئے ادب میں جنسی چاشنی کو روا سمجھا بس پھر کیا تھا سارے ادیبوں نے یہی شیوہ اختیار کر لیا کسی لیڈر نے جرأت پسندی میں ذرا اگلے دار تقریر کر دی تقلیدیوں نے فوراً بہ پروپیگنڈے پبلسٹی، ڈپلومیسی کے پورے پورے فن ایجاد کر دیئے غرض جدھر نظر اُٹھایئے نقل ہی نقل ہے۔ بات نقلی۔ ذات نقلی۔ دانت نقلی۔ آنت نقلی حتیٰ کہ اب دل اور گُردے تک نقلی چڑھنے لگے ہیں۔

پھر بندر کھلی آنکھوں نقل کرتا ہے مگر یہ حضرت اندھی تقلید کے قائل ہیں۔ اندھی تقلید کے معنی ہیں آنکھ بند کئے دوسروں کے پیچھے ہو لینا کٹھ پتلی کی طرح اشاروں پر ناچنا مداری کی ڈگڈگی پر بھکی لگانا اور تماشائیوں کو خوش کرنا اس کا سب سے بڑا کمال ہے۔ فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سوچنا نہیں پڑتا ہے۔ کام آسانی سے ہو جاتا ہے اور دل مطمئن رہتا ہے خصوصاً ایک محکوم قوم حاکم کی تقلید کے ذریعہ میاں مٹھو بنی رہتی ہے اُن کی بڑائی کرتی ہے تعریفوں کے پُل باندھتی ہے۔ گویا جو کچھ ہیں وہ ہیں اور یہ مداحی اس کا وجود ناقص، دنیا میں رہنے کے ناقابل۔ اگر جی بھی رہی ہے تو آقاؤں کے رحم وکرم پر۔ لباس مانگا ہوا۔ زبان رٹی ہوئی۔ قاعدہ سکھایا ہوا۔ لکیر کی فقیر بنی ہمہ وقت

"یارب رہے سلامت فرماں روا ہمارا"

کے راگ گاتی ہے۔ اگر خدانخواستہ فرمانروا سرپرستی سے دستکش ہوتا بھی ہے تو بھی برسوں کی مرعوبیت کے باعث ع

آتے ہیں غسال یورپ سے کفن جاپان سے

غرض زندگی سے لیکر موت تک رہنما ہوتی ہے۔ رہنما چیز کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ اسی لئے محکوم کی دنیا میں کوئی عزت نہیں۔ اُن کے آرام کا کوئی خیال نہیں اُن کی تکلیف کا کچھ احساس نہیں ہوتا۔ ہو بھی تو دنیا میں نہیں ہوتا کیونکہ یہاں ہر طرف بندروں کا راج ہے۔ بندروں کا کام تخریب ہے۔ تعمیر نہیں۔ تعمیر کوئی اچھی چیز نہیں۔ آدم کی اولاد جب تعمیر کا کام کرتی تھی تو بہت سادگی سے گذر بسر کرتی تھی۔ خدا کو مانتی تھی۔ سچائی۔ ایمانداری محبت جیسی بیکار صفات پر جان دیتی تھی۔ اُسے عیش و عشرت کا لطف حاصل تھا نہ دنیا کے مزوں کا پتہ۔ عورتوں کو برقعوں میں لپیٹ کر رکھا جاتا تھا۔ بچوں کو گھر سے باہر نہ نکلنے کی تاکید تھی۔ ملا کی دوڑ مسجد تک۔ زندہ رہنے کے لئے کھاؤ۔ دوسروں کے لئے جیو۔ رات کو جلدی سو جاؤ۔ صبح منہ اندھیرے اُٹھو۔ حلال روزی کی تلاش اچھی چیز ہے۔ جوا نہ کھیلو۔ سود مت لو۔ شراب مت پیو۔ غرض ایک ایک بات پر پہرہ تھا۔ لیکن

وہ تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دُنیا

رات گئی بات گئی۔ آدمی کی صفات گئیں اب معاملہ بندروں کا ہے۔ دُم میں نظیہ لگا کر تہذیب الاخلاق کی لنکا کو پھونکنا ہے کیونکہ اصل میں اسی لنکا نے آفت اُٹھا رکھی ہے۔ تہذیب بات نہیں کرنے دیتی۔ تہذیب جاہل نہیں رہنے دیتی۔ تہذیب ننگا نہیں ہونے دیتی۔ اگر یہ تہذیب نہ ہو تو ہم ترقی کریں گے مگن رہیں گے۔ چیخیں گے۔ چلائیں گے۔

بندر کے بچے کی جے ہو
بندر کے بچے کی جے ہو

کیونکہ

ہیں یہ دنیا کے سرگروہ راج

رُوپیہ ——— اور ہماری سوسائٹی ——— بقیہ صفحہ ۲

آخر کونسی بات ہے جس کی وجہ سے آدمی تمام انسانی اخلاقی حدود کو پھاندتا چلا جاتا ہے اور خود غرضی کی کسی انتہا پر جا کر نہیں رکتا۔ آپ اس سوال پر چاہے جتنا غور کر کے دیکھ لیجئے جواب یہ ملے گا کہ انسان مرنے کے بعد کی زندگی کو بھول گیا ہے۔ اسے دنیا کی رنگینیوں میں یہ یاد نہیں رہا کہ کائنات کے سب سے بڑے حاکم کو زندگی کا حساب دینا ہے اور وہاں نیکوں کے لئے اچھی زندگی ہوگی اور بدکاروں اور انسانیت دشمنوں کے لئے ذلت و رسوائی کی آگ ہوگی۔ جہاں ان کا جمع کیا ہوا سرمایہ گرم کر کے اسکے ان کی پیشانیاں داغی ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ اپنے لوگ دراصل وہ زہریلے سانپ تھے جو دوسروں کے حق کو چین کر اس پر اپنا پھنا لہرا رہے تھے۔ آدمی بھول جائے یا یاد رکھے حساب کتاب کا تو وہ دن آنا ہے ہی۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آدمی یہاں اس نظریہ کے ساتھ جئے۔ گویا یہ زندگی آخرت کیلئے کھیتی ہے یہ بات اگر تعین کا درجہ اختیار کر لے تو کون ہے وہ اپنا دشمن جو اپنے لئے بُرا بیج بوئے گا۔ جبکہ وہ اسے آگے چلکر کاٹنا ہے۔

سلطان احمد عمرانیس

روپیہ — اور ہماری سوسائٹی

روپیہ جمع کرنے کی خواہش لوگوں میں برابر بڑھتی جارہی ہے۔ لوگوں کو اگر کوئی چیز سب سے زیادہ عزیز ہے تو وہ ہے روپیہ ——— حالت یہ ہے کہ کوئی بزرگ اگر کسی کو ہمدردی کے طور پر کچھ نصیحتیں کرتے ہیں تو ان میں سے ایک یہ بھی ہوتی ہے کہ چار پیسے بچا کر رکھنا۔ وقت پر کام آئیں گے۔

ساری دنیا پر چھائی ہوئی روپیہ اکٹھا کرنے کی یہ خواہش دراصل ماحول کی خرابیوں کا نتیجہ ہے۔ یہ سوسائٹی کے اس بگاڑ کا نتیجہ ہے جس سے لوگوں کو واسطہ پڑ رہا ہے۔ ماحول کی حالت یہ ہے کہ ضرورت کے وقت ایک آدمی دوسرے کے ساتھ تعاون نہیں کرتا۔ مصیبت میں اس کی مدد نہیں کرتا۔ گھر میں بیمار ہو اور دوا تک کے لئے پیسے نہ ہوں تب بھی لوگ اس کی حالت دیکھ کر اس کی ضرورت پوری نہیں کرتے۔ روزگار جاتا رہے اور آدمی کو سخت مشکلات درپیش ہوں تب بھی کوئی اس کی حالت دیکھ کر ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ بعض لنگے دانے تو بیروزگاری کی حالت میں ملنا تک پسند نہیں کرتے۔ قریبی خونی رشتہ داروں تک کی یہ کیفیت ہے کہ راہ چلتے تیر اس کو بچا کر نکل جاتے ہیں۔ مبادا کوئی سوال کر بیٹھے۔

ان تمام حالات کو نظر میں رکھ کر آدمی روپیہ جمع کرنا چاہتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ماحول میں کوئی اس کا ساتھی نہیں۔ کوئی پرسان حال نہیں مصیبت میں کوئی شریک غم نہیں۔ ایسی حالت میں جو چیز کام آتی ہے وہ ہے روپیہ ——— صرف روپیہ ——— اس لئے وہ اپنی تجوری کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مصیبت اور مشکلات میں اور سب کو آنکھ بچا جاتے ہیں۔ اس لئے ان پر کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ بھروسہ کے قابل جو چیز ہے وہ ہے روپیہ۔ اور اسی سے ہر قسم کی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

اس بگڑے ہوئے ماحول میں جبکہ انسانوں میں نہ آپس کی محبت ہے نہ ہمدردی، نہ خلق خدا کی خدمت کا جذبہ ——— بلکہ اس کے برعکس نفرت فضا میں پھیلے ہوئے خود غرضی کے جراثیم جب آدمی کو سکون سے نہیں جینے دیتے تو وہ مجبور ہو کر روپیہ کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ ایسی حالت کی موجودگی میں وہ بے چارا اگر روپیہ کو اپنا واحد مددگار سمجھتا ہے تو اس میں اس کا اپنا کچھ زیادہ قصور نہیں۔

خاص طور پر متوسط طبقہ کے لوگ جو ذرا سفید پوش ہیں۔ انہیں یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ کہیں مفلسی میں کوئی روز بد دیکھنا نہ پڑے۔ یعنی یہ کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہ پڑ جائے اور عزت پر آنچ نہ آئے۔ مفلسی کا یہی وہ خوفناک تصور ہے جس کے خیال نے صرف دینداروں کو ہی دولت جمع کرنے کی طرف متوجہ نہیں کیا۔ بلکہ بہت سے ان لوگوں کو بھی اپنی طرف مائل کر لیا جو ترک دنیا کا فیصلہ کر کے گوشہ نشینی کو پسند کر چکے تھے۔

دوسری چیز جو اس خواہش کو مزید ابھارتی ہے یہ ہے کہ سوسائٹی میں صرف مالدار آدمیوں کی قدر ہے۔ عزت کے مستحق بس وہ سمجھے جاتے ہیں جن کا بنک اکاؤنٹ مضبوط ہو۔ لوگوں کے تجربہ میں رات دن یہی بات آتی ہے۔ وہ ہر جگہ اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ مالدار لوگ باعزت بھی سمجھے جاتے ہیں۔ شہرت بھی انہی کی ہے۔ دنیا انہیں بڑا آدمی کہتی ہے اور وہ عیش کے ساتھ زندگی کے دن گذار رہے ہیں۔ اس کے برعکس غریب آدمی کی کوئی عزت نہیں کرتا۔ کوئی ایسا نہیں جو اسے عزت کا مرتبہ دینا تو درکنار کسی تو جتنک کا مستحق سمجھے۔ یہ جذبہ بھی آدمی کو روپیہ اکٹھا کرنے کی طرف راغب کرتا ہے۔ وہ بھی بڑا بننا چاہتا ہے۔ عیش کے ساتھ جینا چاہتا ہے۔ اور یہ چاہتا ہے کہ میں بھی دوسرے مال داروں کی طرح مزے سے زندگی گذاروں۔

روپیہ جمع کرنے کے متعلق یہ تصور کہ اپنی بنیادی ضروریات پوری ہوتی رہیں اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ اور یہ کہ ہر آدمی

اپنی جگہ خود کفیل ہو۔ بجائے خود برا تصور نہیں ہے۔ بلکہ ہر شخص کو اس سلسلے میں لازمی کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن روپیہ جمع کرنے کے اس تصور میں بنیادی طور پر ایک خرابی پوشیدہ ہوتی ہے، یہ خواہش چونکہ ایک مدافعت ہوتی ہے اور سوسائٹی کے خود غرض اور خود پرستانہ رویہ کے جواب میں ظہور پذیر ہوتی ہے اس لئے یہ مدافعت اعتدال سے آگے بڑھ کر افراط کا پہلو اختیار کر لیتی ہے۔ یعنی شروع میں آدمی کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ میں اگر عیش نہ کر سکوں تو کم سے کم دکھ بھی نہ اٹھاؤں مگر آگے چل کر اس کی یہ ذہنیت ترقی کر کے یہ صورت اختیار کر دیتی ہے کہ روپیہ جمع کر کے عیش کرنا چاہئے۔ اور کم سے کم اتنی رقم اکٹھی کر لینی چاہئے کہ جسم اور جان کو جن عیش پرستیوں کی طلب ہو سب پوری ہو جائیں۔

روپیہ جمع کرنے کا جسکا ایک دفعہ لگ جائے تو پھر یہ اعتدال پر جا کر نہیں رکتا بلکہ انتہا تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اگر طلب اتنی ہی ہو کہ تمام انسان اپنے لئے ضرورت بھر سامانِ زندگی فراہم کر لیں تو یہ حق بات ہے۔ اس میں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ زر پیدا جمع کرنے کی کوئی حد اور کوئی تعداد آدمی کے ذہن میں ہوتی ہی نہیں۔ اس کی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ تجوری کی لمبائی چوڑائی جتنی وسیع ہو سکے اچھا ہے۔ ہر آدمی اس منزل پر پہنچ بھی جاتا ہے یا نہیں اس کا جواب تو ہر شخص کو معلوم ہے۔ یعنی جس کے قبضے میں دنیا کے اندر سب سے زیادہ سونا ہو اسے چاندی سونے کی کانیں نظر آنے لگتی ہیں۔ اس لئے ہر آدمی فرداً فرداً اس انتہا کو تو پہنچتا ہی نہیں۔ مگر آدمی چاہتا یہ ضرور ہے کہ دولت کے مقابلے میں دوسرا اس کا مدِ مقابل نہ ہو۔

پھر جب لوگ عملاً اپنے لئے اتنا وسیع میدان نہیں دیکھتے کہ سارا خزانہ گھر ہی میں بھر لیں تو وہ اتنا ضرور جمع کر لینا چاہتے ہیں جس سے اپنی تمام خواہشات پوری کر سکیں۔ خواہشات سے مراد بنیادی انسانی ضروریات نہیں۔ بلکہ وہ سب چیزیں جو ترقی پسند زمانے نے انسان کے عیش کے لئے مہیا کی ہیں۔ فسٹ کلاس موٹر کار۔ عمدہ اور وسیع بنگلہ۔ اور پھر پروپیگنڈہ کے ذریعہ شہرت اور ناموری ان سب چیزوں کے حصول کے لئے وہ جد و جہد کرتا ہے۔

اس ذہنیت کے ساتھ آدمی جب دنیا اور دنیا کے ساز و سامان پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کی نظر خود غرض آدمی کی سی ہوتی ہے۔ وہ للچائی ہوئی نگاہوں سے تمام چیزوں کو دیکھتا ہے۔ اثر اہلِ دولت کو دیکھتا ہے اور پھر اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے تو اسے حسد ہونے لگتا ہے وہ کڑھتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ ایک ہی جھپٹا مار کر دنیا سے اس کی دولت چھین لوں۔ اس غرض سے وہ کاروبار کرتا ہے۔ اور اس میں حلال و حرام کی کوئی تمیز اس کے پیشِ نظر نہیں ہوتی۔ نہ سوسائٹی کا مفاد اس کے سامنے ہوتا ہے بلکہ اس کے رویہ سے اگر قوم اور جماعت کو نقصان بھی پہنچ رہا ہو تب بھی اسے کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ روپیہ جمع کرنا چاہتا ہے۔ بس صرف روپیہ۔

وہ سستے کا کاروبار کرتا ہے، جوئے کے اڈے قایم کرتا ہے شراب کے ٹھیکے لیتا ہے فحش اور گندی فلمیں تیار کرتا ہے۔ عریاں اور تہذیب سے گرا ہوا لٹریچر بعورتوں کے عریاں اور برہنہ فوٹوؤں کے ساتھ شائع کرتا ہے۔ تاکہ اس کا کاروبار چمکے اور روپیہ کی بارش ہونے لگے۔

ظاہر ہے کہ روپیہ کمانے کے یہ تمام طریقے ناجائز اور حرام ہیں۔ ان کی بنیاد ہی انسانیت دشمنی پر ہے۔ کیونکہ ان کے ذریعے سے جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ بہت سے آدمیوں کے نقصان سے حاصل ہوتا ہے مگر وہ ان سب باتوں کا خیال نہیں کرتا۔ وہ کوئی ایسا کاروبار کرنا نہیں چاہتا جس میں اس کا بھی نفع ہو اور سوسائٹی کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اگر وہ اس قسم کا کاروبار کر سکے تو ظاہر ہے کہ یہاں آمدنی کے ذرائع اتنے وسیع نہیں، جتنے اُن طریقوں میں ہیں۔ اس لئے وہ اپنے لئے دوسرا راستہ تجویز کرتا ہے۔ ایک کے فائدے کا اور سب کے نقصان کا۔

ایسا آدمی جس کی ہوس اتنی بڑھ گئی ہو۔ کبھی سکون کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ جتنا مال بھی اکٹھا کرے گا اس کی ہوس پرستانہ ذہنیت اسے کم ہی سمجھتی رہے گی۔ اس لئے اسے وہ حالت کبھی نصیب نہ ہو سکے گی جسے سکون قلب کہتے ہیں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ آدمی جس روپئے کو عیش کرنے کے لئے جمع کرنا چاہتا ہے وہ اس سے اس کا سکون تک چھین لیتا ہے۔ اور حالت یہ ہو جاتی ہے کہ روپیہ کی بڑھتی ہوئی تعداد اسے مزید روپیہ پیدا کرنے کے لئے بے چین کر دیتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ آدمی حلال طریقوں پر کیوں کاربند نہیں ہوتا اور کیوں وہ ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جو تمام انسانوں کو نقصان پہنچانے والے ہیں۔ کیوں وہ اتنا خود غرض ہو گیا ہے کہ اپنے فائدے کے لئے ساری دنیا اور تمام انسانیت کو نقصان پہنچاتا ہے؟ وہ

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

عبدالوہاب تسنیم

آپ کس قسم کے آدمی ہیں؟

عمر لمحہ بہ لمحہ گذرتی ہی چلی جارہی ہے۔ اس کے آگے بند لگانا ہمارے بس کا روگ نہیں۔ عمر کی رو بڑھاپے کی طرف رواں دواں ہے۔ اسے کسی ایک منزل پر ٹھہرایا نہیں جاسکتا۔ مگر اس ممکنات کی دنیا میں یہ دیکھنا ہم سب کو واقعی شادمانی اور مسرت ہوتی ہے کہ بڑھاپے میں جوانی کی زندگی کو قائم رکھنا ممکن ہے۔

ہمیں اپنی اِن قابلِ تعریف قوتوں اور قابلیتوں (جو دوستی کے لئے ——— محبت و الفت کے لئے ——— ایجاد و اختراع کے لئے ——— ذہنی و دماغی کاوشوں کے لئے ——— اور اسی طرح زندگی کی بے شمار فرحت سامانیوں کے لئے ——— صرف ہوتی ہیں) کے متعلق ہمیں محتاط رہنا چاہئے کہ عمر کی روانی کے ساتھ ساتھ ان میں کا کوئی ایک حصہ بھی بیکار نہ صرف ہونے پائے۔

مگر اس کے لئے کوئی قرار داد نہیں ہے کہ ہمارے حسبِ منشا ایسا ہی ہو۔ مگر گھبرائیے نہیں۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ یہ صرف زبانی جمع و خرچ ہے نہیں!!! یہ مقصد ضرور حاصل ہوسکتا ہے۔ مگر حصولِ مقصد کے لئے پوری مستعدی اور اولوالعزمی کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ (اس راہ میں) ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم خود اپنا احتساب کرتے رہیں اور پورے خلوص کے ساتھ ہم اس بات کے خواہاں رہیں کہ جن جن اچھی اور صالح قابلیتوں کی ہم میں کمی ہے انہیں ہم ضرور اپنائیں گے۔ اور بری عادتوں کو خارج کرتے رہیں گے اگر ایسا نہ کیا گیا تو بُری اور خبیث عادتیں عمر کی رفتار کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور جڑ پکڑتی جائیں گی اور پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ ہمارے پلّے حسرت و یاس اور پریشانی و مایوسی کے سوا کچھ دھرا ہی نہ ہوگا۔

دورِ جوانی میں ہمارے لئے یہ کسی حد تک ممکن ہے کہ ہم اپنی قوت اور وجاہت سے اور (بصورتِ زن) اپنی خوبصورتی سے بھی، خود پسندی ——— زود خفگی اور دوسروں پر حاوی ہوجانے یا چھا جانے کی خواہش کو کم کردیں ——— مگر ادھیڑ عمر میں اور اس کے بعد جیسے جیسے ہماری قوتوں میں (خواہ وہ کسی قسم کی کیوں نہ ہو) کمی واقع ہوتی جائے گی ——— ویسے ہی بتدریج یہ اور ان جیسی برائیاں ہمارے قلوب میں گھر کرتی چلی جائیں گی۔

چوبیس پچیس سال کا ایک شخص اگر اب بھی دبلا اور مذاق کرسکتا ہے۔ اور لانبی لانبی اکتا دینے والی کہانیاں سنا سکتا ہے۔ تو کوئی تعجب نہیں کہ اس کی یہ عادت طبیعت ثانیہ بن جائے اور ساٹھ ستر سال کی عمر میں بھی لوگوں کے دماغوں کو چاٹتا پھرے۔ بہت جلد جذبات کی رو میں بہہ جانے والا نوجوان یقیناً اپنے دوست و احباب کے حق میں ایذا رساں اور تکلیف دہ ہی ہے۔ اگر ایسا نوجوان بروقت اپنی اصلاح نہ کرسکا تو آگے چل کر بڑھاپے میں بلکہ اس سے اوّل ہی اس کی طبیعت زود رنجی میں تبدیل ہوجائے گی۔ جس کی صحبت سے لوگ کترانے اور اجتناب کرنے لگتے ہیں ——— جوانی میں حد سے تجاوز مگر غیر ضرر رساں کفایت شعاری آگے چل کر بخالت اور پھر زر پرستی کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہے۔ اور اسی طرح نوجوانی میں حد سے بڑھی ہوئی پریشانی ——— آخیر عمر میں غم واندوہ کا سامان بن سکتی ہے۔

ادھیڑ عمر کو پہنچنے سے پیشتر ہی (یا بالفاظ دیگر ابھی سے) ہمیں چاہئے کہ اپنے آپ کا جائزہ لینا شروع کردیں۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم اپنی پچھلی زندگی کے کارہائے نمایاں کا تدارک کرسکیں۔ ورنہ بہت ممکن ہے کہ آگے چل کر وہ کارہائے نمایاں ہمیں قعرِ ذلت میں گرا دیں۔ اب جو وقت گزر رہا ہے وہی یقینی وقت ہے، اس لئے اس وقت سے ہم کو پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اب بھی آپ اپنا جائزہ لیں۔ اور ان عادتوں کو اپنا لیں جو آگے چل کر آپ کو مسرت آمیز زندگی سے ہمکنار کرسکیں۔

ہماری خوشی اور مسرت۔ ہماری معاشرت کے اُن اصولوں پر منحصر ہے جن سے ہم دوسروں کی محبت جیت سکتے ہیں۔ اور جو ہمارے خاندان اور سوسائٹی کو عزت کا پیغام سنا سکتے ہیں۔ یہ لازمی و لابدی ہے کہ ہم حد لی خلوص، درد مندی اور رواداری جیسی صفات کو اپنائیں۔ نیز یہ ضروری ہے کہ ہم دوسروں کو (خواہ وہ

ہمارے دشمن یا مخالف ہی کیوں نہ ہوں) سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی بخوشی اجازت دینے کا جذبہ پیدا کریں اور دوسروں کے خیالات و تخیلات پر ٹھنڈے دل سے سوچنے اور ان سب سے زیادہ دوسروں کے خیالات کو (توجہ اور خلوص سے) سننے کے عادی بنیں۔ یہ صفات دل و دماغ کی بہترین صفات ہیں۔ جو کامیاب زندگی گذارنے میں ہمارے معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان صفات کو اپنے اندر پیدا کر لینے سے ہماری جسمانی قوت ہرگز کم نہیں ہوتی۔ لیکن بخلاف اس کے اگر ہم ان صفات کے حامل نہ ہو سکے تو یقین مانیئے کہ ہم خود ہی غم و اندوہ اور ناگوار اور تلخ آمیز زندگی کو دعوت دے رہے ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب جوانی ڈھلتی جاتی ہے تو ہم میں بے اعتمادی اور بے یقینی جیسے خطرناک جذبے پرورش پانے لگتے ہیں۔ خواہشات کی پربہار وادیوں کا چکر کاٹنے والے اکثر اپنے دل میں خواہشات کا ایک خرمن لئے پھرتے ہیں۔ دولت مند بن جائیں۔ بہت بڑا منصب حاصل کر لیں۔ یا کسی کی محبت جیت لیں۔ یا کم از کم لیڈر ہی بن جائیں۔ اور ان کی تکمیل کے خواب بھی دیکھا کرتے ہیں ـــــ اگر آپ کی بھی ایسی ہی خواہشات ہیں۔ جو واقعاتی دنیا میں باوجود کوشش کے تشنۂ تکمیل ہی رہی ہوں تو آپ میں پست ہمتی سرائیت کر جاتی ہے اور آپ کہنے لگتے ہیں ـــــ "وہ میں نہیں ہوں جو ناکامیاب رہا ہوں۔ وہ میری زندگی ہے جس نے مجھے ناکامیاب رکھا ہے" اور پھر آپ میں بے اعتمادی، بے یقینی اور بے ہمتی پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے اپنی زندگی میں واقع شدہ واقعات کو صحیح نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ہم ضرور اس حقیقت سے واقف ہو جائیں گے کہ ہمارے اکثر حقیقی جبلّات اور خواہشات کے خلاف وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے حسب خواہش چیزوں سے کم وزنی اور کم قیمتی نہیں ہیں۔ بلکہ یا تو ان کے برابر ہیں یا ان سے بہتر و ارفع۔

ادھیڑ عمر ہی سے کبھی کے قایم کئے ہوئے "مقصد" میں ترقی یافتہ اور تعمیری تبدیلی کر لینا ایک دانشمندانہ عمل ہے۔ تبدیلی کے بعد ہم خود ہی محسوس کریں گے کہ ہمارے دل میں پچھلے مقصد سے کچھ الفت یا محبت ہی نہیں ہے مگر یہ تبدیلی قبل "پوری ہوشیاری اور دانشمندی کے ساتھ کرنی ہوگی موجودہ منتخب شدہ "مقصد" سابقہ مقصد سے زیادہ ترقی یافتہ اور بہترین صفات کا حامل ہونا چاہیئے۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب "جوانی" اور خوبصورتی (خواہ وہ بناوٹی ہی کیوں نہ ہو) پر بخلاف دوسری نیکیوں کے حد سے زیادہ، مگر بیکار زور دے رہی ہے ... گنجاپن ـــــ بالوں پر خضاب لگانا ـــــ گھونگر یالے بال بنانا ـــــ اور چہرے پر کریم اور پوڈر لگا لگا کر ریشم کی طرح نرم بنا لینا ہی آج کل کی تہذیب میں کامیاب زندگی گذار لینے کے مترادف ٹھہرا لیا گیا ہے ـــــ مگر حقیقی اور زندہ جاوید خوبصورتی اور طاقت پہلے جسم میں نہیں بلکہ روح میں پیدا ہوتی ہے۔

جوانی جب بڑھاپے کی طرف مائل ہوتی ہے تو اس کو کامیاب اور مسرت آمیز بنانے کا ایک موثر نسخہ یہ ہے کہ ہم اپنی اندرونی طاقتوں کا صحیح استعمال کرنے لگیں۔ بہت سے لوگ جو وقت سے پہلے بوڑھے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ جسمانی کمزوری نہیں بلکہ تنگ ذہنی اور تنگ مزاجی ہے جو بے رواداری۔ زود رنجی ـــــ اور خود غرضی جیسی بیماریوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

ایک ہوشیار شخص اکثر و بیشتر اپنی زندگی کا اور اپنی شخصیت کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ اور اس بات کا تخمینہ لگاتا رہتا ہے کہ پہلے کی بہ نسبت اب میں کیا ہوں اور کہاں ہوں؟ کم از کم اب تو آپ اپنا تجزیہ کیجئے۔ اور حسب ذیل سوالات دیکھئے اور اپنے متعلق اندازہ خود فرمایئے کہ آپ کس قسم کے آدمی ہیں؟

(۱) کیا میں خود پرست ہوں یا دوسروں کی ضروریات و خواہشات کا بھی کچھ خیال رکھتا ہوں۔؟

(۲) کیا میں دوسروں سے متعلق متعصب رہتا ہوں؟ یا میں یہ تسلیم کر لینے کے لئے تیار ہوں کہ دوسرے بھی یہ حق رکھتے ہیں کہ اپنے لئے جو راستہ چاہیں اختیار کریں ـــــ المختصر ـــــ کیا میں خود رہتا ہوا دوسروں کو برداشت کر سکتا ہوں؟

(۳) کیا مجھ میں ہر چھوٹی بڑی تکلیف اور ناکامی پر آپے سے باہر ہو جانے کی عادت ہے یا مسبب الاسباب جس طرح چیزوں کو بھیجتا ہے میں انہیں راضی برضا کے لیتا ہوں۔

(۴) کیا میں ہر وقت تند رو اور تیز رفتاری کا عادی ہوں؟ یا میں ہر دن کسی وقت دماغی و جسمانی راحت اور سکون لینے کا عادی ہوں؟

(۵) کیا میں اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے وسائل اپنے ہی پاس رکھتا ہوں یا اس ضمن میں دوسروں کا بھی محتاج ہوں؟

(۶) کیا میں اپنی زندگی کی کھیتی میں) بد دلی اور ناراضگی کے بیج بو رہا ہوں؟ یا محبت اور خلوص ان رشتوں پر حاوی ہے جو مجھ میں

اور دوسروں میں ہیں ؟

(۷) مدد کی درخواست کیا میرے دماغ اور پاکٹ بک کو بند کردیتی ہے ؟ یا اپنے وقت اور دولت دونوں سے فیاض ہوں ؟

(۸) کیا پریشانی ہو کہ جرم، میرے دماغی سکون تہ وبالا کردیتے ہیں ؟ یا میں گذشتہ ناکامیوں کو بھول کر ان سارے مسائل کو خاطر جمعی کے ساتھ حل کرتا ہوں جو پیش آتے رہتے ہیں ؟

(۹) آخرش !!! کیا میں اپنے دینی احکام کی طرف زبانی خدمت کرتا ہوں ؛ یا میں اُن دینی احکام پر روزانہ زندگی میں عملاً کاربند ہوں ؟

اگر آپ اپنے آپ سے انصاف کرسکے تو یہ سوالات آپ کی صحیح رہنمائی بھی کریں گے اور آپ خود اپنے لئے ایک بہت زیادہ صحیح راستے کا انتخاب فرماسکیں گے۔ کیا اچھا ہے کیا مضر یہ آدمی جانتا ہے البتہ ضرورت انصاف کی ہوتی ہے کم از کم اپنے ساتھ تو انصاف کیجئے۔

(بشکریہ اُردو سائیکولوجی۔ کراچی)

اِسٹینڈرڈ

سیزرس ـــــ اور ـــــ اُسترے

عُمدگی اور پائیداری کی اعلیٰ مثال پیش کرتے ہیں۔
جس پر میرٹھ کی اِس صنعت کو ناز ہے، قینچیوں اور
اُستروں کی تجارت کرکے بھاری منافع حاصل کیجئے۔

ـــــ ایجنسی کا شرائط نامہ خط لکھکر منگائیے ـــــ

پتہ

دی اسٹینڈرڈ سیزرس کمپنی میرٹھ (انڈیا)

ابنِ ضیاء۔ ایم اے

عنوان ـــــ چہ ضرور؟

ایک طالبِ علم سے گھوڑے پر مضمون لکھنے کے لئے کہا گیا۔
دوسرے روز اس طالبِ علم نے بتایا کہ وہ مضمون نہیں لکھ سکا۔
پوچھا "کیوں؟"
کہنے لگا "گھوڑے پر سوار ہو کر لکھنا محال تھا؟"
آپ کر سکتے ہیں کہ طالبِ علم کی غلطی تھی کہ وہ بجائے اصلی گھوڑے کے بے گھاس دانہ کے گھوڑے پر یعنی کرسی پر بیٹھ کر مضمون لکھ سکتا تھا۔ تسلیم۔ لیکن آپ ان بیشتر مضمون نگاروں کی تجویزوں کی بابت کیا کہیں گے۔ جن کی زندگی گردشِ روزگار کے تحت اس انداز سے گذر رہی ہے کہ

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

کچھ تنگ مزاج شعر کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ شعر گفتن چہ ضرور؟ مگر اس سہل انداز سے نہ خود قلم سے دست بردار ہو سکتے ہیں نہ قلم و نگارش سے بیک بینی و دو گوش اس طرح خارج کئے جا سکتے ہیں۔ مدیرانِ کرام کو بہت دن تک جواب نہ دیجئے۔ جواب بھی دیں تو کورا بھی ہو سکتا ہے۔ کورا جواب نہ بھی دینا چاہیں تو نصیب دشمناں بذاتِ خود یا کنبہ قبیلہ میں مدخریت رہنا ضروری نہیں۔ "برا نہ مانئے۔ برا ماننے کی بات نہیں۔ اس لئے کہ کسی خاندان والے سے کسی نے پوچھا کہ کہئے جناب "خیریت ہے؟"

اس نے تنک کر کہا "خیریت کم بختوں میں۔ میں تو ماشاءاللہ کنبہ قبیلہ والا ہوں۔ کسی کو نزلہ تو کسی کو بخار۔"

اور اب اس صنعتی دور میں آپ کو ضرورت کی بھلا کس چیز میں مضرت ہی چیز کی آمیزش نہیں ملے گی۔ چنانچہ پہلے اکثر مرض کا علاج ہوتا تھا وہ بھی چوٹ پڑ کا۔ اور اب تو تندرست رہنے کے لئے بھی علاج کی ضرورت ہے وہ بھی جیب چٹ قسم کا۔

بات میں بات نکل آتی ہے۔ جیب چٹ پر آپ تعجب نہ کیجئے۔ علاج کے لئے یا تو جیب چٹ ہو گی یا پھر صحت کی امید کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا نظر آئے گا۔ زمانہ یہ آپہونچا ہے کہ اب بجائے خیریت پوچھنے کے زیادہ واضح ہمدردی کا سوال یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے یہاں بیماری یا متعدی تو نہیں۔

تو خیر مدیرانِ کرام سے امن حاصل کرنے کے لئے دنیا میں چند در چند حربے ایجاد ہو چکے ہیں۔ جی ہاں!۔ امن کے لئے حربہ ایجاد ہوتا ہے ـــ یہ دوسری بات ہے کہ حربہ کے استعمال کے لئے جنگ کرنی پڑے۔ دیکھئے زندگی میں جنگ کا بازار کس قدر گرم ہے۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ تحریر کے لئے محرک ہوتے ہیں۔ مدیر اور ضمیر۔ مدیر صاحبان سے تو خیر کسی طرح دامن بچا بھی لیں گے۔ مگر آپ لکھنے سے اس وقت دامن کیسے چھڑائیں گے جب تقاضہ اپنے دل و دماغ کا ہو۔ بات اتنی سی کہنی تھی کہ آپ لکھتے ہیں۔ اس لئے کہ آپ کو لکھنا ہوتا ہے۔ ایک انگریزی ادیب نے اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ "میرے دماغ میں برق پاش طوفان اٹھتے ہیں جن سے پہروں گھٹن رہتی ہے۔ جب تک وہ الفاظ کی بوچھار نہ کر دیں۔ میرے خیالات گویا سرنگوں پھول ہوتے ہیں یا مجوس و خاموش پرند۔"

لیکن پھر بھی وہ چاہتا ہے کہ گھٹا ٹوپ برق پاش طوفان آئیں اور ذہن میں پہروں گھٹن رکھیں کیونکہ جب یہ مجھ پر الفاظ کی بوچھار کر چکتے ہیں تو میرے خیالات خداوند فرماں جھومتے پھول ہوتے ہیں یا جیسے سرشار چہچہاتے ہوئے پرند۔"

شاید اس اقتباس سے آپ کے اعتراض "شعر گفتن چہ ضرور" کے متعلق التباس خاطر ہو گیا ہو۔ میدانِ نثر میں بھی ذہنی کیفیت چاہے اس قدر شدید نہ ہو اس لئے کہ نظم نظم اور نثر نثر لیکن پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ لکھتے ہیں اس لئے کہ آپ کو لکھنا ہوتا ہے اور اس کے لئے عنوان کا سوال چنداں اہم نہیں۔ بقول شخصے آپ اپنی ٹوپی کسی بھی کھونٹی پر ٹانگ سکتے ہیں

ایک ننگ خوردہ کیل ایسا ہی اچھا عنوان ہو سکتا ہے۔ جیسا کوئی اور۔ مثال کے طور پر اپنے ٹوٹے جوتے سے الجھ کر آپ کی زبانِ قال اور اس کی زبانِ حال میں خوب خوب چونچیں ہو سکتی ہیں۔ اور بالآخر آپ اپنی تان کسی سبق آموز بات پر توڑ سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات ہے اُستادانہ۔

استادِ محترم رشید احمد صدیقی عنوان قایم کرتے ہیں "پاسبان" ——— جا گھرتے ہیں بجا دروں میں اور غریب چوٹی رقص بسمل کرتی ہوئی ان کی جیب سے جدا ہو جاتی ہے۔ آپ رشید صاحب پر زیارت درگاہ کے باعث تر چیلے ہونے کے عنوان سے کچھ کہیں نہ کہیں بہر حال اپنے نفسِ مضمون کی طرف واپس آتے ہوئے یہ بلا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ ایک مضمون نگار کو ذہنی خسرا تو ہونا چاہئے اور ہونا پڑتا ہے۔ درگاہ نگارش میں تو الفاظ کی واقعی قدم قدم پر نذر دینی ہوتی ہے۔ جب ہی مراد حاصل ہو سکتی ہے۔ بالخصوص مضمون نگار کا دماغ ادھر اُدھر خوب گھومتا ہے۔ آزادانہ طور پر اپنے عنوان کے درمیان جیسے

آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اسے کسی گہرائی اور عمق کی بالقصد تلاش نہیں ہوتی ایک مخصوص انداز میں ذہن آزادانہ طور پر گھومتا ہے۔ غوطہ زن ہوتا ہے۔ پرواز کرتا ہے اور کبھی دلفریب و نظر فریب راستہ بے تہا ب کے درمیان طے کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہی کہا گیا ہے کہ مضمون دماغ کی ایک غیر منظم یورش ہے۔ یورش ایک جنگی معرکہ ہے۔ ہم کا ایک عام خاکہ ہوتا ہے۔ مگر پیش بندیاں اور طویل تیاریاں نہیں ہوتیں بلکہ اس میں غالب مضمر ہوتا ہے ایکا ایکی اور اچانک پن کا۔ کوئی شے ایک دم غیر متوقع۔ چنانچہ کسی یورش کے سپاہی کا تکیہ ہوتا ہے۔ اس لمحہ کی پیش قدمی پر۔ جیسا موقع ہوتا ہے کرتا ہے۔ جیسی افتاد پڑتی ہے۔ انگیز کرتا ہے۔ جہاں اس کی قسمت لے جاتی ہے۔ پہونچ جاتا ہے۔ مضمون میں بھی ایک عام خاکہ تو ہوتا ہے مگر کوئی سوچی سمجھی اسکیم نہیں ہوتی۔ کافی توجہ انداز بیان پر صرف کی جاتی ہے۔ جس کی مواد سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ مضمون ایک ادبی کاوش ہے جس میں بغیر مطالعہ اور بغیر پہلے سے سوچ بچار کے۔ کسی عنوان پر جو لکھتے وقت آپ کے ذہن میں آتا ہے۔ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن پُر توجہ اور اگر ممکن ہو تو ایک خاص انداز بیان سے یہاں ایک یہ بات کہنی برمحل ہوگی کہ مضمون نگار کی اس لطیف اور آزاد فضا میں بھی قلم سے جو کچھ ضبطِ نگارش میں آئے گا۔ اس میں مضمون نگار کے خیالات و رجحانات کا عکس ضرور جھلکے گا۔ جام سے وہی چھلکے گا جو اس میں موجود ہے۔ جب تحریر کے اس وقیع پہلو نگاہ پڑتی ہے تو دل بے اختیار یہ چاہتا ہے کہ اس گروہ اور جسم تار تار عالم میں ایک گروہ ایسے مضمون نگاروں کا ہو جن کے رشحاتِ قلم سے پُر از خیر عزائم کا ایسا طوفان اٹھے جس سے یہ ظلم اور ظلمات کا عالم زیر و زبر ہو اور اس خاک سے ایک جہانِ دگر پیدا ہو جہاں امن۔ اخوت اور بھلائی کا دور دورہ ہو۔

معیار کے تنقید نمبر میں

ہند و پاک کے تقریباً سب تعمیر پسند نقاد حصہ لے رہے ہیں۔ تعمیر پسند تنقیدات کے اس گراں قدر مجموعہ کو

مفت حاصل کرنے کے لئے معیار کے سالانہ خریدار بنیئے

اس نمبر کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہو گی

سالانہ خریداروں کو یہ نمبر سالانہ زرِ تعاون میں ہی دیا جائے گا۔ مزید قیمت نہیں لی جائیگی۔

حفیظ میرٹھی

غزل

دُور ہوتی جا رہی ہے منزلِ انسانیت
جانے یہ دنیا ہے کس کافر کی بھٹکائی ہوئی

ہر گھڑی عہدِ محبت، ہر نفس پاس وفا
بیڑیاں یہ بھی ہیں لیکن اُن کی پہنائی ہوئی

ہو گئی شاید مسرّت کی حقیقت بے نقاب
ہر مغنّی کی صدا ہے آج بھرّائی ہوئی

کتنا اونچا ہے زمانے کا یہ معیارِ خلوص
قعرِ گمنامی سے ہم نکلے تو رسوائی ہوئی

میری جانب بڑھ کر بڑھنا ذرا، اہلِ کرم!
ہاں یہ دنیا ہے اِسی سائل کی ٹھکرائی ہوئی

عبدالمجید حیرت بی۔ اے

گذرا یوں ہی وقت ہمیشہ
یہ اندیشہ، وہ اندیشہ
پیہم نشتر خوردہ رگ رگ
درد رسیدہ ریشہ ریشہ
دل ہے صرف انہی کا قائل
ہیں جو لوگ محبت پیشہ
شہر کوئی واللہ نہیں ہے
دیکھ لیا ہے بیشہ بیشہ
دل جب چلتا ہے حیرت
چلتا ہے غم ہی کا تیشہ

مائل۔ خیرآبادی

رہ فنا میں، میں زندگانی کے رازداروں کو ڈھونڈتا ہوں
جو مٹ کے اک آفتاب بنتے ہیں ان ستاروں کو ڈھونڈتا ہوں
زمیں وہاں کی بنا رہا ہوں خزاں جہاں کی سرشت میں ہے
جہاں کبھی گل کھلے نہیں ہیں وہاں بہاروں کو ڈھونڈتا ہوں
دکھے ہوئے دل قرار پاتے ہیں جن کی خاطر سے اس جہاں میں
جہاں کی خاطر دکھے ہوئے دل کے بیقراروں کو ڈھونڈتا ہوں
پسینہ آتا ہو جن کی جھنکار سے محبت کے دیوتا کو
میں ساز مہر و وفا کے ایسے شکستہ تاروں کو ڈھونڈتا ہوں
گھنے درختوں کی چھاؤں میں ساتھ چلنے والے بہت ہیں مائل
قدم ملائیں جو خاروں میں ایسے یاروں کو ڈھونڈتا ہوں

شبنم سبحانی

کچھ آج اس رہِ عظمت نشاں کی بات کریں
یہ سایہوں میں دبی کہکشاں کی بات کریں

جہانِ تازہ کا سورج جہاں سے ابھرے گا
ہم اس افق کے رخِ صبح فشاں کی بات کریں

یہ درس دیتے ہیں عصرِ رواں کے اہلِ خرد
دیارِ عشق میں سود و زیاں کی بات کریں

وجود جس کا ہے گلچیں کے واسطے جاں سوز
ہم ایسے پھول کے عزمِ جواں کی بات کریں

ورودِ جشنِ بہاراں کی بات ہو بھی چکی
چمن میں اجڑے ہوئے آشیاں کی بات کریں

قفس سے چھوٹ کے آئے تو مشغلہ یہ ہے
ہر ایک بزم میں آہ و فغاں کی بات کریں

فروغِ عشرتِ منزل کی بات کیا شبنم
کچھ، آؤ، گردِ رہِ کارواں کی بات کریں

خورشید چغتائی

نہ پوچھ سوزِ غمِ روزگار اے ساقی
نفس نفس ہے مرا شعلہ بار اے ساقی

نہ جانے کیا ہو مآلِ نشیمنِ ہستی
بھڑک رہے ہیں فضا میں شرار اے ساقی

اگر علاجِ دلِ زار تو بھی کر نہ سکا
گلہ کریں گے ترے میگسار اے ساقی

میں کیسے چھیڑوں بہاروں کے سحر انگیز
ربابِ دل کے شکستہ ہیں تار اے ساقی

وہ برق بار گھٹائیں فلک پہ لہرائیں
وہ جل کے راکھ ہوئے لالہ زار اے ساقی

غضب ہے آج ہی تشنہ کام بیٹھے ہیں
ازل سے جو ہیں ترے جاں نثار اے ساقی

شبِ سیاہ میں پوشیدہ ہے نویدِ سحر
یہ وقت جیسے بھی گذرے گزار اے ساقی

مسرتوں کے دلآویز پھول جھوم اٹھے
تری نظر جو ہوئی کیف بار اے ساقی

میں نامرادِ خوشی اس طرح ہوں جیسے کوئی
بجھی بجھی سی ہو شمعِ مزار اے ساقی

مرے جنون کو پابندِ عقل و ہوش نہ کر
بہت حسین ہے فصلِ بہار اے ساقی

ذرا ضمیرِ زمانے کا جاگ لینے دے
غلام ہوں گے ترے شہریار اے ساقی

مئے حیات کی کیا تلخیاں کہے خورشید
جہاں ہے حشر کا آئینہ دار اے ساقی

شبنم رومانی

دل بھی کس درجہ ترے عشق میں جذباتی ہے
بعض اوقات تو اپنے پہ ہنسی آتی ہے
ایک گل وہ ہے جو خنداں ہے سرِ زلفِ عروس
اک کلی وہ ہے جو کھلنے سے بھی شرماتی ہے
حسن کی "جدّتِ جلوہ فگنی" ہے بیکار
کہ ابھی عشق کا انداز روایاتی ہے
لوٹتا ہے جو کوئی نجمِ درخشاں شبنم
دیر تک دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

انور صدیقی

قفس میں ذکرِ بہاراں جو کرنے لگتے ہیں
جنوں کے دشت و بیاباں نکھرنے لگتے ہیں
خیالِ تیرہ شبی جب بھی دل میں آتا ہے
تو پھر نجوم درخشاں ابھرنے لگتے ہیں
جو کوئی وحشیٔ غم وقفِ دار ہوتا ہے
تو گیسوئے غمِ دوراں سنورنے لگتے ہیں
سسکتی آہوں کو سنتے ہیں جب کبھی انور
تو جی سے اے غمِ جاناں! گذرنے لگتے ہیں

سید مستفیض عنصر ایم۔ اے

حیات احساس زندگی ہے رہینِ شام و سحر نہیں ہے
حیات سوزِ جگر ہے اے دل، حیات رقصِ شرر نہیں ہے

شعورِ فکر و نظر نہیں ہے، خیالِ شام و سحر نہیں ہے
یہی ہے کیا ارتقائے وحشت کہ مجھ کو اپنی خبر نہیں ہے

بدوشِ فردا ہزار امکاں، ہنوز امید آج اگر نہیں ہے
حیاتِ غم سے نہ بدگماں ہو، حیاتِ غم مختصر نہیں ہے

نیا سا ماحولِ بوستاں ہے، ہوا یہ بھی صیاد ہی کی سازش
خدائے الفت ثبات دیدے مجھے اسیری کا ڈر نہیں ہے

بساطِ دل کی مناسبت سے ہوئی ہے تخلیقِ تابِ جلوہ
تجھے ہے توفیقِ فکرِ زاہد، کمالِ ذوقِ نظر نہیں ہے

یہ میرا ذوقِ جنوں ہے عنصر کہ بے نیازِ حیات ہوں میں
حیات کی الجھنوں سے ورنہ حیات کو بھی مفر نہیں ہے

عنوان چشتی منگلوری

وہ رہبر ہو کے بھی آسودۂ منزل نہیں ہوتا
کہ جس کا "عزمِ محکم" جذبۂ کامل نہیں ہوتا

"شعورِ زندگی" اس کو کبھی حاصل نہیں ہوتا
مذاقِ عشق جس کا رہبرِ کامل نہیں ہوتا

وہ انساں کامگارِ زیست ہو جاتا ہے دنیا میں
جو اپنے فرض کی تکمیل سے غافل نہیں ہوتا

بہت دشوار ہے اے ناخدا موجوں سے ٹکرانا
بھنور میں ڈوب جانا تو کوئی مشکل نہیں ہوتا

سرِ ساحل پہنچکر، قدرِ ساحل کچھ نہیں ہوتی
اگر طوفان کے آغوش میں ساحل نہیں ہوتا

محبت کے اندھیروں سے نہ گھبرانا کبھی عنوان
محبت کا کبھی تاریک مستقبل نہیں ہوتا

منظر اعظمی

حل کر رہا ہوں زیست کے پیچیدہ مسئلے
اب اپنے گیسوؤں کو سنوارا کرے کوئی

رہبانیت کی چھاؤں میں پلتی نہیں حیات
حجروں میں لاکھ نفس کو مارا کرے کوئی

ہے انتہائے شورشِ فرعون اِن دنوں
اعجازِ موسوی کو اشارا کرے کوئی

ان ظلمتوں کی اوٹ سے ہوگی سحر طلوع
آثارِ صبح کا بھی نظارا کرے کوئی

شعر و ادب میں ایک نئی روح پھونک دے
منظر سے خوشنوا کو اشارا کرے کوئی

محمد نیاز نیاز

کیا زمانہ خراب آیا ہے
دعوتِ انتشار لایا ہے

جب اندھیرے کو ہو چکا ہے فروغ
نور نے معجزہ دکھایا ہے

رنگ و بو ہے دریدہ پیرہنی
راز پھولوں نے یہ بتایا ہے

کھل گئی آنکھ اس بہانے سے
زہر نے جو ہمیں ستایا ہے

چشمِ انجم ہوئی ہے تابندہ
شب کو جوں جوں سیاہ پایا ہے

ہم کو بادِ خزاں کے جھونکوں نے
مژدۂ فصلِ گل سنایا ہے

کارواں ہو چکا ہے محوِ خرام
یعنی منزل نے خود بلایا ہے

سن چکا نغمۂ نویدِ سروش
تب نیاز آج گنگنایا ہے

معیار

اپنی زندگی کے چوتھے سال کا آغاز ایک ضخیم سالنامہ سے کر رہا ہے

تنقید نمبر

جس میں خاص طور پر فن تنقید پر تازہ ترین مواد پیش کیا جائے گا۔ اور تعمیری تنقید کی طرف نشان دہی کی جائے گی۔
اس کے علاوہ اس میں ایک حصہ بلند پایہ اور معیاری افسانوں نظموں اور غزلوں کا بھی ہوگا۔

انشاء اللہ یہ نمبر تعمیری ادب کی تاریخ میں ایک اضافہ کہا جا سکے گا

ہم لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ مشکلات کے ہجوم کے باوجود یہ نمبر اواخر جنوری ۱۹۵۴ء میں آپ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے

ایجنٹ حضرات سے خصوصی گذارش

چونکہ نمبر میں مصارف کئی گنا زیادہ ہو جائیں گے۔ اس لئے آپ کو اگر معیار سے قلبی تعلق ہے تو اپنی حد تک انتہائی کوشش فرمائیں کہ تنقید نمبر زیادہ سے زیادہ نکل سکے۔ اور خاص طور پر اس کی قیمت بیشگی بھجوانے کا اہتمام کریں۔ اس سے ہماری مشکلات کے ہجوم میں بہت کچھ کمی آجائے گی نیز یہ نمبر رجسٹرڈ بک پوسٹ سے روانہ ہوگا

عام قارئین سے ایک اہم درخواست

آپ معیار کی خدمات کو اگر ادب کی تعمیر کے لئے مفید پاتے ہیں تو آپ کی خدمت میں ایک نہایت اہم درخواست ہے اور وہ یہ کہ تنقید نمبر کو اپنے حلقہ تعارف میں زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہونچانے کی کوشش فرمائیے۔ اگر آپ کا چندہ ختم ہو رہا ہے تو فوراً آئندہ سال کا زرِ تعاون روانہ کیجئے۔ اور اپنے دوستوں کو بھی معیار کی مالی معاونت پر آمادہ کیجئے۔ اس طرح آپ صرف ہمارے ساتھ بلکہ تعمیری ادب کے ساتھ بڑا تعاون کر سکیں گے۔

پاکستانی حضرات سے

چونکہ کسٹم کی پابندیوں کی وجہ سے ایکسپیوں کے ذریعہ اتنا ضخیم پرچہ پہونچانا نہایت دشوار ہے اسلئے تنقید نمبر حاصل کرنے کی یہ صورت آپ کے لئے سب سے زیادہ مناسب ہے کہ آپ انفرادی خریداری قبول فرمالیں اور اپنا سالانہ زرِ تعاون پانچ روپے "احمد نور صاحب فیملی لائن جیکب آباد" کو ارسال کر کے ہمیں مطلع فرمائیں

تعاون کا خواہاں:— مینجر ماہنامہ "معیار" میرٹھ (یو۔پی)

عاصی عنبائی۔ رامپوری

ایک عظیم خاتون گزر گئی

اب آپ جا چکی ہیں، اپنے رب کے حضور، کم و بیش پچھتر سال کا جگمگاتا علمی سرمایہ اپنے ساتھ لے کر، اور ہمارے لئے ایک ایسا نمونہ چھوڑ کر جس کی نظیر کم از کم اس زمانے میں تو شاید دنیا بھر میں ڈھونڈنی محال ہے۔ میں سوچتا رہتا ہوں کہ بارالٰہا! ابھی دو ہی سال پہلے تک ہم میں ایسی ہستی بھی ہو کر گزر گئی ہے جس کو دیکھ کر، جس کی باتیں سُن کر، جس کو دار و اعمال کا مشاہدہ کر کے ہمیں وہ مبارک عہدِ صحابہؓ یاد آجائے جس کی روایات اب کتابوں کے اوراق ہی کی زینت رہ گئی ہیں۔

میں دو سال بعد پھر اپنے پونے دو سو سال پرانے ماحول میں آیا ہوں اور اس عرصہ میں اس میں بہت کم تبدیلی ہوئی ہے۔ یہ وہی مسجد ہے، یہ وہی گھر ہے، یہ وہی دیوان خانے کے کھنڈر ہیں۔ یہ وہی مکانات ہیں۔ جن میں ہم سات سات آٹھ آٹھ پشتیں گزار چکے۔ اِن سب چیزوں کو میری رُوح تک پُوری طرح پہچانتی ہے۔ اِن سے ہم آہنگ ہے۔ مگر اب ڈوبے دل اور بھاری قدموں کے ساتھ میں اس مکان میں داخل ہوا ہوں تو زمین و آسمان سے بدلے نظر آتے ہیں ——— ایک نقطہ آپ کے نہ ہونے سے۔

میری پھپھو جان! آپ کے مکان کے صحن میں کھڑے بوڑھے کرک میں پھر ننھی گلابی کلیاں پھوٹنے لگی ہیں۔ اِکا دُکا چھوٹی چھوٹی کمرکسیں بھی، پتوں کی اوٹ میں سے جھانکنے لگی ہیں۔ تھوڑے دنوں میں یہ پھر بڑھ کر، پک کر زرد اور رسیلی ہو جائیں گی۔ پھر ہر طرف سے بچوں کی یلغاریں ہوا کریں گی۔ اور پھر وہی سب کچھ ہو گا جو پہلے ہوتا آیا ہے۔ مگر میرے لئے یہ سب بے معنی ہے ——— کیونکہ گھر کی رونق "آپ" اُٹھ گئی ہے۔

مکان کی مرمت ہو چکی ہے۔ جگہ جگہ صفائیوں، قلعی، خفیف ردّوبدل وغیرہ سے مکان کچھ کا کچھ ہو گیا ہے۔ مگر مجھے یہ پہلے سے کہیں بھیانک لگا۔ اور کیوں نہ لگے ؎ اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

میں نیچے دروازے کے پاس صحن میں کھڑا ہوں۔ میری نظریں صحن پار کرتی۔ چبوترے پر سے دبے پاؤں آگے بڑھتی دالان کے اُس گوشے تک جا پہنچتی ہیں جو میرا سب سے جانا پہچانا اور مانوس حصّہ مکان تھا۔ مگر اب وہ اجنبی نظر آرہا ہے۔ وہاں وہ چوکیوں کا فرش نہیں ہے۔ جس پر اُجلی چاندنی۔ اور اس پر دیوار کے برابر گاؤ تکیہ لگا رہتا۔ جس کے سہارے مصلّے پر سفید کپڑوں میں ملبوس وہ نورانی وجود ذکر، تلاوت، نماز، یا مطالعہ میں تقریباً ہر وقت موجود رہتا تھا۔ یہ چوکیوں کا فرش اور اس پر گاؤ تکیہ گویا ایک مرکز تھا۔ اِس گھر ہی کا نہیں۔ ایک بہت وسیع حلقے کا جس میں اَن گنت لوگ۔ واقعات۔ روایات اور دینی و دنیوی امور شامل ہیں۔ یہ ایک تاریخی روایت بنکر ہمارے ذہنوں میں بس گیا ہے۔ اور اس کو نہ معلوم کتنی پشتوں تک منتقل ہونا ہے۔ یہ وہ فرش تھا جہاں سے برکتوں اور نیکیوں کی کرنیں سی پھوٹتی اور دُور دُور تک منوّر کرتی چلی جاتی تھیں۔ یہ آپ کا مصلّی بھی تھا۔ یہیں عزیزوں اور نوکروں کے بچے قرآن اور دوسری ابتدائی تعلیم حاصل کرتے ہوئے آپ کی مشفقانہ دل سوزی اور بے لوث خدمت سے مستفیض ہو چکے ہیں یہیں سے عزیزہ لی اور دوسروں کو قیمتی نصیحتیں اور مفید مشورے آپ کی ذات سے حاصل ہو چکے ہیں۔ یہی آپ کا معبد بھی تھا اور دار المطالعہ بھی ——— غرض یہ ایک مستقل ادارہ تھا۔ اور اب ایک بے بہا روایت۔

میں دو قدم اور آگے بڑھتا ہوں۔ کرک کی گھنی چھاؤں کے نیچے کھڑے مجھے ایک ایک کر کے بے شمار باتیں یاد آتی جا رہی ہیں، یہ بوڑھا کرک مجھے بیحد عزیز ہے۔ آپ ہی نے تو بتایا تھا کہ اسے میرے دادا نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ اور اپنی نگرانی میں اس کی پرورش کرائی تھی۔ اور یہ انہی کی بابرکت توجہ کا نتیجہ ہے کہ اُن کے بعد آج آدھی صدی گزرنے کے بعد بھی جس دوران میں اِس کی غور و پرداخت کسی نے نہ کی۔ اس پر برگ و بار میں کمی نہ آئی لیکن

اس سے بڑھکر میرے لئے اس کے ساتھ اُنس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کو آپ سے نسبت تھی۔ کمرک والی بیگم میں نے ہوش سنبھالا تو یہی لفظ نوکروں اور دوسری عورتوں سے آپ کے متعلق سنا۔ اور آج اسی کی چھاؤں تلے مجھے وہ بیشمار باتیں یاد آ رہی ہیں جن کی یاد میرے لئے اتنی انمول ہے۔

عبادت! آج کس کو اِس سے اتنا لگاؤ ہے کہ اُس کا ذکر کیا جائے۔ موجودہ زمانے میں بھی بہت بڑی بات سمجھی جاتی ہے کہ کسی کا "پابند صوم وصلوٰۃ" ہونا ہی ثابت ہو جائے۔ پھر اُن لوگوں کو جو اِس ماحول میں پلے ہیں۔ آپ کے ذوق و اہتمام عبادت کا کیونکر یقین آسکتا ہے۔ دن۔ رات۔ صبح۔ شام۔ نفل نمازیں اور روزے۔ تسبیحیں، تلاوت، مراقبہ، ــــ غرض چچا جان کا وہ فقرہ اس تفصیل کو اچھی طرح اجمالاً بیان کرتا ہے جو انہوں نے ایک بار آپ سے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ چھوٹی بہن "آپ کی تو جانے کتنی عبادتیں اللہ میاں پر اُدھار ہوں گی"۔ یہ تو خوش طبعی تھی لیکن غالباً اس میں کوئی کلام نہیں کہ آپ کا یہ سرمایہ کئی عمروں کے لئے کافی ہو جائے۔

میں بارہ ایک بجے رات کے دبے پاؤں گھر میں آتا ہوں۔ ابا جان کے احکام کی خلاف ورزی کرنے کی سزا مجھے معلوم ہے کہ گھر کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اور ان کو کھلوانا اچھی طرح ملامت کی ندامت اٹھانا ہے۔ مگر نوعمری میں یار دوستوں کے ساتھ گھر میں بیٹھکر گپ بازی یہ کب سوچنے دیتی ہے۔ پھر بھی یہ اطمینان رہتا ہے کہ پھپھو جان کے گھر کا دروازہ کھلا ہوگا۔ اور اُن کے ہال سے کھڑکی میں سے ہو کر چپ چاپ اپنے گھر میں جا سوؤں گا۔ اور میرا گمان کبھی غلط نہیں ہوا ــــ مگر جب اندر داخل ہوتا ہوں تو گھر بھر کی نیند کے عین درمیان ایک سفید دھوئی مصلے پر اپنے پروردگار کے حضور حاضر دیکھتا ہوں ــــ یہ ایسا التزام تھا کہ غالباً ایک آدھ بار کے سوا کبھی اس کے خلاف تجربہ مجھے نہیں ہوا۔ حالانکہ میرا یہ معمول برسوں رہا۔

میں آپ کو اپنے کسی امتحان میں کامیاب ہو جانے کی خوش خبری سناتا ہوں۔ آپ سن کر شکر ادا کرتی ہیں۔ اور پھر میں آج ہی سے نفل ادا کرنا شروع کر دوں گی۔ میں نے تمہارے لئے مانے تھے" آپ کہتی ہیں۔

"پھر آپ نے میرے لئے نفل مان لئے؟" مجھے حیرت ہوتی ہے۔ "کتنے مانے پھپھو جان؟"

"سوا سو"

اور یہ سوا سو نفل صرف میرے ہی لئے مخصوص نہ تھے۔ اپنے دوسرے عزیزوں اور اولادوں کی نہ معلوم کتنی ہی پریشانیوں یا آزمائشوں کے موقعوں پر۔ جن میں سے بعضوں کی اہمیت کچھ ایسی زیادہ بھی نہ تھی۔ آپ نے اِسی طرح نوافل کی نذریں مانیں اور پوری کیں۔

لوگوں کے لئے عموماً عبادت ایک روزمرّہ کا معمول بن جاتی ہے۔ اور وہ اس کی پابندی اسی طرح کرتے ہیں جیسے وقتوں پر کھانا کھانے اور نا شتہ کرنے کی۔ لیکن میں نے آپ کے علاوہ دو ایک ہی شخص ایسے دیکھے جن کو عبادت اور اہتمام عبادت کا ایسا ذوق ہے گویا آج ہی برسوں کے بعد اس کا موقع ملا ہے اور آئندہ اُمید نہیں۔ اور اس کا ثبوت نہ صرف وہ چند مثالیں ہیں جو اُوپر مذکور ہوئیں بلکہ وہ صحیح مزاج تقویٰ جو ایسی عبادت کا لازمہ ہے۔ آپ میں نمایاں ہو گیا تھا۔ ذکر آخرت یا بیانِ سیرتِ نبویؐ یا کسی کی خوش الحان تلاوتِ قرآن پر آپ کا اشکبار ہو جانا ہم میں سے قریب قریب ہر شخص کے لئے آئے دن کا تجربہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ حیرت ناک واقعہ بھی اسی تقویٰ کا کرشمہ تھا جس پر لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا کہ جب آپ کا پاکستان آنے کے لئے پرمٹ بنوانے کی غرض سے تصویر کھینچوانا ناگزیر ہو گیا تو کیمرے کے آگے آپ کی حالت غیر ہو گئی۔ محض اس خیال سے کہ تصویر کشی حرام ہے۔ میں اس وقت موجود نہ تھا مگر دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ آپ کا جسم سر سے پیر تک کانپ رہا تھا۔ نظر اُوپر نہ اٹھتی تھی اور آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ اور آپ کی یہ تصویر آج بھی یہی ظاہر کرتی ہے۔ اور اسلئے صاف نہ آسکی۔

ہمارے شعراء نے زاہد مرتاض کی ہمیشہ ہجو کی ہے۔ کیونکہ وہ نہایت خشک بے ذوق اور تیز مزاج ہوتا ہے۔ اِس میں ــــ کم از کم مسلمانوں کے دورِ انحطاط کو دیکھتے ہوئے ــــ مبالغہ نہیں۔ مگر اس عہد میں بھی بعض اللہ کے بندے اس کی عین ضد دیکھے گئے ہیں۔ اور آپ بھی اُن میں سے ایک تھیں۔ اس کی گواہی وہ بہت سی خاندان کی بچیاں دیں گی جو بطورِ خاص گھریلو تربیت کے لئے آپ کے پاس بھیجی جاتی تھیں۔ اور آج گھروں کی ملکہ بنی گرہستی چلا رہی ہیں۔ اس کی گواہی وہ بچے اور بوڑھے دیں گے جو بعض بعض دفعہ راتوں کو آپ کے گرد کہانی سننے کے شوق میں جمع ہوتے تھے اور آپ ایک مشاق داستان گو کی سی مہارت کے ساتھ زبان۔ بیان اور اسلوب کی دلچسپی مدنظر رکھتے ہوئے کہانیاں سناتی تھیں۔ اور اس کی گواہی میں دُوں گا جس کو اپنے اعلیٰ کلاسیکی اُردو ادب سے جو ذوق پیدا ہوا وہ خاص طور پر آپ کی بدولت۔ جن سے لیکر میں نے لکھنوی اور دہلوی ادیبوں کے نہ معلوم کتنے ہزار صفحے پڑھ ڈالے۔ یہ کتابیں خصوصاً داستانِ امیر حمزہ بوستانِ خیال اور فسانۂ آزاد نہ صرف میں نے آپ کے سامنے پڑھیں۔ بلکہ اور

کتنے ہی عزیزوں کی اولاد کو آپ نے اپنی نگرانی میں پڑھوائیں، اور پڑھنے کے دوران میں مشکل الفاظ کے معانی بتانے کے علاوہ ان کی ادبی خوبیوں کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی۔ بلکہ سرشار کی اس غیر فانی تصنیف "فسانۂ آزاد" کے بارے میں تو آپ نے دو ایک ایسی معلومات بھی مجھے مہیا کیں جن سے ادبی تذکرے آج تک خالی ہیں۔

لوگ کہیں گے کہ اس "نغمۂ بیداریٔ جمہور" کے زمانے میں یہ قصۂ خواب آور اسکندر و جم" سنانا کیا معنی؟ لیکن انہیں معلوم نہیں کہ ماضی بھی ہمارا بے حد قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔ ادب تو خیر مشترکہ وراثت ہونے کی بنا پر قابلِ حفاظت ہے ہی، قوم یا خاندان کی تاریخی روایات بھی خود اس قوم یا خاندان کی بقا میں مُمد ہو سکتی ہیں۔ اور اس کا شوق بھی مجھے آپ ہی کی بدولت ہوا۔ اپنے بزرگوں کے حالات جاننا۔ انہیں یاد رکھنا اور اگلی نسلوں تک منتقل کرنا جتنا کم ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ اپنے کردار و اوصاف سے ہاتھ دھوتے جا رہے ہیں۔ مگر آپ کے ذریعہ ہم لوگوں میں جو خاندانی اور بڑے پیمانے پر قومی تاریخ جاننے اور سیکھنے کی طرف دلچسپی پیدا ہوئی وہ بھی اپنی جگہ ایک مستقل احسان ہے۔

اور پھر "ماضی" ہی سب کچھ نہیں "حال" بھی بہت کچھ ہے۔ اس کا احساس بھی آپ کو تھا۔ اور اس امر میں بڑے بڑے "ولایت پلٹ" آپ ٹوڈیٹ معلومات رکھنے والے یا کھدر پوشی اختیار کر کے "جنتا" (عوام) کا دم بھرنے والے عزیزوں کو آپ کی وسعت معلومات و نظر پر میں نے دم بخود ہوتے دیکھا ہے۔ انہیں کس قدر حیرت ہوتی تھی کہ یہ سال خوردہ، نئی روشنی اور تعلیم سے ناواقف۔ عبادت گزار۔ قناعت پیشہ۔ گوشہ نشین ہستی جسے برسوں اپنے شہر سے اور مہینوں اپنے گھر سے نکلنے کا اتفاق نہ ہوتا ہو۔ بیک وقت معلّم، واعظ اور اقربا کی دانشمند غمخوار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے بے پناہ ہجوم مصائب کے باوجود قومی۔ ملکی اور بین الاقوامی سیاست اور وقت کی نئی نئی تحریکوں تک سے کیونکر اتنی جہارت کے ساتھ واقف ہو گئی کہ ہر موضوع پر جدید ترین خبر کی روشنی میں نہایت صائب تبصرہ بھی کر سکتی ہے۔ مگر مجھے اس پر اب کوئی حیرت نہیں۔ اوّل تو مومن ہونے کا صحیح مفہوم اس عہد میں "سادہ لوح" اور "حجرہ نشین" ہونا لیا جاتا تھا۔ مگر آپ نے عام متداول خیال کے برخلاف اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ دین صرف مصلّوں اور تسبیح ہی تک محدود نہیں۔ وہ باورچی خانے میں بھی اللہ کا دین ہے اور شادی کے گھر میں بھی۔ ایوانِ سیاست میں بھی ہے اور کارخانوں کے کوارٹروں میں بھی۔ اس لئے مومن کو صرف اس چھوٹے سے گوشے ہی کا پابند نہ ہو جانا چاہیے جس میں وہ نماز پڑھتا اور مراقبے کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک سچے طالب علم کی طرح آپ نے علم حاصل کرنے میں آخر تک نہ ہچکچاہٹ سے کام لیا نہ بے پروائی سے۔ اور پھر جب ایک صحیح بات معلوم ہو گئی تو اپنے سابقہ عمل یا خیال سے رجوع کر لینے میں دیر نہ لگائی۔ میں آپ کے چھوٹوں کا چھوٹا تھا مگر کتنے ہی دینی مسائل۔ تاریخی حالات اور ایسے ہی دوسری معلومات مجھ سے پوچھ کر اپنا اطمینان کرنے میں کبھی باک نہ محسوس کیا یہی طالب العلم کا جذبہ تھا جس کی بدولت آپ نے میری اور بہت سے دوسروں کی معرفت پبلک کتب خانہ سے بے شمار کتابیں منگوائیں۔ اور اسی جذبے سے مجبور ہو کر آپ اپنے اس ضعفِ بدن و پیرانہ سالی کی پروا نہ کر کے کئی سال رمضان بھر تراویح پڑھنے جامع مسجد تک پا پیادہ گئیں۔ کیونکہ وہاں مولانا حافظ .... صاحب محراب سنانے کے علاوہ ہر ترویحہ میں بیٹھکر پڑھے ہوئے حصۂ قرآن کا مفہوم بھی بتایا کرتے تھے۔

اور اب ——— آپ کی سیرت کا جو حصہ مجھے یاد آ رہا ہے میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کا اظہار کس طرح کروں کس قدر روح فرسا۔ جہاں گداز اور جگر خراش ذکر ہے کہ اگر میں قدیم عہد کا شاعر ہوتا تو نہ معلوم کون کون سا مبالغہ باندھکر بھی محسوس کرتا کہ ہنوز ذکر تشنہ ہے۔ اور ایک میں کیا غیروں تک کے کلیجے منہ کو آ گئے ہیں۔ جب اُن پر آپ کی داستانِ الم کا کوئی باب منکشف ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صبر و صلوٰۃ کے ساتھ استعانت کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ اور یہی دونوں آپ کی زندگی بھر کا معمول بنے رہے۔ صلوٰۃ کا تو جو کچھ حال تھا وہ بیان کر ہی چکا ہوں لیکن صبر کا بیان کرنا اتنا آسان نہیں۔ میں بارہا سوچ چکا ہوں کہ اگر وہ مصائب جن میں سے آپ گزریں اور اتنی کامیابی کے ساتھ ان سے عہدہ برآ ہوئیں۔ خدانخواستہ مجھ پر پڑتے تو کیا میرے ہوش بھی سلامت رہتے۔ اُن چھوٹے موٹے بیشمار واقعات کا ذکر نہیں جن سے تقریباً ہر ایک کو پالا پڑتا ہے۔ اگرچہ اتنی کثرت سے نہیں۔ میں تو اُن بڑی آزمائشوں کو سوچتا ہوں جن کے لئے گویا ربِّ قدیر آپ ہی جیسے نیکوں کو منتخب کرتا ہے۔

وہ آپ کا پانچ سالہ ازدواجی زندگی کا المناک خاتمہ۔ جس میں ایک شریف و صالح نوجوان۔ ایک عزیز شوہر۔ دو کمسن بیٹیاں چھوڑ کر خدا کے حضور پہنچ جاتا ہے۔ اور اپنی سعادت مندی، شفقت اور محبت کی یادگار اپنے والدین۔ بیوی۔ اور دوسرے اعزّہ کے آنکھوں میں سلگتے آنسوؤں کی صورت میں قائم کر جاتا ہے۔ گویا آپ کی داستانِ درد کا حقیقی آغاز تھا۔

جس کے بعد گویا مصائب کا دروازہ سا کھل گیا۔ اور رُوحانی و ذہنی اذیت کا یہ سلسلہ نصف صدی بعد موت ہی نے آکر ختم کیا۔ اِس دُکھ بھرے سفر میں بعض بڑی بڑی منزلیں بھی آئیں۔ بلکہ دو ایک تو تقریباً شریکِ سفر ہی ہو کر رہ گئیں۔ آپ کی بڑی بیٹی ـــــ میری رضاعی والدہ ـــــ کی ازدواجی زندگی گویا قبر ہی میں کٹ رہی تھی۔ اور آپ کے لئے مستقل سامانِ خلش تھی ہی کہ دوسری بیٹی کے ہونہار اور لائق شوہر نے دس سال ایک صالحہ کے ساتھ کاٹنے کے بعد زندگی کو الوداع کہہ کر گویا آپ کے لئے پھر آپ کے اوپر بیتی ہوئی مصیبت کی "سنت" تازہ کر دی۔ ارحم الراحمین، بھائی عبدالقدیر خاں کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آج انیس سال بعد بھی ان کا ہنس مکھ، بھرا پیکر سامنے آجاتا ہے تو اُن کی وفات پر اُن کی ماتا کی ماری ماں اور بیٹا سمجھنے والی خالہ اور ساس کی کیفیت کا کسی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور ان کی بیوہ کا غم تو تصور سے بھی ورا ہے۔

لیکن پناہ بخدا ـــــ وہ سانحۂ عظیم جس سے آپ کو اپنی ضعیفی کی اِس آخری منزل میں سابقہ پیش آیا۔ کیا میں ۳ نومبر ۱۹۵۳ء کا دن بھول سکتا ہوں جب مجھے بریلی میں معلوم ہوا کہ آپ کے بڑے داماد صاحب نے جن کے "رضاعی فرزند" ہونے کا مجھے "شرف" حاصل تھا۔ اپنی ہمدم موصوف بیوی کو نہایت اطمینان اور ٹھنڈے دل سے اُسترے سے گلا کاٹ کر ہلاک کر دیا۔ وہ نیک بی بی جو تقریباً ۴ ہزار میں اپنی والدہ کے صفات کا پرتو تھی۔ وہ بے زبان جس نے عمر بھر ظالم شوہر کی سختیاں سہیں۔ یوں چپ چاپ وفا اور تسلیم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئی۔ خاندان بھر میں تو جو کہرام مچا وہ مچا ہی، شہر بھر میں ہُمہُمی مچ گئی جس نے سنا بہبوت ہو کر رہ گیا۔ اور کیسے نہ ہوتا۔ سانحہ ہی ایسا تھا۔ اُس شہیدہ کے جوان جوان بیٹوں پر کیا گزری ہوگی۔ اُس کی غمزدہ بیوہ بہن کو کیا صدمہ ہوا ہوگا۔ اُس کے دوسرے عزیزوں نے کن کانوں سے یہ سنا اور کن آنکھوں سے دیکھا ہوگا ـــــ اور سب سے بڑھکر اس کی صدموں سے نڈھال، دُکھیاری ماں ـــــ آپ ـــــ نے یہ پہاڑ کیونکر سہا ہوگا۔ میرے لئے یہی سوچ ایک قیامت بنی ہوئی تھی۔ وہ رات میری پریشان ترین رات تھی۔ بستر میرے لئے انگاروں کی سیج بنا ہوا تھا۔ خواب میں بھی ـــــ اگر کچھ دیر کو پلک سے پلک لگ بھی گئی ـــــ یہی خیالات غول بن بن کر آرہے تھے۔ میں علی الصباح رامپور جا سکتا تھا مگر نہ گیا۔ میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ میں آپ کو نہ معلوم کس حالت میں دیکھوں گا۔ اور دیکھنے کی تاب ہی کہاں سے لاؤں گا۔ پاگل ہو گئی ہوں گی۔ دورے پڑ رہے ہوں گے۔ بھلا کس کا جگرہ ہے جو اِس ہوش رُبا حادثے پر ضبط کر سکے۔

مگر آہ۔ میری پھپھو جان۔ تیسرے دن جب میں آپ سے ملا ہوں تو مجھے اپنی آنکھوں پر شبہ ہونے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آنسو نکلنے سے روکنا تو کس کے امکان میں ہے۔ میں نے آپ کو حسبِ معمول تلاوت۔ اوراد و وظائف کے ساتھ ساتھ گھر کے کاموں کی ہدایتیں دیتے اور اس سانحے کے قسا قسا نی اثرات پر تبادلۂ خیالات کرتے پایا تو میں بھونچکا رہ گیا۔ میرے پاس اس کے سوا الفاظ نہیں جن سے اپنے جذبات کی ترجمانی کر سکوں۔ صبر اور دعا بس یہی دو باتیں آپ کے معمول میں داخل تھیں۔ اور اس وقت بھی یہی دو چیزیں نمایاں دیکھ رہا تھا۔

اور پھر اس سے بھی بڑھکر میرے دماغ کو چکرا دینے اور رگیں مفلوج کر دینے والی بات یہ تھی جو میں نے دوسروں سے سنی کہ عین اُس وقت فجر کی نماز کی ساعت میں جب آپ اس حادثے کی اطلاع سن کر بادلِ بریاں و چشمِ گریاں وہاں پہنچیں اور بیٹی کو خاک و خون کے بستر پر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ـــــ اور یہ وہ دردناک وقت ہوگا جب انسان کو اپنے جسم و جان کی بھی خبر نہیں رہتی ـــــ آپ نے اعلان کر دیا کہ آپ نے اس سفاک قاتل کو خالصاً للہ معاف کر دیا۔ اور دنیا و آخرت دونوں میں مواخذہ سے دست برداری ظاہر کر دی۔ اللہ اکبر۔ یہ وہ لمحہ تھا جب میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار آپ کی صحیح عظمت کا احساس کیا۔ اور مجھے یقین آگیا کہ قرنِ صحابہؓ کے لوگ کس پائے کے ہوں گے جبکہ اس چودھویں صدی میں بھی کم از کم ایک ہستی کا حال ہم اپنی آنکھوں دیکھ اور کانوں سُن رہے ہیں۔ اور پھر بھی یقین کرنے پر دل مشکل سے آمادہ ہو رہا ہے۔ اس کے بعد جو ہوا سو ہوا۔ قتل کی وجہ سمجھ میں نہ آسکی۔ قاتل نے کچھ بتایا ہی نہیں۔ اشتعال کا کہیں دُور دُور پتہ نہ تھا۔ سوتے سے چُپ چاپ جگایا اور اطمینان سے گلے پر اُسترا پھیر دیا۔ اکثروں نے جنون کا کرشمہ کہا۔ کم اعتقادوں کے لئے تصوف کا کوئی دقیقہ "الٹ جانے" کی بلا ثابت ہوئی۔ بہرحال اہلِ فیصلہ کرنے کے لئے احکم الحاکمین نے اسے بھی حبسِ دوام کی سزا پانے کے دوران ہی میں پروانۂ اجل بھیج کر طلب کر لیا۔ لیکن جانے والی جا چکی تھی۔ بیتنے والی بیت چکی تھی۔ اور سہنے والے نے اس طرح سہہ کر دکھایا کہ ایک دنیا دنگ رہ گئی۔ اور حیرت پر حیرت ہوئی جب آپ نے قاتل کی موت کی خبر سنکر آنسوؤں کے ساتھ اُس کے لئے دعائے مغفرت کی۔

اب ہماری آنکھیں ڈھونڈتی ہیں مگر وہ قانع و صابر، عابد و واعظ۔ معلم و ناصح۔ غریب و امیر سب کی بے لوث خدمت گزار اور سچی ہمدرد ہستی نظر نہیں آتی۔ اور ابھی یہ بھی امید نہیں کہ کوئی دوسری ہستی اُس کی جگہ لے سکے۔ اب نہ محتاجوں کو اپنی قلیل آمدنی کے باوجود کوئی خفیہ و علانیہ امداد دے گا

نہ بچوں بچیوں کو تعلیم و تہذیب سکھائے گا۔ نہ گھریلو پیچیدگیوں کا منصفانہ اور دانشمندانہ حل بتائے گا۔ اور نہ ـــــ سب سے بڑھ کر ـــــ دشمن تک کے حق میں دعائے خیر کرے گا۔ لوگوں کو فرصتیں بہت کم ہیں کہ وہ اِن "ہملات" میں وقت ضائع کریں۔ آج دوسرے "مسائل" اِن سے بہت بڑھکر اہم ہیں۔ اور اُنھی کے سوچنے کو بہتیرا وقت درکار ہے۔ لیکن کم از کم ہمارے اور ہماری نسلوں کے لئے الصالحات قانتات حافظات للغیب کی ایک مثال ضرور قائم ہو گئی ہے ـــــ کتنی انمول مثال۔

ہم دونوں ـــــ میں اور میری شریکِ راہ حیات ـــــ کے لئے وہ ڈیڑھ مہینہ بہت غنیمت تھا جو ۱۹۵۱ء میں آپ کی معیت میں گزرا۔ خدا کی بنائی ہوئی زمین کی انسانی حد بندیاں، اور ان کے سخت تر کرتے رہنے کا یہ اہتمام جس کی بدولت لاکھوں خاندان تتر بتر ہو کر سرحدوں کے دونوں طرف پھڑک رہے ہیں۔ ایسے نہ تھے کہ ہمیں آپ سے ملتے رہنے کی بار بار توقع ہو سکتی۔ اس بنا پر یہ آخری ملاقات آج کتنی قیمتی نظر آتی ہے۔ ۹ ستمبر کی صبح جب ہم دونوں اپنی معصوم شیر خوار کے ہمراہ واپس ہونے کے لئے آپ سے رخصت ہو رہے تھے تو ہمیں آپ کے رنج کا اندازہ تھا۔ میں تو خیر جو تھا سو تھا۔ بیگم ـــــ آپ کی نہایت عزیز نواسی ـــــ آپ کا بچھڑنا اور پھر ڈیڑھ سال بعد صرف ڈیڑھ ماہ کے لئے ملنا آپ کے غم نصیب دل کا اچھی طرح مداوا ابھی نہ کر پایا ہوگا کہ پھر جدائی کی گھڑی آ گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی کہ آیندہ ملنے کی کوئی ضمانت نہیں۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان "ہفت خواں منازل" سے بھی دشوار مرحلے ہیں جنہیں بڑی ہی مشکل سے اتفاقیہ پھاند کر ہم ڈیڑھ مہینے آپ کے ساتھ گزار گئے۔ لیکن کون جانے کہ آیندہ بھی یہ اسی طرح طے ہو سکیں گے۔ یہی احساس تھا جس نے بیگم اور ان کی والدہ کو رخصت ہوتے وقت بے اختیار کر دیا تھا۔ مگر ان دونوں سے زیادہ حساس۔ آپ کی ذات کو میں نے بہت غور سے دیکھا کہ پیکرِ ضبط بنی بیٹھی ہیں۔ ایک آنسو بھی آنکھ میں نہیں۔ صرف بھرّائی ہوئی آواز سے خدا حافظ کہہ کر رخصت کر دیتی ہیں۔

اور اس کے تین ماہ بعد میں اپنے کالج میں کھڑا عبدالستار کا کارڈ پڑھ رہا ہوں کہ ۸ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ (۸ دسمبر ۱۹۵۳ء) جمعہ کی مبارک رات کو آپ کے پیدا کرنے والے نے آپ کی آزمائشوں کا سلسلہ منقطع کر کے اپنے قربِ خاص میں طلب فرما لیا ہے۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون" میرے منہ سے نکلا۔ "ایک عظیم خاتون گزر گئی" اس سے زیادہ میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اور میرے دیدۂ تصور میں آپ سے متعلق بے شمار باتیں جگمگانے لگیں ـــــ وہی جو آج اِس کمرک کی چھاؤں میں پھر یاد آ رہی ہیں۔

لوگ سمجھیں گے کہ یہ آپ کا سوانحی خاکہ ہے۔ نہیں۔ یہ تو محض اظہارِ جذبات ہے۔ آپ کی عظمتِ کردار کے لئے ایک محبت بھرا تحفہ ہے۔ بلند پایہ خواتین کی سوانح عمریاں قلم اور کاغذ سے نہیں لکھی جاتیں۔ وہ اپنی سوانح عمریاں خود ہی لکھتی ہیں ـــــ زندہ اور مستمر۔ اُن کی سوانح عمریاں وہ زندہ افراد ہوتے ہیں جنہیں وہ اپنے دودھ کے ساتھ مزاج اور سیرت بھی دیتی ہیں۔ اور اس فرض کو آپ نے جس طرح ادا کیا اس کی زندہ مرنوشت وہ بے گنتی مائیں۔ بیٹیاں اور مرد ہیں جنہوں نے آپ سے اکتساب فیض کیا ـــــ اور اب آپ کی میراث کو آگے منتقل کر رہے ہیں ۵

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو
ہمہ خنداں بدند و تو گریاں
آں چناں زی کہ بعدِ مردنِ تو
ہمہ گریاں بوند و تو خنداں

تگ و تاز

ابُو المجاہد زاہد کی تعمیر پسند نظموں کا مجموعہ۔ اِس مجموعہ کی کتابت ہو رہی ہے۔ اور بہتر انتظامات کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ ناشر مکتبہ معیار میرٹھ

داغ داغ اُجالے

کئی دنوں سے وہ اپنے کمرے کے دریچے سے کیتھڈرل کے گھڑیال کی منجھر سُوئیوں کو گھورتے گھورتے جھنجھلاہٹ سی محسوس کرنے لگی تھی۔ اُسے اُس دریچے سے جھانکتے ہوئے گھڑیال سے نفرت سی ہوگئی تھی۔ جب بھی وہ تازہ ہوا کے لئے دریچہ کھولتی تو وہ ساکت و جامد کھڑا ہوا گھڑیال اُسے یُوں نظر آتا جیسے وہ اُس کا منہ چڑا رہا ہو۔ اور اس کی سُست رفتار سُوئیاں اس کے اس احساس پر کچوکے لگایا کرتیں کہ کاش وقت کا چکر اس تیز رفتاری سے گھوم جاتا کہ صبح اور شام، اور رات اور دن آپس میں خلط ملط ہو کر رہ جاتے اور تمام عالم مبہوت ہو کر اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیتا۔ اور اس بھونڈی سی اُمید پر اُس نے کیتھڈرل کے گھڑیال کو پہروں گھورا تھا اُسے ٹکٹکی لگا کر دیکھا تھا۔ مگر اُس پتلی سی لمبی سوئی نے اُسے اس کا بھی ادراک نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ منٹ کا فاصلہ کب طے کر پاتی ہے۔ اُس کے اس ٹھہراؤ نے اُسے اکتا دیا تھا۔ اور وہ ایک دم بجھ کر رہ سی گئی تھی جیسے برسوں سے دوپہر کی تمازت کے بعد شام کی سنہری کرنیں نہیں آئی ہیں اور اس کی آنکھیں اس تیز روشنی کا سامنا کرتے کرتے دکھنے سی لگی ہیں۔ اور اس کے گرد و پیش اور اس کے اپنے اندر ایک اُجاڑ پن سا چھا گیا تھا۔

یہ دن رات کب نہیں آئے تھے۔ گرمیوں کی تعطیلات ہمیشہ ہی آتی تھیں اور وہ پورے پورے دن بھی بیکاری ہی کے ہوتے تھے لیکن پھر بھی وہ اس سرعت سے گذرتے تھے کہ بار ہا اُس نے چاہا تھا کہ وہ کیتھڈرل کے مخروطی منارے پر چڑھ کر ان سُوئیوں کو باندھ دے اور کچھ ایسا کرے کہ وقت اپنی جگہ پر تھم کر رہ جائے۔ مگر وہ زمانہ اور ہی تھا کئی ایک ہنگری لڑکیاں جمع ہو جایا کرتی تھیں اور گھر کی چار دیواری کتنے ہی بچکانے کھیلوں سے بھر جاتی تھی تیز تیز پُر مسرت آوازیں اطراف و جوانب سے ٹکرانے لگتی تھیں۔ اور اس کی ماں اس اُودھم پر اس طرح بگڑتی تھی کہ جیسے وہ چاہ رہی ہو کہ اسے ختم نہ کیا جائے۔ اور وقت بھاگتا چلا جاتا تھا۔ مگر اب اس احساس نے کہ وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے گی۔ اس کو بے انتہا مضمحل کر دیا تھا۔ وہ ہنگری لڑکیاں اس بار بھی آئی تھیں اور انھوں نے گھر کی چار دیواری میں اس بار بھی ایک گھما گھمی سی پیدا کر دی جاتی تھی مگر اس بچے کچھے ماحول نے انھیں بہت جلد اکتا دیا اور وہ سب تتر بتر ہو گئیں۔

اور اب وہ ایک دم باؤلی سی ڈیڈی اور ممی کے سے سنجیدہ افراد کے درمیان اکتائی اکتائی سی رہنے کے لئے مجبور ہو گئی تھی۔

اس نے سستے ایڈیشنوں کی انگریزی ناولوں اور افسانوں کی کتابوں میں اپنے وقت کو دفن کر دینا چاہا۔ مگر کیتھڈرل کی وہ بے ہنگم سی وقفوں سے سُنائی دینے والی گھنٹیاں برابر اس کا مذاق اڑاتی رہیں۔ اور ایک دن اُکتا کر وہ مجبور ہو گئی کہ وہ ڈیڈی کی تپائی پر سے تازہ اخبار اُٹھا لایا کرے۔ اور اس میں ضرورت ہے کہ اشتہاروں کو لالچ بھری نظروں سے دیکھا کرے۔

جب پہلی بار اس نے اخبار کے اشتہاروں کی رہنمائی میں ایک ملازمت کے لئے درخواست دینے کا فیصلہ کیا تو بے اختیار اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور اس کے لبوں کے گوشے اور ٹھوڑی رقت کی وجہ سے کپکپانے لگے۔ اور یہ خیال ایک تپتے ہوئے بگولے کی طرح اس کی پسلیوں کے درمیان منڈلانے لگا کہ اب تک اُس نے اخبار کو صرف پیکٹ باندھنے کے لئے ہی استعمال کیا تھا اور اب وہ مجبور ہو گئی تھی کہ وہ اُن کی ورق گردانی بھی کرے۔

اُس دن کے بعد سے وہ مستقلاً اُداس رہنے لگی تھی۔ اور عجب بچکانہ پن اس پر مسلط ہو گیا تھا، جیسے وہ اب برابر سنجیدہ ہوتی چلی جا رہی تھی اور وقت سے پہلے بڑھاپے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے بارہا اس احساس کو خود سے نوچ کر پھینک دینا چاہا مگر جیسے یہ سب کچھ اس سے اور بھی زیادہ چمٹتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن اُس کی درخواست کا جواب آ گیا اور وہ ملازم ہو گئی۔ مگر اس خبر نے اُسے طمانیت بخشنے یا اُسے خوش کرنے کے بجائے اُسے اور پژمردہ کر دیا۔ اب جیسے اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ لاکھ تمنا۔ خواہش اور شوق کے باوجود آئندہ تعلیم سے محروم ہو گئی ہے۔ اُس کی آنکھیں

ایک بار پھر آنسوؤں کی لڑیاں پرونے لگیں اور وہ بڑی حسرت کے ساتھ اپنی حالت پر غور کرنے لگی کہ اُسے ڈیڈی کی مالی تنگ دامانی کی وجہ سے یونیورسٹی کی جیتی جاگتی فضاؤں کو خیرباد کہہ دینا پڑ رہا ہے۔

کتنی جلبیاں تھیں جو اس کے حسین خوابوں پر ایک ساتھ ٹوٹ پڑی تھیں۔ اور یہ غیر متوقع بات ہوتے ہوئے وہ یوں دیکھ رہی تھی جیسے کسی کے ہاتھ سے نوگرفتا پرند چھوٹ جائے اور وہ کھڑا دیکھتا رہ جائے۔ بالکل یونہی وہ اپنے آپ کو یونیورسٹی کے عزیز ماحول سے دُور ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور بے بس تھی۔ وہ ڈیڈی کو مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے کی طرح ضد نہیں کر سکتی تھی۔ مچل نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ایک آفس سپرنٹنڈنٹ کی بساط اس سے زیادہ کیا ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو ——— اور وہ بھی لڑکی ——— زیادہ سے زیادہ بی۔ اے تک تعلیم دلائے۔ اتنے ہی کیلئے کیا کم پاپڑ بیلنے پڑے تھے جو وہ اس سے بھی زیادہ کا مطالبہ کرے۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھی ——— یونیورسٹی کی زندگی کے واقعات اور اس کا ماحول اس کے تصور میں بالکل تر و تازہ تھا۔ وہ یونین ہال سے لیکر اسپورٹس پولین تک سایہ دار گھنے درخت اب بھی اس کی آنکھوں کے لئے سامان فرحت لئے ہوئے تھے۔ اور اتنے فاصلے کو طے کرتے ہوئے وہ کتنی مسرت محسوس کیا کرتی تھی۔ کتنی نگاہیں اس کے گروپ کی طرف اٹھتی تھیں اور کتنی سرگوشیاں قدموں پر دم توڑتی رہتی تھیں کہ وہ ایک مخصوص استغناء کے ساتھ دور وسعتوں میں دیکھنے لگتی تھی۔ اور اسی طرح پھولوں کے قطعوں کو پار کرتے ہوئے لائبریری میں داخل ہوتے ہوئے وہ کتنا پسند کرتی تھی۔ لائبریری میں کسی لڑکی کا داخل ہو جانا گویا ساری نگاہوں کو اپنے اوپر مرکوز کر لینا تھا۔ ایسے لمحہ اپنی اہمیت کا احساس کتنا لطیف ہوتا تھا۔ اسے اپنی اس پھچوری حرکت پر کتنی ہی بار ہنسی آئی تھی کہ وہ ریڈنگ روم محض اس احساس سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہی جایا کرتی تھی۔ مگر اس احتظاظ کے ساتھ ایک کانٹا تھا جو برابر اس کے ذہن میں کھٹکا کرتا تھا۔ وہ اس واقعہ کو اب تک نہ بھلا سکی تھی جب وہ ایک دن ریڈنگ روم میں داخل ہوئی تو تمام نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں اور چند سکنڈ کے لئے ایک بھنبھناہٹ پورے ہال میں گونج گئی۔ اور وہ ایک امریکن رسالے کو ملیکر یونہی ورق الٹنے پلٹنے لگی۔ اس وقت شاید وہ کچھ سوچ بھی رہی تھی کہ دوسری میز کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے گرم گرم مباحثہ کرنے والے لڑکوں کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں تو وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنیوالی لڑکیاں تعلیم کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہوتی ہیں۔ ان کا مقصد صرف اپنی قدر کو اونچا کرنا ہوتا ہے۔"

"یہ تمہاری ہٹ دھرمی ہے۔"

"نہیں ہٹ دھرمی نہیں تم ہی بتلاؤ کہ ایک بی۔ اے پاس لڑکی کب کسی کلرک یا مزدور کے ساتھ زندگی نباہنے کے لئے تیار ہوگی یا ہوئی ہے۔ تم ہندوستان کیا غیر ملک کی بھی کوئی مثال دے کر ثابت کر دو۔"

"خاموش رہیئے۔ ورنہ میں پراکٹر سے شکایت کر دوں گی۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

اُس لڑکے نے تیکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا جیسے وہ اُسے انتہائی ذلیل سمجھ رہا ہو۔ اور پھر وہ ریڈنگ روم سے باہر چلا گیا۔

اور اب بھی یونیورسٹی کو خیرباد کہہ دینے کے بعد اُسے اُس لڑکے پر غصہ آگیا اور اُس کی انگلیوں میں تشنج پیدا ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی کتاب کو میز پر ڈال دیا اور دریچے کے باہر دیکھنے لگی۔ سامنے کیتھڈرل کا منحنی سوئیوں والا گھڑیال اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اور وہ جھنجھلا کر اُٹھکر باہر چلی گئی۔ ڈیڈی مختلف پھولوں کے پودوں کو پانی دے رہے تھے۔ وہ بھی دل بہلانے کے لئے ان کے ساتھ لگ گئی۔

اسی اثناء میں میریا بھی بھولی بھٹکی آن پہونچی۔ اُسے دیکھکر جیسے اُسے اپنے اندر ایک مسرت کی کرن پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس کے تصور میں یونیورسٹی کے خاکے اُبھرنے لگے۔ وہ دوڑ کر میریا سے لپٹ گئی اور برآمدہ ہی میں بید کی کرسیوں پر دونوں بیٹھ گئیں۔

"ابھی صبح ہی میں نے شیلا سے سنا تھا کہ تم کو کوئی ملازمت مل گئی ہے۔ بڑی خوشی ہوئی سن کر۔ میں نے کہا چلو میں بھی مبارکباد دے آؤں۔"

"ہاں! آئندہ ہفتہ سے کام پر چلے جانا ہے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"چلو اچھا ہے۔ بیکار پڑے رہنے سے دل تو نہ گھبرائے گا۔" میریا جیسے اُس کو دلاسا دے رہی تھی۔

اور اس کے بعد بھی جتنی دیر تک میریا اُس سے گفتگو کرتی رہی اُسے یہی محسوس ہوتا رہا کہ جیسے وہ اُن بے فکری لڑکیوں کے گروپ سے دُور ہوتی جا رہی ہے۔ اور میریا اُسے کافی بزرگ تصور کر رہی ہے، جیسے اب وہ قہقہے اور وہ چہلیں اُس کا حصہ نہیں رہی ہیں۔ اور جیسے جیسے یہ احساس اس کے اندر پرورش پاتا جا رہا تھا وہ اور بھی زیادہ مضمحل ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا

دل بیٹھتا چلا جا رہا تھا۔ اور وہ یہ تمنا کرنے لگی تھی کہ میریا اُس کے پاس سے اُٹھ کر چلی جائے ورنہ وہ پاگل ہو جائے گی۔

پھر وہ جلد ہی دفتر کے کام میں مشغول ہو گئی۔ اور اس کا سارا دن کم و بیش وہاں کی مصروفیتوں میں گذرنے لگا۔ وہاں بھی نگاہیں اُس کی طرف اُٹھتی تھیں۔ وہاں بھی سرگوشیاں ہوتی تھیں۔ مگر اُن میں ایک تحکن تھی۔ بوسیدگی تھی اور زندگی کے بھاری بوجھ کی کراہیں تھیں۔ اُسے اُن کھسیائی ہوئی حریص نگاہوں سے گھن سی آنے لگی اور پھر دفتر کا کام ایک اور بوجھ بن کر اُس پر مسلط ہو گیا۔ جس کے نیچے اُس کی اپنی نجیلی خیال آرائیاں سسکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

فائلوں کے انبار جب اُس کے سامنے لگ جاتے تھے اور وہ اُن میں مشغول ہو جاتی تھی تو وہ ایک اُونچا اُٹھتا ہوا پہاڑ سا معلوم ہونے لگتی تھیں۔ جیسے کوئی ڈگمگاتا سا بوسیدہ۔ بے ہنگم منارہ بنا کر اُس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اور وہ اپنے قلم کے قدموں سے اُس پر چڑھنے کے لئے مجبور ہو رہی ہے اور جب وہ کوئی قدم رکھتی ہے تو منارہ اور بلند ہو جاتا ہے۔ وہ ایک قدم اور رکھتی ہے اور منارہ اور بلند ہو جاتا ہے۔ منارہ بلند ہوتا جاتا ہے وہ قدم رکھتی جا رہی ہے۔ اس کے قدم تھک جاتے ہیں۔ قلم کراہنے لگتا ہے اور رد و شنائی بدہیئت خون کے دھبوں کی طرح پھیلنے لگتی ہے اور منارہ ڈگمگانے لگتا ہے اور ایک تحیر انگیز قہقہے کی گونج اُٹھتی ہے۔ بڑی پُر ہول۔ بڑی تکلیف دہ! ——— اور وہ پھر خون زدہ سی اپنے کام میں مشغول ہو جاتی ہے۔

دن کا یہ وقت گذرتا ضرور جاتا تھا لیکن جب اس خستگی سے آزاد ہو کر وہ گھر واپس لوٹتی تھی تو اس کی ہڈی ہڈی چٹخ رہی ہوتی تھی اس کی نس نس ٹوٹ رہی ہوتی تھی اور بس کا اپنا وجود ایک اور بوجھ بن جاتا تھا پھر گھر کا خاموش وحشت انگیز ماحول اُسے اور بھی کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا دن بھر کی محنت کے بعد جو تھکن اُس پر سوار ہو جاتی تھی اُس میں اس خاموش گھر کی وجہ سے ذرا بھی کمی نہیں ہوتی تھی اور دوسرے دن جب وہ پھر دفتر جاتی تھی تو اضمحلال پوری طرح طاری رہتا تھا اور اس کا دل قطعاً نہ چاہتا تھا کہ وہ ایک قدم بھی اُس طرف اُٹھائے۔ مگر اس طرح ایک عرصہ گذر گیا تھا۔ اور وہ اس اتوار کے روز ہمیشہ کی طرح پوری طرح سستا لینا چاہتی تھی کہ صبح ہی صبح ایک دستی دعوت نامہ اُس کے نام آن پہونچا اور وہ مجبور ہو گئی کہ وہ شام اُس پارٹی میں گذارے۔ اُس نے دو تین بار دعوت نامہ کو پڑھا اور اپنے فیصلہ پر مزید غور کیا مگر اُس نے اسی کو بہتر سمجھا کہ بیکار وقت گذارنے سے بہتر یہی ہے کہ ایک شام ایمبیسیڈر میں گذاری جائے۔ کچھ تبدیلیٔ ماحول سہی!۔

ایمبیسیڈر کے باہر ہی اس کی چند ایک پرانی سہیلیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ انھیں دیکھکر اُس کی پرانی یادیں پھر تازہ ہو گئیں اور پھر یہ تمنا ایک کسک کے ساتھ اس کے اندر کروٹیں لینے لگی کہ کاش وہ بھی یونیورسٹی میں ایک بیفکری کا زمانہ گذار سکتی۔ وہ اُن سہیلیوں کے ساتھ ایمبیسیڈر کے اندر تو چلی گئی مگر جیسے وہ اپنے اور ان کے درمیان ایک خلیج سی حائل دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے آپ میں اور اُن میں بڑا بُعد محسوس کر رہی تھی۔ اور اس احساس نے اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کے پیچھے سے مسرت کا عنصر چوس لیا تھا ———

ایمبیسیڈر کے اندر اب بھی وہ وہی پرانی فضا محسوس کر رہی تھی۔ کارنسوں کے پیچھے لگے ہوئے برقی قمقموں کی کرنیں چھت پر اس طرح اُلجھ رہی تھیں کہ ان کے انعکاس سے پورا ہال جگمگا رہا تھا۔ وہی نور کی دھند وہی آرکسٹرا کا پس منظر اور وہی مخصوص بھنبھناہٹیں جیسے اُسے دوبارہ مجبور کرتی رہیں کہ وہ فائلوں کے ڈگمگاتے۔ بوسیدہ اور بے ہنگم مینار سے اپنی جان چھڑانے کے بعد یہیں پناہ لیا کرے۔

یہ خیال برابر بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا کیا۔ اور وہ آرکسٹرا کی آواز سے ایک سرور انگیز کیف حاصل کرتی رہی۔ اُس کی سہیلیوں نے مختلف ناچوں میں حصہ لیا اور ان کے قہقہے اور پُر مذاق فقرے اس کے دل پر چھائی ہوئی تھکن کے بوجھ کو ہلکا کرتے رہے۔ اُس نے ناچ میں حصہ نہیں لیا۔ اُس کو اس سے اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ اُس نے کبھی بھی ناچ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ البتہ وہ اُس وقت تک اُن کے ساتھ رہی جب تک ایمبیسیڈر کی بھیڑ ہلکی [illegible] اور پھر وہ میریا کے ساتھ ہی گھر کے لئے روانہ ہو گئی۔ [illegible] خاموشی کے ساتھ برقی قمقموں سے منور، ویران ہوتی ہوئی سڑک پر چلی جا رہی تھیں۔ لیکن اُس وقت وہ بڑا ہلکا پن محسوس کر رہی تھی۔

"دفتر کے کام سے تم اُکتا تو نہ جاتی ہو گی؟" میریا نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"اُکتاتا تو ایک طرف میں تو پاگل ہو جاتی ہوں"۔ اس نے دوبارہ بوجھ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"نجمہ! میرا کہا مانو تو شام کو یہیں چلی آیا کرو، کچھ نہ کچھ وقت تو ہنسی خوشی کٹ جایا کرے گا۔" سمیر مایئے کہا۔

"ہاں میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔"

اُس نے اپنے فیصلہ کو قطعیت بخش دی۔

پھر اُس کی ہر شام ایمبیسیڈر میں گذرنے لگی اور ایک عرصہ تک وہ اپنے بوجھ کو ہلکا محسوس کرتی رہی۔ مگر جلد ہی اس کی طبیعت اکتانے لگی تھی۔ وہ روز ہی دیکھتی تھی کہ لوگ آتے تھے لڑکیوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے تھے وہ اُن کے ساتھ ہال کے فرش پر آرکسٹرا کے آہنگ کے ساتھ ناچ میں مشغول ہو جاتی تھیں۔ اور وہ اُن ادھیڑ عمر عورتوں کے ساتھ گیلری میں بیٹھی اکتایا کرتی تھی اُداسی کرتی تھی۔ جو اپنی گذری ہوئی زندگی کو ان پیکروں میں حسرت کے ساتھ دیکھا کرتی تھیں۔ اس صف میں خود کو دیکھ کر وہ یہ سوچنے کے لئے مجبور ہو گئی تھی کہ کیا اس کو دن بھر کی مشقت اس قدر بوڑھا کر دیتی ہے۔

دوسری شام اُس نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ آئینہ کی مدد سے اپنے خدوخال کو سنوارا۔ اور ایمبیسیڈر کی حدود میں داخل ہو گئی۔ وہ بے چینی کے ساتھ ناچ کے عرشہ کے کنارے چکر کاٹتی رہی۔ آرکسٹرا کے باکس تک کئی بار گئی۔ لیکن ہر آنے والا اُس سے کترا کر کسی اور کی طرف بڑھ جاتا تھا اور وہ اپنی ناکامی پر جھنجھلا کر رہ جاتی تھی۔ اُس نے گیلری پر ایک جھجکتی ہوئی نظر ڈالی اور پھر اور دوسرے باکسوں کی طرف دیکھا۔ اور اس کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ اب وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ ناچ برابر ہو رہا تھا اور وہ اکیلی کھڑی تھی۔ پھر ایک ادھیڑ عمر کا شخص داخل ہوا اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اُسے کوئی بھی ناچ میں حصّہ لینے والا نظر نہ آیا۔ اب اُس نے جھجکتے ہوئے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اُسے شاید خوف تھا کہ آج بھی وہ ہمیشہ کی طرح نہ نہ انکار کر دے گی۔ مگر وہ سرعت کے ساتھ اس کے ساتھ ناچ کے عرشہ میں اتر گئی۔ اور پھر جس جوڑے کے پاس سے وہ گذرتی رہی وہ تعجب سے اُس کی طرف دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔ پھر اُس نے کئی پھیروں میں حصّہ لیا اور جب کسے ہوئے جوتوں میں اس کا پنجہ دُکھنے لگا تو وہ واپس چلی آئی۔ اُس روز اُسے بڑی مسرت سی محسوس ہو رہی تھی۔

صبح جب اُس نے آئینہ میں منہ دیکھا تو پاؤڈر اور سرخی کے دھبے بڑے بڑے نظر آ رہے تھے۔ اُس نے صابن سے رگڑ رگڑ کر انھیں چھڑا ڈالا اور پھر آئینہ میں دیکھا مگر اب اُسے وہ بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ اُس نے دوبارہ میک اَپ کیا اور دفتر کی تیاریوں میں مشغول ہو گئی۔

جب وہ دفتر پہونچی تو اُس نے اُٹھنے والی نگاہوں میں بڑا استعجاب دیکھا اور ہونے والی مخصوص بھنبھناہٹ بھی کافی بلند ہو چکی تھی۔ مگر اس نے پرواہ کی اور اپنے کام میں لگ گئی۔ مگر بار بار کے افسر کے بلاوے کی وجہ سے وہ روز کے مقابلے میں کچھ بھی کام نہ کر سکی۔

لیکن اس طرح صبح و شام کی متضاد زندگیاں گذارتے ہوئے جیسے اب وہ بالکل اکتا چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بہت جلد اس کی یہ گاڑی کسی بہت بڑی خندق میں گر جائے گی اور پھر کسی کے بس کا نہ رہے گا کہ اُسے اس سے نجات دلا سکے۔ اس لئے اُس نے ڈیڈی کی بات مان لی اور اپنی زندگی ایک جیون ساتھی کے ساتھ گذارنے کے لئے تیار ہو گئی۔

یہ زندگی اُس کے لئے بالکل نئی تھی۔ دفتر سے اُس نے طویل چھٹی لے لی تھی اور ڈیڈی کے گھر سے اُٹھکر اپنے شوہر کے گھر چلی گئی تھی۔ دن بھر کی ایک کام اپنے ہاتھ سے کرنے میں اُسے بڑا لطف آتا تھا۔ مگر دس پندرہ دن کے بعد ہی اُس کی طبیعت اس سے بھر گئی۔ وہ سوچنے لگی تھی کہ میں ایسے ذلیل کام کروں۔ مجھے ان کاموں سے کیا نسبت۔

اس کی طویل چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ صرف دو چار دنوں میں ہی اُسے دفتر میں حاضری دینی تھی۔ شادی سے پہلے وہ اس تذبذب میں مبتلا ہو گئی تھی کہ میں ملازمت کروں یا نہ کروں۔ لیکن ان چند دنوں کی مصروفیات نے اُس پر ظاہر کر دیا تھا کہ شوہر کے چلے جانے کے بعد دن بھر وہ بیکار ہی رہا کرے گی اور پھر اس کی طبیعت اکتایا کرے گی۔ اس لئے اس نے اپنی ملازمت جاری رکھنا ہی پسند کیا۔

اُس کے شوہر نے بہت اصرار کیا۔

"تم کو اب چاکری کرنے سے فائدہ بھی کیا ہے۔ میں غریب نہیں کھانے پینے بھر کا میں ہی کما کر پیدا کر لیتا ہوں۔ چھوڑو مارو گولی اس ملازمت کو۔ تمہاری وجہ سے کسی بے روزگار کا ہی بھلا ہو جائے گا۔"

مگر وہ نہ مانی۔

"میں تنخواہ کے لئے ملازمت کب کرنا چاہتی ہوں، مجھے تو دن بھر بیکار پڑے رہنا عذاب ہو جائے گا۔ اس واسطے وہیں مشغول رہوں تو کیا بُرا ہے۔"

اُس نے اور بھی زور دے کر سمجھایا۔

"تو کوئی اور مشغلہ تلاش کر لو۔ کیا ضروری ہے کہ دفتر ہی کی خاک چھانو۔"

مگر وہ اُس کی بات پر دھیان دینے کے لئے تیار نہ تھی۔

"میں کہتی ہوں اس میں ہرج ہی کیا ہے۔"

اور اس کا شوہر مجبوراً خاموش ہو گیا۔

اور وہ شادی کے بعد دوبارہ فائلوں کے ڈگمگاتے، بوسیدہ۔ بے ہنگم۔

مینار کو اپنے قلم کے قدموں سے ناپنے کی مشق کرنے لگی۔ پہلے وہ اُکتا جاتی تھی وہ یہاں بھی دلچسپیاں تلاش کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ اُسے یہاں کے ماحول میں بھی یونین ہال سے لیکر اسپورٹس پولین تک کے گھنے درختوں کے سایہ کی تلاش رہا کرتی تھی۔ مگر اب وہ پہلے سے بھی زیادہ دن کے ایک طویل عرصہ کو اس مصروفیت میں گزارنا چاہتی تھی۔ البتہ شام کے وقت ایمبیسیڈر رکا چکر اُس کے لئے کچھ ناگزیر سا تھا۔ وہاں کا وہ جانا پہچانا ماحول اور ڈانس ہال کے آرکسٹرا کی گونج نظر انداز کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ گھر کی چار دیواریوں میں وہ شاید ایک طرح کی قید محسوس کرتی تھی اِس لئے وہ اپنے شوہر کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لے جایا کرتی تھی۔ اور اگر وہ جانے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا تو وہ اکیلی ہی چلی جاتی تھی۔

پھر بہت جلد وہ اپنی ازدواجی زندگی کی اس منزل کو طے کر گئی۔ جب ایک بیوی ماں بن جاتی ہے۔ مگر یہ ماں بننا اُسے کچھ زیادہ پسند نہیں تھا۔ کتنے ہی دن اُسے دفتر سے چھٹی لینی پڑی تھی اور کتنے ہی دن وہ ایمبیسیڈر رجانے سے بھی محروم رہی تھی۔ اُسے صرف گھر کی چار دیواریوں میں پڑے ہوئے چھوٹے موٹے کام کرنے پڑے تھے۔ انھیں میں اپنے آپ کو مشغول رکھنا پڑا تھا۔ بیکار ایک اُلجھن اور اکتاہٹ اس پر مسلط رہی تھی۔ اور اب جب وہ اس بوجھ سے ہلکی ہوئی تھی تو ایک طرف مامتا تھی اور دوسری طرف دفتر اور ایمبیسیڈر را — مامتا وہ سمجھ رہی تھی کہ کسی وقت بھی پوری کی جا سکتی ہے لیکن ان دلچسپیوں کو ترک کر دینا گویا اپنے آپ کو بالکل بوڑھا ثابت کر دینے کے مترادف تھا۔ اور وہ اس کے لئے قطعاً تیار نہیں تھی۔ اس فرض کی ادائیگی کے بعد اس نے دوبارہ شوہر سے صدر کر کے اپنی ملازمت کے سلسلہ کو جاری رکھنا مناسب سمجھا اور بچہ کو ملازمہ کے سپرد کر دینے میں کوئی قباحت محسوس نہ کی۔

لیکن اب اُس کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اُس کی مصروفیات دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہیں اور اس کے تمام افعال اتنے مشینی ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ وہ ایک سکنڈ کے لئے بھی خالی نہیں رہ پاتی تھی۔ دفتر، کلب۔ گھر۔ شوہر اور بچہ یہ سب اس کے لئے اتنی ناگزیر تھیں کہ وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف سے بھی بے پروا نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر وہ دیکھ رہی تھی یہ کڑیاں کافی عرصہ تک ایک میں پروئی نہیں رہ سکتی ہیں ان کا کھنچاؤ دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے اور وہ وقت جلد آنے والا ہے جب یہ سب منتشر ہو جائیں گی۔

اور آخر کار اُس کے شوہر نے ایک دن اُس کو ٹوک دیا۔

"آخر کچھ گھر کی بھی فکر کرو۔ بچہ کی طرف بھی توجہ دو نہ معلوم کیسے پل رہا ہے کیسے لوگوں کی عادتیں سیکھے گا۔ رہ گیا میں تو میرا کیا ہے۔ میری طرف سے تو تم اوّل دن سے ہی بے اعتنا ہو۔"

یہ وار کچھ اتنا کاری پڑا کہ وہ تلملا اُٹھی اور دل سے قائل ہوتے ہوئے بھی اُس سے اُلجھ پڑی۔

"نہ معلوم آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ کہئے تو میں بھی ان ملازماؤں کی سی بن کر رہوں۔"

"میں کب کہتا ہوں تم ملازمہ بنکر رہو۔ تم خود ہی غیروں تک کی ملازمہ بنی پھر رہی ہو۔"

یہ کہہ کر وہ جھنجھلایا ہوا سا چلا گیا۔

اور وہ اپنے تمام کاموں میں ایک کوفت سی محسوس کرتی رہی۔ عجب چڑچڑاپن سا وہ اپنے آپ میں محسوس کرتی رہی اور ہر چیز اُسے بے کیف سی نظر آتی رہی۔ شام کو ایمبیسیڈر میں بھی وہ کوئی لطف نہ حاصل کر سکی اُسے وہاں بھی آرکسٹرا بڑی غم انگیز سی لے چھیڑتا ہوا محسوس ہوا جیسے آندھیوں اور طوفان کی سیٹیوں کا امتزاج ہو۔

واپسی پر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُس کا بدن بڑا بوجھل سا ہو رہا تھا اور سارے اعصاب جیسے ٹوٹ سے رہے تھے۔ اُس نے اپنے آپ کو گرا دیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں لیکن اتنے میں ملازمہ روتے ہوئے بچہ کو لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اور وہ اُس پر بُری طرح چیخ پڑی۔

"بیچ دو موذی کو، ایک منٹ بھی چین نصیب نہیں۔ لے جاؤ دور ہو میرے پاس سے ——"

اور ملازمہ سہمی ہوئی بچہ کو لے کر چلی گئی۔

صبح اس کی پیشانی بخار سے تپ رہی تھی۔ اور وہ عجب ہذیانی کیفیت میں تک رہی تھی چیخ رہی تھی۔ اس کے شوہر نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا۔ اور علاج شروع ہو گیا۔

مگر بیماری کا سلسلہ بھی اتنا ہی طویل ہوتا چلا گیا۔ اس کی ماں بھی اس کی تیمارداری کے لئے چلی آئی تھی۔ اور وہ بستر پر پڑے ہوئے دیکھا کرتی تھی کہ اس کی ماں کس طرح اس کے لئے پریشان رہا کرتی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی رہتی تھیں اور وہ دعا کرتی رہتی تھی کہ اس کی بچی اچھی ہو جائے۔ وہ رات رات بھر اس کی وجہ سے جاگتی رہتی تھی اور ڈاکٹر کے آنے پر پہروں اُسے پریشان کرتی رہتی تھی۔ اُس سے عجب لایعنی باتیں پوچھا کرتی تھی۔ اور وہ خود لیٹی ہوئی اس سے لطف لیا کرتی تھی۔ اُس نے اس بیماری کے زمانہ میں کئی بار

اپنی ماں سے ضد بھی کی تھی اُس سے رُوٹھی بھی تھی اور ایسا کرنے میں اُسے کتنا لطف حاصل ہوا تھا۔

اب وہ رفتہ رفتہ اچھی ہو رہی تھی اور پہلے کی طرح گھر کے چھوٹے چھوٹے کام خود ہی کرنے لگی تھی۔ اور سب کے منع کرنے کے باوجود بھی وہ بستر پر پڑے رہنا پسند نہ کرتی تھی۔ اور جب وہ کچھ اور سنبھل گئی تو وہ اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ اپنی ماں کے گھر چلی گئی۔ اُس نے دیکھا وہاں کی فضا اب بھی ویسی ہی تھی جیسی وہ کچھ سال پہلے چھوڑ کر آئی تھی۔ اُس کا کمرہ اب بھی اُسی طرح آراستہ تھا اور اُس کی چیزیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ اُس کے شوہر نے اُس کی ماں سے پوچھا۔

"یہ کس کی چیزیں ہیں سب؟"

"میری بچی کی" اُس کی ماں نے بڑے پیار سے جواب دیا۔

اور وہ چونک اٹھی کیا اُس کی ماں کی بچی اُس سے الگ بھی کوئی ہے۔

صبح جب وہ اپنے شوہر کے لئے چائے لے کر داخل ہوئی تو کیتھڈرل کے گھڑیال نے سات بجائے۔ اُس نے نظر اٹھا کر دریچے سے گھڑیال کی طرف دیکھا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے جس آسودگی کی تلاش میں وہ اب تک سرگرداں رہی تھی وہ خود ہی ایک تشنگی تھی۔

"اب میں نے ملازمت کا ارادہ ترک کر دیا ہے"

اس نے اپنے شوہر کو چائے دیتے ہوئے کہا۔

شاعر! تمہارے گیت

بقیہ صـ۵۳

ابھی وقت باقی ہے — خدارا ملک و ملت کو بیدار کرنے کے لئے خود بھی بیدار ہو جاؤ — کیونکہ تمہارے ہاتھوں میں دنیا کی فنا و بقا کا سوال ہے —! تم اپنے جادو بھرے اشعار کے ذریعہ ایک نئی رُوح پھونک سکتے ہو — اِنیا ولولہ و نیا جوش پیدا کر سکتے ہو — جلدی کرو شاعر — ورنہ ملت بیضا کا شیرازہ بکھر جائے گا — اِملک نیست و نابود ہو جائے گا — آزادی سلب ہو جائے گی — غلامی کا طوق پھر سے گلے میں پڑ جائے گا۔ — نام و نشان تک مٹ جائے گا — !!! اچھے شاعر — حقیقی محبت اور عشق صادق کو اپنا نصب العین بناؤ — مئے حق کے نشہ میں اپنے متوالوں کو سرشار کرو — پھر دیکھو یہ نشہ کتنا سحر آفریں ہوتا ہے — جس کی خاصیت مدہوش کرنا نہیں — بلکہ جھنجوڑ کر بیدار کرنا ہے — !! توڑ دو اِن جام و مینا کو — ارباب و بربط کے تاروں کو شکستہ کر دو — اِن پازیب کی جھم جھم سے غافل ہو جاؤ — آگ لگا دو اِن میخانوں کو — اُڑا دو اس سرمایہ دارانہ نظام کو — اِمٹا دو ہر دنیاوی امتیاز کو — اِبھلا دو خوابوں کے حسین جزیروں کو — ہر اُونچ نیچ — بلندی، پستی — نشیب و فراز — کو ہموار کر دو — اور — اور — اے محبوب شاعر —!

"یقین محکم، اتحاد، اور تنظیم" کے علمبردار پرچم ہاتھوں میں لیکر — کائنات پر فتح و نصرت کے بادل بنکر چھا جاؤ — !!!

کیونکہ — "یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں"

تنقید نمبر کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کیجئے — آپ کی لاپرواہی میں اس کی موجودگی ایک نہایت اہم اضافہ ہو گا۔
(مینیجر)

اقبال احمد انصاری

دو راہیں

نجمہ زندگی کی اس منزل پر پہنچ چکی تھی جب عنقریب اس کا دامن ایک رفیق سے بندھ جانے والا تھا ـــــ اس کی آیندہ ساری زندگی کا رفیقِ حیات ـــــ ! اس کے والدین یعنی پروفیسر حامد حسن اور اس کی امّی کی متجسّس نگاہیں شمیم اور خالد پر مرکوز ہو گئی تھیں۔

نجمہ کے ذہن بلکہ اس کے سارے وجود پر صرف دو نقوش ابھر آئے تھے ـــــ شمیم اور خالد ـــــ خالد اور شمیم۔

شمیم ایک تندرست و خوش رُو اور تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ بی۔ اے کے آخری سال کا طالب علم ایک دولت مند گھرانے کا چشم و چراغ۔ تہذیب جدید سے متاثر ہونے کے باوجود اس کا کردار کالج کے دوسرے طلباء میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ دوسرے مغرب زدہ لڑکوں کی طرح آزادی کے دھارے میں بہا نہیں جا رہا تھا۔

خالد بھی جواں سال تھا لیکن زندگی کی شاہراہ پر بے یار و مددگار۔ والدین کا سایہ اٹھ چکا تھا صرف ایک بہن زندہ تھی جس کی ذات میں والدین کی ساری محبتیں اور شفقتیں مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔ بی۔ اے میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس کی ذہانت و علمی لیاقت اور محنت کشی اس کے تمام اخراجات کی ضامن تھی۔ اسکول کی زندگی سے لیکر کالج کی جماعتوں تک یکساں ممتاز حیثیت کا حامل تھا۔ اس کے تعلیمی کیریر سے متاثر ہو کر اہلِ نظر اس کی قدر کرتے۔ ان صفات سے مزین ہونے کے علاوہ ایک بہترین کردار کا حامل تھا۔ یُوں تو جدید تہذیب سے متاثر کالج کے نوجوانوں کے لئے اس کے کردار میں کوئی خاص کشش یا جاذبیت نہ تھی۔ لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت تھی کہ اپنے عمدہ اخلاق و کردار کی وجہ سے اس کے تمام ملنے والے اس کے گرویدہ تھے۔

اس نے شمیم و خالد میں سے کسی کو کبھی دیکھا تو نہ تھا لیکن اس کے ذہن کے پردہ پر باری باری دونوں کا ہیولیٰ بنتا۔ وہ ان کی صفات کی روشنی میں ان کا تصور قائم کرنے کی کوشش کرتی کبھی شمیم نمایاں ہوتا اور کبھی خالد ـــــ پھر دونوں ہیولے تیزی سے بننے اور مٹنے لگے ایک کے بعد دوسرے۔ اتنی تیزی کے ساتھ کہ ایک دوسرے سے مل جاتے ـــ اور وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکتی ـــــ شمیم یا خالد ـــــ خالد یا شمیم!

شمیم کو وہ اپنا رفیقِ حیات بنا لیتی اس لئے کہ وہ ایک دولتمند باپ کا لڑکا تھا جدید تہذیب اور اعلیٰ تعلیم کے نور سے درخشاں ـــــ لیکن خالد کے کردار میں بھی وہ ایسی جاذبیت محسوس کرتی کہ اسے اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی۔ وہ بھی ایک تعلیم یافتہ لڑکا تھی لیکن سنجیدہ اور دُور اندیش بھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اپنا رفیقِ حیات ایسے شخص کو بنائے جس پر وہ خود پورا اعتماد کر چکی ہوتا کہ اس کی رفاقت میں وہ خود کو غیر مشروط طور پر دیدے۔ شمیم کے کردار میں پختگی ضرور نمایاں ہوتی تھی لیکن ایسے افراد کو پھسلتے بھی اس نے دیکھا تھا ـــــ کتابوں میں بھی اور کانوں سے سنے واقعات میں بھی ـــــ خالد ذہین اور خلیق و باکردار ضرور تھا لیکن ایسے ذہینوں کو اس نے مغرور اور خود نما بھی پایا تھا۔

ـــــ انتخاب کے لئے وہ خود مطمئن ہونا ضروری سمجھتی تھی۔

اسی ادھیڑ بُن میں اس کا کافی وقت صرف ہو گیا لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی اور دوسرے کاموں میں مشغول ہو گئی لیکن ماں کے اصرار پر اسے صورتِ حال اس کے سامنے رکھ دینی ہی پڑی۔ اسے اپنی شادی کے متعلق ماں سے گفتگو کرتے میں شرم تو بہت محسوس ہو رہی تھی لیکن مسئلہ کی اہمیت اور سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے ـــــ جبکہ مسئلہ کا تعلق براہِ راست خود اس کی اپنی ذات اور اپنی زندگی سے تھا ـــــ اس نے حیا کے دائرہ کو وسعت دیتے ہوئے ماں سے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنے ہونے والے رفیقِ زندگی کو کن صفات سے مزین دیکھنا چاہتی ہے۔ اور اس پر وہ خود بھی مطمئن ہونا چاہتی ہے۔ اس کی ماں کا رجحان شروع ہی سے شمیم کی طرف تھا۔ اس نے بیٹی نجمہ کے سامنے اس کی تعریفوں کے پُل باندھ کر رکھ دیئے۔ اور اسے اس بات کی ترغیب دیتی رہی کہ وہ شمیم سے شادی کرلے۔ اس نے ماں کو جواب دیا کہ وہ فیصلہ غیر جانب دار ہو کر

کرنا چاہتی ہے۔ "میں ایک اچھے انسان کو فرض شناش اور حسبِ موقعہ اپنی محبوب اور پسندیدہ چیزوں کو قربان کر کے حق اور فرض کے تقاضے پورا کرنے والا دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہ میرے نزدیک اچھے اور قابلِ اعتبار کردار کی بہترین کسوٹی ہے۔" نجمہ نے اظہار خیال کیا۔ ماں کے لئے بیٹی کی دوٹوک اور مدلل باتوں کو مانے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ اس نے بیٹی کے ارادہ سے اس کے باپ پروفیسر حامد حسن کو آگاہ کر دیا۔

ماں سے جدا ہو کر جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو سب سے پہلے اس نے نرم تولئے سے پسینہ پونچھا۔ "ان برقی پنکھے کی ہوا کے باوجود وہ بات کرنے میں پسینہ سے کس قدر شرابور ہو گئی تھیں"۔ اس نے ہلکے ہیجہ میں کہا۔

پروفیسر صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے "میری بیٹی کتنی لائق اور دور اندیش ہے"۔ اور اس پر دل ہی دل میں مسرور ہو رہے تھے۔ اتنے میں وہ قلم کاغذ اٹھا کر لکھنے میں مشغول ہو گئے۔ انہوں نے اگلے روز شام کو شادی کے متعلق اپنی لڑکی سے انٹرویو کے لئے شمیم کو ایک دعوتی رقعہ لکھا اور شادی ہی کے متعلق ایک دعوت نامہ خالد کو بھی لکھا لیکن دونوں کی تحریر میں نمایاں فرق تھا۔ خالد کے رقعہ میں انٹرویو کا کوئی ذکر بھی نہ تھا۔ دونوں کو ایک ہی وقت مغرب بعد سات بجے بلایا تھا۔ پھر ایک پوسٹ کارڈ اٹھا کر خالد کے بہنوئی کی طرف سے اس کو ایک خط لکھا کہ تمہاری بہن جو عرصہ سے علیل تھیں ان کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔ اس لئے جلد یہاں آجاؤ۔ ایک فارم اٹھا کر بالکل ڈاک خانہ والوں کے انداز میں ایک برقیہ شمیم کے نام تحریر کیا کہ تمہاری والدہ کی حالت یک بہ یک بہت خراب ہو گئی ہے۔ وہ تمہیں یاد کر رہی ہیں۔ جلد سے جلد آنے کی کوشش کرو۔

صبح کا وقت تھا شمیم و خالد دونوں اپنے اپنے مکان پر موجود تھے۔ ملازم دونوں کو دعوتی رقعے دے آیا۔ اس نے ان سے جواب بھی طلب کر لئے۔ شمیم نے لکھ دیا کہ ضرور وقت مقررہ پر حاضر ہوں گا۔ خالد نے بھی لکھ دیا انشاء اللہ ضرور حاضر خدمت ہوں گا۔ دوسرے دن پروفیسر صاحب کالج نہیں گئے۔ خالد کے نام لکھے ہوئے پوسٹ کارڈ پر دو ہلکی ہلکی مہر لگا کر دوپہر میں ملازم سے اس کے کمرے میں جنگلہ کے راستے چھوڑوا دیا۔ اور شمیم کے ملازم کو بلوا بھیجا۔ جب وہ آیا تو شمیم کے نام لکھا ہوا برقیہ دیدیا۔ اور اسے یہ سکھا دیا کہ جب شمیم آئے تو یہ کاغذ دیدینا۔ اور اس سے کہنا کہ ڈاکیہ یہ تار دے گیا ہے۔ اگر وہ دریافت کرے کہ اسے کس نے کھولکر نکالا۔ تو کہہ دینا "بابو جی ہم تار کا نام سن کر بہت پریشان ہو گئے تھے اور جب معلوم ہوا کہ آپ کے گھر سے آیا ہے تو میں نے پڑوس میں ایک صاحب سے پڑھوا کر سنا۔ بابو جی اس میں لکھا ہے کہ آپ کی امی جان بہت بیمار ہیں۔ اور آپ کو بلایا ہے"۔

شمیم کا ملازم بہت ہچکچا رہا تھا کیونکہ وہ ایک دیانت دار شخص تھا اور جھوٹ موٹ اپنے مالک کو پریشان کرنا اچھا نہیں سمجھتا تھا لیکن پروفیسر صاحب نے اسے سمجھایا کہ یہ بات ایک مصلحت کی بنا پر کی جا رہی ہے۔ اس میں شمیم کا نقصان نہیں اور وہ زیادہ دیر پریشان نہ ہوگا۔ جلد اسے حقیقت حال سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ ملازم پروفیسر صاحب سے واقف تھا وہ ان کی بات سے مطمئن ہو گیا اور چلا گیا۔

خالد جب کالج سے واپس ہوا تو اس کی نگاہ کارڈ پر پڑی۔ فوراً اس نے اسے اٹھایا اور پڑھنے لگا۔ خط پڑھکر وہ مبہوت سا ہو گیا۔ اس کی عزیز بہن کا بیمار چہرہ اس کے تصور میں ابھر آیا۔ وہ مضطرب تھا۔ اور ایک کشمکش میں مبتلا تھا۔ ایک شدید الجھن چالیس روپئے . . . . . فائنل امتحان کی فیس . . . . . اور ۲۵ ہی آخری تاریخ . . . . آپا کے پاس چلا جاؤں . . . . . کانپور تک لمبا سفر . . . . . امتحان کی فیس . . . . اُف کیا کروں" اسے اپنی بہن بھی بہت عزیز تھی اور اپنی ایک تعلیمی سال کی محنت بھی۔ وہ چارپائی پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ اور کوئی حل تلاش کرنے لگا کہ اتنے میں اس کے کانوں میں مؤذن کی آواز پہنچی۔ اس نے دیکھا عصر کا وقت ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے قدم حرکت میں نہیں آئے۔ آج وہ اپنے کو عصر کی نماز قضا کر دینے میں حق بجانب سمجھ رہا تھا۔ اُسے خیال آیا۔ "چلو اللہ میاں بھی معاف کر دیں گے . . . . " لیکن پھر وہ یک بہ یک اٹھ بیٹھا جیسے اس کے کان میں کسی نے کہہ دیا ہو "نماز تو پریشانی کے بجائے طمانیت حاصل کرنے میں بہترین مددگار ہوتی ہے" اور وہ مسجد کو چلا گیا۔ نماز کے بعد وہ واقعی قلب میں بہت طمانیت محسوس کر رہا تھا۔ وہ پُر اطمینان لہجہ میں قدم بڑھاتا آیا۔ اور پھر چارپائی پر لیٹ گیا۔ خیالات اپنی فطری رفتار سے اس کے ذہن میں آنے لگے۔ "امتحان! . . . . آپا کی شدید علالت . . . . آپا کی زندگی مجھے زیادہ عزیز ہے . . . . ہماری زندگی ایک امتحان ہے۔ آزمائش! . . . . آپا کی زندگی اس امتحان سے زیادہ قیمتی ہے . . . " یہ فیصلہ تھا اس کا آخری فیصلہ۔ اس کے بعد اس کے لئے ایک نیا مرحلہ یہ بھی تھا کہ پہلی ٹرین سات بجکر بیس منٹ پر چھوٹتی ہے اور دوسری رات کے تین بجے۔ اسے سات ہی بجے پروفیسر صاحب کے وہاں بھی جانا تھا۔ پھر خیالات کچھ تیز رفتار سے آنے لگے۔

"وعدہ خلافی ہوگی . . . . ان سے مل لوں . . . . لیکن بہت دیر ہو جائے گی . . . . پھر تین ہی بجے کی گاڑی سے جانا پڑے گا ——— اتنی تاخیر! خدا معلوم آپا کی حالت کیسی ہو" اس نے یہ طے کیا کہ پہلی ٹرین سے چلا جاؤں اور پروفیسر صاحب کو کسی کے ہاتھ ایک خط بھیج دوں۔ میری مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے وہ مجھے ضرور معاف کر دیں گے۔ اور فیس کا بھی تدارک کر دوں۔ شاید وہ مجھے اتنے

روپئے یا کسی فی قرض دیدیں گے۔ پروفیسر صاحب بہت نیک آدمی ہیں۔

نسیم جب کالج سے واپس ہوا تو اسے ملازم سے تار ملا۔ تار کی عبارت پڑھکر وہ بہت گھبرایا۔ اس نے ملازم سے کچھ دریافت بھی نہیں کیا۔ بلکہ خود ہی بولا۔ "نذیر۔ میری امی کی طبیعت بہت خراب ہے انھوں نے مجھے بلایا ہے"۔ ملازم نے اس سے یہ بات سُن کر کہا۔ "ہاں بابو آپ ضرور جائیے۔ بہت جلدی کیجئے۔ کہئے تو میں آپ کا سامان ٹھیک کردوں . . . "لیکن نسیم نذیر کی باتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ وہ کسی دوسرے خیال میں ڈوبا تھا۔ وہ کالج سے جب چلا تھا تو بہت موڈ میں تھا بلکہ کالج کے اکثر گھنٹوں میں روز سے زیادہ بشاش تھا وہ آج کے انٹرویو کے متعلق کتنا مسرور تھا اور کتنے ہوائی قلعے بنا چکا تھا۔ برقیہ اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کے ٹیڑھے میڑھے الفاظ اتنے موٹے اور ضخیم ہوتے جارہے تھے کہ جیسے وہ اس کے تیار کردہ ہوائی قلعے کو مسمار کردیں گے . . . . . !

اس کے اندر دن سے یہ آواز آرہی تھی کہ ماں کی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے اسے اس کے پاس پہنچنے میں تھوڑی بھی تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔ ورنہ اس وقت کی معمولی سی کوتاہی ہوسکتا ہے کہ ایک بڑی غلطی کا پیش خیمہ بن جائے۔ جس کے لئے اسے ساری زندگی افسوس کرنا پڑے ۔ اس نے تار کی تحریر کو دو بار دہرا پڑھا . . . حروف کی سیاہ لکیریں اس کی بوڑھی ماں کی تصویر میں تبدیل ہوگئیں۔ پھر اس کے نقوش نمایاں تر ہوتے گئے۔ وہی کاغذ بستور اس کے ہاتھ میں تھا . . . ٹیڑھے میڑھے حروف سے ایک اور بھیانک بن رہا تھا جو ہوائی قلعہ کا تصور تھا۔ کیا اس واقعہ کو ہاتھ سے جانے دوگے؟

پروفیسر حامد حسن کی لڑکی . . . انٹرویو!" اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی یہ باتیں اس کے کان میں پھونک رہا ہو جسے سُنی اَن سُنی کرکے وہ سوچنے لگا "میں وعدہ کرچکا ہوں۔ ملنا ضروری ہے ——— ماں کی طبیعت کوئی ایسی خراب تو نہیں ہوگئی ہوگی۔ دو اور دیر سے پہنچنے میں کوئی حرج نہیں . . . . . ہاں۔ ہاں میں پروفیسر صاحب کے یہاں ضرور جاؤں گا۔ نجمہ مجسم انتظار بنی میری راہ دیکھتی ہوگی . . . . شاید یہ ملاقات ہماری محبت کا آغاز بنے . . . . . اگر میں نہ گیا تو وہ بیحد مایوس ہوجائے گی ——— اور یہ میری وجہ سے ہوگا . . . . . اسے مغموم کردینا کتنا بڑا ظلم ہوگا! نہیں مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔"

اس نے دوسرے دن جانے کا فیصلہ کرلیا۔

پروفیسر صاحب اپنے کارنامے کا نتیجہ معلوم کرنے کیلئے بیچین بیٹھے انتظار کررہے تھے! ان کو ایک لڑکے نے خالد کا رقعہ لاکر دیا جسے پڑھکر وہ رقعہ انھوں نے نجمہ کو بھیج دیا۔ اسٹیشن پر پروفیسر صاحب کے آدمی موجود تھے۔ نجمہ نے فون پر ان سے کہہ دیا کہ خالد کو یہ کہہ کر روک لو کہ اس کی بہن کی علالت کا خط فرضی تھا چند منٹ بعد گھڑیال نے ٹن ٹن سات گھنٹیاں بجائیں اور گھنٹیوں کے درمیان نسیم کی موٹر سائیکل پھٹپھٹاتی ہوئی پروفیسر کے مکان پر رکی۔ نسیم بہترین سوٹ میں ملبوس پروفیسر کے سامنے حاضر تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک لطیف مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

پروفیسر کے آدمی خالد کو لیکر اس وقت مکان پر پہنچے جب نسیم وہاں سے جاچکا تھا۔ نجمہ نے خالد کو اپنا رفیقِ حیات منتخب کرلیا تھا۔

ہمارا اشاعتی پروگرام

(۱) ابوالمجاہد زاہد صاحب کا مجموعہ کلام ——— (تگ و تاز)
(۲) طاہر فیضانی صاحب کے افسانوں کا نیا مجموعہ۔
(۳) درست اردو (جدید ایڈیشن) مؤلفہ طاہر فیضانی رامپوری۔
(۴) ابنِ فرید کے افسانوں کا مجموعہ۔
(۵) تنقیدی مقالات کا ایک مجموعہ کتابی صورت میں۔

اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے مکتبہ کی کتابیں زیادہ سے زیادہ خریدیئے

منیجر مکتبہ معیار میرٹھ

مُسرّت الحسن رضوی

رہبر

اپنی منزل پہ تھوڑی دیر قیام کرنے کے بعد میں باہر نکل آیا اور لگام بگام ٹہلتا ہوا کچھ دُور جا نکلا۔

"منزل تو خیر پرانی ہے لیکن مسافر نیا" میں نے سوچا اور پلٹ کر منزل کی طرف دیکھا۔

"ابھی اس کے گنبد اور مینار نظر آ رہے ہیں" میرے نفس نے مجھے دھوکا دیا اور اِس حسین فضا کی سحر انگیز رعنائیوں نے جو رنگ و نور کے ساغر چھلکا چھلکا کر مستی و سرور کے چشمے بہا رہی تھیں مجھے مجبور کیا کہ چند قدم اور آگے بڑھوں۔ اور میں انہیں ہوش و خرد شکار نظاروں میں کھویا ہوا چلتا رہا ـــــ چلتا رہا ـــــ یہاں تک کہ بہت دُور نکل آیا ـــــ پھر یکایک خیال آیا "منزل" ہے اور اس بار جو پلٹ کر دیکھا تو منزل حدِ نگاہ سے باہر ہو چکی تھی۔ دماغ سُن سے رہ گیا۔ اور میں الٹے پاؤں واپس ہوا لیکن ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ فضا مکدّر ہونی شروع ہوئی۔ ہوا میں تیزی و تُندی پیدا ہو گئی اور ساری فضا سائیں سائیں کی بھیانک آواز سے ڈراؤنی بن گئی۔ آسمان پر کالے کالے دیو نما بادل چھا گئے اور دنیا تیرہ و تار ہو کر رہ گئی "میرے معبود" میں چیخ اٹھا ـ منہ زور ہواؤں کے تیز و تند جھونکوں اور ہر چہار سمت پھیلے ہوئے گرد و غبار کی یورشوں نے میرے تھکے ماندے پیروں کو آگے بڑھنے سے روک دیا ـــــ لیکن اُن پاک جذبات کو نہ روک سکیں جو مجھے منزل پر پہونچ جانے کے لئے بے چین کئے دیتی تھیں ـــــ اور آخر میں چل پڑا ـــــ ابھی تھوڑی ہی دُور گیا ہو گا کہ یک بیک بادل گرجے اور خشمگین سوز بجلیاں کوندنے لگیں۔ بجلیوں کی چمک نے آنکھوں کو چکا چوند کر دیا۔ اور بادلوں کی گرج سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چٹانوں تک کے جگر پاش پاش ہو جائیں گے۔ یہ ساری فضا کچھ ایسی بھیانک اور ہولناک تھی کہ مجھ محسوس ہوا جیسے عذاب کا ظالم دیوتا۔ اپنی تمام قہر سامانیوں کے ساتھ دنیا کو ہلاک کرنے پر آمادہ ہے۔ "الاماں!" میں چیخ پڑا اور بجلیوں کی لمحاتی چمک میں جو میں نے اوپر نگاہ اٹھائی تو ایسا معلوم ہوا جیسے اس وقت سارے جہان پر سیاہی شب مسلط ہو۔ "رات آ گئی" میں نے سوچا اور اس خیال سے سارے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی ـــــ "رہبر رہبر" میری زبان سے بے اختیار نکلا اور اس بار بجلی بڑے زور سے کوندی اور ساتھ ہی کچھ انسانی آوازیں بھی میرے کانوں میں آئے لیکن۔ لیکن وہ اس قدر خلط ملط تھیں کہ کوئی آواز صاف سنائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے آنکھوں پر زور ڈال کر جو اِدھر اُدھر دیکھا تو خود کو ایک ایسی پگڈنڈی پر پایا جس کے دونوں کناروں پر بڑے بڑے مہیب غار مجھے ہضم کر جانے کے لئے اپنے دہانے کھولے پڑے تھے۔ یہ تاریک غار خالی نہ تھے بلکہ انہیں بہت سے انسان نما جانور بھی کیڑوں کی طرح رینگ رہے تھے۔ جن کی تعداد بے شمار تھی۔ ان میں سے بعض مجھے اپنی جانب بُلا رہے تھے اور بعض بڑی خیف آوازیں مجھے اپنی راہ پر سیدھا چلے جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میں اپنی جگہ پر حیران کھڑا رہ گیا اور سوچنے لگا کہ اتنی ساری مخلوق آخر اس مہیب کی حالت میں کیوں پڑی ہے؟ کیا یہ بھی میری طرح بھٹک گئے ہیں اور بھٹکتے بھٹکتے پایانِ کار ان مہیب غاروں میں آ پڑے ہیں جہاں سے ان کے نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ اور کیا آخر کار میرا بھی ایسا ہی انجام ہو گا؟ اس خیال سے میرے رُونگٹے کھڑے ہو گئے اور بھٹک کر غار میں گر پڑنے کے خیال نے پیروں کو مَن مَن بھر کا کر دیا ـــــ میں اپنی جگہ پر ساکت و حیران کھڑا تھا اور مایوسی و درماندگی نے میرے دماغ کو ماؤف اور دل کو افسردہ کر دیا تھا ـــــ میں کھڑا تھا ـــــ ایک بت کی طرح ساکت و خاموش، منجمد اور ویران ـــــ اور جانے کب تک اسی طرح کھڑا رہتا اگر یہ آواز میرے کانوں میں نہ گونجتی کہ ـــــ "دنیا کی تمام پریشانیوں اور مصیبتوں کا واحد علاج صرف اس بات پر منحصر ہے کہ۔۔۔۔" میں ابھی یہیں تک سُن سکا تھا کہ یک بیک بادل گرجا اور ہواؤں کے دوش نازک پر کھیلتی ہوئی یہ ہلکی ہلکی صوت شیریں بادلوں کی گرج میں گم ہو کر رہ گئی۔ میں نے ایک ہلکی سی جھرجھری لی اور اپنی تھکی ہوئی لیکن متجسّس نگاہوں کو دُور خلاؤں میں گاڑ دیا۔ اب فضا میں ہلکی ہلکی تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ ہواؤں کی تیزی و تندی کم ہونے لگی تھی

اور گرد و غبار چھٹ رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔ بجلیوں کی لمحاتی چمک نے میری مدد کی اور میں ایک ایسے مقام پر پہونچ گیا جہاں ایک شخص بلندی پر کھڑا کچھ کہہ رہا تھا اور اس کے نیچے ہزاروں انسانوں کا ایک ہجوم حیرت کی تصویر بنا ہوا آنکھیں پھاڑے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی آواز پر کان لگا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"موجودہ نسل کی بیشتر تعداد نکمی اور ناکارہ ہے۔ اس کا وجود دنیا کے لئے خار و خس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور اس کا بار مادر گیتی کے سینہ پر بہت بھاری ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا تمام گندگیوں اور آلائشوں سے پاک ہو جائے۔ اس کی تمام پریشانیاں اور مصیبتیں دور ہو جائیں اور یہ ایک لہلہاتے ہوئے سبزہ زار اور مسکراتے ہوئے باغ و بہار میں تبدیل ہو جائے تو ان خار و خس کے ناپاک وجود کو دنیا سے ناپید کر دو۔ . . . ."

میں نے دیکھا کہ اس کی اس تقریر پر مجمعوں کی طرح جامد ہجوم نے ایک جھرجھری لی اور بعضوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن بول نہ سکے۔ اُن کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اور اس شخص نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ . . . . اور ان کی جگہ چند ایسے مضبوط اور متحکم افراد پیدا کرو جنہیں "فوق البشر" کہتے ہیں ـــــ ہاں فوق البشر ہی ایک ایسا فرد ہے جو دنیا کو اس کی تمام دکھوں سے نجات دلا سکتا ہے۔ اور اسے تاریکی کے غار سے باہر نکال کر اجالے اور روشنی کے گہوارے میں جھولا جھولا سکتا ہے۔ دنیا کو چاہئے کہ اس عظیم تر شخصیت کو خوش آمدید کہنے کے لئے ہمیشہ تیار رہے۔ بلکہ اس طاقتور قوم کی پیدائش کے لئے ہر قسم کی قربانی دے خواہ یہ قربانی لاکھوں اور کروڑوں نکمے انسانوں کا خون ہی کیوں نہ طلب کرے۔"

"اُف یہ جبر و تشدد" میں نے سوچا اور مجھ سے نہ رہا گیا۔ آخر آگے بڑھکر اسے ٹوکتے ہوئے پوچھا۔ "خدا کی پیدا کردہ مخلوق کو اس بیدردی سے فنا کر دینے کا آخر آپ کو کیا حق پہنچتا ہے"؟ اور اس نے جواب دیا۔ "اگر تاریخ عالم پر تم نگاہ کرو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ہر بار ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ایک طاقت ور اپنے سے کمزور کو دبا کر خود مالک بن بیٹھتا ہے۔ اور اس کا اس طرح مالک بن بیٹھنا کچھ غلط نہیں۔ کچھ گناہ نہیں بلکہ عین انصاف ہے اور عین حق ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو دنیا صرف ناکارہ اور نکمے افراد کی ہنگامی ہوئی مخلوق سے بھر جائے اور تمام نظام عالم درہم برہم ہو کر رہ جائے۔"

"کیا یہ بربریت نہیں ہے۔ اور خدا کی بیگناہ مخلوق پر انتہائی ظلم ڈھانا نہیں ہے اور پھر کیا یہ ظلم اپنے ردِ عمل کے طور پر تباہی و بربادی نہ لائے گا۔ تعجب ہے کہ آپ بیدردی اور بیرحمی میں کیسے فلاح انسانیت پاتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"بیرحمی؟ تو تم رحم چاہتے ہو؟" اس نے بڑے تیکھے پن سے جواب دیا۔ "یہ رحم ہی تو ہے جس نے دنیا میں اس قدر تباہی و بربادی پھیلا رکھی ہے۔ جب انسان رحم کرتا ہے تو اس کا زور گھٹ جاتا ہے اور جب اُس کا زور گھٹ جاتا ہے تو وہ نکما اور ناکارہ ہو جاتا ہے، اس کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ اور وہ دنیا کا نظام سنبھال نہیں سکتا۔"

"یا اُس کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں اور جب وہ رحم کرتا ہے تو اس کی طاقت بڑھ جاتی ہے کیونکہ وہ انسانی صفتوں سے گزر کر خدا کی صفتوں کا حامل بن جاتا ہے اور اُس میں وہ رُوحانی طاقت پیدا ہو جاتی ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی مادی طاقت نہیں کر پاتی۔" میں نے جواب دیا۔

"میری رائے میں تو رحم کے اسباب بزدلی اور کمزوری ہیں۔" اُس نے نرم ہوتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ رحم کے اسباب قوت و جوانمردی ہیں۔ بزدل ہمیشہ سفاک اور ظالم ہوتا ہے یہ ایک ابدی حقیقت ہے۔" میں نے کہا۔ اور ساتھ ہی ان مجسموں میں سے ایک بڑی گرجدار آواز میں بول اٹھا۔ "تم ان پر تنقید کرتے ہو؟"

"اور تم ان کو پوجتے ہو۔" میں نے بیزاری سے جواب دیا اور پھیر ٹیوں کے اس ہجوم سے باہر نکل آیا۔

دنیا پر ابھی تک سیاہی شب مسلط تھی۔ بادل ابھی تک گرج رہے تھے اور شمیں سوز بجلیاں ابھی تک کوند رہی تھیں گویا عذاب کا ظالم عفریت ہنوز سرگرم کار تھا۔ "فوق البشر کا تخیل تو اچھا ہے" بے شک بہت لاجواب ـــــ لیکن اس کی جو تشریح کی گئی ہے اس سے فوق البشر کی ایک ایسی بھیانک تصویر سامنے آجاتی ہے جس سے دنیا دکھوں اور مصیبتوں سے نجات پانے کے بجائے اور زیادہ نئی نئی الجھنوں میں پھنس کر رہ جائے گی اور گیسوئے ہستی بجائے سنورنے کے اور زیادہ الجھ جائے گی۔" میں نے سوچا اور انہیں خیالات میں غلطاں و پیچاں بجلیوں کی لمحاتی چمک کے سہارے پگڈنڈی پر چلتا رہا ـــــ چلتا رہا اور اسی طرح میلوں دور نکل آیا۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی تاریک رات بڑا ہی بھیانک منظر پیش کر رہی تھی اور طرح طرح کے خوفناک جانور رونگٹے کھڑے کر دینے والی آوازیں دل و دماغ کو ہلائے دے رہے تھے۔ منزل کے گم ہو جانے کا جانکاہ احساس مجھے رہ رہ کر بہت پریشان کئے دیتا تھا۔ اور اپنے

شوق تماشا اور ذوقِ خرام پر مجھے بہت غصہ آرہا تھا۔ "غفلت کا یہی نتیجہ ہوتا ہے" میرے ضمیر نے مجھ پر طنز کیا اور شدت احساس ندامت سے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا ——— اب بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی چمک میں کمی پیدا ہونی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اب میں ایک ایسی جگہ پر چل رہا تھا جہاں سے حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا ایک بڑا سا چٹیل میدان پڑا تھا۔ میں بہت خوش ہوا اور اپنے تھکے ماندے پیروں کو گھسیٹتا ہوا جلد جلد راہ طے کرنے لگا ——— یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ کتنی دور چل آیا تھا پر یہ ضرور ظاہر تھا کہ اب آگے جانا محال ہے کیونکہ سامنے ایک بڑی سی کھائی منہ کھولے پڑی تھی۔ میں سہم گیا۔ اور اس کھائی کے اس پار جانے کی تدبیریں سوچنے لگا ——— سوچتا رہا لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی اور میرا اضطراب بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ یک بیک میرے کانوں میں بہت سی انسانی آوازیں آنے لگیں اور میں نے اپنی مضطرب اور متجسس نگاہیں اُن آوازوں کی طرف ڈال دیں۔ کچھ دیر بعد میری نگاہوں نے دیکھا کہ کھائی کے اس پار بہت دور سے ایک چھوٹی سی روشنی نمودار ہوئی اور آہستہ آہستہ کھائی کی جانب بڑھنے لگی۔ شب دیجور میں اس طرح ایک روشنی کے نمودار ہو جانے سے مجھے بڑی مسرت ہوئی اور میں اپنی ساری واماندگی اور پریشان حالی بھول گیا۔ مگر میں بہت متعجب تھا کہ آخر یہ روشنی یکایک کہاں سے آگئی۔ حیرت و انبساط کے ملے جلے جذبات نے مجھے کچھ سوچنے سے روک دیا اور میں خاموش کھڑا اس روشنی کو دیکھنے لگا جو خراماں خراماں اسی جانب آرہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس روشنی کے جلو میں ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کا ایک سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں اور جی چاہا کہ ایک بار دوڑ کر اُن خوش نصیب انسانوں سے جا ملوں جن کو اس تاریک رات میں بھی روشنی میسر تھی۔ لیکن سامنے وہ لمبی چوڑی کھائی منہ کھولے پڑی تھی۔ مجھے اپنی بیکسی پر بڑا ترس آیا اور میں رو پڑا۔ یہ روشنی مسلسل آگے بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ کھائی سے کچھ فاصلہ پر آکر رک گئی۔ اب بہت سی چیزیں صاف نظر آرہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سیلاب ایسے کمزور اور لاغر انسانوں پر مشتمل ہے جن کے چہرے سے بیماری اور بھوک کی کلفتیں نمایاں ہیں اور تقریباً ہر شخص کے ہاتھ میں ایک ایک مشعل ہے جس سے چنگاریاں چھٹک چھٹک کر فضا میں اڑ رہی ہیں اور مشعلوں سے نکلتا ہوا کمرہ دھواں فضا کو اور بھی تاریک بنائے دے رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص جو خاصا تہذیب یافتہ اور متمدن معلوم ہوتا تھا اس سیلاب کے سامنے کھڑا بڑے جذباتی انداز میں کچھ کہہ رہا ہے۔ راہنما نہ کو رخ دیکھ کر ہی زمانے کا بہت ستایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کے چہرے سے بیزاری اور غم و غصہ کے آثار نمایاں اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن کے گرد شکنیں پڑ گئی تھیں آگ اور انگارے برساتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ تو میں نہ سن سکا کہ ان کے رہنما نے انہیں کیا سمجھا دیا۔ لیکن اتنا ضرور دیکھا کہ اُن مردہ چہروں پر خوشی کے آثار نمایاں ہو گئے اور لبسر تے ہوئے لب مسکرانے لگے ——— ساکت مجمع میں ایک جنبش پیدا ہوئی اور اس نے ایک زوردار نعرہ لگایا۔ پھر جنگل گرجتا گرجتا اور خوشی کے بے ہنگم قہقہے اڑاتا کھائی کے وجود سے بے خبر معصومانہ اُس کی جانب بڑھنے لگا۔ . . . آہ! میں نے ایک چیخ ماری اور دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو چھپا لیا۔ وہ اندھا کھائی میں گر رہے تھے ——— "میرے معبود مجھے بچا لے" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور ہاتھوں کو آنکھوں پر سے ہٹاتے ہوئے تاریکی میں اِدھر اُدھر جھانکنے لگا۔ غور سے دیکھنے پر ایک طرف مجھے ایک سایہ سا ہلتا ہوا معلوم ہوا۔ سنسان تاریک رات میں ایک سایہ ہلتا ہوا دیکھ کر میں کچھ ڈر سا گیا لیکن آگے بڑھ کر جب حقیقت تلاش کی تو اطمینان کا سانس لیا۔ یہ سایہ ایک ایسے انسان کا تھا جس کے جیسے میں نے متعدد انسان اپنی گشتہ منزل پر دیکھے تھے۔ وہ بڑی تیزی سے آگے کی جانب لپکا جا رہا تھا۔ میں نے بھی تیز تیز قدم اٹھائے اور لپک کر اس کا دامن پکڑتے ہوئے پوچھا "جناب کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

"منزل پر" بزرگ نے بڑی متانت سے جواب دیا اور پوچھا "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"وہیں جہاں جناب کے قدوم میمنت لزوم جا رہے ہیں۔ کیا آپ میری راہ نمائی کریں گے؟"

میں نے بڑی لجاجت سے عرض کیا اور اُس نے ایک عجیب انداز

استعجاب سے مجھے اپنے پیچھے پیچھے چلے آنے کو کہا۔ میں اُس کے اِس انداز پر کچھ ٹھٹکا۔ کیونکہ یہ انداز میں نے اپنی منزل گم گشتہ کے کسی ایک فرد میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ بہرکیف! چونکہ انہوں نے منزل تک پہونچانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اور پھر صورت بھی کچھ آشنا معلوم ہوتی تھی اِسی لئے میں اُن کے ساتھ ہو گیا۔ یہ بزرگ بڑی تیزی سے کئی ایک پیچیدہ راستے طے کر گئے اور میں اپنی منزل پہ پہونچ جانے کا نشاط انگیز خیال دل میں لئے اُن کے پیچھے چلتا رہا ــــ یہاں تک کہ ایک ایسی جگہ جا پہونچا جہاں سے متعدد راستے متعدد اطراف کو جاتے تھے۔ یہ بزرگ اِس جگہ پہونچکر رک گئے اور بڑی دیر تک غور و فکر کرتے رہے۔ لیکن جب اپنے خیال کی بھول بھلیوں سے نہ نکل سکے تو بڑی خجالت سے کہا۔

"افسوس میں راستہ بھول گیا"

"کیا آپ اس راہ کے نئے مسافر ہیں"؟ میں نے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں تو کئی بار آیا گیا ہوں" اس نے اور شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

"پھر ــــ؟" میں نے اور زیادہ تعجب سے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ جو اشارات مجھے اس راہ مستقیم پر چلنے کے لئے دیئے گئے تھے۔ اُن میں میں نے اپنی عقل سے گھٹاؤ بڑھاؤ کر دیا اور اُن کی خواہ مخواہ تاویلیں کرنی شروع کیں اور ۔ ۔ ۔ ۔" اور وہ ندامت سے پانی پانی ہو گیا۔

"گستاخی معاف ــ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ جناب نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے مودبانہ عرض کیا۔

"نہ پوچھو یہ نہ پوچھو پیارے رفیق" اس نے کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

میں خاموش ہو گیا۔ بیمار بھی خاموش تھا اور سارے جہاں پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دنیا ابھی تک تاریکی کے گہوارے میں پڑی تھی اور انسان ابھی تک بھٹک رہا تھا۔

"کیا ہم اسی طرح تاریکی میں بھٹکتے رہیں گے اور ہمیں اُجالا کبھی نصیب نہ ہوگا ــــ منزل حق کبھی نظر آئے گی؟" میں سوچ رہا تھا اور سوچ سوچ کر مایوس و مضطرب ہو رہا تھا کہ اچانک ایک آواز فضا میں گونجی ؎

نہ ہو نومید نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

میں تڑپ اٹھا اور مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے تاریکی کا پردہ یک لخت چاک کر دیا ہو۔ نگاہیں اُوپر اٹھیں تو دیکھا کالے کالے دیو نما بادل چھٹ رہے تھے اور آسمان پہ تاروں کا کارواں اپنا رخت سفر باندھ رہا تھا ــــ میں دیوانہ وار اِس جاں بخش آواز کی سمت دوڑا اور آخر ایک ایسی جگہ پہونچا جہاں کچھ لوگ ایک شخص کے گرد اس طرح جمع تھے جس طرح شمع کے گرد پروانے یا چاند کے گرد تارے جمع رہتے ہیں۔ اور وہ کہہ رہا تھا ــــ نسلِ آدم کو چاہئے کہ وہ اپنے انسان پیدا کرے جو دنیا کو اس کی تمام پریشانیوں اور مصیبتوں سے نجات دلا سکتے ہوں لیکن یہ صلاحیت اولادِ آدم میں اُس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ اُن فطری اصولوں پر اپنی زندگی کی تعمیر نہیں کرے گی جو اُس کے خالق نے اپنے ایک مقبول بندے کے ذریعے اِس تک پہونچائے ہیں۔ اور جو خود اُن اصولوں کا زندہ نمونہ تھا۔" وہ خاموش ہو گیا۔ مجمع بھی خاموش تھا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک طرف کو چل پڑا۔ مجمع نے بھی اس کی تقلید کی اور اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ لیکن میں ابھی تک اپنی جگہ پر ساکت اور خاموش کھڑا تھا۔ راہنما کی ایک ایک بات میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ میں اس کی باتیں سمجھنا چاہتا تھا۔ ان پر غور کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ مبادا بھٹک کر کسی غار یا کھائی میں نہ گر پڑوں۔ اور اسی لئے جب میں نے اُس کی باتوں کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہا تو میرے دل و دماغ میں ایک کشمکش پیدا ہو گئی ــــ لیکن میرے پاؤں بالکل غیر اختیاری طور پر اُٹھنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا تو مجھے علم نہیں کہ میں اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں کتنی دُور چلا آیا تھا لیکن یہ ضرور محسوس کر رہا تھا کہ میرا دماغ اور میری عقل اپنی پیچ در پیچ منطقی بحثوں کے بعد بھی دل پر فتح نہ پا رہے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے دل کو اس بات کا یقین ہو کہ اپنی منزل گم گشتہ پر پہونچنے کی سیدھی راہ یہی ہے ــــ آخر اُس وقت جبکہ میری عقل پسپا ہو کر میدان چھوڑنا ہی چاہتی تھی میں نے سنا کوئی چلا رہا ہے "منزل۔! منزل۔!! وہ دیکھو منزل ــ!!!"

اِس ناگہانی چیخ سے میں گھبرا سا گیا اور سر اٹھا کر جو اِدھر اُدھر دیکھا تو فرطِ حیرت سے بُت بنا کھڑا رہ گیا۔ میری گم شدہ منزل جس کی تلاش میں پاؤں میں چھالے پڑ پڑ گئے تھے اور ایک جگ بیت گیا تھا۔ سپیدۂ سحر کے حسین نظاروں کے درمیان کھڑی مسکرا رہی تھی۔

تنقید نمبر

میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو کامیاب بنائیے

امین الدین۔ گورکھپوری

کون ؟

بڈھے کمہار نے چاک کو ایک جھٹکا دیا اور وہ گھومنے لگا۔
گول گول چھوٹی چھوٹی پیالیاں بننے لگیں۔
اپنے اردگرد ایک ڈھیر لگاتا رہا۔
کبھی کبھی اپنی چمکتی نظریں ان پر جما دیتا۔
چاک اب بھی چکر لگا رہا تھا۔
وہ سوچ رہا تھا۔
کسی نے کہا ہے کہ دنیا بھی چکر لگاتی ہے۔
پیڑ۔ پودے۔ چرند۔ پرند۔ حتیٰ کہ انسان اس کے ڈھلے ہوئے نمونے ہیں۔
بالکل جیسے اس کی چاک سے اترے ہوئے۔
گھڑے۔ ہانڈیاں۔ اور پیالے۔ پیالیاں۔
چکنی چکنی۔ اچھی اچھی اور تیڑھی میڑھی بھی۔
لیکن اس چاک کو گھماتا کون ہے ؟
جس سے ہمارے جیسے انسان ڈھلتے ہیں۔
جس کی وجہ سے رنگ برنگ کے پھول کھلتے ہیں اور پودے اُگتے ہیں۔
دونوں ہاتھوں سے اپنی جھکی اور اکڑی ہوئی پیٹھ ٹھیک کرنے لگا۔
چاک گھوم رہا تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔
کچھ دیر کے لئے پیالیوں کا بننا رک گیا تھا۔ ؟

(ادارۂ ادب اسلامی گورکھپور میں پڑھا گیا)

امین الدین گورکھپوری

اِنتظار

گلاب کے سُرخ پھول نے اپنا دامن پھیلا دیا تھا۔
رنگینیاں اور خوشبوئیں لٹائی جا رہی تھیں۔
ہر راہ گیر کچھ دیر کے لئے مبہوت اور ششدر کھڑا ہو جاتا۔
اور پھر اس خدا کی یاد تازہ کر لیتا۔
جس نے ایسی چیز سے انسان کو نوازا تھا۔
جو انسان کو طمانیت اور شگفتگی بخشتی ہے۔
بیدرد بھونرا بھی اِدھر آنکلا۔
کالا کالا سا۔ ایک بدمزہ راگ الاپتا ہوا۔
جیسے خود کالا تھا۔ ویسے اسے ہر حسین شے سے بَیر تھا۔
پھر اس نے گلاب کو چُوس ڈالا۔
بیدرد کالا بھونرا۔
ہر شے میں کالا پن دیکھنا چاہتا تھا۔
اور پھر وہ گلاب سُوکھ گیا۔
اور کالا ہو گیا۔
اس کی رنگینیاں۔ شوخیاں۔ عطر بیزیاں رخصت ہو گئیں۔
اب وہاں نہ کالا گلاب ہے نہ کالا بھونرا۔
البتہ ایک چھوٹی سی کلی لہرا رہی ہے۔
اس کی مسکراہٹیں نئی بہار کی آمد کا پتہ دے رہی ہیں۔
یہ زمانہ آنے والا ہے۔
نسیم سحری کا انتظار ہو رہا ہے۔

(ادارۂ ادب اسلامی گورکھپور میں پڑھا گیا)

طاہرہ سعید شمع

شاعر! تمہارے گیت ...!!

اے شاعرِ خوش بیاں ـــ! تمہارے گیت کتنے دل خوش کن ہوتے ہیں! تمہارا نغمہ کتنا پُرسرور ہوتا ہے ـــ! تمہارا طرزِ بیان کس قدر شیریں ہوتا ہے۔ ایسی شیرینی اور لطافت کی مے کتنی مدہوش کن ہوتی ہے ـــ! تمہارا یہ سحر کتنا وجد آفریں ہوتا ہے ـــ! اُف! شاید تم ان بیش بہا گل ہائے رنگین کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنا کر بھی اتنے شاد نہ ہوتے ہو گے، جتنا ہم تمہارے کلام سہت و بود کا رس چوس کر لطف اندوز ہوتے ہیں ـــ! شاعرِ خوش بیان! واقعی تمہارا جادو رگ، رگ اور نس نس میں سما جانے والا ہے ـــ! اور تمہارے اشعار بہ مصداق تیر دلنشتر دل اور جگر کو چھیدنے والے ہوتے ہیں ـــ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم اس ارضی حکومت کے حکمراں ہو ـــ! تم نے اپنے کیف آور اشعار کے ذریعہ قلوبِ انسانی کو اپنا گرویدہ بنایا ہے ـــ! دماغِ آدم، تم سے جیت نہیں سکتا ـــ! سماعت و بصارت تم نے چھین لی ہے ـــ! تم چاہو تو اُس کی دنیا بدل سکتے ہو! ایک آن میں کائنات کے ذرّے ذرّے کو ایک نئی مے سے سرشار کر سکتے ہو ـــ! سوتی بستی کو جگا سکتے ہو ـــ! جاگتی بستی کو اپنے نشہ آور نغموں سے مدہوش کن نیند سُلا سکتے ہو ـــ! غرض کہ تمہاری آہنی دسترس سے کوئی بھی چیز بعید نہیں ـــ!!!

مگر اے شاعرِ شیریں بیاں ـــ! تم کب تک ہمیں اپنے سپنوں کی نگری میں محوِ خواب رکھو گے ـــ! وقت بیداری سر پر آپہنچا ـــ! للہ ہمیں اپنے اشعار سے جھنجھوڑ کر جگا دو ـــ! ذرا نہ یاد رکھو ـــ ہماری طاقتیں ـــ! ہمارا جوش دو ولولہ ـــ! ہماری تقریر و تحریر ـــ! ہمارے عزم و ارادے ـــ! ہمارا جذبۂ اتحادِ ملت ـــ! حتیٰ کہ ہمارا ملک ـــ! و ہماری قوم ـــ! سب تمہارے انوکھے شراب سے سرشار ہو کر ہمیشہ کی گہری نیند سو جائیں گے ـــ! پھر لاکھ جھنجھوڑنے پر بھی خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہو سکیں گے ـــ! تم کب تک ہمیں ایسے سبز باغ دکھاؤ گے ـــ؟ جس میں شاعری و نیاز کے خیالی گل و بوٹے کھلتے ہیں ـــ! جن کے غنچے و گل میں نہ کوئی مہک ہوتی ہے ـــ! نہ صبا کی کوئی دلفریبی محسوس ہوتی ہے ـــ! جو حقیقت سے دُور ـــ بہت دُور ہیں ـــ! کیا فائدہ ایسی تصوراتی دنیا میں کھونے سے ـــ؟ خیالی بستی کو بسانے سے ـــ؟ خوابوں کے نیل گوں آکاش پر پرواز کرنے سے ـــ؟ تم حال میں ماضی کے نقوش ڈھونڈتے ہو ـــ! مستقبل کے خوشنما محلات کا سپنا دیکھتے ہو ـــ! لیکن یہ نہیں جانتے کہ زمانۂ حال کے خوابیدہ آرزوں ـــ سسکتی تمناؤں ـــ بوسیدہ ارمانوں کے کھنڈر پر اپنی اُمیدوں کا خوشنما فلک بوس محل کبھی نہیں تعمیر کر سکتے ـــ!!!

اے سحر ساز شاعر ـــ! کب تک تم مجازی عشق و محبت کی داستانِ پارینہ دُہراتے رہو گے ـــ؟ چاک گریباں کرو گے ـــ! ارشت و جبل کی خاک چھانو گے ـــ؟! اپنے میخانوں کی دُنیا سا غرِ مینا سے کب تک آباد رکھو گے ـــ! شراب و کباب کی مجلسیں ـــ! رقص و سرود کی محفلیں ـــ! کب تک گرم رکھو گے ـــ؟ فانی تجلی تمہیں کب تک سحر کرتی رہے گی ـــ! تمہارا طلسم کب ٹوٹے گا ـــ؟ تم اپنے خوابوں کے رنگین جزیرے کب تک آباد رکھو گے ـــ؟ کیا تم نے کبھی یہ بھی غور کیا کہ تم بارہا کتنے غلط نظریات کا شکار ہوئے ہو ـــ! کبھی یہ بھی سوچا کہ دنیا اب ایک مختلف زاویئے پر گامزن ہے ـــ جس کے اہم اور پُرخطر موڑ پر انسان تمہارے مجازی عشق و محبت کی چاشنی میں ڈوبے ہوئے گیتوں کو اپنا رہبر نہیں بنا سکتا ـــ! زمانے کے نشیب و فراز تمہارے نغموں سے عبور نہیں کئے جا سکتے ـــ! جام و مینا کی کھنک ـــ! ستار و بربط کی جھنکار ـــ! پازیب کی چھم چھم ـــ! روح کی پیاس نہیں بجھا سکتے ـــ! تمہارے اشعار صرف نفس کی غذا ہیں ـــ! جذبات کو اور بھڑکاتے ہیں ـــ! راحتِ قلب اور تسکینِ دماغ نہیں بن سکتے ـــ!! نیرنگیٔ دنیا سے تم خوب واقف ہو ـــ! اب زمانہ وہ نہیں رہا۔ جو کبھی تھا ـــ! وقت وقت پر سب باتیں اچھی لگتی ہیں ـــ!!!

اے ہر دلعزیز شاعر ـــ! ہوش میں آؤ ـــ! سنبھل جاؤ!

(ملاحظہ فرمائیے صفحہ ۴۳)

خیال اپنا اپنا

پندرہ روزہ "نور" رامپور

مدیر :- ابو سلیم محمد عبدالحئی ۔ مائل خیرآبادی۔
سالانہ زرتعاون :- ساڑھے تین روپے۔ قیمت فی پرچہ ڈھائی آنہ
ملنے کا پتہ :- پندرہ روزہ "نور" رام پور ۔ یو۔پی۔

چھوٹے بچوں کے اس رسالہ کے بہت سے شمارے ہماری نظر سے گذر چکے ہیں۔ تبصرہ کے لئے اس رسالہ کو مسلسل ہم نے بہت توجہ اور دلچسپی سے پڑھا ہے ۔ اور بچوں کی ذہنی تعمیر کے لئے بے انتہا مفید پایا ہے صحیح اسلامی تعلیمات کو دلکش اور دلنشین انداز میں پیش کرنا اور اتنی آسان زبان میں پیش کرنا کہ پہلے دوسرے درجہ کے بچوں کیلئے وہ نہ صرف مطالعہ کا سامان بنے بلکہ دلچسپی کا موجب بھی بن جائے ـــــ حقیقت میں کوئی آسان کام نہیں۔ اور یہ مشکل اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب بچوں کی دلچسپی کے لئے اسلامی حدود کی پوری پوری پابندی کرتے ہوئے رسالہ میں آرٹ کا مظاہرہ بھی کیا جائے۔

اس رسالہ کے فاضل مدیران بڑی تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ندرت سے کام لیکر "نور" میں ان سب دلچسپیوں کو یکجا کر دیا ہے جن سے صالح اور پاکیزہ خیالات بچوں کے دل میں آسانی سے جاگزیں ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ اگر اس رسالہ کا ادارہ اسی طرح ندرت اور ذہنی اپج سے کام لیتا رہا تو "نور" کا شمار نہ صرف بچوں کے بہترین اسلامی رسائل میں ہوگا۔ بلکہ اردو میں بچوں کے لئے جتنے رسالے نکلتے ہیں۔ ان سے کسی بات میں کسی طرح پیچھے نہ رہے گا۔

(ت۔ ا)

ماہنامہ "ساحل" کشن گنج

مدیر :- اکمل یزدانی۔ ایم۔ اے
سالانہ زرتعاون :- تین روپے، قیمت فی پرچہ چار آنے
ملنے کا پتہ :- ماہنامہ "ساحل" کشن گنج۔

یہ رسالہ پہلے بھی کچھ عرصہ تک نکلا ہے۔ اب نئے انتظامات کے ساتھ یہ خصوصیت لے کر نمودار ہوا ہے کہ اس کے دامن میں صالح اور تعمیری تخلیقات کی فراوانی نظر آتی ہے۔

اکمل یزدانی صاحب اچھی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اور اچھے خیالات کے حامل۔ ہمیں امید ہے کہ وہ کامیابی کے ساتھ صالح ادبی افکار و نظریات کو عام کرنے میں تندہی سے "ساحل" کو ترقی دیتے رہیں گے۔

"ساحل" کا معیار نہ تو اتنا اونچا ہے کہ متوسط ادبی مذاق کے لوگوں کے لئے معمہ سے کم ثابت نہ ہو اور نہ اتنا نیچا ہے کہ اونچا ادبی مذاق رکھنے والوں کو اس کے مطالعہ سے نئی باتیں حاصل نہ ہوں۔ یہ توازن کئی لحاظ سے بہت مفید رہے گا۔

ہمارا خیال ہے کہ اس خوبی کو اکمل صاحب اگر برقرار رکھنے کی کوشش کریں گے تو وہ "ساحل" کے معاونین میں سے تعمیر پسند ادیبوں کا ایک اچھا حلقہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

(ن۔ ا)

معذرت تنقید نمبر کی تیاریوں کی وجہ سے اس شمارہ میں ادبی مسائل کے تحت کچھ نہیں دیا جا رہا ہے اس کمی کو انشاء اللہ تنقید نمبر میں کما حقہ، پورا کر دیا جائے گا۔ ہم قارئین سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ ادبی مسائل پر خط لکھیں اور ہمیں نقطۂ نظر کی وضاحت کا موقع دیں۔ تنقید نمبر میں بطور خاص اس عنوان کے تحت مفید سوالات کے جواب پیش کئے جائیں گے۔

ادارہ